

اشاعت خاتم

اپریل ۱۹۹۵ء تا اگست ۱۹۹۵ء

الحمد لله

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حضرت مولانا  
محمد منظر عثمانی  
رحمۃ اللہ علیہ

۱۴۱۷ — ۱۳۲۳ ھ ÷ ۱۹۹۶ — ۱۹۰۵ء

مکتبہ

عبد القادر حمید



کمپیوٹر کمپوزنگ ————— پرنٹ لائن کمپیوٹرس۔ لکھنؤ فون 85305!  
 کور ڈیزائننگ ————— ایڈورٹائزر انڈیا ————— لکھنؤ فون 16284  
 طباعت ————— کاکوری آفسیٹ پریس۔ لکھنؤ فون: 70143!

### اس خاص نمبر کی قیمت اور سالانہ زر تعاون

برائے ممالک	قیمت عام ایڈیشن	قیمت اعلیٰ ایڈیشن	اس نمبر سے سالانہ چندہ
ہندوستان	115/-	135/- مع معمولی ڈاک	150/-
پاکستان	150/-	200/- مع معمولی ڈاک	200/-
بقیہ ممالک	159/-	166/- ڈاک 10/-	15/- ڈاک 23/-

ایڈیٹر ————— خلیل الرحمن سجاد نعمانی  
 باہتمام ————— محمد حسان نعمانی

محمد حسان نعمانی پرنٹر پبلشر نے کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱/۱۱۳ نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

۶۶

اِشَاعَتِ كَاجِھِیَا سَٹھواں سَکال

۱۳۵۳ھ  
۱۹۳۲ء  
آغا زار اشاعت

اول آخرفنا اظہار و باطن فنا  
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخِ سرفنا  
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ مدام  
جس کو کیا ہو کسی مرخوئے نام

(اقبال)

قیمت علی ادیشن  
۱۵۰/-

قیمت علی ادیشن  
۱۱۵/-

४८५

پیشرو

نہیں

موتی مراد ! داستان حکم و عدل

جیسے کہ یہ کہ اگر صیغہ فوری (م) بنام اس سوسائٹ

پھر انجان دنیا پر اس کے فرائض سے سبقت نہ لے کر

انباریں ہائیڈرو پمپ سے پیداوار کے لیے -

کرمی، انہی کا بھی ہے۔ اسے پیچھے رہے۔ یہ سب کچھ

اور ان کے ساتھ انضمام اور شمولیت ہے اور

فقد مررت به ليلة ربيعه سنة ثمان و عشرين و ثمان مائة

ترجمہ: افسوس کہ میں نے اس کو فتنہ سے بچا کر دیا۔

سے یہ کہہ کر اٹھ کر چلا گیا۔

یا ایک جو کب تک ہر سوسے گا۔ یہ روئے ہمارے کا  
 یہ سوسے کی کھدائی ہے۔ دعا و قہر و...

الحمد لله الذي جعل في كل شيء  
دلالة على قدرته وجلاله

مفتی محمد رفیع الدین صاحب

لا تروى في كتب معتدلة

جامعہ اسلامیہ اسلامیہ

Madrasa Islamiya

(١٢) Hathaura

Dt. Bandah.

U. S.



## فہرست مضامین

- ۱۰ ناشر کی چند ضروری گذارشات  
۱۳ عتیق الرحمن سنبھلی ناظم ادارہ

### ۱۷ مسافر آخرت منزل آخرت کی طرف

- ”عالم دین، مبلغ و مفکر مولانا محمد منظور نعمانی نے داعی اجل کو لبیک کہا“  
روزنامہ قومی آواز لکھنؤ  
”ممتاز عالم دین و مفکر و مصنف مولانا محمد منظور نعمانی سپرد خاک“  
روزنامہ صحافت لکھنؤ  
۲۱ ”کلمہ توحید کی گونج میں حضرت مولانا نعمانی کو ابدی آرام گاہ میں سلا دیا گیا“  
روزنامہ ان دنوں لکھنؤ  
۲۳ محمد ارشادند اخیالی نوگانوی (نوحہ فراق)  
۲۷ قطعہ تاریخ وفات  
۲۸ قطعہ تاریخ وفات  
۲۹ نکتہ داں منظور نعمانی (جذبات عقیدت)  
جناب حکیم افہام اللہ  
زبیر احمد راہی قاسمی

### خبر وفات کی صدائے بازگشت

- ۳۱ اسلامی جرائد و رسائل میں

- ۳۳ ایک مدبر عالم اور دردمند مصلح کی رحلت  
۳۰ ماہنامہ ”معارف“ اعظم گڑھ  
ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

ایک شخصیت نہیں ایک ادارہ  
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را  
بزم ملت اسلامیہ کا ایک اور چراغ گل ہو گیا  
علم و دین کا ایک چراغ اور بجھا  
ترجمان علماء حق کا وصال  
انھ گیا علم و عمل کا آفتاب  
مسلمانان ہند کے لئے ایک بڑا حادثہ  
عالم اسلام کی بلند مرتبہ شخصیت

ماہنامہ ”امپیکٹ انٹرنیشنل“ لندن  
”ترجمان دارالعلوم“ دیوبند  
ماہنامہ ”الرشاد“ اعظم گڑھ  
ماہنامہ ”الماثر“ ممبئی  
ماہنامہ ”ختم نبوت“ ملتان پاکستان  
ہفت روزہ ”نئی دنیا“ دہلی  
ماہنامہ ”اشراق“ لاہور  
ہفت روزہ ”جدید مرکز“ لکھنؤ

### گلہائے تازہ

(خاص نمبر کے لئے لکھے گئے مضامین)

رفیق محترم

۹۷ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی  
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰۹ مولانا مرغوب الرحمن صاحب  
مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۱۹ مولانا محمد عاشق الہی برنی (مکہ مکرمہ)  
پروفیسر محمد یونس مظہر صدیقی

۱۲۷ (چیرمین ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)  
مولانا نور عالم خلیل امینی

۱۳۵ ایڈیٹر الداعی، استاد دارالعلوم دیوبند  
مولانا عبدالقدوس رومی

۱۶۹ (مفتی شہر آگرہ)  
مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

۱۸۷ صدر شعبہ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دارالعلوم دیوبند سے وابستہ دیرینہ یادوں کے  
نقوش و تاثرات  
اپنے اسلاف کی یادگار  
عہد حاضر کا مجاہد اسلامی

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم

الفرقان کا دورِ زریں۔ اس کا دورِ اولیں

مولانا نعمانی اپنی کتابوں، عادتوں اور باتوں  
کے آئینہ میں

- ۲۰۱ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری  
استاذ حدیث، اکتھن یونیورسٹی۔ ابو ظہبی
- ۲۰۷ مولانا محمد حنیف ملتی  
شیخ الحدیث۔ معبد ملت، مالگاوں
- ۲۱۳ مولانا محمد زکریا سنہلی  
استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- ۲۲۹ جناب قطب الدین ملّا  
ایم اے فاضل دینیات۔ (بلگام)
- مولانا عتیق احمد بستوی  
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء
- جناب اسیر ادروی بنارکر  
جناب سید ثناء اللہ
- فاضل جامعہ رحیمیہ لاہور  
عتیق الرحمن سنہلی
- ۲۶۳ ڈاکٹر شمس تبریز خاں  
استاذ شعبہ عربی۔ لکھنؤ یونیورسٹی
- ۲۹۱ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی  
دارالعلوم، کراچی۔ پاکستان
- ۳۰۵ خلیل الرحمن سجاد نعمانی ندوی  
جناب محمد یونس سلیم
- ۳۲۷ سابق ڈپٹی منسٹر حکومت ہندو گورنر بہار۔  
مولانا فرید الوحیدی۔ جدہ
- ۳۳۷ جناب صوفی رحمت اللہ۔ بہرائچ  
محمد حسان نعمانی
- ۳۵۳ محمد یحییٰ نعمانی  
متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- ۳۵۶ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی۔ چند تاثرات
- مولانا محمد منظور نعمانی اپنی تصنیفات کے  
آئینہ میں
- محمد ثکیر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی  
اور آپ کی شہرہ آفاق کتاب ”معارف الحدیث“
- میری تحسن کتاب ————— ”دین و شریعت“
- حضرت مولانا نعمانی ————— نقوش و تاثرات
- اسلامی ہند کی ایک تاریخ ساز شخصیت  
ایک تاریخی شہادت
- والد ماجد ————— کچھ یادوں کی روشنی میں  
اکابر علماء دیوبند کے سلسلہ زریں کی آخری کڑی
- حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
- وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں  
ایک مدبر و مفکر عالم دین
- من انصاری الی اللہ  
ماں باپ سے زیادہ شفیق
- حضرت ابی کی ذاتی اور گھریلو زندگی  
نانا جان رحمۃ اللہ علیہ

عجب اک مطلع انوار تھے منظور نعمانی (نظم)  
 باتیں جو یاد رہ گئیں  
 علم و عمل کی ایک جیتی جاگتی شخصیت  
 اپنی باتیں، کچھ ناقابل فراموش یادیں  
 مرتبہ فارسی  
 ڈاکٹر مسلم شبنم نوری  
 جناب حافظ سمیع اللہ صدیقی  
 جناب عبدالرؤف صدیقی، کراچی  
 محمد فرقان محمد نعمان۔ مکہ مکرمہ  
 مولانا محمد ابراہیم فانی  
 دارالعلوم حقانیہ۔ پاکستان

## فکر نعمانی کی جھلکیاں

آئینہ الفرقان میں

مرتبہ - عتیق الرحمن سنبھلی

اگر رسول ﷺ اس زمانہ میں ہوتے  
 ۱۔ رس قرآن - (سورہ توبہ کی اہمیت)  
 حقیقت اور اہل حدیثیت

الحدرد فالحدرد  
 کیا ابھی وقت نہیں آیا؟ تقسیم ہند کے بعد کی ایک پکار  
 ہندوستان کی تقسیم پر پہلا تاثر  
 انتخابی جنگ میں دین و اخلاق کی پامالی پر الفرقان کا احتساب  
 ہمارا نصب العین اور طریق کار  
 معرکہ القلم یا فیصلہ کن مناظرہ  
 نیک ارادے کے ساتھ سینما بینی؟  
 حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دعوت  
 احیاء دین کی دعوت اور سیاست  
 ۱۔ تنویر حنت اور خوف و زرخ سے محرومی  
 حتم نبوت کی حقیقت  
 حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے "۱۹۹ اسماء مبارک"  
 حافظے کے نقوش

۱۔

۲۔

۳۔

۴۔

۵۔

۶۔

۷۔

۸۔

۹۔

- ۴۷۳ ایک ایشیائی اسلامی کانفرنس کا تجربہ  
۴۷۵ خطبہ عید

- ۴۸۱ اپنے خطوط کے آئینہ میں  
(مکتوبات بانی الفرقان کا انتخاب)

- ۴۸۳ علمی افکار و افادات  
توازن و اعتدال  
حمیت حق  
ذکر چمن فکر چمن (دارالعلوم دیوبند)  
نفی ذات اور فکر آخرت  
اصلاح و ارشاد  
اصلاح رسوم  
۵۶۳ دل درد مند  
۵۷۱ دور معذوری اور فکر ملت  
۵۸۵ متفرقات  
۵۹۱ گلشن علم و عمل کی پڑگئی مدھم بہار (نظم)  
۶۹۹ جناب فضل حق عارف خیر آبادی

### کارزار حیات میں

- ۶۰۱ عتیق الرحمن سنہلی  
۹۳/۹۴ سالہ زندگی  
منزل بہ منزل  
حضرت بانی الفرقان کی  
تصنیفی و تالیفی یادگاریں  
۶۵۷ بنیاد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی (نظم)  
۶۶۱ قاری محمد مسلم غازی

# ناشر کی چند ضروری گذارشات

## قارئین الفرقان کی خدمت میں

الحمد لله الذی بعزته وحلاله تتم الصلحت

الفرقان کی یہ خاص اشاعت بیاد بائی الفرقان حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ آپ خدمت میں پیش ہے۔ انشاء اللہ یہ خود بتائے گی کہ بائی الفرقان علیہ الرحمہ اپنے تابندہ نقوش کو موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے کی جو ذمہ داری ہم پر چھوڑ گئے تھے۔ ہم نے اس کی ادائیگی ممکنہ کوشش ضرور کی ہے۔ خاص طور پر برادر مکرم مولانا عتیق الرحمن سنبھلی رید مجھ م نے جس طر طبیعت کی ناسازی اور شدید گرمی (لندن میں قیام کی وجہ سے جس کے وہ اب عادی نہیں رہے ہیں) کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے دن و رات محنت کی ہے وہ ہم جیسوں کے لئے واقعی قابل تقلید ہے۔ اور یقیناً انھیں کام کی لگن و رشہ میں ملی ہے اور بلاشبہ وہ بائی الفرقان کے سچے وارث ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کامل صحت کے ساتھ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔

ہم اپنی اس کوشش میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ امید ہے آپ اپنی رائے سے نوازیں گے۔

یہ خاص اشاعت پونے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم نے الفرقان کے آخری شمارے ہونے والے شمارہ (مارچ ۱۹۹۸ء) میں ۵۰۰ صفحات کا اعلان کیا تھا۔ پھر پوسٹر شائع کیا تو ۶۰۰ صفحات کا اندازہ تھا لیکن کئی مضامین روکنے اور متعدد مضامین مختصر کرنے کے باوجود اب یہ پونے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اب یہ چار ماہ کے بجائے پانچ ماہ کا مشترک شمارہ ہے۔ لہذا نوٹ فرمائیں کہ۔

☆ یہ خاص اشاعت اپریل تا اگست ۱۹۹۸ء کا مشترک شمارہ ہے۔

☆ اگلا شمارہ بابت ماہ ستمبر ۱۹۹۸ء انشاء اللہ اگست کے آخری ہفتہ میں شائع ہوگا۔

کسی اسبابی تدبیر کے بغیر یعنی سرمائے کا کوئی خصوصی انتظام کئے بغیر ہم نے اس ضخیم نمبر کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا۔ اور جب اس کے صفحات میں اضافہ ناگزیر معلوم ہوا تو بھی ہم نے صرف رب کریم کے بھروسہ سرمائے کی کمی کو آڑے نہ آنے دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ادارے پر قرض



کا بہت بڑا بوجھ آن پڑا ہے۔ امید ہے کہ وہی مسبب الاسباب ہم کو اس سے سبکدوش کرے گا۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہے اس ضخیم نمبر کو قارئین تک بحفاظت پہنچانے کا۔ اس سلسلے میں ہم نے پہلے الفرقان کے ذریعے اور پھر خطوط لکھ کر الفرقان کے قارئین کرام سے استدعا کی تھی کہ اس نمبر کو محفوظ طریقے پر منگوانے کے لئے رجسٹری فیس ارسال کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ اندرون ملک کے صرف بیس پچیس فیصد خریداران الفرقان نے اس پر توجہ دی اور بیرونی ممالک کے ایسے خریداروں کی تعداد جنہوں نے رجسٹری فیس بھیجی ہو پانچ فیصد سے کسی طرح زائد نہیں ہے۔

یقین جانئے کہ ادارہ اس وقت اس پر بالکل قادر نہیں ہے کہ ایسے تمام خرچہ اپنے خرچے پر یہ نمبر رجسٹرڈ بھیجے۔ اور سادہ ڈاک سے بھیجنے پر ضائع ہونے جس کی تلافی تو ممکن ہی نہیں۔ لہذا ہمیں یہ طے کرنا پڑا ہے کہ:-  
برائے ہندوستان

(۱) جن خریداران نے رجسٹری فیس ارسال کر دی ہے ان کی خدمت میں بان ۔۔۔  
نمبر رجسٹرڈ روانہ کیا جا رہا ہے۔

(۲) جن حضرات نے رجسٹری فیس نہیں بھیجی ہے لیکن ان کا زر تعاون جمع ہے ان کو یہ نمبر محصول ڈاک مع پیکنگ خرچہ 20/- روپے کی وی پی سی سے روانہ کیا جائے گا۔

(۳) جن خریداران کی مدت خریداری مارچ ۹۸ء تا اگست ۹۸ء کے کسی شمارہ پر ختم ہوتی ہے ان کی خدمت میں یہ خاص اشاعت سالانہ چندہ کی وی پی سی سے روانہ کی جائے گی۔ اس طرح یہ خاص نمبر انھیں بحفاظت پہنچ جائے گا، اور ان کا سال آئندہ کا چندہ بھی جمع ہو جائیگا۔

برائے پاکستان

(۱) جن پاکستانی خریداران نے رجسٹری فیس ارسال نہیں فرمائی ہے لیکن ان کا زر تعاون جمع ہے ان کو یہ نمبر رجسٹرڈ بھیجا جا رہا ہے، ایسے تمام حضرات نمبر ملتے ہی 35/- روپے ادارہ اصلاح و تبلیغ کو روانہ فرمادیں۔

(۲) جن حضرات کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے ان کا نمبر روک لیا گیا ہے۔ وہ اپنا زر تعاون مع رجسٹری فیس مبلغ دو سو روپے ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلیین بلڈنگ، لاہور بھیج کر سید ہمیں روانہ فرمائیں۔

بیرونی ممالک

(۱) بیرونی ممالک کے ان تمام خریداروں کی خدمت میں یہ خاص اشاعت رجسٹرڈ

ارسال کی جارہی ہے۔ جن کا سالانہ زر تعاون جمع ہے، ایسے حضرات سے گزارش۔  
رجسٹرڈ محصول کے سلسلہ میں ۲ پونڈ یا ۳ ڈالر خاص نمبر ملتے ہی ارسال فرمادیں۔  
(۲) جن بیرونی خریداران کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے ان کا خاص نمبر دو  
ہے، امید ہے کہ ہماری مجبوری کو سمجھتے ہوئے کچھ خیال نہ فرمائیں گے۔ اور جلد از جلد بقا  
رجسٹری فیس ارسال فرمادیں گے، تاکہ یہ خاص اشاعت بھیجی جاسکے۔

برطانیہ و یورپ کے خریداران کیلئے درج ذیل پتہ پر رقم بھیجنے میں یقیناً سہولت؛

Mr. Raziur Rahman, 90-B Hanley Road

London N4 3DW, (U.K)

### ایک ضروری گزارش

اگر آپ سے کوئی اس خاص نمبر کے نہ پہنچنے کی شکایت کرتا ہے تو براہ کرم ۲۱  
صفحات پڑھو ادیں، ممکن ہے انکا نمبر مذکورہ بالا وجوہات میں سے کسی وجہ کی بنا پر رکا ہوا ہو۔  
یہ خاص نمبر دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔ (۱) عام ایڈیشن (۲) اعلیٰ ایڈیشن  
تمام خریداران کی خدمت میں عام ایڈیشن ہی بھیجا جا رہا ہے سوائے ان کے کہ  
نے اعلیٰ ایڈیشن کے لئے اضافی رقم ارسال کی ہے۔ اعلیٰ ایڈیشن عمدہ مضبوط جلد  
آراستہ ہے اور بحفاظت رکھنے کے شائقین کے خیال سے تیار کر لیا گیا ہے۔

آخر میں ہم تمام مضامین نگار حضرات اور مشہرین کے تعاون کے لئے ممنون ہیں اور امید  
ہیں کہ ان کا یہ تعاون صرف خاص نمبر تک ہی محدود نہیں ہو گا بلکہ اس کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا  
بڑی ناشکری ہوگی اگر ہم ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کریں جنہوں نے کسی طرح سے بھی  
نمبر کی تیاری میں اپنا تعاون دیا۔ بالخصوص وہ حضرات جنہوں نے الفرقان کی وہ فائلیں یا وہ شمارے  
کرائے جو ہمارے پاس محفوظ نہیں تھے اور وہ حضرات جنہوں نے ہائی الفرقان کے خطوط فراہم  
سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کارِ خیر میں ان کی شرکت کو قبول فرمائے۔ اور  
کو اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے۔ آمین

یہ عاجز اور ادارہ الفرقان کے تمام کارکنان آپ کی دعاؤں کے محتاج اور طالب ہیں۔

والسلام \_\_\_\_\_ ناظم ادارہ الفرقان

تواولیس

## عرض مرتب

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيدنا ونبينا

وأصحابه وأهل بيته أجمعين آمنا بعد

یہ عاجز مرتب گواہی دیتا ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف اللہ وحدہ ہے۔ اور اُسی کو زیبا ہے۔ پس اگر کبھی اس خاص اشاعت کے سلسلے سے یہ خیال اور شیطان ۔ ۔ ۔ ذہن کے کسی گوشے میں گزرا ہو کہ اسکے ذریعے سے ہمارے والد ماجد علیہ الرحمہ کی بزرگی و بڑائی کا نقش لوگوں کے دلوں میں قائم ہوگا، تو رت غفور و رحیم سے التجا ہے کہ اپنے کرم سے معاف فرمادے۔ جہاں تک اصلی ارادے اور نیت کا تعلق اور اس کا شعور ہے وہ سوائے اسکے کچھ نہیں رہا کہ ان کی زندگی میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا تذکرہ اور جن کا تحریری شکل میں محفوظ کر دیا جانا، لوگوں کیلئے مفید۔ بلکہ بے حد مفید۔ ہوگا۔ اور خود ہمارے لئے ایک مستقل نصیحت اور وصیت کا کام دے گا۔ اور اسی لئے اس کی پوری احتیاط کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جو کچھ چھے اس کا اصلی رخ اسی افادیت کی طرف ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پوری احتیاط کے وجود پر یہ نظر آیا کہ یہ بات عملاً ممکن نہیں کہ قابل تقلید اور قابل استفادہ باتوں کے حوالہ سے کسی شخصیت کا تذکرہ ہو اور اسکی بڑائی اور عظمت کا کوئی پہلو اس تذکرے سے پیدا نہ ہو اور اسکے لئے ذہن نے اس آیت قرآنی سے تسلی پائی کہ۔

ولله العزة ولرسوله اور عزت تو اللہ کیلئے ہے اور اسکے رسول کیلئے

وللمؤمنين (المسافقون-۸) اور ایمان والوں کے لئے۔

کہا نہیں جاسکتا کہ یہ احتیاط جس کا ذکر کیا جا رہا ہے کہاں تک کامیاب رہی اور واقعہ میں کہاں تک اس کا حق ادا کیا جاسکا لیکن اگر کچھ کوتاہی رہی تو خاکسار مرتب کی معذرت یہ ہے کہ

اتنے ضخیم نمبر کا سارا ادارتی کام، علاوہ اپنے تقریباً سو صفحے کی تحریری حصے کے، بالکل تنہا کرنا پڑا ہے اور قارئین الفرقان ناواقف نہیں ہیں کہ وہ ایک کمزور صحت کا انسان ہے۔ پھر اس پر مستزاد اب عمر کا ستر (۷۰) کے ہند سے کو چھو لینا بھی، ساڑھے تین سو صفحات کے بیرونی مضامین اس نمبر میں شامل ہیں۔ کتابت کو دینے سے پہلے ان کا ایک ایک لفظ اپنی ذمہ داری کے ماتحت پڑھنے کی کوشش کی گئی تاکہ کہیں نوٹ لکھنے کی ضرورت ہو تو وہ نوٹ لکھا جائے، کچھ ساقط کرنا ضروری نظر آئے تو اس کو ساقط بھی کیا جائے۔ حشو و زوائد ہوں تو دوسروں کے لئے جگہ نکالنے کی خاطر یہ غیر ضروری حصے حذف کئے جائیں۔

اس سے بھی زیادہ بھاری کام دو اور تھے۔ ایک الفرقان کے شروع سے اس وقت کے تمام فائلوں کا مطالعہ جب تک حضرت بائی الفرقان کی تحریریں اس میں نکلتی رہیں، اور یہ کوئی ساٹھ برس کے فاصلے تھے۔ اس مطالعے سے اس نمبر کے لئے دو کام لئے جانے تھے۔ ایک آپ کی پوری زندگی کا اشاریہ (یا خلاصہ) مرتب کرنا جو سب سے آخری مضمون ”بانوے / چورانوے سالہ زندگی منزل بہ منزل“ کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ دوم، آپ کی تحریروں اور تقریروں میں سے ایک ایسا انتخاب جس سے آپ کی فکری شخصیت کو سمجھنے میں لوگوں کو مدد ملے اور اس میں بجائے خود وہ افادیت بھی ہو جس کیلئے آپ ساری زندگی حریص و مضطرب رہے۔

دوسرا تقریباً ایسا ہی بھاری کام آپ کے ٹیکڑوں خطوط میں سے مختلف نوعیتوں کے خطوط کا ایک انتخاب مرتب کرنا تھا۔ یہ کام اس لحاظ سے پہلے کام سے بھی زیادہ بھاری تھا کہ جہاں بعض خطوط بے حد افادہ عام کی نوعیت رکھتے ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ ہر خط قابل اشاعت نہیں ہوتا۔ پھر نمبر میں جگہ کی محدودیت کو دیکھتے ہوئے قابل اشاعت خطوط میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا فیصلہ کرنا۔ کسی طرح بھی اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کام کس قدر دقت طلب اور محنت طلب ہوا۔ جبکہ اس میں تھوڑی سی مدد برادران عزیز مولوی محمد زکریا صاحب سنبھلی اور مولوی محمد عارف صاحب سنبھلی سے بھی مل گئی تھی۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

جگہ کی محدودیت کا جو اندازہ شروع میں تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باہر کے مضامین کی تعداد اور اس کا دباؤ بڑھا تو اس اندازے کے مطابق کئے گئے انتخاب پر بار بار نظر ثانی کرنا پڑی ورنہ خطوط کی تعداد اس سے کافی زیادہ ہوتی جتنی اس وقت ہے۔ یہی معاملہ حضرت بائی الفرقان کی تحریروں کے انتخاب میں بھی پیش آیا کہ اصلی انتخاب کو کمی در کمی کا شکار ہونا پڑا۔

تاہم خاکسار مرتب کا خیال یہ ہے کہ اس اشاعت خاص کی جان یہی دو انتخابی حصے ہیں

اور انھیں میں اس اشاعت کی اصلی روح اور اصل مقصدیت ہے۔ اور صرف یہی خیال تھا جس کے ماتحت یہ دونوں بھاری کام اپنی کمزور بساط کو اچھی طرح جاننے کے باوجود اٹھائے۔ ان دو کاموں کے بغیر اس نمبر کی وہ افادیت اور معنویت اپنے نزدیک نہ تھی جس کے بارے میں یہ گمان ہو سکے کہ اگر حضرت والد مرحوم کسی طرح اس نمبر کو دیکھ سکیں تو انھیں اس رسمیت کی شکایت اپنے بیٹوں سے نہ ہو جس سے وہ ہمیشہ نفور رہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ ان کی روح مبارک کے لئے ایک صدقہ جاریہ کی صورت بنے۔ اللھم صدق طسا و تفضلہ ما انک ار

العلیم ہ نمبر کی اشاعت میں جو ایک ماہ کی تاخیر ہوئی اس میں بھی زیادہ تر دخل تھا۔ کہ اپنی کمزور صحت نے اس کام کے دوران میں کئی بار جھٹکا کھایا جس نے مؤخر ہونی چلی گئی۔ مگر اس حصے کے بغیر نمبر کی اشاعت طبیعت کو کسی طرح قہ

باہر سے آنے والے جو مضامین شامل اشاعت ہیں الحمد للہ وہ بالعموم اسی افادی نوعیت کے حامل ہیں جس کو ہم نے اس نمبر کے لئے ضروری سمجھا۔ افسوس کہ یہاں ان مضامین کے تعارف یا کم از کم خصوصیات کی طرف اشاروں کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ بس ہم شکر گزار ہیں کہ ان حضرات نے ہمارے ساتھ تعاون فرمایا اور اپنے مضامین سے نمبر کے افادی پہلوؤں میں اضافہ کیا۔

ناپاسی ہوگی اگر اس نمبر کے سلسلے میں تعاون کا تذکرہ کرتے ہوئے محترم بھائی قطب الدین ملا صاحب کا ذکر نہ کیا جائے۔ انھوں نے اپنے اس قلبی دروہانی تعلق کی بنا پر جو انھیں حضرت والد مرحوم سے تھا اور ان کے خانوادے سے ہے۔ بیلگام (کرناٹک) سے لکھنؤ کا سفر اسی خدمت کے لئے کیا اور مکمل ایک ماہ ہمارے ساتھ گزار کر گئے جس سے کتابت کی تصحیح میں خاص طور پر بڑی مدد ملی۔ اس ضمن میں مجھے یہ بھی لازم ہے کہ اپنے بڑے بیٹے (اور والد مرحوم کے بڑے پوتے) میاں عبید الرحمن سلمہ کا دعائے ذکر کروں کہ انھوں نے بھی کامل ایک ماہ کا وقت اپنی ملازمت (آل انڈیا ریڈیو، مانیٹرنگ سیکشن، دہلی) سے رخصت لیکر لکھنؤ میں میرے ساتھ اسی نمبر کے سلسلے میں مدد دینے کو گزارا۔ اور ان کی مدد میرے لئے بہت ہی راحت اور سہولت کا باعث ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کو ان کی دین و دنیا کے لئے نافع بنائے۔

اپنے نقطہ نظر سے اس نمبر میں صرف ایک کمی رہ گئی ہے کہ الفرقان کے صفحات میں حضرت بانی الفرقان کے جو چھوٹے بڑے مضامین اول دن سے آخر تک نکلے ان کا ایک اشاریہ (انڈیکس) نہیں آسکا۔ محترم بھائی قطب الدین ملا صاحب نے بہت عرصہ پہلے اپنے ذاتی تقاضے سے یہ انڈیکس تیار کیا تھا اور وہ انھوں نے اس موقع کے لئے ہمیں پہونچا بھی دیا تھا مگر اس پر کچھ کام کی ضرورت تھی جس کے بعد وہ اس نمبر میں شامل کیا جاسکے۔ اس کام کے لئے میرے پاس بالکل وقت نہ نکل سکا اور کوئی دوسرا مجھے میسر نہ تھا جو اس کام کو انجام دے دیتا۔ کوشش کی جائے گی کہ یہ کام کبھی آئندہ ہو سکے۔ ملا صاحب کے تیار کردہ انڈیکس کی رو سے الفرقان کے ان مضامین کے صفحات ۵۹۸۷ ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے انڈیکس کی ضخامت کیا ہوگی۔

نمبر یقیناً اس سے بہتر ہو جاتا اگر ادارتی سطح کے امور کا کوئی مددگار میسر ہوتا۔ تاہم میرے لئے یہ بات اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حضور سر اپا نیاز ہونے کی ہے کہ تنہائی کے باوجود سوائے ایک انڈیکس کی کمی کے یہ مکمل اسی نقشے پر تیار ہوا ہے جو نقشہ اس کیلئے ذہن میں پہلے دن بنا تھا۔ نمبر کو اس کے مندرجات کی مختلف مناسبتوں کے اعتبار سے چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں

(۱) مسافر آخرت منزل آخرت کی طرف

(۲) خبر وفات کی صدائے بازگشت

(۳) گلہائے تازہ

(۴) فکرِ نعمانی کی جھلکیاں

(۵) اپنے خطوط کے آئینے میں

(۶) کارزارِ حیات میں

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کو نافع بنائے، ہمارے لئے بھی اور قارئین کے لئے بھی۔ اور اگر اس میں کوئی شے اس کے لئے ناپسندیدہ ہو تو اس سے درگزر فرمائے۔

عتیق الرحمن سنہلی

بروز جمعہ

۲۳ صفر ۱۴۱۹ھ / ۱۹ جون ۱۹۹۸ء

نوٹ - افسوس ہے کہ بعض قابل اشاعت مضامین شامل اشاعت ہونے سے رہ گئے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں وہ دیئے جائیں گے۔



# مسافرِ آخرت منزلِ آخرت کی طرف

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ  
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّاتٍ ۖ  
(القرآن سورۃ الفجر [۸۹])

(ترجمہ) اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو (ادھر چل کر) میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔



TUE, 5 MONDAY, MAY 5 1997

QAUMI AWAZ

# عالم دین مبلغ و مفکر مولانا محمد منظور نعمانی نے اعلیٰ جل کو لبیک کہا

دیوبند کے مشاہیر نے مولانا کو لبیک کہے۔

امیر ملت مولانا کے علاوہ

مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

اور مولانا کے بیٹے

بامع خطیب، احادیث کے ماہر، بے برصغیر محرم

نکھو ام اریل۔ ہر صبر صرف نکھو لکم

یہ سب ملک پر عمل کرنا کرنا کرنا کرنا

ہر صبر اسلام کے معنی ہر صبر اور عظیم

خطیب اور ماہر صبریت مولانا محمد منظور نعمانی

ایسے مالک عقیق سے ملنے مولانا کو جو صبر

سے صاحب مراثی تھے لکن ان کا وجود ہی دین

و اسلامی مطلق بنانے کا امت تھا۔

وہ صبر و شجاعت ہم میں بھرتی تھے جہاں

ماہر ڈاکٹر مولانا کا علاج ہو رہا تھا لیکن مشنر

نے آج صبر سے پہلے ان کے آنکھیں اس دوا

فانی سے صبر کر کے کی حیرت۔

صبر و اسلامی مفکر مولانا محمد منظور نعمانی

کی پیدائش ۱۹۱۵ء میں صبر آباد کے صبر

صبر صبر صبر صبر صبر صبر صبر صبر

نظم صبر صبر صبر صبر صبر صبر صبر

گودا یا معلوم دیوبند میں ہوئی تھی جہاں ان کے

سبہ جانتے حاصل کی۔

مولانا فرشتہ و بان سے اسلام کے

صبر صبر اور اس کی روح کو عام کر کے

کرنا ہے اس کے لیے وہ امام عہد ایسے قلم

اور زبان سے بکھر رہے تھے انھوں نے اسلام

کی صبر صبر اور اس کی عظمت دیکھ کر

رخص اس مقصد کے تحت انھوں نے ہفتہ ہفتہ

نکھو صبر صبر اسلام کو بہت بہت صبر

اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو کر لکھوں

قندار میں شائع ہوئے مولانا اس سے بڑا

ان کی ہر جگہ کی تصنیف معارف احمدیت

قومی آواز

بمنازل عالم دین مفکر و مصنف مولانا محمد منظور نعمانی سپرد خاک

آخری دہد ار کے لیے بلا تفریق مذہبِ مِلّت شہرِ اُمڈ پُرا  
شہر میں ایک چرخِ تھانہ رہا

لکھنؤ ۵ مئی، عالی شہرت کے  
 ملک مولانا مسطور لہویا کو حق کا کلام رات  
 ۸ بجے مقامی سکرسنگ ہرم میں انتقال  
 ہو گیا تھا۔ رجاک کرنے کے لئے طائفہ  
 مہسدات آج عیش ماہ میں جیسے سا  
 براہ راست انہی رجاہ ہرم آتے ہیں  
 سے رجاہ متعلق چہرہ ہوں اور اسے بہت  
 پہنچے باقاعدہ شہر میں سڑکی کیفیت  
 اس کی آخری آرام گاہ یک شاد و ماہ  
 ایچما باجوا کا۔

۱۔ مولا نے اس سوال کی تفسیر نہ کی  
 ۲۔ مگر اور حرجاً ہوتے ہیں یہ ان کے  
 ۳۔ بدل کا اصل مصلوح ہرگز نہ ہی پرانے  
 ۴۔ حصہ ہے ۔ علامۃ کی اس عبارت سے  
 ۵۔ چنانچہ اگر وہی وہی اور ان کے  
 ۶۔ ان کے بدلہ میں اور ان کے بدلہ  
 ۷۔ میں سے کسی کو بھی نہیں دیا جائے  
 ۸۔ ان کے بدلہ میں دیا جائے تو  
 ۹۔ ان کے بدلہ میں دیا جائے تو  
 ۱۰۔ ان کے بدلہ میں دیا جائے تو

جس لوگوں کو سولہ انعامی کے اتھقال  
 کی حد پر دیر پٹی اٹھولے سہراہ راست  
 عیش مایہ کارج کیا اور اس وقت  
 عالم یہ تھا کہ چار مانع پہرے لکھو  
 اور اسیں آنا دوسرے کی ہر طرف  
 سونگروں کی ایک لائنیں ہیں  
 عیش مایہ کی حالت وہاں وہاں  
 مددہ العلماء عیش مایہ ملک کے  
 آنکری سر میں ماسالہ کم دینے پر  
 اور ادھکی بھجواہ کے تہاوانی تو  
 کا ارازیں اسے فیتہ تہہ تو  
 دیا یا ماسالہ کے کھانہ کا اٹھا  
 سے آہ وقت والی تو بل نا ملک  
 سید پارچہ کھانا کی تعلیم  
 مددہ فاضلہ باریز سے تہہ عیش  
 ایہ عالم خزانہ سے تو تہہ سے  
 سہراہ کرا کرا کرا کرا کرا  
 تو تو ایہ فیتہ مددہ عیش مایہ  
 کا اٹھا عیش مایہ کھانہ کا اٹھا  
 مددہ عیش مایہ کھانہ کا اٹھا  
 مددہ عیش مایہ کھانہ کا اٹھا  
 مددہ عیش مایہ کھانہ کا اٹھا

۱- حضرت علی (ع) سے جو دعوت  
تشریف آئی اس میں برا بھلا مانا

دکٹوریہ اسٹریٹ اور اعلیٰ سٹریٹ  
 جس سوگرا دروں نے سند پڑھ کر  
 بیسیں لکھ سیکوں کا انتہام ایک طرف  
 سے کیا تھا

مولانا نے سہدوں اور مسلمانوں کے  
خیر سگائیاں کہ جب بے کم مردوں کے لئے بڑا  
صعد محمد کی ناک ملک میں فرقہ دارانہ سیاست  
سرتقلد ہے۔

درمانہ صحیحاً دیتے کی علامت کے ایک  
حلیہ میں مولانا سید احمد رحمہ اللہ کی  
حدیث کو بروایت جراح عقیدت میں  
لیا گیا اور افعالِ نواب کے لئے دعا لکھی  
سیر کے متعدد ملے اور ادلی اور اولی اور

بنو نے یہ قول اس مظلوم خزان کے  
حدیثات کی عقیدت کا سرسوت خراج  
بیٹھا کیا۔ شہر کے سامنے ہی دینی ذریعہ  
ادامہ جن میں دارالکس اور کالج تک  
شامل ہیں مولانا کو خراج عقیدت پیش  
کرنے کے لئے دن بھر کھڑے ہو کر دیئے گئے

روزنامه  
صحافت

6-5-97

اللہ کے ولی حافظ محمد اقبال نے غسلِ یاس اور عارف باللہ قاری محمد صدیق نے غارِ جابرؑ میں

حضرات کو چڑھ کر حوا جبار پر تھے ہیں بیان  
اگر اعلان کو دیکھا تو مجھے سدا کا کون  
سکھائی دے گا ۔  
حزب کی محنت کو دیکھا ہے ۔  
روح واقف ہیں وہ جانے ۔  
نام محمد اعدا نام دینو  
تھی اور اگر اعلان دیکھا  
رد و جواب نام ہو اس لئے  
کسی کدول میں اس کا  
آیا اس لئے ان کے آخری عمر میں میں  
دلوں کے ان کے مزاج اور طبع کو لکھو  
رکھا اگر کسی اعلان کے بغیر تہہ اور دہ  
شہزاد کے سیکڑوں اہل تعلق شریک  
جوتے تھے میں دیر میں تھے سکڑی ہوئی  
تھے متاثر دیکھا تھے اہل علم ۔  
میں نے اور سچائی ، ہمارے  
لدا میں نے باہر سے تعلیم میں تھے اور  
تاجر میں تھے سب سے عزت میں تھے  
غیر مسلم میں تھے ان کے خاص معاملے  
میں اور سیاسی امید میں تھے لیکن میں  
کے ساتھ مولانا کو فرمیں انارکالی  
کے بیٹوں اور تینوں نے سسٹر  
ان کی ایک آراہ گاہ میں لکھی  
وہ پر سکون مصلحت اس لئے دیکھی  
دکھنا خاکہ جمع میں اکثریت  
استور جہلات کی تھی ۔ حضرت  
لکھتے تو جیہ کی گرج میں لانا لگا  
مضاحقہ کا دم و بھاندا  
بحر کم نادرۃ احوال کی گرج  
وہاں ، یا

محمد ارشاد نند اخیالی نوگانوئی

## (بر مرقد نعمانیؒ)

اٹھا سر سے ہمارے آہ ایسا ظل ربانی  
وہ جس پر ناز کرتی ہے سدا تاریخ انسانی

وہ تھا دراصل حزب اللہ کی تفسیر قرآنی  
رہاتا عمر نصب العین جس کا دیں کی سلطانی

اسی کو دیکھ کر آتی سمجھ ”دین و شریعت کی“  
کہ یہ ”اسلام کیا ہے؟“ اور کیا شئی ہے مسلمانی

(۲)

کہا خالق نے عزرائیل سے اس کو بلا لاؤ  
پسند اب آگئی جس کی مجھے ہر ایک قرآنی

مثایا جس نے جان و مال اپنا راہ میں میری  
مرا عاشق، میرا شیدا، وہی ”منظور نعمانیؒ“

ملا دیں جس نے بنیا میں جہان شرک و بدعت کی  
کچھ ایسی غیب سے اس کو ملی توفیق یزدانی  
آخری ساموں سے مدد، قہقہہ حادہ



مری خاطر مشقت پر مشقت کا وہ عادی تھا  
کبھی دیکھی نہ جس نے راہ حق میں اپنی آسانی

فنا ہو جائیں سب دل سے نقوش آلام دنیا کے  
یہاں ایسی کروں اس پر لڑائند کی فراوانی

کچھ اس انداز سے لینے نسیم خوشگوار آئی  
گھٹائیں ٹوٹ کر برسیں ہوا ماحول نورانی

فرشتوں کی قطاریں وجد میر  
چل اب پاکیزہ جنت کی طرف ابرار

عجب انداز سے ہونٹوں کا کھلنا یاد ہے اب تک  
کہ جیسے پی رہے ہوں کوثر و نسیم کا پانی

پھر اک ہچکی میں دیدی جان پیدا کرنے والے کو  
مثالی جس کی خاطر آپ نے یہ ہستی فانی

جمال و نور کی بارش نے حیراں کر دیا سب کو  
جو دیکھی بعد مرنے کے رخ انور کی تابانی

فلک پر پہنچے عزرائیل لیکر روح اقدس کو  
تور ضواں نے کہا ”قربان تم پر میری درباری“

یہ کون آیا ہے باطل سے ہزاروں بار ٹکرا کر  
فروغ کلمہ حق میں مٹا کر ہستی فانی

مچی ہے دیھوم کس کے واسطے یہ خیر مقدم کی ؟  
ہوئی جانی ہیں حورانِ جناب کیوں آج دیوانی

یہ بندہ جاہ و ثروت پر سدا ٹھوکر لگاتا تھا  
نہ کی دنیا کے تخت و تاج و سطوت کی شاخوانی

یہ ارباب سیاست سے ہمیشہ دور رہتا تھا  
نہ کرنے دی شریعت میں نہ بھی باطل کو من مانی

یہی بندہ تھا جس نے کی تھی اس فتنے کی سرکوبی  
بشکل انقلاب اٹھا تھا جو از خاک ایرانی

کیا اس نے نہ اپنا ایک پل برباد دنیا میں  
جہادِ زندگانی میں ہر اک لمحہ تھا طوفانی

اسی بندہ نے رخ موڑا تھا سیلِ قادیانی کا  
غرض ہر طرح کی باغِ محمد (ﷺ) کی نگہبانی

(۳)

یہ کیسے لٹ گئی دنیا اچانک قلبِ مضطرب کی  
نہیں جاتی، نہیں جاتی، دل محروم کی حیرانی

چھٹائیوں ساتھ اک کمرے میں بہ پل آٹھ برسوں کا  
نہ سمجھے گا کوئی بربادِ الفت کی پریشانی

بھٹکتا پھر رہا ہے کوئی اب سنسان راہوں میں  
غمِ فرقت کی سینے میں لئے ”میراثِ نعمانی“

تمہیں نے پھیر لین نظریں جو اس دنیائے فانی سے  
نظر آتی ہے اب دنیا کی ہر ایک چیز انجانی

اکیلا جان کر جب ظلمتیں مجھ پر لپکتی ہیں  
تو اشکِ خوں رلاتا ہے وہی ماحولِ نورانی

سجایا تھا جسے ذکر و تلاوت  
ہوئی کیسے گوارا آپ کو اس کھر کی ویراں؟

ابد تک اپنی محرومی پہ اشکِ خوں بہائے گی  
وہ ناداں قوم جس نے آپ کی قیمت نہ پہچانی

قلم سے آگ نکلے اور آنکھیں خون برسائیں  
نہ کم ہوگی کسی صورت یہ بحرِ غم کی طغیانی

تڑپ کر یاد کرتی ہیں فضائیں آج سنبھل کی  
سکھائی جس زمیں کو آپ نے توحیدِ بانی

بہت ویران لگتی ہے زمیں شہرِ نگاراں کی  
بچھائی تھی جہاں تم نے بساطِ بزمِ عرفانی

یہ مرکز یاد کرتا ہے، وہ مسند یاد کرتی ہے  
دیا تھا آپ نے برسوں جہاں پر درسِ قرآنی

تڑپ جاتے تھے جس کا نام سن کر آپ پل بھر میں  
مبارک ہو اب اس خلاق دو عالم کی مہمانی

پکارے گا ہر اک پل کہ اب ”ارشاد“ کہہ کہہ کر  
یہ کہتی ہے ندا، رورو کے میری چاک دامانی

وہ باتیں یاد آتی ہیں وہ لمحے یاد آتے ہیں  
ملیں شفقت بھری گودی میں جب لذات روحانی

(۴)

خداوند! دیا تھا جتنا گہرا ساتھ دنیا میں  
عطا کر خلد میں بھی ”اتنا گہرا قرب لافانی“

خدائے پاک ان کی قبر کو تو نور سے بھر دے  
بنا اس کو ریاض جنت الفردوس کا ثانی

خداوند! نہ کر محروم ان کی ”خیر و نسبت سے“  
لٹا دے ہم غریبوں پر وہی برکات روحانی

اب ان کا ساتھ ہم کو جنت الفردوس میں دے دے  
جہاں کی زندگی باقی جہاں کا سیش لافانی

☆☆☆

ڈاکٹر محمد ولی الحق انصاری

سابق صدر شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی

## تاریخ ہائے وفات حضرت منظور نعمانیؒ

حضرت منظور رخصت ہو گئے جن کی ہر اک بات میر  
 کلک کوثر ریز تھا ان کا قلم علم کا ساگر تھی ان کی پ  
 مرد کامل، نیک سیرت، نیک طبع پیکر علم و عمل قدسی صفات  
 آفتاب علم اس میں مچھپ گیا کیا تھی ۲۷ / ذی الحجہ کی رات  
 پوچھی جب تاریخ بول اٹھا ولیؒ

(نام کے اعداد) ہیں سال وفات

منظور	+	نعمانی	۱۳۱۷ھ
(۱۱۹۶)		(۲۲۱)	
آہ	منظور	نعمانی	جنت مکانی
۶	۱۱۹۹۶	۲۲۱	۳۵۳
	+		۱۲۱
			۱۹۹۷ء

جناب حکیم محمد افہام اللہ

## قطعہ تاریخ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

موت العالم موت العالم گفتہ اندائے عزیز      حیف از دار فانی شیخ نعمانی برفت  
 او محدث او مصنف او مناظر بہر دیں      کارہائے دین کردہ سوئے جنت او برفت  
 گر تو خواہی دیدن ز خائر باقیات الصالحات      ”مکتب فرقان“ برو آں ز خائر را بجست  
 من ز تی سال ہم نشینش رکن شوری دیو بند      حیف آں صاف گو صاف باطن رکن شوری برفت

سال رحلت را چوں جستم غیبی ندا شد بر غریب

عدد ہائے حروف ”منظور نعمانی“ بشفقت

۱۴۱۷ھ



زبیر احمد راہی قاسمی  
بیت الفرید سر دنج (مدھیہ پردیش)

(تاریخ وفات)

## نکتہ داں منظور نعمانی

۱۹

۹۷

(بروفات علامہ معصر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

میں رحلت ہوا ہے ان پہ ایسا فصل ربانی      مقیم جنت الفردوس ہیں منظور نعمانیؒ  
کھلے از گلشن محمود و قاسم خوشنما خوشترؒ      یکے از باقیات انور و شبیر عثمانیؒ  
بہ رتک کوثر و تسیم اندازِ بیاں اُن کا      ہے دریائے رموزِ معرفت تفسیر قرآنی  
معارف میں حدیث پاک کے وہ گل کھلائے ہیںؒ      رہے گی جس سے روشن تا قیامت شمع ایمانیؒ  
افع دین حق میں معرکے ایسے بہت آئے      پئے تسلیم باطل نے جھکائی اپنی پیشانیؒ  
اگر امدادِ غیبی تھی دمِ تحریر انھیں حاصلؒ      ادھر تقریر میں ملتی رہی تائیدِ ربانیؒ  
ت اللہ کے بندے ہیں لیکن آج دنیا میں      نہیں ملتا کوئی ”اللہ والا“ اب بآسانیؒ

ہیں چھیالیس سے ستانوے تک میں نے دیکھا ہے نظر میں ”جلوہ حق“ اور جبیں پر ”نورِ ایمانی“  
 ستانِ حسین احمد (۱) کا تھا وہ بلبُل شیدا رہی ہے محفلِ الیاس میں ان کی غزل خوانی  
 زاری عمر ساری دینِ فطرت کی حمایت میں ہیں انکی کوششیں اس باب میں بے مثل و لا مثانی  
 متیق و حضرت حسّان ہیں نگران ”الفرقان“ وراثت میں ملی ہے ان کو یہ ”میراثِ نعمانی“  
 و معصر مجید (۲) و مصطفیٰ (۳) بہر اہی طیب (۴) ہوا محروم جنگی برکتوں سے عالم فانی  
 راپے خصال مومنانہ ”عارف کامل“ عیاں انوار ایمان و یقین از لوحِ پیشانی  
 ’متممات شہود حق‘ تک جنگی رسائی تھی فقری میں بھی کی ہے اُن خدا والوں نے سلطانی  
 ’خدا رحمت کند این عاشقانِ یاک طینت را‘ زبے حب رسولِ یاک، عشق ذاتِ ربانی

ندارم باک اگر گویم بالفاظِ دگر راہی

جہاں خالی شدہ از اہل دل از مرگِ نعمانیؒ

☆ ☆ ☆

(۱) تنویرِ عام سے سب سے زیادہ مدنی قدر۔ ۹-۲ قطبِ ماوہ شیخ طریقتِ حضرت مولانا محمد امجد حیاتِ معنی سرور۔

(۲) حضرت مولانا مصطفیٰ حسن کوری۔ (۳) حضرت صہبہ الامام علامہ و قاسم مولانا محمد طیب سائق مقیم، اراعلوم، یو۔س۔

خبر وفات کی صدائے بازگشت  
اسلامی جرائد و رسائل میں

گھر اکرا لیں بھی یہ کہتا رہا ہو گا کہ ۔

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ  
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو  
ایسے بیدار مغزو ہوش مند عالم کی وفات مسلمانوں کی بد نصیبی، قوم و ملت کا زیاں اور علم  
دین کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی مراد آباد ضلع کے قصبہ سنہل میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے یہیں  
اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، دارالعلوم مئو میں بھی درسیات کی تحصیل کی اور  
آخر کے دو سال دارالعلوم دیوبند میں گزارے۔ اس وقت مولانا انور شاہ کشمیری صدر  
المدرسین اور شیخ الحدیث تھے ان سے اور دوسرے اساتذہ فن سے درس لیا۔ شاہ صاحب کے  
تلمذ پر ان کو ہمیشہ فخر رہا اور اپنے تمام اساتذہ میں انھیں سے سب سے زیادہ محبت اور عقیدت  
رکھتے تھے ان سے بیعت بھی ہوئے حضرت شاہ عبدالقادر رانی پوری سے بیعت اس کے بعد ہوئے  
تھے۔

مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد چند برس تک عربی مدارس میں تدریس کی  
خدمت انجام دی، اس زمانے میں بعض داخلی و خارجی فتنوں کا بڑا زور تھا، ان فتنوں سے اسلام کے  
عقیدہ توحید و رسالت کی بیخ کنی اور شرک و بدعت کے فروغ کے علاوہ علمائے دیوبند کی ذات  
و مسلک بھی مجروح ہو رہا تھا، اس لئے مولانا طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کی سرکوبی کی  
تیاری کرنے لگے تھے اور اب تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی انکے خلاف محاذ آرائی میں حصہ  
لینا شروع کیا، چنانچہ ان کی ابتدائی زندگی بعض فرقوں کے مقابلوں اور ان سے مناظروں کے لئے  
وقف رہی اور اسمیں وہ بڑے کامیاب رہے۔ اسی سلسلے میں انھیں اپنے مخالفوں کے نظریات کے  
ابطال کے لئے ایک علمی و دینی ماہنامہ رسالہ نکالنے کا خیال بھی آیا جو محرم ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء  
سے اب تک ان کے انتقال کے بعد بھی الفرقان کے نام سے برابر شائع ہو رہا ہے اور وہ ملک کا  
مشہور علمی، دینی اور اصلاحی رسالہ خیال کیا جاتا ہے۔

مولانا کی یہ جرأت و ہمت بھی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے شروع میں رسالہ ایسی جگہ  
سے شائع کیا جو ان کے حریفوں کا خاص مرکز تھی۔ ان کی مہم جو اور حوصلہ پسند طبیعت کو ہمیشہ اپنی  
سرگرمی عمل کے لئے نئے میدانوں اور خوب سے خوب تر راہوں کی تلاش و جستجو رہتی تھی، عمر  
کی پختگی اور بعض تجربوں کے بعد جب وہ مولانا محمد الیاس کا ندھلوی کی دینی تحریک سے متوسل

ہو گئے تو مسلمانوں کی اصلاح کے اس محدود تصور پر قانع نہیں رہ سکے جس کی بنا پر بعض طبقوں کی اعتقادی و عملی غلطیوں کی بحث و تحقیص کا اور ان کی افراط و تفریط کی تعلیط و تردید الفرقان کا خاص موضوع بن گیا تھا بلکہ یہی دینی دعوت ان کے دل و دماغ پر چھا گئی اور وہ ان کی زندگی اور ان کے اعمال کا خاص محور اور الفرقان کی اصل دعوت بن گئی۔

الفرقان کے متعدد خاص نمبر بھی شائع ہوئے جو بہت مقبول ہوئے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ پر اس کے خاص نمبر بڑی اہمیت و منفعت کے حامل تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں اور عظیم داعیوں کا کارناموں اور ان کی دعوت و تعلیم کو جس بہتر انداز میں ان میں پیش کیا گیا۔ اور صاحب الفرقان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کے حج نمبر سے حاجیوں کو

تبلیغی و دعوتی اسفار اور الفرقان کی ادارت کے ساتھ ساتھ مولانا ہمیشہ سبیل میں بھی مشغول رہتے جس کا انھیں اچھا ذوق، خاص سلیقہ اور خداداد ملکہ تھا، وہ اردو کے بہت اچھے اہل قلم تھے۔ ان کی تحریریں نہایت سلیس، شگفتہ اور رواں ہوتی تھیں۔ جن کی زبان آسان اور بڑی عام فہم ہوتی اور پیش کرنے کا انداز اتنا مؤثر اور دل نشیں ہوتا تھا کہ عام آدمی کو بھی ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے اس پر ان کی مکمل گرفت ہوتی تھی، اسلئے اپنے مدعا و مقصود کو کسی ایچ بیج کے بغیر اچھی طرح واضح کر دیتے تھے۔

مولانا کی چھوٹی بڑی بے شمار تصنیفات ہیں اور وہ سب اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے درجنوں ایڈیشن بھی نکلے اور ملک کی مختلف زبانوں کے علاوہ انگریزی اور عربی وغیرہ میں ترجمے بھی ہوئے، ان کی جن کتابوں کا فیض بہت عام ہوا ان کا تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا۔

اسلام کیا ہے؟

یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے بعد کے خاص حالات میں لکھی گئی ہے اس میں ایک عام مسلمان کیلئے مکمل دین کو آسان اور مؤثر دعوتی زبان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ رسالہ مسلمانوں کے لئے رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنے اور غیر مسلموں میں بھی اسلام کی اصل صورت واضح ہو جائے۔

دین و شریعت

اس کا موضوع بھی وہی ہے مگر یہ کسی قدر ادنیٰ سطح کے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے

## قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

اس میں قرآن مجید کی عمومی دعوت کا خلاصہ بڑے موثر اور دل نشیں انداز اور آسان و عام فہم زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔

## آپ حج کیسے کریں؟

اس کو لکھنے کے دو خاص مقصد تھے، ایک تو یہ کہ معمولی خواندہ آدمی کو بھی حج کے مناسک و ارکان ادا کرنے میں سہولت ہو، دوسرا مقصد یہ تھا کہ حج کے اعمال کو ادا کرنے کے وقت جن دینی جذبات سے حاجی سرشار ہونا چاہئے ان کی تحریک کا سامان کیا جائے۔ ان مقاصد کے لحاظ سے یہ کتاب بہت کامیاب ہوئی۔

## آسان حج

اس میں وہی مضمون مزید مختصر اور آسان کر کے لکھا گیا ہے، راقم کو حج بیت اللہ کے سلسلے میں مولانا کے ان رسالوں سے بڑا فائدہ پہنچا۔

## کلمہ طیبہ کی حقیقت

اس میں کلمہ کی حقیقت و مفہوم بہت سادہ اور آسان زبان اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

## نماز کی حقیقت

اس میں آسان زبان اور دل نشیں انداز میں نماز کی روح بتائی گئی ہے، یہ رسالہ بھی بہت نفع بخش ہے۔

## معارف الحدیث

یہ مولانا کی سب سے اہم اور مفید کتاب ہے جو اردو کی علمی و حدیثی ذخیرہ میں ایک بہت قیمتی اضافہ ہے، اس کو بڑی شہرت و قبولیت نصیب ہوئی اس کی سات جلدیں خود مولانا نے مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ آٹھویں جلد ان کے برادر زادہ مولوی محمد زکریا استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مرتب کر رہے ہیں۔ یہ کتاب دور حاضر کے خاص حالات اور ایک عام پڑھے لکھے شخص کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، یہ دراصل حدیث نبوی کے ضخیم

دفتر سے ایک انتخاب ہے جو ترجمے کے ساتھ ایسی سادہ اور مختصر تشریح پر مبنی ہے جس سے حدیث کا اصل مغز و مدعا اچھی طرح ذہن نشیں ہو جاتا ہے اور یہ کتاب انسان کی عملی و روحانی ترقی و اصلاح کا ذریعہ بھی بن گئی ہے، گو اس میں فنی مسائل اور مہمات امور سے براہ راست تعرض نہیں کیا گیا ہے، تاہم اس سے احادیث کی بہت سی علمی و فنی گریں صاف طور پر حل ہو گئی ہیں، حدیثوں کے فقہی پہلو اور فقہاء کے اختلافات کا تذکرہ بقدر ضرورت اس طرح کیا گیا ہے کہ افتراق باہمی کے رجحان کی ہمت شکنی ہو، اس لحاظ سے یہ کتاب اہل علم اور طلبہ حد لئے بھی بہت کار آمد ہے۔

ان کتابوں سے مسلمانوں کو بڑی رہنمائی اور تقویت ملی اور ان کی حیثیت جاریہ کی ہے۔

مولانا کا شمار اس عہد کے ممتاز اور صف اول کے علماء میں ہوتا تھا، دینی - رسولی اور پختگی حاصل تھی۔ تفسیر، فقہ، کلام اور کتب معقولات پر انکی وسیع اور گہرا تھی۔ لیکن حدیث سے ان کو زیادہ شغف اور مناسبت تھی جسکی تحصیل ہندوستان کے مشہور اور نابذ روزگار محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے کی تھی اور کئی برس تک خود بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کا درس دیا، ان کی کتاب معارف الحدیث بھی حدیث میں ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔

کم لوگوں کو تحریر و تقریر دونوں پر قدرت ہوتی ہے مگر مولانا کو تقریر کی بھی اچھی مشق تھی، مناظروں میں ان کی کامیابی میں اسکو بھی بڑا دخل تھا۔ تبلیغی جماعت کے اجتماعات اور دوسری ملی دینی تحریکوں میں بھی وہ اپنی تقریروں کی اثر انگیزی اور دلپذیری کے بناء پر مدعو کئے جاتے تھے، آخر میں وہ مختصر تقریریں کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ راقم کو ایک مرتبہ انجمن تعلیمات دین کے جلسے میں انکی تقریر سننے کا اتفاق ہوا جو مختصر ہونے کے باوجود واضح، مدلل اور دل نشیں تھی۔

مولانا قوم، ملک اور ملت کے مسائل سے کبھی بے تعلق اور بیگانہ نہیں رہے تقسیم کے بعد مسلمانوں کو جس بحر ان اور پیچیدگی کا سامنا کرنا اور آئے دن جن نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان کے حل کے لئے جو مخلصانہ کوششیں اور تدبیریں ہوئیں ان میں انکا بھی بڑا عمل و دخل رہا۔ ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کا قیام عمل میں آیا تو جو علماء ان میں پیش پیش رہے اور اس کے لئے مختلف جگہوں کے انھوں نے دورے کئے ان میں یہ بھی تھے اور آخر تک اس سے انکا

گہرا تعلق رہا۔

اسی زمانے میں انھوں نے اپنے بعض رفقاء کے تعاون سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا تاکہ آئے دن فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو مایوسی، انتشار پست ہمتی اور احساس کمتری پیدا ہو رہا تھا، اسے ختم کر کے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے، ہفت روزہ ندائے ملت کا اجراء اسی احساس کا نتیجہ تھا جس نے بڑی حد تک مسلمانوں کو قوت، جرأت، اور ہمت عطا کی، اب بھی یہ اخبار ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی سرکردگی میں نکل رہا ہے اور مفید خدمت انجام دے رہا ہے

۱۹۶۴ء میں جمشید پور اور راوڑکیلا وغیرہ کے فسادات نے ملت کے درد مندوں کو گہری تشویش اور سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا، اسی کے نتیجے میں ڈاکٹر سید محمود کی رہنمائی میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی۔ اس کے قیام میں مولانا منظور صاحب کا بھی مکمل تعاون رہا اور اس کے وفد میں شامل ہو کر انھوں نے بھی ملک کے اکثر مقامات کا دورہ کیا جس سے بڑی اچھی فضا بنی مگر بد قسمتی سے یہ اتحاد بہت عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹر سید محمود بہت ملول و متفکر ہوئے، ایک مرتبہ انھوں نے اس صورت حال کا درد و حسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے بعض حضرات کے رویہ کی شکایت کی مگر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی سیاسی بصیرت، اصابت رائے اور معاملہ فہمی کا اعتراف کیا۔

۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل میں بھی وہ شریک رہے اور اس کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور اپنی تحریروں اور الفرقان کے ذریعہ اس تحریک میں جان و قوت پیدا کی۔

مولانا حالات حاضرہ اور گرد و پیش کے واقعات سے پوری طرح باخبر رہتے، اخباروں کا مطالعہ پابندی سے کرتے سیاسی اشخاص اور ملی رہنماؤں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی ان کے یہاں رہتا۔ وہ مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے لئے انگریزی اخبار کی اشاعت ضروری سمجھتے تھے اور اس کے لئے اپنی جیسی کوشش بھی کی مگر ابھی تک یہ نیل منڈھے نہیں چڑھی۔

مولانا ہندوستان کے دو سب سے بڑے اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن رکیں تھے اور بعض نازک موقعوں پر ان کی خدا داد ذہانت و صلاحیت اور بروقت قوت فیصلہ سے ان تعلیم گاہوں کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں بڑی مدد ملی۔ وہ رابطہ عالم اسلامی کے بھی ممبر تھے اور جب تک ان کی صحت اچھی رہی اس کے جلسوں



میں پابندی سے شریک ہوتے اور اسی بہانے حج و عمرہ اور زیارت حرمین کا ثواب بھی لوٹتے رہے۔ دارالمصنفین سے بھی مولانا کا تعلق تھا، مولانا سید سلیمان ندوی سے بعض مسائل میں استفسارات کرتے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم سے بھی ان کا مخلصانہ ربط و تعلق تھا، اس کے موجودہ صدر محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تو وہ ”رفیق مکرّم“ ہی تھے۔ الفرقان میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ پر اپنا خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا تو اس خاکسار نے بھی حضرت سے عقیدت کی بنا پر ایک مضمون اس میں اشاعت کے لئے بھیجا جس کی وصولی کی رسید فوراً دیتے ہوئے مولانا نعمانیؒ کی تحسین فرمائی جو میرے لئے سرمایہ فخر ہے۔

مولانا نے بڑی مصروف و مشغول زندگی گزاری، وہ مدّة العمر دین و سر بلندی اور مسلمانان ہند کی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے، مولانا سیرت اور خوش خلقی سے متصف تھے، طبیعت میں درد مندی اور قلب میں رستہ افسانہ تھے اس لئے واقعات و حالات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے، دینی مسائل میں ان کا ذہن کھلا ہوا تھا، جزئیات میں متوسّع تھے، شرعی امور میں تشدد و تصلب کے بجائے، سہولت، تخفیف و عافیت پیدا کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔

اس دور کے اکثر اکابر علماء و مشائخ سے ان کے تعلقات تھے اور وہ بالالتزام ان کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ ان کی سبق آموز زندگی کے واقعات و حالات سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور انھیں قلم بند کر کے دوسروں کو بھی ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ اس ضمن میں ان کی یہ خوبی قابل ذکر ہے کہ جن اکابر کی وہ بڑی عزت اور خاص احترام کرتے تھے ان کی کمزوریوں اور کمیوں پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی اور کسی نہ کسی پیرائے میں بے جھجک وہ اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے، اس طرح یا تو وہ بزرگ اپنی کمی کو تاہی کی اصلاح و تلافی فرمالیتے یا اگر خود مولانا کو کسی وجہ سے غلط فہمی ہو گئی ہوتی تو وہ دور ہو جاتی اور ان کی تسلی و تشفی کا سامان ہو جاتا۔

مولانا کی سیرت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جس کام کو ٹھیک اور بہتر سمجھتے تھے اس میں تن من دھن سے لگ جاتے لیکن جیسے ہی اس کی غلطی ان پر متکشف ہو جاتی وہ اس سے فوراً اور بے تکلف کنارہ کش ہو جاتے، اس میں نہ انھیں اپنی سبکی کی پروا ہوتی اور نہ اپنے قدیم رفیقوں اور دوستوں کی خفگی کا خیال ہوتا، پچھلے دس برسوں سے وہ علیل تھے، بالآخر وقت موعود آگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر و حکیم عطا کرے۔ آمین

ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند

مولانا حبیب الرحمن قاسمی

## جوابادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

ملک و بیرون ملک کے علمی و دینی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی گئی ہوگی کہ عالمی شہرت کے حامل نامور مصنف اور تبحر عالم دین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ۲۶/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ، ۳۱ مئی ۱۹۹۷ء کو بوقت ۸ بجے شب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ، اللہم اعمر لہ وارحمہ واعف عہ ، و اکرم برلہ ووسع مدخلہ و ابرل علی روحہ و حسدہ شایب رحمتک واحعلہ من عبادک المقربین۔ آمین  
یا ارحم الراحمین۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ عصر حاضر کی ان ممتاز ہستیوں میں سے تھے جن کی زندگی ایک مستقل تاریخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی و عملی انحطاط کے اس دور میں جب کہ جانے والا اپنا کوئی بدل چھوڑ کر نہیں جاتا موصوف کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس پر اظہار کرب و الم کے تمام الفاظ بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ صرف مولانا مرحوم کے اعزہ کا نہیں پورے ملک کا، بڑے صغیر کا بلکہ پورے عالم اسلام کا حادثہ ہے۔

مولانا نعمانی قدس سرہ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت عہد کی دلکش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہند، حضرت حکیم الامت، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی، حضرت محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری، وغیرہ علم و عمل کے مجسم پیکروں کے جلوہ جہاں آرا کو دیکھا تھا اور ان میں سے اکثر کے علمی و عملی حسنات و برکات سے براہ راست استفادہ کیا تھا۔

ان کے رگ و پے میں یہ یقین پیوست تھا کہ اکابر علماء دیوبند اس عہد میں ”مانا علیہ و

اصحابی کی عملی تفسیر تھے اور ان کا فہم دین اس دور میں خیر القرون کے مزاج و ذوق سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اسی لئے وہ اکابر دیوبند رحمہم اللہ کے علم و عمل اور فکر و نظر کے مظہر اتم اور امین و نقیب تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم کے لئے داخلہ کو ”باب رحمت“ میں داخلہ سے تعبیر کرتے تھے۔ دارالعلوم اور اس کے اکابر سے ان کی وابستگی و گرویدگی عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ دارالعلوم کی خدمت کو ایک دینی و ملی فریضہ تصور کرتے تھے اور جس بات کو وہ دارالعلوم کے حق میں مفید و بہتر باور کرتے تھے اس کے اظہار و بروئے کار لانے میں اپنے و پرانے کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔

### ولادت اور دور تعلیم و تحصیل

مولد، موصوف ۱۸ شوال ۱۳۲۳ھ کو اپنے آبائی وطن سنہیل ضلع مرہا

ایسے خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے جس میں دینداری بھی تھی۔ چنانچہ مولا کتاب تحدیث نعمت میں لکھتے ہیں۔

”سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے جس احسان عظیم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جس میں دنیوی معیشت کے لحاظ سے خوشحالی کے ساتھ اس کی توفیق سے دینداری اور خدا ترسی بھی تھی۔ میرے والد صوفی احمد حسین صاحب مرحوم ایک متوسط درجے کے دولت مند تھے، زمینداری بھی اچھی خاصی تھی اور تجارتی کاروبار بھی خاصا وسیع تھا، اسی کے ساتھ ان کی آخرت کی فکر دنیا کی فکر پر غالب تھی اور وہ کاروبار میں مشغولی کے ساتھ ”الدا کریں اللہ کثیراً“ میں سے تھے“ (ص ۲۱-۲۲)

ابتدائی تعلیم اپنے وطن سنہیل کے مختلف مدارس میں مختلف اساتذہ سے حاصل کی جن میں مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم خود لکھتے ہیں۔

”۱۳۳۸ھ کی بات ہے جبکہ میری عمر پندرہ سال ہو گئی تھی والد صاحب کو معلوم ہوا کہ شہر کے فلاں مدرسے میں ایک نئے پنجابی استاذ آئے ہیں، اور وہ بہت توجہ سے پڑھاتے ہیں۔ والد صاحب نے مجھے ان کے پاس بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے، اللہ ان کو بہترین جزاء دے، ان کی بدولت میری گاڑی اب پہلے دن سے پڑی پر پڑ گئی اور بد شوقی اور بے دلی دور ہو گئی۔ ذہن اور حافظہ بھی اللہ نے بہت اچھا دیا تھا۔ اس لیے طالب علمی کے سفر کا بہت بڑا حصہ تیزی سے طے کر لیا۔“ (ص: ۲۳)

متوسطات اور فنون کی اکثر کتابیں اپنے وطن کے مشہور صاحب درس عالم حضرت

مولانا کریم بخش سنبھلی سے مدرسہ عبد الرب دہلی اور دارالعلوم مؤصلع اعظم گڑھ میں پڑھیں۔ دارالعلوم مؤصلع میں بعض کتابیں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب محدث اعظمی اور حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی سے بھی پڑھیں، پھر تکمیل کے لیے شوال ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوئے اور دو سال یہاں رہ کر فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم دین کی تحصیل و تکمیل کی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

”بہر حال میرے طالب علمی کا سفر بہت ہی تیزی سے طے ہوتا ہوا اس منزل پر آگیا کہ توفیق الہی سے ۱۳۴۳ھ میں علوم دین، فقہ اور حدیث کی آخری اور تکمیل تعلیم کے لیے مجھے دارالعلوم دیوبند جانا نصیب ہو گیا جو ہندوستان ہی میں نہیں پورے عالم اسلام میں اس وقت ان علوم کی تدریس و تعلیم کا عظیم ترین مرکز تھا اور جہاں ان علوم کے وہ ماہر اساتذہ جمع تھے جو اپنے فن میں امتیاز و کمال رکھتے تھے اور ساتھ ہی صلاح و تقویٰ میں اسلاف کا نمونہ تھے“

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں

”یہ داخلہ میرے لیے تو باب رحمت کا داخلہ تھا ہی، میرے والد کے لیے بھی اس کے ذریعہ اہل حق سے عقیدت و تعلق اور اصلاح عقائد کا راستہ کھل گیا۔“

دارالعلوم دیوبند میں مولانا مرحوم نے پہلے سال مشکوٰۃ شریف، ہدایہ آخرین وغیرہ وہ کتابیں پڑھیں جن کا دورہ حدیث سے پہلے پڑھنا ضروری ہے اور دوسرے سال دورہ حدیث کی تکمیل کر کے شعبان ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے، اسی دوران خارج اوقات میں حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ سے معقول کی اہم ترین کتاب ”شرح اشارات طوسی“ کا ایک معتد بہ حصہ پڑھا، آپ کے دارالعلوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، حضرت مولانا سراج احمد رشیدی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب امر دہوی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی (اجازۃ) حضرت محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت محدث کشمیری قدس سرہ سے آپ کو خصوصی عقیدت و محبت تھی اور ان کے علم و عمل سے بے حد متاثر تھے۔

چنانچہ تحدیثِ نعمت میں لکھتے ہیں:

”دوسرے سال یہ عاجز دورہ حدیث میں شریک ہوا۔ یوں تو اس وقت دارالعلوم کے سبھی بڑے اساتذہ باکمال، اپنے اپنے فن کے امام اور صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ میں بھی صاحب مقام تھے۔ لیکن ان میں صدر المدرسین شیخ الحدیث استاذنا العلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا خاص الخاص مقام تھا جنہوں نے نہیں دیکھا وہ غالباً یہ تصور بھی نہ کر سکیں گے کہ چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں اس شان کا کوئی قبھر عالم ہو سکتا ہے جن اصحاب نظر نے حضرت مدوح کو کچھ مدت تک قریب سے دیکھا ہے ان سب کا احساس یہی ہو گا کہ علوم دین کے بحرِ خار اور ورع و تقویٰ کے لحاظ سے ان خاصانِ خدا میں سے تھے جن کی منکرات و معصیات سے حفاظت فرمائی جاتی ہے۔ صورت بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی حسین معصومانہ بنائی تھی کہ دیکھنے والا بے ساختہ کہہ اٹھے۔ ان ھذا لا ملک کریم“۔

(ص ۳۳-۳۴)

اسی حسنِ عقیدت کی بنا پر امتحان سے فارغ ہوتے ہی حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست نہیں بلکہ نیازِ مندانہ اصرار کیا جسے حضرت شاہ صاحب نے خلافِ عادت قبول فرمایا اور توبہ کی تلقین اور تسبیحات و شغلِ پاسِ انفاس کی تعلیم فرمائی۔ مولانا مرحوم نے اپنے تعلیمی دور کی بہت ساری تفصیلات ایک رسالہ ”میری طالب علمی“ میں جمع کر دی ہیں جو مکتبہ الفرقان سے شائع ہو چکا ہے۔ طلبہ و علماء کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

دورِ عمل

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد اپنے وطن مدرسہ محمدیہ سنبھل سے درس و تدریس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد یہاں سے مدرسہ چلہ امر وہہ چلے گئے اور تقریباً تین سال تک وہاں بھی تدریسی مشغلہ جاری رہا۔ لیکن ملک کے حالات اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اس قدر تشویشناک تھے کہ ان حالات میں مولانا مرحوم جیسے حساس اور دعوت و تبلیغ کا ذوق و مزاج رکھنے والے کے لیے مدرسہ کی چہار دیواری میں محصور ہو کر صرف درس و تدریس پر قناعت کر لینا مشکل تھا اس لیے وہ تعلیمی و تدریسی مشغلہ کو تا دیر قائم نہ رکھ سکے۔

اس وقت کے حالات کا تذکرہ خود مرحوم کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

”یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام کو چند شدید قسم کے فتنوں سے سابقہ تھا جن میں بعض داخلی تھے اور بعض خارجی۔ خارجی فتنہ آریہ سماج کی شدھی سنگٹھن تحریک کا تھا۔ داخلی فتنوں میں ایک طرف قادیانیت کی یلغار تھی۔ ہر طرف ان کے مناظر اور مبلغ پھیل رہے تھے اور امت کے عقیدہ ختم نبوت کی جڑیں کھودنا چاہتے تھے اور دوسری طرف بریلوی مکتب شرک و بدعت نے سر اٹھا رکھا تھا۔ ہمارا ضلع مراد آباد اس زمانے میں بریلوی فرقے کے مشہور زعمیم درہنما مولوی نعیم الدین صاحب کی وجہ سے اس فتنے کا خاص مرکز تھا۔ گلی کو چھ بلکہ گھر گھر یہی چہ چاہتا۔“

چنانچہ ان فتنوں کے مقابلہ کے لئے مولانا مرحوم میدان عمل میں نکل نہیں بلکہ کود پڑے اور بالخصوص بریلوی فرقے کا ایسا کامیاب تعاقب کیا کہ اس فرقہ کے بڑے بڑے جفاوری مولانا موصوف کا نام سن کر گھبرا جاتے تھے اور جلسہ مناظرہ میں آنے سے پہلے ان کے دل تھرا جاتے تھے۔

اس زبانی بحث و مناظرہ کے ساتھ یہ ضرورت سمجھی گئی کہ اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے ایک رسالہ بھی جاری کیا جائے تاکہ دین خالص اور سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو آواز مولانا بلند کر رہے ہیں اسے ملک کے ہر گوشے میں مزید مؤثر انداز میں پہنچایا جائے۔ ”الفرقان کا اجراء“ کے تحت مولانا خود رقم طراز ہیں

”ماہنامہ الفرقان“ جس کی اشاعت کا اس وقت (رمضان ۱۴۱۳ھ) باسٹھواں سال چل رہا ہے اس کا اجراء بھی فی الواقع احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے اس عاجز بندے کے فکر و عمل کی ایک کڑی تھی۔ اس دور میں بار بار تقاضا ہوتا رہا تھا کہ ایک ماہنامہ جاری کیا جائے لیکن ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر اور مقدر ہے اس کے لئے عملی شکل نہیں بن پاتی تھی حتیٰ کہ وہ وقت مقرر آگیا اور ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ میں استخارہ مسنونہ کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ انشاء اللہ محرم ۱۳۵۳ھ سے ایک ماہنامہ الفرقان نامی بریلی سے جاری ہوگا۔“ (ص ۳۹)

الفرقان کے اجراء اور پھر اس کی بقاء کے لئے مولانا موصوف نے کس قدر مشکلات برداشت کیں اور انتھک محنتیں کیں وہ بجائے خود ان کی زندگی کا ایک محیر العقول باب ہے۔ جس سے ان کی اولوالعزمی، رائے کی پختگی اور جہد و عزیمت کا پتہ چلتا ہے۔ الفرقان نے رد بریلویت

کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ برصغیر کے جراندورسائل کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں اور آج بھی اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے اس زمانہ کے الفرقان کے شمارے اہم ترین مآخذ و مصادر کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے صرف نظر کر کے اس موضوع کو مکمل نہیں کیا جاسکتا۔

اسی دور میں الفرقان کے دو خصوصی نمبر بھی منصفہ شہود پر آئے۔ ایک ”مجدد الف ثانی نمبر“ اور دوسرا ”شاہ ولی اللہ نمبر“ یہ دونوں خصوصی شمارے بھی اپنی افادیت و جامعیت کے لحاظ سے علمی و تحقیقی دنیا میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ ان دونوں شماروں میں حضرت ثانی اور حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ کے فکر و عمل، نظریات و تعلیمات اور ان خدمات کا ایسا جامع و مستند تعارف آگیا ہے جس سے عام تذکروں کا دامن خالی ہے۔ خصوصی نمبروں کی ترتیب و اشاعت بھی مولانا مرحوم کا ایک قابل فخر علمی کارنامہ۔

زندگی کا ایک اور رخ

دین حق کی دعوت و اشاعت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی جذبہ کی بنا پر انہوں نے مدرسہ کی یک گونہ یکسو زندگی کو خیر باد کہہ کر تقریر و تحریر اور بحث و مناظرہ کی وادی ہنگامہ خیز میں قدم رکھا تھا۔ اسی جذبہ خیر سے مغلوب ہو کر ایک زمانہ میں وہ مولانا مودودی صاحب سے بھی متاثر ہو گئے اور یہ تاثر آہستہ آہستہ اتنا بڑھا کہ وہ نہ صرف ان کے ہم سفر بن گئے بلکہ ان کی جماعت اسلامی کی تشکیل و تنظیم میں بنیادی کردار ادا کیا وہ خود لکھتے ہیں

”اس جماعت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں، میں مودودی صاحب سے بھی کچھ آگے ہی تھا۔ نیز لوگوں کو بڑی قوت سے اس کی طرف دعوت دی تھی اور اعتراضات کے مقابلے میں اس کی بھرپور مدافعت کی تھی“ (ص ۷۹)

لیکن ان کا علم صحیح و فہم سلیم فکر و نظر کی اس لغزش کو زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا اور وہ جلد ہی ہی اس راستہ سے الٹے پاؤں واپس ہو گئے جس کی مکمل روداد ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت“ کے نام سے مرتب کر کے شائع بھی کر دی۔

اس کے بعد وہ اپنے اسی جذبہ دعوت و تبلیغ کے تحت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ سے وابستہ ہو گئے اور ان کی قائم کردہ جماعت تبلیغ کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں گھوم پھر کر دین حق کی دعوت و اشاعت میں نمایاں

حصہ لیا اور جب تک پیروں سے معذور نہیں ہو گئے عملی طور پر تن دہی اور مستعدی کے ساتھ اس کام میں لگے رہے۔

اور اسی کے ساتھ اس وقت کے مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری سے تجدید بیعت کر کے سلوک و احسان کی منزلیں بھی طے کر لیں اور حضرت رائے پوری کی جانب سے اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔  
مولانا موصوف نے دین کے اس شعبہ کی راہ سے بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔  
لکھنؤ اور اسکے قرب و جوار کے اصلاح کے بہت سے لوگ مولانا سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے۔

## تصنیف و تالیف

مولانا کا تعلق اگرچہ درس و تدریس سے کم ہی رہا لیکن ان کی علمی استعداد نہایت پختہ اور ٹھوس تھی اور ان کا مطالعہ بہت وسیع و عمیق تھا اس لئے ان کا علم مستحضر تھا اور علمی مسائل پر اس طرح تفصیلی و محققانہ گفتگو کرتے تھے گویا ابھی انہوں نے اس موضوع پر تیاری کی ہے۔  
مولانا نے دینی موضوعات پر جو کتابیں تحریر فرمائی ہیں ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا علم کس قدر پختہ اور ہمہ گیر تھا۔ وہ بڑے سے بڑے اہم اور دقیق علمی مسائل کو اس طرح سادہ، سلیس عام فہم اور شگفتہ عبارت میں سمجھا دیتے ہیں کہ قاری کو ان کی دقت کا احساس تک نہیں ہوتا بالخصوص اپنی مشہور سات جلدوں میں پھیلی ضخیم تالیف معارف الحدیث میں احادیث کے انتخاب اور پھر ان کی توضیح و تشریح میں جس ژرف نگاہی اور لطافت فہم کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی وسعت علم اور مہارت فن کا ایک بین ثبوت ہے۔

مولانا نعمانی علیہ الرحمہ نے مختلف علمی و دینی موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریبا ڈھائی درجن کتابیں لکھیں جن میں معارف الحدیث، اسلام کیا ہے؟، دین و شریعت، ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت، شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا کی ان ساری کتابوں کی زبان نہایت شگفتہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اس لئے عام و خاص ہر حلقے میں مقبول ہیں۔ مولانا مرحوم کی تحریر کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کی اثر انگیزی ہے۔ ان کی گفتگو بھی نہایت مؤثر ہوتی تھی لیکن تقریر کے مقابلہ میں ان کی تحریر زیادہ پرکشش اور مؤثر ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے اس کا تعلق محض الفاظ و بیان سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے تھا۔ اور تاثیر کی یہ قوت زبان و بیان پر قدرت کی رہنما منت نہیں بلکہ یہ انکے اخلاص اور سوز و دروں کی کرشمہ سازی ہے۔



## دارالعلوم دیوبند اور دیگر اداروں سے مولانا کے روابط

دارالعلوم سے مولانا کا ایک تعلق تو تحصیل و تعلیم کا تھا جس کا ذکر گذر چکا ہے دوسرا ضابطہ کا تعلق تعلیم سے فراغت کے اٹھارہ سال بعد ۱۳۶۳ھ میں مجلس شوریٰ کی رکنیت کی شکل میں قائم ہوا جو زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد قدس سرہ، حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی شاہجہاں پوری وغیرہ اساطین علم اور ارباب ورع و تقویٰ کی موجودگی میں یہ انتخاب بتا رہا ہے کہ مولانا نعمانی قدس سرہ کے علم، فہم اور دیانت و امانت پر حضرات اکابر کو پورا پورا اعتماد تھا۔ اور اس اعتماد کو مولانا مرحوم مجروح ہونے نہیں دیا اور مشکل سے مشکل تر حالات میں بھی انھوں نے اپنے شعور حد تک کسی بھی معاملہ میں دارالعلوم کے مفاد پر کسی چیز کو مقدم نہ ہونے دیا۔  
مولانا مرحوم کے مشورے اور رائے کو مجلس شوریٰ کے ارکان اہمیت دیتے تھے۔

اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں جو ہنگامہ رونما ہوا اس موقع پر مولانا مرحوم کے اعتماد ہی پر اکثر ارکان شوریٰ انکے ساتھ رہے اور مولانا کے فیصلوں کی بھرپور تائید و حمایت کی۔  
دارالعلوم دیوبند کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ لکھنؤ اور دیگر بہت سارے مدارس دینیہ کے رکن اور سرپرست اور نگران رہے۔ رابطہ عالم اسلامی سعودی عرب کے بھی رکن رکن تھے اور جب تک سفر کے لائق رہے اس کے اجلاس میں شرکت بھی کرتے تھے۔  
ان علمی و ملی اداروں کے علاوہ مسلم مجلس مشاورت سے بھی مولانا کا بنیادی تعلق تھا۔ اور اس کی تشکیل و تاسیس کی جدوجہد میں براہ راست شریک رہے۔ چنانچہ اس مجلس کے قیام کے تحت لکھتے ہیں

”اس مجلس کا بنیادی تخیل ایک پرانے نیشنلسٹ لیڈر ڈاکٹر سید محمود کی طرف سے ان دنوں سامنے

آیا جبکہ جنوری ۱۹۶۳ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ تین صوبوں میں پھیلی ہوئی چار سو میل کی پٹی میں اس درجے کا بھیک مسلم کش فساد ہوا کہ جس کا کوئی تصور انسانوں کی ہستی میں نہیں کیا جاسکتا ڈاکٹر صاحب کا تخیل سامنے آیا تو دل نے اسے قبول کیا، یہ نہایت تعمیری ہونے کے ساتھ ایک انقلابی تخیل بھی تھا۔ دل و دماغ نے جب اس سے اتفاق کیا تو اپنی افتاد طبع کے مطابق اسے اوڑھ ہی لیا اور شعور کی حد تک آخرت کے اجر و ثواب کی امید میں اوڑھا۔“ (ص ۹۳)

لیکن بعد میں اس مجلس سے وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں جو اس کے ابتدائے قیام میں

قائم کی گئی تھیں اور تجربے نے بتادیا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں کوئی خالص مسلم سیاسی تنظیم ہمارے لیے ہو سکتی (۱)۔ پھر اس کے لیڈروں نے بھی اجتماعی کاموں میں جس صلاحیت اور کردار کی بلندی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا مظاہرہ نہیں کیا تو مولانا اس سے دل برداشتہ ہو گئے اور اپنے آپ کو اس سے بے تعلق کر لیا۔

ابتداء میں مولانا جمیعۃ علماء ہند سے بھی وابستہ رہے اور اپنے احوال و ظروف کے اعتبار سے جمیعۃ کے کاموں میں عملی حصہ بھی لیتے رہے۔ لیکن بعد میں وہ اپنے تقریری و تحریری کاموں میں اس طرح منہمک ہو گئے کہ جمیعۃ سے یہ وابستگی باقی نہ رہ سکی البتہ جمیعۃ کے اکابر سے گہرے تعلقات ہمیشہ استوار رہے۔

انفرادی اور ذاتی طور پر مولانا مرحوم کے جن شخصیتوں سے گہرے روابط اور تعلقات تھے ان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی دامت برکاتہم سر فہرست ہیں اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی بھی مولانا مرحوم پر بھرپور اعتماد کرتے تھے اور ان کے مشوروں کو بڑے اہمیت دیتے تھے۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب دامت برکاتہم پر بھی مولانا مرحوم کو بہت زیادہ اعتماد تھا اور ان کے فہم، تدبیر، سمجھ بوجھ اور ورع و پرہیزگاری کے بڑے معترف تھے۔ حضرت مہتمم صاحب کا مدارس کے انتظام و انصرام سے بظاہر کوئی عملی تعلق نہیں تھا اس کے باوجود مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے ان کے ذاتی اوصاف و کمالات کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کے لئے مجلس شوریٰ کے ارکان میں سے انہیں کا نام پیش فرمایا۔ مولانا کی اس تجویز پر دارالعلوم دیوبند کے بعض قدیم اور بڑے اساتذہ نے دور ان گفتگو خود بندہ سے اظہار حیرت کیا لیکن واقعات یہ بتاتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی یہ تجویز کس قدر درست تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد مجلس شوریٰ کی نگرانی اور حضرت مہتمم صاحب کے انتظام و انصرام کے تحت دارالعلوم نے جب اپنا سفر شروع کیا تو اس کی راہ میں کیسی کیسی اڑچنیں آئیں کیسے کیسے کٹھن حالات سے دوچار ہونا پڑا، خارجی اور داخلی فتنوں نے دارالعلوم کے تعلیمی و انتظامی ماحول کو کس طرح تاراج کرنا چاہا مگر حضرت مہتمم صاحب عزیمت کا پہاڑ بن کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے حسن تدبیر اور خداداد صلاحیتوں سے دارالعلوم کی کشتی کو ان طوفانی تھیزوں سے اس طرح محفوظ و سلامت باہر نکال لائے کہ اسے سوچ کر بھی حیرت ہوتی ہے اور

(۱) الفرکان [مجلس مشاورت کوئی سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ یہاں مصنف محترم نے سیاسی کالاف شاید بہت وسیع معنوں میں استعمال کر دیا ہے۔

دل پکارا تھا ہے کہ حضرت مولانا نعمانی قدس سرہ کی یہ تجویز بلاشبہ الہامی تھی۔

حضرت مولانا نعمانی نور اللہ مرقدہ کی ایک اور صفت جس سے بندہ بیحد متاثر ہوا وہ ان کی آخرت کی جوابدہی کی فکر ہے۔ دارالعلوم کے اسی ہنگامہ کے دور میں بندہ کو مولانا سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ اور ہنگامہ سے پنپنے سے متعلق طویل طویل گفتگو کی بھی نوبت آئی مگر مولانا کو کبھی آخرت کی جوابدہی کے فکر سے خالی نہیں پایا جبکہ ایسے معاملات میں عام طور پر اچھے دیندار اور پرہیزگار لوگ بھی تساہل سے کام لے لیا کرتے ہیں۔

اسی طرح مولانا کی دوسری خصوصیت جس سے بندہ بہت متاثر ہوا وہ حق ظاہر ہو جانے کے بعد اپنی رائے اور موقف سے رجوع ہے۔ اس سلسلے میں خود بندہ کے ساتھ

آیا۔ دارالعلوم ہی سے متعلق ایک کام تھا۔ مولانا مرحوم کی رائے تھی کہ یہ کام

اور فرماتے تھے کہ اگر میری صحت اجازت دیتی تو خود میں اس کام کو انجام دیتا

بناء پر یہ کام وہ مجھ سے لینا چاہتے تھے اس سلسلے میں انھوں نے حضرت امہتم

دوسرے اکابر سے گفتگو بھی فرمائی تھی اور ان بزرگوں کے ذریعہ اپنی رائے بلکہ حکم سے

بھی کر دیا مگر اس بارے میں میری رائے یہ تھی کہ وقتی طور پر اگرچہ یہ کام دارالعلوم کے لیے

مفید ہو جائے مگر بعد میں اس کے اثرات نہایت نقصان رساں ہونگے اس لئے میں اس کام کے

لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا مگر حضرت مولانا مرحوم کو اس پر اصرار تھا۔ بالآخر انھوں نے اس پر گفتگو

کے لئے مجھے لکھنؤ طلب کیا۔ میں حاضر ہو گیا تو انھوں نے اپنی بات نہایت تفصیل کے ساتھ

بیان فرمائی اور اس کام کی افادیت و ضرورت کو بڑے موثر انداز میں میرے سامنے رکھا، خاموشی

اور توجہ سے مولانا کی پوری بات سننے کے بعد میں نے مؤدبانہ عرض کیا کہ اگر یہ اکابر کا حتمی فیصلہ

ہے اور اس بارے میں اب کسی گفت و شنید کی گنجائش نہیں ہے تو بندہ اس کام کے لئے تیار ہے

لیکن اگر اس سلسلے میں ابھی غور و فکر کی کچھ گنجائش ہے تو بندہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ حضرت

مولانا نے زیر لب تبسم فرماتے ہوئے کہا جب تک کوئی کام نہ کرنا لیا جائے اس میں غور و فکر کی

گنجائش تو رہتی ہی ہے کہو تمہارا اس سلسلہ میں کیا موقف ہے۔ میں نے مختصر طور پر اپنی رائے

بیان کر دی جسے سنکر وہ ایک دم خاموش و ساکت ہو گئے، ان کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہیں۔ اس سکوت کے تھوڑی دیر بعد فرمایا کہ مولوی صاحب تمہاری

بات بھی غور طلب ہے۔ اچھا اس وقت جاؤ، صبح ناشتہ پر گفتگو ہوگی۔ میں حسب حکم ناشتہ کے

وقت حاضر ہو گیا اور مولانا کے کمرے میں پہنچا تو مجھے دعائیں دیں اور بار بار دعائیں دیں اور فرمایا

کہ بسا اوقات بعض باتیں اس طرح دل دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں کہ دوسرے پہلو کی جانب توجہ ہی نہیں جاتی۔ جزاک اللہ تم نے دوسرے پہلو کو بھی سامنے کر دیا۔ میں نے اس مسئلہ پر رات کو کئی بار غور کیا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمہارا خیال صحیح ہے۔

میں مولانا کے اس طرز عمل سے بیحد متاثر ہوا کہ ایک فیصلہ کو جس پر وہ تقریباً تین چار ماہ سے منشرح تھے کس طرح ایک اپنے سے ہر حیثیت سے کمتر کی رائے پر بدل دیا۔ آج جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے ان کی یہ عظیم تر ادائیں بار بار یاد آرہی ہیں اور زبان پر یہ دعائیہ مصرع جاری ہے ع

”خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں“

حضرت مولانا نعمانی کی وفات بلاشبہ پوری امت کے لیے ایک سانحہ ہے اور ہم میں سے ہر شخص پر ان کا حق ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق انہیں ایصالِ ثواب کرے۔

اللهم اکرم برلہ ووسع مدخلہ واندلہ داراً حیراً من دارہ واهلاً حیراً من اہلہ وبقہ من الخطایا کما یبقی الثوب الابیض من الدس وواعد بیہ و بین خطایاہ کما ناعدت بین المشرق والمغرب۔ اللهم لاتحرما اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

یوں تو عالم اسلام کا ہر فرد اس حادثے پر سخت تعزیت ہے لیکن دارالعلوم دیوبند کے خدام خاص طور پر حضرت مولانا مرحوم کے اہل و عیال کی خدمت میں پیغام تعزیت پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو مقعد صدق میں پیہم ترقی درجات عطا فرمائیں، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں اور انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ تعلیمات و ہدایات کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے ہم سب کو اس عمل پیرا ہونے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین۔

(دارالعلوم ممبئی، جون ۱۹۹۷ء)

”امپیکٹ انٹرنیشنل“ - لندن

جناب ایم۔ ایچ۔ فاروقی

# ایک شخصیت نہیں، ایک ادارہ

AN INSTITUTION NOT AN INSTITUTION MAN

[ذیل کا تعزیتی مضمون مؤقر انگریزی ماہنامہ ”امپیکٹ انٹرنیشنل“ (لندن) ترجمہ ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ذہن میں یہ بات رکھنا مناسب ہوگی کہ صاحب مضمون تعلق پاکستان سے ہے اور ساتھ ہی جماعت اسلامی کے حلقے سے۔ مضمون پر ان دونوں رشتوں کا اثر اگر نمایاں ہے تو وہ ایک قدرتی بات ہے۔ یہ اثر خاص طور پر کانگریس، مسلم لیگ، مسٹر جناح، گاندھی جی اور جمعیت العلماء کے تذکرہ میں زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ بہت سے قارئین کے لئے اس تذکرہ کا انداز قابل اختلاف بلکہ کچھ تاخوشگوار بھی ہو سکتا ہے۔ خود ہمیں بھی اس میں ایک حد تک یک طرفہ پن محسوس ہوتا ہے تاہم یہ ایک زاویہ نظر اور نقطہ نظر ہے۔ اور ہمارے یہاں تو زاویہ ہائے نظر (خاص کر کانگریس اور مسلم لیگ کے معاملے میں) ایک طرفہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ اسلئے اس کے من و عن سامنے آنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے۔

نقطہ نظر کی بات سے الگ جہاں کچھ واقعاتی نوعیت کی غلطیاں یا غلط فہمیاں ہمیں نظر آتی ہیں وہاں نوٹ دے کر اشارہ کر دیا گیا ہے۔ نوٹس کے علاوہ ذیلی سرخیاں بھی تمام تر الفرقان ہی کی قائم کردہ ہیں۔]

وہ سلطنت برطانیہ کی بالادستی کا زمانہ تھا۔ شمالی ہندوستان کے ضلع مراد آباد کا کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈبلیو۔ جے۔ ای۔ لیپٹن (W.J.E. LIPTON) قصبہ سنہیل کے دورہ پر تھا۔ اس موقع پر اس نے سنہیل کے جن عمائدین سے ملاقات کی ان میں قصبہ کے ایک معزز

زمیندار، خوش حال تاجر اور مقامی میونسپل بورڈ کے ممبر صوفی احمد حسین بھی تھے۔ ”لپٹن صاحب“ کو یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ صوفی صاحب نے اپنے کسی بیٹے کو تعلیم کے لئے مقامی ہائی اسکول نہیں بھیجا ہے۔ اس نے صوفی صاحب سے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ اپنے بیٹوں کو یا کم از کم تیسرے صاحبزادے کو اسی سال اسکول میں داخل کرادیں [۱]۔ لپٹن صاحب نے کہا کہ وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خاص طور پر ہدایت کر دیں گے کہ یہ بچہ پانچ سال میں ہائی اسکول ضرور پاس کر لے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اس کے بعد وہ اس بچہ کو نائب تحصیلدار بنادیں گے۔ یہ ایک بہت ہی پرکشش تجویز تھی کیونکہ نائب تحصیلدار کے عہدہ پر براہ راست تقرری اس وقت کسی ہندوستانی کے لئے ترقی کر کے بلند ترین سرکاری عہدہ تک پہنچ جانے اور بالآخر ”خان بہادر“ کا اعزاز حاصل کر لینے کی گویا پکی ضمانت تھی۔ لیکن صوفی احمد حسین صاحب نے خوبصورتی کے ساتھ لپٹن صاحب کو یہ بتادیا کہ وہ اپنے بیٹوں کو صرف دینی تعلیم دلوانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ قبر میں بھی ان کے کام آئیگی۔

وہ بچہ جس کے لئے انگریز کلکٹر نے یہ خصوصی پیشکش کی تھی بارہ سال کے محمد منظور تھے جو اس وقت تک عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کیلئے سنبھل ہی میں ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں جاتے رہتے تھے۔ نو برس بعد وہ دارالعلوم دیوبند سے باقاعدہ فارغ ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند صرف ایک عظیم الشان دینی درسگاہ ہی نہیں بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کا ایک اہم مرکز بھی تھا۔ دیوبند میں اپنے زمانہ طالب علمی (۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۶ء) کے دوران انھوں نے اپنے وقت کے جلیل القدر محدث علامہ انور شاہ کشمیریؒ (۱۸۷۴ء تا ۱۹۳۳ء) سے علم حدیث حاصل کیا۔ اپنے آخری سال کے سالانہ امتحان سے فارغ ہو کر وہ اسی دن اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کی درخواست کی۔ کچھ پس و پیش کے بعد بالآخر درخواست کو شرف قبول ملا اور دوسرے ہی دن وہ دارالعلوم سے رخصت ہو کر وطن روانہ ہو گئے۔ اگرچہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے اس لائق ترین شاگرد کی رہنمائی کے لئے بہت زیادہ عرصہ حیات نہیں رہے تاہم دارالعلوم دیوبند کا فیض انہیں تازندگی حاصل رہا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد ”مولوی محمد منظور نعمانی“ اپنے وطن سنبھل کے مدرسہ محمدیہ میں مدرس ہو گئے۔

[۱] الفرقان) یہاں یہ بتادینا مناسب ہو گا کہ صوفی صاحب سے یہ مسٹر لپٹن کی پہلی ملاقات نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے آشنا تھے۔

## تحریک خلافت اور ترک موالات

وہ دور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا نازک دور تھا۔ خلافت عثمانیہ اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں کے بوجھ تلے دم توڑ رہی تھی۔ برطانوی حکومت اپنی اس یقین دہانی سے پھر گئی تھی جو برطانوی وزیراعظم لارڈ جارج (۱۸۶۳-۱۹۳۲ء) کے ذریعہ مسلمانوں کو دی گئی تھی کہ ان کے جنگی مقاصد میں ترکی سلطنت کو اس کے قدیم تاریخی مقامات سے محروم کرنا ہرگز شامل نہیں ہے۔ لیکن مرکزی خلافت کمیٹی نے خلافت کو ایک مقدس ادارے کی حیثیت سے قائم اور برقرار رکھے جانے کے لئے اپنی تحریک کو ختم کر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر اس دوران میں جبکہ تحریک خلافت نے مسلمانوں میں ہلچل مچا رکھی تھی اور انگریزی حکومت کے تہہ بے اطمینانی کی فضا پیدا کر دی تھی، اس تحریک کو ایک نئی تحریک

(NON-COOPERATION) نے آدبوجائے موہن داس کرم چند

(۱۹۲۸ء) اچانک میدان میں لے آئے تھے، گاندھی کی اس تحریک کا علانیہ کے ساتھ کی گئی دوہری ناانصافیوں کے ازالہ کے لئے انگریزوں پر دباؤ ڈالنا تھا۔ جن میں ایک ناانصافی تو یہ تھی کہ برطانوی حکومت مسلمانوں سے کئے گئے اپنے اس وعدہ سے منحرف ہو گئی تھی کہ ترکی کو اس کے مقدس تاریخی مقامات سے محروم نہیں کیا جائیگا اور دوسرے یہ کہ جلیانوالہ باغ قتل عام کو روکنے میں حکومت ناکام رہی تھی نیز اس سانحہ کے ذمہ دار جنرل ڈائر کو حکومت کی طرف سے کوئی سزا بھی نہیں دی گئی۔

خلافت کمیٹی کے ذمہ داروں کیلئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ گاندھی کی طرف سے ملنے والی اس غیر مترقبہ حمایت کو قبول نہ کرتے اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اس جدوجہد میں شریک نہ ہو جاتے جو ان کے اپنے ہی مطالبات یعنی خلافت کی بحالی اور ملک کی آزادی کیلئے برپا کی گئی تھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن یہ غلسم جلد ہی ٹوٹ گیا اور مسلمان اپنی تحریک خلافت کیسے تھ میدان میں یکہ و تنہا رہ گئے۔ کیونکہ گاندھی جی نے جس طرح اچانک تحریک خلافت کی حمایت میں ترک موالات کی مہم شروع کی تھی اسی طرح آنا فانا مسلمانوں سے کسی صلاح و مشورہ کے بغیر اس تحریک کو واپس لینے کا اعلان بھی کر دیا۔

فروری ۱۹۳۲ء میں شمالی ہندوستان کے قصبہ چوراجوری میں ایک ہجوم نے ایک پولیس اسٹیشن کو آگ لگا دی تھی جس میں ۲۴ پولیس والے زندہ جل گئے تھے تشدد کا یہ تہا واقعہ گاندھی جی کے لئے پوری تحریک کو لپیٹ کر رکھ دینے کا بہانہ بن گیا۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے

ایک قراود منظور کی جسمیں کہا گیا کہ اس وقت ملک کی فضا عدم تشدد پر مبنی کسی سول نافرمانی کی تحریک کیلئے سازگار نہیں ہے اسلئے تحریک ترک موالات کو موقوف کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔

اس دوران میں ہزاروں مسلمان ترک موالات کی اس مہم میں بے دریغ قربانیاں دے کر بڑا نقصان اٹھا چکے تھے۔ اسکے برخلاف ہندوؤں نے اس تحریک کا ساتھ دینے میں پورے بخل اور احتیاط سے کام لیا تھا۔ جہاں ایک طرف علیگزہ مسلم یونیورسٹی کا نظام مہینوں تک ہنگامہ آرائی کی نظر رہا وہیں دوسری طرف بنارس ہندو یونیورسٹی میں حالات نارمل رہے اور انگریزی حکومت کے ساتھ اس کا تعاون بھی جاری رہا۔ بہر حال گاندھی کو ترکی اور پنجاب میں انگریزی حکومت کی غلط کاریوں کی تلافی کرانے کے اپنے عہد و پیمان سے پھر جانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی بلکہ وہ ہندوستان کے لئے 'سوراجیہ' حاصل کرنے کے اپنے مہینہ مقصد سے بھی دستبردار ہو گئے۔

### صرف محمد علی جناح

جلینوالہ باغ کے قتل عام کا سانحہ ۱۹۱۹ء میں پیش آیا تھا لیکن گاندھی کو ترک موالات کا خیال اس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع نہیں کر دی۔ مسلمانوں نے بھی نہیں سوچا کہ گاندھی جی کو جلینوالہ باغ کی یاد آخر اتنے دنوں کے بعد کیوں آئی اور کیوں انہوں نے اپنی تحریک کو تحریک خلافت کے ساتھ جوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ دراصل گاندھی کا ایک ایسا خاصہ تھا جسے مسلمان بہت دیر میں اور بڑی مشکل سے سمجھ سکے۔ اس وقت کی مسلم قیادت میں صرف محمد علی جناح (۱۸۷۶-۱۹۴۸ء) ایک استثنا تھے۔ انہیں ترک موالات کے مقاصد سے تو دلچسپی رہی لیکن گاندھی اور ان کے طریقہ کار کے بارے میں وہ مشکوک تھے۔ (جناح اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں کے ممبر تھے) بہر حال تحریک خلافت، جسے گاندھی پہلے ہی چلنا کر چکے تھے، بالآخر ۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو اس وقت اپنے انجام کو پہنچ گئی جبکہ فری میسن غلبہ والی نئی انقرہ حکومت نے آخری عثمانی خلیفہ کو معزول کر کے خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

### خاتمہ خلافت کے اثرات

ان تمام واقعات کا مسلمانوں کی نفسیات اور مسلم سیاست پر گہرا اثر پڑا تھا انہیں



خلافت کے صدمہ سے نکل آنے میں ایک دہائی سے بھی زیادہ عرصہ لگا۔ اس دوران میں مسلم سیاسی محاذ پر جو خاموشی چھائی رہی اس سے فائدہ اٹھا کر قادیانیوں اور آریہ سماجیوں نے مسلمانوں پر یلغار شروع کر دی اور انہیں انتہائی فتنہ انگیز بلکہ تکفیری مباحثوں اور مناظروں میں الجھا دیا۔ قادیانی فرقہ مسلمانوں میں ایک اصلاحی تحریک کا دعویدار بن کر ابھرا تھا اسی طرح آریہ سماجیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ہندوؤں میں اصلاح کے علمبردار ہیں مگر دونوں کا اصل نشانہ اسلام تھا۔ ممکن ہے اس فتنہ انگیزی میں ان استعماری طاقتوں کا ہاتھ ہو جو مسلمانوں کو مسلم سرزمین خصوصاً فلسطین اور نام نہاد مشرق وسطیٰ میں سامراجی تسلط کو چیلنج کرنے کی ساز دینا چاہتے تھے۔ سامراجی حکمت عملی کا ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی منافرت کے بیج بودیے جائیں اور اس طرح ان دونوں قوموں کو حصول آزادی و جدوجہد سے باز رکھا جائے۔

ادھر جزیرہ نمائے عرب میں جاری سامراجی ریشہ دوانیوں نے موجود دیوبندی بریلوی نزاع کی خلیج کو اور زیادہ گہرا کر دیا تھا۔ انگریز جزیرہ عرب میں چل رہا تھا۔ ایک طرف اس نے شریف حسین (۱۸۵۳-۱۹۳۱ء) کو اپنا آلہ کار بنایا تھا تو دوسری طرف عبدالعزیز بن سعود (۱۸۸۰-۱۹۵۳ء) کی پشت پناہی بھی کر رکھی تھی جبکہ ہندوستان میں دیوبندی اور بریلوی انہی دونوں مہروں کی حمایت اور مخالفت میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔

آج کی طرح اس وقت کی مسلم دنیا میں بھی عوامی رائے اور مسلم حکمت عملی عموماً ناقص معلومات بلکہ بعض اوقات غلط اور گمراہ کن اطلاعات کی بنیاد پر استوار ہوا کرتی تھی۔ دیوبندیوں نے عبدالعزیز ابن سعود کی حمایت کی انھوں نے شریف حسین کو خلافت عثمانیہ کے ایک باغی کی حیثیت سے دیکھا جبکہ عبدالعزیز بن سعود نجات دہندہ قرار پائے۔ دراصل دیوبندی طبقہ آل سعود کے مرشد اور دینی رہنما شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳ء-۱۷۹۲ء) کے علمی مقام و مرتبہ سے بہت متاثر تھا [۱]۔

دوسری طرف بریلوی (جو مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے منسوب کئے جاتے ہیں) بزرگان دین کے مزارات سے والہانہ عقیدت رکھنے کی بنا پر اس بات سے سخت نالاں اور برہم

[۱] (الفرقان) نہ معلوم یہ خیال کیونکر پیدا ہوا ہے۔ ورنہ واقعہ اس کے برعکاس ہے۔ زیادہ تفصیل کے لئے خود حضرت مرحوم (مولانا نعمانی) کی کتاب ”شیخ محمد بن عبدالوہاب“ دیکھنا چاہیے۔

تھے کہ حجاز پر قبضہ کے بعد عبدالعزیز ابن سعود نے شیخ محمد بن عبد الوہاب کی پیروی میں مقامات مقدسہ میں واقع قبروں اور مزاروں پر بنے قبوں کو مسمار کر دیا تھا۔ اگرچہ دیوبندی بھی اس معاملے میں سعودیوں کی طرف سے کی جانے والی زیادتی کی حمایت نہیں کرتے تھے، تاہم اس قضیہ سے دیوبندی بریلوی تنازعہ بھڑک اٹھا۔

### مولوی منظور میدان عمل میں

اسلام پر قادیانیوں اور آریہ سماجیوں کی یورش اور دیوبندی، بریلوی اختلافات نے نوجوان اور حال ہی میں فارغ ہوئے مولوی محمد منظور کی بہترین مناظرانہ صلاحیت کو اجاگر کر دیا۔ ان مناظروں میں انہیں کامیابی بھی خوب ملی۔ لیکن جلد ہی انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ مناظروں کی افادیت عارضی اور محدود ہے اور اسکے نتیجہ میں تنازعہ محض ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ لہذا انہوں نے اپنے مشن کو مستقل اور ملک گیر پیمانے پر جاری رکھنے کے لئے ”الفرقان“ کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ نکالنا شروع کیا۔

”الفرقان“ کا پہلا شمارہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔ درمیان میں چار ماہ کے مختصر وقفہ کو چھوڑ کر گزشتہ ۶۳ سال سے ”الفرقان“ نہ صرف یہ کہ مستقل شائع ہو رہا ہے بلکہ برصغیر ہندو پاک میں اسلام کی ترجمانی میں اس نے ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

”الفرقان“ نے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے چند مجاہد علماء کی زندگی اور ان کی خدمات پر خصوصی شمارے شائع کر کے جلد ہی اپنا نقش جما دیا تھا۔ ان خصوصی شماروں میں ”الفرقان“ کا شاہ اسماعیل شہید نمبر مجدد الف ثانی نمبر اور حضرت شاہ ولی اللہ نمبر سر فہرست ہیں۔ تحریک خلافت کے خاتمہ سے پیدا ہو جانے والے خلا میں ”خاکسار“ نام کی ایک نیم عسکری تحریک بھی اٹھی تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ علامہ عنایت اللہ مشرقی (۱۸۸۸ء-۱۹۶۳ء) کی اٹھائی ہوئی یہ تحریک نظم و ضبط کے اپنے مخصوص مزاج و انداز کی بنا پر مسلمانوں کے لئے زبردست کشش کا باعث بنے گی۔ لیکن چونکہ اس تحریک کا اصل محرک اسلام کے بجائے فاشزم کا وقتی عروج تھا اس لئے اس کا نتیجہ مسلمانوں کی توجہات کو طاقت و شوکت کے لا حاصل مظاہرے اور خواہ مخواہ کی محاذ آرائی میں لگا دینے کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔

مولانا محمد منظور نعمانی نے ۱۹۳۸ء میں ”الفرقان“ کا ایک خصوصی شمارہ اسی خاکسار تحریک کے تنقیدی جائزہ کے لئے بھی شائع کیا تاکہ وہ اس تحریک کے نظریات، اس کا لائحہ عمل اور مسلمانوں کے لئے اس کے سیاسی مضمرات پوری طرح واضح کر سکیں۔

ہندوستان ایک نئے سیاسی عہد کے دروازے پر

۱۹۳۵ء میں ”گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ“ کی منظوری سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ انگریزوں نے اپنی سلطنت کے نقشہ میں تبدیلی کا عمل شروع کر دیا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی اس لئے انگریزوں کی سیاسی وراثت بلاشبہ اسی کو منتقل ہوتا تھی۔ کانگریس کی بنیاد دسمبر ۱۸۸۵ء میں ایک ریٹائرڈ انگریز آفیسر اے۔ او۔ ہیوم (۱۸۲۹-۱۹۱۲ء) نے اصلاً ایک سماجی تنظیم کی حیثیت سے رکھی تھی۔ لیکن جلد ہی اسے سیاسی جماعت میں تبدیل کر دیا گیا۔ کانگریس کے پہلے صدر ڈبلیو۔ سی۔ بنرجی نے یہ انکشاف کیا تھا کہ کانگریس کی یہ قلب ماہیت گورنر جنرل ڈفرن (۱۸۲۶-۱۹۰۲ء) کے ایماء پر عمل میں لائی گئی تھی مزید، نے مسٹر ہیوم پر یہ پابندی بھی عائد کر دی تھی کہ جب تک وہ ہندوستان ”کانگریس اسکیم“ سے ان کے تعلق کو ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

ڈفرن اور بنرجی کی ذریات کے باہمی رشتوں میں ۲۱ چڑھاؤ آتے رہے ایک دوسرے سے قطع تعلق نہیں کیا۔ کانگریسی قیادت کا یہ مخلوط اینگلو انڈین گچھر انگریزوں لئے بہت بڑے اطمینان کا باعث تھا۔ مثال کے طور پر جواہر لال نہرو (۱۸۸۹-۱۹۶۳ء) انگریز زیادہ تھے، ہندوستانی کم۔ بلکہ گاندھی جیسے ہندو بھی محض مذہبی رسومات کی حد تک ہی ہندو تھے ورنہ ان کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظریات کلیتہاً مغربی تھے۔

مسلمانوں پر یہ بات پوری طرح واضح ہوتی جا رہی تھی کہ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے ذریعہ صوبائی خود مختاری کا جو راستہ کھلا ہے وہ بالآخر ملک کو کانگریسی اقتدار یا دوسرے الفاظ میں ہندو اقتدار تک لیجانے والا ہے۔ لیکن مسلمان جو ابھی تک خلافت کے صدمہ سے سنبھل نہیں سکے تھے، اپنے مستقبل کے لئے کوئی لائحہ عمل متعین کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ بھی جو ۱۹۰۶ء میں کم و بیش کانگریس جیسے حالات میں ہی وجود میں آئی تھی اس وقت تک مسلمانوں میں قبول عام حاصل نہیں کر سکی تھی۔ قیام پاکستان کا مطالبہ رسمی حیثیت سے تو ۱۹۴۰ء میں سامنے آیا تھا لیکن اپنے لئے ایک آزاد ثقافتی اور سیاسی نظام کی ضرورت کا احساس مسلمانوں میں گذشتہ صدی کے اواخر سے ہی موجود تھا۔ ماضی قریب میں شاعر اسلام اور فلسفی علامہ اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) نے اس مسئلہ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ء اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں اٹھایا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت الہی (۱۸۹۷-۱۹۵۱ء) نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر سید عبداللطیف نے

ہندوستان کو چار ثقافتی منطقوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تحریروں میں ڈاکٹر عبداللطیف کی پیش کردہ تجویز کو منظور کرنے کی وکالت کی تھی اور ۱۹۳۹ء میں چودھری خلیق الزماں (۱۸۸۹-۱۹۷۳ء) نے مسلم علاقوں کو بقیہ ہندوستان سے علیحدہ کر دینے کی تجویز سامنے رکھی تھی۔ اس طرح مسلم رائے عامہ بتدریج پاکستان کے حق میں ہموار ہوتی جا رہی تھی۔

### مولانا نعمانی کا سیاسی ذہن

لیکن یہاں ”نیشنلسٹ“ کہے جانے والے مسلمان بھی تھے۔ (اور جو مسلم حقوق کی بات کرتے تھے ان کو ”فرقہ پرست“ کا طعن آمیز نام دیا جاتا تھا) ان ”نیشنلسٹ“ (قوم پرست) مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں طبقہ دینی علماء کی تنظیم ”جمعیتہ العلماء ہند“ تھی۔ ان علماء کے پاس برطانوی حکومت کے خلاف سر فروشانہ جدوجہد کی ایک طویل تاریخ تھی جس کی بنا پر وہ انڈین نیشنل کانگریس سے زیادہ قربت اور ہم آہنگی رکھتے تھے۔ چنانچہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے تلخ تجربہ کے باوجود جمعیتہ العلماء نے کانگریسی قیادت پر اعتماد برقرار رکھا۔ مولانا منظور نعمانی کی سیاسی فکر پر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا گہرا اثر تھا۔ چنانچہ وہ بھی جمعیتہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مولانا اگرچہ جمعیتہ العلماء کی مجلس عاملہ کے رکن نہیں تھے لیکن ہندوستانی سیاست سے ان کی واقفیت کی بنا پر جمعیتہ کے اکابرین ان کی بڑی قدر کرتے تھے یہاں تک کہ جمعیتہ العلماء کے اہم جلسوں میں انہیں خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔

۱۹۳۶ء کے صوبائی الیکشن کے نتیجے میں ہندوستان کے کل گیارہ صوبوں میں سے سات میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں اور یہ بات تقریباً طے شدہ تھی کہ آزادی ملنے کی صورت میں ملک کا اقتدار انڈین نیشنل کانگریس کے ہاتھ میں آئے گا۔ جمعیتہ العلماء ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے شرعی نظام قائم کرنا چاہتی تھی۔ مولانا نعمانی کے بقول جنگ آزادی میں کانگریس کے اشتراک عمل کا اصل سبب یہی تھا [۱]۔ لیکن جمعیتہ العلماء، کوئی عوامی جماعت نہیں تھی صرف علما پر مشتمل ایک مخصوص مجلس تھی اور اسے خوب اندازہ تھا کہ تحریک آزادی میں کانگریس کی حمایت کرنے کے باوجود وہ کانگریس کی پالیسیوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی بلکہ اس وقت کی جمعیتہ کے تمام اراکین کو کانگریس میں شامل کر کے بھی یہ مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس

[۱] (الفرقان) اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی جمعیتہ العلماء کو ان نیشنلسٹ مسلمانوں میں شامل کرنا جو گویا مسلم حقوق

کی بات پسند نہیں کرتے تھے، ایک عجیب سی بات ہے۔

صورتحال کے پیش نظر جمیعہ کی ایک اہم شخصیت اور نائب امیر شریعت بہار مولانا محمد سجاد نے ۱۹۴۰ء میں یہ تجویز پیش کی کہ جمیعہ العلماء کی سرپرستی میں مسلمانوں کی جماعت قائم کی جائے جسکے ممبران کیلئے کانگریس کی ممبر شپ حاصل کرنا بھی ضروری قرار دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس راستے سے کانگریس کے اندر پہنچ کر جمیعہ العلماء کیلئے کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونا ممکن ہو جائے گا۔

### ایک یادگار واقعہ

اس زمانے میں مولانا نعمانیؒ مستقل دہلی آتے رہتے تھے [۱] انہیں مولانا سجاد کی تجویز اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے فوراً ہی دیوبند کے قریب واقع تھانہ بھون جا کر مولانا تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہونے اور انہیں اس تجویز سے آگاہ کرانے کا ارادہ کیا۔ اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) علماء دیوبند کی محترم ترین شخصیات میں ہندوستانی سیاست کے تعلق سے جمیعہ العلماء کی فکر سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ مسلم لیگ کی حمایت کا تھا اس لئے جمیعہ کی طرف سے ایک عوامی جماعت کی تجویز پر ائی ماسید حاصل کر لینا یقیناً ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ تھانہ بھون پہنچ کر مولانا منظور نعمانی نے جب اس تجویز کی تفصیلات مولانا تھانوی کے سامنے پیش کیں تو بظاہر وہ اسکی تائید پر آمادہ نظر آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر انہیں یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ ایسی عوامی جماعت کی تشکیل اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر ثابت ہوگی تو وہ بذات خود جمیعہ اور کانگریس دونوں میں شامل ہونے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن وہ اس معاملہ پر جمیعہ العلماء کے اکابرین سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

مولانا منظور نعمانیؒ فوراً دہلی کیلئے روانہ ہو گئے اور اسی دن شام کو جمیعہ العلماء کے نائب صدر [۲] مفتی کفایت اللہ (۱۸۷۵-۱۹۵۲ء) اور مولانا سجاد کی معیت میں تھانہ بھون واپس آگئے۔ دوسرے دن صبح کی ملاقات میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا (متوفی ۱۹۸۲ء) مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب (متوفی ۱۹۸۳ء) اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا ظفر احمد تھانویؒ (۱۸۹۳-۱۹۷۴ء) بھی شریک ہوئے مولانا منظور نعمانی نے ان

[۱] (الفرقان) بریلی سے دہلی کا یہ سفر تقریباً ہر ماہ الفرقان کی طباعت کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ [۲] واقعہ میں صدر۔ ۱۹۳۰ء تک

مفتی صاحب ہی صدر تھے۔ (الفرقان)

حضرات کے سامنے مولانا سجاد کی اس تجویز کی تفصیلات بیان کیں جسکے ذریعہ جمیعۃ العلماء کو توقع تھی کہ وہ کانگریس کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکے گی اور آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاسکے گا۔ اس پر مولانا ظفر احمد تھانوی نے کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے کے معاملے میں بعض فقہی اشکالات اٹھاتے ہوئے فرمایا کہ فقہ حنفی کا ایک صریح مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان کسی جنگ کے فریقین میں سے کسی ایک فریق کی بھی حمایت اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ایسا کرنا اعلاء کلمہ اسلام کیلئے ضروری نہ ہو۔ وگرنہ انہیں کسی بھی ایسے نزاع میں فریق بننے کی اجازت نہیں ہے۔ اسکے جواب میں مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ اس وقت درپیش مسئلہ کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان کانگریس کی حمایت کریں یا نہ کریں آزادی کے بعد ملک میں جو بھی حکومت قائم ہوگی وہ جمہوری ہوگی اسلامی حکومت نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آزادی کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو جائیں اور حصول آزادی کے بعد ملک کے معاملات میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ اس جدوجہد میں شریک ہوں اور مستقبل کے ملکی نظام میں بھی شریک اور حصہ دار بنیں۔ انہوں نے کہا کہ جمیعۃ نے اسی دوسرے راستہ کو اختیار کیا ہے۔ مفتی کفایت اللہ نے یہ بات واضح کر دی کہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل میں بعض ”منکرات“ سے بھی سابقہ پڑیگا۔ مثلاً کانگریس کمیٹیوں کے اجلاس میں خواتین کے ساتھ شرکت کرنا لیکن اس طرح کے منکرات سے مسلم لیگ کے جلسے بھی پاک نہیں ہوتے اس بناء پر جمیعۃ والے کانگریس کے ساتھ اپنے اشتراک کے سلسلے میں مطمئن ہیں۔

یہ میٹنگ ۳ گھنٹے سے بھی زیادہ وقت تک جاری رہی۔ لیکن اس دوران مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں فرمایا۔ آخر میں انہوں نے اپنے مہمانوں سے فرمایا کہ آپ لوگ اب کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر آرام فرمائیں۔ اس دن مولینا کا روزہ تھا۔ لیکن رات کو اپنے مہمانوں کے کھانے کا اہتمام مولانا نے خود فرمایا۔ مولانا تھانوی کی خاموشی سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اب وہ جمیعۃ کی اس تجویز کی حمایت کے حق میں نہیں رہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ وہ نوجوان عالم مولانا منظور کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے تھے خاص طور پر اس بات سے کہ وہ ہندوستانی مسلم سیاست میں اتنی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

بہر حال بعد میں جمیعۃ العلماء نے اپنی اس تجویز کو خود ہی خیر باو کہہ دیا کیونکہ اس دوران کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے متعصبانہ رویہ کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس سے دوری پیدا

ہونے لگی تھی اور اس کا امکان بہت کم رہ گیا تھا کہ مسلمان کسی کانگریس حامی مسلم جماعت میں شریک ہوں یا اسکی حمایت کریں۔ مولانا منظور نعمانی نے اپنے رسالہ الفرقان میں خود بھی کانگریسی حکومتوں کے اس رویہ پر سخت تنقید کی تھی جو وہ مختلف صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ اپنائے ہوئے تھے۔

### مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں شرکت سے معذرت

۳۸ء کے اواخر یا ۳۹ء کے اوائل میں مولانا منظور نعمانی کو مولانا اشرف علی تھانوی کی طرف سے ایک ٹیلی گرام ملا جس میں انہیں تھانہ بھون بلانے کے لئے صرف اس قدر درج تھا ”تم سے مشورہ کی ضرورت ہے“ غالباً اسکی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کے صدر نواب خاں (۱۸۸۶ء-۱۹۵۸ء) نے مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں یہ گزارش مسلم لیگ کی حمایت میں ایک بیان جاری کر دیں۔ اس درخواست کی وضاحت

مولانا تھانوی کو بتایا کہ جمعیتہ العلماء ہند اور اسکے صدر مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷ء) پورے زور شور سے کانگریس کی حمایت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اس کی دعوت دے رہے ہیں جس سے یہ تاثر ملتا ہے۔ کہ انکے نظریہ کو تمام علماء کی حمایت حاصل ہے اور اسکا عام مسلمانوں کی رائے پر بڑا اثر پڑ رہا ہے۔ لہذا ہم آپکی خدمت میں یہ درخواست لیکر حاضر ہوئے ہیں کہ آپ اپنی طرف سے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان فرمادیں۔ مولانا تھانوی نے جواب دیا کہ اگرچہ مسلم لیگ کے مقاصد سے انہیں پوری ہمدردی ہے لیکن ابھی اس بارے میں انہیں انشراح نہیں ہے کہ جس طرح کی حمایت ان کی طرف سے مطلوب ہے وہ اسکا اعلان بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ نواب اسماعیل خاں نے دریافت کیا کہ آپ کے اطمینان کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ مولانا تھانوی یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کی طرف سے کسی بھی صورت میں اسلام کے کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں کی جائیگی۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر آپ لوگوں کو منظور ہو تو میں اپنی طرف سے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں ایک عالم دین کو نامزد کر دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ کے دینی پہلو پر اس عالم کی رائے کو ماننا مسلم لیگ کی قیادت کیلئے ضروری ہوگا۔ اس گفتگو کے بعد نواب اسماعیل خاں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح سے مشورہ کیلئے روانہ ہو گئے۔ چند روز بعد وہ اس پیغام کے ساتھ واپس لوٹے کہ مسلم لیگ مولانا اشرف علی

(۱) الفرقان مولانا مدنی اس وقت صدر نہیں تھے۔ ان کی صدارت ۱۹۴۰ء سے شروع ہوئی تھی۔ البتہ بغیر صدارت کے بھی وہ جمعیتہ کے نہایت مؤثر رکن تھے۔

تھانوی کے نامزد کردہ عالم دین کو درکنگ کمیٹی میں لینے کے لئے تیار ہے البتہ وہ لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی کسی ایسے صاحب فہم شخص کو نامزد فرمائیں گے جو سیاسی ذہن رکھتا ہو اور مسلم لیگ کو درپیش مسائل کو سمجھنے کا اہل ہو۔ وہ عالم دین جنہیں مولانا اشرف علی تھانوی مسلم لیگ و درکنگ کمیٹی میں اپنی طرف سے نامزد کرنا چاہتے تھے مولانا منظور نعمانی تھے۔ یہ بات مولانا نعمانی کو مولانا ظفر علی تھانوی نے بتلائی۔ انہوں نے کہا کہ حضرت (مولانا اشرف علی تھانوی) آپ کو مسلم لیگ کی درکنگ کمیٹی میں اپنی نمائندگی کیلئے نامزد کرنا چاہتے ہیں لیکن مولانا منظور نعمانی نے ان سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ جمیعہ العلماء سے وابستہ ہیں اور مسلم لیگ کی پالیسیوں کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔

مولانا مودودی سے ذہنی ربط

لطف کی بات یہ ہے کہ جمیعہ العلماء کیساتھ اپنی کامل وابستگی کے باوصف مولانا منظور نعمانی رفتہ رفتہ ایک بالکل مختلف فکر سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ ”النجم“ کے دفتر میں ایک نیادینی ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ ان کی نظر سے گزرا۔ ”النجم“ مولانا عبدالشکور فاروقی متوفی ۱۳۸۱ھ کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ ترجمان القرآن جو اس وقت حیدرآباد سے نکلتا تھا مولانا عبدالشکور صاحب کے فرزند مولانا عبدالمومن فاروقی نے مولانا منظور نعمانی کو دکھایا تھا۔ یہ کوئی نیا رسالہ نہیں تھا لیکن اب اسکی ادارت سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۶۰۳-۱۹۷۹) نے سنبھالی تھی۔ مولانا منظور نعمانی اسی وقت سے ترجمان کے گرویدہ ہو گئے وہ اسلامی اور عصری مسائل پر اس کے مدیر کی غیر معمولی گرفت اور اس کے طاقتور اسلوب تحریر سے بیحد متاثر ہوئے۔ مولانا نعمانی ہر صبح ”النجم“ کے دفتر میں ترجمان القرآن کے نئے شمارہ کی آمد کا بے صبری سے انتظار کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ انتظار انہیں بہت زیادہ عرصہ تک نہیں کرنا پڑا۔ اگلے ہی سال ۱۹۳۳ء میں جب انہوں نے ماہنامہ ”الفرقان“ جاری کیا تو انہیں ترجمان القرآن تبادلہ میں موصول ہونے لگا تاہم انہوں نے ترجمان القرآن کے پچھلے تمام شمارے بھی حاصل کر لینے کا خاص اہتمام کیا۔ مولانا مودودی جو اپنی معرکتہ الآراء تصنیف ”المجہاد فی الاسلام“ پر علمی اور سیاسی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرنے کے بعد کافی متعارف ہو چکے تھے مسلمانوں کو درپیش مسائل سے نپٹنے کیلئے کسی جزوی حکمت عملی کے بجائے ایک ہمہ گیر پروگرام کے داعی تھے مولانا منظور نعمانی نے اپنے رسالہ الفرقان میں متعدد مضامین ”ترجمان القرآن“ کے حوالہ سے شائع کئے اور ان کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی۔



دونوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ ان کے رسائل میں جو نظریات پیش کئے جا رہے ہیں ان کی ترویج کے لئے ایک باقاعدہ تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

### مسئلہ داڑھی اور بالوں کا

لیکن کسی صاحب نے مولانا نعمانی کو بتایا کہ مودودی صاحب کی تحریروں کی عکاسی ان کی ذاتی زندگی میں نظر نہیں آتی، وہ داڑھی بھی نہیں رکھتے۔ پھر کچھ دنوں بعد انہیں مودودی صاحب کی زندگی میں کچھ خوشگوار تبدیلیوں کی اطلاع بھی ملی۔ تاہم مولانا نعمانی جب پہلی بار مولانا مودودی صاحب سے ملے تو انہیں سخت دھکا لگا۔ ان کے سامنے ایک بے داڑھی والا شخص تو نہیں تھا لیکن جو تھوڑی بہت تبدیلی آئی تھی وہ بس برائے نام تھی۔ مودودی مولانا نعمانی کی اس پریشانی کو بھانپ لیا۔ انہوں نے کہا ”مولانا! جس دنیا سے میرے جہاں سے نکل کر میں آیا ہوں آپ کو اسکی خبر نہیں ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ : جاؤں، تبدیلی انشاء اللہ رفتہ رفتہ آئیگی۔“

مولانا منظور نعمانی مودودی صاحب کے انکار ان کی غیر معمولی ذہانت اور ان کے طاقتور طرز تحریر کے بڑے مداح اور شیدائی تھے۔ وہ مودودی صاحب کے خیالات اور ان کے تجزیوں سے تقریباً پوری طرح اتفاق رکھتے تھے لیکن اس سب کے باوجود مودودی صاحب کی چھوٹی سی داڑھی اور ان کے بالوں کی وضع ان کیلئے پریشانی کا باعث تھی۔ تنہائی کی ایک ملاقات میں انہوں نے مولانا مودودی صاحب سے دریافت کیا کہ۔

”احکام شریعت کے بارے میں آپ کا کیا طرز عمل ہے؟“

”میں اپنے امکان کی حد تک شریعت کی پابندی کرتا ہوں“

”آپ تقلید شخصی کو تو ضروری نہیں سمجھتے لیکن یہ بات تو آپ بھی ضروری سمجھتے

ہوں گے کہ جس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے اس کے خلاف نہ کیا جائے؟“

”ہاں! میں اسے ضروری سمجھتا ہوں اور اس سے خروج کو جائز نہیں سمجھتا“

”کیا ایسی داڑھی رکھنا آپ کے نزدیک جائز ہے؟“

”میری رائے میں داڑھی اتنی ہونا ضروری ہے کہ دور سے نظر آئے۔ اور اتنی اگر

چھوٹی سی بھی ہے تو حرام پانا جائز نہیں سمجھتا۔“ مودودی صاحب نے اپنی رائے

کی تائید میں فقہ حنبلی کی کتاب ”مغنی“ کا حوالہ دیا۔

”میں نے مغنی نہیں دیکھی ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ داڑھی کو داڑھی جیسا نظر

آنا چاہئے۔ اور آپ کی داڑھی اس سے بہت کم ہے جتنی کو حدیث میں ضروری بتایا گیا ہے۔“

”میرا خیال یہ ہے کہ آپ کی بات صحیح ہے اور مجھے اپنی اصلاح کر لینی چاہئے“  
”اور آپ کے بالوں کی وضع؟“

”کیا یہ آپ کے نزدیک ”قزع“ ہے جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے؟“  
”میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ ”قزع“ ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس طرح کے بال رکھنا صالحین کے طریقہ کے خلاف ہے اور خاص کر جو لوگ دین و شریعت کی پابندی کے داعی ہوں ان کیلئے ایسی چیزوں کی بالکل گنجائش نہیں ہے“ اس پر بھی مودودی صاحب نے فرمایا کہ یہ بات آپ کی ٹھیک ہے۔

آخر میں مولانا نعمانی نے مودودی صاحب سے ان کی ذاتی زندگی کے بعض پہلوؤں کے بارے میں کچھ سوالات کئے اور مودودی صاحب نے بے تکلفی سے ان کے جوابات دیئے۔ اس کے بعد مولانا نعمانی نے اپنا اطمینان ظاہر کر کے مولانا مودودی سے کہا کہ اب آپ جماعت کی تشکیل کے لئے ہم خیالوں کو دعوت دیجئے اور اس کام کے لئے کوئی تاریخ مقرر کر دیجئے۔

### جماعت میں شرکت اور مفارقت

مجوزہ جماعت کی تشکیل کے لئے یہ میٹنگ اگست ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوئی۔ مولانا منظور نعمانی نے نئی جماعت، جماعت اسلامی.... کی امارت کیلئے مولانا مودودی کا نام پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ دستور کے لحاظ سے امیر میں جو صفات ہونی چاہئیں، مثلاً تقویٰ، علم دین میں بصیرت، اصابت رائے اور حزم و عزم وہ سب مودودی صاحب میں موجود ہیں اور اس حیثیت سے وہ جماعت کے موجودہ اراکین میں فائق و ممتاز ہیں۔ مولانا منظور نعمانی کو نائب امیر بنایا گیا اور ”الفرقان“ پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ جماعت کے نظریات اور اسکی دعوت کی وکالت کرنے لگا۔

تاہم جماعت کی تاسیس کے ۲۱ ماہ بعد مولانا نعمانی نے ”الفرقان“ میں اعلان کیا کہ اگرچہ وہ جماعت کی دعوت اور اس کے مقاصد کو اب بھی درست اور برحق سمجھتے ہیں لیکن انہوں نے افسوس اور قلق کے ساتھ جماعت کی باضابطہ ذمہ داری اور اسکی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے خود کو علیحدہ کر لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس اعلان سے ایسی کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ

جماعت سے میری بے تعلقی کسی اصولی اختلاف پر مبنی ہے بلکہ اسکی وجہ کچھ ذاتی قسم کے معاملات ہیں۔ لیکن اسکے ۱۵ برس بعد (الفرقان۔ رمضان ۱۴۳۵ھ۔ اپریل ۱۹۵۸ء) تک انہوں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ ”ذاتی معاملات“ کیا تھے کسی نے انہیں بتایا تھا کہ (ان دنوں) مودودی صاحب کے گھر میں ایک مرد باورچی ملازم تھا اور ان کی اہلیہ اس سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ یہ ایک ”منکر“ تھا۔ (۱)

۸۰۔ ۱۹۷۹ء میں مولانا نے دوبارہ اس موضوع کی طرف اُس وقت توجہ کی جب انہوں نے ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف“ نامی کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کی رو سے ”ذاتی معاملات“ وہی تھے جنکا اوپر ذکر کیا گیا۔ ال۔ ال۔ میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ خاص طور پر ۵۷ء کے سنہ ان کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ مودودی صاحب کی تحریروں اور جماعت بعض ”سنگین خامیاں“ آگئی ہیں۔ مولانا نعمانی کو امید تھی کہ مودودی صاحب فرمائیں گے لیکن ابھی ان کی یہ کتاب اشاعت کے مرحلہ میں ہی تھی کہ مودودی انتقال ہو گیا۔

### جماعت سے مفارقت کا اصل راز

مولانا نعمانی کو اگرچہ اسکا علم نہ تھا۔ لیکن جماعت سے مولانا کی علیحدگی فی الواقع عظیم دینی و اصلاحی تحریک ”تبلیغی جماعت“ کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ (متوفی ۱۹۴۳ء) کی دعاؤں کا ثمرہ تھی۔ یہ بات مولانا نعمانی کے علم میں اس وقت آئی جب وہ مولانا الیاس صاحب کے انتقال کے بعد ان کی تدفین میں شرکت کر کے واپس ہو رہے تھے (۲)۔ ہوا یہ کہ مولانا

(۱) (الفرقان) غور کیا جائے تو یہ مولانا مودودی کا ”ذاتی مسئلہ“ کہلائے گا نہ کہ مولانا نعمانی کا۔ مولانا نعمانی کا ذاتی مسئلہ وہ تھا جو مودودی صاحب کے اس گھریلو مسئلے سے پیدا ہوا اور جس کی تفصیل سرگزشت میں کی گئی ہے۔ کہ یہ واقعہ علم میں آنے کے بعد اور خود مودودی صاحب سے اسکی تصدیق ہو جانے کے بعد مولانا نعمانی نے اپنے لئے یہ مسئلہ محسوس کیا کہ انھوں نے مودودی صاحب کا نام اہدات کیلئے پیش کرتے ہوئے ان کے حق میں صاحب تقویٰ ہونے کی شہادت دی تھی۔ اور اس واقعہ کی روشنی میں جس کو مودودی صاحب بدلنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں، ان کی شہادت اب شہادتِ رور (جموئی شہادت) ہو جاتی ہے، تو وہ اب کیا کریں؟

(۲) (الفرقان) یہ واپسی تدفین سے نہیں تھی بلکہ مولانا الیاس صاحب کے انتقال کے بعد ایک اجتماع سے تھی۔

الیاس صاحب کے ایک خاص رفیق حاجی عبدالرحمن نے مولانا نعمانی سے درخواست کی کہ وہ بھی اسی تیل گاڑی پر سوار ہو جائیں جس پر بیٹھ کر وہ مرکز واپس جا رہے ہیں۔ حاجی عبدالرحمن اصلاً ایک نو مسلم تھے اور مکمل طور پر جماعت تبلیغ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے سرگوشی کے انداز میں مولانا نعمانی سے پوچھا ”مولانا یہ تو بتائیے کہ آپ کون سی جگہ چلے گئے تھے جو ”حضرت جی“ (حضرت مولانا الیاس صاحب کو حضرت جی کہا جاتا تھا) آپ کے بارے میں اتنے فکر مند ہوئے تھے۔ اسکے بعد حاجی عبدالرحمن نے انہیں حسب ذیل واقعہ سنایا۔

قریباً دو ڈھائی برس پہلے (۱۹۶۰ھ یا ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء) کی بات ہے۔ گرمیوں کی ایک دوپہر میں ”حضرت جی“ میرے حجرہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے تم سے اس وقت ایک ضروری بات کرنی ہے۔ پھر مجھ سے دریافت فرمایا ”تم مولانا منظور نعمانی کو جانتے ہو“ میں نے کہا ”مجھے تو یہ نام یاد نہیں آتا“ فرمایا وہ جن کا ایک رسالہ نکلتا ہے اور جو بدعات اور اہل بدعت کا رد کرتے ہیں“ میں نے کہا ”ہاں ان کو تو میں جانتا ہوں۔ فرمایا کہ وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں۔ ہمیں ان کے لئے دعا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کو وہاں سے نکال لے۔ پھر ہم دونوں نے اسی وقت نماز پڑھ کر ان کے لئے دعا کی۔

حاجی عبدالرحمان کی زبانی یہ واقعہ سن کر مولانا منظور نعمانی کو خیال آیا کہ غالباً یہ اسی زمانے کی بات ہوگی جب وہ جماعت اسلامی کے اس وقت کے مرکز دارالاسلام میں قیام کی غرض سے جمال پور (مشرقی پنجاب) چلے گئے تھے۔ اگرچہ اس وقت تک مولانا الیاس یا ان کی تبلیغی جماعت سے مولانا نعمانی کا کوئی خاص تعلق نہیں تھا لیکن اسکے بعد بہت عرصہ نہیں گزرا کہ مولانا منظور نعمانی بالآخر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں غالباً اپنے خاص ذوق و مزاج کی مناسبت سے انہیں ہونا ہی چاہئے تھا۔

یہاں سے ”الفرقان“ کی دعوت کا ایک نیا دور شروع ہوا جس کا خاص محور اور مرکزی نقطہ یہ قرآنی دعوت تھی کہ ”اے مسلمانوں سچے مومن بن جاؤ“۔ اور ”اے مسلمانوں پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ“۔

آزادی کے بعد کا ہندوستان اور پاکستان

۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو جن سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان میں تعلیم، پرسنل لا اور مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کے مسئلہ کے علاوہ پاکستان بنوانے کی پاداش میں مسلمانوں کی خونریزی اور بھیاںک مسئلہ

کش فسادات کا ایک طویل سلسلہ بھی تھا۔ مولانا منظور نعمانی مسلمانوں کو درپیش ان مسائل و مشکلات کے بارے میں فکر مند ہی نہیں رہے بلکہ ان سے بچنے کی تمام اجتماعی کوششوں میں عملاً شریک ہوئے خواہ اتر پردیش کی دینی تعلیمی کونسل ہو یا ہندوستانی مسلمانوں کی کل جماعتی تنظیم مسلم مجلس مشاورت ہو، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہو، یا ملی ہفتہ وار ”ندائے ملت“ کے اجرا کی مہم ہو مولانا نعمانی ہر جگہ پیش پیش تھے۔

۱۹۶۵ء میں مولانا منظور نعمانی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی مجلس تاسیس کے رکن منتخب ہوئے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کا پاسپورٹ گم ہو چکا تھا اور حکومت نے انہیں نیا پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال یہ مسئلہ تو کسی طرح حل ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد انہیں صدر جمہوریہ (۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (۱۸۹۷-۱۹۶۹) کی طرف سے یہ پیغام موصول ہوا کہ وہ رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کیلئے سعودی عرب روانہ ہو، میں ان سے ملاقات کریں۔ چنانچہ اسی سفر کے سلسلہ سے دہلی پہنچنے پر اس ملاقات کے دوران ذاکر حسین خاں صاحب نے مسئلہ کشمیر کا ذکر کیا تو مولانا ہندوستانیت میں تو کسی شک و شبہ کا سوال نہیں ہونا چاہیئے۔ البتہ جو رائے رکھتے ہیں وہ حکومت ہند کی پوزیشن سے قدرے مختلف ہے۔ اس لیے اگر یہ مسئلہ رابطہ عالم اسلامی میں آیا تو ہم اپنی رائے کے خلاف کوئی موقف تو اختیار نہیں کر سکتے لیکن ہمیں اپنی ہندوستانیت کا لحاظ رکھنا بھی قدرتی طور پر عزیز ہو گا۔

درکئے جام شریعت و درکئے سند ان عشق!

مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود مولانا منظور نعمانی نے اپنے علمی مشاغل کی طرف سے کبھی تساہل نہیں برتا۔ ماہنامہ ”الفرقان“ کی ادارت کے ساتھ ساتھ انہوں نے سو (۱۰۰) یا اس سے بھی زائد کتابیں اور رسائل اردو میں تصنیف کیے جن میں سے بعض کے ترجمے انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ مولانا اپنی تمام کتابوں میں ”اسلام کیا ہے؟“ کو سر فہرست رکھتے تھے لیکن انہوں نے ”قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟“ ”آپ حج کیسے کریں؟“ ”اور آسان حج“ جیسی متعدد مقبول عام علمی اور تحقیقی کتابیں بھی لکھی ہیں۔۔۔ دین کی عام فہم تشریح و ترجمانی میں مولانا کا اہم ترین کارنامہ سات جلدوں پر مشتمل

ان کی ”معارف الحدیث“ ہے۔

مولانا نے ”معارف الحدیث“ کی آٹھویں جلد نامکمل چھوڑی ہے جو انشاء اللہ اب بعد میں شائع ہوگی۔

مولانا منظور نعمانی کسی زمانے میں ایک زبردست مناظر رہے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں جب آیت اللہ خمینی نے شاہ ایران کا تختہ پلٹ دیا تو ان کی اس کامیابی کو بعض حلقوں نے ”اسلامی“ انقلاب کے ایک قابل تقلید نمونہ پر محمول کیا۔ مولانا منظور نعمانی کا موقف اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے اردو زبان میں ”انقلاب ایران، امام خمینی اور شیعیت“ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ مولانا نعمانی کی یہ ایک ایسی فاضلانہ اور محققانہ تصنیف ہے کہ اس میں اٹھائے گئے نکات اور ان کے تائیدی حوالوں کی آج تک تردید نہیں کی جاسکی۔

انقلاب ایران کے بعد عربوں اور ایرانیوں کے مابین پیدا ہو جانے والی سیاسی چپقلش کے پس منظر میں ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کتاب کی اشاعت کے پیچھے سعودیوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن ۱۹۸۳ء میں جب کتاب کے مصنف نے رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں اس موضوع سے کسی کو دلچسپی نہیں (۱) بلکہ سعودی حکومت نے اس کتاب کے عرب میں داخلہ کی اجازت بھی برسوں بعد دی۔

مولانا محمد منظور نعمانی جماعتوں اور اداروں کی حد بندیوں میں محدود رہنے والے آدمی نہ تھے۔ دارالعلوم دیوبند وہ واحد ادارہ ہے جسکی مجلس شوریٰ سے وہ آخر تک وابستہ رہے لیکن ایک مرحلہ پر وہ اسکی رکنیت سے بھی مستعفی ہونا چاہتے تھے۔ اس اقدام سے انہیں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نے باز رکھا۔ مولانا نعمانی بذات خود ایک ادارہ تھے۔

(ترجمہ عبید الرحمن سنہلی)



(۱) الفرقان) یہ سرفی الواقع اسی موضوع کی خاطر ہوا تھا۔ ورنہ سالہا سال سے رابطہ کے اجلاس میں شرکت اپنی سخت معذوریوں کی بنا پر چھوٹی ہوئی تھی۔

”ترجمان دارالعلوم“ دہلی  
مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

## خدا رحمت کند ایں عاشقانِ رپاک طینت را

بر صغیر ہندوپاک کی عظیم اسلامی شخصیت مولانا محمد منظور نعمانی  
کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے اور ۹۲ برس کے مسلسل سفر کے بعد ۴ مئی  
ابدی نیند سو گئے۔ نور اللہ مرقدہ۔

مولانا نے وسطانی تعلیم دارالعلوم منو اعظم گڑھ میں حاصل کی۔  
کے لئے .. دارالعلوم دیوبند گئے، سن کر گئے تھے کہ دیوبندی رسول اللہ ﷺ  
ماننے، رسول کی توہین کرتے ہیں، بد عقیدہ بلکہ کافر ہیں، لیکن جب سنبھل کی فضا سے نکل کر  
دیوبند پہنچے تو وہاں صحابہ کرام کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھیں، حدیث و فقہ کا چچا دیکھا، عجیب  
سے عجیب شخصیتیں دیکھیں، شاہ انور صاحب کا علم حدیث کا طنطنہ نظر آیا اور پورا دارالعلوم علوم و  
فنون ہی نہیں تربیت اور آداب نبوت کا مجسمہ نظر آیا۔

ایک ایسا طالب علم جو منو سے حمد اللہ، شمس بازنہ، اور قاضی مبارک جیسی کتابوں سے  
منطق و فلسفہ سیکھ کر آیا ہو اور جس کی خاندانی شہرت بریلویت سے متاثر ہو، وہ دیوبند پہنچ کر  
حیران ضرور ہوا ہو گا مگر اس کے ضمیر نے گواہی دی کہ یہاں علم دین اور نبوت کی روشنی ہے،  
اس لئے کہ اس کو دیوبند میں اتباع رسول کی دولت مل گئی، علوم نبوت کا خزانہ مل گیا، اور ایمان و  
اسلام کی لذت نصیب ہو گئی، اس لئے عمر بھر کے لئے مسلک دیوبند کا ترجمان دارالعلوم کا نمائندہ  
اور اکابر اسلام کا عاشق زار بن گیا۔ پھر اس خوش نصیب پر یہ رنگ اس قدر غالب آیا کہ ۹۲ سال  
کی طویل عمر میں کبھی یہ رنگ پھیکا نہیں پڑا، بلکہ پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ ع  
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

(۲)

دیوبند سے مولانا جب سنبھل لوٹ آئے تو وہاں مولانا احمد رضا خاں صاحب اور مولانا حشمت علی خاں صاحب کا بریلوی فکر اپنے شباب پر تھا۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری اور مولانا معظم علی صاحب جیسے حضرات مسلک دیوبند کی تردید و اشاعت میں سر سے کفن باندھ کر میدان میں کھڑے تھے، ایک طرف سے کفر و تکفیر کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، دوسری طرف مولانا مرتضیٰ حسن کی چاندنی پھیلتی جا رہی تھی، بحث و نظر، مناظرہ اور مجادلہ کا بازار ہی نہیں گرم تھا، میدان جنگ گونج رہا تھا، ایسے میں سنبھل کا یہ نوجوان تماشہ نہیں دیکھ سکتا تھا، اس لیے اپنی فطرت کے مطابق میدان میں اتر گیا اور اس جرات و ہمت کے ساتھ اتراکہ اس نے اپنا دفتر ہی بریلی شریف میں کھول دیا۔ اور وہیں سے ”الفرقان“ جیسے ماہانہ پرچے کو جاری کر کے کفر و بدعت، بد زبانی اور مولانا حشمت علی خاں صاحب کی گالیوں پر بند باندھنا شروع کر دیا، آج ہم دیکھتے ہیں کہ بریلویت کے ہر حملے کا جواب دے کر، ہر نامعقولیت کا پول کھول کر، ہر کفر کی بنجیہ ادھیڑ کر اور ہر گالی کا مذاق اڑا کر مولانا نے اور ان کے ہمنواؤں نے کتابوں کا وہ ذخیرہ تیار کر دیا جو ہمیشہ کے لئے اس جنگ کا خاتمہ کر سکتا تھا، چنانچہ آج وہ جنگ سرد ہو چکی ہے اور اس میں بڑا حصہ حضرت مولانا کا ہے اور اسی معرکہ آرائی میں مولانا نے اپنے کو سنبھلی کے بجائے نعمانی کہنا شروع کر دیا۔ **رد اللہ مصححہ**

(۳)

مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جو بات سامنے آتی اس کا علمی یا جذباتی یا تجرباتی تجزیہ کر کے سمجھنا جانتے تھے کہ حق کیا ہے باطل کیا۔ مگر اتنا تو ہر صاحب عقل کر لیتا ہے

گھیر لیتا ہے جب ان کو باطل کہیں  
دل کے اندر سے کہتا ہے کوئی بزن

یہ تھا مولانا کا حال اور اسی حال میں انھوں نے پوری عمر گزار دی۔ ظاہر ہے کہ ہر معرکہ میں اپنا موقف بنانا اور پھر اس کے لئے جدوجہد کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے، اس لئے مولانا کو کئی بار ٹھوکریں لگیں۔ ناکا میابی ہوئی اور مسلسل ہوئی مگر وہ کسی حال میں نچلے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ یہی مرحلہ زندگی کا سب سے سخت اور خطرناک مرحلہ ہوتا ہے اور اس مرحلے میں خدا کی توفیق



میسرنہ آئے تو آدمی بہک جاتا ہے، یا برباد ہو جاتا ہے، اور توفیق میسر آجائے تو سنبھل جاتا ہے، راستے پر آ جاتا ہے، اور نفس مطمئنہ کی دولت تک پہنچ جاتا ہے۔

حضرت مولاناؒ اپنی ابتدائی زندگی میں مولانا مودودی صاحبؒ کے ساتھ بھی وابستہ ہوئے اور جماعت اسلامی کی تاسیس میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ وابستگی بڑی پر جوش اور سرگرم تھی لیکن اس کے باوجود جب ان کو محسوس ہوا کہ ان سے فکر و نظر کی غلطی سرزد ہوئی ہے، تو مودودی صاحب سے علاحدگی اختیار کرنے میں دنیا کی شرم یا کوئی اور چیز رکاوٹ نہ بن سکی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کسی تحریک سے وابستہ ہونے اور اس کی طرف دوسروں کو بھی پوری قوت سے دعوت دینے کے بعد اس سے علاحدہ ہونا نفسیاتی طور پر بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے اور یہ فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو تلاش حق کا سچا جذبہ اور اپنی غلطی کے اعتراف کی اخلاقی جرأت رکھتا ہو۔

(۴)

مولاناؒ کی قوت فیصلہ اور تلاش حق ان کا فن تھی، چنانچہ وہ ”مدرسہ د سرپرست تھے اور راقم الحروف مہتمم تھا۔ مولاناؒ کے بعض مریدین نے مولاناؒ کو فضائل یہاں لیڈری کرتا ہے، پڑھاتا کچھ نہیں، اس سے لڑکے بیزار ہو رہے ہیں مولاناؒ کا ذہن میری طرف سے غیر مطمئن کرنے کی یہ باریک چال تھی، مگر مولاناؒ اس جال میں اس وجہ سے نہیں آئے کہ انھوں نے اس شکایت میں حقیقت کی جستجو شروع کر دی، صبح کو مجھ سے فرمایا کہ سب سے بڑی جماعت کے بچوں کو میرے پاس بھیج دو۔ یہ اچانک حادثہ تھا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میرا امتحان لینے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ اس وقت شرح جامی میں گیارہ لڑکے تھے، میں نے انھیں درس گاہ میں بٹھا دیا اور مولاناؒ کو بلا کر وہاں سے چلا گیا۔ مولاناؒ نے لڑکوں سے شرح جامی کی عبارت پڑھوائی، ترجمہ کر لیا، مطلب پوچھا، چونکہ اس جماعت میں بڑے ہونہار لڑکے تھے سبھی نے بے دھڑک عبارت پڑھی، بے لاگ ترجمہ کر دیا، اور مطلب بتا دیئے تو مولاناؒ کو حیرت ہو گئی اور بہت خوش ہوئے، پھر مجھے بلا کر بچوں کی تعریف کی اور اس طرح کی شکایت پر بھروسہ نہیں کیا۔ . . . پھر انھوں نے شکایت کرنے والوں سے کیا کہا یہ مجھے معلوم نہیں مگر وہ لوگ حیران رہ گئے کہ ان کا نشانہ خطا کر گیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ پھر بھی باز نہیں آئے۔

یہ تھا مولاناؒ کا مزاج کہ حق کیا ہے، غلط کیا؟ اس کی کھوج کرتے تھے۔ معمولی سے معمولی

کام میں اور بڑے سے بڑے مرحلے میں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اسی تلاش و جستجو اور پھر اسکے استحکام پر خرچ کر دی اسلئے اپنی اس خصوصیت میں وہ تمام علماء میں ممتاز تھے۔

(۵)

مولانا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ اور انکی اسی رکنیت کے زمانے میں دارالعلوم میں وہ انقلاب عظیم آیا جس نے دیوبند کی چولیس ہلادیں اور ممبران شوریٰ کو آزمائش میں ڈال دیا۔ جشن صد سالہ کے بعد جب عالمی مؤتمر اہناء قدیم اور تنظیم فضلاء دارالعلوم کے نام سے دارالعلوم دو گروپوں میں تقسیم ہو گیا تو مولانا نعمانیؒ غیر جانب دار تھے مگر حالات سے پوری واقفیت رکھنا چاہتے تھے۔

مولانا کا ذہن مولانا اسعد صاحب کی طرف سے صاف نہیں تھا کہ وہ سیاسی ہیں مگر قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی امانت و دیانت سے مطمئن تھے۔ دارالعلوم کی کشاکش کے بعد جب پہلی مجلس شوریٰ ہوئی تو اسمیں مجلس شوریٰ نے چند ایسے فیصلے کیے جو دارالعلوم کیلئے بنیادی اور ضروری تھے مگر اسے دارالعلوم کی انتظامیہ نے پسند نہیں کیا۔ یہ کشاکش اتنی بڑھی کہ حضرت مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ کو بلانا بند کر دیا تو دستور کی دفعات کا حوالہ دیکر خود اراکین نے مجلس شوریٰ طلب کر لی اور وہ مجلس شوریٰ بھی دارالعلوم کی انتظامیہ کو پسند نہیں آئی تو انتظامیہ نے طے کر لیا کہ مجلس شوریٰ اور دستور اساسی دونوں منسوخ کر کے ایک اڈھاک کمیٹی مقرر کر دی جائے، چنانچہ دہلی کے ”نمائندہ اجتماع“ نے مجلس شوریٰ توڑ دی اور دستور اساسی منسوخ کر کے اڈھاک کمیٹی کے ممبران کا اعلان کر دیا اور دستور کیلئے ایک کمیٹی بنادی گئی۔

اور وہ شخص جو بالکل غیر جانب دار تھے دارالفرقان لے کر مقابل میں آ گیا۔ اس نے حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے میں کسی کی مطلق پروا نہیں کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ملک کو مطمئن کرنا ممکن نہیں تھا۔

آپ دو سال کا الفرقان پڑھتے تو واضح ہو جائے گا کہ مولانا نعمانی کہاں سے چلے تھے اور کس کس طرح حضرت قاری صاحب کو معطل اور دارالعلوم سے علاحدہ کئے جانے تک کام کرتے رہے اور اس پر آنسو بہاتے رہے کہ حضرت قاری صاحب کے حواریوں نے ان کو کہاں لے جا کر کھڑا کر دیا ہے۔ پھر پنجائیت، وفود اور ثالثی وغیرہ کی تمام کاروائیاں سامنے رکھ دی ہیں۔ ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ دارالعلوم کے مسئلے میں حق کیا تھا، غلط کیا تھا، اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے حضرت قاری صاحب کی حالت بہت قابل رحم بن گئی تھی۔ اور دارالعلوم تقسیم ہو گیا تھا۔

ان حالات میں اچھے اچھوں کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں مگر مولانا نعمانی صاحب لکھنؤیا دیوبند کہیں خاموش نہیں ہوئے، برابر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔ یہ تھا مولانا نعمانی کا مزاج، ان کا موقف اور ان کا کردارِ عالی ع  
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہ سب حضرات خدا کی بارگاہ میں حاضر ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائے، سب کی کمزوریوں کو معاف فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کو پھر جاگیر داری کے چکر سے نجات دلائے۔

(۶)

ہم حضرت مولانا نعمانیؒ کی رحلت کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ انشاء اللہ مولانا کے لئے ایصالِ ثواب کی پوری کوشش کریں گے۔ ان کا ہم پر حق ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صبر و سکون میسر فرمائے اور مولانا مرنے والی دینی خدمات کا بہتر سے بہتر صلہ عطا کرے۔ (ترجمان دارالعلوم بابہ۔)

☆☆☆

### ہماری دو اہم مطبوعات

(۱) پرانے چراغ معاصر شخصیتوں، بزرگوں، استادوں اور دوستوں سے متعلق تعارفی مضامین،

تاثرات، مشاہدات و واقعات اور معلومات کا دلچسپ مجموعہ۔ مکمل تین جلدوں میں۔ قیمت -/210

(۲) آپ بیتی حضرت مولانا عبد الماجد دریابادیؒ اردو کے مشہور صاحب طرز

ادیب اور مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے قلم سے نکلی ہوئی آپ بیتی اور خوشنویسی سوانح عمری، جسمیں گزشتہ لکھنؤ اور اودھ کی ثقافت و تہذیب، مشاہیر دین و ادب، ممتاز معاصرین و احباب کے جیتے جاگتے تذکرے اور چلتی پھرتی تصویریں بھی موجود ہیں۔

آپ بیتی میں مولانا کے جادو نگار قلم نے اپنی گزشتہ زندگی کے ساتھ عہد رفتہ کو اس طرح آواز دی ہے کہ حال معلوم ہونے لگتا ہے۔

قیمت -/75

تیسرا ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

ملنے کا پتہ : مکتبہ فردوس، مکارم نگر، برولیا، لکھنؤ - ۷

ماہنامہ ”الرشاد“ اعظم گڑھ

مولانا مجیب اللہ ندوی

## بزمِ ملتِ اسلامیہ کا ایک اور چراغ گل ہو گیا

ناظرین الرشاد کو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے جانکاہ حادثہ وفات کی اطلاع ضرور مل چکی ہوگی، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

موت تو ہر انسان کے لئے مقدر ہے اور اس کی خبریں ہمارے کانوں میں روزانہ پڑتی رہتی ہیں مگر بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کانوں اور آنکھوں سے گزر کر دل و دماغ کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ تڑپا دیتی ہیں اور ان کی چیھن برسوں محسوس ہوتی ہے۔ انہیں میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا حادثہ وفات ہے، ان کی موت کسی عام انسان کی موت نہیں ہے بلکہ ایک عالم باعمل، ایک فاضل اجل، ایک داعی بے بدل اور ملت کے لئے درد مند اور پرسوز دل رکھنے والے کی موت ہے۔

دو تہائی صدی تک ملت کے مشکل مسائل کے حل کرنے کیلئے جن دو چار شخصیتوں کی طرف نگاہ اٹھتی تھی ان میں ایک نمایاں مقام انھیں بھی حاصل تھا، جماعت اسلامی کی تشکیل ہو، مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام ہو یا دینی تعلیمی کونسل کے قیام کا آغاز ہو یا تبلیغی جماعت کی ابتدائی نشوونما ہو، ان سب میں پورے خلوص کے ساتھ حصہ لیا اور اس کے لئے نہ تو ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا کی اور نہ ذاتی نفع و نقصان کی ترازو میں اسے تولتا اور نہ بڑے بڑے آدمی کے سامنے اپنی رائے دینے سے گھبرائے، جو بات صحیح سمجھ میں آئی اس میں دل و جان سے لگ گئے اور اگر غلط معلوم ہوئی تو اس سے برأت کا اظہار کرنے میں بھی تامل نہیں ہوا، بعض لوگ اس کو ان کی کمزوری پر محمول کرتے تھے مگر یہ ان کی حق پرستی کی بات تھی کہ

امت کے مسائل کے سلسلہ میں نہ انہیں خریداجا سکا اور نہ وہ کسی کے سامنے جھکے اور نہ کسی کی کاسہ لیلیٰ کی، وہ اس شعر کے مصداق تھے۔

قیمتیں کھوکھو کے جو بازار خوشامد میں چلیں

ایسے سکتے میری خودداری نے کم ڈھالے ہیں

مولانا نے ابتدائے جوانی میں کچھ دن مناظرہ کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے مگر جلد ہی اس سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اور مثبت علمی و دینی کام ہی کو اپنا مشغلہ بنایا، علمی و دینی کام کی ابتدا انہوں نے رسالہ الفرقان کی اشاعت سے کی۔ مگر الفرقان اور مولانا کا باوقار تعارف اس وقت ہوا جب انہوں نے الفرقان کا مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ نمبر نکالا، یہ بھی ایک عزیمت کی بات تھی کہ انہوں نے ان کاموں کی ابتدا بریلی جیسے اظہار حق کے لئے ناموافق مقام سے کی، ایک شخص مولانا سے ملنے گئے۔ ان کو پورا پختہ یاد نہیں تھا، انہوں نے کسی شخص

الفرقان کا دفتر کہاں ہے؟ وہ مخالف کیمپ کا کوئی دل جلا آدمی تھا، اس نے جواب دیا۔

آسمان پر ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کتنے سخت ماحول میں۔

برسوں کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب کے مشورے سے لکھنؤ منتقل ہو۔

سے الفرقان اور کتابوں کی اشاعت کا وسیع کام آپ نے شروع کیا۔

مولانا نے کئی درجن دینی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، جن میں بعض اپنی مثال آپ ہیں۔ عام پڑھے لوگوں کے لئے ان کی کتاب اسلام کیا ہے؟، ہزاروں ہزار کی تعداد میں چھپی اور بچی، پھر دین و شریعت میں اسلام کے عقائد اور دین و شریعت کی انہوں نے جس متوازن اور مدلل انداز میں تشریح کی ہے وہ عام علماء اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بہترین کتاب ہے، ان کتابوں کے علاوہ ان کی سب سے معرکہ الآراء کتاب معارف الہدیث ہے، جس کی اب تک چھ جلدیں (۱) شائع ہو چکی ہیں۔ یہ حدیث نبوی کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے پڑھنے کے بعد اسلامی تعلیمات کے بارے میں مختلف قسم کے شبہات ان کی سادہ مگر فنی انداز کی تشریحات سے خود بخود دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر جن حدیثوں میں کچھ تناقض نظر آتا ہے اسکی ایسی متوازن توجیہ اور تطبیق کرتے ہیں کہ اس کا تناقض دور ہو جاتا ہے، حج کیسے کریں؟ بھی ان کی مقبول ترین کتاب ہے، ان کے علاوہ کئی درجن کتابیں ہیں۔

عام طور پر موجودہ دور میں جو علماء کسی دینی، علمی یا تعلیمی کام میں لگتے ہیں وہ عام ملت

کے اجتماعی کاموں سے کم دلچسپی رکھتے ہیں، مگر آج سے ۵۰ برس پہلے کے علماء درس و تدریس یا دعوت و تبلیغ یا تصنیف و تالیف کے کام کے ساتھ ملت کے اجتماعی مسائل سے بھی نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ اس راہ میں قربانی کے لئے بھی تیار رہتے تھے۔ اب اُس دور کے زیادہ تر علماء کی رہنمائی سے یکے بعد دیگرے ہم محروم ہوتے جا رہے ہیں جن میں مولانا موصوف بھی تھے۔

مولانا کی طبیعت میں حد درجہ رقت تھی۔ عام طور پر ان کی تقریروں اور مجلس گفتگو میں اور بسا اوقات نماز میں بھی اس کا اظہار ہوتا رہتا تھا، راقم الحروف کے ساتھ ان کا سلوک انتہائی مشفقانہ تھا۔ جب تک وہ مرکز کی مسجد میں قیام پذیر رہے جب لکھنؤ جانا ہوتا تو راقم الحروف وہیں ٹھہرتا تھا، عام طور پر فجر کی نماز کے لئے وہ اکثر احقر کو آگے بڑھا دیتے، ایک بار سورہ ”ق“ پڑھی تو لا تحنصموا للدیٰ دلی آیت پر نماز ہی میں زار و قطار رونے لگے، اور پھر نماز بعد دیر تک اس پر گفتگو فرماتے رہے۔ راقم الحروف کی جب کوئی تحریر جاتی تو بڑے شوق سے اس کو شائع فرماتے، احقر نے جامعہ الرشاد میں تعلیمی سال کے اختتام پر طلبہ کے سامنے ایک وداعی تقریر کی جس کو مدرسہ کے ایک استاذ مولانا انعام الحق صاحب نے مرتب کر کے الفرقان میں بھیج دیا۔ حضرت مولانا نے اس پر ایک اچھا نوٹ لکھ کر اسے شائع کر دیا۔ یہ پرچہ جب شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے رمضان المبارک میں کئی سو کے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر طالب علم اور استاذ کو پڑھنا چاہئے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ وہاں موجود تھے، ان کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا کہ دوسرے ہی دن انہوں نے احقر کو خط لکھا کہ تمہارا یہ مضمون انشاء اللہ عند اللہ مقبول ہو گا اور حضرت شیخ الحدیث کی اس عزت افزائی کا ذکر فرمایا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند میں جب اختلافات شروع ہوئے تو میں نے ان کو قاری صاحب کی حمایت میں ایک سخت خط لکھا، انہوں نے اس کا برا نہیں مانا، کچھ دن بعد ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ تمہارے جذبات قابلِ قدر ہیں مگر حالات کی وجہ سے بعض اوقات رائے بدلنی پڑتی ہے۔

ان کی پاکیزہ زندگی ان کے دقیق دینی، ملی اور علمی کارنامے زبان حال سے یہ شعر پڑھ

رہے ہیں۔

جان کر من جملہ ارباب میخانہ مجھے مد توں رو دیا کریں گے جام و پیانہ مجھے

مجلہ ”الماثر“۔ مئو

مولانا ابوبکر غازی پوری

## علم و دین کا ایک چراغ اور بجھا

۲۲ مئی کو سفر حج سے واپسی ہوئی، امسال مئی میں آتش زدگی کے واقعہ پہلے ہی سے متاثر تھے، سینکڑوں حجاج کی موت کا نقشہ نگاہوں کے سامنے تھا، اے کو دوروز بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ اطلاع ملی کہ جماعت دیوبند کے قابل سب کے مخدوم حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ۳۲ مئی کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ ا۔۔۔ الیہ راجعون۔

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ اطلاع تھی کہ وہ ادھر کئی سال سے صاحب فراش ہیں، لیکن ایسی کوئی اطلاع نہیں تھی کہ ان کی بیماری کا حال کچھ ایسا ہے کہ وہ ہم سے یوں دیکھتے دیکھتے رخصت ہو جائیں گے، مولانا مرحوم نے اسی بیماری میں بستر پر پڑے پڑے اپنی وہ مایہ ناز کتاب تصنیف کی جس نے قصر خمینیت کی چولیس ہلادیں، ہندوستان کی ساکت فضا میں ایک گونج پیدا کر دی، حق بات کا کہنا اور حق کیلئے لڑنا مولانا مرحوم کا خاص امتیاز تھا۔ اس بارے میں کسی قسم کی مداخلت کا وہ کبھی، شکار نہیں ہوئے، نہ وقت کی مصلحتوں نے ان کو کبھی اظہار حق سے روکا، انھوں نے اسی اظہار حق کی خاطر بعض اپنے ان رفقاء سے بھی رشتہ توڑ لیا جن سے ان کا زندگی بھر کا ساتھ تھا اور یہ بات کبھی کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ مولانا مرحوم کا رشتہ ان سے بھی ٹوٹے گا، مگر مولانا مرحوم کے نزدیک رشتہ اور قرابت سے زیادہ اہم چیز تھی عقیدہ و مسلک کی حفاظت، اسلاف کے ناموس کا دفاع، اس کے لئے مولانا نے ان کی پوری زندگی شاہد ہے کسی طرح کی کوئی سودے بازی نہیں کی، اور نہ جس چیز کو انھوں نے حق جانا اس کے اظہار سے کبھی ان کی زبان خاموش رہی، خواہ اس کیلئے ان کو بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑی ہو۔

مولانا مرحوم عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے اپنے اکابر دیوبندر رحمہم اللہ کے سچے چانشین تھے، دیوبندیت اپنی پوری روح کے ساتھ مولانا مرحوم کے اندر رچی بسی تھی، یہی وجہ تھی کہ ان کے قلم اور ان کی زبان نے ہر باطل اور ہر فتنہ کا مقابلہ کیا اور کسی تساہل کا کبھی شکار نہ ہوئے بریلویت کی جڑ انھوں نے خود بریلی میں قیام کر کے اکھاڑ ڈالی، الفرقان کا اجراء اللہ کے اس شیر نے بریلی سے کیا جہاں اس عقیدہ و مذہب کے بڑے بڑے جغادری تھے اور حق یہ ہے کہ مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تنہا جس پامردی و جواں ہمتی سے اس فتنہ کا سد باب کیا یہ انھیں کا حصہ تھا، اور بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مناظروں اور انکی تحریروں نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا اور کم از کم رضا خانی علماء علم و عقل کی راہ سے اپنی بات کہنے سے عاجز ہو چکے ہیں، یہ مولانا نعمانی مرحوم کا وہ کارنامہ ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ بھلا نہیں سکتی۔

مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مودودی کی تحریرات سے متاثر ہو کر اور محض اخلاص کے جذبہ سے جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی تھی، اور ایک زمانہ تک جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے افکار و نظریات اور عقیدہ و مسلک کا بھرپور دفاع کیا جب تک کہ خود ان پر یہ حقیقت واشگاف نہ ہو گئی کہ جماعت اسلامی کی دعوت دین اسلام کی دعوت دین سے بالکل الگ ہے، مولانا نعمانی جماعت اسلامی میں جب تک رہے پورے اخلاص کے ساتھ رہے، انھوں نے اس بارے میں اپنے اکابر تک کی باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب وہ جماعت اسلامی سے الگ ہوئے تو بھی ان کی یہ علاحدگی محض اللہ کے لئے اور مخلصانہ تھی، اور جتنی شدت کے ساتھ مولانا نعمانی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کا دفاع کر رہے تھے جب جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی گمراہیاں ان پر کھل گئیں تو انھوں نے اتنے ہی اخلاص اور اتنے ہی شدت کے ساتھ ان گمراہیوں کو ظاہر بھی کیا

آخر زمانہ میں مولانا نعمانی کا یہ کارنامہ بھلایا نہیں جاسکتا جو انھوں نے خمینیت اور ایرانی انقلاب کے نام پر پیدا ہونے والے فتنہ کی حقیقت کو اپنی تحریرات سے ظاہر کر کے انجام دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایران کے انقلاب سے بہت سے لوگ حواس باختہ تھے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ خمینی کی شکل میں ایک مہدی وجود میں آگیا ہے اور اب خدا کی زمین فتنوں اور برائیوں سے پاک ہو جائیگی۔ اور اسلام اپنی پوری طاقت کے ساتھ دنیا میں حکمرانی کرے گا۔ یورپ اور امریکہ کی حکومتوں میں زلزلہ پیدا ہو جائیگا اور امام انقلاب خمینی صاحب دنیا کا نقشہ بدل دیں گے، مگر جو لوگ حقیقت کی نگاہ سے اس انقلاب کو دیکھ رہے تھے اور جن کے سامنے شیعت کی پوری تاریخ



تھی وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ ایک نیا فتنہ ہے جو اسلام اور ملت اسلامیہ کے لئے بڑی مشکلات پیدا کرے گا، چنانچہ بعد کے واقعات نے اسکی پوری تصدیق کر دی، خمینیت اور ایرانی انقلاب کی حقیقت سے مولانا نعمانی نے لوگوں کو متعارف کرایا، اور لوگوں کو اسکے فریب سے نکالا، مولانا مرحوم کا یہ کارنامہ تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے دین کا حقیقی داعی بنایا تھا، الفرقان کے پچاس سال سے زیادہ کی فائلیں اور مولانا کی تمام کتابیں اس کی شاہد ہیں کہ مولانا پر دین کی دعوت کا جذبہ غالب تھا، ان کی تحریر بڑی سنجیدہ باوقار اور سہل ممتنع اور موثر ہوتی تھیں، اپنی بات کو دل میں اتار دینے کا ان کو ملکہ حاصل تھا، کسی کی تحریر کی ایسی اثر انگیزی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی تحریرات تکلف سے پاک بہت سادہ مگر بے پناہ تاثیر کی حامل ہوتی تھیں، ان کی آواز ہے، 'نہ معلوم کتنی زندگیوں میں اسلام کی روح پھونک دی، اللہ نے اس کی دور حاضر کی دوسری کتابیں بہت کم ایسی ہیں جن کو ایسی مقبولیت حاصل ہو نے اپنی زندگی کو عملی بنانے میں ان سے اتنا فائدہ اٹھایا ہو جتنا انھوں نے اٹھایا ہے۔'

مولانا مرحوم کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، علم کی محفل میں ایسی تابندہ روزگار شخصیتیں بہت کم آتی ہیں اور جب وہ رخصت ہو جاتی ہیں تو ان کی جگہ پر نہیں ہوتی، مجلہ المآثر کا شمارہ بالکل تیاری کے مراحل میں ہے اس کے مدیر محترم مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی ابھی سفر حج سے واپس نہیں ہوئے ہیں، یہ مجلہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب محدث اعظمی کی یاد میں نکل رہا ہے، محدث اعظمی سے مولانا نعمانی کا رشتہ تلمذ کا تھا، المآثر کے سرپرست مولانا رشید احمد صاحب اعظمی کی خواہش تھی کہ اسی شمارہ میں مولانا نعمانی پر ایک تعزیتی تحریر آجائے، انھوں نے راقم کو حکم دیا اور بجلت تمام یہ چند سطریں تحریر کر دی گئیں۔ بہر حال یہ احساس ستارہا ہے کہ اگر موقع ہوتا تو اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت تھی۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے، بال بال ان کی مغفرت فرمائے، ان کی لغزشوں کو درگزر کرے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

راقم الحروف، ادارہ المآثر اور مدرسہ مرقاة العلوم کے تمام ذمہ دار و مدرسین مولانا مرحوم کے صاحبزادگان کی خدمت میں اس حادثہ فاجعہ پر اپنے قلبی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو صبر و سکون کی دولت سے نوازے۔ (آمین)

ماہنامہ ”ختم نبوت“ ملتان (پاکستان)

## ترجمانِ علماءِ حق کا وصال

اس ماہ مئی میں ہم سے جدا ہونے والی پہلی اہم شخصیت، اکابرِ اسلاف کی نشانی، محقق و مؤلف، علماءِ حق کے ترجمان، قدوةِ الاتقیاء والصلحاء حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی ہے، ماہ ذی الحجہ کو حج کے موقع پر اطلاع ملی کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی پر بیماری کا شدید حملہ ہوا ہے اور ان کو اسپتال میں آئی سی یو میں داخل کر دیا گیا۔ چند دن بعد اطلاع ملی کہ حضرت رحمۃ اللہ کا وقت موعود آ پہنچا اور حضرت مولانا نعمانی اپنے اسلاف کے پاس پہنچ گئے، ان کی وفات کی اطلاع ملتے ہی اہل حق انتہائی غمزدہ ہو گئے اور پوری دنیا میں تعزیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی موجودہ دور میں اکابرِ علماء کرام حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب حضرت جی کے قافلۃ الہی حق کے مجاہد سپاہی تھے، دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے تدریس و تحقیق اور تالیف کے میدان کو اپنا لیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی تالیف کے میدان میں اک دوسرے کے رفیق رہے، اس دوران آپ پر اسلام اور اہل حق کی حقانیت کے لئے مناظروں کا جذبہ پیدا ہوا اور ہندوستان میں آپ ایک عظیم مناظر کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آپ نے محسوس کیا کہ مناظروں کے ذریعہ اصلاح کا پہلو زیادہ ہو کر نہیں اس لئے ان سے آپ کی طبیعت اچاٹ ہو گئی اور آپ نے اپنی تمام تر توجہ تالیفات اور امت کی اصلاح کی طرف لگا دی۔ اس دوران آپ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ کے تبلیغی مشن کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت کی معیت میں اس سلسلے میں بہت زیادہ کام کیا۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات جز

فرمائے۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے وقت جن علماء کرام کو آپ کا قرب حاصل ہوا۔ ان میں مولانا محمد منظور نعمانی بھی شامل تھے اور حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی میں آپ کا مشورہ شامل تھا۔ بعد ازاں آپ حضرت مولانا یوسف صاحب حضرت جی کی معیت میں تبلیغی کام سے متعلق رہے اور آپ کی وفات تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دراصل مولانا محمد منظور نعمانی کے ذہن میں نوجوان نسل کی اصلاح کے لئے بہت زیادہ احساس تھا۔ اس بناء پر آپ نے تبلیغی کام کے ساتھ دنیا کی ہر اسلامی تحریک کا مطالعہ کیا اور جس تحریک کو مناسب سمجھا اس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اس احساس اور آپ کی عالمگیر فکر کی وجہ سے رابطہ عالم اسلامی میں آپ ابتداء سے شامل رہے اور رابطہ عالم اسلامی کے ذریعے پوری دنیا میں آپ نے تبلیغ دین کی اشاعت کی۔ اسی طرح دنیا کی بے شمار اسلامی تحریکات کے آپ تاسیسی رکن تھے۔ مولانا مودودی صاحب نے جب جماعت اسلامی کی تحریک کا آغاز کیا تو آ۔ ابوالحسن علی ندوی نے ان کے ساتھ تعاون کے بارے میں سوچا لیکن جب محض نظریات علماء سلف سے نہیں ملتے بلکہ علماء سلف کے متعلق ان کا ذہن بھی صاف ہے تو نہ صرف ان سے علیحدہ ہوئے بلکہ براءت کا بھی اعلان کیا اور ان کی ناکرتے رہے۔

۶۵ سال قبل آپ نے تحریری فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ”الفرقان“ رسالہ کا اجراء کیا، اس رسالے نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے ”نگاہ اولیں“ اور بہترین مضامین کی وجہ سے ابتدا ہی سے علماء کرام میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ ہندوستان جیسے ظلمت کدہ کفر میں اس رسالے نے ہمیشہ حق کی آواز بلند کی۔ ہر اسلامی موضوع پر بہترین تحقیق شامل کی۔ بقول مولانا عبدالرشید ارشد (صاحب بیس مردان حق) اس رسالے نے اپنے ۶۵ سالہ دور میں کبھی کوئی ایسی تحریر شائع نہیں کی جس کو ادب کی زبان میں ہلکی تحریر سے تعبیر کیا جاسکے۔ اپنے ۶۵ سالہ دور میں اس رسالے نے کئی نمبرات شائع کئے جو ایک علمی ذخیرہ ہیں۔ خاص طور پر ایرانی انقلاب کے بعد ”مینی سے متعلق فتویٰ“ نے پوری دنیا کے سامنے ایرانی انقلاب کی تصویر واضح کر دی اور امت مسلمہ کو ایک عظیم نقصان سے محفوظ فرمایا۔

تالیف کے میدان میں رب کائنات نے آپ کو خصوصی قبولیت کا درجہ عطا فرمایا۔ عام فہم زبان میں علمی مسائل کو امت کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ بڑے بڑے شبہات دور ہو گئے۔ ”اسلام کیا ہے؟“ آپ کی وہ عظیم تالیف ہے جس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ دنیا کی

اکثر زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اس کتاب کو خالی الذہن ہو کر پڑھنے والا شخص اسلام کی حقانیت کی تصدیق کئے بغیر نہیں رکھ سکتا۔ اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کے دور میں اس کتاب نے پوری دنیا کے سامنے اسلام کی اصل تصویر پیش کی۔ معارف الحدیث کے عنوان سے آپ کے حدیث سے متعلق سلسلے نے جواب کتابی شکل میں کئی جلدوں پر مشتمل ہے علماء کرام کے حلقے میں ایسی مقبولیت حاصل کی کہ کوئی عالم دین اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ انگریزی زبان میں اس کے تراجم نے یورپ اور امریکہ کے مسلمانوں کی بہت زیادہ رہنمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ دین و شریعت، قرآن آپ سے کیا کہتا ہے، تذکرہ مجدد الف ثانی، ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ، تصوف کیا ہے؟، نماز کی حقیقت، نماز اور خطبہ کی زبان، آپ حج کیسے کریں؟، آسان حج، منتخب تقریریں، میری طالب علمی، آپ کون ہیں کیا ہیں اور آپ کی منزل کیا ہے؟، قرب الہی کے دور استے، قرآن وحدیث کی سودائیں، انسانیت زندہ ہے، شاہ اسماعیل شہید اور معاندین اہل بدعت، فیصلہ کن مناظرہ، کلمہ طیبہ کی حقیقت، برکات رمضان، تاریخ میلاد، عقیدہ علم غیب، مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات، مسئلہ حیات النبیؐ کی حقیقت، ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت، آپ کی وہ قابل قدر تصانیف ہیں جس کی ضرورت ہر اہل علم محسوس کرتا ہے۔

اپنے استاد محترم محدث العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے قادیانیت کے خلاف جہاد کا جذبہ آپ کو علمی وراثت کے طور پر ملا تھا۔ اس لئے اس موضوع پر بھی آپ نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنے استاد محترم کے مشن پر قلم اٹھایا اور قادیانی کیوں مسلمان نہیں، قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ، کفر اور اسلام کے حدود اور قادیانیت، آپ کی وہ کتابیں ہیں جس کی وجہ سے قادیانیت کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ کرنا بہت آسان ہو گیا۔ تصوف کے میدان میں آپ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ تھے۔ مبر و شکر کے آپ مثالی پیکر تھے۔ بقول آپ کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمن سنبھلی (۱) مرض وفات کے موقع پر۔

”خوبہ ساری زندگی راں قال اور زماں حال سے اللہ تعالیٰ کا شکر سکھاتا رہا (یاد رہے کہ شکر کے سلسلے میں ان کا ایک خاص حال رہا ہے) وہ اب زبان قال بند ہو جانے پر صرف زبان حال سے مبر و شکر سکھاتا رہا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ وہ اکٹھ کھولتے ہیں۔ پاس میں بیٹھے ہوئے اور پاس میں ڈوبے ہوئے کسی شخص کو دیکھتے

ہیں اور ایک انگلی اٹھا کر کچھ اشارہ کرتے ہیں۔ شاید وہ اس حال میں بھی اسی وحدہ لا شریک کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کی طرف سدگاہ حد کی طرف توجہ مبذول کرانے ہی میں ان کی ساری زندگی گزری۔“  
( الفرقان جون ۱۹۹۷ء )

زندگی کے منازل کو کامیابی سے گزار کر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ اس عالم میں اہل حق سے رخصت ہوئے کہ اہل حق ان کی ضرورت بہت زیادہ محسوس کر رہے تھے۔ اکابر علماء کرام کی پے بہ پے روانگی قیامت کی طرف روانگی کا ایک عمل ہے کہ علم اٹھایا جانا حدیث مبارکہ کے مطابق علماء کرام کے اٹھائے جانے سے تعبیر ہے۔ آج اہل حق کے یہاں ہر شخص افسردہ ہے اور غمزدہ ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں اور دعاؤں سے محروم رہے۔  
امیر مرکزیہ مولانا خواجہ امیر خان محمد صاحب، نائب امیر مرکزیہ حیدرہیالوی، مولانا عزیز الرحمن جالندھری، مولانا اللہ وسایا، قافلہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مجاہدین مولانا محمد علی جالندھری شجاع آبادی، رضا کاران حضرت بنوری رحمہم اللہ جانشاران مفتی احمد الرحمان رحمہ کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر اشکبار ہیں اور پسماندگان کے اس غم کو اپنا غم تصور کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درجات کو بلند فرمائے اور آپ کے مشن اور صدقات جاریہ کو تاقیامت جاری و ساری رکھے۔ (ماہنامہ ختم نبوت، ملتان، پاکستان) =

## ذرا توجہ فرمائیں!

اگر آپ کو یہ خاص نمبر رجسٹری فیس نہ بھیجنے کے باوجود رجسٹرڈ ملا ہے تو براہ کرم رجسٹری فیس پندرہ روپے بلاتا خیر روانہ فرمائیں۔ بہت سے خریداران کے رجسٹری فیس نہ بھیجنے کی وجہ سے الفرقان پر بیس پچیس ہزار کا فاضل بار پڑا ہے۔ آپ کے تعاون کے لئے ہم ممنون ہیں۔ ناظم ادارہ الفرقان

لادینیت کا متوالا بنانے کی سازشیں تیار ہو چکی تھیں اور جس دانش گاہ کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں، آپ اسی اہم یونیورسٹی کے قابل فخر سپوت تھے، اسی درس گاہ نے آپ کے گیسوئے برہم کو سلجھا دیا تھا اور وہ جذبہ، وہ سوز، وہ فکر، وہ عقاب ذہن دیا تھا جس کا دنیا نے مشاہدہ کیا۔ وار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جس نے دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی اتنی آمیزش کی جس کا ایک داعی کے لئے ہونا ناگزیر تھا اور تعلیم کی ثنویت، علم کی دوئی نے جو ایک دراز اور خلیج پیدا کر دی تھی، اس عظیم دانش گاہ اور تحریک اسلامی کی مسند حدیث پر آپ نے گلباریاں فرمائی ہیں۔ اس لئے اس وفات کی ضرب سے یہ تمام جماعتیں دوچار ہوئی ہیں۔

دردست نہ تیر لیست، نہ دردست کمان است

ایں سادگی اوست کہ بسکل دو جہاں است

مولانا نے محترم نے تصوف و سلوک کی راہ طے فرمائی۔ اس کا ایک دلچسپ و عجیب ماضی ہے جو آج بھی ان نوجوانوں کو جو تصوف کو ایک فرسودہ نظام سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور مغرب زدہ ماڈرن خیالات کے حاملین کہ عصر حاضر کی چمک دمک اور ظاہری ٹیپ ٹاپ نے جن کے دل کے ہنگاموں کو خموش کر دیا ہے انہیں تزکیہ قلب، تزکیہ نفس کی مؤثر دعوت دیتی ہے۔ آپ کے اوصاف حمیدہ اور کمالات جلیلہ ایک ضخیم کتاب کے تحت مل ہیں کیوں کہ آپ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک کتب خانہ تھے۔ ۹۲ سالہ زندگی میں ایک سو کتابوں سے زائد تصانیف، مختلف موضوعات پر تحقیقی اور دلوں کو اپیل کرنے والے اسلوب میں پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ ایک اکیڈمی بھی اتنا کام مل کر انجام نہیں دے سکتی ہے۔ انہیں چیزوں نے آپ کو موت کے بعد اور زندہ بنا دیا۔

حدیث کے موضوع پر مرحوم کی خدمات ناقابل بیان ہیں، وہ کام کرنے کی ایک نئی طرح اور بنیاد ہے اور اس موضوع پر ایک اچھوتا کام ہے۔ معارف الحدیث جلد نمبر ۵، ص ۹ پر حضرت مولانا علی میاں ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ نے مصنف محترم (حضرت مرحوم) کو خاص مناسبت اور اس سے بہرہ وافر عطا فرمایا تھا اور

اس طرح یہ موضوع (حدیث) ان کے لئے محض علمی ذہانت کا نتیجہ نہ رہا بلکہ ذوق طبعی بن گیا اور ان

تمام وجوہ سے جو اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہیں ان کو اس موضوع پر لکھنے کا اتقان حاصل تھا اور بلا کسی مدد

و تعلق کے عرض کیا جاتا ہے کہ وہ اس کا حق ادا کرنے میں بہت کامیاب ہوئے۔“

حضرت مرحوم کافی عرصہ سے بیمار تھے، اسی بیماری میں انہوں نے اپنے وقت موعود پر

باقی صفحہ ۹۳ پر

ماہنامہ ”اشراق“ لاہور

جناب منظور الحسن

## مسلمانان ہند کے لئے ایک بڑا حادثہ



۳۱ مئی ۱۹۹۷ء کو دنیائے اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین وفات پائے۔ ان کا اس دنیا سے رخصت ہونا ملت اسلامیہ اور خاص طور پر ایک بہت بڑا علمی حادثہ ہے۔ برصغیر نے گزشتہ دو صدیوں میں جو عظیم کئے، وہ ان میں ممتاز تھے، ہندوستان کے درودیوار گواہ ہیں کہ اس مجسمہ ایک ایک لمحہ دین اسلام کی نصرت و حفاظت میں گذرا، درس و تدریس، ارشاد و ہدایت، اور وسط و نصیحت ہی ان کے شب و روز کے مشاغل تھے۔ وہ ہندوستان کے ان چند علماء میں سے تھے جنہیں علوم اسلامیہ میں فی الواقع رسوخ حاصل تھا۔ دینی حمیت کے معاملے میں ہندوستان میں ان کا ثانی شاید کوئی نہیں تھا، فتنہ قادیانیت ہو، خاکسار تحریک ہو یا مشرکانہ عقائد کے حاملین ہوں، وہ تمام زندگی ان کے مقابلے میں دین کے محافظ بن کر کھڑے رہے، ان فتنوں کے خلاف انھوں نے خطابت کے میدان میں بھی جنگ لڑی اور تحریر کے میدان میں بھی۔ اس جنگ میں معلوم ہوتا ہے، کہ خدا کی نصرت ہمیشہ ان کے شامل حال رہی۔

مولانا منظور نعمانی ”اگرچہ پوری زندگی تصوف کے داعی اور مبلغ رہے۔ لیکن اس کے باوجود عام مشرکانہ اعمال اور بدعتوں کی بیخ کنی کے لئے انھوں نے بے پناہ خدمات انجام دیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے توحید پر ایمان کو راسخ کیا۔ ہندوؤں کی تقلید میں مسلمانوں میں در آنے والی قبر پرستی، غیر اللہ سے استعانت اور اس طرح کی دوسری قباحتوں سے مسلمانوں کو بچانے کی بھرپور سعی کی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی دینی خدمات کو قبول فرمائے اور انھیں آخرت میں بلند درجات سے نوازے۔ آمین۔

مولانا مودودی نے اپنے کام کے آغاز میں جب دارالاسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم

کرنے کا پروگرام بنایا تو مولانا نعمانی نے اس ادارہ میں شمولیت کی پر زور خواہش کی۔ مولانا نعمانی ادارے کے تاسیسی اجلاس میں تو شریک ہوئے لیکن مولانا کے طرز زندگی کے بارے میں کچھ تذبذب ہو جانے کی بنا پر انھوں نے ادارے کی رکنیت اختیار نہیں کی۔۔۔۔۔

بالآخر مولانا نعمانی ”سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت پر کسی قدر مطمئن ہو گئے۔ چنانچہ جب جماعت اسلامی کا تاسیسی اجلاس ہوا، تو اس میں مولانا منظور نعمانی نے بھرپور شرکت کی۔ اس موقع پر جماعت کی امارت کے لئے انھوں نے ہی مولانا مودودی کا نام پیش کیا۔ مولانا منظور نعمانی اس موقع پر نائب امیر بھی منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ”الفرقان“ ”ترجمان القرآن“ ہی کی طرح جماعت کا ترجمان بن گیا۔ لیکن جماعت کی تاسیس کے تقریباً دو سال بعد ہی انھوں نے جماعت سے علاحدگی اختیار کر لی۔ علاحدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا

”میری یہ علاحدگی کسی اصولی خلاف کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کا باعث، دراصل کچھ شخصی قسم کی چیزیں ہوئی ہیں، جن کے مابوجود وابستہ رہنا میں نے اپنے لئے صحیح نہیں سمجھا اور ان کا اطمینان بخش اصلاحی حل بھی میں نہیں پاسکا، نیز میری یہ علاحدگی صرف اس مخصوص نظام جماعت سے ہے۔ یعنی میں اب اس کا بھابطہ رکن نہیں رہا ہوں، اس لئے اگرچہ جماعت کی باضابطہ شرکت اور اس کی ذمہ داریوں سے میں سبک دوش ہو چکا ہوں، لیکن پھر بھی اس کے اصل مقصد کے ساتھ میری وابستگی ویسی ہی ہے اور میں اللہ پاک سے اس راہ میں جدوجہد کی بیش از بیش توفیق مانگتا ہوں۔ (مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت ص ۶۹)

لیکن بعد ازاں انھیں جماعت اسلامی کے فکر سے بھی، جو درحقیقت سید مودودی کا فکر تھا، بنیادی اختلاف پیدا ہو گیا۔ انھوں نے جماعت کے فکر کی بنیادی کتاب ”قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں“ پر سخت تنقید کی۔ وہ لکھتے ہیں:

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ مودودی صاحب سے ایسی خطرناک غلطی (اللہ، رب، دین اور عبادت جیسی دین کی بنیادی اصطلاحات کے بارے میں یہ سمجھنا اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرنا کہ صدیوں سے جمہور علمائے امت، ان کا جو مطلب سمجھ رہے ہیں وہ غلط یا ناقص تھا۔) کیوں ہوئی؟ تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ بیسویں صدی کے اس دور میں جب کہ ساری دنیا میں سیاست اور سیاسی اقتدار کے مسئلہ نے دوسرے تمام مسائل سے زیادہ قیامت اور جنت و دوزخ کے مسئلہ سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔۔۔۔۔ اس سیاست زدہ فضا اور ماحول میں مولانا مودودی صاحب نے اپنی دعوت و تحریک کو خاص کر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں میں واقع اور مقبول بنانے کے لئے ضروری سمجھا کہ کلمہ لا الہ الا اللہ، اور حقیقہ توحید کی اور اس طرح اسلام کی ایک نئی سیاسی تشریح کی جائے اور اسی کو دعوت کی بنیاد بنایا جائے (مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت ص ۹۳-۹۴)



مولانا نعمانیؒ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں ان کی شہرہ آفاق کتاب معارف الحدیث ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی اس کے علاوہ انھوں نے تفہیم دین کے سلسلے میں سادہ اور عام فہم اسلوب میں متعدد کتابیں تحریر کیں یہ کتابیں عوام الناس میں بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں ”اسلام کیا ہے“ ”آپ حج کیسے کریں“ ”قرآن آپ سے کیا کہتا ہے“ اور ”دین و شریعت“ جیسی کتابیں اسلامی لٹریچر میں نہایت ممتاز اور منفرد درجہ رکھتی ہیں مولانا منظور نعمانی کی تحریروں کے بارے میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے۔

یہ مولانا کا بہت بڑا امتیاز تھا کہ آپ نے اس وقت انگریزی داں طبقہ کے سامنے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے اور خود نوجوان علماء کے سامنے دین کو ایسی زبان میں اور ایسی تعبیر کے ساتھ اور ایسی ترکیب و انتخاب کے ساتھ اور ایسی حسنِ تفہیم کے ساتھ پیش کیا جس کی مثال بہت کم ملے گی۔

(الفرقان جون ۱۹۹۷ء ص ۲۳)

مولانا منظور نعمانی کی دینی اور علمی خدمات اتنی وسیع ہیں کہ انہیں شاید ممکن ہی نہیں اس لئے ان الفاظ کی تائید ہی پر کفایت کی جاسکتی ہے جو مولانا اب نے مولانا منظور نعمانی کی وفات کے موقع پر کہے ہیں:

اللہ کی نعمت کے طور پر اور اس زمانے کے حالات کو دیکھ کر کہئے کہ ایک کرامت کے طور پر مولانا کا وجود تھا اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لے جو اجتماعی جگہوں پر بہت کم کیے جاتے ہیں تصنیف کرنے والے دعوت سے گریز کرتے ہیں جلسوں میں تقریر کرنے والے کے لئے تصنیف مشکل کام ہے اس لئے کہ وہ یکسوئی کی طالب ہے بقدر ضرورت دینی ملی کاموں میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے تعمیری سیاست کے ذریعہ ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ جامعیت عطا فرمائی مولانا نے تمام سرگرمیوں کے ساتھ رسالہ الفرقان نکالا جو برصغیر کا ایک ممتاز دینی و دعوتی ماہنامہ تھا بلکہ وہ ایک ایسا مکتب خیال اور مددگار فکر تھا جس سے لوگوں کی رہنمائی ہوتی تھی توحید خالص اور سنت صحیحہ کا پیغام ملتا تھا۔ مولانا کی وفات ملت کا ایک عظیم خسارہ ہے پھر ان کی معذوری جس کی مدت میٹھوں سے تجاوز ہو چکی تھی وہ ملت کا نقصان تھا۔ مولانا کی وفات سے ملت کا ایک بڑا سرچشمہ قوت بند ہو گیا اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے ان کے کارناموں کو زمرہ رکھے اور ان کی تصنیفات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے

(الفرقان جون ۱۹۹۹ء ص ۲۰)

”ہفتہ وار جدید مرکز لکھنؤ“

جناب محمد مسعود

## عالم اسلام کی بلند مرتبہ شخصیت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

۳۷ مئی ۱۹۷۷ء کو ممتاز عالم دین، محدث اور صاحب طرز ادیب مولانا محمد منظور نعمانی کی وفات کے ساتھ علمی و تصنیفی سرگرمیوں اور عملی جدوجہد کے ایک طویل دور کا خاتمہ ہو گیا۔  
مولانا منظور نعمانی بیک وقت امور دینیہ کے ممتاز و مستند عالم، ماہر حدیث، بلند مرتبہ صحافی اور صاحب طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ معرفت و سلوک کے میدان کے بھی رمز شاس تھے، توحید خالص، احیاء سنت و شریعت اور رد بدعت کے سلسلہ میں انھوں نے جس جرأت و استقامت کا ثبوت دیا اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور اپنے ایک قدیمی فیصلہ کے مطابق کسی تنظیم میں کوئی عہدہ بھی قبول نہیں کیا لیکن سیاست کے اتار چڑھاؤ پر ان کی ہمیشہ نظر رہی اور ملت اسلامیہ پر جب بھی کوئی کڑا وقت آیا وہ تصنیف و تالیف کے گوشہٴ عافیت سے نکل کر عملی میدان میں بھی آئے، وہ مسلم مجلس مشاورت کے نہ صرف بانیوں میں تھے بلکہ جب تک مشاورت اپنے اصل نہج پر چلتی رہی وہ اس کے مرکزی رہنماؤں میں سے تھے اور اس سلسلہ میں انھوں نے ملک کے دور دراز علاقوں کے سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ وہ جماعت اسلامی کے بھی بانیوں میں سے ایک تھے لیکن نظریاتی اختلافات کی وجہ سے انھوں نے بعد میں اپنے کو اس تنظیم سے الگ کر لیا اور اس بارے میں اپنے خیالات کا بھی پوری بیباکی کے ساتھ اظہار کر دیا۔

مسلم پرسنل لاہور ڈاؤر دینی تعلیمی کونسل کے بھی وہ بانی ممبروں میں تھے، اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور رابطہ عالم اسلامی مکہ کی مجلس شوریٰ کے بھی وہ ایک

طویل عرصہ سے رکن تھے۔

مولانا نعمانی کی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں دارالعلوم دیوبند کا خاص رول رہا ہے۔ اپنی تعلیم کے دوران یہاں انھیں جن اساتذہ سے فیض اٹھانے کا موقع ملا وہ اپنے اپنے فن کے امام تھے۔ مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا ابراہیم بلیاوی، مولانا اعجاز علی جیسے اکابرین دین کی صحبت نے ان کی شخصیت کو اس طرح نکھارا کہ وہ مسلک دیوبند کے ایک عظیم مبلغ بن گئے۔ اسلامی معاشرہ میں در آئیں بیچار سوم اور بدعات کے خلاف اپنے مضبوط قلم اور تقریروں سے انھوں نے جو جہاد چھیڑا وہ دارالعلوم دیوبند کی علمی و روحانی فضاؤں کا ہی نتیجہ تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے بد عقیدہ لوگوں کی اصلاح کے لئے مناظرے بھی کئے اور آریہ سماجیوں سے مناظرہ کر کے مسلمانوں کو گمراہ ہونے سے بچایا۔ مناظروں میں ان کی زبردست کامیابیاں علوم دینیہ بران کی مضبوط گرفت کے ساتھ دوسرے عقائد اور مذاہب کے بارے میں ان کی گہرے بین تبوت ہے۔ تاہم انھیں جلد ہی اس کا احساس بھی ہو گیا کہ محض مناظر درستگی اور اصلاح کا کام نہیں ہو سکتا اس لئے اس راستے سے ہٹ کر انھیں ذریعے احیاء سنت و شریعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور ۱۹۳۴ء میں بریلی گیا (۱) جو بعد میں لکھنؤ منتقل ہو گیا اور آج تک جاری ہے۔

”الفرقان“ کے ذریعہ مولانا نعمانی نے دینی علوم و مسائل کی اشاعت کی جو خدمت انجام دی اور تاریخ کی بلند مرتبہ اسلامی شخصیتوں سے اپنے قارئین کو روشناس کرانے کا جو فریضہ ادا کیا وہ بلاشبہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے ایک سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں اور علوم دینیہ کی بنیادی باتوں کو بہت ہی سادہ اور عام فہم زبان میں لوگوں تک پہنچایا۔ اسلام کیا ہے؟، دین و شریعت، تذکرہ مجدد الف ثانی، اور ملفوظات حضرت مولانا الیاس جیسی کتابوں نے اسلام کی صحیح اسپرٹ اور اس روح کو پیش کیا جو اصل مقصد تھا۔ اسلام کے صحیح عقائد کے سلسلہ میں انھوں نے سمجھوتہ تو دور خاموشی اختیار کرنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا اور اس سلسلہ میں جب ضرورت پڑی اپنی بات کو پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ سامنے لانے میں انھوں نے کبھی کوئی ہچک نہیں دکھائی چاہے اس کی زد کسی پر پڑتی ہو۔ اسی طرح معاشرت اور معاملات میں بھی حق گوئی سے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹے اور اپنے وقت کے بڑے سے بڑے عالم یہاں تک کہ خاص تعلق والے اپنے دوستوں سے ٹکرا گئے۔

اس کے ساتھ ہی وہ اتنے وسیع القلب بھی تھے کہ جب کبھی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور کسی مرحلہ پر انھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ غلط تھے تو اپنی عالمانہ شان اور انا کو پس پشت ڈال کر انھوں نے کھلے بندوں اعتراف بھی کیا۔

اس کی متعدد مثالیں الفرقان کے شماروں اور ان کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مسلم مجلس مشاورت کے بانی صدر ڈاکٹر سید محمود کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے ایک جگہ کہا ہے کہ میں اگرچہ ذاتی طور پر ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے سو فیصدی متفق تھا کہ تقسیم کا مطالبہ مسلم لیگ کی بہت بڑی غلطی تھی لیکن اس کو مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ یہ بات عام تقریروں میں اس طرح کہی جائے۔ جبکہ ڈاکٹر سید محمود کا کہنا تھا کہ جب تک ہندوستانی مسلمان ذہنی طور پر اس کو تسلیم نہیں کر لیں گے کہ تقسیم کا مطالبہ ایک غلط مطالبہ تھا اس وقت تک وہ صحیح راستہ پر نہ آسکیں گے۔ اس سلسلہ میں مولانا نعمانی آگے مزید کہتے ہیں۔ انھیں کے لفظوں میں

”اس موقع پر میں یہ اعتراف کر لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ گزشتہ آٹھ سال کے تجربے مجھے

”مھی اسی نتیجہ پر پہونچا یا جس پر ڈاکٹر صاحب بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔“

صحافت کی تاریخ میں الفرقان اپنے خصوصی نمبروں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندانہ و دیگر تاریخی شخصیتوں اور دور حاضر کی بڑی ہستیوں پر جو عالمانہ شان کے معیاری نمبر نکالے وہ جہاں ایک طرف مقصد سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت ہے وہیں ان کی صحافتی صلاحیتوں کی مثال بھی۔ حضرت مولانا یوسف صاحب اور مولانا نسیم احمد فریدی پر خصوصی نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ اپنے جریدے اور دیگر تصانیف سے انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی فکر اور تحریک کو عام لوگوں تک پہونچایا اور آسان سادہ زبان میں ایسی ایسی معلومات فراہم کر ادیں جو برسوں برس لا بصریوں میں بیٹھ کر بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اپنی بات واضح اور دونوں لفظوں میں بے تکلفی سے کہہ دینے کی جس علمی نثر کو انھوں نے فروغ دیا وہ خالص زبان و ادب کی بھی ان کی ایک بڑی خدمت ہے۔ ان کی تصنیفات اگر صرف زبان سیکھنے کے لئے پڑھی جائیں تو طالب علم کو وہ اور اک حاصل ہوگا جو کم سے کم اس زمانہ کے مشہور ادیبوں کو پڑھنے سے نہیں ہو سکتا۔

یہ دارالعلوم دیوبند کا ہی فیضان تھا کہ ان کے اپنے وقت کی بڑی روحانی و دینی شخصیتوں

سے قریبی روابط تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا جیسی شخصیات کے ساتھ ان کی قربت اور تبلیغی جماعت سے ان کی عملی وابستگی نے ان کی شخصیت کو اس طرح نکھار دیا کہ ان کے بے پناہ علم کی راہ میں نہ ان کا عمل مانع ہوا، اور نہ ہی ان کی علمی و تصنیفی مصروفیتوں کا ان کی عملی سرگرمیوں پر کوئی اثر پڑا، اپنی علمی و تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک صاحب حال بزرگ بھی تھے اور اپنے پیرومرشد حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری کی مجلسوں نے انھیں معرفت اور سلوک کی ان منزلوں سے بھی روشناس کرایا جس کے بغیر دین و شریعت کی صحیح روح کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”واقعہ یہی ہے کہ تصوف صیقا کے شاہ صاحب (شاہ ولی اللہؒ) نے فرمایا ہے۔ دین و شریعت کی روح اور اس کا جوہر ہے اور صوفیائے کرام ہی اس دولت کے حامل و امین ہیں اور جس طرح جسم کبھی روح سے —  
سکتا اسی طرح امت مسلمہ اپنے دینی وجود میں کبھی تصوف اور صوفیائے ربانی سے بے یار —

سچ یہ ہے کہ مولانا منظور نعمانی کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور مختلف پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ انھیں احاطہ تحریر میں لانا آسان نہیں ہے۔ —  
اور کارناموں پر تو اہل علم ہی روشنی ڈال سکیں گے ہم یہاں ان کے سب سے قریبی دوست اور ہم مسلک حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ان تاثرات کے ساتھ اپنی بات ختم کرتے ہیں۔

”مولانا محمد منظور نعمانی کا وجود ایک کرامت کے طور پر تھا اور اللہ نے اس کو جو جامعیت اور امتیاز عطا کیا تھا وہ کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔ ان کے انتقال سے ملت کا نقصان ہوا اور ایک بہت بڑا چشمہ قوت مند ہو گیا۔  
لیکن اللہ ان کے کارناموں کو مدہر رکھے اور ان کی تصنیفات سے لوگ استفادہ کریں۔“ (شمارہ ۱۱ مئی ۱۹۹۷ء)

صفحہ ۸۶ کا بقیہ

ہستے، مسکراتے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی اور اپنے پیچھے بہت سی غزودہ جماعتوں، تنظیموں، اداروں اور بہت سے افراد کو چھوڑ کر اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔

اب ان کی یادیں ہیں، خدمات جلیلہ ہیں، انکے تشنہ کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے، ان کے اسلوب و فکر کو زندہ رکھنا ہے اور اپنی بھی تیاری کرنی ہے کہ آج ہم تعزیت پیش کر رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دوش عظمت پر سوار ایک جنازہ کو دیکھ رہے ہیں جس پر رحمت پروردگار پھول برسا رہی ہے.... کل ہماری بھی باری ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ اس میں نہ عمر کی قید ہے نہ وقت کی پابندی۔  
(نئی دنیا ۱۳ جون ۱۹۹۷ء)

# تحدیثِ نعمت

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تصنیفی یادگار جو آپ کے مرض الوفات میں منظر عام پر آئی۔  
۶ ماہ میں پہلا ایڈیشن ختم۔ اب دوسرا ایڈیشن اہم ترمیمات نیز ترتیب کی درستی کے ساتھ۔

جس میں آپ نے اپنے اوپر رب کے انعامات و احسانات کی شہادت قلمبند فرمائی ہے کہ شاید وہ ایک دستاویزِ شکر کے طور پر آخرت میں کام آجائے۔ کیسے گھرانے میں آپ کو وجود بخشا کیا؟ آپ کی تعلیم کے لئے والد ماجد کو کیا مومنانہ توفیق عطا ہوئی؟ وقت کے کیسے عظیم اساتذہ سے آپ کو فیض یابی کا موقع ملا؟ عملی زندگی کے میدان میں توفیق الہی نے آپ کو کس کس طرح نہال کیا؟ دین و ملت کے کن کن محاذوں پر پروردگار نے آپ کو خدمت کے موقع بخشے۔ وقت کے کن کن بزرگوں کو آپ نے پایا۔ کن اوصاف و امتیازات سے وہ سرفراز تھے؟ اور ان کے دامنِ شفقت میں آپ نے کیا کیا پایا۔ ان سب نعمتوں کا بیان حمد و شکر میں ڈوبی زبان سے۔

۳۵۲ صفحات پر مشتمل، مجلد کتاب مع خوبصورت گرد پوش

قیمت صرف - 75/- روپے

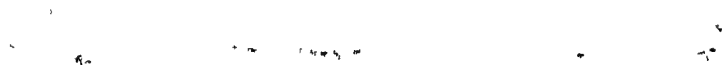
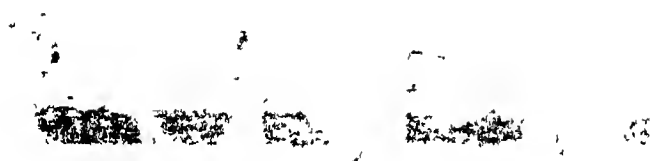
ناشر

الفرقان بکڈ پو

114/31 نظیر آباد، لکھنؤ-18

# گہائے تاز

خاص نمبر کے لئے لکھے جانے والے مضامین





مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

## رفیق محترم

عالم ربانی، داعی الی اللہ و خادم دین مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی ذات کم سے کم  
ہندوستان کے دینی و علمی حلقہ اور خصوصیت کے ساتھ راقم کے حلقہ احباب  
تعارف نہیں، شاید دو حقیقی بھائیوں میں بھی اتنی قریبی رفاقت، یکجہ  
اور اتحاد فکر و عمل رہا ہو جو ہم دونوں میں تھا، سلوک و تربیت، تحریک و دو  
خیال کے علاوہ تقریباً ۱۵ سال کے قریب (لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع محمد  
یکجائی رہی، بیچ گانہ نمازوں میں معیت و شرکت، اجتماع سے خطاب و درس۔۔۔

یکجائی سالہا سال قائم رہی۔ دہلی کے مرکز تبلیغ اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت  
میں حاضری، ان کی دعوت میں شرکت و ہم سفری، پھر رائے پور، سہارنپور کی حاضری، عارف  
باللہ، و مرہد زمانہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائے پور سے انتساب و ارادت، پھر رابطہ  
العالم الاسلامی مکہ معظمہ کی رکنیت اور شرکت میں رفاقت اور سفر حج و زیارت مدینہ طیبہ میں بار  
بار مصاحبت، اتحاد خیال و اتحاد عمل یہ سب وہ خصوصیتیں اور امتیازات ہیں جو ان دو شخصوں میں  
کم دیکھنے میں آتے ہیں جن کا مولد و منشاء، مدرسہ و دانشگاه، شہر و وطن اور خاندانی انتساب الگ الگ

ہو۔

مولانا ایک حادثہ کے نتیجہ میں جو دارالعلوم دیوبند سے واپسی پر سواری پر پیش آیا تھا،  
پھر اس میں دوسرے سفر میں اور اضافہ ہو گیا تھا تقریباً دس سال تک اضطراب نہ صرف خانہ نشین  
بلکہ صاحب فراش رہے، اس طویل مدت اور اضطرابی حالت میں بھی وہ افادہٴ مسلمین اور  
خدمت دین سے کنارہ کش اور منقطع نہیں رہے مشہور دینی مجلہ ”الفرقان“ ان کے مضامین  
و افادات سے مزین و معمور رہا، اور بھی کچھ املائی و تلقینی خدمات و افادات جاری رہے لیکن یہ  
مجبوری و معذوری بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۲۶ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ (مطابق ۲۴ مئی ۱۹۹۷ء) کو انھوں  
نے سحر نرسنگ ہوم میں جہاں وہ کی دن سے زیر علاج و استراحت تھے داعی اجل کو لبیک کہا اور

سفر آخرت اختیار کیا، ۲ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ (۵ مئی ۱۹۹۷ء) صبح دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالم ربانی مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی نے نماز جنازہ پڑھائی، راقم انتقال کے دن رائے بریلی میں تھا صبح آٹھ بجے لکھنؤ حاضر ہو گیا اور نماز جنازہ میں شرکت کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وسیع میدان میں صفیں لگ گئیں، خود دارالعلوم میں مقیم افراد (طلبہ و اساتذہ) کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہی ہے، اس کے علاوہ ملحقہ مدارس و مکاتب اور شہر کے محلوں سے بہت بڑی تعداد میں لوگ آگئے، شہر کی انتظامیہ نے ٹریفک کو روک دیا، پانی کے ٹینکر بھی مہیا کر دیئے، دو گھنٹہ میں یہ جنازہ آخری منزل تک پہنچا اور اس خادم دین، عالم ربانی کو سپرد خاک کیا گیا عصر اللہ لہ و رفع درحانہ۔

۲ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ (مطابق ۵ مئی ۱۹۹۷ء) کو بعد نماز مغرب دارالعلوم ندوۃ العلماء (جس میں مولانا نے ۱۱ سال تدریس حدیث کا عمل بھی جاری رکھا اور جس کے وہ مستقل رکن انتظامی اور مشیر و معاون تھے) جلسہ تعزیت و دعا منعقد ہوا، راقم نے وہاں جو تعزیتی تقریر کی اور اپنی طویل رفاقت اور علمی تجربات و مشاہدات کا خلاصہ پیش کیا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے حمد و ثناء کے بعد

”و من احسن قولاً ممس دعاً الی اللہ و عمل صالحاً و قال اسی من المسلمین“  
شرکاءے مجلس، برادران، و رفقاء عزیزا

میرے لئے اس وقت بڑی آزمائش کی بات ہے کہ میں اپنے رفیق مخلص، رفیق فاضل، رفیق مکرم، محبوب رفیق اور رفیق رفاقت طویلہ بلکہ رفاقت اطول حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (پہلی مرتبہ رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے بلکہ کہنا ضروری ہے) کے متعلق کچھ عرض کروں، یوں تو تعلقات و روابط کی کثرت، واقفیت کے وسیع میدان اور دینی خدمات کے مختلف انواع و اقسام سے تعلق و ربط ہونے کی وجہ سے مجھے بارہا اس طرح کا ناخوش گوار فریضہ انجام دینا پڑا ہے اور ہندوستان ہی نہیں مشاہیر عالم اسلامی اور مشاہیر مصلحین اور اہل کمال کے بارہ میں اپنے مشاہدات و تاثرات اور انکے فضل و کمال کا اظہار کیا ہے، لیکن اس وقت مجھے جو آزمائش پیش آرہی ہے اور اس سلسلہ میں جو مجاہدہ کرنا ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں، اسکی خاص طور پر دو وجہیں ہیں۔

ایک تو مولانا کا فضل و کمال، ملت اسلامیہ پر انکے حقوق و احسانات اور دوسرے میرا وسیع تعلق، یکجہاز ندگی گزارنا، یکجہاز ہنا، اس کی مدت تقریباً نصف صدی ہے، اس سب کی وجہ سے

مجھے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کا اندیشہ ہے اس کے ساتھ ان دقتوں اور ذمہ داریوں کا احساس بھی ہے جو مجھے متفکر بنائے ہوئے ہے، میں جو کچھ کہوں گا وہ ان کے حق کی ادائیگی نہیں ہوگی بلکہ اپنے فرض کی ادائیگی ہوگی اور یہ واقعہ ہے کہ فرض کی ادائیگی بڑی مشکل ہوتی ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مولانا ان راسخین فی العلم میں سے تھے جن کی مثال کم ملتی ہے، خصوصاً اس زمانہ میں علمی انحطاط اور علمی انتشار، تحریکوں کی کثرت، مشغولیوں کی فراوانی اور ان کا تنوع اتنا ہے کہ علم میں رسوخ حاصل کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے، لیکن جو لوگ مولانا سے اجمالی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں اور اسکی تصدیق کریں گے کہ مولانا ہندوستان کے ان منتخب اور مختص ممتاز علماء میں شامل ہیں جنہیں علوم اسلامیہ میں رسوخ حاصل تھا، اور یہ معمولی بات نہیں ہے وسعت معلومات، وسعت مطالعہ، تصنیف و تالیف کی صلاحیت، یہ سب چیزیں بہت عام اور کثرت سے پائی جاتی ہیں، لیکن علمی رسوخ یہ بہت اونچی ۔

ہے، میں خدا کے گھر میں بیٹھ کر اس کی شہادت دیتا ہوں کہ مولانا

کلام میں اور فرق منخرنہ و محرّفہ کے بارے میں جو وسیع معلوما

واقفیت اور ان کی کمزوریوں اور ان سے پیدا ہونے والے خطرات

ہندوستان کے کم علماء کو حاصل ہوگا، جن لوگوں نے یہاں ان سے ترمذی ریت پر

اسکی شہادت دیں گے، پھر ان کی جو کتابیں ہیں وہ بتاتی ہیں کہ ان کو علم میں کتنا رسوخ حاصل

تھا۔ پھر زمانہ کی نبض شناسی، نئی نسلوں کی ضروریات اور ان کی نفسیات اور تقاضوں سے گہری

واقفیت اور ان کے ذہنوں کی گہرائیوں تک پہنچنا اور ان کو متاثر کرنا یہ اپنی جگہ پر ایک کمال ہے اس

کے ساتھ علم میں رسوخ اور اس کو پیش کرنے کی صلاحیت، انتخاب کی صلاحیت، ذہنوں کی

رعایت یہ ایک خاص چیز ہے، جن لوگوں نے مولانا کی کتابیں پڑھی ہیں خاص طور پر ان کی کتاب

”معارف الحدیث“ جو اس مسجد میں عصر بعد سنائی جاتی ہے کم از کم اردو لٹریچر میں یہ بے نظیر

کتاب ہے، جس طرح حدیث و سنت کو پیش کیا گیا ہے جس طرح اس سے سبق لینے اور احادیث

کے مختلف پہلوؤں اور مخفی گوشوں کو ابھارا گیا ہے وہ بے مثال ہے، ان کی عام فہم اور مقبول عام

کتاب ”اسلام کیا ہے“؟ نیز ”آپ حج کیسے کریں“؟ ”قرآن آپ سے کیا کہتا ہے“؟ ”دین

و شریعت“ وغیرہ وہ کتابیں ہیں جو ممتاز ہی نہیں بلکہ بعض جیتنوں سے منفرد ہیں، اپنے

مقصد، حسن انتخاب، حسن تعبیر، حسن بیان، حسن تفہیم اور ذہنوں کی رعایت کی بنا پر اس کو توفیق

الہی ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

مولانا نے دیوبند کے چوٹی کے اساتذہ مولانا سید انور شاہ کشمیری صاحبؒ جیسے حضرات سے تعلیم حاصل کی تھی اس لئے ان کو علم میں بڑا رسوخ اور کمال حاصل تھا، ان کا یہ رسوخ آخر عمر تک باقی رہا، ہمارے مشاہدہ اور علم میں یہ بات ہے کہ بعض حضرات کو ابتدائی دور میں رسوخ فی العلم حاصل ہوتا ہے لیکن جوں جوں ان کی مشغولیتیں بڑھتی جاتی ہیں زندگی کے تقاضے، راحت و آرام اور خانگی زندگی کے مطالبات بڑھتے ہیں، دینی و ملی اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا پڑتا ہے ان سے متاثر ہو کر بلکہ ان سے دب کر وہ ایسے ہو جاتے ہیں کہ صحیح عبارت کا پڑھنا بھی ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے لیکن مولانا کا رسوخ فی العلم آخر تک باقی رہا جو بہت کیما ب بلکہ نادر بات ہے، یہ نتیجہ ہے ان کے والدین کے حسن نیت، ان کے اساتذہ کرام کی لہیت و خلوص و ربانیت کا پھر مولانا کی محنت و خلوص اور مسلسل علمی اشتغال کا کہ ان کا تعلق علم سے برابر قائم رہا، آخر تک علمی رسوخ و پختگی باقی رہی اسکا میں عینی شاہد ہوں اور قریب ترین رفیق کی حیثیت سے مجھے خود اس کا تجربہ ہے۔

مولانا کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی حمیت دینی سے، ایک ہے حمایت، دوسری چیز ہے، حمیت، حمایت میں وہ اندرونی جذبہ اور دل سوزی نہیں ہوتی، وہ دل کی تپش اور ذہن کی خلش اور وہ اضطراب و بے چینی نہیں ہوتی جو حمیت میں ہوتی ہے حالانکہ حروف دونوں کے متقارب ہیں اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیت دینی کا جو جو ہر عطا فرمایا تھا وہ کم لوگوں کو ملتا ہے، ہو سکتا ہے دینداری، عبادت گزاری، تہجد اور شب بیداری اور ذکر و مشغل میں دوسرے لوگ بڑھے ہوئے ہوں لیکن دینی غیرت و حمیت کی دولت و نعمت سے مولانا مالا مال تھے، حمیت یہ ہے کہ دل میں آگ سی لگ جائے، سوزش پیدا ہو جائے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیا خطرات درپیش ہیں مسلمانوں کی آبادی کا کیا حشر ہو گا خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کا کیا انجام ہو گا۔

تقسیم کے بعد مسلمانوں کے یہاں رہنے کے سلسلہ میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں بات واضح نہیں تھی کہ مسلمان اب کیسے رہیں گے لیکن مولانا کا ذہن بہت واضح تھا اور ان کے سامنے کام کا پورا نقشہ بنا ہوا تھا یہ اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیت جیسی نعمت سے نوازا تھا یہ ایک نفسیاتی نکتہ اور تجربہ کی بات ہے کہ حمیت بھی ہمیشہ یکساں باقی نہیں رہتی اس لئے کہ علم جتنا بڑھتا اور معلومات و تجربات میں جتنی وسعت ہوتی جاتی ہے حمیت میں اسی اعتبار سے کمی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ احساس ہی ختم ہو جاتا ہے جو لوگ عجائب گھر اور میوزیم دیکھتے رہتے ہیں ان کے اندر استعجاب کا مادہ باقی نہیں رہتا وہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ

سب چیزیں یکساں ہیں لیکن میں عینی شاہد کی حیثیت سے گواہی دیتا ہوں کہ اپنے وسیع علم و مطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ مولانا کے اندر دینی حمیت و غیرت بھری ہوئی تھی۔

میں نے مولانا کو سب سے پہلے ”دارالمبلغین“ میں مولانا عبدالشکور صاحب کے پاس دیکھا اسکے بعد تعارف و ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جب میری کتاب ”سیرت سید احمد شہید“ شائع ہوئی تو جن خاص خاص لوگوں کو کتاب بھیجی ان میں مولانا محمد منظور نعمانی بھی تھے مولانا نے کتاب ملنے کے بعد خط لکھا اس میں انہوں نے تحریر کیا کہ ’یہاں جو وقت ڈاک کا ہوتا ہے وہی کھانے کا ہوتا ہے آپ کی کتاب آئی تو میں اس میں اتنا مشغول ہو گیا کہ میرے لئے کھانا مشکل ہو گیا میں اس سے بہت متاثر ہوا، اس زمانے میں ہندوستان میں ایک نئی تحریک چلی تھی جس کے بانی علامہ مشرقی نام کے تو مشرقی تھے لیکن ذہنی و فکری لحاظ سے علامہ مغربی تھے وہ خاکسار تخرک تھی جو اس دور کی خطرناک ترین تحریک تھی اس وقت ہندو -

تحریک نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ مقبولیت حاصل کی،

مولانا کو غالباً سب سے پہلے اس کا احساس ہوا کہ اگر یہ تحریک

جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے اس کا رابطہ ہو جاتا ہے تو ایمانی رابطہ

نہیں رہیگا، معروف و منکر اور کفر و ایمان میں کوئی فرق باقی نہیں رہیگا۔۔۔۔۔

تھے وہ زیادہ تر سیاسی و تنظیمی مقاصد تھے مولانا اس وقت رائے بریلی تشریف لائے اور انہوں نے

مجھے آمادہ کیا کہ میں اسکی ذمہ داری قبول کروں کہ ایک جماعت بنائیں اور تحریک چلائیں اور میں

اسکی قیادت اور ترجمانی کروں میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ کام اس شخص کے سپرد کر

چاہئے جو انگریزی پر پوری قدرت رکھتا ہو انگریزی میں تقریر کر سکے بیان وے سکے اور اخبار ر

میں مضامین لکھ سکے انہوں نے کہا وہ کون ہے؟ تو میں نے اپنے پیر بھائی حاجی عبدالواحد صاحب

مشورہ دیا جو انگریزوں کے دور میں پورے پنجاب میں ایم۔ اے۔ انگریزی میں فرسٹ ڈویژن پا

ہوئے تھے ان دنوں وہ فورٹ سنڈیمین میں تھے، چنانچہ ہم رائے بریلی سے پنجاب میل میں

ہو کر لاہور پہنچے وہاں مولانا مودودی سے ہم لوگوں نے ملاقات کی پھر حاجی عبدالواحد صاحب

سے ملنے فورٹ سنڈیمین گئے جو کوئٹہ سے آگے تھا اور دہ بولان ہو کر راستہ جاتا تھا ہم تینوں

مشورہ کیا پھر طے ہوا کہ اپنی جماعت بنانے سے پہلے ان دینی و دعوتی مراکز اور خانقاہوں کا

کرنا چاہئے جہاں کام ہو رہے ہیں چنانچہ ہم لوگ سہارن پور ہوتے ہوئے رائے پور پہنچے، حفی

مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کے مشورہ پر ہم لوگ مرکز نظام الدین آئے وہاں

جماعت کے نظام کو پچشم خود دیکھا حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے ملاقاتیں کیں بالآخر ہم نے اپنی صلاحیتیں اس جماعت کی نصرت و حمایت اور استحکام کیلئے وقف کر دیں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے بڑے بڑے اجتماعات میں شریک ہوئے پورے ملک کا سفر کیا باہر بھی گئے جہاں تک تبلیغی جماعت کی افادیت اور ضرورت کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں، جو کچھ ہم سے تعاون ہو سکتا تھا وہ ہم نے کیا جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے یہاں دینی وجود کے متعلق جتنا مولانا کا ذہن صاف اور واضح تھا اتنا کسی بڑے سے بڑے عالم کا نہیں تھا مولانا نے یہاں کے جو حالات سمجھے اور خطرات اور اندیشوں کا ادراک کر لیا وہ مولانا ہی کا حصہ تھا۔

راوڑ کیلا اور جمشید پور کے بھیانک فسادات میں پانچ ہزار (۵۰۰۰) مسلمان مارے گئے کھیتوں اور گھروں کے اندر مسلمانوں کے سر تر بوز اور خربوزہ کی طرح پڑے ہوئے تھے خون کے چھینٹے دیواروں پر لگے ہوئے تھے، مولانا نے سب سے پہلے ان علاقوں کا دورہ کیا انہوں نے مجھے آمادہ کیا کہ تم جا کر دیکھ آؤ، چنانچہ میں مولانا ابوالعرفان خان صاحب ندوی مرحوم کے ساتھ وہاں گیا، تعلیم یافتہ ہندوؤں سے ملاقاتیں کیں لوگوں کی رائے ہوئی کہ کوئی تنظیم قائم ہونی چاہئے تاکہ ملت کے دین اور تہذیب کی حفاظت کی تدبیر کی جائے، اور اس ملک کو اسپین بنانے سے بچایا جائے، چنانچہ ”مسلم مجلس مشاورت“ کی تجویز ہوئی، اس کے بڑے محرک اور داعی ڈاکٹر سید محمود تھے، ہم اور مولانا اس میں شریک ہوئے پھر کرناٹک وغیرہ کے سفر ہوئے۔

مولانا کا امتیازی وصف جو کم علماء کو نصیب ہوا ہے وہ فرق محرفہ و منحرفہ سے گہری واقفیت اور ان کے خطرات و نقصانات کا احساس و ادراک ہے، کون کون فرق محرفہ ہیں اور کون غیر محرفہ، ان فرقوں کیلئے محاذ بنانا اور اسکو اپنا فرض سمجھنا جتنا مولانا نے اس میدان میں کیا اتنا شاید مولانا مرتضیٰ چاند پوری نے کیا ہو میرے سامنے انکا پورا کام نہیں ہے مولانا سید محمد علی مونگیری نے قادیانیت کا مقابلہ کیا اور اسکے خطرات کا ادراک و احساس کیا، انہوں نے مونگیری سے قادیانیوں کا مقابلہ کیلئے مولانا مرتضیٰ صاحب چاند پوری کو مدعو کیا جب تک مناظرہ ہوتا رہا مولانا سید محمد علی مونگیری سجدہ میں پڑے رہے جب انکو شکست فاش ہوئی اور جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگے تو مولانا نے سجدہ سے سر اٹھایا۔ قادیانی ہوں یا بریلوی ان سب کا مقابلہ مولانا نعمانی نے جتنا کیا اتنا شاید ہی کسی نے کیا ہو مولانا زبردست مناظر تھے وہ فرق باطلہ اور فرق محرفہ کی کتابوں سے بہت گہری واقفیت رکھتے تھے اور ان کی بہت سی عبارتوں تک کے حافظ تھے وہ اس

طرح عبارت زبانی سناتے کہ جیسے دیکھ کر پڑھ رہے ہوں اس درجہ مولانا کا اختصار اور حافظہ قوی تھا کہ اس میں مولانا کا کوئی شریک نہیں۔ مولانا نے شرک و بدعات کا جم کر مقابلہ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کو شرک کے اثرات سے بچایا، بد عقیدگی، اشراک باللہ، عبادت قبور، استعانت بغیر اللہ، استغاثہ بغیر اللہ سے بچایا ہندوستان جیسے ملک میں یہ کام بڑا خطرناک اور نراکتوں سے بھرا ہوا تھا، عالم عربی میں شیخ محمد بن عبد الوہاب اور مصر و شام میں شیخ حسن الدین اور دوسرے علماء اٹھے اور انہوں نے کام کیا لیکن ہندوستان میں (حضرت سید صاحب اور حضرت شاہ اسماعیل شہید اور چند علمائے مصلحین کے بعد) کماؤ کی جتنا کام مولانا نے کیا وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے اور کسی کا کام ہو جو ہمارے علم میں نہیں۔

۱۹۵۱ء میں لکھنؤ میں تبلیغی مرکز کی عمارت بنی، ہم دونوں کے ایک مخلص نے اسکی تعمیر اس انداز سے کی کہ ہم دونوں یہاں ساتھ رہ سکیں، مولانا اس وقت بلوچستان

میں ہم دونوں منتقل ہو گئے، پھر تو شب و روز کا ساتھ ہونے لگا ناشتہ

نمازوں میں بھی ساتھ، خطاب اور سفروں میں بھی رفاقت رہی، مو

اخلاقی صفات، ذہنی کمالات اور تصنیفی سرگرمیاں سب کھلی کتاب کی

اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت کام لیا، حضرت رائے پوریؒ سے بیعت کا تعلق تھا وہ رہا۔۔۔

قیامت میں جب اللہ تعالیٰ سوال کریگا کہ کیا لائے؟ تو میں دو آدمیوں کا نام لوں گا پہلا نام مولانا محمد

منظور نعمانی کا لیا، انکے اندر اللہ تعالیٰ نے متضاد صفات و صلاحیتیں ودیعت فرمائی تھیں جنکے اندر

تضاد تو نہیں لیکن عملاً تضاد معلوم ہوتا ہے کسی کو علمی اشتغال ہوتا ہے تو عملاً دعوت کے کام

میں لگنا مشکل ہوتا ہے ہم سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو بڑے داعی ہیں لیکن مہینوں ہو جاتے ہیں کہ

انکو کتاب دیکھنے کی نوبت نہیں آتی لیکن مولانا نے دونوں کو جمع کر رکھا تھا۔

مولانا اگرچہ دیوبند کے فاضل اور اسکی مجلس منتظمہ کے رکن تھے لیکن اسکے ساتھ ندوۃ

العلماء کی تحریک سے بھی اور ندوۃ العلماء کے ادارہ سے بھی انکا مخلصانہ تعلق رہا ہے انہوں نے

یہاں کے ذمہ داروں کی درخواست بلکہ اصرار پر حدیث کی تدریس کی ذمہ داری قبول فرمائی،

طلبہ نے ان سے فائدہ اٹھایا، ندوۃ العلماء کی انتظامیہ کے طویل عرصہ تک رکن رہے، مجلس

تحقیقات و نشریات اسلام کے بنیادی رکن تھے، اس کی سرپرستی اور قلبی تعلق برابر باقی رہا، سناتے

کہ اس بیماری میں جب ہوش و حواس بجا تھے کوئی عیادت کے لئے گیا تو انھوں نے کہا کہ جی چاہے

ہے کہ ندوہ جاؤں۔

مولانا نے نازک وقتوں میں بھی اپنی اصابت رائے اور تجربات سے ندوہ کو فائدہ پہنچایا، ندوہ کا جب پچاسی سالہ جشن ہونے والا تھا تو ہمیں فکر تھی کہ اس کی صدارت کے لئے کون موزوں شخصیت ہوگی تو مولانا نے (جب کہ ہم دونوں رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے تھے، حج کا زمانہ بھی تھا) شیخ الازہر الامام الاکبر عبدالحمید محمود کی رائے دی، جو صوفی منش تھے اور متشرع قسم کے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کے طور پر اور اس زمانے کے حالات کو دیکھ کر نعمت نیز کرامت کے طور پر مولانا کا وجود تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لیا جو اجتماعی جگہوں پر بہت کم کئے جاتے ہیں، تصنیف کرنے والے دعوت سے گریز کرتے ہیں، جلسوں میں تقریر کرنے والوں کے لئے تصنیف مشکل ہے، اس لئے کہ وہ یکسوئی کی طالب ہے، بقدر ضرورت دینی و ملی کاموں میں اور سیاسی جدوجہد میں بھی حصہ لینا ضروری ہوتا ہے، تعمیری سیاست کے ذریعہ ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ جامعیت عطا فرمائی تھی۔

مولانا نے تمام سرگرمیوں کے ساتھ رسالہ ”الفرقان“ نکالا جو برصغیر کا نہ صرف ایک ممتاز دینی و دعوتی ماہنامہ تھا بلکہ وہ ایک ایسا مکتب خیال اور مدرسہ فکر تھا جس سے لوگوں کی ذہنی و فکری رہنمائی ہوتی تھی، توحید خالص اور سنت صحیحہ کا پیغام ملتا تھا، ملتی و دینی شعور بیدار ہوتا تھا۔ مولانا کی وفات ملت کا ایک عظیم خسارہ ہے، پھر ان کی معذوری جس کی مدت مہینوں سے متجاوز ہو گئی تھی ملت کا نقصان تھا، مولانا کی وفات سے ملت کا ایک بڑا سرچشمہ قوت بند ہو گیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ان کے کارناموں کو زندہ رکھے اور ان کی تصنیفات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔

(۲)

## شہری جلسے کی تقریر تعزیت

[ندوۃ العلماء کے تعزیتی جلسے کے بعد لکھنؤ شہر کے پانے پر ایک تعزیتی جلسہ ۱۱ مئی ۱۹۷۷ء کو قیصر باغ بارہری میں آل انڈیا دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام حضرت مولانا غلامہ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اس جلسے میں حضرت مولانا نے جو تقریر بحیثیت صدر کونسل ارشاد فرمائی اس کی جداگانہ افادیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوا کہ اس ضمن میں وہ بھی درج کر دی جائے، یہ تقریر بھی شیپ ریکارڈ پر محفوظ کر لی گئی تھی۔ اسی شیپ کی مدد



اس کو مرتب کر کے دیل میں پیش کیا جا رہا ہے

[ادارہ]

حمد و ثنا کے بعد

میرے بزرگو، بھائیو، دوستو اور عزیزو!

ایک رفیق کار کی حیثیت سے، حالات پر نظر رکھنے والے ایک انسان کی حیثیت سے، ایک جہاں دیدہ سیاح کی حیثیت سے، ایک سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے، جس کے لئے سوانح نگاری اور تاریخ خاندانی مشغلہ ہو، پھر جس کے قلم سے متعدد عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات پر کتابیں بھی نکلی ہوں، اس حیثیت سے مجھے اپنے محترم و موقر، محبوب، ایک طاقتور مقتدی اور قابل تعظیم رفیق کار کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہئے۔  
العلماء کے تعزیتی جلسے میں سب بہت تفصیل سے عرض کر دیا تھا، کرتا ہوں کہ اس کے بعض پہلو ایسے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کا حق ادا نہ

اس وقت میں ہندوستان کے ان خاص حالات کے حوالے سے ہمارے رفیق محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (۱) نے کیا، کہنا چاہوں گا کہ یہاں کے حالات مسلمانوں کے لئے ایسے پیچیدہ، نازک، حساس، بلکہ متضاد پہلو لئے ہوئے تھے، یہ حالات سب ملکوں میں پیش نہیں آیا کرتے، یہ حالات ایک ایسی روشن دماغ، درد مند، حقیقت پسند، حقیقت بین اور مبصر و جامع شخصیت کو چاہتے ہیں، جو وقت کی نزاکتوں کو متضاد عناصر کو، پوشیدہ خطروں اور مشتبہ بلکہ خطرناک نیتوں اور ارادوں کو دیکھ سکے اور ان کے مطابق کام کرے۔

مولانا منظور صاحب نعمانی کا میں سمجھتا ہوں کہ بڑا امتیازی کمال تھا، اللہ تبارک و تعالیٰ کا خاص انعام تھا کہ انھوں نے اس ملک کے خطرات کو سمجھا، اور یہ خطرات صرف غیر مسلموں کی طرف سے نہیں، وقت کی حکومتوں یا سیاسی تحریکوں اور تنظیموں ہی کی طرف سے پیدا ہونے والے نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کی اپنی حالت کی طرف سے جو خطرات تھے یعنی دینی تنزلی، کمزوری، بے حمیتی، بے عملی اور شرک و بدعات ان سب چیزوں کو سامنے رکھا اور اس حقیقت کو سمجھا کہ یہ ملک مسلمانوں کے لئے دوسرا اسپین نہ بن جائے۔

اسپین وہ ملک ہے جہاں مسلمانوں نے صدیوں تک بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی اور

پھر وہاں ایسے علماء پیدا ہوئے، ایسی دینی فضا چھائی رہی اور ایسا شریعت پر عمل رہا کہ جس طرح ان کے (اہل اندلس 'اسپین') کے فقہی مذہب یعنی مالکی مذہب کا مشہور مسئلہ تھا کہ اہل مدینہ کا عمل اس بات کی دلیل اور علامت ہے کہ یہی حکم شریعت اور سنت ہے۔ [عمل اہل المدینۃ حُجَّة] ایک مدت کے بعد وہاں کے علماء کا فتویٰ یہ ہو گیا اور یہی لوگوں کا مذہب بن گیا کہ قرطبہ جو ان کا دار السلطنت تھا اس کا عمل بھی شرعی حجت اور اس بات کی دلیل ہے کہ یہی حکم شریعت ہے، نہ محض ایک مقامی رسم و رواج۔ چنانچہ وہاں کی تاریخ کے اس دور میں یہ فتویٰ لکھا ہوا ملتا ہے کہ [عمل اہل القرطبة حجة] تو یہی ملک، یہی اسپین جس کی دینی فضا کا یہ حال تھا، اور جس میں شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی جیسی شخصیت پیدا ہوئی کہ ان کے بارے میں کچھ بھی اختلاف ہو لیکن ان کا لقب شروع سے شیخ اکبر چلا آ رہا ہے، پھر موطا امام مالک کے کیسے کیسے شارح وہاں پیدا ہوئے، کیسے کیسے ادیب و شاعر پیدا ہوئے۔ اندلس اور قرطبہ کی تاریخی عظمت جاننے کیلئے اور کچھ نہیں تو علامہ اقبال کی مسجد قرطبہ والی نظم ہی پڑھ لیں تو کافی ہے۔ اس جامع قرطبہ میں دور کعت نماز پڑھ کے جو یہ نظم، یہ قصیدہ انھوں نے کہا ہے وہ انہی کی شاعری میں نہیں بلکہ مؤرخانہ شاعری جس میں تاریخی حقائق کا بیان ہوتا ہے اس میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی اسپین کا حال یہ ہے کہ کہیں اذان کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ کسی کو آپ نماز پڑھتا نہیں دیکھیں گے۔ جامع مسجد قرطبہ میں تو نماز پڑھنا گویا قانوناً ممنوع ہے۔

اللہ کی توفیق سے ہمیں اس اسپین میں جانے کا بھی موقع ملا ہے، حسن اتفاق کہ ڈاکٹر اشتیاق صاحب بھی ساتھ تھے۔ ہم دونوں وہاں گئے۔ طلیطلہ سے لیکر فرانس سے ملانے والی آخری سرحد تک، وہاں سے موجودہ دار السلطنت میڈرڈ (Madrid) تک۔ سب سے بڑھ کر قرطبہ اور اسکی جامع مسجد میں بھی جانا ہوا، اور ہم نے بھی وہاں علامہ اقبال کی طرح کسی طور پر نماز پڑھ لی۔

الفرض یہ اُس مسلم اسپین کا حال اندر اور باہر کے عوامل کی وجہ سے ہوا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مولانا کا بڑا امتیاز تھا کہ ایک طرف اُن کی نظر ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے انحرافات، اُن میں دین فہمی کی کمی، دین کے فرائض اور مطالبات کے سلسلے میں تغافل اور اُس کی خطرناکی پر تھی، اور دوسری طرف مسلمانوں کے ملتی جود اور اُن کی ایک ممتاز ملت کی حیثیت کو باہر سے ہمسایہ قوموں سے جو خطرات لاحق ہو رہے تھے اور جو اسپین کے سے حالات اس سرزمین ہند میں بھی پیدا ہو جانے کا اندیشہ پیدا کر رہے تھے جہاں وہ مجدد اور اولیاء اللہ

پیدا ہوئے جس کی مثال عالم اسلام میں ملنی مشکل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسی شخصیت، حضرت شاہ ولی اللہ جیسی شخصیت، اسکے علاوہ سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، ایک ہی وقت میں ایسے کئی اشخاص جہاں پیدا ہوئے وہاں خطرہ ہو گیا ہے کہ یہاں کے مسلمان صرف تاریخی طور سے مسلمان نہ رہ جائیں کہ تاریخ میں ان کا نام مسلمان لکھا جائے۔ لیکن عمل کے لحاظ سے، نمایاں امتیاز کے لحاظ سے ان میں کوئی بات باقی نہ رہے۔ عربی اور فارسی تو بڑی چیز ہے اردو تک سے مسلمان نا آشنا ہو جائیں۔ ہندو دیومالا (میتھالوجی) کے اثرات ان کی نئی نسلوں پر طاری ہو جائیں۔ وہ اپنی ثقافت اور کلچر کھو بیٹھیں۔

مسئلے کے یہ دونوں پہلو اگرچہ متضاد نہیں ہیں، پھر بھی ان میں سے ایک ہی انسان کی توجہ کیلئے کافی ہے۔ اُسے دوسری طرف کیلئے فرصت کی نوبت ہی آنا مشکل۔ جامعیت اور ان کا خاص امتیاز و کمال تھا کہ ان کی توجہ مسلمانوں کے ا۔ تقاضوں پر بھی رہی اور ان مخالفانہ منصوبوں اور خطرات پر بھی جو باہر کر رہے تھے۔ جیسا کہ میں نے ندوۃ العلماء کے تعزیتی جلسے میں کہا تھا اللہ۔ تھی کہ ایک طرف حمایت کا جذبہ بھی تھا کہ دین کی حمایت کی جائے، دینی مراکز و مابین جائے، دینی شخصیتوں کی حمایت کی جائے اور تاریخی شخصیتوں کی حمایت کی جائے۔ اور اس طرح حمیت بھی تھی کہ وہ کسی مشرکانہ عقیدے کو، کسی کھلی ہوئی بدعت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ نے ان سے وہ کام لیا جو اپنے عہد کی ممتاز ترین شخصیتوں سے لیا کرتا ہے۔ یہ سب چیزیں میں نے تفصیل سے ندوۃ العلماء کے جلسے والی تقریر میں پیش کی ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں ہیں جو مشرق و مغرب کو دیکھے ہوئے ہے

مرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

یہاں سے لیکر مغرب اقصیٰ کے آخری حدود تک، اور جہاں تک غیر مسلم ممالک کا تعلق ہے امریکہ، کناڈا اور یورپ کو بار بار دیکھا اور اسلامی دنیا میں کوئی قابل ذکر نمایاں ملک نہیں رہا جہاں ہمارا گناہ گار قدم اور گناہ گار وجود نہ پہنچا ہو۔ اور اس کے بعد ہمارا یہ اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا میں یہ دونوں چیزیں بہ یک وقت پیدا کیں۔ دین کی حمایت بھی اور

غیرت و حمیت بھی۔ اور اُن سے وہ کام لیا جو اپنے عہد کی ممتاز ترین ہستیوں سے لیا جاتا ہے۔ آخر میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ جلسہ بارہ درری میں، وسط شہر میں ہو رہا ہے میں اہل لکھنؤ سے تعزیت کرتا ہوں کہ ایک شہری کی حیثیت سے، یہاں کے ایک بہت بڑے دینی ادارے اور یہاں کی دینی تحریکات اور دینی سرگرمیوں کے ایک حقیر دینی سپاہی کی حیثیت سے میں اپنے ہم وطن شہریوں سے تعزیت کرتا ہوں کہ اللہ نے اس شہر سے ایک ہستی اٹھالی جس کی وجہ سے رحمتوں کا نزول ہوتا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں، نعمتوں کا نزول علمائے ربانی کے وجود سے ہوتا ہے۔ بہت سی بلائیں ٹلتی ہیں۔ اسکی مثالیں آپ کو تاریخ میں ملیں گی اور دینی نصوص میں بھی۔

میں اپنے ہم شہریوں سے تعزیت کرتا ہوں کہ یہاں سے ایک ایسی ہستی اٹھالی گئی جس کی وجہ سے نہ صرف دینی رہنمائی مضامین کے ذریعے اور تقریروں اور مواظظ کے ذریعے سے ہوتی تھی بلکہ اُسکے رہنے سے بھی ایک برکت تھی اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک نگاہ کرم تھی۔ اس لحاظ سے میں اپنے سب بھائیوں سے تعزیت کرتا ہوں۔

[اسکے بعد مولانا نے بڑی دیر تک دعا فرمائی اور اس دعا ہی پر جلسہ ختم ہو گیا۔]

## دو نئی کتابیں

از محمد علاء الدین ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء

(۱) ہجرت مصطفیٰ سیرت نبوی کے سب سے مہتمم بالشان انقلابی موڈ کا مکمل دستاویزی خاکہ۔ ہجرت کے دور رس نتائج، ثمرات، برکات اور اس کے انقلابی پیغام کا مفصل اور دلنشین تذکرہ، دعوتی و تحریکی شعور کو ہمیز لگانے والی اپنے موضوع پر پہلی تعریف، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا واقع، پر مغز اور طویل مقدمہ۔ خوبصورت گرد و پوش۔ صفحات ۳۴۸ قیمت ۹۲ روپے۔

(۲) منتخب تعبیرات مدارس عربیہ کے طلباء کے لئے عربی زبان کی قدیم و جدید عمدہ تعبیرات کا بیش بہا خزانہ مع سلیس اردو ترجمہ، نیز مضمون نگاری اور مطالعہ کرنے کا طریقہ، ماہرین فن کی تقاریر، صفحات ۱۹۰ قیمت ۲۰ روپے۔

طلبا، اور تاحراں کتب کے لئے نصف قیمت۔

ملنے کے پتے . (۱) الفرقان بک ڈپو 114/131 نظیر آباد، لکھنؤ  
(۲) ندوی بک ڈپو ندوۃ العلماء، لکھنؤ

حضرت مولانا مرغوب الرحمن  
مہتمم دارالعلوم دیوبند

## حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

دارالعلوم دیوبند سے وابستہ دیرینہ یادوں کے نقوش و تاثرات

انسان کے اوصاف سعادت میں حق و صداقت کی پہچان اور اس کا اتباع ایک انسان بڑے خوش نصیب اور وہ روحیں بہت سعید ہیں جنہوں نے اپنی زندگی سمانچے میں ڈھال لیا ہو اور پروردگار نے آخر حیات تک انہیں اس کی توفیق تمام فیصلوں میں ہر طرح کی عصیت اور جانبداری سے دامن بچا کر صرف نصیب العین قرار دیں، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَسَتَرْنَا عَنْ أَهْلِ الْيَمِينِ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ (زمر آیت ۱۸)

پس میرے ان بندوں کو خوش خبری سنائیے جو (ہر بات سننے ہیں اور اس میں سے اچھی بات کا اتباع کرتے ہیں۔

یعنی اللہ کے جو بندے ہر طرح کی باتوں کو سننے کے بعد اچھی باتوں کو قبول کریں اور اسی کی پیروی کریں وہ خوش خبری کے مستحق ہیں پھر ان ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ (آیت بالا)

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور یہی لوگ اہل عقل ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ مندرجہ بالا صفت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پروردگار کی ہدایت ان کے شریک حال ہو جاتی ہے اور عقل کے صحیح استعمال کی وجہ سے اولوالالباب اور اہل عقل کا خطاب بھی انہیں لوگوں کے لئے موزوں ہے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، ہماری معلومات کی حد تک سعادت سے ہمکنار انہیں

توفیق یافتہ انسانوں میں تھے جنہوں نے ہمیشہ حق و صداقت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا اور ان کی زندگی اسی محور کے ارد گرد گھومتی رہی۔

دارالعلوم دیوبند سے ان کے ابتدائی اور طالبعلمانہ تعلق میں بھی توفیق ایزدی کی یہی روح کار فرما نظر آتی ہے کہ ان کے والد مرحوم جناب صوفی احمد حسین صاحب ذوق و مشرب کے اعتبار سے اہل دیوبند سے قریب نہیں تھے لیکن اس کو توفیق خداوندی ہی کہا جائے گا کہ انہوں نے اس اختلاف کے باوجود اپنے فرزند کو حدیث پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند بھیجے کا فیصلہ کیا اور اس طرح مولانا نعمانیؒ کو خداوند قدوس نے طالب علمی ہی کے زمانہ سے اولئک الدین ہذہم اللہ کے انعام کا مستحق بنادیا، پھر یہ کہ اس تعلق نے ان کے والد مرحوم کے ذوق و مشرب کو بھی بڑی حد تک تبدیل کر دیا۔

مولانا نعمانی ۲۳ شوال ۱۳۴۳ھ کو دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوئے، (جب کہ ان کی عمر ۱۹ سال تھی) ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدرسۃ الشریعہ سنہجھل سے معقولات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دیوبند پہنچے تھے، امتحان داخلہ دینے کے لئے جن کتابوں کے نام درج ہیں ان میں قاضی مبارک، امور عامہ، صدر، توضیح وغیرہ شامل ہیں، ممتحن نے ان کتابوں میں کامیابی کے نمبرات دے کر انہیں مشکوٰۃ شریف کی جماعت میں داخل کیا، پورے سال وہ انہماک کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے اور امتحان سالانہ میں انہوں نے مندرجہ ذیل نمبرات حاصل کئے۔ (۱)

۱۔	مشکوٰۃ شریف	۵۱
۲۔	ہدایہ احیریں	۵۰
۳۔	حلالین شریف	۵۰
۴۔	دیوان حماسہ	۵۰
۵۔	سعہ معلقہ	۴۶
۶۔	شرح نوحۃ المکر	۴۴
۷۔	سراحی	۴۳

۱۳۴۴ھ کے سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی کے بعد وہ ۱۳۴۵ھ میں دورۂ حدیث

(۱) یہاں یہ واضح رہے کہ دارالعلوم میں نمبروں کی زیادہ سے زیادہ مقررہ حد ۵۰ ہے۔ لیکن پرچہ اگر بہت اچھا حاصل ہو روایت ہے کہ ممتحن کو کچھ نمبر بڑھا دیتا ہے۔

داخل ہوئے، یہ سال حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی صدارت کا آخری سال تھا، مولانا نعمائی نے پورے سال تمام باکمال اساتذہ سے استفادہ کیا اور اس سال انہوں نے دورہ حدیث میں امتیازی نمبرات حاصل کئے، پوری جماعت میں اول قرار دیئے گئے، دورہ حدیث کے نمبرات کی تفصیل یہ ہے۔

۵۳	۱۔ مسلم شریف
۵۱	۲۔ بحاری شریف
۵۱	۳۔ ابوداؤد شریف
۵۱	۴۔ ترمذی شریف
۵۱	۵۔ موطا امام محمد
۵۰	۶۔ نسائی شریف
۵۰	۷۔ طحاوی شریف
۵۰	۸۔ موطا امام مالکؒ
۴۹	۹۔ شمائل ترمذی شریف
۴۸	۱۰۔ بیضاوی شریف
۴۵	۱۱۔ اس ماحہ شریف

طالب علمانہ زندگی کی یہ باتیں دارالعلوم کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا نعمائی نے حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کیا، پھر دارالعلوم کے اکابر اساتذہ سے علم و عمل کی جو دولت حاصل کی تھی اسکی اشاعت میں سرگرم عمل ہو گئے، مختلف مدارس میں کام کیا، مختلف دینی و ملی تنظیموں کی سرگرمیوں میں حصہ لیا، فرق باطلہ کے زعماء کو مناظروں کے میدان میں گھسیٹا اور شکست فاش دی، بریلی سے مجلہ الفرقان جاری کیا، ان سب خدمات کا تذکرہ اور ان کی تفصیلی سرگزشت دیگر مضامین میں آئے گی، میرا مقصد تو صرف یہ بیان کرنا ہے کہ فراغت کے بعد موصوف کا کوئی ضابطہ کا تعلق تو دارالعلوم سے نہیں تھا لیکن وہ جہاں بھی کوئی خدمت انجام دے رہے تھے ان سب کو دارالعلوم سے حاصل کردہ دینی حرارت کا مظہر اور دارالعلوم سے حاصل کردہ امانت کی تقسیم سمجھنا چاہئے۔

اسی وجہ سے وہ اپنی تمام سرگرمیوں میں اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے برابر رابطہ قائم

رکھتے تھے، ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، یہاں تک کہ فراغت کے صرف اٹھارہ سال بعد ان کا دارالعلوم سے ضابطہ کا نہایت مستحکم تعلق قائم ہو گیا کہ وہ ۱۳۶۳ھ میں مجلس شوریٰ کے ممبر نامزد ہو گئے اور اس طرح اکابر دارالعلوم کی جانب سے ۴۰ سال سے کم عمر میں انہیں اعتماد کی سب سے بڑی سند اور اعزاز کا سب سے اونچا منصب عطا کر دیا گیا۔

جس مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۶۳ھ میں شوریٰ کی رکنیت کے لئے منتخب کیا، اس میں مندرجہ ذیل اکابر شریک تھے۔

- ۱۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب
- ۲۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
- ۳۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قائم مقام صدر المدر سین
- ۴۔ جناب حاجی رشید احمد صاحب
- ۵۔ جناب حافظ محمد یوسف صاحب انصاری
- ۶۔ جناب مولانا حافظ محمد اشفاق صاحب
- ۷۔ جناب مولانا حکیم مشیت اللہ صاحب
- ۸۔ جناب مولانا حکیم محمد یونس صاحب
- ۹۔ جناب مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب
- ۱۰۔ جناب مولانا حکیم محمد صادق صاحب
- ۱۱۔ جناب شیخ ضیاء الحق صاحب

اس زمانہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ، صدر المدر سین تھے، لیکن حضرت موصوف کی گرفتاری اور نظر بندی کی وجہ سے صدارت تدریس کا کام قائم مقام کے طور پر شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب انجام دے رہے تھے، اس سلسلے میں جو تجویز منظور کی گئی اس کا پورا متن یہ ہے۔

تحویر نمبر ۱ ایجنڈے کا پہلا نمبر پیش ہوا، اس کے متعلق مہتمم صاحب کی رپورٹ پڑھی گئی، اس میں مولانا حفظ الرحمن کا نام ہے مگر ان کی معذوری ظاہر ہے کہ وہ نظر بندی کی حالت میں ہیں، دوسرا نام حضرت مولانا محمد حسن صاحب قاضی بھوپال کا ہے، مجلس ان کو ان کے تقدس اور خدمات قدیمہ دارالعلوم اور ان کے ضعف کی وجہ سے دفعہ ۱۳ کے تحت حاضری جلسہ سے مستثنیٰ کرتی ہے، ان کی تحریری رائے مجلس میں ان کی حاضری کے قائم مقام ہوگی، تیسرا نام



مولانا محمد صادق صاحب کا ہے وہ خود تشریف لے آئے ہیں لہذا ان کا معاملہ ختم ہو گیا، باقی تین حضرات خواجہ فیروز الدین صاحب، مولوی ظہیر الحسن صاحب کا ندھلوی اور مولوی محمد سہول صاحب کے متعلق مجلس نے کثرت رائے سے فیصلہ کیا کہ ان حضرات کو افسوس کے ساتھ رکنیت مجلس سے سبکدوش کیا جاتا ہے، جناب حاجی رشید احمد صاحب کی رائے یہ تھی کہ اس وقت ان کو توجہ دلائی جائے اور بصورت عدم شرکت ان کی علاحدگی کا مسئلہ آئندہ مجلس میں پیش ہو، خالی شدہ اسامیوں کو پر کرنے کے لئے مہتمم صاحب نے مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری کے نام پیش کئے جو کثرت رائے سے منظور کئے گئے۔

یہ مجلس شوریٰ ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۰ مئی ۱۹۴۴ء کو ہوئی۔ اس کے بعد حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ۲۰ جمادیٰ نعمانی صاحب کے نام رکنیت شوریٰ کی اطلاع پر مشتمل مکتوب گرامی تحریر کیا۔

حضرت المحترم.. . . . . زید مجدکم السامی

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ مسند ۱۰۰ ممدون  
الاولیٰ ۶۳ھ نے جناب کا اسم گرامی رکنیت شوریٰ کے لئے منتخب کر کے پاس کیا ہے اسلئے ملتس  
ہوں کہ مجلس کے اس انتخاب کو قبول فرما کر منظوری سے اطلاع فرمائی جائے اور مجالس کے  
جلسوں میں جو سال بھر میں دو دفعہ ہوتے ہیں شرکت فرما کر مفید مشوروں سے خدام دارالعلوم کو  
ممنون فرمایا جائے۔

جناب کی ذات گرامی کا سفر خرچ آمد و رفت ہر جلسہ کے موقع پر دارالعلوم کے ذمہ ہو گا جو کہ جناب پرچہ مصارف دے کر طلب فرمائیں گے۔

میری مکرر درخواست ہے کہ جلسوں میں شرکت سے گریز نہ فرمایا جائے کیونکہ ممبری کا مقصد محض نام اور نامزدگی نہیں بلکہ کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے معاملات سے باخبر رہ کر کارکنوں کو مشورہ اور رائے سے امداد دیا جاتا، ان کے تفکرات میں ہاتھ بٹاتا اور جو عمل میں مبتلا ہیں ان سے معاملات کا صحیح علم حاصل کر کے اس پر رائے قائم کرنا اور ان کی اعانت فرماتا ہے، یہ بغیر جلسوں میں آئے بلکہ موقع بموقع یوں بھی دارالعلوم میں تشریف لا کر یہاں کے حالات و ضروریات سے مطلع ہوئے بغیر ممکن نہیں، اس لئے میری سہ کرر درخواست ہے کہ کم از کم

جلسوں کے موقع پر تو شرکت اشد ضروری ہے۔

یہاں کے اصول کے مطابق تین جلسوں میں بلا معذرت عدم شرکت پر مجلس دوسرے انتخاب پر غور کرتی ہے اس لئے درخواست بار بار کی گئی۔ امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔ والسلام

(احقر) محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۰-۵-۱۳۶۳ھ

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمہ اللہ، کالمکتوب گرامی وصول کر کے، حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی رحمہ اللہ نے ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۳ھ کو رکنیت شوریٰ قبول کرنے سے متعلق جو مکتوب گرامی تحریر فرمایا تھا حسن اتفاق کہ وہ بھی فائل میں محفوظ ہے اور اس کا ایک ایک لفظ حضرت مرحوم کے خلوص، للہیت، فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کا آئینہ دار ہے، لکھتے ہیں۔

مخدومی! دامت فیو صدکم

سلام مسنون گرامی نامہ مشتمل بر اطلاع رکنیت شوریٰ موصول ہوا، حیرت ہوئی کہ یہ کیوں کر ہوا اور میرے کن بزرگوں کی نیک گمانی اس کا باعث بنی۔

بہر حال اپنی نااہلیت اور عدم صلاحیت کے حقیقی احساس کے باوجود اس ذمہ داری کو اس اللہ کی مدد اور توفیق کے بھروسہ پر میں قبول کرتا ہوں جو جانتا ہے کہ یہ بوجھ بلا میرے علم اور بغیر مجھ سے دریافت فرمائے میرے بزرگوں نے مجھ پر ڈالا ہے، اس سے دعا ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کی نیک گمانی کی لاج رکھتے ہوئے اس سلسلے کے صواب و سداد کی مجھے ہمیشہ توفیق دے اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں میری مدد فرمائے۔ اللہم لاتجعلنی بدعائک شقیماً وکسبی رؤفاً رحیماً۔ اللہم الہمی رشدی و قنی شر نفسی۔ آپ سے بھی اسی دعا کا خواستگار ہوں۔

الحمد للہ بخیریت ہوں، خدا کرے مزاج گرامی بھی بعافیت ہو۔

خادم۔ محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

گرامی نامے میں پہلے حیرت و استعجاب کا اظہار ہے، پھر اس منصب کے لئے اپنی نااہلی کا اعتراف ہے، پھر حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کی روایت و ان اعطیتها عن غیر مسئلة اُعت علیہا کے مضمون کے پیش نظر ذمہ داری کو قبول کرنے کی اطلاع ہے اور آخر میں بارگاہ خداوندی میں دل کی مخلصانہ دعائیں ہیں۔

راقم الحروف، مجلس شوریٰ کارکن ہونے کی حیثیت سے، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے بارے میں یہ شہادت پیش کرتا ہے کہ شوریٰ میں ان کا طرز عمل مکتوب میں پیش کردہ دونوں باتوں یعنی توفیق سداد و صواب اور حقوق دارالعلوم کی ادائیگی کا مکمل آئینہ دار تھا، اور حقیقت حال تو آخرت ہی میں سامنے آئے گی تاہم قرائن و آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دعائیں بارگاہ خداوندی میں شرف قبول سے نوازی گئیں۔ اور توفیق صواب و ادائیگی حقوق میں ان کا کردار بہت نمایاں رہا۔ معذوری کے چند آخری سالوں کو مستثنیٰ کر کے وہ پابندی کے ساتھ شوریٰ و عاملہ کی تمام مجلسوں میں شریک ہوتے رہے اور ہر طرح کی ذہنی و عملی توانائی سے دارالعلوم کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے رہے۔

ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے داخلی و بیرونی مسائل سے متعلق جب بھی کوئی کمیٹی تشکیل کی گئی تو اس میں بہت اہمیت کے ساتھ ان کا نام شامل کیا گیا۔ بالکل ابتدائی سالوں میں وہ دارالعلوم کی دستور ساز کمیٹی کے ملازمین دارالعلوم کی ترقیات یا گریڈ پر نظر ثانی سے متعلق کوئی کمیٹی اصلاحات سے متعلق کوئی کمیٹی مقرر کی گئی وہ برابر اس کے رکن نامزد۔

راقم الحروف بھی ۱۹۶۲ء سے دارالعلوم کی شوریٰ کارکن ہے، اور اگرچہ محمد منظور صاحب نعمانی سے غائبانہ تعارف تو بہت پہلے سے تھا لیکن ملاقات کا شرف مجلس شوریٰ ہی میں حاصل ہوا، پھر وہیں موصوف کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا، اور اس زمانہ سے لیکر آج تک کے ارکان شوریٰ میں راقم مولانا نعمانی صاحب مرحوم کے طرز عمل سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔

موصوف کا مجلس شوریٰ میں شرکت کا طرز عمل یہ تھا۔

(الف) وہ دارالعلوم کے معاملات میں رائے قائم کرنے سے پہلے مختلف لوگوں سے تبادلہ خیال کرتے اور غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کر لیتے اسکو صاف طور پر پیش کرتے تھے، کسی کی رعایت کی بنیاد پر چشم پوشی یا مدافعت ان کی عادت نہیں تھی۔

(ب) مجلس شوریٰ کے ارکان دو حصوں میں تقسیم تھے، ایک حزب اقتدار، اور ایک حزب مخالف، اور عام طور پر ممبران کی رائے میں اپنی جماعت کے رجحانات کی رعایت پائی جاتی تھی، لیکن مولانا نعمانی مرحوم کا ان دونوں جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ خصوصی تعلق نہیں تھا، ان کی رائے ہمیشہ دارالعلوم کے مفاد کے تابع رہتی تھی۔

(ج) انھیں اپنی رائے پیش کرنے کا بڑا سلیقہ تھا، مجلس کے آداب اور تمام اراکین مجلس کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی رائے پیش کرتے تھے، بڑے محتاط الفاظ استعمال فرماتے تھے، لب و لہجہ سے تواضع اور انکسار جھلکتا تھا، بسا اوقات تاثر کی شدت میں آواز بھر جاتی تھی، کبھی آنکھیں بھی نم ہو جاتی تھیں، اور اگر وہ کسی کے بارے میں یہ سمجھ لیتے تھے کہ وہ کسی وجہ سے ان کی بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کر پائیں گے تو وہ ان سے تنہائی میں ملتے، اپنی رائے پیش کرتے، دوسرے کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور عام طور پر یہ ہوتا کہ دوسرے کو اپنی رائے پر مطمئن کر لیتے یا دوسرے کی رائے قبول کر کے خود مطمئن ہو جاتے۔ اسی لئے دارالعلوم کے معاملات میں ان کے اخلاص و دیانت، غیر جانبداری اور اصابت رائے کو دیکھتے ہوئے رافق المحروف کا بیشتر ان سے اتفاق رائے رہتا تھا۔

(د) موصوف میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی رائے کو کبھی اپنی ذات کا مسئلہ نہیں بناتے تھے، اگر اپنی رائے کی کمزوری واضح ہو جاتی تو اس کو برملا واپس لے لیتے تھے اور اگر کمزوری بھی واضح نہ ہوتی تو مجلس کے ضابطہ کے مطابق کثرت رائے کا احترام کرتے۔ میں نے کبھی انہیں اپنی بات کی ہچ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(ه) اصابت رائے میں ان کا خصوصی مقام تھا اور مجلس ان کی رائے کو بڑی اہمیت دیتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ مجلس میں اختلاف رائے ہوا تو مسئلہ مولانا نعمانی صاحب کے سپرد کر دیا گیا اور انہوں نے جو رائے پیش کی اسی کو فریقین نے قبول کر لیا۔

حضرت مولانا نعمانی صاحبؒ کی رائے پر محمول کئے جانے والے یہ مسائل بڑی اہمیت کے حامل ہوتے تھے، جیسے ممبران شوریٰ کی خالی جگہوں پر انتخاب کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ ہر اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ انہی ممبران کے ذریعہ پروردگار عالم دارالعلوم جیسی عظیم الشان روایات کی حامل درس گاہ کا نظم چلا رہا ہے اور دارالعلوم کے حال اور مستقبل کا انحصار انہی حضرات کی رائے پر ہوتا ہے۔

ایک سے زائد بار ایسا ہوا کہ ممبران کے انتخاب میں شدید اختلاف رائے کی نوبت آئی تو مجلس شوریٰ نے اس کو مولانا نعمانی مرحوم کے حوالہ کر دیا اور انہوں نے جو نام پیش فرمائے وہ سب کے نزدیک قابل قبول قرار پائے۔

مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۵/۲۶/۲۷ رجب ۱۴۱۰ھ مطابق ۳۰/۳۱/۳۲ مئی و یکم جون ۱۹۸۱ء میں ایسی ہی صورت پیش آئی تو مسئلہ مولانا نعمانی مرحوم کے سپرد کر دیا گیا، اور پیش کردہ

تمام ناموں کی فہرست کے ساتھ انہیں یہ اختیار دیدیا گیا کہ خواہ وہ ان ناموں میں سے انتخاب کریں یا اپنے طور پر دارالعلوم کی شورئی کے لئے کسی نام کو موزوں سمجھتے ہوں تو اس کو لے لیں، اور اسی مجلس کی دوسری نشست میں ان ناموں کو پیش فرمادیں، چنانچہ مولانا نعمانی صاحب مرحوم نے غور و فکر کے بعد حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی (۱) مولانا محمد عثمان صاحب دیوبندی نبیرہ شیخ الہند، اور جناب حاجی علاء الدین صاحب پالپوری رحمہم اللہ کے نام پیش کئے جنہیں مجلس نے کسی بھی بحث و تجویز اور کسی بھی اختلاف کے بغیر قبول کر لیا۔

مولانا نعمانی صاحب رحمہ اللہ کے مجلس شورئی میں شرکت کے طرز عمل کی وضاحت سے راقم الحروف اپنے اس تاثر کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ شریعت میں مشورہ کے جو مقاصد ہیں کہ ایک دوسرے کی رائے سے استفادہ کر کے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ کیا جائے، پھر بہتر صورت کو اختیار کیا جائے۔ مولانا نعمانی کا مزاج اور ان کا طریقہ کار ان تمام شریعتی مجلس شورئی میں ان کی رائے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی اور کبھی رائے کے مطابق تجویز منظور کر لی گئی۔

مددگار مہتمم کی حیثیت سے راقم الحروف کے دوش ناتواں۔  
تہا مولانا نعمانی مرحوم کی پیش کردہ تجویز کو قبول کرنے کی صورت میں نمل۔ یہ۔ د۔ یہ۔  
جب اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں اختلاف کا آغاز ہوا تو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ نے مجلس شورئی پر ایک مفصل تحریر پیش کی جس میں حضرت اقدس نے اپنی معذوریوں کو پیش کرتے ہوئے لکھا کہ میرے قویٰ میں اضمحلال آگیا ہے۔ بصارت بھی

(۱) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی رحمہ اللہ کا نام آگیا ہے تو یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ماضی قریب میں مولانا مرحوم کی وفات کے بعد بعض اہل قلم کے مضامین میں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ دارالعلوم میں اختلافات کے بعد انھوں نے مجلس شورئی میں شرکت ترک کر دی تھی، یہ بات واقعات کے بالکل خلاف اور محض غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش ہے۔

اول تو حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمہ اللہ کا انتخاب ہی دارالعلوم میں اختلاف رونما ہونے بلکہ شدت اختیار کرنے کے بعد، دارالعلوم کی انتظامیہ کی تبدیلی سے صرف ایک سال پہلے ہوا تھا، انتظامیہ کی تبدیلی جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ میں ہوئی ہے اور حضرت مولانا کا انتخاب رجب ۱۴۰۱ھ میں۔ دوسرے یہ کہ موصوف اس کے بعد اکثر مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے، ممبری قبول کرنے کے بعد منعقد ہونے والی نصف سے زائد مجلسوں میں ان کی شرکت ہے اور جس مجلس میں شرکت نہیں ہے وہاں عدم شرکت کے عذر پر مشتمل گرامی نامے ہیں، پھر شعبان ۱۴۰۵ھ میں مجلس نے ان کا استعفیٰ بھی مولانا نعمانی مرحوم کی سفارش پر قبول کیا ہے، حضرت مولانا کے استعفیٰ نامہ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

کنزور ہو گئی ہے، ذہن بھی پوری طرح مسائل کو اخذ نہیں کرتا وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے اگر یہ صورت اختیار کر لی جائے کہ منصب اہتمام پر نام تو میرا ہی رہے اور کام کے لئے کسی دوسرے کا انتخاب کر لیا جائے تو یہ دارالعلوم کے لئے بہتر رہے گا۔

ابھی ممبران شوریٰ حضرت اقدس کی تحریر کے مضمرات پر غور ہی کر رہے تھے کہ اچانک مولانا نعمانی مرحوم نے کسی بھی طرح کا استفسار کئے بغیر میرا نام پیش کر دیا۔ خدا گواہ کہ میرے جسم پر لرزہ طارہ ہو گیا کہ ایک ذرہ بے مقدار دارالعلوم کی کیا خدمت کرے گا لیکن ہوا یہ کہ میرے علاوہ کسی بھی ممبر نے حضرت مولانا نعمانی مرحوم کی اس تجویز سے اختلاف نہیں کیا۔ حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی مرحوم تجویز لکھنے لگے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، مولانا نعمانی مرحوم نے بڑی خشمکیں نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اصرار کر کے مجھے سکوت پر مجبور کر دیا اور فرمایا کہ تمہاری طرف سے طلب نہیں ہے اس لئے اللہ کی مدد شامل حال رہے گی۔ دارالعلوم کی خدمت کو کار آخرت سمجھ کر انجام دینا چاہئے اور گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد جب قضا و قدر کے فیصلے کے مطابق اختلافات کی خلیج وسیع ہوئی تو اس موقع پر حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مرحوم کا کردار نکھر کر سامنے آیا اور انھوں نے جس موقف کو درست سمجھا اس کی تائید و نصرت یا بالفاظ دیگر احقاقِ حق میں کسی مداخلت کو راہ نہیں دی کہ مولانا نعمانی صاحب ان اختلافات سے پہلے بڑی حد تک حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ سے قریب تھے اور ان دونوں بزرگوں کے درمیان کئی طرح کے مضبوط روابط تھے لیکن مولانا نعمانی صاحب نے دارالعلوم کے مفاد کے مقابلہ پر ان روابط اور تعلقات کی رعایت نہیں کی اور جس موقف کو صحیح سمجھا اس کے لئے اپنی پوری توانائی صرف فرماتے رہے۔ اس دور میں بار بار مشکل مراحل پیش آتے رہے اور ہر مرحلہ پر ان کے خلوص و للہیت اور اصابت رائے سے استفادہ کیا جاتا رہا — موصوف سے بھی مراسلت کے ذریعہ مشورہ کیا گیا اور بار بار ایسا ہوا کہ گفتگو کے لئے سفر کی نوبت آئی اور ہر مرتبہ یہ فائدہ رہا کہ مشکلات کی گرہ کھل گئی۔

دارالعلوم دیوبند سے مولانا نعمانی مرحوم کے تعلقات کی تفصیلات تو بہت ہیں لیکن راقم الحروف کو مضمون لکھنے کی عادت نہیں اس لئے طالب علمی کے دور سے شوریٰ کی رکنیت تک کی مختصر باتیں اور اس سلسلے میں کچھ تاثر پیش کر دیا گیا، تاکہ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی قدس سرہ کے بارے میں وہ شہادت اور اق میں محفوظ ہو جائے جو احترام کے جذبات کے ساتھ میرے سینے میں محفوظ ہے۔

مولانا محمد عاشق الہی برنی مدینہ منورہ

## اپنے اسلاف کی یادگار

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ واصحابہ و من تبعہ۔

اما بعد اسید الاولین والآخرین حضرت رسول اکرم ﷺ چونکہ آخر ال  
تمام انسان ان ہی کی شریعت پر چلنے کے لئے مامور ہیں، اور آپ کی ستر۔  
اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ کے بعد آپ کے علوم اور اعمال کی حفاظت کا انتظام فرمایا ہے۔ قرآن  
حکیم کے بارے میں قرآن مجید ہی میں ارشاد ہے ”إِنَّا نَحْنُ رُكْنَا الدِّكْرَ وَأَنَّا لَهُ لِحَافُطُونَ“  
(ہم ہی نے نازل کیا ہے یہ ہدایت نامہ (قرآن) اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔)  
قرآن حکیم کی حفاظت اس کے الفاظ و معانی کی، احکام اسرار و حکم کی حفاظت کے ساتھ  
ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی حفاظت بھی امت مسلمہ کرتی رہی ہے اور غیر منصوص  
مسائل میں فقہاء نے استنباط و اجتہاد کا فریضہ ادا کیا۔ یہ سب چیزیں محفوظ ہیں اور ان کو محفوظ  
رکھنے والے بھی ہمیشہ رہے ہیں۔ قرآن و حدیث کو محفوظ رکھنا اور ان کو آگے بڑھانا اور پھیلانا  
احکام پہنچانا، عمل کرنا اور عمل کرانا امت کی ظاہری اور باطنی تربیت کرنا، تزکیہ نفوس کا کام انجام  
دینا۔ یہ سب امور امت کے ذمہ ڈالے گئے اور الحمد للہ اکابر امت نے ہمیشہ اس ذمہ داری کو پورا  
کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا ”يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمُ مِ  
كُلِّ خَلْفٍ عَدُولَهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِبِينَ وَ انْتِحَالَ الْمُسْطَلِينَ وَ تَاوِيلَ الْجَاهِلِينَ“ (اس  
علم (علم دین) کو ہر زمانے کے اچھے بندے سنبھال لیں گے۔ وہ غلو و افراط والوں کی تحریفوں سے، کھوٹے سکے

رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کو میراث نہیں دی اور یہ کہ خلافت بلا فصل کے حق دار رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کو خلافت نہیں دی لہذا یہ لوگ خلافت کے غاصب ہیں۔ شروع میں تو اتنی ہی بات تھی کہ حضرت ابو بکر نے میراث نہیں دی اور خلافت غصب کر لی۔ اس کے بعد شدہ شدہ شیعیت یہاں تک پہنچ گئی کہ دو تین حضرات کو چھوڑ کر سب صحابہ کو کافر کہا جانے لگا۔ پھر جب یہ بات سامنے آئی کہ قرآن میں تو حضرات صحابہ کی تعریفیں آئی ہیں اور ان کے بارے میں رضى الله عنهم و رصو عہ فرمایا گیا ہے۔ تو یہ عقیدہ بنالیا گیا کہ قرآن کریم میں تحریف کی گئی ہے احد یہ کہ اللہ تعالیٰ کو بد اہو گیا تھا (العیاذ باللہ)۔ شیعوں کے یہ عقائد تو عام طور سے مسلمان نہیں جانتے تھے، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ نے تحفہ اثنا عشریہ میں شیعیت کا تعارف کرایا اور ان کے فرقوں اور عقائد کی نشاندہی کی۔ ان کے لعدہ حض - مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمہ اللہ علیہ نے شیعیت کا تعارف و اشکاف کرنے اور امت مسلمہ کو ان سے واقف کرانے کا بیڑا اٹھایا وے خوب کام کیا اور بڑا کام کیا۔

پس جب ایرانی انقلاب سامنے آیا جو سراسر شیعی انقلاب

تعارف کرانے میں بہت سے علمائے پاکستان نے حصہ لیا حضرت مولانا محمد مسطور عثمانی نے ہندوستان میں اس کا بیڑا اٹھایا اور ”ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت“ کے نام سے اپنی مشہور کتاب لکھی۔ اس کتاب میں شیعیت کی اصل تصویر کھینچ دی اور خمینی کے معتقدات کا اس کی اپنی تصانیف کے آئینہ میں تعارف کرایا۔ شیعوں کو ناگوار تو بہت ہوا لیکن اہل حق ہمیشہ حق ظاہر کرتے رہے ہیں۔ حضرت مولف نے کسی کی ناگواری کی کچھ پروا نہ کی اور الحمد للہ کتاب بارہا چھپی اور ان شاء اللہ چھپتی رہے گی۔ اور دنیا بھر میں اس کے تراجم ہوئے۔

جہاں تک علمی لکھا پڑھی اور زبانی مناظروں کا تعلق ہے شیعہ آج تک کسی بات کا جواب نہیں دے سکے اور اپنے عقائد کو قرآن و سنت سے بلکہ حضرت علیؓ کی سیرت سے اور ان کے اقوال سے بھی ثابت نہیں کر سکے۔ باوجودیکہ ولائیں سے عاجز ہیں، اپنے مسلک و مذہب کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔ پھر بھی اپنے کو دین اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اگر کوئی کافر کہتا ہے تو برا مانتے ہیں۔ ہمارے اکابر نے فرمایا ہے کہ کافر ہونے والا خود کفر اختیار کرتا ہے علماء کا احسان ہے کہ بتا دیتے ہیں کہ یہ عقیدہ کفریہ ہے۔ لہذا ان حضرات کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ لیکن گمراہ لوگوں کو حق اور حقیقت کی طرف آنے کی راہ ملتی ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں



سورہ جاثیہ میں اَقْرَأْتِ مَنْ اتَّحَدَ الْهَہَ ہوا..... الح کہا گیا ہے اہل حق نے ہمیشہ اظہار حق اور اعلان حق کا فریضہ ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی اسی طرف توجہ فرمائی اور خوب شرح و بسط کے ساتھ شیعیت کا تعارف کرا دیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔

☆☆☆

صفحہ ۱۱۸ کا بقیہ

میں بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ وہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے اعمال کو حسنات کے ترازو میں جگہ دے، ترقی درجات سے نوازے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

والحمد لله اولاً و آخراً۔

☆☆☆

### سلسلہ تجلیات تین کی چار اہم کتابیں

از حضرت مولانا عبدالباقی ندوی

ہم نے جہل و جہالت نفس و نفسانیت کی بدولت دین کی بہت سی بچی بچی باتوں کو بھول بھلا کر اور ان میں بے دینی کی باتیں ملا کر یا ان پر عمل چھوڑ کر دین کی دینی ہی نہیں دنیوی بھی ہر طرح کی بھلائیوں اور کامیابیوں سے اپنے کو محروم کر لیا ہے۔

ان کتابوں میں از سر نو پورے دین کی کھری بچی صاف ستھری صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ اسی پر نہ صرف آخرت کی نجات کا قطعی وعدہ ہے بلکہ دنیا کی بھی انفرادی و اجتماعی، معاشی و سیاسی تمام پریشانیوں سے نجات کی یہی اکیلی راہ ہے۔

ان کتابوں میں درج دیل موضوعات پر بحث کی گئی ہے :

(۱) تجدید دین کا کل انفرادی صلاح و اصلاح پر (۲) تجدید تصوف باطنی و اخلاقی پر۔

(معروف بہ جامع الجہدین)

(۳) تجدید تعلیم و تبلیغ اجتماعی و سماجی پر۔ (۴) تجدید معاشیات معاشی یارزقی پر۔

ملنے کا پتہ :

باری پبلی کیشنز، باری ہاؤس، سیٹاپور روڈ، لکھنؤ

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی ندوی  
چیرمین ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

## عہد حاضر کا مجاہدِ اسلامیؒ

”نگاہِ اولیس“ ”الفرقان“ اور ”مولانا محمد منظور نعمانی“ کے تعارف ہوا جب ان میں سے کسی کے معنی و تعریف سے خاکسار واقف مولوی انعام علی رحمہ اللہ کے پاس روز اول سے ماہنامہ ”الفرقان“ لکھنؤی ”الفرقان“ سے ہوئی جو آخری بھی بنی، بریلوی سے ملاقات بہن جہت، وضعدار اور صاحبِ قلب و نظر تھے، سب سے تعلق رکھتے تھے مگر تعلق خاطر لکھنؤ کے صاحبِ الفرقان اور حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم سے بیحد و بیکراں تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ دونوں صاحبین، شیخین اور امامین تھے۔ صاحبِ الفرقان سے غائبانہ اور ”الفرقان“ اور اسکی ”نگاہِ اولیس“ سے مشاہدانہ تعارف و تعلق بابا جان گرامی نے پیدا کیا، اور ان کے معانی و مفاہیم، جہات و تعریفات اور حدود و قیود سے آگاہی بخشی۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کی ”زیارتِ اولیس“ اس صدی عیسوی کی چھٹی دہائی کے دوسرے یا تیسرے برس ہوئی جب لکھنؤ میں عظیم تبلیغی اجتماع ہوا۔ اس میں شرکت کرنے غالباً اول مرتبہ ہمارے قصبہ کی ایک نمائندہ جماعت لکھنؤ پہنچی۔ امیر جماعت کے فرزند دلہند ہونے کی بنا بر کم، بیکراں محبت پدری کی وجہ سے زیادہ، خاکسار بھی اس کا ادنیٰ بلکہ ادنیٰ ترین فرد اور کمسن ترین رکن تھا۔ اس قاطبِ یادگار و حاملِ اثرات و برپا اجتماع کی بے پناہ برکات دیگر کے علاوہ چند چیزوں نے جو ”چیزے دیگری“ قسم کی تھیں، دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے اسیر محبت و تعلق کر لیا۔ حضرت مولانا محمد عمران خان ندوی رحمہ اللہ کی لبھاتی، گدگداتی، ہنساتی اور رلاتی تقریر اور حسین و جمیل شخصیت، مولانا محترم حضرت سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا جادو بیاں خطاب اور پرکشش سراپا، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا پرسوز و دل سوز

سورہ جاثیہ میں اُقرَأْتِ مَنْ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ..... الح کہا گیا ہے اہل حق نے ہمیشہ اظہار حق اور اعلان حق کا فریضہ ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی اسی طرف توجہ فرمائی اور خوب شرح و بسط کے ساتھ شیعیت کا تعارف کرا دیا۔ مرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔



صفحہ ۱۱۸ کا بقیہ

میں بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ وہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے اعمال کو حسنات کے ترازو میں جگہ دے، ترقی درجات سے نوازے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

والحمد لله اولاً و آخراً۔



### سلسلہ تجلیات تین کی چار اہم کتابیں

از حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ

ہم نے جہل و جہالت نفس و نفسانیت کی بدولت دین کی بہت سی عجیبی باتوں کو بھول بھلا کر اور ان میں بے دینی کی باتیں ملا کر یا ان پر عمل چھوڑ کر دین کی دینی ہی نہیں دنیوی بھی ہر طرح کی بھلائیوں اور کامیابیوں سے اپنے کو محروم کر لیا ہے۔

ان کتابوں میں از سر نو پورے دین کی کھری پکی صاف ستھری صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ اسی پر نہ صرف آخرت کی نجات کا قطعی وعدہ ہے بلکہ دنیا کی بھی انفرادی و اجتماعی، معاشی و سیاسی تمام پریشانیوں سے نجات کی یہی ایکلی راہ ہے۔

ان کتابوں میں درج دیل موضوعات پر بحث کی گئی ہے :

(۱) تجدید دین کامل انفرادی صلاح و اصلاح پر (۲) تجدید تصوف باطنی و اخلاقی پر۔

(معروف بہ جامع المجددین)

(۳) تجدید تعلیم و تبلیغ : اجتماعی و سماجی پر۔ (۴) تجدید معاشیات : معاشی یارزنی پر۔

ملنے کا پتہ :

باری پبلی کیشنز، باری ہاؤس، سیتاپور روڈ، لکھنؤ

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی ندوی  
چیرمین ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

## عہد حاضر کا مجاہدِ اسلامیؒ

”نگاہِ اولیں“ ”الفرقان“ اور ”مولانا محمد منظور نعمانی“ کے۔

تعارف ہوا جب ان میں سے کسی کے معنی و تعریف سے خاکسار واقف ۔۔۔  
مولوی انعام علی رحمۃ اللہ کے پاس روز اول سے ماہنامہ ”الفرقان“ آتا تھا۔ میری پہلی شناسائی لکھنؤی ”الفرقان“ سے ہوئی جو آخری بھی بنی، بریلوی سے ملاقات کبھی نہیں رہی۔ بابا جان ہمہ جہت، وضعدار اور صاحبِ قلب و نظر تھے، سب سے تعلق رکھتے تھے مگر تعلق خاطر لکھنؤ کے صاحبِ الفرقان اور حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم سے بیحد و بیکراں تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ دونوں صاحبین، یتیمین اور امائین تھے۔ صاحبِ الفرقان سے غائبانہ اور ”الفرقان“ اور اسکی ”نگاہِ اولیں“ سے مشاہدانہ تعارف و تعلق بابا جان گرامی نے پیدا کیا، اور ان کے معانی و مقاصد، جہات و تعریفات اور حدود و قیود سے آگاہی بخشی۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ کی ”زیارتِ اولیں“ اس صدی عیسوی کی چھٹی دہائی کے دوسرے یا تیسرے برس ہوئی جب لکھنؤ میں عظیم تبلیغی اجتماع ہوا۔ اس میں شرکت کرنے غالباً اول مرتبہ ہمارے قصبہ کی ایک نمائندہ جماعت لکھنؤ پہنچی۔ امیر جماعت کے فرزند و بلند ہونے کی بنا بر کم، بیکراں محبت پدری کی وجہ سے زیادہ، خاکسار بھی اس کا ادنیٰ بلکہ ادنیٰ ترین فرد اور کسن ترین رکن تھا۔ اس قابلِ یادگار و حاملِ اثراتِ دریا اجتماع کی بے پناہ برکات و دیگر کے علاوہ چند چیزوں نے جو ”چیزے دیگر“ قسم کی تھیں، دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے اسیر محبت و تعلق کر لیا۔ حضرت مولانا محمد عمران خان ندوی رحمۃ اللہ کی لبھاتی، گدگداتی، ہنساتی اور رلاتی تقریر اور حسین و جمیل شخصیت، مولانا محترم حضرت سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا جادو بیباں خطاب اور پرکشش سراپا، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا پرسوز و دل سوز

بیان و سرپا تو وضع و انکسار تشخص اور اعلانات و آداب کرنے والے ایک حسین و جمیل حضرت کی دلاویز شخصیت اور سحر انگیز کلمات جو حضرت خضر علیہ السلام کی مانند راہ نماد راہبر رہے مگر تلاش کے باوجود کبھی نہ مل سکے۔

اجتماع لکھنؤ کی زیارتِ نعمانی گرچہ لمحاتی و عارضی تھی، مگر جلد ہی اسے مستقل و جاودانہ ہونا تھا۔ ۹ جولائی ۱۹۵۳ء کو اس راقم آثم کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ ہوا اور تعلیم کا سلسلہ ۱۹۶۰ء کی جولائی تک جاری رہا۔ اس مدت میں حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ سے گونا گوں تعلقات اور مختلف النوع روابط رہے۔ مولانا مرحوم کو تقریباً ہر رنگ و روپ میں دیکھا اور پرکھا۔ کبھی ان کو حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کے ”ثانی اثنبین“ کی صورت و رفاقتِ جاودانہ میں، گہے مبلغ و واعظ و مرشد کی مسند باتمکین و ہوش پر، گاہ گاہ ندوہ کے مربی شیخ اور مشیرِ باتدبیر کے منصبِ جلیل پر، اکثر و بیشتر استاذِ کل اور مدرسِ علوم و فنون کا بوریاۓ توکل و غنا سجائے ہوئے، مستقل مصنف و مؤلف اور مقالہ نگارِ اسلامی کی حیثیتِ دنوناز سے، خطیبِ جاد و بیان اور مدافعِ صحابہ کرام کے انداز میں، اور استقلالِ دوائی کے ساتھ مفکرِ اسلامی، مؤلفِ ایمانی اور خادمِ قرآن ربانی و سنتِ نبوی کی پیاری جون میں، مولانا مرحوم سے ندوہ کی تعلیم کے بعد گرچہ جسمانی روابط یا مشاہداتی تعلقات کم سے کم ہوتے چلے گئے تاہم روحانی ربط و تعلق اور فکری ہم آہنگی و دل بستگی میں کبھی خلل نہیں آیا۔

اشخاص و افراد میں بہت کم خوش نصیب اور کمتر اکتسابی ہوتے ہیں جو شخصیات بنتے ہیں اور پھر شخصیات سے بلند ہو کر عبقریات کے بلند منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی اشخاص، شخصیات و عبقریات میں تھے جو پوری صدی پر چھائے رہے۔ وہ بشر تھے اور ان میں بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ حسنات بھی تھے اور سینات بھی مگر ان کے حسنات کہیں زیادہ روشن تر و تابندہ تر تھے۔ خاکہ نگاری اور سوانح نگاری میں ان دونوں کو میزان میں تولایا جاتا ہے مگر خاکسار راقم تو نذرانہ عقیدت و ہدیہ محبت پیش کرنے بیٹھا ہے، اس میں مکروہات کا دخل کہاں؟ اور ہو بھی تو ایسی محبوب شخصیات کی خطایا بھی پیاری لگتی ہیں۔ ان کی نگاہِ اولیس سے لے کر خاتمہِ بالآخر تک جس رنگ و روپ، انداز و اداء، حال و قال اور صورت و شکل میں دیکھا ہے ان کی کچھ تاثراتی قلمی تصویریں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، کچھ تعمیلِ ارشادِ صاحب الفرقان ثانی میں، کچھ رسم و آدابِ نگارش کی خاطر اور بہت کچھ اس دل کے تقاضے سے جو ان کی محبت و عقیدت سے لبریز اور ان کے مراحمِ خردانہ اور الطافِ بے پایاں سے مہر آمیز ہے۔

## مبلغ و واعظ نعمانی

راقم سطور نے جب تک ہوش و خرد کے ناخن ذرا کم نکالے تھے مولانا مرحوم کو زیادہ تر ایک مبلغ و واعظ کے روپ میں زیادہ دیکھا۔ ندوہ میں مدتوں تک ہر جمعرات کو عورتا عشاء تبلیغی ہفتہ واری اجتماع اس کی حسین و جمیل مسجد میں ہوا کرتا تھا۔ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مرحوم و مغفور خطاب عام و خاص کے مستقل ارکان دوگانہ تھے۔ باقی آتے جاتے رہتے تھے کہ مسافر بھی ہوتے تھے اور راہی بھی۔ طلبہ کو بعد نماز مغرب ہی خطاب تبلیغ سننے کی اجازت تھی کہ عصر و مغرب کے مابین ان کو مومن قوی بننے کی تعلیم و ترست فٹ بال، والی بال وغیرہ کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ اس جسمانی مشق و

مہتمم ندوہ کی پشت پناہی ہی حاصل نہ تھی بلکہ مفتی زماں و مجتہد عصر رحمہ اللہ کا فتویٰ نمبر م بھی حاصل تھا۔ ان دونوں سے اگر کوئی روگرداں

نگاہ حضرت مولانا محمد اسحاق ندوی سندیلوی رحمہ اللہ کے حصار بے پناہ

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ارباب حل و عقد کی دور اندیشی، کہ خطاب عام و خاص لے ارکان دوگانہ کی گوہر افشانی مغرب کے بعد ہی ہوتی تھی۔ طلبہ و اساتذہ اور عام سامعین ہمہ تن گوش اور سرپا ہوش بنے دونوں مبلغوں کے خطاب و خطبہ سے بقدر استطاعت استفادہ کرتے۔ مولانا نعمانی مرحوم کی تقریروں کی فنی خصوصیات کو کوئی دوسرا صاحب قلم و فن اجاگر کرے گا، ہمارے گوش و ہوش پر جو اثرات و ارتسامات ہیں وہ ان کی سادگی بیان کو پرکاری ادا میں لپیٹ کر ”از دل خیزد بر دل ریزد“ کے والہانہ، عاشقانہ اور مستانہ پیکر کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ، عام فہم اور سلیس ہوتی۔ فکر عظیم، تصور بلند اور مغز شاندار ہوتا، دونوں ملکر لذت تقریر کو فردوس گوش بناتے اور ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“ کا عینی مشاہدہ کراتے۔ مولانا مرحوم کی تقریر و بیان میں اصل گرمی اور سرخوشی ان کے سوز و دروں اور قلب مجنوں کی گہرائی و گیرائی سے آتی تھی جو سامعین کی سماعت اور حاضرین کی حضوری سے گذر کر ان کے قلب و جگر تک پہنچتی تھی۔ راقم سطور نے ان کی صد ہا تقریر اور ان گنت بیانات سنے، کبھی ندوہ کی مسجد و منبر سے، کبھی دارالعلوم کے قدیم و جلیل ہال میں، کبھی امین الدولہ پارک کے سبزہ زار پر اور کبھی اس سے متصل سرکاری ہال میں۔ لکھنؤ کے دوسرے مقامات بھی ان کے بیان سے معزز اور ہم سامعین بہرہ مند ہوئے، اور ان سے ہمیشہ ہی مستفید و مستفیض اور بہرہ ور و شاد کام

ہوئے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ اسکی روحانی و فکری و علمی تعمیر میں خطابِ نعمانی کی کارگیری نہیں ہے؟

## پیہم رواں مربی و شیخ

مبلغ و واعظ کے روپ میں حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ کارگر و کارساز ہوتے تھے اور ان کے سامعین و مخاطبین دمساز و ہمراز۔ مگر یہ تعلق زیادہ تر یک طرفہ فعالیت کا تھا۔ طلبہ و ساکنینِ ندوہ کو ایک دو طرفہ تعلق و ربط کا موقع تب نصیب ہوتا تھا جب مولانا مرحوم چلتے پھرتے مل جاتے تھے۔ کبھی صحنِ مسجد میں، کبھی روش پر، کبھی شاہراہ پر اور کبھی عمارت کی غلام گرد شوں میں۔ ایسا کم ہوا کہ مولانا نے عالی مقامِ ندوہ میں موجود ہوں اور اصحابِ ندوہ ان سے کسی جگہ اور کسی مقام پر محروم رہیں۔ اسی لئے وہ چلتے پھرتے مولوی اور پیہم رواں مربی کہلاتے تھے۔ ان کی عادتِ شریفہ تھی کہ تبسم ان کے لبوں پر ہمیشہ سجا رہتا کہ ان کی فطرت بھی تھی اور ”بوجہ طلق“ کی تعمیل حکمِ نبوی بھی۔ کیا اساتذہ اور کیا طلبہ اور کیا دیگر کارکنانِ ندوہ۔ وہ ہر ایک سے خوش دل ملتے، خوش بیاں رہتے اور خوش فکر نظر آتے۔ ملاقات ہوتی تو سلام کا انتظار نہ کرتے خود پہل کر لیتے اگرچہ ہم وابستگانِ دامنِ نعمانی اس کا موقعہ ان کو کم دیتے۔ سلام کے جواب میں پیار بھرے انداز میں اور محبت آمیز حرکات و سکنات سے حال احوال پوچھتے، پھر سلسلہٴ کلام دراز کرتے۔ ہنس ہنس کر، پیار پیار میں اور سوجھ بوجھ سے سب کچھ کہہ جاتے۔ ان کے نصیحت میں نصیحت بھی ہوتی، سرزنش بھی، افادہٴ علمی بھی ہوتا، فیضِ رسانی بھی۔ موقع و محل کی بات بھی ہوتی اور حقیقتِ جادوانی بھی، محبت و شفقت کا اظہار بھی ہوتا اور تعلق و یگانگت بھی۔ ان کو ایسے مواقع پر بھی طنز و تعریض اور استہزاء و تمسخر سے ہمیشہ گریزاں پایا۔ وہ نہ شرمندہ کرتے اور نہ خود شرمسار ہوتے۔ ایک عجیب دلربا نہ انداز ہوتا ان کا۔ ہمیں بات کڑوی لگتی تو بھی ان کے شیریں لہجہ کے سبب پی جاتے، طعن و نقد معلوم ہوتا تو انگیز کر لیتے کہ ان کے خندہٴ لب کے اسیر تھے۔ مولانا مرحوم کی ان چلتی پھرتی ملاقاتوں نے ان کی شخصیت کو دلاویز اور پرکشش بنا دیا۔ ان کو آتا دیکھ کر ہم بڑھ کر ان کے قدم لیتے، جاتا دیکھ کر لپک کر بمقدم ہو جاتے۔ وہ ان بزرگانِ طریقت سے بالکل مختلف تھے جن کو آتے دیکھ کر لوگ راہ بدل دیتے اور جاتے دیکھ کر کئی کاٹ جاتے ہیں۔ اس پیہم رواں مربی سے ہم نے کیا کیا فکری، علمی، روحانی اور قلبی غذا پائی اس کا تجزیہ صرف مربی اعلیٰ ہی کر سکتا ہے۔

## شیخِ کل کے روپ میں

ہمیں نہیں معلوم اور نہ اسکی ضرورت ہے کہ اس زمانے میں حضرت مولانا نعمانی مرحوم کا سرکاری و منصبی مرتبہ و مقام ندوۃ العلماء میں کیا تھا، البتہ یہ یاد ہے اور پکا تجربہ بھی کہ مولانا موصوف کو شیخِ کل اور شیخ المشان کا منصب عالی حاصل تھا۔ وہ ناظم ندوۃ العلماء کے معتمد ہوں نہ ہوں مگر معتمد دارالعلوم کے دستِ راست اور معتمد خاص تھے۔ غالباً اس حیثیت سے اور اپنے علمی و فنی جلال و جمال کے سبب بھی وہ استاذِ نگران اور شیخِ وقت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کے اس کاہر منصبی یا منصب علمی پر نکتہ چینی بھی ہوتی تھی اور بعض خاص فکری حلقے نالاں بھی تھے۔ ہمارا مولانا مرحوم سے اس روپ میں جو تعلق تھا وہ حلقہٴ درس اور تدریس کا تھا۔

اس زمانے میں وہ ہمارے باقاعدہ استاذ نہ تھے لیکن کبھی

دیتے وقت تشریف لے آتے۔ معلوم نہیں استاذ کی تربیت کے

لئے۔ لیکن ان کی آمد ہماری خوشی بلکہ سرمستی کا باعث بن جاتی۔

گریزوں کے بعد مولانا مرحوم کچھ دیر ہی سکوت فرماتے، استاذِ درس کے کلام و بیان کے دوران ہی کسی مناسب و بر محل موقع پر سلسلہٴ کلام اور زبامِ تدریس اپنے مشاق ہاتھوں میں لے لیتے۔ ہمارے باقاعدہ استاذ فن و معلم کتاب ہمارے ہم سبق و ہم درس بن جاتے کہ ہمارے ساتھ وہ بھی شیخِ کل کی تدریس و تعلیم کے وقت سرپا گوش ہوتے۔ اس انتقالِ معلمی کے اولین لمحات ہماری سرخوشی و سرشاری کے ہوتے کہ وہ محفوظ و مسرور کرتے۔ لمحہٴ سرشاری کے بعد جب گوش و نظر شیخِ کل کی تدریس و تعلیم کے فنی نکات، علمی جہات اور درسی نقاط کی طرف جاتی تو پھر علم و فکر کے بہتے سرچشموں سے استفادہ ہوتا۔

مولانا مرحوم بالعموم حدیث شریف کے اسباق و درس کے دوران ہی قدم رنجہ فرماتے تھے۔ شاید اس لئے کہ اس فنِ عظیم سے ان کو مناسبتِ خاص تھی یا اس استاذِ گرامی سے تعلق خاطر۔ اصل بات جو بھی رہی ہو، ہم طلبہ نے مولانا مرحوم کے ان ”دخل در درسیات“ خطبات سے بہت استفادہ کیا، نئے نئے گوشے سمجھے اور شاید فنی سمجھ بوجھ پیدا کی۔ ان کی تدریس و تعلیم کے انداز سے شاید ہمارے باقاعدہ استاذوں نے بھی بہت کچھ سیکھا کہ ظاہری اکرام و تکریم کی پُر تصنع علامات کے علاوہ چہرہ و بشرہ کی ریکھائیں اور چشم و نگاہ کی چمک ان کے اور ہمارے قلب و دل کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔



اسی ضمن خاص میں ایک حادثہ فاجعہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر وہ ناگوار واقعہ نظر آتا ہے مگر بہ باطن آدم گری کا حامل ہے۔ ہمارے ایک استاذِ حدیث مولانا مرحوم کے پروردہ و ساختہ اور ان ہی کے لائے ہوئے تھے۔ ہمیں وہ مشکوٰۃ شریف کا درس دیتے تھے۔ قدم رنجہ فرماتے ہی اور شاید اس سے قبل ہی وہ اپنے چہرے پر خشونت طاری کر لیتے تھے۔ ہمارا یہ تاثر یوں سچا ہے کہ وہ عام حالات میں اور مخصوص لوگوں کے لئے سراپا محبت و لطافت ہوتے تھے۔ ہمارے استاذِ محترم اس راقمِ آثم پر توجہ خاص رکھتے تھے۔ میری طالبعلمانہ شوخی، دورانِ تعلیم و تدریس سبق پڑھنے میں غلطی اور سوال و جواب کی بے مہار عادت سے شاید نالاں تھے۔ میرے تمام ہم سبق و ہم درس میرے دمساز و رفیق ہی نہ تھے مجھے اپنا نمائندہ اور سرخیل بھی بنا کر ’میدانِ جنگ‘ میں اتار دیتے تھے۔ استاذِ گرامی قدر کا ہر گز کوئی قصور نہ تھا، میری ہی تقصیرات طالبعلمانہ تھیں۔

اور چیزوں کے علاوہ استاذِ گرامی کا ایک طریقہ ہماری فہم و تفہم سے بالا تر تھا۔ وہ متنِ حدیث کا ٹھیکہ ترجمہ کر داتے تھے۔ ”ریاض الصالحین“ اور دوسری کتبِ درسی کی تعلیم کے دوران ہماری عادت با محاورہ اردو ترجمہ و تشریح کی پڑچکی تھی۔ وہ اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ ہم ہزار کوشش کے باوجود لفظی ترجمہ کے عظیم الشان کام کو انجام دینے سے قاصر رہے، پھر کچھ طالب علمانہ ہٹ دھرمی اور استادانہ اصرار کا بھی معاملہ تھا۔ لفظ و محاورہ کی کشاکش جب ناگوار صورت و آہنگ اختیار کر گئی تو اس کی گونج ایوانِ بلا تک جا پہنچی۔ صاحبانِ اقتدار نے بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا اور اچانک ایک دن استاذِ گرامی قدر کی جگہ حضرت مولانا نعمانی رحمہ اللہ حکم و ثالث درجہ میں تشریف لائے۔ اس دن کا سبق پڑھایا، مسائل پوچھے اور اشارہ کنایہ ہی میں نہیں صراحت و وضاحت کے ساتھ لفظی اور با محاورہ ترجمے کے فضائل و مناقب بیان کرنے میں اصولی تطبیق اور وجوہ تلافی سے کام لیا۔ استاذِ گرامی کی تصویب و تائید کی تو طلبہ و تلامذہ کی تغلیط بھی نہ کی۔ مولانا مرحوم نے غالباً استاذِ مکرم کو بھی نصیحت کی تھی۔ بعد کے دروس مشکوٰۃ میں انھوں نے ہمارے با محاورہ ترجمے کو بخوشی انگیز کیا اور ہم نے ان کے لفظی ترجمہ کو۔ کچھ دنوں کی افہام و تفہیم کے بعد درسِ حدیث ایک دوسرے استاذِ مکرم کے حوالے کر دیا گیا۔ غالباً اس میں بھی حکمتِ نعمانی کو پورا پورا دخل تھا۔ مولانا مرحوم کے ایسے حکیمانہ اندازِ تربیت اور ماہرانہ طریقہ تعلیم کا باب کافی وسیع ہے۔

## استاذ حدیث کی حیثیت

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی جزو وقت تدریس کی سعادت بار بار ملتی رہی تھی مگر وہ خلاؤں کو پُر کرنے کے مترادف تھی۔ ان کی مستقل تعلیم سے بہرہ مند ہونے کی سعادت بہت دیر میں ملی لیکن بہر حال ملی۔ فضیلت اول میں حضرت مولانا مرحوم ”صحیح مسلم“ پڑھانے پر مامور کئے گئے۔ ہم نے جذبات تشکر و امتنان کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے تقرر کو اپنی خوش بختی پر محمول کیا۔ ان کا طریقہ تعلیم بہت دلچسپ تھا۔ حسب دستور مولانا اپنے خاص انداز سے بالکل صحیح وقت پر درجہ تشریف لاتے۔ مسند درس سنبھالتے، کسی ایک طالب علم کو متن کتاب پڑھنے کا حکم دیتے، متن کی تشریح و تعبیر کرتے۔ دوران تفسیر کتاب بار بار عینک چہرے سے اتارتے اور لگاتے رہتے، اس دوران بالعموم داہنی آنکھ پر نیم ہوتا تھا۔ موتی چہرہ مبارک پر ڈھلک آتے، بسا اوقات رقت شدید ہو جاتی۔ چھاجالی۔

نہ جانے کیا سبب تھا، خود نمائی کا عنصر یا حسن طلب کا درجات تک بالعموم راقم ہی متن کتاب پڑھنے کی کوشش کرتا تھا اور تا۔۔۔ حضرات اساتذہ کرام اپنی شفقت و محبت بکراں سے اسے انگیز کر لیتے بلکہ بسا اوقات اسکی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ہمارے رفقاء درس نے یا تو بطور عافیت یا بسبب محبت و رفاقت اپنا حق بھی اپنے ساتھی کو دے دیا تھا۔ کچھ اس میں مقام و جلوس خاکسار کا دخل تھا کہ وہ ہر درجہ میں استاذ گرامی کے دائیں ہاتھ پر ہمیشہ بیٹھا کرتا تھا۔ حسب دستور ہر روز میں سبق پڑھنے کی کوشش کرتا مگر استاذ مکرم مجھے چکار پچکار کر خاموش کر دیتے بلکہ بسم اللہ پر ہی روک دیتے، اور کسی دوسرے رفیق درس کو متن کتاب پڑھنے کا حکم دیتے۔ یہ صورت حال تقریباً روزانہ پیش آتی اور کم از کم خاکسار کو سختی سے دوچار کر جاتی۔ رفقاء درس نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ آغاز از خود نہیں کریں گے۔ لہذا یہ کار منصبی خاکسار انجام دینے کی کوشش کرتا اور ناکام رہتا، اور قرعہ قال کسی دوسرے دیوانہ کے نام پڑتا۔

ایک دن طالب علمانہ شوخی کا پھر مظاہرہ ہوا۔ تمام رفقاء درس نے خاکسار کے حق میں متن کی قرأت و تلاوت سے باقاعدہ گریز کیا۔ استاذ گرامی قدر نے ماحول و فضا اور حالات کا اندازہ کر کے خاکسار کو پڑھنے کا حکم دیا۔ تعمیل ارشاد سے قبل بہر حال شاگردِ شاکی نے شکوہ پیش ہی کر دیا کہ جناب عالی اس حقیر کو سعادت قرأت سے کیوں محروم رکھتے ہیں؟ استاذ مکرم نے جو کچھ فرمایا

اس کا خلاصہ عرض ہے کہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم میں ہر ایک کی شراکت ضروری ہے ورنہ چند دوسروں کے حقوق پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ محرومی خواہ خود ساختہ و اختیار کردہ ہو ان کو مقام حرکت و اقدام سے پیچھے ڈھکیل دیتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ مجہولیت و انفعالیات کے خول میں بند ہوتے جاتے ہیں، پھر ان کی صلاحیتوں کو زنگ لگنا شروع ہوتا ہے تا آنکہ وہ بالکل مردہ ہو جاتی ہیں۔ اس طریقہ استاد ی میں کسی ذاتی رنجش یا صفاتی پر خاش کا دخل نہ تھا۔ استاد مکرم کی دلیلوں اور توجیہوں نے دماغ و ذہن کو پوری طرح سے متاثر کیا مگر دل کے کونے میں ایک پھانس تھی جو لگی رہی۔

بلاشبہ افادہٴ استاذ کا باب پورا اکلار ہا مگر استفادہ کا دروازہ کھلتا بند ہوتا رہا۔ اس ضمن میں ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جس دن طرفین کے درمیان صلح کل سے زیادہ مہر و محبت کا تعلق ہوتا اس دن استاذ مکرم حدیث کی تشریح و تعبیر کا نیا باب رقم کرتے، فنی و علمی نکات کا دریا بہا دیتے۔ شاید انہی لحاظِ نادرہ کی مسیحائی ہے کہ فنی شریف میں کچھ شد بد پیدا ہوئی۔ اب کفِ افسوس ملتے ہیں کہ صاحبِ معارف الحدیث سے صحیح کسبِ فیض کیا ہوتا تو یہ احساس محرومی نہ ہوتا!

### مؤلف و مصنفِ اسلامی

مولانا مرحوم کے مقالات و شذرات کے مطالعہ اور فہم کی نوبت تو کافی دیر میں آئی، ان سے بطور مؤلف و مصنف تعارف و روشناسی ”اسلام کیا ہے؟“ سے ہوئی۔ بلا تکلف و تردد رقم کرتا ہوں کہ بچپن میں جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا اور اسلامِ فہمی کی راہ دکھائی ان میں مولانا مرحوم کی اس تالیفِ لطیف کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان گنت دوسرے عام و خاص افراد و طبقات کو بھی اس کتابِ مستطاب نے صحیح فہمِ اسلامی سے آشنا کیا۔ اثر انگیزی، سلاست و سادگی، صحتِ فکر و نظر، سادگی میں پرکاری اور موضوعاتی جامعیت کے اعتبار سے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ انھیں خصوصیات سے وہ بہت مقبول و متداول رہی۔

بالعموم اسلام کی تعریف میں عقیدہٴ توحید و رسالت اور آخرت کے علاوہ ارکانِ اربعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس کی بنا پر اخلاق و معاملات کا باب خارج ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا نے عام قارئین اور طلبہ کے لئے اسلام کا جامع تعارف پیش کیا جو بالکل نئی چیز ہے۔ کم از کم عمومی سطح پر۔ بیس ابوب پر مشتمل اور مختصر کتاب کلمہ طیبہ اور ارکانِ اربعہ کے علاوہ معاملات، تقویٰ و پرہیزگاری، عمدہ اخلاق، اللہ اس کے رسول کریم ﷺ اور دین کی محبت، دین پر استقامت، اسکی

نصرت و حمایت، شہادت، آخرت و قیامت، جنت و دوزخ، ذکر الہی، تلاوت قرآن پاک، دعا، درود شریف، توبہ و استغفار اور خاتمہ میں رضائے الہی کے حصول کے نصاب الہی سے بحث کرتی ہے۔

موضوعات کی جامعیت اس کتاب لطیف کو مختصر ترین اسلامی نصاب کا درجہ عطا کرتی ہے۔ وہ ایک عام شخص کو دین کا جامع تصور بتاتی اور اسے اسلام سے پوری طرح متعارف کرتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اسکی سلیس و آسان زبان، مدلل تشریحات، قرآن پاک کی آیات کریمہ اور حدیث شریف کی خوبصورت ترین مبادیات سے روشناس کراتی ہے۔ ”اسلام کیا ہے؟“ کی اثر انگیزی، روح و قلب کو گرمائی کے خصوصیات بلاشبہ اسے ایک لازوال قدر و قیمت عطا کرتی ہے۔ اس کتاب کا اس خاکسار راقم پر ہمیشہ گہرا اثر رہا۔

مولانا نعمانی مرحوم نے اسلام کیا ہے؟ کی موضوعاتی اور

کتاب ”دین و شریعت“ میں پیش کی۔ اس کے پیش لفظ میں مولانا ”اسلام کیا ہے؟ کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد سے مجھے خیال تھا“

کے درجہ کی ایک کتاب اور تیار ہونی چاہئے۔ جس میں اسلامی اصول

کیا جائے کہ دلوں سے عہد حاضر کے لحدانہ شکوک و شبہات اور اہل زلیغ و ضلالت سے سعادت و تحریفات کی بھی صفائی ہو۔ ”یہ دراصل مولانا مرحوم کے چھ خطبات اور بعض تحریری اضافات پر مبنی کتاب ہے جس میں ایمانیات، عبادات، اخلاق، معاشرت و معاملات کے ساتھ ساتھ اسلام کے سیاسی نظام .. خلافت راشدہ .. پر بھی بحث ملتی ہے۔ آخر میں احسان و تصوف پر ایک باب ہے۔

مولانا مرحوم تالیف و تصنیف کے ذریعہ اسلام اور اسکی صحیح تعلیمات پیش کرنا چاہتے تھے اور ان کا مخاطب زیادہ تر کم تعلیم یافتہ یا جدید تعلیم یافتہ طبقہ تھا جو دینی مبادیات سے بالعموم ناواقف ہوتا ہے یا معمولی شد بد رکھتا ہے۔ یہ تو ان کی تالیفات کا مثبت اور بنیادی پہلو تھا۔ اس مقصد سے انھوں نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے علاوہ بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ ان میں ”نماز کی حقیقت“، ”کلمہ طیبہ کی حقیقت“، ”قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟“، ”تصوف کیا ہے“، ”حج کیسے کریں“ وغیرہ شامل ہیں۔ افادیت اور اثر انگیزی کے اعتبار سے ان تالیفات نعمانی نے اپنے اصل مخاطبین کے روح و قلب کو گرمایا سو گرمایا، خواص کو بھی بہت فائدہ پہنچایا۔ اتنی وضاحت، صراحت اور سلاست کے ساتھ قلم نعمانی کے سوا اور کون رقم کر سکتا تھا؟

تالیفات نعمانی کا دوسرا پہلو یہ رہا کہ مسلم یا غیر مسلم طبقات کے انحرافات اور ان کی اسلام دشمنی کو بھی اجاگر کیا جائے تاکہ عوام و خواص دونوں ان کے مکرو فریب سے واقف اور ان کی چالوں سے محفوظ رہیں۔ یہاں مولانا نعمانی ”منکلم“ اسلام بن جاتے ہیں۔ ابتداء میں انھوں نے بریلوی مکتب فکر کی مبادیات و اساسیات سے خوب خوب بحث کی۔ اور ان کے دجل و فریب اور تحریفات کو واضح کیا۔ ان کے دو اہداف قادیانیت اور شیعیت رہے جو اول الذکر سے زیادہ خطرناک ہی نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کی سوچی سمجھی سازشیں ہیں۔ قادیانیت پر ان کی کتابیں اور اس سے کہیں بڑھ کر ”ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت“ ان کو بے نقاب کرتی ہیں۔

نعمانی تالیفات کے انھیں دونوں محوروں میں ان کی دوسری نگارشات بھی آتی ہیں کہ یا تو وہ اسلام اور اس کے عظیم علمبرداروں کی خدماتِ جلیلہ اور ان کی عبقریاتِ نادرہ کو ان کے صحیح تناظر میں پیش کرتی ہیں یا ان کے حسین و جمیل چہروں سے اغیار و حاسدین کی اڑائی ہوئی خاک کو دور کر کے ان کو آئینہ بناتی ہیں۔ اول الذکر زمرہ میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت مولانا محمد یوسف، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا جیسے بزرگانِ دین و ملت پر ان کی اپنی نگارشات یا ان کی مرتب کردہ کتابیں بصورتِ خاص اشاعتوں یا رسائل کے شامل ہیں۔

دوسرے زمرہ میں وہ تالیفاتِ نعمانی آتی ہیں جو ابطالِ اسلامی اور رجالِ دینی کے خلاف دشمنوں کے معاندانہ پرچار کی قلعی کھولتی اور ان کی مجاد و مصفا و تصدیق پیش کرتی ہیں۔ شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید پر معاندین اہل بدعت کے الزامات اور ان جیسی دوسری تحریریں اور تقریریں اس میں شامل کی جاسکتی ہیں۔

مولانا مرحوم کی ان تالیفات کا مقصود اصلی صرف ایک تھا کہ اسلام اور اس کے جاں نثار خادموں اور عظیم علمبرداروں کو ان کے صحیح رنگ و روپ میں پیش کیا جائے۔ انھوں نے قرآن و حدیث کو اپنی تمام تالیفات کی بنیاد بنایا کہ یہی دونوں اصل کسوٹی ہیں جن پر کھرے کھوٹے کو پرکھا جاسکتا ہے اور جن سے معاندین و مخالفین بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دوسرے تمام مآخذ و مصادر کو مولانا مرحوم نے استعمال ضرور کیا ہے مگر ان کو معیارِ حق و باطل نہیں بنایا۔ وہ صرف معلومات، مشاہدات اور واقعات فراہم کرنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔ تصوف اور صوفیائے کرام پر ان کی تحریریں ان کے اسی طریقہ ہکار کو واضح کرتی ہیں۔ اسلامی

تصوف ان کے نزدیک شریعت و دین اسلامی کی روح کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کی بعض تعبیرات و تشریحات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر روح احسانی کے وجود و کار فرمائی سے انکار ناممکن ہے۔ تصوف اور صوفیہ نئی اصطلاح اور مصلحین کا نیا طبقہ ہو سکتے ہیں مگر ان کی بنیاد و اساس قرآن و حدیث پر تھی۔ مولانا نعمانی تصوف کے غیر اسلامی تجاوزات پر نقد و تنقید کرنے سے بھی نہیں چوکتے جو ایک قائل تصوف کے ایمانی و احسانی صلابت کی دلیل محکم ہے۔

نعمانی تالیفات میں ایک عظیم شاہکار کا درجہ ان کی ”معارف الحدیث“ کو حاصل ہے۔ حدیث نبوی پر اردو زبان و ادب میں بلاشبہ صد ہا کتابیں لکھی گئیں اور ان میں سے بہت سی موثر، کارگر، کارساز، آدم گر، تربیت کنندہ اور عظمت و جلالت کی حامل ہیں۔ مولانا مرحوم کی ”معارف الحدیث“ سچ سچ حدیث شریف کے زرو جواہر اور یاقوت و مرجان پیش کرتا ہے۔ بیان، طرز اداء، سلاست و بلاغت، اسلوب و پیشکش کے علاوہ موضوعاتی

زبان میں ایک جامع و مختصر دائرہ معارف (ENCYCLOPEDIA)

”معارف الحدیث“ کو مؤلف گرامی قدر و حقیقت شناس نے

انتخاب“ قرار دیا ہے اور اس میں اردو ترجمہ اور تشریحات پیش فرمائی ہیں۔ -

یافتہ مسلمانوں کو اس کا مخاطب و ہدف بنایا ہے اور ان کی جدید ذہنی اور فکری سطح کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ابتداء میں مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ ”معارف الحدیث“ کی پانچ جلدیں ہوں گی مگر بعد میں ان کی تعداد زیادہ ہو گئی۔ یہ موضوع کی وسعت اور مخاطبوں کی بنا پر توسیع ہوئی۔

بقول مولانا مرحوم کتاب یا جلد اول کتاب الایمان پر مبنی ہے اور اس میں حدیثیں عام طور سے ”مشکوٰۃ المصابیح“ سے لی گئی ہیں۔ دوسری جلدیں مختلف موضوعات پر مبنی ہیں جیسے جلد دوم کتاب الرقاق اور کتاب الاخلاق کے لئے خاص ہے جبکہ جلد سوم کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ کے ابواب رکھتی ہے۔ جلد چہارم تین ارکان اسلام، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج سے بحث کرتی ہے۔ پانچویں جلد میں کتاب الاذکار والدعوات کے عنوان سے احادیث جمع کی گئی ہیں۔ چھٹی اور ساتویں جلدیں کتاب المعاشرة والعاملات کے لئے خاص ہیں۔ جلدوں کی ترتیب میں موضوعات کا کوئی خاص منصوبہ نہیں مد نظر رکھا گیا ہے۔ غالباً احادیث کی جمع و تدوین کی سہولت نے موجودہ ترتیب کو جنم دیا ہے۔

مؤلف گرامی کا طریقہ کار بہت سادہ، سہل اور موثر ہے۔ عنوان کے تحت متن حدیث راوی اول کے حوالہ سے پیش فرماتے ہیں پھر اس کا سیدھا سادہ یا محاورہ ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

حدیث کا اصل مصدر و ماخذ بھی بتاتے ہیں اور آخر میں اپنی تشریح سے مستفید کرتے ہیں۔ اس تالیفِ نعمانی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام اہم موضوعات پر ایک اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ مسلمان اور غیر مسلم کو بھی حدیث پر مبنی اسلام کی تعلیمات سے بہت خوبصورتی سے روشناس ہی نہیں کرتی اس کے دل و جگر میں صحیح اسلامی روح پیدا کرتی ہے۔

### مدافع دین متین و ناقد عناصر باطلہ

مولانا نعمانی رحمہ اللہ کی جس طرز تالیف اور اداء تصنیف پر خاکسار ہمیشہ فدا رہا وہ دین متین کی خالص اسلامی تعبیر و تشریح اور شدید ترین اسلام دشمن عناصر سے اور ان کے باطل افکار اور گمراہ کن عقائد و اعمال سے اس کے سرچشمہ صافی کی حفاظت و صیانت کی سعی مشکور ہے۔ کوردیدگانِ قوم اور نگاہِ کج و فکرِ زلیغ کے حاملین الزام تراشی کریں گے کہ ”مکند جنس باہم جنس پرواز“ کا معاملہ ہے یا فکری اور ذہنی موافقت کا مسئلہ ہے کہ وہ مساعیٰ نعمانی اور موافقتِ خاکساری کی فہم سے یکسر قاصر ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی امت کو جس قدر ضرر و نقصان ان مسلم دشمن عناصر اور اسلام کش قوتوں سے پہونچا وہ کسی غیر سے نہیں پہونچا۔ ان میں غالباً کیا یقیناً سرفہرست شر و اضلال وہ مسلم فرقہ باطلہ ہے جو اپنے عقائدِ دینی اور افکارِ خلافت و امامت میں اس قدر تجاوز کر چکا ہے کہ وہ سرحدِ ایمان اور حدودِ اسلام سے خارج ہو چکا ہے۔

نہ مولانا مرحوم کو اور نہ خاکسار راقم کو اور نہ ہی کسی صحیح فکر و عقیدہ کے حامل کو اس حقیقت سے انکار ہے کہ اس بات کو ماننے میں ادنیٰ تاہل کہ ہر شخص اور ہر طبقہ اور ہر قوم کو اپنا دین و ایمان اور عمل اختیار کرنے کا حق اور اس حق کو پوری طرح استعمال کرنے کی آزادی ہے بشرطیکہ وہ دوسروں کے دین و ایمان اور عمل و شریعت پر ڈاکہ نہ ڈالے۔ وہ اپنے کو وہی کہے جو وہ ہے اور زور زبردستی سے اسلام اور اپنے مسلم ہونے کا دعویٰ نہ کرے۔ مگر عجب ستم ظریفی ہے کہ تمام فکری، عقلی، دینی، عقیدہ اور عملی انحرافات و تجاوزات کے باوجود کوئی فرد، طبقہ یا قوم اس فکر و عمل کے علمبردار ہونے کا مدعی ہو جس کی جڑیں کھودنا اس کا فرض منصبی بن چکا ہے۔ اس سے زیادہ طرفہ ستم یہ ہے کہ تمام غیر مسلم عناصر اور اسلام مخالف طبقات ان انحرافات و تجاوزات کی پشت پناہی اور تائید کرنے پر اور ان کے حاملین و ماہرین کو خالص اسلامی علمبردار بنا دینے پر تل جاتے ہیں۔ ستم بالائے ستم بلکہ عجب بر عجب کا معاملہ ان مسلم مفکرین اور مومنین اہل قلم کا ہے جو اپنے ذاتی خیالات و افکار اور جماعتی و اداری اقدار جیسے شخصی وجوہ و علل کی بنا پر غیر اسلامی انحرافات و تجاوزات بلکہ تحریفات تک کو قبول کر کے ان کو اسلامی اور دینی رنگ و

ذہنِ نعمانی نے اس انقلاب کی خطرناکی اور اسکو اسلامی انقلاب بنانے کی زہرناکی کو بروقت محسوس کر لیا کہ وہ اس اسلام دشمن اور مسلم مخالف قوتِ باطلہ کی رگ رگ سے واقف، اس کے ہر جال سے آگاہ اور اس کی ہر تعلیم کے عالم تھے۔ مؤلف گرامی قدر نے اسی بنا پر اپنی کتاب لطیف کا نام بڑا ہڈ کار رکھا کہ اس منصوبہٴ باطل کے تین محور تھے۔ اول ایرانی انقلاب کی حقیقت آشکارا کی کہ وہ خالص شیعہ انقلاب ہے۔ دوم امام خمینی کے صحیح شیعہ افکار و اعمال سے پردہ اٹھایا کہ وہ مسلمانوں کے نہیں ایرانی امامیوں یا اثنا عشری شیعوں کے امام ہیں اور آخر میں شیعیت کی اصل حقیقت بیان کی جو اس فکر کے اماموں بالخصوص امام خمینی کی تحریروں کی روشنی میں ابھرتی ہے اور قارئین کو کسی تردد و شبہ میں نہیں چھوڑتی کہ وہ سراسر غیر اسلامی شے ہے۔



مولانا نے محترم و مرحوم کی اس عظیم الشان تالیف کا تنقیدی و تحلیلی تجزیہ و مطالعہ نہیں لے سکا۔ تاثراتی تصنیف اس کا مکمل نہیں ہو سکا مگر موضوع کی خطرناکی مولف کی ژرف نگاہی، اور مسلم عوام و خواص کی نادانگی اس کی متقاضی ہے کہ اس پر کلام کو کچھ طول دیا جائے۔ ہمارے ہاں ایک رواج عام یہ بھی ہو گیا ہے کہ بلا مطالعہ و مناقشہ اور بنا علم و فکر اپنے سے مخالف نقطہ نظریا مختلف خیال و رائے رکھنے والے کی جاہلانہ تردید کر دی جاتی ہے یا اخباری بیانات و ارشادات کی بنا پر پوری تالیف کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یا ایک دو تسامحات کے سبب پورے کلیے کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ کون بشر دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ معصوم و بے خطا ہے سوائے ان کے جن کا عقیدہ معصومیت انسان پر ہے۔

مولف گرامی قدر نے ایرانی انقلاب کو بہت مختصر بحث میں عقیدہ امامت پر مبنی ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ خالصتاً شیعہ انقلاب ہے جس سے ایران اور دوسرے ممالک و دیار کے شیعوں کو اتفاق ہو تو ہو مگر اہل سنت اس سے اساسی اختلاف رکھنے پر مجبور ہیں کہ وہ ان کے تصور خلافت ہی نہیں کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ مولف دور ہیں کو اسے شیعہ انقلاب ماننے میں کوئی باک نہیں اور نہ ہی اسکی پریشانی ہے کہ اہل تشیع اس کو کیا مانتے ہیں۔ انھیں تمام صالح فکر اسلامی کے حاملین عالی مقام کی مانند اس پر اعتراض ہے کہ اسکو اسلامی انقلاب بنا کر عالم اسلام کو گمراہ کیا جا رہا ہے اور وہ بھی غلط بنیادوں پر۔ وہ ملت اسلامیہ کو اس کے خطرناک عناصر سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح مولف حقیقت رقم نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ امام خمینی نے اپنے شیعہ عقائد و افکار اور تصورات کو کبھی چھپایا نہیں، ان کی تمام تالیفات بالخصوص ”الحکومة الاسلامیة“، ”تحریر الوسيلة“ اور ”کشف الاسرار“ میں ان کے تمام سیاسی، فقہی، دینی اور تہذیبی افکار بلا کم و کاست موجود ہیں جو ان کو خالص اثنا عشری مفکر اور قائد ثابت کرتے ہیں۔ کائنات پر شیعہ ائمہ کی تکوینی حکومت، ائمہ اثنا عشری کی انبیاء و رسل پر فضیلت، ان کی معصومیت و محفوظیت، ان کی پیروی کی وجوہیت کے علاوہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے بارے میں ان کے شیعہ عقائد و افکار اور ان کے خطرناک نتائج پر مولانا نعمانی نے کلام کر کے مدلل انداز سے واضح کیا ہے کہ وہ شیعہ قائد تھے۔ پھر ان کے شیعہ و غیر شیعہ، سنی نما اور دوسرے طبقات ان کو خالص سنی اسلامی قائد و مفکر اور امام کیوں بنا کر پیش کرتے اور امت کو گمراہ کرتے ہیں؟

محقق نعمانی نے ایرانی انقلاب اور اس کے امام خمینی کے دو عارضی ارکان پر مختصر بحث

کرنے کے بعد اپنی مفصل و مدلل بحث مستقل رکن ثالث، شیعیت پر مرکوز رکھی ہے اور اہل فکر و نظر خوب جانتے ہیں کہ یہ وہ خارج غیلاں ہے جو پہلوئے اسلام میں ہمیشہ کچھتا رہا ہے۔ مشہور مارکسی مورخ پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے ایک بار برسرِ منبر اور خلاق عالم کے رو برو اپنے کلمہ حق کو اس طرح بیان کیا تھا: ”فسطائیت مرچکی، نوآبادیاتی نظام کا جنازہ نکل رہا ہے، سرمایہ دارانہ نظام لبِ گور ہے، ایک دن اشتراکیت دم توڑ دے گی اور پھر اشتیائیت بھی فنا ہو جائے گی مگر یہ شیعیت، کبھی فنا نہ ہوگی۔“ یہ محض مرحوم کی جذباتیت نہ تھی بلکہ مورخ دور میں کی حقیقت بنی تھی۔ مگر ہمارے قدیم و جدید علمائے دین اور دانشورانِ ملت نے بالعموم اس حقیقت مسئلہ کو نہیں سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے اس تصور فہم میں کچھ دخل شیعہ مصداق، آذکار کیمابی یا نابی سے زیادہ شیعہ علماء و خواص کے نظریہ کتمان کا ہے۔

مولانا مرحوم نے اپنی اس عظیم کتاب کے دو تہائی حصہ کو شیعہ لئے وقف کیا ہے۔ شیعیت و مسیحیت، آغاز و ارتقاء شیعیت، شیعہ فرقہ۔

مباحث کے بعد مؤلف گرامی قدر نے اثنا عشریہ کی اساس و بنیاد مسئلہ امام

ہے۔ اس بنیادی عقیدہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے یا مستنبط کئے جانے والے تبعی نظریات پر کلام کیا ہے۔ حضراتِ خلفاء ثلاثہ، صحابہ کرام، بالخصوص ازواجِ مطہرات کے بارے میں شیعہ افکار کو بالخصوص امام خمینی کی تحریروں سے مدلل کر کے پیش کیا ہے۔ نبوت کے تسلسل، عقیدہ رجعت، قرآن مجید میں تحریف اور بعض ایسے ہی اہم اور بنیادی امور پر امام خمینی کی تحریروں سے شہادتیں فراہم کی ہیں۔

مؤلف گرامی قدر کو شیعہ افکار و رجحانات اور عقائد و اعمال سے بحث نہیں کہ وہ ان کا دین و ایمان ہے اور وہ جانیں اور ان کا رب عادل جانے۔ مگر ان کا بنیادی نکتہ بحث یہ ہے کہ اسلامی مفکرین بالخصوص علماء اور دانشوروں اور ان کے بعد عامۃ المسلمین کو ان غیر اسلامی افکار و اعمال سے آگاہ کر کے ان کے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنے اور اغیار کے خطرناک حملوں سے محفوظ کرنے کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ اس سے ہر صاحبِ فکرِ سلیم اور حاملِ عقلِ صحیح کو اتفاق ہو گا کہ اپنے دین و ایمان اور عقیدہ و فکر اور نظام و ادارہ کی حفاظت کا حق سب کو حاصل ہے تو مسلمانوں کو بھی ضرور حاصل ہونا چاہئے۔ مولانا منظور نعمانی مرحوم کی یہ کتاب جلیل اسی سعیِ بلیغ کی ایک بروقت نشانی ہے جو امتِ اسلامیہ کی حفاظت و صیانت کی فکری و عملی شہادت بن گئی ہے۔

## مدیر الفرقان یا مجاہد اسلامی

ماہنامہ الفرقان کا اجراء انھیں دونوں بنیادی ضروریات کے لئے عمل میں آیا تھا۔ ابتداء میں اس کا زور باطل نظریات اور فاسد افکار اور غیر اسلامی اعمال و عملیات کی تردید کر کے اسلام، دین اور امت اسلامی کی حفاظت و صیانت کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ تردید و تغلیط سے گذر کر صحیح اسلامی تعلیمات اور بنیادی افکار کی ترویج و اشاعت کی طرف ہو گیا۔ مگر یہ زور یا شد و مد کا صرف انتقال علمی تھا۔ ورنہ الفرقان نے کبھی بھی ابطال باطل اور احقاق حق کا دو گونہ فریضہ نظر انداز نہیں کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو کبھی کوئی دور میں دور اندیش حقیقت پسند و اصول پرست مفکر و مدبر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ یہ تو ہمارے عقیدہ و ایمان کا بنیادی محور ہے: انکار باطل سے اثبات حق تک پہنچنا کلمہ توحید کا اصل مغز ہے۔ مدیر الفرقان کی حیثیت سے مولانا منظور نعمانی نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک اسلامی فکری جہاد کیا ہے جو فکری، عقیدہ، علمی اور دینی اعتبارات سے برصغیر پاک و ہند میں زریں الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

یہاں مجلہ الفرقان کی تاریخ بیان کرنی مقصود ہے نہ اسکی خدمات کا تذکرہ مطلوب ہے اور نہ ہی اسکا موضوعاتی تجزیہ۔ مگر علمی و فکری اسلامی جہاد میں اس کے مرتب کردہ نقوش اجاگر کرنے کے لئے اس کے بعض سنگ ہائے میل کی طرف نشاندہی ضروری ہے۔ اور یہ نشاندہی تاثراتی اور علمی انداز میں اس کے بعض امتیازات کے تذکرہ سے کی جا رہی ہے۔

ماہنامہ الفرقان نے اپنے مدیر کبیر کی شخصیت کی ہمہ جہتی کے مانند جو کبھی لڑائی لڑی ہے اور مختلف محاذوں پر اسلامی جہاد جاری رکھا ہے، اس میں اولیں اور اہم ترین محاذ اپنوں کے بعض طبقات نے کھولا تھا۔ اہل بدعت نے کتاب و سنت اور اعمال و آثار بزرگان اسلام کی تعبیر و تشریح اپنی کج فہمی اور کج عقیدتی کے سبب کی اور اسکو صحیح اسلامی نظام فکر و عمل بنانے کی کوشش کی۔ الفرقان اور اس کے مدیر جلیل نے ان کی گمراہ اور گمراہ کن تحریروں، تقریروں اور افعال و اعمال اور رسوم و رواج کا بروقت تذکرہ کیا۔ ان کے کج کلاہانہ انداز فکر کو واضح کیا، ان کی تحریفات و تاویلات کی قلعی کھولی، ان کے اصل خیالات و نظریات کو طشت از پام کیا، اور ان کے اعمال و افعال کی شناخت ظاہر کی۔ عوام و خواص مسلمین کو اس طرح ان کی تاویلات فاسدہ سے پہنچنے والے خطرناک نتائج سے محفوظ و مامون کیا۔

اپنوں کے فاسد خیالات و باطل افکار کی تردید و تنقید میں ایک سخت مرحلہ بلکہ تمام

مر اعلیٰ حیات میں سخت ترین اس وقت آیا جب ہر طرح کے ہمنواؤں ہم خیال اور ہم فکر و ہم قدم اور محترم و معظم شخصیات و طبقات نے دین و ایمان کے عظیم ترین ابطال کو ہدف تنقید و ملامت بنایا۔ اگرچہ الفرقان کے بانی مدبر گرامی نے اپنی مدیرانہ زندگی میں ایسی بہت سی جنگیں لڑی تھیں مگر یہ معرکہ حق و باطل ان کی زندگی کے آخری لمحات میں پیش آیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس معرکہ کے اصل شہسوار اُن کے فرزند گرامی کے رشحاتِ قلم تھے مگر ان کے پیچھے دراصل افکار و تربیتِ نعمانی کا پشتہ لگا تھا۔ الزام تراشی اور بہتان طرازی بھی کی گئی کہ یہ معرکہ حق و باطل نہیں تھا بلکہ ذاتی عداوت و حسد کا شاخسانہ تھا بلکہ یہاں تک بھی سوچا اور پرچار کیا گیا کہ ایک مخصوص ادارہ کے خلاف مجرمانہ سازش تھی۔ دلوں کے بھید عالم الغیب و الشہادہ جانتا ہے اور نیت بلکہ نیا ت اور ان پر مبنی اعمال کا حساب کتاب اسی کے دستِ عدل نواز میں ہے لیکن ہم غلو! بندے اتنا جانتے ہیں کہ صحابہ کرام کو ہدف ملامت اور نشانہ تنقید بنا۔ اور صحیح نہیں ہو سکتا۔

الفرقان کی طویل جدوجہد اسلامی میں یہ مرحلہ بہت اہم میں خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھوانے پر مجبور ہوا تھا۔ بنیادی وجہ سیادت سے زیادہ ان کی عزت و حرمت کی حفاظت کی ایمانی کوشش تھی۔ راقمِ آتم یہ سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا کہ کوئی صحیح العقیدہ مومن و مسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے کسی بھی طبقہ کو مستسلم، غیر مخلص اور غیر عادل کیوں کر کہہ سکتا ہے یا ایسا فاحش کلام کرنے والے کی حمایت و نصرت کر سکتا ہے؟ میرا تو عقیدہ ہے کہ اس فکرِ باطل پر اغماض برتنے والا بھی مرتکبِ فاحش ہے، اور اپنے ہڈیاں کے لئے ہر طرح کی مہذب اور سخت ترین تنقید کا مستحق ہے، خواہ وہ دینی و علمی جلالِ دنیا کے کسی بھی مرتبہ پر فائز ہو۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب ساداتِ علم و دین الفرقان کے تلخ لہجہ اور خاکسار راقم کے سخت الفاظ پر شکوہ کرتے ہیں، اور خود فراموش کر دیتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے دین و ایمان کے ارکان کے خلاف سخت ترین بلکہ مذموم و مقبور الفاظ و تعبیرات استعمال کی ہیں۔ ایسے دریدہ دہن، دریدہ قلم اور دریدہ فکر حاملین کے لئے تمام سخت الفاظ اور شدید ترین تعبیرات ہلکی ہیں۔ الفرقان کی یہ جدوجہد مبارک ترین، عظیم ترین اور دور رس نتائج کی حامل رہی جس نے امتِ اسلامی کی عدالتِ صحابہ کرام اور تاریخِ اسلامی کے ایک اہم ترین باب میں صحیح اسلامی رہنمائی کی۔ یہ وہ قضیہ مرصیہ تھا جس نے حق کو ثابت و جاگر اور باطل کو پسپا و پژمرده کر دیا۔ فکرِ نعمانی کا یہ پرتو کتنا دلکش و عزیز ہے!

## رد شیعیت و قادیانیت پر

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ کی تسلی بخش و لاجواب تصانیف

### ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی مقبول و معروف تصنیف۔

کتاب کا انداز منفی اور اس کا مقصد بحث و تردید نہیں، بلکہ ان تینوں موضوعات کے بارے میں جن کی طرف اس وقت پوری دنیا کی توجہ مرکوز ہے بلا کم و کاست بنیادی حقائق کی وضاحت ہے۔ کتاب میں کوئی بات اپنی طرف سے یا ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت کے مخالفوں کی تصانیف سے اخذ کر کے نہیں کہی گئی ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان تینوں کے ماخذ ہی کی روشنی میں کہا گیا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس نے ہزاروں بندگان خدا کی آنکھیں کھول دیں۔ شیعیت کی حقیقت جاننے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ عمدہ گلیر کاغذ۔ آفسیٹ کی عمدہ طباعت اور خوبصورت گرد و پوش سے مزین۔

صفحات ۳۰۰ قیمت اردو ایڈیشن - 60/ انگریزی ایڈیشن - 55/

### خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علمائے کرام کا متفقہ فیصلہ

کیا شیعہ مسلمان ہیں؟ اس بارے میں ائمہ اسلام، فقہاء و مجددین اور خصوصاً دور حاضر کے ماہرین فقہ اور محقق علماء کی رائے۔ دلائل کے ساتھ پڑھئے۔ دوسرے مکمل۔ قیمت - 50/

### قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟

رد قادیانیت پر لاجواب کتاب جو عام و خاص سب کے لئے یکساں تسلی بخش ہے۔ قیمت - 19/

### قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قادیانیت پر یہ مختصر رسالہ دریابہ کوزہ کا مصداق ہے اور قادیانیت کے زہر کا مجرب تریاق بھی۔

قیمت - 5/

### کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت

مولانا محمد منظور نعمانی نے اس میں قادیانی لٹریچر کے بیسیوں حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ قادیانی فرقہ مرزا غلام احمد کو نبی و رسول مانتا ہے اس لئے وہ مسلمان نہیں ہے۔ قیمت - 4/

ملنے کا پتہ: الشرقان بک ڈپو 114/31 نظیر آباد،

مولانا نور عالم خلیل امینی

ایڈیٹر ”الداعی“ و استاذ ادب عربی دارالعلوم، دیوبند

# داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہل قلم

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۲۳ھ / ۱۳۱۷ھ - ۱۹۰۶ء / ۱۹۹۷ء

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخی گفتار کے  
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

رفعتید و لے نہ از دل ما

دوشنبہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۵ مئی ۱۹۹۷ء کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے، شہر مظفر پور سے، میں نے دیوبند میں اپنے اہل خانہ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ میں آج ”ویشالی اکسپریس“ سے دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، ان شاء اللہ کل علی الصباح دہلی اور دہلی سے ایک بجے چھوٹنے والی لدھیانہ سوپر فاسٹ سے، ساڑھے تین بجے کے قریب دیوبند پہنچ جاؤں گا۔ ریسیور ہاتھ سے رکھنے سے پہلے، میں نے یوں ہی چلتے چلاتے پوچھ لیا کہ اور کوئی قابل ذکر بات تو نہیں؟ تو اہلیہ نے بتایا کہ ہاں، لکھنؤ میں کوئی مولانا محمد منظور نعمانی تھے، ان کا آج شب میں وہاں کے کسی نرسنگ ہوم میں ۸ بجکر ۳۴ منٹ پر انتقال ہو گیا ہے۔ دارالعلوم کے مناروں سے آج رات سے ہی بار بار ان کی وفات کی خبر دی جا رہی ہے۔ اس وقت دارالعلوم میں ایصال ثواب اور تعزیتی جلسہ ہو رہا ہے۔

مولانا نعمانی فرماتے ہیں:

”دارالعلوم دیوبند میں، میری طالب علمی کا دور، دو سال (۱۳۴۳ھ تا ۱۳۴۵ھ) رہا۔ یہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ، کی صدارت تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادے کی توفیق بھی بخشی۔ حضرت استاذ کشمیری قدس سرہ، نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ ۷۱ سال بعد دورہ حدیث کی جماعت میں اتنے اچھے طلبہ اس سال جمع ہوئے ہیں۔“

”تعلیمی سال کے خاتمے پر، جب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا، تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام بھی رکھ دیا (اتنا کام امتحان کے لئے مقرر چند گھنٹوں میں نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے میں نے خصوصی طور پر درخواست کر کے عصر کی نماز تک کے لئے وقت بڑھوایا تھا،) نتیجے میں بھی امتیاز حاصل رہا۔“ (۱)

### جامعیت کا راز

دارالعلوم دیوبند کی تابناک تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہاں کے طلبہ اپنے اساتذہ سے محض علم و معلومات ہی حاصل نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاص و احتساب، ورع و تقویٰ، زہد و صلاح، جذبہ اصلاح، دین کی ترویج، دعوت و پیغام محمدی کا درد، مسلمانوں کی حالت زار کا غم، اسلام کے حوض صافی کو گد لانے کی کسی کوشش کی بات سوچنے والے کے خلاف ننگی تلوار بن جانے کا حوصلہ اور ساری توانائیوں، صلاحیتوں اور حاصل شدہ وسائل کو خدمت اسلام کے لیے وقف کر دینے کی عزیمت کا بادہ تیز و تند پی کر سرمست بھی ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں کا کوئی فارغ محض حامل علم یا خشک عالم یا بے نتیجہ رسمی سند یافتہ اور دراہم محدود کی تلاش میں صرف در در کی ٹھوکر کھانے اور اپنی محدود دنیا کو بنانے اور صرف اپنے متعلق سوچنے اور صرف اپنے تن خاکی کے تقاضے کو پورا کرنے کی تنگ و دو پر اپنی علمی و فکری ”بینکاری“ یا ظاہری لیاقت کو مرکوز کر دینے کی کبھی نہیں سوچتا تھا، کیوں کہ اس نے یہ ”سبق“ ہی نہیں پڑھا ہوتا تھا۔ وہ تو یہاں سے علم کے ساتھ عشق کی تیج جگر دار و تلوار بے نیام لے کر نکلتا اور زبان حال سے یہ شعر پڑھتا تھا، جو شاہ عبدالعزیزؒ (متوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف سے انھیں، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صاحب تفسیر

مظہری، متوفی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) کے یہ کہہ کر سپرد کیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا کرتے تھے کہ اس کو قرآن سکھا دیجئے۔

روح پدرم شاد، کہ با استاد مرا گفت

کہ فرزند مرا، عشق بیاموز، و دیگر هیچ!

(خدا اے پاک میرے والد کی روح کو شاد رکھے کہ انھوں نے میرے استاد سے فرمایا تھا کہ میرے بیٹے کو صرف عشق سکھا دیجئے، باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں)

شخصیت کے تشکیلی عناصر

نیز سیر و سوانح کا طالب علم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جامع صفات و کمالات عالم اور دین کے مختلف میدانوں میں سرگرم کار داعی و مفکر آسانی سے اور ہوتا جاتا۔ اس کی تشکیل و تعمیر میں مختلف عناصر باہم گھل مل کر اپنا عنصر، محنت، توفیق الہی، خاندان، ماحول، تعلیم گاہ، اساتذہ کی دعا، سحر گاہی، سیاسی و اجتماعی صورت حال، سازگار اور معتدل یا سخت

حالات، علما و صلحا کی صحبت، علوم جو اس نے حاصل کیے، وہ پٹری جس پر اس حالات، متحرک رہی، وہ اہم اسٹیشن جو اس کی زندگی کو کراس کرتے رہے، وہ غم و الم یا خواب و آرزو جو اس کے فکر و نظر کے آشیانے میں جنم لیتے رہے، وہ رفقا جو راہِ عمل اور سفر حیات میں اس کے ساتھ رہے، وہ بڑے اور ذہین لوگ جن سے اس کو شعوری و لاشعوری استفادے کا موقع ملا، وہ مصائب جنہوں نے اس کی مخفی صلاحیتوں کے سوتے جگادیئے اور وہ مطلوبہ معیار پر سرگرم عمل ہو گئیں، اس کے ملک میں اٹھنے والے سیاسی طوفان اور اس کے وطن کی مذہبی و گروہی کش مکشیں: یہ سبھی کچھ مل جل کر کسی شخصیت کو تراشتے ہیں۔

قدربنا مولانا نعمانی کی تعمیر میں بھی ان سارے عناصر نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک نسبتاً خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے گھر کا ماحول مائل بہ بدعت ہونے کے باوجود دینی تھا۔ ان کے والد اپنے خاص عقیدے کے ساتھ بھی صالح اور عبادت گزار تھے، کثرتِ عبادت کی وجہ سے ہی ”صوفی“ ان کے نام کا سابقہ بنا ہوا تھا اور وہ ”صوفی احمد حسین“ کے نام سے معروف تھے۔ (۱)

ان کے والد ”گیارھویں“ اور ”بارھویں“ شریف کے قائل ہونے کے باوجود اپنے



مولانا نعمانی فرماتے ہیں۔

”دارالعلوم دیوبند میں، میری طالب علمی کا دور، دو سال (۱۳۴۳ھ-۱۳۴۵ھ) رہا۔ یہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ، کی صدارت تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادے کی توفیق بھی بخشی۔ حضرت استاذ کشمیری قدس سرہ، نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ ۷۱ سال بعد دورہ حدیث کی جماعت میں اتنے اچھے طلبہ اس سال جمع ہوئے ہیں۔“

”تعلیمی سال کے خاتمے پر، جب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا، تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام بھی رکھ دیا (اتنا کام امتحان کے لئے مقرر چند گھنٹوں میں نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے میں نے خصوصی طور پر درخواست کر کے عصر کی نماز تک کے لئے وقت بڑھوایا تھا،) نتیجے میں بھی امتیاز حاصل رہا۔“ (۱)

### جامعیت کا راز

دارالعلوم دیوبند کی تابناک تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہاں کے طلبہ اپنے اساتذہ سے محض علم و معلومات ہی حاصل نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاص و احتساب، ورع و تقویٰ، زہد و صلاح، جذبہ اصلاح، دین کی تربیت، دعوت و پیغام محمدی کا درد، مسلمانوں کی حالت زار کا غم، اسلام کے حوض صافی کو گد لانے کی کسی کوشش کی بات سوچنے والے کے خلاف نگلی تلوار بن جانے کا حوصلہ اور ساری توانائیوں، صلاحیتوں اور حاصل شدہ وسائل کو خدمت اسلام کے لیے وقف کر دینے کی عزیمت کا بادۂ تیز و تند پی کر سر مست بھی ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں کا کوئی فارغ محض حامل علم یا خشک عالم یا بے نتیجہ رسمی سند یافتہ اور دراہم معدود کی تلاش میں صرف در در کی ٹھوکر کھانے اور اپنی محدود دنیا کو بنانے اور صرف اپنے متعلق سوچنے اور صرف اپنے تن خاکی کے تقاضے کو پورا کرنے کی تگ و دو پر اپنی علمی و فکری ”مینا کاری“ یا ظاہری لیاقت کو مرکوز کر دینے کی کبھی نہیں سوچتا تھا، کیوں کہ اس نے یہ ”سبق“ ہی نہیں پڑھا ہوتا تھا۔ وہ تو یہاں سے علم کے ساتھ عشق کی تیغ جگر دار و تلوار بے نیام لے کر نکلتا اور زبان حال سے یہ شعر پڑھتا تھا، جو شاہ عبدالعزیزؒ (متوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف سے انھیں، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صاحب تفسیر

مظہری، متوفی ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) کے یہ کہہ کر سپرد کیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا کرتے تھے کہ اس کو قرآن سکھا دیجئے۔

روح پدرم شاد، کہ با استاد مرا گفت

کہ فرزند مرا، عشق بیاموز، و دگر بیج!

(خدا نے پاک میرے والد کی روح کو شاد رکھے کہ انھوں نے میرے استاد سے فرمایا تھا کہ میرے بیٹے کو صرف عشق سکھا دیجئے، باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں)

شخصیت کے تشکیلی عناصر

نیز سیر و سوانح کا طالب علم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جامع صفات و کمالات عالم اور دین کے مختلف میدانوں میں سرگرم کار داعی و مفکر آسانی سے اور نہ ہو جاتا۔ اس کی تشکیل و تعمیر میں مختلف عناصر باہم گھل مل کر اپنا عنصر، محنت، توفیق الہی، خاندان، ماحول، تعلیم گاہ، اساتذہ کی دعا، سحر گاہی، سیاسی و اجتماعی صورت حال، سازگار اور معتدل یا سخت حالات، علماء و صلحا کی صحبت، علوم جو اس نے حاصل کیے، وہ پٹری جس پر اس متحرک رہی، وہ اہم اسٹیشن جو اس کی زندگی کو کراس کرتے رہے، وہ غم و الم یا خواب و آرزو جو اس کے فکر و نظر کے آشیانے میں جنم لیتے رہے، وہ رفقا جو راہِ عمل اور سفر حیات میں اس کے ساتھ رہے، وہ بڑے اور ذہین لوگ جن سے اس کو شعوری و لاشعوری استفادے کا موقع ملا، وہ مصائب جنہوں نے اس کی مخفی صلاحیتوں کے سوتے جگا دیئے اور وہ مطلوبہ معیار پر سرگرم عمل ہو گئیں، اس کے ملک میں اٹھنے والے سیاسی طوفان اور اس کے وطن کی مذہبی و گروہی کش مکشیں۔ یہ سبھی کچھ مل جل کر کسی شخصیت کو تراشتے ہیں۔

قدر بنا مولانا نعمانی کی تعمیر میں بھی ان سارے عناصر نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک نسبتاً خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے گھر کا ماحول مائل بہ بدعت ہونے کے باوجود دینی تھا۔ ان کے والد اپنے خاص عقیدے کے ساتھ بھی صالح اور عبادت گزار تھے، کثرتِ عبادت کی وجہ سے ہی ”صوفی“ ان کے نام کا سابقہ بنا ہوا تھا اور وہ ”صوفی احمد حسین“ کے نام سے معروف تھے۔ (۱)

ان کے والد ”گیارہویں“ اور ”بارہویں“ شریف کے قائل ہونے کے باوجود اپنے

بیٹے کی دینی تعلیم کے لیے بے حد تڑپ رکھتے تھے اور اس کو اچھے سے اچھا عالم دین بنانے کے لیے ہر طرح کی دوا اور دعا کرتے رہتے تھے۔ (۱) اپنے خصوصی اعتقادات کے باوجود خدا کی توفیق سے انھیں یقین تھا کہ دین کی اچھی تعلیم، دیوبندی مکتب فکر کے مدرسوں ہی میں ہوتی ہے، چنانچہ اپنے بیٹے کو شروع سے ہی انھی مدرسوں میں تعلیم دلائی اور پھر دیوبند بھیج دیا۔ فرزند ارجمند کے یہاں داخلہ لینے کی برکت سے ان کے اعتقادات بھی شدہ شدہ درست ہو گئے۔

### دین کی ہمہ جہت خدمت کی راہ پر

ذکر کیا جا چکا ہے کہ دیوبند میں مولانا نعمانی کی طالب علمی کا زمانہ، دیوبند کے سنہرے دور کا تسلسل تھا؛ اس لیے اس کی فضاؤں اور ہواؤں میں مجازی جلال و جمال اور دینی باغ و بہار کی کار فرمائی تھی۔ اس ماحول کا پروردہ امت کے ہر درد کی دوا اور ملت کے ہر مسئلے کا حل ہوا کرتا تھا۔ وہ دیوبند سے نکلے تو صرف دو تین سال تک اپنے وطن سنبھل اور اپنے ضلع کے قصبہ امر وہہ میں تدریس کا کام کر سکے۔ اس کے بعد دین کے درد سے معمور انکے قلب و نظر نے انھیں مدرسے کی محدود دنیا سے خدمت دین کے وسیع تر میدانوں میں ڈال دیا۔ (۲)

انھوں نے اسلام و جاہلیت کے مابین جاری معرکوں کی نئی سمتوں، نئی حسیت اور نئے رویوں کا بغور مشاہدہ کیا۔ مغربی تہذیب کی شیشہ سازی، مکر بازی اور سحر کاری دیکھی اور دوسری طرف نسل نو کی اسلامی تہذیب کے حوالے سے ”پیزاری“ کی حد تک پہنچی ہوئی ”بے اعتمادی“ دیکھی۔ انگریزی سامراج کے ہاتھوں ہندو مسلم دشمنی کے کاشت کردہ بیج کو تناور درخت بن کر برگ و بار لاتے ہوئے دیکھا۔ سیاسی تحریکات کی ہمہ ہی، ملک کی آزادی اور پھر اس کی تقسیم، اور تقسیم کے دوران، اور اس کے بعد کے دل فگار فسادات دیکھے۔ خون مسلم کی ارزانی دیکھی، خواتین مسلم کی بے آبروئی دیکھی، میراث خلیل کی پامالی دیکھی۔ نبوت محمدی پر قادیانیت کی ناکام یلغار دیکھی اور عقیدہ صحیحہ پر بدعتوں اور خرافات کی شبنوں بازی دیکھی۔ عقل نو کا مطالعہ کیا تو پایا کہ اس کو اسلامی تعلیمات کے سلسلے میں آسودگی اور یکسوئی نہیں۔ دوسری طرف یہ دیکھا کہ اس ملک میں سیکولرزم کے پردے میں اسلام پر، اس کی تعلیمات و عقائد پر، تہذیب اسلام پر، اور اسلامی شناخت پر، منظم، بھرپور اور پیہم حملے کی منصوبہ بندی تیار ہے۔ سیکولرزم جس کو اکثریت کا بڑا حصہ یکسر مسترد کر چکا ہے اور ایک چھوٹا سا طبقہ اس کو ”ہندوازم“ کے معنی میں لینے اور ہندو مذہب کی ساری دیومالائی تہذیب و ثقافت و تعلیمات کو ملک کے تمام باشندوں پر تھوپ

دینے کو ہی اصل سیکولرزم کہتا ہے، جس کو کبھی وہ ”قومی دھارا“ کا نام بھی دیتا رہتا ہے۔ جو اتنا ہی مسلم کو دیکھا کہ وہ (خلافت عثمانیہ کے زوال اور اکثر اسلامی ملکوں پر سامراجی قبضے اور اب وہاں سامراجی فکر و فلسفے و طریقہ حکومت و تہذیب مغرب کے عمل دخل اور وہاں کے تمام امور کی رگ جاں کے پنچے مغرب میں آجانے کے بعد) احساس کمتری، ذہنی جھٹکے اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہیں۔ جب کہ انگریزی و عصری تعلیم یافتہ مسلم طبقہ، مغربی طرز زندگی کا دلدادہ، اور حرف بحرف اس کی تقلید کا داعی اور عامل ہے اور اسی میں ساری دینی و دنیوی ترقیوں کا راز پوشیدہ دیکھتا ہے، اپنی اس رائے سے مخالفت رکھنے والوں کو ”قدامت پسند“، ”جنگ نظر“ اور ”تاریک خیال“ اور نہ جانے کیا کیا سمجھتا ہے۔

یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے

بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

انہوں نے یہ سب کچھ صلاحیت و ذہانت کی نگاہ سے دیکھا،

غیرت مومن سے مطالعہ کیا، ایمان و یقین سے تجزیہ کیا اور اپنی خدا

لیا فتوں سے دین و ملت کی بہتری کے لیے زندگی بھر سرگرم عمل رہے۔ یہ ر ر ی۔  
انہوں نے جو کچھ کیا وہ خدا کی توفیق اور اس کے نتیجے میں حسن انتخاب و عمل کی بہترین مثال ہے۔  
وہ صحیح معنی میں وقت کے مطلوبہ ”اسلامی سپاہی“ تھے۔

انہوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے فتنوں کا خوب خوب مقابلہ کیا۔ خارجی فتنوں میں آریہ سماج کی شدھی سنگھٹن تحریک کا فتنہ پیش پیش تھا اور داخلی فتنوں میں قادیانیت تو تھی ہی جس کے مبلغ و مناظر فرنگی شیشہ گردوں سے ”نفس“ مانگ کر لاتے اور وارثان میراث خلیل و محمد ﷺ سے ان کا سرمایہ دین و ایمان چھین لینے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ دوسری طرف بریلوی شرک و بدعت نے اس وقت کے خاص حالات میں سراٹھار کھا تھا۔ مولانا نے ان سارے فتنوں کا زبان و قلم دونوں سے مقابلہ کیا۔ بریلویوں سے بطور خاص متعدد مناظرے کیے۔ ہر مناظرے میں انھیں یا تو منہ کی کھانی پڑی یا مولانا کے مقابلے سے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں انھیں عافیت نظر آئی۔ (۱) اور قادیانیوں اور آریہ سماجیوں کی بھی اچھی طرح خبر لی ان باطل

(۱) ان مناظروں کی کچھ تفصیل ”تحدیث نعت“ صفحہ ۳۰-۶۰ میں پڑھئے۔ نیز مولانا نعمانی کی کتاب ”دیوبند و بریلی کے اختلاف و نزاع پر فیصلہ کن مناظرہ“ پڑھئے۔

فروق اور قبور یوں کا مولانا نے جس طرح مقابلہ کیا، حق یہ ہے کہ اس کی بنا پر علمائے دیوبند میں اس سلسلے میں وہ صف اول کے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ بدعت کے سلسلے میں مولانا کا کام شاید مولانا گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) اور مولانا تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) کے بعد علمائے دیوبند میں سب سے زیادہ روشن ہے۔

”الفرقان:“ دینی خدمت کا مضبوط اور بے مثال پلیٹ فارم

محرم ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں خاص بریلی سے ”الفرقان“ جاری کیا، تاکہ اہل بدعت کی خود ان کے مرکز بریلی ہی میں سرکوبی کی جاسکے۔ شروع شروع میں الفرقان پر اپنے اولین مقاصد کے تحت مناظرے اور بحث و مباحثے کا رنگ غالب رہا، لیکن بعد میں خصوصاً ۱۹۴۲ء میں مولانا محمد الیاس صاحب (متوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) اور مولانا شاہ عبدالقادر راپوری (متوفی ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء) سے جڑنے کے بعد اس کا رنگ دعوتی، فکری، علمی اور پیغمبری بن گیا۔

”الفرقان“ مولانا کا ایک مستقل کارنامہ ہے۔ اس کے ذریعے انھوں نے جس طرح ٹھوس بنیادوں پر دین و دعوت کی خدمت کی، بندگانِ خدا کی راہنمائی کی، قلب و ذہن کو سلجھ ہوئے اسلوب میں روحانی خوراک پہنچائی، متردد ذہنوں کو تشفی بخشی، ”عقل مندوں“ کو مطمئن کیا، بھٹکے ہوئے آہو کے پھر سوئے حرم آنے کا راستہ ہموار کیا اور ہندی مسلمانوں کے پیش آمدہ مسائل و مشکلات پر جس طرح صحیح اور بروقت رائے دی، یہ سبھی کچھ ایک مستقل تحریر بلکہ تحلیل و تجزیے کا عنوان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاید و باید ہی کسی دینی رسالے نے اتنی لمبی عمر پائی ہوگی اور اہل حق کی نگاہ میں اس کو وہ اعتبار و وقار حاصل ہوا ہو گا جو ”الفرقان“ کو حاصل رہا ہے۔

”الفرقان“ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو مولانا عتیق الرحمن سنہلی جیسا شاندار صحافی اور مایہ ناز اسلامی اہل قلم دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا سنہلی کی تشکیل و تعمیر میں جہاں انکے والد بزرگوار اور صاحب الفرقان مولانا نعمانی کی کمیاب گری کو دخل ہے وہیں ”الفرقان“ کے بابرکت پلیٹ فارم کو بھی۔ اور مولانا نعمانی کے چھوٹے صاحبزادے مولانا سجاد نعمانی ندوی تو اپنے قلم کے حوالے سے تمام تر الفرقان ہی کی دین ہیں۔

مولانا کی خود متعدد تصنیفات الفرقان ہی کے صفحات پر تیار ہوئیں، نیز اس پلیٹ فارم سے دیگر کئی اہل قلم کی گراں قدر تصنیفات تیار ہوئیں جن میں مولانا مفتی نسیم احمد صاحب

فریدی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ (۱) ”الفرقان“ کے متعدد خصوصی اور تحقیقی شمارے، شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) اور مجدد الف ثانی رحمہما اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) پھر شیخ محمد الیاسؒ، مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ (متوفی ۱۳۸۴ھ، ۱۹۶۵ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) وغیرہم پر شائع ہوئے، جنہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ دینی و علمی شخصیات پر اس طرح کے خصوصی نمبرات نکالنے کی طرح غالباً در دور سالوں میں سب سے پہلے ”الفرقان“ ہی نے ڈالی۔ اب تو علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات پر رسالوں کے آئے دن نمبر نکلنے لگے ہیں۔

اُس زمانے کا ایک زبردست فتنہ خاکسار تحریک کا فتنہ بھی تھا جس کے بانی عنایت اللہ خاں (ولادت لاہور، ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء وفات لاہور ۲۷ اگست ۱۹۶۳ء) نام کے ایک صاحب تھے جو ”علامہ مشرقی“ کے نام سے مشہور تھے۔ یہ تحریک مسلمانوں کے ایک بڑی آزمائش بن گئی تھی۔ مولانا نے اس کا بھی بھرپور مقابلہ کیا ابطال کرتے رہے اور الفرقان کی چھٹی جلد ۱۳۵۸ھ کے تین شماروں اسی تحریک کے بارے میں نکالا، جو سارا کا سارا مولانا ہی کی تحریر پر مشتمل تھا۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ اس وقت کے ہندوستان کے سوسوں حالات، برطانوی سامراجی حکومت کی طرف سے ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کے نفاذ، اور ہندوستانوں کو کچھ زیادہ حکومتی اختیارات دیے جانے سے جو صورت حال پیدا ہوئی تھی، اور آئندہ ہندوستان کا نقشہ اور اس نقشے میں مسلمانوں کی جو جگہ متعین ہونے لگی تھی اس کے پیش نظر اہل نظر و اہل علم و قلم پڑھا لکھا مسلمانوں کا طبقہ خاصا فکر مند ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کی اس نقشے میں کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس طرح کے سوالات پر لکھنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۲۰ شوال ۱۳۹۹ھ / ۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء) سر فہرست تھے۔ مولانا نعمانیؒ حساس دل اور مسلمانوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ مودودی صاحب کی طاقت ور تحریروں میں مسلمانوں کے درد کا درماں دیکھ کر وہ ان سے متاثر ہو گئے۔ قصہ طویل ہے وہ جماعت اسلامی کی اولین شکل (جو تحریک دارالاسلام کے نام سے قائم ہوئی تھی) اور پھر دوسری شکل میں (جو شعبان ۱۳۶۰ھ / مطابق اگست ۱۹۴۱ء میں ”جماعت اسلامی“ ہی کے نام سے بنی) نہ صرف شریک رہے بلکہ اس

(۱) اور اس سے پہلے نام مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا آتا ہے (الفرقان)

(۲) پڑھئے ”قصدیث نعت“ ص ۷۷-۷۸

کے داعی، قائد؛ بلکہ مولانا مودودی سے زیادہ پر زور وکیل رہے؛ لیکن خدا کی توفیق، کتاب و سنت کی شاعری، دیوبند کی تعلیم و تربیت، علمائے صالحین کی صحبت و غیرہ کی وجہ سے مزاج کی سلامت روی نے انھیں زیادہ دن وہاں رہنے نہ دیا (۱)

مولانا شاہ عبدالقادر راپوری اور مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ سے وابستگی کے بعد ان کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا۔ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کے وہ اور ان کے رفیق دیرینہ و شریک دعوت و فکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ شارح و ترجمان اور وکیل بن گئے۔ ان دونوں کی کوششوں سے پڑھے لکھے طبقے میں بطور خاص دعوت کے کام کا وقار بڑھا۔ مولانا الیاس کی دعوت میں قلم اور پروپیگنڈے کو کسی قسم کا عمل دخل نہیں تھا، وہ کام پر زور دیتے تھے، بات سے بالکلہ اجتناب تھا، لیکن یہ دونوں حضرات چوں کہ اہل قلم بھی تھے اس لئے دعوت کے کام کو قلم انداز نہیں کر سکتے تھے، ان کے قلم سے ہزاروں بندگان خدا کو فائدہ پہنچا، مولانا نعمانی ایک طاقت ور اور معتبر رسالے کے مدیر بھی تھے۔ انھوں نے رسالے کو بڑی حد تک اس کے لئے مسخر کر دیا۔

مولانا فرماتے ہیں

”حضرت مولانا محمد الیاس کی تحریک کا کام صرف دل و زبان اور عملی نقل و حرکت سے تعلق رکھتا تھا، قلم اور تحریر کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا، یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر میری ذات کے ساتھ ”الفرقان“ ایسا جزا ہوا تھا کہ کسی علمی، دینی اور اصلاحی خدمت کی میں توفیق پاؤں اور ”الفرقان“ اس سے الگ الگ رہے۔ اس کا تصور ہی کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اب ”الفرقان“ کی بھی اصل دعوت یہی ہو گئی“ (۲)

مولانا الیاسؒ کو اس عاجز نے دیکھا نہیں، صرف کتابوں میں پڑھا اور مولانا نعمانی، مولانا علی میاں ندوی اور ان جیسے بزرگوں سے سنا ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ پڑھا اور سنا اس سے ان کے سلسلے میں یہ اعتقاد جازم ہو گیا کہ وہ دین کے حوالے سے کچھ صحابہ جیسی ہی تڑپ رکھتے

(۱) اس سارے قصبے کی باقاعدہ تفصیل اور اس کا پس منظر جانے کے لیے، مولانا نعمانی کی مستقل تصنیف ”مولانا مودودی“ کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف ”پڑھنا چاہیے۔ جو ہندی مسلمانوں کے ۷۰-۷۵ سالہ عہد کی ایک تاریخ بھی ہے اور شروع سے ہی مولانا نعمانی کی دینی پختگی، اسلامی حمیت اور بلند عموں و پر زور و پر شور قلم کے باوجود کھوکھلے دایموں اور طریقہ سلف سے ہٹے قادیان و مفکرین کی مزاج آشنائی کی دور میں صلاحیت کی ایک ٹھوس دلیل بھی۔

تھے۔ مسلمانوں کی حالت زار پر دل کباب ہو گیا تھا، دین کے لئے تڑپنا، اسی کو غم اول و آخر بنالینا، اس کی دعوت کو عام مسلمانوں تک پہنچا دینے کے لئے اسی طرح بے چین رہنا جیسے انگاروں پر لوٹنے والا رہا کرتا ہے، اور مسلمانوں کو مسلمان بنادینے کی فکر میں روز و شب گھلنا، پگھلنا اور اپنے خدا سے اس کام کو آسان بنادینے کے لئے رو رو کر تنہائی میں آرزو کرنا اور دعاہائے سحر گاہی میں اسی موضوع پر اس سے مناجات کرنا اور خدا کے ہر بندے سے منت و ساجت کرنا کہ وہ اسی غم کو اوڑھ لے، ایسی خصوصیات ہیں جو دین کے سابقین اولین داعیوں کا وجہ امتیاز تھیں۔

چنانچہ مولانا الیاسؒ سے جو بھی لگا، جزا، متاثر ہوا اور ان کی صحبت میں بیٹھا، ان کی دعوت و تبلیغ میں شریک ہوا، وہ مولاناؒ کے درد سے حصہ پانے سے محروم نہیں رہا، مولانا نعمانی علماء کی صف کے ایسے خوش نصیب لوگوں میں سرفہرست افراد میں تھے۔

چنانچہ ان کی تحریر و تقریر کا رنگ و آہنگ ہی نہیں ان کا تبدیل ہو گیا، برکت کا نور، عشق کی لپٹ، پیغام محمدیؐ کی محبت کی تپش صلابت، اور دل حساس کا بامقصد درد و مقدس غم، تحریر و تقریر کے پھوٹنے لگا، مولانا نعمانی اور ان جیسے ”الیاسی بزرگوں“ کی اس زمانے او ایک کرنٹ ہے، ایک عجیب سی محبوبیت ہے، ایک خاص قسم کا جادو ہے، جلے ہوئے دل لی حو تسبو ہے، محبوب اعظم محمد ﷺ کی محبت کی جانفزا مہک ہے۔

ملی سرگرمیوں میں قائدانہ رول

لیکن ایسا نہیں ہوا کہ وہ مولانا الیاسؒ اور ان کی دعوت سے مربوط ہو کر دین و ملت کی تمام سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے، بلکہ نئے ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کے حل، ان کی باعزت زندگی اور دینی شناخت کی برقراری کے لئے قائدانہ رول ادا کیا اور قلم و زبان اور تنگ و دو کے ذریعے متعدد تحریکوں، سرگرمیوں اور کوششوں میں عملی اور فعال حصہ لیا۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل میں پیش پیش رہے، جس کا نخیل اس سے پہلے قاضی عدیل عباسیؒ (متوفی ۲۲ مارچ ۱۹۸۰ء - ۱۳ جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ) نے پیش کیا تھا اور وہ اپنے ضلع بستی کے حدود میں اس نخیل کو اچھے ڈھنگ سے برپا بھی کر چکے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں ہفت روزہ اخبار ”ندائے ملت“ کی تاسیس میں اور ۹ اگست ۱۹۶۳ء کو مجلس مشاورت کی تعمیر میں حصہ لیا، جس کی دعوت ایک بڑے ملی و سیاسی قائد ڈاکٹر سید محمود (متوفی ۱۹۷۱ء) نے دی تھی۔ اسی طرح دسمبر ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل میں قائدانہ رول ادا کیا، جس کی شیعہ اولین اُن



کی اور دیگر علمائے دیوبند (جن میں مولانا سید منت اللہ رحمانی سابق امیر شریعت بہار و اڑیسہ متوفی ۱۴۱۱ھ / ۱۹۹۱ء سر فہرست تھے) کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند میں منعقدہ اجلاس بابت مارچ ۱۹۷۲ء، میں رکھی جا چکی تھی۔ اور تمام علمائے ہند کے اتفاق رائے سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ (متوفی ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء) کو بورڈ کا صدر اور مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کو اس کا سکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ اس بورڈ نے اس وقت سے اب تک مسلمانوں کی دینی شناخت کی بقا کی لڑائی جس کامیابی سے لڑی ہے، اس کامیابی سے مسلمانوں کی کسی تحریک کو سرفراز ہونے کی توفیق آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۳ء میں اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بنائے گئے اور اس وقت سے تادم حیات اس کے سرگرم ممبر رہے۔ ہمیشہ ان کی عالمانہ فاضلانہ اور حکیمانہ رائے کو وزن کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ اور گزشتہ اور حالیہ انتظامیہ دونوں کے دور میں انھوں نے ذمہ داروں کو اپنی گراں قدر رائے، جہاں بنی، دور رسی اور گہرے تجربات سے نہ صرف فائدہ پہنچایا بلکہ مربیانہ راہ نمائی کی۔

ان کی علمی و دینی و دعوتی شخصیت کی بنا پر ۱۹۶۵ء میں انھیں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا رکن تاسیسی منتخب کیا گیا اور تادم زندگی وہ اس منصب پر فائز رہے۔ اسی طرح وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامی کے بھی رکن رہے۔ ہر جگہ ان کی رائے کا وزن محسوس کیا گیا۔

### قلمی خدمات

دعوتی و دینی و ملی میدانوں میں سرگرم کار رہتے ہوئے، مولانا نے مختلف اسلامی موضوعات پر گراں قدر تصنیفات اور تحریروں سے اسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا۔ اسلامی موضوعات پر ہندوستان بلکہ برصغیر میں لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں، لیکن دو باتوں کی بنا پر مولانا اپنے معاصرین اہل قلم میں لاثانی نظر آتے ہیں۔

[۱] انگریزی تعلیم یافتہ اور مغرب کی مادی تہذیب کے سحر میں گرفتار، مادی طریق فکر و سیاست و فلسفہ پر ایمان رکھنے والی اسلامی تعلیمات سے بے زاریا بے گانہ اور تشکیک میں مبتلا نسل نو کو، مدلل، مکمل اور اس کی عقل و خرد و قلب و نگاہ کو متاثر کرنے والے زود ہضم اسلوب میں؛ اسلامی تعلیمات اور دینی حقائق کو پیش کرنے کے حوالے سے، مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا کام منفرد اور جداگانہ ہے۔ وہ اس سلسلے میں جتنے کامیاب اور خدائے کریم کی طرف سے جس قدر توفیق یافتہ ہیں، کم ہی اہل علم و قلم کو یہ سعادت ملی ہوگی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ فرماتے ہیں

”جہاں تک اس زمانے کا تعلق ہے، یہ کام (یعنی دینی تعلیمات و حقائق کو عصر حاضر کے ذہن و تقاضے کو سامنے رکھ کر پیش کرنے کا کام) پہلے سے زیادہ دشوار اور نازک ہو گیا ہے، کہ ذرا سی غفلت، کسی رجحان کے غلبے، یا ذہنی رد عمل کے نتیجے میں، دین کی تفہیم، زمانے کے اثرات سے متاثر، روح اور مقاصد دین سے دور اور رائج الوقت اور مقبول زمانہ فلسفوں، تحریکوں اور نظریات کی ترجمان بن سکتی ہے۔ اس کام سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے، جس نے ایک طرف دین کا علم، اس کے ماہر اساتذہ اور علمائے راہنہ سے حاصل کیا ہو، کتاب و سنت سے براہ راست استفادے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہو، تعلیم کے ساتھ علمائے راہنہ کی صحبت بھی پائی ہو، پھر اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کے مختلف حلقوں میں راہ

خیالات سے واقف ہو؛ اس نے زندگی کسی خیالی دنیا، علمی حصار یا ”دور“

ہو؛ اہل حرفہ سے لے کر دانشوروں اور علما و واعظین سے لے کر یہ

والوں تک سے اس کا اختلاط و نشست و برخاست رہی ہو، پھر وہ (وہی

مسائل کو سہل اور عام طریقے پر بیان کرنے اور سادہ سے سادہ زبان بولتے اور ۔۔۔ چ  
اس سب کے علاوہ اُس کے اندر اخلاص،، سوز و درد اور دعوت کا طاقت ور جذبہ بھی پایا جاتا ہو،  
کہ اس کے بغیر کوئی کوشش مؤثر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔

”مجھے اس حقیقت کے اعلان میں مسرت اور کسی قدر فخر محسوس ہوتا ہے کہ رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر ”الفرقان“ نے اس اہم اور نازک کام کا بیڑہ اٹھایا....“ (۱)

[۲] میرے علم میں نہیں کہ کسی اہل علم و قلم نے عصر حاضر میں رکاکت یا عامیانہ پن اور سطحیت سے بچتے ہوئے اتنی عام فہم زبان میں اسلام کی دعوت و تعلیمات کو عصر حاضر کے مطابق پیش کیا ہو، جس کو پڑھ کر علماء و تعلیم یافتہ بھی بے مزہ نہ ہوں، اکتائیں نہیں اور عوام پڑھیں تو ایک ایک لفظ ان کے دل میں اترتا چلا جائے، جس میں ادبی چاشنی تو مکمل طور پر پائی جاتی ہو؛ لیکن الفاظ کی بے جا شوکت و سرکشی اور ترکیب کی ”کوہ پیائی“ اور ہمالیائی اونچائی“ سے بچا گیا ہو اور پڑھنے والے کو ایسا لگے کہ لکھنے والے نے ہر ہر لفظ کو محسوس کر کے لکھا ہے، ہر ہر جملے کو پیمائش اور تول کے بعد ہی، جملے میں برقرار رہنے دیا ہے اور جیسے عوام و خواص کی میٹنگ بلا کر اس

(۱) مقدمہ ”دن و شریعت“ ص ۱۶، تیرا ہوا ال ایڈیشن ۱۹۹۳ء، الفرقان پبڈیو، لکھنؤ

گیا ہے۔ مولانا کا عام فہم اور شیریں ترجمہ، نیز دلکش و روح پرور تشریح نے کتاب کو ہر مسلمان کی ضرورت بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب اصلاحی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے تمام میدانوں میں مسلمانوں کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اور عمل سے راہ نمائی حاصل کرنا آسان ہو جائے، لیکن مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ حدیث پاک کی بہت سی تعبیروں کا صحیح اردو ترجمہ نیز بعض دقیق علمی بحثوں کی گریں اس کتاب میں جس آسانی سے کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں بہت کم جگہ یہ چیز نظر آئی۔

”الداعی“ کی ذمہ داری لینے کے بعد، میں نے طے کیا کہ اس کو کسی نہ کسی درجے میں داعی رہنا چاہیے اور ایسے دعوتی و فکری مضامین ہر شمارے میں آنے چاہئیں جن میں اسلامی تعلیمات و حقائق کو سننے ذہن کے مطابق پیش کیا گیا ہو۔ فرزند ان دیوبند نے جو بھرائے اگر اں مایہ اسلامی کتب خانہ تیار کر دیا ہے، میں نے اس مقصد کی خاطر اس پر ایک نگاہ ڈالی، تو باوجود اس کے کہ یہ تصنیفات و نگارشات اپنی جگہ گراں بہا، بے مثال اور تمام علم و فن کی جامع ہیں، لیکن مجھے اس بحر میں وہ درمطلب زیادہ آسانی سے نہیں مل سکا جس کا میں تلاشی تھا یعنی یہ کہ دعوتی و فکری بات آسان زبان میں اور موجودہ ذہن کو سامنے رکھ کر کی گئی ہو۔ بالآخر مولانا کی ”دین و شریعت“ قرآن آپ سے کیا کہتا ہے، ”معارف الحدیث“ الفرقان کی فائلوں میں ان کے مضامین اور ان کے تقریری مجموعوں سے ہی اس سلسلے میں فائدہ اٹھایا جاسکا۔

شیعیت کے موضوع پر مولانا کی زندہ جاوید تصنیف

امام آیت اللہ روح اللہ خمینی (متوفی ۴ جون ۱۹۸۹ء/ ۱۴۰۹ھ) نام کے ایرانی شیعہ اثنا عشری عالم نے ایران میں رضا شاہ پہلوی کی طاقت و رشاہی کا تختہ الٹ کر اپنے عقیدے کے مطابق ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء میں وہاں ”اسلامی حکومت“ قائم کی، تو نہ صرف شیعہ و نیانے آسمان سر پر اٹھالیا، بلکہ وہ سنی العقیدہ مسلمان خصوصاً نوجوان جو ایک خاص قسم کی سطحی اسلامی تحریک سے متاثر، ”حکومت الہیہ“ یا ”خلافت علی منہاج النبۃ“ کے قیام کے لیے نام نہاد کوشش اور مطلوبہ عمل و اخلاص کے بغیر محض کھوکھلے نعروں سے مسرور اس سلسلے کے لڑچکر کے ”منشیات“ سے سرشار تھے؛ خمینی کے عقیدے، صحابہ کرام پر اس کے سب و شتم، ابو بکر و عمرو عثمان رضی اللہ عنہم پر بطور خاص اس کے لعن و طعن اور ایسی الزام تراشی جو کسی نہایت ہی ضال، فاسق اور بدکردار جماعت کے لیے بھی نہیں کی جاتی (۱) سے بالکل صرف نظر کرتے ہوئے؛ اس کو ایک صحیح، مطلوبہ اور مثالی حکومت اسلامی کا بانی، اسلامی انقلاب کا داعی و مؤسس، قابل تقلید قائد

سمجھنے، سمجھانے اور پوری دنیا میں اس کا بول بالا کرنے کے لیے زبان، قلم، اور ذرائع ابلاغ کی ایسی پر زور طاقت صرف کرنی شروع کر دی اور خمینی سے عقیدت و محبت کے اظہار میں یہ لوگ اس حد تک پہنچ گئے کہ اُس کے خلاف کوئی حرف تنقید زبان سے نکالنے والا اُن کے نزدیک گویا اتحادِ اسلامی کا مخالف، حکومتِ اسلامی کا دشمن، مسلمانوں کے انتشار کا داعی اور غلبہ فکرِ اسلامی و عروجِ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والا بن گیا۔

اس صورتِ حال سے صحیح العقیدہ علمائے دین بے چین ہو گئے؛ کیونکہ فسادِ عقیدہ کے ساتھ کسی طرح کی ”اسلامی حکومت“ کا قیام اور اس سلسلے کی دعوت و تحریک محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں قابلِ قبول نہیں۔ خدائے ذوالجلال کسی کروفر، کسی مغربی طاقت کو لاکار دینے، کسی بڑی طاقت کے لیے مشکلات پیدا کر دینے سے متاثر و ”مرعوب“ نہیں ہوتا۔ اُن کے نزدیک اصل یہ ہے کہ شرک سے اجتناب کیا جائے۔ اس کی الوہ و باطنی شکلوں سے بچا جائے، اسی کو سارے کارخانے کا حاکم و مالک دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی

ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر  
حرف اُس قوم کا بے سوز، عمل زار و دوزبوں  
ہو گیا پختہ عقائد سے جہی جس کا ضمیر

ان علمائے حق میں سر فہرست مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ھے جن کا قلم بدعت، قادیانیت اور دیگر باطل فرقوں کے مقابلے میں شرر بار رہ چکا تھا۔ مولانا نے اپنے امراض، پیرائے سالی، کمزوری ساری چیزوں سے بے نیاز ہو کر شیعیت کا، اس کی تاریخ کا اس کے قدیم مآخذ کا اور جدید مراجع کا نیز خمینی کی تصنیفات و تحریرات کا گہرائی و گہرائی سے مطالعہ کیا۔

اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اس مطالعے نے اُن کے ضعیف اور بیماریوں سے زار و نزار جسم میں ایک نئی حرکت و قوت اور فکر و مطالعے کی ایک نئی صلاحیت پیدا کر دی۔ اُنھوں نے اس محنت و انتہاک کیساتھ کام شروع کیا کہ بارہا اُن کی صحت خطرے میں پڑ گئی اور اہل تعلق کو اس بارے میں فکر و تشویش لاحق ہوئی، لیکن مولانا اپنی افتادِ طبع اور زندگی بھر کے معمول کے مطابق اپنے کو اس سے باز نہیں رکھ سکے۔“ (۱)

مولانا نے اس مذہب کا معروضی، حکمانہ و عالمانہ و مؤرخانہ جائزہ لیا، جس کے نتیجے میں

ان کی محققانہ کتاب ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ معرض وجود میں آئی جو مذہب شیعہ کی مکمل تاریخ، اس کے عقائد اور کتاب و سنت کی روشنی میں ان کے عقائد سے اخذ کردہ نتائج کا اتنا جامع مرقع بن گئی ہے جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں۔ شیعیت کا یہ جدید ترین اور بہترین مطالعہ ہے جو کسی بھی پڑھے لکھے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

مولانا نے جس وقت اس کتاب کو بالاقساط لکھنا اور الفرقان کے صفحات پر شائع کرنا شروع کیا، اُسی وقت میرے جی میں آیا کہ یہ کتاب وقت کی ضرورت ہے اور ہمیشہ کے لیے عموماً اور اس وقت خصوصاً اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عرب دنیا بھی تشیع کے فتنے، اس کی تحریف کاری اور جسم اسلامی میں اس کے سرطانی عمل سے واقف ہو۔ نیز خمینی کی اپنے سلف کی شدید پیروی، صحابہ کرام سے اس کی اور اس کے سلف کی بیزاری، تبراء سب و شتم، اور دل گداز الزامات کی چارج شیٹ سے واقف ہو۔ پھر ”حکومت اسلامیہ“ کا بھرم بھی اس کے سامنے کھل جائے اور عالم اسلام کے نعرہ بازوں جو انوں پر اس کا جو طلسم چلا ہوا ہے اس کے ٹوٹنے کی راہ ہموار ہو۔

یہ سوچ کر میں نے اسے عربی قالب میں ”الداعی“ میں شائع کرنا شروع کیا۔ اس موقع سے قدرتی طور پر مولانا کی بے پناہ توجہات سے سرفراز رہا۔ وہ اپنے خطوط کے ذریعے جہاں دعائیں دیتے، حوصلہ بڑھاتے، وہیں کسی جگہ عبارت کو حذف کر دینے یا اس کی تعبیر بدل دینے یا پیرا گراف کے اضافے اور مزید حوالوں کی نشان دہی کرتے۔

عشقِ جسور و فقرِ غیور کی جلوہ گری

مولانا نعمانی کی تمام تصنیفات، نگارشات، اور علمی و دعوتی کاموں میں جو برکت نظر آتی ہے، ایک خاص قسم کی روشنی پھوٹی پڑتی ہے، ایسی کشش ہے جس کا سرچشمہ محض الفاظ کا حسن، تعبیرات کا جمال، ترکیب کی خوبی، بیان کی رعنائی، طرز ادا کی زیبائی؛ نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جب ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ اُن کے ہاں الفاظ کے بناؤ سنگار، اور تراش خراش پر بالارادہ زور نہیں۔ اس کے باوجود ان کی چھوٹی بڑی تمام تصنیفات بے حد مقبول ہیں، ان کے تراجم بہت متداول ہیں۔ اُن کے ذریعے ہزاروں بندگان خدا کو دین کے جاننے، سمجھنے، اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی ہے۔ اُن کی تالیفات اور مطبوعہ تقریریں عام مسلمانوں کے لیے دین سمجھنے کے حوالے سے ایک عام اور ناگزیر ضرورت بن گئی ہیں۔ یہ سبھی چیزیں وہ ہیں جو ایک بندہ خدا،

ایک مقبول بارگاہِ الہی، ایک ایسے عالم ہی کی تصنیفات و اعمال میں ہو سکتی ہیں جس کو توفیقِ الہی کی دولت، خدا کے صالح بندوں کی صحبت، خاصانِ خدا کی تربیت، مقبولانِ بارگاہِ الہی کی توجہات سے سرفرازی اور ان کی خصوصی دعاؤں سے بہرہ یابی حاصل رہی ہو۔

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر

کوئی عالم، مصنف، اہل قلم، داعی، محدث، قائدِ دینی، مصلحِ اجتماعی، بلکہ ادیب، شاعر اور فنان، خواہ کتنا ہی قد نکال لے، وہ محض علم و اطلاع کے بل بوتے پر اور صرف ذہانت و ذکاوت، عقل و عبقریت، دور نگاہی و روشن خیالی کے سہارے، اپنے کام میں برکت کا نور، مقبولیت کی سحر کاری، قدر افزائی و پسندیدگی کی جاذبیت پیدا نہیں کر سکتا، اگر اس کے کام کا خیر خونِ جگر، نورِ تقویٰ، تب و تابِ اخلاص، بے تابیِ عشقِ رسول، سرشاریِ محبتِ الہی، عبادت اور شوقِ ریاضت سے نہ اٹھا ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی علمِ فائدہ رسانی اور باعثِ حیات جاودانی بنادیتی ہے۔

واقف ہو اگر لذتِ بیداری شب۔

اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پر اُسرار

مولانا نعمانیؒ نے راپور (ضلع سہارنپور) کی خانقاہ اور مولانا محمد الیاس کی صحبت و دعوت سے محبت کا جامِ آتشیں نوش کیا تھا، علامہ انور شاہ کشمیری کے نفسِ گرم سے تاثیر حاصل کی تھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) کی زیارت سے فیض پایا تھا، عارف باللہ مفتی عزیز الرحمن عثمانی دیوبندی (متوفی ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء) مولانا حبیب الرحمن عثمانی دیوبندی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء) حکیم الامت حضرت تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) شاہ و صی اللہ فتح پوری گورکھپوری ثم الہ آبادی (متوفی ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی (۱۳۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) امام اہل سنت مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنوی (متوفی ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء) کی صحبت و معیت و علمی استفادے اور روحانی استفادے کے حوالے سے قدحِ خوار رہے تھے اور ان کی مومنانہ نگاہ سے اپنی ”تقدیر بدلوانے“ میں مدد ملی تھی۔ محمد عربیؐ کی مدنی ہاشمی قرشی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان عشاقانِ پاک طینت و نیک سیرت سے سلیقہٴ عشق و محبت اور دین کے لیے جینے مرنے کا ذوق حاصل کیا تھا، اسی لیے ان کی تحریر میں جو لذتِ گفتار اور گرمیِ کردار ہے وہ ہر عام و خاص کو متاثر کرتی اور گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اللہ نے ان کی مقبولیت کا

نظارہ ہم لوگوں کو اس طرح دکھادیا کہ ایک ڈیڑھ لاکھ کے مجمع نے ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی اور سخت دھوپ میں ۸ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے عیش باغ قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ تک انھیں رخصت کیا۔

### مولانا کی چند خصوصیات

مولانا ذہین اور قوی الحافظ تھے، انھیں درسی کتابوں کی عبارتیں، فقہ کے متون اور بہت سی احادیث زبانی یاد تھیں۔ بوقت ضرورت بالفاظ زبانی پڑھ جاتے تھے۔ کسی عالم کی گفتگو کو عرصے کے بعد بھی انھیں کے الفاظ میں لکھ اور بول لیتے تھے۔ (۱) واقعات و حالات کو بغیر کسی کمی اور زیادتی کے بیان کرنے پر بھی انھیں عجیب سی قدرت تھی۔ اپنے ملنے والوں کو عرصے کے بعد دیکھ کر بھی پہچان لیتے تھے۔ سالہا سال سے بیماری اور کمزوری کے باوجود انتقال سے ذرا پہلے تک بھی ان کا حافظہ اور دماغ صحیح طور پر کام کرتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث و فقہ کے ساتھ ان کے مسلسل اور طویل اشتغال کی یہ برکت تھی۔ فقہاء اور محدثین عموماً قوی الحافظ اور ذہین ہوئے ہیں، کیوں کہ قوت حافظہ خدائی روشنی ہے، جس سے صالحین کو سرفراز کیا جاتا ہے۔ امام شافعی کا زبان زد خاص و عام قطعہ ہے کہ ”میں نے اپنے استاذ حضرت وکیع سے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو آپ نے مجھے معاصی سے اجتناب کی تلقین کی کہ قوت حافظہ نور الہی ہے جو کسی عاصی کو نہیں دیا جاتا۔“

ذہانت کی بنا پر مولانا مسائل کی تہوں اور اُن کے ممکنہ گوشوں تک بہت جلد پہنچ جایا کرتے تھے، پھر جلد ہی ان کے مناسب حل تک بھی ان کی رسائی ہو جاتی تھی۔

وہ صائب الرائے اور دور بین بھی تھے، طویل تجربات، سمجھ داری، زمانے کے نرم گرم سے مسلسل سابقہ اور زندگی کے دراز سفر نے انھیں یہ صفت عطا کی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ حساس مسائل اور ملک و ملت کے نازک معاملات میں بڑے بڑے علماء و قائدین ان سے رجوع کرتے اور ان کی رائے معلوم کر کے اسی پر عمل کرتے تھے۔

حالات حاضرہ اور تقاضائے زمانہ پر ان کی گہری نگاہ تھی، وہ اچھی طرح جانتے کہ کس مسئلے کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے اور دعوتِ دین کو عوام و خواص میں مقبول بنانے کے لیے اس

(۱) ”تحدیثِ نعمت“ میں ص ۱۳۹ سے ۱۸۶ تک میں حضرت تھانویؒ کی خدمت اقدس میں اپنی بار بار کی حاضریوں کے ضمن میں

بہت سے مسائل پر حضرت کے ساتھ تبادلۂ خیال اور گزارشات کے اپنے الفاظ اور حضرت تھانویؒ کے جوابات کے متون مولانا نے اکثر جگہ سالہا سال کے بعد اپنے حافظے کی مدد سے لکھے ہیں اور اکثر جگہ فرمایا ہے کہ جہاں تک یاد پڑتا ہے اصل الفاظ یہی تھے۔

وقت کن پتھروں اور روڑوں کو ہٹانے کی فی الفور ضرورت ہے اور انھیں کس طرح ہٹایا جاتا چاہیے۔ مغربی تہذیب کے نشے سے چور اور عصری تعلیم سے محذور ذہن لوگو کو کس طرح مخاطب کیا جائے؟ خوب جانتے تھے ”عصری حسیت“ کے ماہر تھے اور حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے حکیمانہ مقولہ ”کَلِّمُوا النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عُقُولِهِمْ أَلَّا يُكْذِبَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ“ (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق خطاب کیا جائے تاکہ وہ نادانی سے اللہ و رسول کی بات کی تکذیب نہ کریں)۔ پراچھی طرح عمل کرنا جانتے تھے۔ ان کی تمام تحریریں اور تقریریں اس کی شاہدِ عادل ہیں۔

علمی مباحث ہوں، یا فرق و مذاہب، یا نظریات و رجحانات: ان کے درمیان موازنہ اور تجزیہ ایسا کرتے کہ بڑے بڑے مدعی تحقیق کو بھی نشفی ہو جاتی اور ہر پڑھے لکھے کو ان کی رائے دل لگتی بات محسوس ہوتی۔ باطل فرق و مذاہب اور دعوات و تحریکات کے منشاء زلیخ و ضلال و طریقہ اضلال پر ان کی نگاہ ہمہ گیر تھی۔

وہ اظہارِ حق میں بھی جبری واقع ہوئے تھے، اس سلسلے میں

والے کی ملامت، دوستوں کی ناراضگی اور اپنوں کے برا ماننے کی پرواہ

یقین ہو جائے کہ فلاں بات حق ہے، ضمیر کا یہی تقاضا ہے اور اللہ رب العزت سے ردیب ہیں پسندیدہ ہے۔ وہ پرانے کپڑوں کی طرح تبدیلی رائے سے بھی مکمل گریزاں تھی۔

وہ رفیق القلب، جلد آبدیدہ ہو جانے والے اور بہت گریہ کناس تھے۔ حضور ﷺ آپ کے صحابہ اور صلحائے امت کے تذکرے سے روئے بغیر گزرنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ اپنے تمام اساتذہ و مشائخ کی یکساں قدر کرتے تھے اور ان کے اختصاص کے گوشوں میں ان سکھوں سے استفادے کے لیے کوشاں رہتے۔ ہر چند کہ انھیں علامہ کشمیری، شیخ عبدالقادر رائے پوری، مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے زیادہ مناسبت تھی اور انھیں سے زیادہ اکتسابِ فیض بھی کیا۔

دارالعلوم دیوبند سے عشق

وہ مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے عاشق صادق، اس کے مسلک کے سرگرم ترجمان، بدعت و قبوریت کے لیے شمشیر برہنہ اور ہمارے علما کی صف میں اس سلسلے میں زیادہ واضح موقف رکھتے تھے۔ دارالعلوم سے ان کا عشق ایک احسان مند کا اپنے محسن کے احسان اور اپنے منعم کی بخششوں کی قدر دانی سے عبارت تھا۔ وہ زندگی بھر اُس کے آتش عشق میں جلتے اور اس کی



محبت کی شراب صبحی و شبی پیتے رہے۔ جب تک کسی طرح بھی دیوبند آنے کی سکت باقی رہی مجلس شوریٰ میں بلا تاغہ شرکت فرماتے رہے؛ لیکن جب طرح طرح کے امراض و اعذار نے چلنے پھرنے سے مجبور کر دیا تو ہمیشہ ان کی تمنا رہی کہ کاش وہ ایک مرتبہ دارالعلوم آجائیں۔ دارالعلوم کے در و دیوار پر ایک نگاہ کسی طرح ڈال لیں، طلبہ و اساتذہ سے آخری دفعہ ملاقات کر لیں، مجلس شوریٰ کے ارکان و ذمہ داران میں حیات اپنے دوستوں کو الوداع کہہ لیں۔ دو ایک مرتبہ عشق نے جب زیادہ ستایا تو اپنے کئی اعزہ کے سہارے و ہیل چیر پر بیٹھ کر نہ جانے کتنی مشقتوں سے ریل یا کار کے ذریعے سفر کر کے دارالعلوم پہنچے۔

وہ آخر دم تک دارالعلوم کے اہم معاملات میں ذمہ داروں کو مشورے دیتے رہے، خصوصاً دارالعلوم کے موجودہ مہتمم، مرد صالح حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ العالی کو، جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک مربی بزرگ اور سرپرست کو کھو کر بڑی تنہائی محسوس کر رہے ہیں۔

خدا نے پاک انھیں اپنی خاص رحمتوں سے نوازے اور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے جوار میں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ان کے تمام اعزاء، متعارفین، رفقاء، دعاگو اور محبین و معتقدین کو صبر جمیل و اجر جزیل سے نوازے۔ آمین۔

☆☆☆

**اگر آپ اس خاص نمبر کو مفید سمجھتے ہیں تو!!**

زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اس کو پہنچانے میں ہماری مدد کریں ————— شکریہ  
————— ناظم ادارہ الفرقان

مولانا عبدالقدوس رومی

مفتی شہر۔ آگرہ

## حضرت مولانا نعمانیؒ کی یادگار

### ”الفرقان“ کا دورِ زریں۔ اُس کا دورِ اوّلین

☆☆☆

[قارئین اس مضمون کے آخری حصے میں کچھ ایسی چیزیں پائیں گے جو اس کے خاص موقع و محل کے ساتھ کچھ موردِ اُن نہ معلوم ہوں۔ لیکن :-  
کا ایک قیمتی مضمون ہے۔۔ البتہ قارئین کو الجھن سے بچانے کیلئے کہیں مناسب سمجھی گئی ہیں۔۔۔ اوارہ]

عنوان مذکور الصدر کے تحت اپنا اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے یہ ذکر کر دینا مناسب و بر محل ہو گا کہ راقم السطور کو حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کی پہلی زیارت کب اور کہاں ہوئی تھی اور پھر بعد میں وہ اتفاقی و ہنگامی ملاقات و زیارت کس طرح گونا گوں روابط و تعلقات میں تبدیل ہو گئی تھی۔

یہ ان متعدد الجہات اور گونا گوں روابط و تعلقات ہی کا تقاضا ہے کہ احقر کو اپنے مزاج اور عام عادت کے خلاف یہ طے کرنا پڑا کہ ”تذکرہ نگاری“ کا یہ دشوار گزار فریضہ چاہے کسی اور کے لئے ادا نہ کیا گیا ہو مگر حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کیلئے جس طرح بھی بن پڑے کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی لکھنا ہے۔

تذکرہ نگاری میں راقم السطور کو جو دشواری محسوس ہوتی ہے اسے سمجھانے کیلئے اپنی ہی ایک بات یہاں لکھ دینا مناسب ہے جو متعدد بار راقم السطور کو ایسے حضرات سے عرض کرنی پڑی ہے جنہوں نے اپنی کسی کتاب پر تقریظ یا مقدمہ و پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ احقر نے ان حضرات سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ بھائی! میری قسمت میں قسام ازل نے اس قسم کے مضامین

کا کوئی حصہ رکھا ہی نہیں ہے اسلئے اس خدمت سے معذوری ہے، احقر کو اپنی اس کمزوری کا تجربہ برابر ہوتا رہتا ہے کہ کسی کتاب پر تقریظ لکھنا شروع کی مگر دھیرے دھیرے مضمون کی پٹری بدلتی گئی اور آخر میں وہ تقریظ تنقید کی پٹری پر آ گئی۔ اپنی اسی کمزوری کی وجہ سے ایسی خدمات سے معذرت کر لیا کرتا ہوں۔

احقر کو حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کی پہلی زیارت ۱۳۵۵ھ یا ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء) میں بہت ہی عجیب و غریب طور پر ہوئی تھی جو ساٹھ سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد آج بھی تقریباً اسی طرح ذہن میں یوں محفوظ و موجود ہے جیسے یہ ابھی کل ہی کا واقعہ ہو۔ یہ واقعہ غالباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء کا ہے اسوقت احقر کے والد محترم مولانا محمد سراج الحق مچھلی شہرؒی بسلسلہ ملازمت فتنور ہنسوہ میں تھے اور احقر نے وہیں مدرسہ اسلامیہ میں ابتدائی عربی و فارسی کتابیں شروع کی تھیں۔ اپنی عمر اسوقت بارہ، تیرہ سال کی رہی ہوگی، حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ بقید حیات تھے۔ مگر سفر کا عمومی سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ کسی وقتی ضرورت سے حضرت علیہ الرحمہ کانپور تشریف لائے ہوئے تھے اور اُدھر شہر فتنور میں رضا خانیت کے نقیب اعظم جناب حشمت علی خان صاحب پبلی بھیتی کئی روز سے اپنی تقریروں کے ذریعہ شہر کی پرسکون فضا میں ہلچل پیدا کئے ہوئے تھے۔ ان تقریروں میں بار بار مطالبہ یہ ہوتا کہ حفظ الایمان کی کفریہ عبارت کے مصنف کانپور آئے ہوئے ہیں۔ مجھ سے مناظرے کیلئے انہیں یہاں بلاو اور مناظرہ کرالو۔ اگر وہ یہاں آنے پر تیار نہ ہوں تو اپنی شکست تسلیم کر لیں (”شیر بیشہ“ کی یہ شیری بھی قابل غور ہے کہ وہ کانپور سے ملے ہوئے شہر فتنور میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کو مناظرے کیلئے چیلنج کر رہے تھے مگر یہ ہمت نہیں پڑتی کہ وہ خود کانپور جا کر چیلنج کریں) حشمت علی خان صاحب کی یہ ڈیگیں شہر فتنور کے اہل حق کئی روز تک متواتر سنتے رہے اور پھر انہوں نے بالکل ہی رازدارانہ طور پر اسکا ایک حل بھی سوچ لیا اور چپکے سے بذریعہ تار ”مناظر اہل سنت“ حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے تشریف لانے کی درخواست کر دی جسے مولانا نے بلانے والوں سے قدیم تعلق کی بنا پر قبول بھی فرمایا اور تار ہی سے جواب دیا کہ میں ”کاکا میل سے فتنور پہنچ رہا ہوں“ حالات کے اس پس منظر سے راقم السطور بے خبر تھا۔ اسے تو صرف اتنی ہی خبر تھی کہ فتنور میں ”شیر بیشہ“ کی اشتعال انگیزیوں کی وجہ سے ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے اور بس۔ اسی موقع پر ایک روز والد صاحب نے احقر کو بلایا اور پوچھا کہ الہ آباد میں ”میر مسیتا“ کی مسجد کے نیچے جو دکاندار ہیں انکا حلیہ و صورت تمہارے ذہن میں ہے؟ احقر نے اثبات میں جواب دیا کہ ہاں

اچھی طرح ہے!

تب فرمایا کہ تم اسی وقت اسٹیشن چلے جاؤ ابھی ”کالکا میل“ سے اسی حلیہ کے ایک مہمان آرہے ہیں تم انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے آؤ۔ ہم لوگ اس وقت فتحپور کے محلہ ”خیلدار“ میں رہتے تھے۔ جہاں محرک تحریک ندوۃ العلماء حضرت مولانا شاہ سید ظہور الاسلام صاحب علیہ الرحمۃ کا مزار بھی ہے۔ یہ محلہ شہر کے ایک گوشہ میں پڑتا تھا۔ یہاں سے اسٹیشن آنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ باہر ہی باہر تھا۔ دوسرا راستہ وسط شہر سے گذرتا ہوا تھا۔ حضرت والد صاحب نے ازراہ احتیاط مجھے تاکید فرمادی تھی کہ مہمان محترم کو اپنے گھر تک باہر والے راستے ہی سے لایا جائے۔ یہ احتیاط و رازداری اس درجہ ملحوظ رکھی گئی تھی کہ اسٹیشن جاتے جاتے بھی احقر کو اس بات سے بے خبر رکھا گیا تھا کہ یہ آنے والے مہمان کون صاحب ہیں۔  
سلسلہ میں تشریف لارہے ہیں۔ اور یقیناً اسی وجہ سے خود اسٹیشن جانے مامور کیا گیا تھا۔

اسی بے خبری کے عالم میں احقر ”کالکا میل“ سے آنے وا۔

کیلئے ٹرین کے مقررہ وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا۔

”کالکا میل“ دہلی، ہوڑہ لائن پر چلنے والی بہت پرانی ٹرین ہے اور اسکی آمد و رفت کے اوقات بھی شاید روز ازل سے ایک ہی چلے آرہے ہیں۔ یہ ٹرین آج کل جس وقت فتحپور پہنچتی ہے، اب سے ساٹھ سال پہلے بھی اسی وقت پہنچتی تھی (سہ پہر کو چار بجے کے قریب دہلی سے آنے والی یہ ٹرین فتحپور پہنچتی تھی) ٹرین کے لیٹ ہو جانے کی جو بیماری آجکل لگی ہوئی ہے یہ اس وقت ماورائے تصور تھی، اسٹیشن پر احقر کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کہ ٹرین آگئی۔ احقر کی مجلس نگاہیں والد صاحب کے بتائے ہوئے حلیے والے مہمان کو تلاش کر رہی تھیں کہ پلیٹ فارم کے اسی حصہ میں جہاں باہر جانے کا گیٹ ہوتا ہے اور مسافروں سے ٹکٹ لینے والائی لی کھڑا ہوتا ہے اسی جگہ ٹرین کے ایک ڈبے سے اسی حلیہ کے ایک صاحب ٹرین سے اترے، احقر نے ان سے سلام و مصافحہ کیا اور عین اسی وقت حضرت مولانا عبدالحید صاحب مدظلہ (۱) جو فتحپور میں احقر کے استاد تھے وہ نظر آگئے جو اسی ”کالکا میل“ سے الہ آباد جا رہے تھے، انھوں نے جلدی جلدی حضرت مولانا سے سلام و مصافحہ کیا اور ٹرین پر سوار ہو گئے۔ احقر اپنے مہمان محترم کو حسبِ ہدایت باہر والے راستے سے اپنے گھر محلہ خیلدار لے گیا جہاں والد محترم علیہ الرحمہ بعض

(۱) انفس کہ حضرت مولانا اس مضمون کی اشاعت سے قبل انتقال فرما گئے۔

دوسرے اہل شہر کے ساتھ ان مہمان محترم کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ یہ تھی حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے پہلی تقریب ملاقات۔

اس وقت حضرت مولانا نعمانی کا قیام ہمارے ہی گھر پر ہوا تھا احقر نے شعور کی آنکھیں جب کھولی ہیں شہر الہ آباد کی فضا میں ”دیوبندیت، بریلویت“ کی نزاعی بحثوں اور اشتہار بازیوں نے ایک الجھل پیدا کر رکھی تھی جس کا قدرتی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ان مباحث کا احقر کو اپنی بے شعوری ہی کے دور میں شعور پیدا ہو گیا تھا اور بچپن ہی سے احقر کو علماء حق سے ایک عقیدت اور اس عقیدت کے تحت انکی خدمت کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اسلئے احقر نے بھی حضرت مولانا کی خدمت گذاری نہایت شوق و ذوق کے ساتھ کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ”شیر بیشہ“ (حشمت علی صاحب) کو اطلاع دی گئی کہ مناظر اہل سنت فاتح بریلی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی تشریف لے آئے ہیں اب آپ ان سے مناظرہ کرنا چاہیں تو کر لیں یہ مولانا نعمانی جیسا کہ آپ کو بذات خود علم ہے حضرت تھانوی (علیہ الرحمہ) کے نمائندہ و وکیل ہیں جنھیں آپ اور آپ کے سرگروہ شہزادہ اعظم حضرت جناب حامد رضا خان صاحب بھی ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں لاہور کے مشہور و معروف مناظرہ میں حضرت تھانوی (علیہ الرحمہ) کا نمائندہ و وکیل تسلیم کر چکے ہیں جس مناظرہ کے حکم و صدر ڈاکٹر اقبال وغیرہ جیسے حضرات تھے۔

”شیر بیشہ“ کو جب پوری طرح یقین ہو گیا کہ مناظرہ کا یہ پیغام وہ خواب میں نہیں سن رہے ہیں بلکہ واقعہ یہی ہے کہ بالکل بے خبری میں ہوا یہی ہے کہ اس وقت فتحپور میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تشریف لائے ہیں اور مناظرہ کے پورے امکانات پائے جا رہے ہیں تو موصوف کی ساری شیریں، رو باہی میں تبدیل ہو گئی اور اہل سنت کی طرف سے پہنچائے ہوئے پیغام کا جواب یوں دیا کہ مولانا منظور صاحب کو مناظرہ کا چیلنج نہ دوں گا، ہاں اگر وہ مجھے چیلنج کریں گے تو مناظرہ کر لوں گا۔ شیر بیشہ کا یہ جواب اسلئے تھا کہ انھیں حضرت مولانا نعمانی کے مزاج و فکر کی تبدیلی کا اندازہ پوری طرح ہو چکا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ یہ مولانا نعمانی اب وہ نعمانی نہیں ہیں جنھوں نے سنبھل کے مناظرہ میں اپنے بالمقابل کسی مناظر کو سنبھلنے نہ دیا تھا اور خود میرے استاد محترم و مکرّم رحمہ اللہ صاحب کو نوٹس دیکر میدان مناظرہ میں آنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ بالکل بادل ناخواستہ رحمہ اللہ! رحمہ اللہ کی فریاد کرتے ہوئے میدان مناظرہ میں آگئے تھے لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان سے مناظرہ کر سکیں اسلئے ان کی جگہ پر مجھے کھڑا ہونا پڑا

تھا۔

شیر بیشہ کو مناظرہ لاہور بھی یاد تھا کہ کس طرح ان مولانا منظور نے اُس موقع پر ہم لوگوں کی ہر تنگی بے تکی شرطوں کو مان لینے کے بعد یہ کہہ کر مناظرہ شروع کر دیا تھا کہ اب شرطوں کا قصہ ختم کیجئے۔ میں بلا شرط مناظرہ شروع کرتا ہوں۔

چنانچہ یہی ہوا کہ حضرت مولانا نعمانی اپنی فکری و مزاجی تبدیلی اور ملک کی نازک صورت حال کے احساس کی وجہ سے اب مناظرہ کے لئے اقدام اور پہل کو تقاضائے وقت کے خلاف سمجھ رہے تھے، انھوں نے شیر بیشہ کے فرار و گریز کو سمجھ لینے کے باوجود یہی جواب دیئے کا فیصلہ فرمایا کہ

”اب وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ اسلئے مناظرہ کا چیلنج تو میں نہ ۱۰۰ لگا لیکہ۔ اگر

حشمت علی صاحب مناظرہ پر آمادہ ہیں تو میں ان کی جوابدہی کے

تسل کر سکتا ہوں۔“

شیر بیشہ کی خوش قسمتی کہنے یا کہنے کہ ”بلی کے بھاگوں چہ رو باہی کام آگئی اور سرزمین فتحور“ فاتح بریلی کی ”فتح فتحور“ کا نظارہ۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

تاہم حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ نے علماء حق کے مسلک کی وضاحت اور اتمام حجت کے لئے فتحور میں دو روز قیام فرمانا منظور فرمایا جس کی وجہ سے ”شیر بیشہ“ کو خوشی میں بغلیں بجانے اور یہ کہنے کا موقع نہ مل سکا کہ مجھ سے مناظرہ نہ کیا اور راہ فرار اختیار کر لی۔ چنانچہ دو روز بعد نماز عشاء سید واڑہ کے قریب دلالوں کی مسجد میں حضرت مولانا کا ایمان افروز اور شرک سوز بیان ہوا۔

پہلے دن کا بیان کلمہ طیبہ کے جزو اول ”لا الہ الا اللہ“ پر اثبات توحید اور ابطال شرک سے متعلق تھا۔ اور دوسرے دن کا بیان کلمہ طیبہ کے جزو دوم ”محمد رسول اللہ“ پر تھا جس میں حضور سرور کائنات ﷺ کی نبوت و رسالت اور ختم نبوت و رسالت پر ایمان لانے کی تلقین اور اتباع سنت و رد بدعت کا بیان تھا۔

ان دونوں بیانوں کا خاص فائدہ یہ ہوا کہ اہل شہر کے لئے ہر دو فریق کی تقریروں کے

موازنہ و تقابل کا موقع مل گیا جسکی وجہ سے انھیں پوری بصیرت کیساتھ حق اور حقیقت تک پہنچنے کا راستہ مل گیا۔

چنانچہ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اسوقت اگرچہ اہل شہر فریقین کے دو مشہور مناظرہ کے پہلوانوں کے دنگل کا تماشا نہیں دیکھ سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے جذبات پر اس بھی پڑ گئی ہو لیکن ہر دو فریقین کی تقریروں کے تقابل و موازنہ سے جو دور رس اور دیر پا فائدہ پہنچا وہ ایسے کسی بھی مناظرہ سے نہیں پہنچ سکتا تھا جو عام طور پر ایک منصوبہ بند اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت بڑی ہنگامہ خیزی کے بعد شروع کیا جاتا ہے اور پھر کسی نتیجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی شرانگیزی اور ہل بازی کر کے نقص امن کے اندیشے میں ختم بھی کر دیا جاتا ہے۔ فقہور میں بھی امکان یہی تھا کہ اگر مناظرہ کی بساط بچھ بھی جاتی تو وہ مناظرہ کسی نتیجہ اور فیصلہ تک ہرگز نہ پہنچتا، مولانا نعمانی علیہ الرحمہ شریعہ کی رو باہی حیلہ سازیوں سے اچھی طرح واقف تھے اسلئے انھوں نے بے نتیجہ ہنگامہ بازی کی راہ اختیار ہی نہیں کی۔

حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ جو بجا طور پر اس دور میں مناظر اہل سنت اور فاتح بریلی تھے راقم طور کی ان سے یہ پہلی ملاقات بھی اس طرح ہوئی تھی کہ مناظرہ تو نہیں ہو سکا تھا لیکن ایک حد تک مناظرہ ہی جیسا لطف حاصل ہو گیا تھا۔

اس ملاقات کے بعد احقر کی باقاعدہ عربی تعلیم کا دور شروع ہو گیا اور بغرض تعلیم فقہور سے چل کر کچھ دنوں کے لئے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں، شرح مائے عامل اور فصول اکبری وغیرہ کی جماعت میں شریک رہا، جامع العلوم کے صدر مدرس اسوقت مولانا وصی علی صاحب علیہ الرحمہ ملیح آبادی تھے اور حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے مشہور خلیفہ و مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ اس کے سرپرست تھے۔

جامع العلوم میں ہم دونوں بھائیوں کا قیام تقریباً ایک ہی مہینہ تک رہا ہو گا کہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جانے کا فیصلہ ہو گیا اور احقر اپنے برادر محترم مولانا جامی صاحب علیہ الرحمہ کے ہمراہ مظاہر علوم سہارنپور پہنچ گیا۔

یاد پڑتا ہے کہ مظاہر علوم کے زمانہ قیام میں حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے تین بار ملاقات ہوئی تھی جن میں سے دو بار کی ملاقات تو سہارنپور میں ہوئی تھی اور ایک بار کی ملاقات بریلی میں ہوئی تھی جہاں اسوقت مولانا کا قیام تھا، پہلے ذکر اس بریلی کی ملاقات کا پڑھ لیجئے۔

۱۳۶۳ھ میں احقر ایک سال کیلئے دارالعلوم دیوبند میں بھی زیر تعلیم رہا تھا۔ یہ سال

مشکوٰۃ شریف کی تعلیم کا تھا، مشکوٰۃ شریف وہاں احقر نے حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ سے پڑھی تھی۔ اسی وقت دارالعلوم کے بعض ساتھیوں کے ساتھ مدرسہ اشاعت العلوم بریلی سے سرکاری نصاب کے مطابق امتحان عالم کا فارم احقر نے بھی بھر دیا تھا۔ امتحان کا مرکز بریلی تھا اسلئے امتحان کے موقع پر بریلی جانا ہوا تھا، خیال ہوا کہ حضرت مولانا سے بھی ملاقات کر لی جائے، غالباً بعد نماز عصر دولت خانہ پر حاضر ہوا، کٹڈی کھٹکھٹائی تو بذات خود حضرت مولانا ہی باہر تشریف لے آئے اور بے سان و گمان مجھے دیکھ کر تعجب کے انداز میں دریافت فرمایا کیسے آنا ہوا؟ احقر نے بے ساختہ دبے تکلف عرض کر دیا کہ

مدرسہ اشاعت العلوم میں سرکاری امتحانات ہونے والے ہیں، عالم کا امتحان دینے آیا ہوں۔ احقر کی زبانی سرکاری امتحان دینے کی بات سنا کر حضرت مولانا کو جیسے ایک دھکا سا لگا اور ایک عجیب کیفیت و انفعال رنج و صدمہ کے ساتھ بیساختہ ان کی زبان سے،

اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ

مولانا کا یہ صدمہ آمیز تاثر دیکھ کر احقر کو بھی ندامت ہو

پہلے سے تھا ہی کہاں ورنہ عالم کے امتحان کا ذکر کرنا ہی کیا ضروری نہ

ان سرکاری امتحانات اور اس قسم کی سرکاری ملازمتوں سے معصوم، رہے۔ سادہ سادہ کامزاج بھی تھا جو حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے طرز عمل سے بے ساختہ ظاہر ہو گیا۔ ان حضرات کی فکر یہی تھی کہ مدرسوں کے یہ بوریا نشین اپنی اصل عزت و مقام اسی بوریا نشینی ہی میں سمجھیں، عربی مدارس کے ان طلباء کا اصل مقصد صرف خدمت دین ہی ہونا چاہئے۔ دنیا طلبی کی بنیاد پر قائم ملک کی عصری تعلیم گاہیں نہیں۔ خود احقر بھی یہی سمجھتا ہے کہ ہمارے ان اکابر ہی کی فکر حق اور قابل قبول ہے۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ اسی موقع پر اپنے اس امتحان عالم سے متعلق یہ دلچسپ لطیفہ بھی ذکر کر دوں کہ خدا تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ اسی عالم کا سرٹیفکیٹ کیسے وقت میں احقر کے لئے کارآمد ثابت ہوا۔

۱۳۹۰ھ میں احقر جب ”مفتی شہر آگرہ“ کی حیثیت سے دارالافتاء جامع مسجد جہاں آرا سے وابستہ ہوا تو ایک روز شہر کے ایک ملی کارکن نے باتوں باتوں میں یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ جس جگہ پر آپ کا تقرر ہوا ہے اس جگہ کے لئے درخواستیں تو چند اور بھی تھیں لیکن چونکہ آپ کی درخواست کے ساتھ بریلی شریف اور دیوبند شریف دونوں ہی جگہوں کی سندیں تھیں تو یہی سمجھا گیا کہ یہ ”صاحب“ معتدل ہوں گے اور آپ کے تقرر کی سفارش کر دی گئی۔



موازنہ و تقابل کا موقع مل گیا جسکی وجہ سے انھیں پوری بصیرت کیساتھ حق اور حقیقت تک پہنچنے کا راستہ مل گیا۔

چنانچہ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اسوقت اگرچہ اہل شہر فریقین کے دو مشہور مناظرہ کے پہلوانوں کے دنگل کا تماشا نہیں دیکھ سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے جذبات پر اس بھی پڑ گئی ہو لیکن ہر دو فریقین کی تقریروں کے تقابل و موازنہ سے جو دور رس اور دیرپا فائدہ پہنچا وہ ایسے کسی بھی مناظرہ سے نہیں پہنچ سکتا تھا جو عام طور پر ایک منصوبہ بند اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت بڑی ہنگامہ خیزی کے بعد شروع کیا جاتا ہے اور پھر کسی نتیجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی شرانگیزی اور ہلڑ بازی کر کے نقص امن کے اندیشے میں ختم بھی کر دیا جاتا ہے۔ فتحپور میں بھی امکان یہی تھا کہ اگر مناظرہ کی بساط بچھ بھی جاتی تو وہ مناظرہ کسی نتیجہ اور فیصلہ تک ہرگز نہ پہنچتا، مولانا نعمانی علیہ الرحمہ شیر بیشہ کی رو باہی حیلہ سازیوں سے اچھی طرح واقف تھے اسلئے انھوں نے بے نتیجہ ہنگامہ بازی کی راہ اختیار ہی نہیں کی۔

حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ جو بجا طور پر اس دور میں مناظر اہل سنت اور فاتح بریلی تھے راقم سطور کی ان سے یہ پہلی ملاقات بھی اس طرح ہوئی تھی کہ مناظرہ تو نہیں ہو سکا تھا لیکن ایک حد تک مناظرہ ہی جیسا لطف حاصل ہو گیا تھا۔

اس ملاقات کے بعد احقر کی باقاعدہ عربی تعلیم کا دور شروع ہو گیا اور بغرض تعلیم فتحپور سے چل کر کچھ دنوں کے لئے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں، شرح مآۃ عامل اور فصول الہری وغیرہ کی جماعت میں شریک رہا، جامع العلوم کے صدر مدرس اسوقت مولانا وصی علی صاحب علیہ الرحمہ ملیح آبادی تھے اور حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے مشہور خلیفہ و مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ اس کے سرپرست تھے۔

جامع العلوم میں ہم دونوں بھائیوں کا قیام تقریباً ایک ہی مہینہ تک رہا ہو گا کہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جانے کا فیصلہ ہو گیا اور احقر اپنے برادر محترم مولانا جامی صاحب علیہ الرحمہ کے ہمراہ مظاہر علوم سہارنپور پہنچ گیا۔

یاد رہتا ہے کہ مظاہر علوم کے زمانہ قیام میں حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے تین بار ملاقات ہوئی تھی جن میں سے دو بار کی ملاقات تو سہارنپور میں ہوئی تھی اور ایک بار کی ملاقات بریلی میں ہوئی تھی جہاں اسوقت مولانا کا قیام تھا، پہلے ذکر اس بریلی کی ملاقات کا پڑھ لیجئے۔

۱۳۶۳ھ میں احقر ایک سال کیلئے دارالعلوم دیوبند میں بھی زیر تعلیم رہا تھا۔ یہ سال

ک

وہ

خود

تھا اور

لیکن و

مشکوٰۃ شریف کی تعلیم کا تھا، مشکوٰۃ شریف وہاں احقر نے حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ سے پڑھی تھی۔ اسی وقت دارالعلوم کے بعض ساتھیوں کے ساتھ مدرسہ اشاعت العلوم بریلی سے سرکاری نصاب کے مطابق امتحان عالم کا فارم احقر نے بھی بھر دیا تھا۔ امتحان کا مرکز بریلی تھا اسلئے امتحان کے موقع پر بریلی جانا ہوا تھا، خیال ہوا کہ حضرت مولانا سے بھی ملاقات کر لی جائے، غالباً بعد نماز عصر دولت خانہ پر حاضر ہوا، کندی کھٹکٹائی تو بذات خود حضرت مولانا ہی باہر تشریف لے آئے اور بے سان و گمان مجھے دیکھ کر تعجب کے انداز میں دریافت فرمایا کیسے آتا ہوا؟ احقر نے بے ساختہ دبے تکلف عرض کر دیا کہ

مدرسہ اشاعت العلوم میں سرکاری امتحانات ہونے والے ہیں، عالم کا امتحان دینے آیا ہوں۔ احقر کی زبانی سرکاری امتحان دینے کی بات سنا کر حضرت مولانا کو جیسے عجیب کیفیت و انفعال رنج و صدمہ کے ساتھ بیساختہ ان کی زبان۔

اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ

مولانا کا یہ صدمہ آمیز تاثر دیکھ کر احقر کو بھی ندامت ہوئی، اس

پہلے سے تھا ہی کہاں ورنہ عالم کے امتحان کا ذکر کرنا ہی کیا ضروری تھا؟

ان سرکاری امتحانات اور اس قسم کی سرکاری ملازمتوں سے متعلق ہمارے مشائخ و اکابر کا مزاج یہی تھا جو حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے طرز عمل سے بے ساختہ ظاہر ہو گیا۔ ان حضرات کی فکر یہی تھی کہ مدرسوں کے یہ بوریا نشین اپنی اصل عزت و مقام اسی بوریا نشینی ہی میں سمجھیں، عربی مدارس کے ان طلباء کا اصل مقصد صرف خدمت دین ہی ہونا چاہئے۔ دنیا طلبی کی بنیاد پر قائم ملک کی عصری تعلیم گاہیں نہیں۔ خود احقر بھی یہی سمجھتا ہے کہ ہمارے ان اکابر ہی کی فکر حق اور قابل قبول ہے۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ اسی موقع پر اپنے اس امتحان عالم سے متعلق یہ دلچسپ لطیفہ بھی ذکر کر دوں کہ خدا تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ اسی عالم کا سرٹیفکیٹ کیسے وقت میں احقر کے لئے کارآمد ثابت ہوا۔

۱۳۹۰ھ میں احقر جب ”مفتی شہر آگرہ“ کی حیثیت سے دارالافتاء جامع مسجد جہاں آرا

سے وابستہ ہوا تو ایک روز شہر کے ایک ملی کارکن نے باتوں باتوں میں یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ جس کے پر آپ کا تقرر ہوا ہے اس جگہ کے لئے درخواستیں تو چند اور بھی تھیں لیکن چونکہ آپ کی خواست کے ساتھ بریلی شریف اور دیوبند شریف دونوں ہی جگہوں کی سندیں تھیں تو یہی مانگیا کہ یہ ”صاحب“ معتدل ہوں گے اور آپ کے تقرر کی سفارش کر دی گئی۔

ان صاحب کی زبانی یہ بات سن کر مجھے خود غور کرنا پڑا کہ میں نے اپنی درخواست کے ساتھ بریلی شریف کی سند کہاں پیش کی ہے۔ بہت غور و فکر کے بعد یہ معممہ حل ہو سکا اور مجھے یاد آیا کہ عالم کا جو امتحان میں نے مدرسہ اشاعت العلوم بریلی سے دیا تھا اس کے سرٹیفکیٹ میں تو مدرسہ کا نام دیا ہوا ہے، وہی میرے لئے بریلی شریف کی سند ہے۔

اس طرح بریلی شریف کا وہ امتحان ایسے وقت میں کام آگیا کہ اس غلط فہمی میں مفتی شہر کی جگہ پر میرا تقرر ہو گیا اور پھر اس جگہ پر میرا قیام اتنی مدت تک ممتد ہوا کہ احقر سے پہلے دور میں اس منصب پر اتنی طویل مدت تک کسی بھی ”مفتی شہر“ کا قیام نہیں رہا تھا۔

بات کا سلسلہ ادنیٰ مناسبت سے ایک دوسرے موضوع سے جڑ گیا اور بات کچھ دور چلی گئی۔ ذکر یہ چل رہا تھا کہ فتخوڑ کی پہلی یادگار و دلچسپ تقریب ملاقات کے بعد اپنے زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا نعمانی سے تین بار ملاقات و زیارت کی نوبت آئی تھی جن میں سے بریلی کی یہ ملاقات طالب علمی کے آخری دور کی تھی کہ اسی سال میں عالم کا یہ امتحان بھی دیا تھا اور اسی سال مظاہر علوم میں دورہ حدیث بھی پڑھ رہا تھا۔ اس ملاقات کے علاوہ اس سے پہلے دو ملاقاتیں مظاہر علوم میں ہو چکی تھیں۔

ان میں سے پہلی ملاقات غالباً ۱۳۵۹ھ (۱۹۳۹ء) میں ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت مولانا نعمانی اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے ”تلاش مرشد“ (۱) میں سہارنپور اور اطراف سہارنپور (تھانہ بھون، دیوبند اور رائے پور) کا سفر کیا تھا۔

اس ملاقات کے بھی کچھ نقوش ذہن میں محفوظ ہیں، یاد آتا ہے کہ ایک مجلس میں ان دونوں حضرات کی گفتگو میں درس نظامی نصاب کی بعض کتابوں کے غیر ضروری ہونے کی بات بھی آئی تھی، شرح جامی اور مختصر المعانی کو یہ حضرات قابل حذف فرما رہے تھے۔

حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے مظاہر علوم میں دوسری ملاقات اس وقت ہوئی ہے جب مولانا نعمانی علامہ مودودی کی بیعت فتح کر کے حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمہ کی خدمت میں تشریف لائے تھے اور حضرت شیخ الحدیث صاحب کے مکان کے قریب اس کمرہ میں ٹہرائے گئے تھے جس میں مولانا اظہار الحسن صاحب کاندھلوی اپنی طالب علمی کے دور میں رہا کرتے تھے، احقر نے خدمت میں حاضری دی تھی اور شاید دو باتیں دریافت کی تھیں، پہلی بات تو یہ تھی کہ آپ نے ”جماعت اسلامی“ سے علیحدگی کیوں اختیار کی؟ مگر مولانا نے اس سوال کا کوئی صاف

اور اطمینان بخش جواب نہیں دیا تھا (کیونکہ ابھی اسے صیغہ رازی میں رکھنا چاہتے تھے)۔  
احقر کا دوسرا سوال مودودی صاحب کے قدر قبضہ سے کم داڑھی سے متعلق تھا (اس وقت تک موصوف کی ڈاڑھی قدر قبضہ سے کم ہی تھی [۱]) اس سوال کا مختصر جواب مولانا نے یہ دیا تھا کہ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام احمد علیہ الرحمہ کے یہاں قدر قبضہ کی شرط نہیں ہے۔ احقر معمولی درجہ کا طالب علم تھا۔ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا تھا لیکن بعد کو جب استاذ محترم مفتی محمود حسن گنگوہی علیہ الرحمہ سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ شیخ ابن حمام نے فتح القدیر میں ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے کہ ان سب کے نزدیک قدر قبضہ سے کم داڑھی رکھنا جائز نہیں ہے۔ [۲]

۲۰ شعبان ۱۳۶۵ھ میں مظاہر علوم کی تعلیم ختم ہو گئی تھی اور اسی ماہ کی ۲۳ تاریخ کو احقر کی ازدواجی زندگی شروع ہو گئی۔ احقر کی شادی عم محترم جناب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی (جواب سے دو سال پہلے ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ میں گئیں رحمہما اللہ وغیرہا)

احقر کی یہ شادی بھی حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ ذریعہ بنی کیونکہ عم محترم حضرت صوفی صاحب علیہ الرحمہ حضرت مولانا نعمان در سرت و ندوی کے ایسے دوستوں میں سے تھے جن کے ساتھ ان حضرات کی عقیدت بھی وابستہ تھی۔ اسی تعلق کی وجہ سے حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ احقر کے ساتھ بزرگانہ شفقت و محبت کا معاملہ رکھتے تھے جس کا کچھ اندازہ حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کے درج ذیل مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے۔

[۱] فاضل مضمون نگار کی یہ اطلاع صحیح نہیں ہے۔ مودودی صاحب کی داڑھی اس وقت بقدر قبضہ اگر نہیں تو قریب قریب ضرور ہو چکی تھی۔ یہ راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آل محترم کی نگاہ سے والد ماجد کی ”سرگزشت“ نہیں گزری ہے۔ ورنہ اس اطلاع کی بھی تصحیح ہو جاتی اور اسکے علاوہ بھی اس سلسلے کے بعض سوالات جو اس مضمون میں آگے آرہے ہیں وہ بھی نہ پیدا ہوتے۔ (مرتب)

[۲] یقیناً کوئی خاص وجہ تھی کہ یہ مختصر جواب ملا۔ ورنہ ”سرگزشت“ میں اس اجماع کا حوالہ بھی مذکور ہے۔ اور مزید برآں اس کی رو سے والد ماجد نے ایک حدیث کا حوالہ دے کر مودودی صاحب سے ان کے استدلال کی کمزوری کا اعتراف بھی کرایا تھا۔

ناسمہ سبحانہ و تعالیٰ

لکھنؤ

۶۸۰/۵/۸

برادر مکرم و محترم مولانا عبد القدوس رومی صاحب زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

مجھے بہت ہی قلق ہے کہ آپ کل تشریف لائے اور میں اپنی معذوری کی وجہ سے آپ کا وہ اکرام اور راحت رسانی کا انتظام نہیں کر سکا جو ایک عام مہمان کا ہوتا ہے۔ آپ کا تو چند روز چند نسبتوں کا خاص حق تھا۔ اور عجیب اتفاق جو صاحب مرکز میں میرے مہمانوں کی خاص فکر رکھتے ہیں وہ کل وہاں موجود نہ تھے، میں نے ان کو پیغام بھیجا وہ مغرب کی نماز پڑھ کر میرے پاس آئے، میں نے ان کو آپ کے بارے میں بتلایا اور مرکز آپ کے پاس بھیجا واپس آکر بتلایا کہ معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مولانا کانپور کے ارادہ سے تشریف لے گئے، بہت ہی افسوس اور قلق ہوا، صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں، دعاؤں کا محتاج و طالب اور دل سے دعا گو ہوں،

والسلام

محمد منظور نعمانی

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس سے مقصود تو صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ احقر راقم السطور کا نیاز مندانہ و خادمانہ تعلق حضرت مولانا موصوف کے ساتھ بہت پرانا اور گونا گوں رہا ہے جسکی پوری تفصیل ایک علیحدہ مضمون کا تقاضا کرتی ہے۔ اسلئے بقیہ تفصیل کو فی الحال نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔

الفرقان کی پوری مدت اشاعت تو اس وقت تک تقریباً ۶۵ سال ہو چکی ہے اس طویل مدت میں الفرقان مختلف ادوار سے گزرا ہے جسکی تفصیل بطور اجمال یوں بیان کی جاسکتی ہے۔

پہلا دور جس میں ماہنامہ الفرقان جاری ہوا ہے، یہ دور ۱۳۵۳ھ سے شروع ہوتا ہے لیکن اس دور سے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے اس دور کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ اس دور کی تاریخ کا جائزہ لیا جاتا ہے تو تاریخ پیدہ دیتی ہے کہ حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت ۱۳۴۵ھ (مطابق ۱۹۲۷ء) میں پائی تھی۔

یہ دور ہندوستان میں اسلام اور پیروان اسلام کے لئے سخت قسم کی آزمائش کا دور تھا۔ مسلمانان ہند اس وقت متعدد اور مختلف فتنوں سے دوچار تھے جن میں سے کچھ فتنے داخلی تھے اور کچھ فتنے خارجی، خارجی فتنوں میں آریہ سماجیوں کی شدھی سنگٹھن تحریک ایک طرف سرفہرست

تھی اور دوسری عیسائی مشنری کی تبلیغی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔

اور داخلی فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ تھا جس نے ایک قادیانی مرزا کے روپ میں جنم لیا تھا لیکن اس ابوالفتن فتنہ قادیان کے ساتھ ساتھ ”رافضیت“ و ”رضا خانیت“ نام کی دو امہات الفتن کی خلاف توحید و سنت سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔

یہ وہی زمانہ تھا جب آل سعود کے پہلے سلطان سعود نے حجاز مقدس کے گورنر شریف مکہ کو معزول کر کے وہاں کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور محض جوش و جذبہ سے کام لیتے ہوئے حرمین کے مقابر و قبہ جات کے بے دھڑک انہدام کا اقدام کر ڈالا۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ اقدام عام مسلمانوں کے اشتعال و برہمی کا سبب بن گیا۔

اس مظاہرہ اشتعال و احتجاج میں یہ رافضیت و رضا خانیت فکری و عملی طور پر بالکل متفقہ و متحد بلکہ شیر و شکر کی طرح ”تا کس لگوید بعد ازیں من دیگر م تہ“

۱۳۴۵ھ جب حضرت مولانا نعمانی دارالعلوم سے فراغت

تشریف لائے ہیں اس وقت ملک کی فضا ان کی اشتعال انگیزیوں

گرمی و بخار سعودی حکومت کی بجائے علمائے دیوبند کے خلاف تہ

حضرت مولانا نعمانی نے فضا کی اس گرمی کو اپنی دینی و اصلاحی سرریوں سے سازگار سمجھا کہ اہل تجربہ یہی کہتے ہیں کہ لوہا جس وقت گرم ہو ہتھوڑے کے زور سے اسے جس طرح چاہیں کارآمد بنا سکتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا نعمانی نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ فضا کی اس گرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی سرزمین بریلی سے توحید و سنت کی آواز بلند کی جائے اور انھوں نے بریلی میں قیام کر کے اسی بدعت خیز زمین میں توحید و سنت کی ختم پاشی کیلئے ۱۳۵۳ھ میں ماہنامہ الفرقان جاری فرمادیا جو نرم و گرم حالات سے گزرتے ہوئے بفضلہ تعالیٰ ۶۵ سال کی عمر طے کر چکا ہے۔

جن حضرات کو کسی دینی رسالہ کے نکالنے کا کوئی تجربہ ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو جنھیں دین و مذہب سے کوئی خاص تعلق اور لگاؤ نہیں ہے وہ کسی دینی رسالے کی خریداری کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں کسی دینی رسالے کے اجراء کا فیصلہ کر ڈالنا غیر معمولی ہمت کی بات ہے اور پھر اسے نہ صرف جاری کر دینا بلکہ ایک مدت تک مسلسل جاری رکھنا بہت صبر آزما اور بڑے دل گردے کا کام ہے۔

چنانچہ رسالہ الفرقان کو بھی بار بار نہایت درجہ دشوار اور صبر آزما مرحلوں سے گذرنا

پڑا تھا جس کی تفصیل الفرقان کے ابتدائی اداروں میں دیکھی جاسکتی ہے اور جس کا مختصر اجمالی تذکرہ حضرت مولانا نعمانی کی آخری کتاب تحدیثِ نعمت میں بھی آگیا ہے۔ ہم اس جگہ اسی تحدیثِ نعمت کے حوالہ سے اس دور کے مشاہیر اہل علم، اکابر ملت کی اس اپیل کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں جو انھوں نے الفرقان کے اہم مقصد اشاعت کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کی نصرت و حمایت کیلئے الفرقان ہی کے صفحات میں شائع کی تھیں۔

اس اپیل پر دستخط کنندگان اکابر و مشائخ حسب ذیل حضرات تھے۔

(حضرت مولانا سید) حسین احمد مدنی، (حضرت مفتی) محمد کفایت اللہ، (حضرت مولانا) شبیر احمد عثمانی، (حضرت مولانا حافظ) عبداللطیف، (ناظم اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری، (مولانا) حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی، (حضرت مولانا) سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، (حضرت مولانا) محمد اسعد اللہ صاحب، (حضرت مولانا) حبیب الرحمن صاحب اعظمی۔

اکابر ملت کی یہ اپیل الفرقان کے اسی دور اول میں شائع ہوئی تھی جب الفرقان کا مقصدِ وحید توحید و سنت کی تائید اور شرک و بدعت کی تردید کرنا تھا۔

اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اپنے دور اول میں الفرقان نے یہ دینی فریضہ باحسن وجہ انجام دیا تھا، اس نے اپنے اس ردِ شرک و یادگار دور میں توحید و سنت کے بالمقابل شرک و بدعت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو صرف روکا ہی نہیں بلکہ اسے پیچھے ڈھکیل کر توحید و سنت کی پیش قدمی کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا اس حقیقت کا اظہار خود حضرت مولانا نعمانی نے بھی ان لفظوں میں فرمایا، ”تحدیثِ نعمت“ میں فرماتے ہیں۔

الفرقان کا دور اولیٰ :- اب سے ساڑھے تیرہ سال پہلے محرم ۱۳۵۳ھ میں الفرقان جاری ہوا تھا، اس وقت اس نے مسلمانوں کی اصلاح اور خدمتِ دین کا ایک مخصوص و محدود دائرہ تھا یعنی مسلمانوں کے بعض خاص طبقوں کی اعتقادی اور عملی غلطیوں پر سنجیدہ بحث و تمحیص اور مدلل تنقید اور دین کے بارے میں ان کے افراط و تفریط کی تعلیط و تردید کرتے ہوئے صراطِ مستقیم کی طرف دعوت۔

الغرض اس ابتدائی دور میں یہی الفرقان کا خاص موضوع تھا، چند سال تک الفرقانِ اسی خصوصیت کے ساتھ جاری رہا اور تحدیثِ نعمت کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں جن خاص

مسائل بر الفرقان میں بحث کی گئی غالباً آئندہ ان پر کسی مزید غور و بحث کی ضرورت نہ ہوگی اور الفرقان میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہی انشاء اللہ ان مسائل و مباحث میں حرف آخر رہے گا۔  
(تحدیثِ نعمت ص ۸۳)

تحدیثِ نعمت کا مندرجہ بالا یہ اقتباس الفرقان بابت رجب ۱۳۶۶ھ سے ماخوذ ہے جب کہ الفرقان کے دورِ اولیس کے ان مضامین کی یاد تازہ اور ناظرین کے دل و دماغ میں محفوظ تھی۔ لیکن اب جبکہ ۱۳۸۱ھ چل رہا ہے اور تحدیثِ نعمت کے مندرجہ بالا اقتباس کی تحریر کو ۵۲ سال یعنی نصف صدی سے بھی دو سال کی مدت زائد گزر چکی ہے، پچھلے دور میں لکھے ہوئے مضامین کا اس دور میں دستیاب ہونا نہایت درجہ دشوار ہے بالخصوص ایسی صورت میں کہ خود الفرقان نے اب اس قسم کے نئے مضامین کی یا اپنی ہی فائیل سے پرانے مضامین کی اشاعت کو بالکل ہی غیر ضروری سمجھ لیا ہے جن کی اشاعت کو اکابر ملت کی اپیل کے ذریعہ<sup>۱</sup> کر لیا تھا۔ (۱)

تحدیثِ نعمت کے مذکورہ بالا اقتباس کی خط کشیدہ آخری سطور احق محسوس ہوتی ہیں، یہ حقیقت مسلم کہ الفرقان کے اولین دور<sup>۲</sup> شرک سے متعلق جو مضامین شائع ہوئے تھے وہ اسکے بعد آئندہ ہی یقیناً اسی صورت میں کہ بعد کے زمانے میں جب بھی ان مضامین کی ضرورت ہوتی انھیں دوبارہ شائع بھی کیا جاتا، صرف الفرقان کی پرانی فائلوں میں ان کا محفوظ ہونا ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا اور نہ ظاہر ہے کہ رضا خانیت و بریلویت کی تردید اور حضراتِ علمائے دیوبند کے مسلک صحیح اور عقائد حقہ کی صفائی و ترجمانی کا کام تو اس سے پہلے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہانپوری اور اولین مناظر اہل سنت حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری انجام دے چکے تھے۔

(۱) کوائف میں ایسا نہیں ہے ”فیصلہ کن مناظرہ“ جو اولیس تحریر ہے۔ برابر کتابی شکل میں شائع کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں ”شاہ شہید پر معاندین اہل بدعت کے الزامات“ پھر ”بریلوی فتہ کا نیا روپ“ تو الفرقان کے نئے دور ہی میں لکھی گئی ہے۔ اور برادر م مولانا محمد عارف سنہلی جواب اس سلسلے کے وارث ہیں انکے اس سلسلے کے مضامین الفرقان میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور تقویۃ الایمان پر مولانا نور الحسن راشد کا طویل قسط وار مضمون بھی اسی دور کی چیز ہے۔ اور سب سے آخر میں مولانا نسیم احمد فریدی نمبر میں شاہ شہید ہی کے بارے میں خود صاحب الفرقان نے جو کچھ لکھا ہے وہ تو انکے دورِ اول کی یاد تازہ کر دینے والی چیز ہے۔ مزید یاد آیا کہ الفرقان کا انتخاب نمبر (۳۷) جو پرانے مضامین الفرقان کا انتخاب تھا اس میں بھی دورِ اول کے مضامین کا ایک پورا باب



مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر ”تحدیثِ نعمت“ کا ایک اقتباس اور نقل کر دیا جائے جو حضرت مولانا نعمانی نے الفرقان کے دورِ اولین کے خاتمہ پر دوسرے دور کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔ عنوان ہے ”الفرقان کا دوسرا دور“ اس عنوان کے تحت مرقوم ہے ”الفرقان کی اشاعت کا سلسلہ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں شروع ہوا تھا اور اس کا ایک مخصوص اور محدود دائرہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ہوا، یہ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کا نفاذ تھا جسکے ذریعہ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو کچھ زیادہ حکومتی اختیارات منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا..... اس صورت حال کے پیدا ہوتے ہی یہ سوالات اٹھنے شروع ہوئے کہ ملک کی آزادی کی صورت میں مسلمانوں کا دینی مستقبل کیا ہوگا؟ اور مسلمانوں کو اس مستقبل کے تحفظ کیلئے کیا کرنا ہوگا؟ اس سوال کو اس وقت کے ایک نمایاں اہل قلم مولانا (علامہ) ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ میں بہت غیر معمولی انداز پر اٹھایا اور ایک عرصہ تک موضوع بنائے رکھا۔ موصوف کے اس سلسلہ مضامین نے اس عاجز کو متاثر کیا اور رفتہ رفتہ یہ ذہن بن گیا کہ چند اعتقادی اور عملی مسائل (مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہیں، غیر اللہ کو غائبانہ ندادینا، اہل قبور سے امداد چاہنا، غیر اللہ سے تقرب کیلئے جانور ذبح کرنا، ان کے نام پر نذر و سنت ماننا وغیرہ امور شرک۔ رومی) جن میں مسلمانوں کے بعض طبقے افراط و تفریط اور غلطیوں میں مبتلا ہیں انکی بابت اصلاحی جدوجہد تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھنے کے بجائے وہ میدانِ عمل اختیار کیا جانا چاہئے جسکے ذریعہ مسلمان آنے والے نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو سکیں۔ یہ عاجز محسوس کرتا ہے کہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بہت بروقت اور صحیح رہنمائی تھی اور اس کے ذریعہ اس بندہ پر ایک خیر کثیر کا دروازہ کھلا“

”اور پھر جب اس نئے ذہن اور تقاضے کے تحت اس بندے کے قدم اولاً اس راہ کی طرف اٹھ گئے جو اب اسکے نزدیک فکر و نظر کی ایک غلطی تھی یعنی مولانا (علامہ) ابوالاعلیٰ مودودی کے زیرِ قیادت جماعت اسلامی کی تاسیس، تب بھی توفیق الہی میری دستگیری کے لئے مہربان ہوئی اور بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میرے قدم واپس ہوں اور اگرچہ الٹے پاؤں واپسی کا یہ مرحلہ نفسیاتی طور پر بڑا سخت تھا اسلئے کہ اس جماعت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں، میں مودودی صاحب سے بھی کچھ آگے ہی تھا، نیز لوگوں کو بڑی قوت سے اسکی طرف دعوت دینی تھی اور اعتراضات کے مقابلے میں اس کی بھرپور مدافعت کی تھی مگر ایک

مختصر سی کشکش کے بعد اللہ نے میرے لئے یہ واپسی کا فیصلہ بھی آسان کیا“ (تحدیثِ نعمت ص ۷۹)۔

حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ نے مندرجہ بالا مختصر سے چند سطری مضمون میں غایت اجمال و ایجاز سے کام لیتے ہوئے علامہ مودودی سے اپنے متاثر ہونے اور پھر ان کے ہمنوا، ہم خیال اور ہمسفر ہونے کی خاصی طویل داستان کو بالکل ہی اشاروں اشاروں میں اس درجہ مختصر فرمادیا ہے کہ اس سے صحیح صورت حال کی عکاسی نہیں ہو پاتی۔ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں آیا تھا اسی دور میں علامہ مودودی نے اس ایکٹ کے مضمرات و اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا مسیحا بن کر ترجمان القرآن میں مضامین لکھنے شروع کئے تھے۔ ان مضامین کا جادو ایسا تھا جس نے مولانا نعمانی علیہ الرحمہ جیسے حق پسند، حق آشنا شخص

کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اب ملکی حالات اس بات کی اجازت نہ دے گے اسی مقصد و حید پر اب بھی قائم رہے اور دین الہی کی اشاعت، حفاظت میں اسی انداز سے سرگرم عمل رہے جسکے لئے وہ ابھی کچھ دستخط سے ایک پر زور و مؤثر اپیل شائع کر چکا ہے، کہ مولانا محمد منظور

جو کام کر رہے ہیں وہ ان کا ذاتی نہیں بلکہ خالص دینی کام ہے اور تائید اہل سنت و جماعت کے سلسلے میں جو خدمات وہ انجام دے رہے ہیں درحقیقت پوری جماعت کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ اب تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس فرض کفایہ کے حق میں بالکل سرسری قسم کی یہ تعبیر اختیار کر لینا کہ چند اعتقادی اور عملی مسائل جن میں مسلمانوں کے بعض طبقے افراط و تفریط اور غلطیوں میں مبتلا ہیں“ نامیہ تحریر فرمانا کہ ”یہ عاجز محسوس کرتا ہے کہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بہت بروقت اور صحیح رہنمائی تھی اور اسکے ذریعے اس بندے پر ایک خیر کثیر کا دروازہ کھلا“

یہ سب ایسی تعبیرات ہیں جو دل میں کھٹکتی ہیں ان سے اتفاق کر لینا کسی بھی ایسے شخص کیلئے مشکل ہو گا جو اپنے دل میں توحید خالص کی دعوت کا شوق اور شرک بواح سے بیزاری کا جذبہ رکھتا ہو (۱)۔

(۱) الفرقان [محترم نے ذرا ہی آگے چل کر خود ہی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان بیانات کی تحریر ”بر اور م یقین ارحس“ کے قلم سے ہے نہ کہ خود حضرت مولانا نعمانی کے قلم سے اس بنا پر ان تعبیرات کو اتنی اہمیت تو نہیں ملی جانتے تھے۔ محترم مضمون نگار نے اپنے اس اظہارِ باثا میں دیدی ہے۔ مزید برآں یہ خیال تو آں محترم کا خود بھی نہوگا۔ (بقیہ آئے)

”تحدیثِ نعت“ میں الفرقان کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار سے متعلق تفصیلات کے بعض حصے قابلِ غور ہیں جنکی وجہ سے الفرقان کے مختلف ادوار کا بیان ایک دوسرے سے ممیز نہیں ہو سکا ہے، الفرقان کے دوسرے دور کے بیان میں کچھ دور تک تو علامہ مودودی سے تاثر اور پھر بہت ہی سرسری طور پر جماعت کی تاسیس میں شرکت اور پھر اٹے پاؤں اس سے واپسی کا ذکر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں اور تبلیغی تحریک سے متاثر ہونے کا بیان شروع کر دیا ہے۔ پھر ”الفرقان کا دور جدید مقصد اور دعوت“ کا عنوان دیکر کچھ لکھا گیا ہے اور یہ تمام تفصیلات کچھ اس طرح لکھی گئی ہیں جس سے الفرقان کے بدلے ہوئے مختلف ادوار ایک دوسرے سے متماز و ممیز نہیں ہو سکے ہیں۔

احقر کی یادداشت کے مطابق علامہ مودودی سے حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کی اثر پذیری کی مدت کافی طویل رہی ہے، یہ اثر پذیری تو غالباً ۱۹۳۶ء ہی سے شروع ہو گئی تھی پھر ۱۹۴۱ء میں جماعت کی تاسیس ہوئی جس میں مولانا نعمانی نے علامہ مودودی کے شریکِ غالب کی حیثیت سے شرکت کی اور منتخب امیر المومنین کے ہاتھ پر بیعت کر کے کچھ وقت باقاعدہ رکن کی حیثیت سے گذارا تھا۔

اور جماعت سے علیحدگی کا مرحلہ بھی بتدریج طے ہو سکا تھا اسلئے اس دور کی روداد کا اس درجہ سرسری طور پر آنا کچھ عجیب سا لگا (۱)۔

مودودی صاحب سے اثر پذیری کے دور میں حضرت مولانا پر جس خیر کثیر کا دروازہ کھلا اسکی حقیقت بھی نہ کھل سکی کہ وہ خیر کثیر کیا تھا؟ اگر وہ خیر کثیر یہی تھا کہ حضرت مولانا نعمانی کو الفرقان کے دورِ اول میں اسکے مقصدِ وحید کے تحت توحید و سنت کے اثبات و تائید یا شرک و بدعت کی تردید پر کی جانے والی محنت و سعی کے رائیگاں جانے کا احساس ہو گیا تو یہ بات کسی

(بچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ) اور نہ ہونے کی گنجائش ہے۔ کہ حضرت مرحوم نے توحید کی دعوت اور شرک سے بیزاری کی بساطِ پلین دی تھی۔ بات بھرف میدانِ کار میں وسعت اور طریقِ کار میں تبدیلی کی تھی۔ مولانا مودودی کا ذوق اسے پسند نہیں کرتا تو یہ ایک الگ بات ہے۔ اور ان کا ذوق نہایت قابلِ احترام، ویسے خود اس تبدیل شدہ طریقِ کار کی زیادہ افادیت کا قول وہ فتح پور ہنسوا لے قے میں کر چکے ہیں۔

(۱) [الفرقان] مولانا نے محترم یہاں اپنے خاص ذوقی تاثر کے غلبے میں یہ فراموش کر گئے ہیں کہ ان کا موضوع ”تحدیثِ نعت“ پر تبصرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس تبصرے کی گنجائش بھی ہوتی تب بھی یہ شکایت بجا نہ تھی۔ اس لئے کہ ”تحدیثِ نعت“ اس تفصیل کا عمل نہ تھی، اور تفصیل کے خواہش مندوں کیلئے ”سرگزشت“ نامی کتاب بہت پہلے سے موجود تھی جس کا حوالہ تحدیثِ نعت میں بھی اسی مقصد سے دیا گیا ہے۔

طرح نہ تو معقول ہے نہ ہی قابل قبول (۱)۔

احقر کا اندازہ ہے کہ الفرقان کی تاریخ اور اسکے مختلف ادوار کی جو تفصیلات ”تحدیثِ نعمت“ میں مذکور ہوئی ہیں ان میں جا بجا جھول اور غلط بیانی اسوجہ سے راہ پاگئی ہوگی کہ یہ حصہ برادر گرامی مولانا عتیق الرحمن صاحب زید مجدد ہم کامرتب کیا ہوا ہے، بہتر صورت یہ ہوگی کہ آئندہ کسی موقع پر برادر موصوف الفرقان کی مجموعی خدمات اور اس کے علیحدہ علیحدہ ادوار کی تاریخ و تبصرہ از سر نو مرتب فرمادیں۔

تاریخ الفرقان کا مختصر و اجمالی جائزہ لینے پر احقر اپنے خصوصی ذوق کے تحت اس نتیجہ پر پہنچ سکا کہ الفرقان نے اپنی ۶۵ سالہ عمر میں جو روشن و تابندہ اور دیرپا دپائندہ کارنامے انجام دیئے ہیں اسکا زیادہ تر حصہ اسی دور اول سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی روشن و تابناک دور میں اہل شرک و اہل بدعت سے متعدد منہات  
شائع ہوئیں، ان فرقوں کی تردید میں متعدد علمی و تحقیقی مضامین شائع  
ضروریہ، اور شارع حقیقی جیسی تحقیقی کتابیں الفرقان کے اسی روشن دور  
اسی روشن دور میں الفرقان نے پہلے مجدد الف

ولی اللہ نمبر جیسے دستاویزی شاہکار نمبر نکالے جو آئندہ بھی ایک رہے۔  
گئے۔ اس لئے الفرقان کو مولانا نعمانی کا کارنامہ حیات قرار دیتے ہوئے ہمیں اسکے ابتدائی اولین دور ہی کو اس کا دورِ زریں ماننا پڑے گا۔ (۲)



(۱) الفرقان [نہیں۔ وہ خیر کثیر یہ نہیں تھا اور نہ ایسا سمجھنے کی کوئی گنجائش تحدیثِ نعمت کے جمل بیان میں ہی ہے۔ وہ خیر کثیر تحدیثِ نعمت ہی کے بیان کی روشنی میں وہ عملی دور تھا جو جماعت اسلامی کے بعد شروع ہوا۔ اور اسے حضرت والد ماجد اپنی زندگی کے تمام ادوار میں بیش قیمت ٹہراتے تھے۔

(۲) محترم مولانا کی نظر مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر کے سالہائے اشاعت پر نہیں رہی کہ یہ نمبر ۳۵ء کے بعد یعنی بالترتیب۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئے ہیں۔ یعنی وہی زمانہ جس میں مودودی صاحب سے گہرا اثر رہا۔

## جماعت اسلامی اور بریلویت سے متعلق مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اہم تصانیف

مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف  
حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی ایک اہم تصنیف، اپنے طرز کی پہلی کتاب جس میں مولانا مودودی  
مودودی صاحب کی ان باتوں اور لطایف کی نشاندہی کی ہے جو امت کے لئے اور بالخصوص اہل حقہ کے لئے  
زیغ و ضلال اور فتنہ کا باعث بن سکتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی مدوی کا بصیرت افروز پیش لفظ ہے ————— قیمت -/30

شاہ اسماعیل شہید اور معاندین اہل بدعت کے الزامات  
حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر معاندین اہل بدعت کے مکر وہ الزامات کا مدلل جواب — قیمت -/13

### فیصلہ کن مناظرہ

اکابر علماء دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب  
نیاڈیشن نئی کتابت کے ساتھ قیمت -/18

### بوارق الغیب

”علم غیب نبوی“ کی تردید میں مولانا نعمانیؒ کی معرکہ الآراء محققانہ تصنیف۔  
جلد دوم انتقاء اللہ جلد شائع ہو رہی ہے۔ 50/-

### تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات

اس میں تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات سے متعلق اہم مضامین جمع کر دئے گئے ہیں۔ قیمت -/11

### عقیدہ علم غیب مسئلہ حیات النبیؐ

قرآن وحدیث اور ارشادات صحابہؓ  
کی روشنی میں  
مسئلہ حیات النبیؐ پر اٹھائے جانے والے سوالات کا  
مدلل اور تسلی بخش جواب۔  
قیمت -/5

ملنے کا پتہ : الفرقان بکڈپو 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ - 18

مولانا محمد برہان الدین سنہلی

صدر شعبہ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

## حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

اپنی کتابوں، عادتوں اور باتوں کے آئینہ میں

کسی بھی اہم علمی شخصیت پر قلم اٹھانا راقم کیلئے یوں بھی آ  
ایسی ذات گرامی پر جو مختلف الجہات اور متنوع کمالات کی حامل ہو،  
نعمانیؒ پر ”الفرقان“ کی خاص اشاعت کے لئے ان کے فرزند ان گرامی  
جب کچھ لکھنے کی فرمائش کر کے راقم کو ایک بڑی سعادت میں شریک  
صالحین کا ذکر بھی موجب خیر و برکت ہے) تو راقم کچھ عرصہ متردد رہا، ایک طرف تو اپنی کوتاہ  
قلمی کا احساس مولانا ایسی مشہور و ہمہ گیر شخصیت پر لکھنے میں تاہل کا موجب بن رہا تھا، تو دوسری  
طرف حضرت مولانا سے دیرینہ متعدد قسم کے روابط، خاص طور پر موصوف کی خدمت میں  
ربع صدی سے بھی زیادہ برابر حاضر ہونے کی توفیق کی بنا پر، ان کی مجالس و گفتگو سے مستفید  
ہوتے رہنے، نیز انکی شفقتیں جو راقم کے لکھنؤ آنے کے بعد سے مسلسل رہیں، کی وجہ سے ایک  
طرح کا اپنے اوپر حق معلوم ہوا کہ اس سعادت سے محروم نہ رہا جائے، برادران محترم کی فرمائش  
نے مہمیز کا کام کیا، لہذا اپنا ٹوٹا پھوٹا قلم لیکر اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسے پر بیٹھ گیا، کیا عجب ہے کہ  
یہ سطریں خود راقم کے لئے ذخیرہ آخرت بن جائیں۔

اس سعادت میں حصہ لینے کا ارادہ کر لینے کے بعد میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ کیا  
لکھا جائے؟ غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کے مواقع پر جو بہت  
سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں اور حافظہ کی گرفت میں بھی رہ گئیں، ان میں سے کچھ ناظرین کے  
سامنے پیش کر دی جائیں۔ بہت سوں کو انشاء اللہ نفع پہونچے گا، نیز مولانا کی تصنیفات میں سے چند  
کا نہایت مختصر خلاصہ پیش کر کے قارئین میں سے جو لوگ اب تک ان کتابوں کے براہ راست

مطالعہ سے محروم رہے ہیں ان کے شوق مطالعہ کو مہمیز کیا جائے،  
واقعہ یہ ہے۔ مولانا کی تحریروں سے واقف حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ مشکل سے  
مشکل علمی مضامین نہایت آسان پیرایہ میں بیان کر دینا مولانا کا وہ امتیاز ہے جس میں وہ کم از کم  
اپنے معاصرین کے اندر منفرد و ممتاز نظر آتے ہیں، ان کی تحریریں سہل ممتنع کا جیتا جاگتا نمونہ  
ہونے کے ساتھ نہایت مؤثر اور دلنشین بھی ہوتی ہیں، انشاء اللہ آئندہ سطروں میں کچھ  
اقتباسات قارئین کے ملاحظہ سے گزریں گے تو ہر ایک راقم کی ہمنوائی پر مجبور ہو جائیگا۔  
مولانا کی مجلس گفتگو

یوں تو راقم الحروف کو مولانا کے ہم وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، لیکن عجیب بات  
ہے کہ لکھنؤ آنے سے پہلے وطن میں، مولانا کو صرف ایک دو بار دیکھنا تو یاد آتا ہے، کسی مجلس  
میں شرکت بلکہ ملاقات تک یاد نہیں حالانکہ مولانا سے میرے والد ماجد حضرت مولانا قاری  
حمید الدین صاحب (جو علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد اور دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلاء  
میں تھے، مولانا سے بھی کوئی دس سال (۱) اقدم) کے خاصے روابط تھے، جن کا اندازہ مجھے مولانا  
کی خاص شفقتوں اور والد صاحب کے ان تذکروں سے ہوا جو یہاں (لکھنؤ) آنے کے بعد مولانا  
کی ہی زبانی سنے، اسلئے مجھے جو کچھ بھی معلومات ہیں وہ میرے لکھنؤ آنے کے بعد کی ہیں۔

ایک حدیث کی توجیہ :

ایک مجلس میں مشہور حدیث جسکے الفاظ یہ ہیں ان الله يعث لهذه الأمة على رأس  
مائة كل سنة من يحدد لها ديها (ابوداؤد شریف صفحہ ۲۳۳ جلد ۲) پر گفتگو کرتے ہوئے کہ  
اس سے بظاہر ہر صدی کے سرے پر امت محمدیہ میں مجدد کے آنے کی پیش گوئی معلوم ہوتی  
ہے (غالباً مولانا شاہ حلیم عطاء، سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حوالہ سے) فرمایا کہ  
یہاں ”رأس“ کا لفظ ”معلم“ ہے (یہ ایک خاص اصطلاحی تعبیر ہے، جسکا مفہوم قریب قریب  
”زائد“ کا ہوتا ہے) مطلب یہ ہوا کہ حدیث میں ہر صدی کے اندر ”مجدد“ (فرد یا جماعت)  
آنے کی پیشین گوئی ہے خواہ صدی کی ابتداء میں آئے یا وسط میں یا آخر میں۔ پھر قرینہ یا دلیل کے  
طور پر یہ بھی فرمایا کہ ”صدی“ کے ابتداء و انتہا کی تعیین (سنہ ہجری کا تعیین) تو آنحضرت ﷺ

(۱) دونوں کی عروں میں بھی کم و بیش اتنی ہی تفاوت ہوگا، والد ماجد کا انتقال شوال ۱۳۷۷ھ (مئی ۱۹۵۸ء) میں ہو گیا، اناتہ و اناتہ الیہ

راجعون۔

کی وفات کے خاصی مدت بعد (حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں) ہوئی تو عرف عام کے مطابق ابتداء کیونکر مراد ہو سکتی ہے! راقم کو یہ افادہ بہت ہی اہم اور گرہ کشا معلوم ہوا (شائد اسی لئے نہاں خانہ قلب میں محفوظ ہو گیا) کیونکہ اس سے وہ اشکال بھی دور ہو گیا کہ بہت سے مجددین مثلاً مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہؒ کسی صدی کی ابتدا میں نہ پیدا ہوئے نہ انکی وفات ہوئی (مجدد صاحب کی ولادت کا ۱۹ھ ہے اور وفات کا ۱۰۳۴ھ ہے، شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۱۳ھ میں ہوئی اور وفات ۱۷۶۱ھ میں)

### تفسیر تدبر قرآن کے بارے میں ایک الجھن کا ازالہ

راقم کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شروع سے ہی حدیث و فقہ -

مجید کی تدریس کی بھی خدمت مفوض رہی، اس ضرورت سے اور کچھ ا

مختلف تفسیری کتابوں کے مطالعہ کی سعادت حاصل رہی، یہاں آکر :

مطالعہ کا پہلی بار موقع ملا ان میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ”تدبر“

جلدیں قریبی زمانہ میں ہی منظر عام پر آئی تھیں) اسکے بعض مقامات، مثلاً آیات سورہ بقرہ اور

اس ذیل میں آیات جہاد و قتال کی تفسیر۔ بہت پسند آئے بلکہ اچھوتے لگے، خاص طور پر تحویل

قبلہ سے جہاد و قتال کا ربط۔ جو بظاہر بے جوڑ سی بات لگتی تھی، اس تفسیر کے مطالعہ سے نہ صرف

یہ کہ ان کے درمیان بے ربطی کا وہم دور ہوا بلکہ اعلیٰ درجہ کی ہم آہنگی معلوم ہونے لگی، مگر

”تدبر قرآن“ کی یہ اور اس قبیل کی بہت سی خوبیوں کے باوجود ایک خاص بات بری طرح ٹھکتی

تھی، وہ یہ کہ متعدد مقامات پر ایسا نظر آیا کہ آیت کی تفسیر و تشریح میں صحیح حدیث (بخاری

شریف کی بھی حدیث) موجود ہوتے ہوئے مولانا اصلاحیؒ نے ایسی تفسیر کی جس سے اندازہ ہوا

کہ یا تو اس حدیث پر اصلاحی صاحب کی نظر نہیں پڑی یا اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا، (مثلاً سورہ

بقرہ کی آیت ما کان اللہ لبصیع ایمانکم کی تفسیر میں، یہ آیت بھی تحویل قبلہ کے سلسلہ کی

ہے) دوسری وجہ راقم کو نہایت مستبعد لگی تھی اسلئے پہلی وجہ تسکین خاطر کے لئے راجح سمجھی، مگر

یہ الجھن برابری رہی تا آنکہ اسکا تذکرہ ایک روز مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے کیا تو مولانا نعمانیؒ

نے۔ کم از کم راقم کے اس وقت تک صاحب تدبر قرآن کے ساتھ حسن ظن اور اپنی معلومات

بلکہ توقع کے برخلاف۔ ایک چونکا دینے والی بات فرمائی، ”جسکا خلاصہ و مفہوم یہ ہے کہ یہ کیسے

ممکن ہے کوئی شخص تفسیر قرآن لکھنے بیٹھے اور اس کے سامنے تفسیر ابن کثیر یا اس جیسی کوئی



کتاب نہ ہو تو پھر وہ آیت کی تفسیر سے متعلق احادیث سے بے خبر کیوں کر رہ سکتا ہے! بات دراصل یہ ہے کہ مولانا اصلاحی اپنے استاد مولانا فراہی کے اتباع میں فکری و اصولی طور پر تفسیر آیات کا حدیث پر مدار رکھنا ضروری نہیں سمجھتے“ (راقم نے مولانا نعمانی صاحب کا مفہوم ادا کرنے کی اس طرح کوشش کی ہے کہ موصوف کے الفاظ کی بھی بڑی حد تک رعایت رہے) پھر اسی بات کو واضح اور مدلل کرنے کے لئے فرمایا کہ ”مولانا فراہی“ کا نقطہ نظر جاننے کے لئے ”الفرقان“ کے ”شاہ ولی اللہ نمبر“ میں مولانا عبید اللہ سندھی کا مضمون پڑھنا چاہئے، مزید برآں اس مقالہ کی اہمیت سے متعلق اور بھی بہت کچھ فرمایا (۱) چنانچہ راقم کو مقالہ دیکھنے کا شدید اشتیاق ہوا، اسے حاصل کر کے بغور مطالعہ کیا، اس میں یہ عبارت ملی ”مولانا حمید الدین (فراہی) مرحوم میرے بہت پرانے دوست تھے۔ قرآن شریف کے تناظر آیات میں ہمارا مذاق متحد تھا اگرچہ طریقے اور پروگرام میں کسی قدر اختلاف رہا۔ وہ بالکبیل مجھ سے بدرجہا اعلیٰ جانتے تھے اور میں حدیث ان سے زیادہ جانتا تھا، جب تک میں ہندوستان میں ان سے ملتا رہا حدیث شریف ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا، اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں، اسی سال وہ بھی حج کے لئے آئے ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں، افکار میں بے حد توافقی پیدا ہو گیا تھا، مگر وہاں بھی حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہو گئی، ہم نے سختی سے انکار کیا اور کہا کہ حدیث کو ضرور ہی ماننا پڑیگا تنگ آکر فرمانے لگے آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا مؤطا مالک افرمایا ہم اسکو مانتے ہیں۔“ اسکے بعد ”تدبر قرآن“ کا راقم نے مقدمہ دیکھا تو اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، اس میں جا بجا اس طرح کی عبارتیں خود مولانا اصلاحی اور انکے استاذ مولانا فراہی کے قلم کی ملیں جن سے مولانا عبید اللہ سندھی کے بیان کی تصدیق اور مولانا نعمانی کے مذکورہ بالا ”افادہ“ کی پوری تائید نکلتی ہے، مثلاً ”تدبر قرآن“ (جلد اول پہلا ایڈیشن صفحہ ” ف “ اشاعت لاہور) میں مولانا فراہی کی یہ عبارت ملتی ہے ”پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آجائے جن کی پوری حدود و تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو صحیح راہ یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور اخبار و آحاد پر زیادہ اصرار نہ کرو“ (حدیث کے بارے میں قریب قریب یہی موقف برصغیر میں منکرین

(۱) اس مقالہ کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے تنہا یہ بات کافی ہوگی کہ اسے پڑھ کر مولانا سید سلیمان ندوی جیسے ناقد و بصیر۔

مولانا نعمانی کو لکھا تھا ”میں نے بغور پڑھا، بیشک مولانا سندھی کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفے اور نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق تھی“ (یہ مضمون الگ بھی رسالے کی شکل میں شائع ہوا۔)

حدیث کے باوا آدم اسلم جبراجپوری صاحب کا بھی تھا۔ برہان) یا مثلاً اسی صفحہ پر خود مولانا اصلاحی نے لکھا ہے ”جو لوگ احادیث و آثار کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ خود قرآن پر بھی حاکم بنا دیتے ہیں (اس طرح کی بات امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر امام سے منقول ہے۔ برہان) وہ نہ تو قرآن کا درجہ پہچانتے ہیں نہ حدیث کا۔“ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مولانا اصلاحی ہی کے قلم سے نکلنے والی عبارت سے تو یہ مترشح ہو رہا ہے کہ وہ حدیث کو تاریخ اور دیگر آسمانی کتابوں کے درجے میں رکھتے ہیں، (دیکھئے مقدمہ تدبر قرآن پہلا صفحہ) بہر حال مولانا نعمانیؒ کے افادہ اور انکی راہنمائی سے وہ سمجھیں تو دور ہو گئی جس کا ذکر اوپر آیا، لیکن صاحب ”تدبر“ کے تدبر سے جو حسن ظن تھا اسے ٹھیس لگی۔

### شخصیات

یوں تو مولانا نعمانیؒ معاصر شخصیات کا گویا انسائیکلو پیڈیا دوسرے حلقے کے ذی علم اشخاص کے بارے میں انکی معلومات قابل کاش یہ تمام معلومات و افادات کتابی شکل میں آجاتے (اگرچہ ”تحدید“ آگیا ہے مگر اسکے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا ”سب کہاں اکچھ نمایاں ہو سیں“)

اپنے اساتذہ میں محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کتیمیریؒ کے بہت قائل و مداح تھے (آں مدوح کے تمام شاگردوں کو انکا ایسا ہی شیفہ اور گرویدہ پایا) انکے بعد غالباً اپنے شیخ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائے پوری اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ (بانی جماعت تبلیغ) کے بہت قائل تھے ان حضرات سے متعلق اور وابستہ جس طرح کے حالات بیان فرماتے تھے ان کے پیش نظر اصحاب حالات کا قائل اور گرویدہ نہ ہونا قابل تعجب تھا، بلکہ سننے والے کا بھی عظمت کے احساس سے سرشار نہ ہو جانا مستبعد ہے۔

ایک موقع پر ان مذکورہ حضرات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا (جسکا یہ مفہوم ذہن میں رہ گیا ہے) کہ ان حضرات کو دیکھ کر حقیقتاً (براہ راست واقفیت سے) ان کی بلند مقامی کا اندازہ ہوا۔ حضرت الاستاذ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (نور اللہ مرقدہ) کے بارے میں فرمایا کہ ان کی عظمت تقلید حاصل ہوئی اس کی وضاحت کرتے ہوئے غالباً یہ بھی فرمایا کہ اپنے عصر کے تمام ہی لائق عظمت علماء اور بزرگوں کو حضرت مدنیؒ کی بلندی مرتبہ اور رفعت شان کا غایت درجہ قائل پایا۔ اس طرح کے سبق آموز واقعات تو مولانا کے سنائے ہوئے بہت ہیں جن سے پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے مگر یہاں اتنے پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے (آخر میں بھی ”کچھ متفرق بیش قیمت باتیں

”کے عنوان سے مولانا کے چند زریں اقوال ذکر کئے گئے ہیں وہاں پر ملاحظہ ہوں)

### خور و نوازی

ہر بڑے میں یہ صفت بھی پائی جاتی ہے کہ وہ چھوٹوں کو نوازتے اور انکی قدر و حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مولانا نعمانی موصوف میں یہ وصف راقم نے بدرجہ اتم پایا۔ اس بارے میں ”جگ بیتی“ کے بجائے ”آپ بیتی“ سنانا ہی شاید زیادہ آسان بھی ہے اور کار آمد بھی۔ جیسا کہ شروع میں ذکر آیا۔ راقم کو اپنی آمد لکھنؤ (۱۳۹۰ھ۔ ۱۹۷۰ء۔) سے ہی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اس سے قبل باوجود ہم وطنی کے کوئی ربط نہ تھا۔ مگر ایسا محسوس ہوا کہ بہت قدیم زمانے سے ربط و تعلق رکھنے والے کسی نہایت شفیق مربی کی سرپرستی حاصل ہو گئی ہے۔ ایسے ایسے مفید مشورے دیئے جن سے اس نو عمر اور ناتجربہ کار، نو وارد کو بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی احقر کو لکھنے پڑھنے کی تھوڑی بہت عادت بفضلہ تعالیٰ یہاں آنے سے پہلے سے تھی۔ کئی اہم مقالہ (مثلاً ”رودیت ہلال کا مسئلہ“ جو بعد میں کتابی شکل میں آیا) شائع ہو چکے تھے۔ مولانا نے کے پاس علمی استفسارات پر مشتمل کوئی خط آتا تو عنایت فرمادیتے تاکہ اس کا جواب یہ حقیر لکھے۔ اور جب تعمیل حکم کر دیتا تو اسے ”الفرقان“ میں دیتے اور اپنے خاص انداز میں داد بھی دیتے کبھی کسی علمی فکری فتنہ کے سر ابھارنے کی انھیں خبر ملتی تو تفصیلات اور خطرات سے آگاہی بخشتے ہوئے اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کرتے اور راقم اگر تعمیل کر دیتا تو اسے الفرقان میں شائع فرماتے۔ اس وقت حسن اتفاق سے ”الفرقان“ کی ادارت کی ذمہ داری برادر م محترم مولانا متیق الرحمان سنبھلی زید مجدہ کے ہاتھ میں تھی۔ موصوف بھی احقر پر نہایت مہربان تھے (اور ہیں) ان کی مہربانی کی ہی یہ علامت تھی کہ اس زمانے میں ”الفرقان“ کا تقریباً پورا ایک شمارہ ”مسلم پرسنل“ (۱) پر راقم کے ایک مضمون کی نذر کر دیا تھا۔ (فجزاھم اللہ احسن الجزاء)۔

کچھ مولانا کی کتابوں کے بارے میں

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اور مولانا کی تحریروں کا ہر پڑھنے والا جانتا بھی ہے۔ موصوف کے قلم میں اللہ تعالیٰ نے غضب کی تاثیر، چاشنی اور ساوگی و سلاست رکھ دی تھی کہ

(۱) یہ مقالہ بعد میں بہت سے اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں ”معاشرتی مسائل“ کے نام سے ”مجلس تحقیقات و نشریات اسلام“ لکھنؤ شائع کیا۔ اس وقت سے اب تک کوئی دس بارہ ایڈیشن مختلف جگہ سے شائع ہو چکے ہیں (ماحمد نذیر علی دکن)

مشکل سے مشکل مضمون پانی ہو جاتا اور بمشکل سمجھ میں آسکے والے عقائد و حقائق کا سمجھنا نہایت آسان اور سہل ہو جاتا ہے کہ پھر کسی عامی کو بھی دشواری نہیں ہوتی بلکہ دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اسی کے ساتھ الفاظ نہایت نپے تلے اور بقدر ضرورت ہوتے نہ کم نہ زیادہ۔ یہ صفت یوں تو مولانا کے قلم سے نکلے تمام نقوش میں، فی الجملہ، پائی جاتی ہے مگر عقائد، معجزات اور تصوف جیسے دقیق مباحث میں انکے نوک قلم سے عقدہ کشائی دل و دماغ روشن کرنے والی اور شبہات کے چھتے کاٹنے کا لہر دینے والی ہوتی ہے۔ اسکی مثالیں یوں تو مولانا کی ہر تصنیف میں بکثرت پائی جاتی ہیں مگر جن کتابوں میں بکثرت ملتی ہیں ان میں حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دین و شریعت :

راقم کا تاثر یہ ہے۔ جو حال ہی میں اسکے بالاستیعاب مطالعہ سے مسلمان کیلئے۔ خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو یا بہت کم پڑھا لکھا شریعت کے سے لیکر معاملات، اخلاق، معاشرت اور سیاست تک کے بارے میں، بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ اس موضوع کی دوسری کتابوں سے بڑے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کتاب میں ”اسلام“ کی علمی و عملی تصویر ایسے انداز میں دی گئی ہے کہ قاری کے دل و دماغ میں اسلام کی عظمت و اہمیت سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ اسکے تقاضوں (مطلوبات و منہیات) پر عمل کرنے کیلئے پوری طرح آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مولانا نے اپنی کتاب میں نہ صرف اپنی بات کہی ہے بلکہ قرآن مجید، احادیث نبویہ ﷺ اقوال صحابہ سے لیکر حال تک کے تمام اکابر علماء، خاص طور پر شاہ ولی اللہ کے ارشادات پیش کئے ہیں۔ بلکہ شاہ صاحب کی تو بہت سی تعبیرات بھی اختیار کر لی ہیں۔

اقتباسات۔ اب کچھ نمونے پیش کئے جا رہے ہیں۔

خداوند تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسکی وحدانیت کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”قرآن مجید انسان کے اسی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ کو سامنے رکھ کر کہتا ہے کہ یہ سب کرشمے اللہ کی قدرت کے ہیں اور یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہے۔ جو شخص زمین کو دیکھتا اور زمین پر جو کچھ ہوتا رہتا ہے اسکو بھی دیکھتا رہتا ہے اور اوپر جو آسمان وغیرہ نظر آتے ہیں ان کو بھی دیکھتا رہتا ہے۔ اسکے لئے زمین و آسمان کے خالق کے بارے میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔“

اسکے بعد مولانا نے اپنے خاص ذوق کے تقاضے سے بھی اسلام کی اصل روح ”توحید“ پر بہت مفصل کلام کیا ہے اسکے جتہ جتہ حصہ بھی نقل کئے جا رہے ہیں۔

”خدا کی توحید کا مسئلہ ایسا ہے جسمیں بہت سی قومیں گمراہ ہوئی ہیں اسلئے تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور تعلیم کا یہ خاص موضوع رہا ہے۔ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں تو اس مسئلہ کی ایسی ایسی تکمیل اور تفصیل کی گئی ہے کہ کوئی گوشہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔“ بعد ازاں مولانا نے کلیدی حیثیت کی یہ بات فرمائی۔۔۔ ”توحید کا۔ یعنی اللہ کو ایک ماننے کا۔ ایک درجہ تو وہ ہے جسکو بہت سے مشرکین بھی مانتے ہیں لیکن قرآن مجید کے بیان کے مطابق وہ کافی نہیں، مثلاً اتنی بات کہ آسمان وزمین اور اس ساری کائنات کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے۔“ ان مشرکین کا شرک یہ تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق و تقرب کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں، یہ چاہیں تو بناؤ بگاڑ کر سکتے ہیں اور ایسا بنیاد پران کو خوش کرنے کے لئے ان کی عبادت کرتے ہیں، یعنی سجدہ و طواف جیسے اعمال کرتے نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے، مشرکین کے ان اعمال ہر مولانا یہ تبصرہ فرماتے ہیں ”بس ان کا یہی خیال اور یہی عمل شرک تھا۔ اسی وجہ سے قرآن پاک میں اسی شرک کا رد زیادہ کیا گیا ہے۔“

معبودان باطل کی نشاندہی یوں کی ہے ”بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مشرک لوگ سارے معاملات پتھر کی مورتیوں کے ساتھ ہی کرتے تھے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ مشرکین کا یہ مشرکانہ عقیدہ اور عمل ان بزرگ روحوں اور روحانی ہستیوں کے ساتھ تھا جن سے پتھر کے بت منسوب تھے۔۔۔ دراصل عبادت ان روحانی ہستیوں کی کجیاتی تھی اور انہیں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جاتا تھا“ (۴۲-۴۶)

اسکے بعد مولانا نے اسباب ظاہرہ کے استعمال اور مشرکانہ استعانت کے درمیان فرق، نیز عبادت کی حقیقت پر تفصیلی کلام کیا ہے جو دیکھنے کے لائق ہے۔

### عقیدہ آخرت

عقائد کے ابواب میں غالباً سب سے زیادہ عمیق الفہم آخرت کا عقیدہ ہے، قرآن مجید و احادیث شریفہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے لئے سب سے زیادہ عقیدہ کا نام مشکل تھا، لیکن دیکھئے! مولانا نے کس طرح اس مشکل کو آسان بنا دیا کہ ہر عوام الناس نے عقیدہ آخرت کے بارے میں آسانی سے سمجھ سکیں۔

بات ہر شخص کی سمجھ میں خود بھی آسکتی ہے کہ ہماری ری اس زندگی کے بعد کوئی ایسی زندگی ضرور ہونی چاہئے جس میں لوگوں کو انکے اعمال کی سزا اور جزا ملے، کیونکہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ عمر بھر برائیاں کرتے، ڈاکے مارتے، غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ اور زندگی بھر عیش اڑاتے رہتے ہیں اور اسی حال میں مر جاتے ہیں اس طرح بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ بچارے بڑی نیکی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی ساری زندگی تکلیف سے گزرتی ہے۔ اسی حال میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو جب یہ دنیا خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور وہ ہمارے سب اچھے برے کاموں کو دیکھتا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یہاں۔۔۔ نہ نیکیوں کو انکی نیکی کا صلہ مل رہا ہے اور نہ مجرموں کو سزا دی جا رہی ہے تو خود بخود یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ پھر اللہ کی طرف سے یہ جزا اور سزا کسی دوسری زندگی میں ملنی چاہئے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اللہ کے یہاں ایسا نہ ہو۔۔۔ کے ظلم پر کوئی باز پرس ہو، (ص)

### رسالت

انبیاء اور رسل کی آمد کی ضرورت اور ان پر ایمان لانے کی حاجت کو مولانا نے یسے سہل اور آسان اسلوب میں بتایا! ملاحظہ کیجئے۔ ”جب اللہ کو اور آخرت کو ماننے کے بعد ہمارے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ اس دنیا میں ہم اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری والی زندگی گزاریں تو ہم اسکے محتاج ہو گئے کہ کسی طرح سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کے ہمارے لئے کیا احکام ہیں اور اسکی طرف سے کن کاموں کی اجازت ہے اور کن باتوں کی ممانعت؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو یہ باتیں براہ راست بتلاتا نہیں اور جو تھوڑی سی عقل اور سمجھ بوجھ انسان کو ملی ہوئی ہے وہ اس دنیا کی روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے تو کسی حد تک کیلئے کافی ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنا اسکے بس کی بات نہیں کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اور کن کاموں سے راضی اور کن سے ناراض ہوتا ہے؟ پس ہماری اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسالت اور پیغمبری کا سلسلہ قائم فرمایا۔“ یعنی اللہ نے جس طرح ہماری ضرورت کے لئے سورج پیدا فرمایا..... اور جس طرح ہمارے لئے غذا کی پیداوار کا نظام قائم کیا اسی طرح اس کی طرف ہدایت فرمائی۔

لئے نبوت کا نظام قائم فرمایا۔ اسی ذیل میں ایک بہت اہم عنوان یہ قائم کیا کہ ”پیغمبر کی تعلیم کی ضرورت“۔ ”انبیاء شریعت ساز نہیں ہوتے بلکہ شریعت رسالہ ہوتے ہیں۔ (ہدیٰ بعدہ ص ۱۷۷)۔ رز جاں کو سننے کے لائق ہے! اس میں معجزہ، کرامت، نبوت، ولایت، اور...

ضروریات دین، اہل سنت والجماعت کے اصول، تقلید جیسی بہت سی شرعی حقیقتوں پر بڑا ہی تسلی بخش کلام اور عام فہم گفتگو کی ہے اسی کے ساتھ بعض نہایت دلچسپ اور سبق آموز واقعات ذکر کئے ہیں۔

یہ کتاب کے صرف ابتدائی تین بابوں کے اقتباسات ہیں۔ باقی ”دین شریعت“ اسلام کے تمام ہی اہم ابواب کی جامع ہے۔ عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت، دین کی نصرت، حکومت و خلافت اور احسان و تصوف، الغرض دین و شریعت کے ان تمام پہلوؤں پر ایسی سیر حاصل، موثر اور بصیرت افروز گفتگو فرمائی گئی ہے جو حضرت مولانا کا ہی حصہ ہے۔ مولانا کے قلم میں کیسی روانی، جاذبیت اور شگفتگی تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بعض جگہ ایسا موزوں شعر چست فرمادیتے ہیں جس سے وجدان جھوم اٹھتا ہے مثلاً شہید اور شہادت کے مراتب بیان کرتے ہوئے جہاں یہ بتایا کہ شہید مرتے نہیں ہیں۔ وہیں یہ شعر بھی لکھ دیا۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر  
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

### تصوف کیا ہے؟

اگرچہ یہ مختصر سا رسالہ ہے مگر مولانا کی یہ بھی بہت مفید اور اہم تحریروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، اسلامی علوم یا یوں کہئے اسلام کے مختلف شعبوں میں تصوف، ایک ایسا عنوان ہے جس پر بعض معلوم اور نامعلوم اسباب سے غلط فہمیوں کے دبیز پردے پڑ جانے کی بنا پر صدیوں سے متکلم فیہ رہا ہے، اسکے غیر اسلامی بلکہ ملحدانہ، اور جو گیانہ، وہندوانہ، ہونے تک کی بات بہت زور شور سے کہی گئی اور اب تک کہی جا رہی ہے۔ حالانکہ علمائے حق نے ہمیشہ اس الزام کی تردید اور غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی ہے، آخری دور میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اسے ایسا ممتنع کر دیا اور کتاب و سنت کے دلائل سے اسکا (یعنی حقیقی تصوف کا نہ کہ مصنوعی کا) عین اسلام ہونا ثابت کر دکھایا ہے کہ اب کسی جو یائے حق منصف مزاج کے لئے اسے غیر اسلامی کہنے کا منہ نہیں رہا، حکیم الامت کی اس عظیم خدمت کا اعتراف سب ہی اہل حق نے کیا ہے، جن میں مولانا نعمانیؒ بھی شامل ہیں (ایک مجلس میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی علیہ الرحمۃ نے (راقم کی موجودگی میں) حضرت تھانوی کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ ”تصوف کے مجدد تھے“۔ زیر نظر کتاب کے دیباچہ کا مطالعہ ہی غلط فہمی کے ازالہ کیلئے بڑی حد تک کافی ہو سکتا ہے۔

## نماز اور خطبہ کی زبان:

ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے دور انتشار میں بہت سے وہ مسائل پیدا ہوئے (یا پیدا کئے گئے) اور اٹھے (یا اٹھائے گئے) جنہیں ”مسئلہ“، کہنا ہی شاید صحیح نہ ہو، لیکن جب تو میں آمادہ زوال ہوتی ہیں تو ان میں طرح طرح کے اسباب انتشار پیدا ہوتے یا کئے جاتے ہیں۔ جن میں شعوری یا غیر شعوری (بڑی حد تک غیر شعوری) طور پر ایسی تو میں پھنس جاتی ہیں اور پھر باہم معرکہ آرائی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ گویا ایک ہنگامہ عصر (۱) کی زبان میں ”بصال فی عبر عدو“ (ہو ایں لاشی چلانا) کے بے فائدہ کام میں مبتلا ہو جاتی ہیں، یہ صورت حال پیدا ہو جانے پر بعض صاحب الرائے اور دور اندیش قوم کے ہمدرد حضرات جن میں ہمیشہ علماء سرفہرست رہے ہیں۔ درمیان میں پڑ کر علمی و فکری راہنمائی کے ذریعہ اس نزاع کو ختم کر رہے ہیں۔

راقم کے خیال میں نماز اور جمعہ کے خطبہ۔ بالخصوص جمعہ ہونے کا معرکہ اسی قسم کا جہاد ہے، اور مولانا نعمائیؒ کا یہ مختصر چپ ”بقامت کہتر بقیمت بہتر“ کا مصداق ہے۔ اس نزاع کے ختم کرنے کی سعی مستور ہندوستان کے ایک مشہور فلسفی عالم اور حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مولانا عبد الباری ندویؒ کے ایک حکیمانہ قول ”عقل وکیل ہے حج نہیں“ کے مطابق ذہین انسان جب کوئی مسلک یا رائے اختیار کر لیتا ہے تو اسکے لئے عقل دلائل فراہم کر ہی دیتی ہے (جس طرح ہر کمزور سے کمزور بلکہ جھوٹے اور فرضی مقدمہ کے لئے بھی وکیل مل جاتے ہیں) ایسی ہی کچھ صورت حال راقم کے نزدیک۔ نماز اور خطبہ جمعہ کے غیر عربی میں جواز کے قائلین کی ہے، ان لوگوں نے اپنی تائید میں ’بزع عم خویش‘ جو دلائل دئے ہیں ان میں کسی ایک کو بھی واقعی دلیل قرار دینا مشکل ہے، مولانا نعمائیؒ نے اسی قسم کے ”دلائل“ کا اپنے اس رسالہ میں بھرپور جائزہ لیا ہے اور ان کا پائے چوبیس، بلکہ، تار عنکبوت، جیسا ”مضبوط“ ہونا واضح کر دیا ہے، یہ نہایت مختصر رسالہ ہے (اسلئے اس کا قیہ حصول بھی ہر ایک کی دسترس میں ہے) جو شخص بھی اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتا، یعنی غیر عربی زبان میں نماز و خطبہ کے جواز کی طرف رجحان رکھتا ہو وہ اسے ضرور پڑھے۔

(۱) مفکر اسلام خدو منا حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں مدظلہ نے الحمد للہ کی طرف سے ائمہ اربعہ اور ان کے قبیضین، بالخصوص احناف کے خلاف ادھر کچھ عرصہ سے جارحانہ مہم تیز کر دینے سے متاثر ہو کر ایک نہایت قیمتی رسالہ عربی میں لکھا، اسکی تمہید میں اس جارحانہ مہم اور گولہ باری کیلئے مذکورہ بالا بیخ تعبیر اختیار کی۔



## حضرت شاہ اسماعیل شہید اور فیصلہ کن مناظرہ

مولانا نعمانیؒ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے بھی یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ انکی شہرت اولاً مناظر اعظم کی حیثیت سے ہوئی، اب سے تقریباً ۶۰-۶۵ سال پہلے ان کا اصل کارنامہ بلکہ یہ کہنا اور سمجھنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان کا اصل مشغلہ فرق ضالہ۔ بالخصوص بریلویوں سے مناظرہ ہی تھا اس باب میں انہوں نے ایسے تابندہ نقوش چھوڑے ہیں جو مٹ نہیں سکتے، لیکن پھر خود مولانا کو احساس ہوا کہ یہ میدان زیادہ مفید اور بار آور نہیں زیادہ بہتر اور مفید تر کام ایجابی یعنی اصلاحی و دعوتی کام ہے۔

چنانچہ مولانا نے پھر وہ کوچہ ایسا چھوڑا کہ اسکی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لیکن وہ ضرورت فی الجملہ باقی رہی (بلکہ کچھ اب تک بھی ہے) جسکی بنا پر مولانا نعمانیؒ نے یہ میدان سنبھالا تھا، یعنی علمائے حق مثلاً شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری، حضرت تھانویؒ کے خلاف بریلویوں کی افترا پردازیاں اور ان حضرات کے اقوال و عبارات کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کرنا جس سے کفر و ضلال کا پہلو پیدا کیا جاسکے تاکہ ان بزرگوں پر کفر کا فتویٰ لگانا آسان ہو۔ اگرچہ اوپر (عنوان میں) دو کتابوں کے نام مذکور ہیں، لیکن حقیقتہً ان کا موضوع ایک ہی ہے گویا وہ ایک ہی کتاب کے دو جز ہیں، یعنی اکابر علماء کا دفاع، اور بریلویوں کے امام اور ان کے متبعین کی طرف سے ان حضرات اکابر پر لگائے گئے الزامات کے مسکت جوابات، اور الزام لگانے کے لئے ان کی عبارتوں میں تحریف و تلمییس اور قطع و برید کی جیتی جاگتی مثالیں پیش کر کے عبرت کا سامان فراہم کرنا جس سے بریلوی۔ اکابر و اصاغر۔ کی ناخدا ترسی اور دجل و فریب کے وہ عبرت انگیز نمونے سامنے آتے ہیں کہ عقل دنگ اور شرم و حیا سر پٹختی رہ جاتی ہے، اہل حق سے وابستہ جن لوگوں کو بریلویوں کے اس گروہ سے سابقہ ہو اور ان کی ریشہ و انیوں اور کلہ درازیوں کا شکار ہوں وہ ضرور ان کتابوں کا مطالعہ کریں انشاء اللہ وہ خود بھی پوری طور پر مطمئن ہوں گے اور بریلوی زبان درازوں کے منہ اچھی طرح بند کر سکیں گے۔

## مولانا نعمانی کی چند متفرق بیش قیمت باتیں

مسک الختام، کے طور پر مولانا کی چند مفید باتیں۔ جو حافظہ میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ پیر کی جابری ہیں امید ہے کہ انشاء اللہ نفع پہونچے گا۔!

(۱) راقم نے ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں دعا کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا کہ آپ دعا کیجئے کہ اللہ دعا کی توفیق دے، یہ بظاہر عجیب سا جواب تھا مگر اسکے بعد مولانا نے (غالباً میرا تعجب رفع کرنے کیلئے) یہ واقعہ سنایا (جس کا حاصل یہ ہے) ”ایک مرتبہ ہم نے اپنے شیخ حضرت رائے پوری سے دعا کی درخواست کی تو انہوں نے اولاً ایسا ہی جواب دیا پھر فرمایا کہ ”مولانا (یا مولوی صاحب)، دعا قلب کی حرکت اضطرابی کا نام ہے جب ایسی دعا کی توفیق مل جاتی ہے، تو پھر اسکی قبولیت میں تخلف نہیں دیکھا۔“

(۲) مولانا کی جب تک صحت و قوت بلکہ ہمت نے بھی ساتھ دیا برابر عیدین کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں بعد نماز عید اصلاحی تقریر فرماتے۔ (پہلے تو عیدین کی نماز بھی پڑھاتے تھے مگر ادھر پندرہ بیس سال سے نماز تو نہیں پڑھا رہے تھے مگر اس میں بڑے کام کی اور دل چھونے والی باتیں فرماتے اور یہ مصداق اثر بھی ہوتا (بعض تقریریں، الفرقان میں چھپ چکی ہیں) عید کے تقریر میں مولانا کا یہ جملہ بڑا ہی البیلا معلوم ہوا، اور اسے دماغ نے گناہ چوری بدکاری نہیں ہیں، بلکہ ان کے گناہ ہیں غیبت، حسد، بدگوئی، اور نیہ۔۔۔ الفاظ بھی بڑی حد تک مولانا ہی کے ہیں جہاں تک یاد ہے)

(۳) غالباً عید کے دن ہی ایک تقریر میں بڑے درد و سوز کے ساتھ فرمایا عموماً مسلمان شادی بیاہ کے موقع پر ہر چھوٹے بڑے قریب و دور کے عزیزوں کو حتیٰ کے نوکروں چاکروں اور کمینوں (۱) تک کو راضی کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں مگر اللہ اور اسکے رسول کو راضی نہیں کرتے بلکہ انکو شدید طور پر ناراض کرنے والے اعمال و حرکات کرتے ہیں۔ ویسے مولانا کی تقریر باہر تقریر اور تحریر میں فکر آخرت بیدار کرنے کی بات شامل ہوتی تھی۔ یاد آتا ہے کہ مولانا عبد الباقی ندوی نے ایک بار مولانا نعمانی کا یہ امتیاز بتا کر بڑی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔

(۴) ایک روز میری موجودگی میں ایک شخص نے ایک نو عمر عالم کی تعریف کی کہ وہ فلاں، فلاں جگہ گئے انہوں نے وہاں تقریریں کیں جو بہت پسند کی گئیں، اس پر مولانا نے فرمایا کم عمری میں شہرت اور مقبولیت بڑے ابتلاء اور آزمائش کی بات ہے! چنانچہ ان صاحب کے بارے میں واقعہ، یہ شہرت ابتلاء کا باعث بن گئی۔

(۱) ہمارے علاقے (سنبل اور اسکے اطراف) میں ”کمین“ کا لفظ بہتر، مہترانی اور اسی طرح کے دیگر چھوٹے کام کرنے والے (شاگرد پیشہ) لوگوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔

## حضرت شاہ اسماعیل شہید اور فیصلہ کن مناظرہ

مولانا نعمانیؒ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے بھی یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ انکی شہرت اولاً مناظر اعظم کی حیثیت سے ہوئی، اب سے تقریباً ۶۰-۶۵ سال پہلے ان کا اصل کارنامہ بلکہ یہ کہنا اور سمجھنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان کا اصل مشغلہ فرق ضالہ۔ بالخصوص بریلویوں سے مناظرہ ہی تھا اس باب میں انہوں نے ایسے تابندہ نقوش چھوڑے ہیں جو مٹ نہیں سکتے، لیکن پھر خود مولانا کو احساس ہوا کہ یہ میدان زیادہ مفید اور بار آور نہیں زیادہ بہتر اور مفید تر کام ایجابی یعنی اصلاحی و دعوتی کام ہے۔

چنانچہ مولانا نے پھر وہ کوچہ ایسا چھوڑا کہ اسکی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لیکن وہ ضرورت فی الجملہ باقی رہی (بلکہ کچھ اب تک بھی ہے) جسکی بنا پر مولانا نعمانیؒ نے یہ میدان سنبھالا تھا، یعنی علمائے حق مثلاً شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری، حضرت تھانویؒ کے خلاف بریلویوں کی افترا پردازیاں اور ان حضرات کے اقوال و عبارات کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کرنا جس سے کفر و ضلال کا پہلو پیدا کیا جاسکے تاکہ ان بزرگوں پر کفر کا فتویٰ لگانا آسان ہو۔ اگرچہ اوپر (عنوان میں) دو کتابوں کے نام مذکور ہیں، لیکن حقیقتہً ان کا موضوع ایک ہی ہے گویا وہ ایک ہی کتاب کے دو جز ہیں، یعنی اکابر علماء کا دفاع، اور بریلویوں کے امام اور ان کے متبعین کی طرف سے ان حضرات اکابر پر لگائے گئے الزامات کے مسکت جوابات، اور الزام لگانے کے لئے ان کی عبارتوں میں تحریف و تلخیص اور قطع و برید کی جتنی جاگتی مثالیں پیش کر کے عبرت کا سامان فراہم کرنا جس سے بریلوی۔ اکابر و اصغر۔ کی ناخدا تری اور دجل و فریب کے وہ عبرت انگیز نمونے سامنے آتے ہیں کہ عقل دنگ اور شرم و حیاء سر پٹیتی رہ جاتی ہے، اہل حق سے وابستہ جن لوگوں کو بریلویوں کے اس گروہ سے سابقہ ہو اور ان کی ریشہ و دانیوں اور کلہ درازیوں کا شکار ہوں وہ ضرور ان کتابوں کا مطالعہ کریں انشاء اللہ وہ خود بھی پوری طور پر مطمئن ہوں گے اور بریلوی زبان درازوں کے منہ اچھی طرح بند کر سکیں گے۔

## مولانا نعمانی کی چند متفرق بیش قیمت باتیں

مسک الختام، کے طور پر مولانا کی چند مفید باتیں۔ جو حافظہ میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ پیش کی جا رہی ہیں امید ہے کہ انشاء اللہ نفع پہنچے گا۔!

(۱) راقم نے ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں دعا کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا کہ آپ دعا کیجئے کہ اللہ دعا کی توفیق دے، یہ بظاہر عجیب سا جواب تھا مگر اسکے بعد مولانا نے (غالباً میرا تعجب رفع کرنے کیلئے) یہ واقعہ سنایا (جس کا حاصل یہ ہے) ”ایک مرتبہ ہم نے اپنے شیخ حضرت رائے پوری سے دعا کی درخواست کی تو انہوں نے اذلاً ایسا ہی جواب دیا پھر فرمایا کہ ”مولانا (یا مولوی صاحب)، دعا قلب کی حرکت اضطرابی کا نام ہے جب ایسی دعا کی توفیق مل جاتی ہے، تو پھر اسکی قبولیت میں تحلف نہیں دیکھا۔“

(۲) مولانا کی جب تک صحت و قوت بلکہ ہمت نے بھی ساتھ دیا برابر عیدین کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں بعد نماز عید اصلاحی تقریر فرماتے۔ (پہلے تو عیدین کی نماز بھی پڑھاتے تھے مگر ادھر پندرہ بیس سال سے نماز تو نہیں پڑھا رہے تھے مگر تقریر فرماتے تھے) اس میں بڑے کام کی اور دل چھونے والی باتیں فرماتے اور یہ مصداق، ازل دل خیز دہرا، رزدا، ان کا اثر بھی ہوتا (بعض تقریریں، الفرقان میں چھپ چکی ہیں) عید کے تقریر میں مولانا کا یہ جملہ بڑا ہی الیلا معلوم ہوا، اور اسے دماغ نے محفوظ گناہ چوری بدکاری نہیں ہیں، بلکہ ان کے گناہ ہیں غیبت، حسد، بدگوئی الفاظ بھی بڑی حد تک مولانا ہی کے ہیں جہاں تک یاد ہے)

(۳) غالباً عید کے دن ہی ایک تقریر میں بڑے درد دسوز کے ساتھ فرمایا ”میں شادی بیاہ کے موقع پر ہر چھوٹے بڑے قریب و دور کے عزیزوں کو حتیٰ کے نوکروں چاکروں اور کمینوں (۱) تک کو راضی کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں مگر اللہ اور اسکے رسول کو راضی نہیں کرتے بلکہ انکو شدید طور پر ناراض کرنے والے اعمال و حرکات کرتے ہیں۔ ویسے مولانا کی تقریر باہر تقریر اور تحریر میں فکر آخرت بیدار کرنے کی بات شامل ہوتی تھی۔ یاد آتا ہے کہ مولانا عبد الباقی ندوی نے ایک بار مولانا نعمانی کا یہ امتیاز بتا کر بڑی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔“

(۴) ایک روز میری موجودگی میں ایک شخص نے ایک نو عمر عالم کی تعریف کی کہ وہ فلاں، فلاں جگہ گئے انہوں نے وہاں تقریریں کیں جو بہت پسند کی گئیں، اس پر مولانا نے فرمایا ”کم عمری میں شہرت اور مقبولیت بڑے ابتلاء اور آزمائش کی بات ہے اچنانچہ ان صاحب کے بارے میں واقعہ، یہ شہرت ابتلاء کا باعث بن گئی۔“

(۱) ہمارے علاقے (سنجھل اور اسکے اطراف) میں ”کمین“ کا لفظ مہتر، مہترالی اور اسی طرح کے دیگر چھوٹے کام کرنے والے (شاگرد پیشہ) لوگوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔

(۵) ایک مجلس میں بڑے کام کی، اور گہرے مطالعہ پر مبنی، یہ بات فرمائی بریلویت بطور فرقہ کے ”احمد رضا خاں“، کے زمانہ سے یا ان کی بدولت پیدا ہوئی ورنہ اس سے پہلے یہ فکر تو تھا مگر فرقے کی شکل میں نہ تھا۔

اعتذار:

آخر میں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہو گا کہ مولانا کی نصف صد سے زائد کتابیں ہیں ان سب پر گفتگو اور ان کا تعارف نہ آسان ہے نہ اسکے لئے وقت بلکہ مقالہ کے مقصد سے جن کتابوں کا حال ہی میں مطالعہ کیا تھا ان سب کا تعارف کرنا بھی سر دست مشکل نظر آیا۔ (امید ہے کہ یہ کمی انشاء اللہ کوئی اور اہل شخص پوری کر دے گا) اسلئے بس اتنے ہی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ راقم کی قارئین سے درخواست ہے کہ دعا فرمائیں، اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائیں اور جن باتوں اور کتابوں کا ذکر آیا ہے کم از کم ان سے استفادہ کی زیادہ سے زیادہ لوگوں کو توفیق دے، اور صاحب کتب کے رفع درجات اور مغفرت کا سبب بنائے۔

☆☆

عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب نور اللہ مرقده کی

## عوامی کتب

۱۵/-	آداب المعلمین	۱۰/-	فضائل نکاح	۲۲/-	سیرت سید المرسلین
۲/-	احکام المیت	۴/-	حق نما	۸/-	آداب المعلمین
۲/-	مخلصانہ اپیل	۵/-	کلام ثاقب	۲۰/-	فضائل علم والعلماء

کل قیمت - ۸۸/- روپیہ

- ۸۸/- روپیہ کا منی آرڈر آنے پر ڈاک خرچ بذمہ مکتبہ ہوگا۔

ملے کے پتے

مکتبہ رحمانیہ، ہتھورا ضلع باندہ یوپی۔

ادارہ پیام صدیق گھانم پور ضلع کانپور

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری  
استاذ حدیث العین یونیورسٹی (ابوظہبی)

## حضرت مولانا محمد منظور نعمانی<sup>۲۰</sup>

### چند تاثرات

حضرت مولانا نعمانی صاحب کی وفات اس عہد کا بہت بڑا حال میں ایسا عظیم خلا پیدا ہو گیا، جس کا پر ہونا بظاہر ممکن نہیں، ان کی ذات و کمالات کی حامل تھی، وہ کامیاب ترین مدرس اور عظیم ترین محدث تھے، وہ سب مشہور مناظر، اسلام کے داعی، اور زمانہ کے نبض شناس مفکر تھے۔ انکی اصابت رائے اور دقت نظر مسلم تھی۔ وہ اخلاص و دینی محبت کا اعلیٰ نمونہ، اپنے اکابر کی خصوصیات و روایات کے حامل اور انکے علوم کے ناشر تھے۔

اس ناچیز کا ان کی ذات گرامی سے تعلق ندوۃ العلماء میں طالب علمی کے زمانہ (۱۳۵ھ) سے شروع ہوا تھا جو تازندگی قائم رہا، یہ ناچیز مظاہر العلوم سے ندوہ پڑھنے آیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مولانا نعمانی صاحب اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ دونوں بزرگوں کا تبلیغی کام سے بہت گہرا عملی تعلق تھا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ، بھی اپنے خطوط میں ان حضرات کی خدمت میں حاضری کی تاکید فرماتے رہتے تھے، ۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۱ء دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری مدرسہ کا زمانہ ہے۔۔۔ اس عرصہ میں حضرت مولانا سے زیادہ قرب و اتصال کے مواقع ملے، اس لئے کہ اس ناچیز کے ذمہ جب مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے لئے کی گئی، حضرت مولانا اس زمانہ میں ندوہ کے شیخ الحدیث تھے۔ اور دارالعلوم کے تمام اہم کاموں میں شریک مشورہ رہتے تھے انھیں کی سعی سے کچھ عرصہ کے لئے مشکوٰۃ شریف کی دونوں جلدیں ایک ساتھ

کردی گئی تھیں، اس کے بعد جب حضرت مولانا نے اپنے خاص حالات کی بناء پر تدریسی خدمت سے معذرت فرمائی، تو اس زمانے میں آپ جو کتاب یعنی ترمذی شریف پڑھاتے تھے وہ آپ کے مشورے سے اس ناچیز کے ذمے کی گئی اور یہ کتاب تقریباً ۵ سال یعنی ۱۹۷۷ء تک ندوہ میں میرے آخری قیام تک میرے ہی ذمہ رہی۔

حضرت مولانا کے ایما اور حکم کی بناء پر الفرقان میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، اس زمانہ میں کئی اسفار بھی حضرت مولانا کے ساتھ ہوئے، جب پہلی مرتبہ دارالعلوم ندوہ کے سلسلہ میں مالگاوں، بمبئی، ناگپور، وغیرہ سفر کرنا پڑا، تو حضرت مولانا نے وہاں کے ذمہ داروں کو جو ان سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، خطوط لکھے جن سے دارالعلوم کے تعارف میں بڑی مدد ملی، ہندوستان سے باہر آنے کے بعد بھی حضرت مولانا سے تعلق برابر قائم رہا، ہر حاضری و ملاقات پر وہ خصوصی شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، ان کی بڑی خواہش تھی کہ حضرت مولانا کے ہمراہ معینجیل جو ان کا آبائی وطن ہے وہاں کا سفر ہو جائے، افسوس، اپنے حالات کی بنا پر اس کا موقع نہ مل سکا، ان باتوں کا تقاضہ تھا کہ الفرقان کے خصوصی نمبر کے لئے کوئی علمی مقالہ تیار کرتا مگر اس وقت ہندوستان سے باہر ہوں، حضرت مولانا کے خطوط اور ان کی اکثر کتابیں یہاں موجود نہیں ہیں، اس لئے چند تاثرات پر اکتفا کر رہا ہوں تاکہ رسالہ الفرقان کے خصوصی نمبر کی بزم میں شرکت کا موقع مل سکے۔

تازہ خواہی داشتن گرد اغہائے سینہ را

گا ہے، گا ہے، باز خواں ایں دفتر پارینہ را

حضرت مولانا کا علمی رسوخ

حضرت مولانا نعمانی نے جس زمانہ میں اپنا علمی سفر شروع کیا تھا، وہ ہندوستان کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے، بڑے بڑے اکابر علماء و محدثین، فقہاء و ربانین موجود تھے۔ جن حضرات کے سامنے حضرت مولانا نے زانوئے تلمذتہ کیا تھا، ان میں کا ایک ایک فرد اپنے فن میں یگانہ روزگار تھا۔ خصوصیت کیساتھ حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ جن کے بارے میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شہادت ہے ”اگر وہ پچھلے دور میں پیدا ہوئے ہوتے تو طبقہ اہل علم میں ان کی بڑی شان ہوتی“ حضرت مولانا نعمانیؒ کا علامہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں خصوصی مقام ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ رہا، مطالعہ کا شغف تھا، درسی

وغیر درسی کتابوں میں جو اشکالات پیش آتے ان کے جوابات کو اہتمام سے نوٹ فرمالیا کرتے، اور علامہ کشمیری کی خدمت میں حاضری کے وقت پیش کرتے، شاہ صاحب کے جوابات بھی نوٹ فرمالیا کرتے، اللہ تعالیٰ نے قوت حافظہ اور ذکاوت و ذہانت کی دولت سے بھی نوازا تھا، حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ یہ سوالات حضرت الاستاذ کی خدمت میں میرا خصوصی ہدیہ ہوتے ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ ترمذی شریف کی ایک عبارت پر اشکال واقع ہوا، اس کو نوٹ کر لیا۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کے وقت اس کو پیش کر دیا، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا، مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، جس سال آپ دورے میں تھے، مجھے خوب یاد ہے میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے نسخوں میں ایک غلطی واقع ہو گئی ہے، لیکن لوگ سرسری گزر جاتے ہیں ان کو پتہ نہیں چلتا، ورنہ جو اشکال آپ کو پیش آیا ہے وہ انھیں بھی آنا چاہئے، یہ واقعہ دلیل ہے حضرت مولانا کے علمی رسوخ کی، جس کی شہادت ان کے استاد علامہ کشمیری دے رہے ہیں۔

غرض حضرت مولانا نعمائی نے کتابیں محنت سے پڑھیں اور پڑھائیں، کشمیری کے تلمذ و تعلق نے ان کے اندر علمی رسوخ و کمال پیدا کر دیا۔ کی تالیفات سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے، بالخصوص ان کی کتاب ”سب کے لئے یکساں قابل مطالعہ و استفادہ ہے۔“

ان کی ساری زندگی کے رفیق حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے ان کے علمی رسوخ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ”علمی رسوخ بہت اونچی چیز ہے، اور ایک خاص امتیاز ہے، میں اللہ کے گھر میں بیٹھ کر شہادت دیتا ہوں کہ مولانا کو علم حدیث میں، تفسیر میں، علم کلام اور فرقہ محرفہ اور منحرفہ کے بارے میں جو وسیع معلومات تھیں ان سے جو غیر معمولی واقفیت تھی اور ان کی کمزوریوں اور ان سے پیدا ہونے والے خطرات کا جتنا صحیح اندازہ ان کو تھا، وہ ہندوستان کے مشاہیر علماء کو بھی حاصل نہیں۔“ (تعزیتی جلسہ ندوۃ العلماء کی تقریر)

حضرت مولانا کے کامیاب مناظرے

حضرت مولانا نے اپنے وقت کے تمام فتنوں کا، وہ قادیانیت ہو یا بریلویت، علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک، ہو یا اور کوئی فتنہ، ان سب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، اور پوری طاقت سے ان کا رد کیا، اور مسلمانوں کو ان فتنوں کے نقصانات سے آگاہ کیا، اور ان کو بچانے کی کوشش کی۔



مولانا بیان فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور درس و تدریس کا کام شروع کیا، ہندوستان میں چند شدید قسم کے فتنوں سے سابقہ تھا، جن میں بعض داخلی تھے، اور بعض خارجی۔ خارجی فتنہ آریہ سماج کی شدھی سنگٹھن تحریک کا تھا، داخلی فتنوں میں ایک طرف قادیانیت کی یلغار تھی، اور اس کے مناظر و مبلغ پھیل رہے تھے، اور امت کے عقیدہ ختم نبوت کی جڑیں کھودنا چاہتے تھے، اور دوسری طرف بریلوی مکتب فکر کے شرک و بدعت نے سر اٹھا رکھا تھا، اس لئے حضرت مولانا نے بریلویوں کے تکفیری فتنے کی وجہ سے ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، اور ان سے پے بہ پے کامیاب مناظرے کئے، اس میدان میں ان کو اپنے اکابر علماء دیوبند کا پورا اعتماد حاصل تھا، حضرت اقدس حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا کو اپنا وکیل بنایا تھا، جو بہت بڑے اعتماد کی دلیل ہے۔

ندوة العلماء میں قیام کے زمانے میں ہمارے استاذ مولانا اسحاق سندیلوی کو ان کے قصبہ سندیلہ میں بریلویوں سے مناظرہ کی نوبت آگئی، اس سلسلہ میں انھوں نے مناسب سمجھا کہ مولانا نعمانی صاحبؒ سے مشورہ کر لیا جائے، جو اس میدان کے شہسوار رہ چکے ہیں، اس ناچیز کو ساتھ لیکر لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں جہاں حضرت مولانا نعمانیؒ کا قیام تھا حاضر ہوئے، مولانا نعمانی صاحبؒ ان دنوں مناظرہ چھوڑ چکے تھے، وہ دعوت و تبلیغ اور وعظوں کے ذریعہ فضا کی تبدیلی کو زیادہ مفید و موثر سمجھتے تھے، دوران گفتگو حضرت مولانا نے ایک دلچسپ قصہ ایک مناظرہ کا سنایا جس کو میں یہاں نقل کر رہا ہوں ”مبارکپور اعظم گڑھ میں احیاء العلوم مشہور مدرسہ ہے اس کے بانی حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مرحوم ہیں انھوں نے لکھا کہ یہاں بریلویوں سے مناظرہ کی نوبت آگئی ہے، اس لئے فلاں تاریخ کو یہاں تشریف لائیں، ان کے مناظر سید محمد کچھو چھوی ہیں، جو اس طبقہ کے بڑے محدث سمجھے جاتے ہیں، ہم نے چیلنج قبول کر لیا ہے“ مولانا نعمانیؒ نے بیان فرمایا کہ میں نے صبح کی ٹرین سے اپنی آمد کی اطلاع کر دی، مگر بعد میں رائے بدل گئی، جس کی ان کو اطلاع نہیں کی، صبح اسٹیشن پر نہ پا کر وہ لوگ واپس چلے گئے، لوگوں میں مایوسی ہوئی، بریلویوں نے اعلان کر دیا کہ ”دیوبند کے مناظر کا فرار“ بہر حال شام کی ٹرین سے مبارکپور پہونچا اور مولانا شکر اللہ صاحب سے عرض کر دیا کہ میری آمد کی کسی کو خبر نہ ہو، اور عشاء کے بعد جہاں ان لوگوں کا اسٹیج لگا ہوا ہے اس سے پچاس قدم دوری پر ہمارے پچاس آدمی بیٹھ جائیں بریلوی مناظر کو حضرت مولانا کی آمد کا خیال نہیں تھا اس لئے انہوں نے جلسہ کا آغاز کر دیا، اور ایک نوجوان کو جو داڑھی منڈا تھا، نعت رسول ﷺ کے لئے کھڑا کر دیا، مولانا فرماتے ہیں کہ اتنے

میں ہم اپنے ساتھیوں کو لیکر میدان مناظرہ میں گئے، اور ان پچاس آدمیوں کو اپنے ساتھ اٹھا کر اس مناظرہ کے سامنے بیٹھ گئے، یہ منظر دیکھ کر بریلوی محدث گھبرا گئے، مجھے خیال ہوا کہ مناظرہ تو ہو گا نہیں البتہ نقض امن کا بہانہ بنا کر پولس کو یہ لوگ بلا کر جلسہ ختم کر دیں گے، اس لئے میں نے ان سے مخاطب ہو کر یہ کہا کہ یہ دائرہ منہاجونعت رسول ﷺ پڑھ رہا ہے، یہ صریح بے ادبی ہے، اس کو منع کر دیں، اور یہ بتلائیں کہ کن مسائل پر مناظرہ کر رہے؟ محدث صاحب نے گھبراہٹ میں کہا کہ ہم وعظ کے لئے آئے ہیں۔ اتنے میں پولس آگئی، وہ پہلے میرے پاس آئی کہ نقض امن کا خطرہ ہے اس لئے جلسہ برخاست کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا پہلے واسطہ صاحب کو اٹھائیں، چنانچہ انھیں جا کر پولس والوں نے اٹھا دیا، جلسہ برخاست ہو گیا، اور ہماری کامیابی کا اعلان ہو گیا، یہ ہے مناظرہ کی حقیقت۔ اور یہ فرمایا کہ اس دور کے نئے و پرانے فتنے کا سد ماب دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا اور رد قادیانیت

قادیانیت کو حضرت مولانا اسلام کی فتح مکنی اور تخریب کاری کا دوسرا

کے رد کو وقت کا اہم فریضہ سمجھ کر مرزا غلام احمد قادیانی کی کفریات، اور

نو کی جو خود مرزا نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، ان سب کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا۔ اور دیگر جھوٹے دعویٰ کا ایسا بھانڈا پھوڑا کہ مولانا کی کتابوں کو پڑھنے والا قادیانیت اور اسکے بانی کو بھی نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، اس کو اس قابل بھی نہیں سمجھے گا کہ یہ شخص شرافت و انسانیت کا حامل سمجھا جائے چہ جائیکہ نبوت و رسالت کا۔

مولانا کی تینوں کتابیں ۱۔ قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ ۲۔ قادیانیت پر غور کرنا سیدھا راستہ ۳۔ کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت، یہ کتابیں اپنے موضوع پر بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں۔

آخری دور میں رد شیعیت کا منفرد کارنامہ

مولانا کے ضعف پیرانہ سالی، دیگر عوارض صحت اور مزید برآں بعض لحاظ سے معذوری کا دور شروع ہو چکا تھا کہ ایران کے آیت اللہ خمینی نے شاہ ایران کے خلاف اپنی تحریک میں کامیابی حاصل کی، اور خالص شیعہ عقائد پر مبنی حکومت قائم کر کے اسے اسلامی حکومت اور اسلامی

انقلاب کے نام سے مشہور کر لیا، ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسلمانوں کا نوجوان طبقہ اس حکومت کو واقعی اسلامی حکومت سمجھنے لگا، نہ کہ ایک خالص شیعہ حکومت اس لئے ضرورت تھی کوئی مرد خدا پروپیگنڈے کے اس طلسم کو توڑے، یہ کام اللہ نے حضرت مولانا سے لیا، حضرت مولانا نے خود خمینی کی کتابوں کو حاصل کیا، اور دیگر مستند شیعہ علماء کی کتابوں کے مطالعہ کا ایک طویل اور پر مشقت مرحلہ اپنی تمام کمزوری اور معذوری کے باوجود طے کر کے ”ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت“ کے نام سے ایک کتاب تالیف کی، جو اردو، انگریزی، اور عربی زبان میں اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے، اس کا اعتراف بڑے مشاہیر علماء عرب نے بھی کیا ہے۔

حضرت مولانا نعمانیؒ نے بہت سے ایسے اعمال چھوڑے ہیں، خصوصاً ان کی تالیفات جو ان کی ذات گرامی کو قیامت تک زندہ جاوید رکھیں گی۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق  
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

☆☆

## ہمارے یہاں

اپنی مطبوعات کے علاوہ ہندوستان کے بہت سے اداروں کی علمی، دینی، اصلاحی اور درسی وغیرہ درسی کتب کا بہت بڑا ذخیرہ ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ پوری واقفیت کے لئے پانچ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر ہماری فہرست کتب طلب فرمائیں۔

بسمارپتہ - الفرقان بکڈپوسٹ ۱۱۳/۳۱۳ نظیر آباد لکھنؤ-۱۸

مولانا محمد حنیف بلی  
سیخ الحدیث معہد ملت۔ مالہ گاؤں

## مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ

### اپنی تصنیفات کے آئینہ میں

مرحوم و مغفور حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمۃ  
سالہ زندگی میں جو زریں خدمات مختلف محاذ پر انجام دی ہیں وہ کسی تہ  
نہیں اللہ نے انہیں ایسا حساس اور درد مند دل بخشا تھا جو عیاں اور  
نظر رکھتا تھا۔ انکی زندگی کا ایک دور وہ بھی تھا جس میں انکا وجود باطل کے سبب تباہ  
کے نام سے باطل لرزتا تھا اور جسے مرحوم دین کا ایک ضروری اور خوش گوار فرض سمجھ کر انجام  
دیتے رہے، درس و تدریس کے ذریعہ انھوں نے ملت کے نو نہالوں اور خورد و کلاں کی جو تربیت  
فرمائی وہ ان کی خدمت کا انمول حصہ ہے، ملکی مسائل اور ملت کے مسائل کیلئے وہ جقدر حق گوئی  
اور بیباکی سے سرگرم عمل رہے انکے معاصرین میں اسکی نظیر نہیں ملتی، حکومت وقت کی دست  
درازیوں اور ملت کے ساتھ ہونے والے مظالم کا عہد ناتوانی تک جو مثالی دفاع کیا مسلم جماعتیں،  
مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل، مسلم پرسنل لا بورڈ، ان کی شرمندہ احسان ہے۔ غیر مسلموں  
میں جس حقیقت شناسی کے ساتھ محاسن اسلام پیش کر کے انہیں اسلام کی دعوت دی اس سے  
کوئی صاحب نظر، صرف نظر نہیں کر سکتا، تقریروں اور مواعظ کے ذریعہ مرحوم نے جو لشکر  
آراستہ کیا اور محاذ کو تادم زیت گرمائے رکھا وہ انھیں کا عظیم اور روشن کارنامہ ہے لیکن خدمات  
کے ان نت نئے محاذوں میں مرحوم نے اپنے حقیقت نگار قلم سے جو نقوش ثبت فرمائے اور  
تقاضوں کی رعایت کر کے اسلوب جدید میں جو قلمی خدمت انجام دی ہے وہ انہیں قیامت تک

زندہ رکھے گی۔ ذوق نے کہا تھا ۔  
 رہتا قلم سے نام زمانے تلک ہے ذوق  
 اولاد سے تو ہے یہی ددپشت چارپشت

مولانا منظور صاحب نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا نبضِ دوراں پر انگلی رکھ کر لکھا جو ملت کیلئے تیر بہدف اور انسانیت کیلئے آبِ زلال ثابت ہوا انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا مضربِ دل کی صدائے بازگشت اور حرفِ آخر ثابت ہوا، ان کی تحریر سے دلوں کی تاریک دنیا نے جلپائی اور گرم گشتِ راہ کو منزلِ کا پتہ ملا۔ ان کی تحریر و تصنیف کی یہ کوئی معمولی برکت نہیں ہے کہ جو لکھا دردِ دل اور دوائے دل ثابت ہوا اور نہ جانے کتنوں کو ان کی تحریر و تصنیف سے زندگی اور حوصلہ ملا، وقت کے تقاضوں کی رعایت کر کے لکھنا ان کی کتابِ زندگی کا روشن اور تابناک باب ہے۔ ان کی کتاب ”اسلام کیا ہے“ عہدِ ابتلاء کی زندہ جاوید اور انقلابی نشانی ہے۔ ۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی زندگی و بالِ دوش بنی ہوئی تھی۔ اسلام دشمن تحریکات ایک ایک کر کے خرمینِ اسلام پر بجلیاں گر رہی تھیں۔ مسلمان سہاروں سے محروم ملک کے گوشے گوشے میں اپنے وجود کی طرف سے فکر مند تھے۔ اسلام دشمن طاقتوں نے طے کر رکھا تھا کہ ہندوستان کو اسپین بنا کر رہیں گے۔ ایسے شہر آشوب ماحول میں مولاناؒ کے قلمِ حقیقت نگار نے حقائق و محاسن سے پردہ اٹھایا اور پوری عزیمت کے ساتھ عصیت و تنگ نظری میں گرفتار غیر مسلم صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ یہ کتاب مسلمانوں کے ایمان و یقین اور خود اعتمادی کا ذریعہ تو بنی ہی، غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کی راہ بھی ہموار ہوئی، غیر مسلم اردو داں اسکالروں نے اسے شوق کی نگاہ سے پڑھا، متاثر ہوئے، رجش، کنجی اور غلط فہمی بھی کم ہوئی اور بڑی حد تک فکر و نظر کی اصلاح ہوئی، ان حالات کو برپا کرنے میں مولاناؒ کے اخلاص کو خاص دخل حاصل ہے۔ یہ کتاب کئی زبانوں میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئی۔

مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انتہائی معرکہ الآراء تصنیف جسکی تکمیل انھوں نے زندگی کی تقریباً چالیس بہاروں میں فرمائی ہے وہ حدیث کا بے مثال انتخاب اور اسکی دلنواز تشریح ”معارف الحدیث“ ہے جو تقریباً ۸ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اس حقیقت کیلئے شاہد عدل ہے کہ خدا نے ان کی عمر میں کس قدر برکت عطا فرمائی ہے۔ کتاب اردو زبان میں حدیث رسول ﷺ کی گراں بہا موسوعہ (انسائیکلو پیڈیا) ہے جسے ابن حجر کی فتح الباری، علامہ عینی کی عمدۃ

القاری، علامہ عثمانی کی فتح الملہم، مولانا زکریا رحمہ اللہ کی لامع الدراری کی صف میں پیش کیا جاسکتا ہے یہ کتابیں تو حدیث کا شغف رکھنے والوں کیلئے ہیں لیکن ”معارف الحدیث“ تو عوام اور خواص سب کے لیے یکساں بیش بہا سرمایہ ہے جس سے ایک زمانہ فیض یاب ہو رہا ہے۔ کتاب میں جو مضامین درج ہیں وہ ایک انسان کی زندگی کے ہر شعبہ سے ہم آہنگ اور متعلق ہیں۔ مضامین انتہائی سہل، زبان میں بلا کی سادگی، تحریر میں غضب کی اپنائیت اور شیرینی سے مرقوم نے جس حدیث کی تشریح فرمائی ہے محو ہو کر اور اس میں ڈوب کر لکھا ہے۔ کتاب حدیث کا درس دینے والوں اور برکات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مجلسوں کو معمور رکھنے کے لئے بیش بہا علمی اور حدیثی اثاثہ ہے مولانا نے اس کتاب کے ذریعہ انسانی دل و دماغ کو متاثر کرنے اور دعوت عمل دینے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ ہم جیسے نیاز مند بھی ایسی مناسبتوں کیلئے کتاب کو بغور دیکھتے اور استفادہ کرتے ہیں بلکہ مختلف موضوعات پر عوام کیلئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ کتاب کے بہت سے مخصوص ابواب، مختلف دینی مدارس میں نصاب میں شامل ہیں۔ کتاب کی اس سے ہوتا ہے کہ خود دار العلوم ندوۃ العلماء میں عصر کی نماز کے بعد اس میں ندوہ کے تمام اساتذہ، طلبہ اور بہ نفس نفیس حضرت مولانا سید ابوال تشریف فرما ہوتے ہیں، حدیث کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے یہ کتاب اکیس مخاطب کی ضیافت طبع اور اثر آفرینی کیلئے یکسو ہو کر اپنی سی مبارک کوس کتاب چونکہ خدمت کے طور پر اخلاص و للہیت سے لکھی گئی ہے اس لئے اس کا معنوی اثر سننے اور پڑھنے والے کے دل میں چھپ چھپ کر جگہ بنا لیتا ہے اور بلا کسی تاخیر کے دل میں جذبہ عمل بیدار ہوتا ہے۔ خدا مولانا مرحوم کو جزاء خیر عطا فرمائے اور کتاب ان کی مغفرت کا ذریعہ ہو۔ صحاح حدیثوں کا یہ مجموعہ ہر طرح سے لائق مطالعہ ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ”برکات رمضان“ ہے، کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن رمضان روزوں سے متعلق حدیثوں کی حکیمانہ تشریح کی گئی ہے۔ جس کے مطالعہ سے مکمل شرح صدر ہوتا ہے اور دل میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا، روزوں سے متعلق یہ کتاب رموز، نکات، حقائق، اشارات اور نئے معنی کی بہترین اور دلنواز تشریح ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے دل و دماغ پر یہ تاثر ہوتا ہے۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات

عبارت کیا، اشارت، کیا ادا کیا

شروع کرنے کے بعد قاری ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ مرحوم نے روایات کے مضامین کو سمجھانے کے لئے حالات کا سہارا لیا ہے جسے پڑھ کر طبیعت چل جاتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد بلاشبہ دل سے دعا نکلتی ہے۔ ع  
جزاک اللہ چشم باز کر دی

اسکے علاوہ ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ، حج کیسے کریں، مسنون دعائیں، نماز کی حقیقت، الفرقان کا حضرت مجدد الف ثانی نمبر، حضرت جی نمبر، شیخ الحدیث مولانا زکریا نمبر، شاہ ولی اللہ نمبر، جیسی کو ششیں مولانا کے اتہب خامہ کا شاہکار ہیں جس پر اظہار خیال کرنے کیلئے دفتر بھی ناکافی ہو گا۔ یہ کتابیں مولانا کے کمال علم اور تجربہ معرفت کی حقیقت جاگتی تصویر پیش کرتی ہیں۔ درحقیقت امت پر ہونے والے احسان عظیم کا تو خالق کائنات ہی بدلہ دے گا ہم تو صرف مرحوم کے لئے رفع درجات اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ آمین

مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قلم بزارواں، جہاں دیدہ، تصنع سے پاک، عام فہم اور سادہ ہوتا ہے۔ قدرت نے انہیں مشکل ترین مضامین کو آسان زبان میں پیش کرنے کا بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ زبان ایسی میٹھی اور اپنائیت لئے ہوئے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا قصباتی بھی خوب محفوظ ہوتا ہے۔ سجع اور قافیہ آرائی سے پیدا ہونے والی غرابت اور تعقید (گراوٹ) سے ان کی تحریر پاک تھی نازک ترین موقع پر بھی مرحوم نے مغلوب الغضب صحافی اور اہل قلم کی طرح کوئی بات تحریر نہیں فرمائی، رکیک جذبات، یا وہ گوئی سے مولانا کی تحریر دھلی ہوئی تھی۔ ان کی تصنیفات کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ کہ وہ رمانے کے تقاضوں اور لوگوں کی نفسیات سے واقف تھے، ان کی آخری تصنیف جو ان کے وصال کے بعد شائع ہوئی ۸۰ سالہ انقلابی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ آپ بیتی بھی ہے جگ بیتی بھی۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد تاثر ہوتا ہے کہ ہم بھی معرکہ حیات میں مولانا کے ساتھ مجاہدات کی منزلیں طے کر رہے ہیں، کتاب پڑھنے والے کیلئے زندگی کی تاریک اور پرہیزگاروں میں قبلہ نما اور مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی کے تجربات اور نشیب و فراز کی مرحوم نے ایسی دل نشیں اور دلنواز تشریح کی ہے کہ مقصد کیلئے سفر کرنے والوں کا دل و دماغ روشن ہو جائے، تحریکات کا انقلابی اقدام، شخصیات کا جلوہ آفریں تذکرہ اس انداز سے فرمایا ہے کہ دل یقین کرتا ہے کہ وہی اور لدنی اوصاف ہیں جو اخلاص کی بنیاد پر کریم آقا کی طرف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ مولانا نے جا بجا اس کا اعتراف بھی

کیا ہے، کتاب اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتی ہے کہ گدڑی میں چھپے ہوئے لعل کی دریافت کیسے کی جائے اور کمال کی شناخت کیسے کی جائے۔ بزرگوں سے مراسم اور رسم و راہ کو بھی مولانا نے خداوند عالم کی نعمت غیر مترقبہ بتایا ہے۔ اس طرح ان کمالات کی وجہ سے یہ کتاب نئی نسل کیلئے بھی اپنی علمی، عملی، روحانی اور ایمانی تربیت کا پیش بہا سرمایہ ہے۔ کتاب حشو و زوائد سے پاک ہے۔ مولانا نے انہی حقائق کا تذکرہ فرمایا ہے جو سیرت، شخصیت اور تربیت سازی کا بڑا موثر ذریعہ ہیں۔ لوگوں کو یہ کتاب اسی جذبہ سے پڑھنا بھی چاہیے تاکہ یہ اوصاف خفیہ راہوں سے قلب و دماغ میں اپنی جگہ بنا سکیں۔

یہ کتاب مولانا کی زندگی کی سرگذشت اور آپ بیتی ہے جو بڑا نازک فریضہ ہے جس میں قدم قدم پر اپنی انا میں کھوجانے کا اندیشہ ہے لیکن مولانا نے اپنی زندگی کے احوال و کوائف کی اس انداز سے عکاسی فرمائی ہے کہ دور دور تک سب اور خود پسندی کا تائبہ بھی نہیں بلکہ خدا کی عظمت و کبریائی کا احساس اور اپنی بے بضاعتی اور کم سواوی کا اعتراف ہے۔ خود پسندی کے لئے گرز کا کام کرتی ہے۔ کتاب کا نام ”تحدیثِ نعمت“ اس سے بھی خاکساری، کسر نفسی اور تواضع مترشح ہے۔ ہم نے آپ اس میں کہیں نہ کہیں خود پسندی اور خود ستائی کا رنگ جھلک پڑتا ہے بن جاتی ہے۔ مگر یہاں سطر سطر تواضع کا مرتع اور سادگی میں ڈوبی ہوں۔۔۔ دل کی اس خطرناک بیماری کا علاج بھی ہے۔ انشاء اللہ پڑھنے والے بہت سے لوہر پارے اور جوہر پارے پائیں گے۔ خدا مولانا کو جزاء خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے سب کیلئے فکر و عمل کی شاہ راہ تعمیر کر دی ہے۔

مولانا تو اب خدا کے حضور پہنچ گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن یہ آرزو دل میں لیکر گئے کہ اگر زندگی وفا کرتی اور صحت ساتھ دیتی تو قرطاس و قلم سے کچھ اور خدمت کرتا مگر خدا کی ان بو جھی مشیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تقریباً سو سال زبان و بیان اور قرطاس و قلم سے خدمت کرنے والا مسافر علامہ وحید الدین بخٹو دہلوی کی زبان میں یہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔

اجل خدا کیلئے صرف دو گھڑی رک جا  
یہ مانگتے ہیں دعا میری زندگی کیلئے



فیصلہ قضا و قدر غالب آیا اور عمر بھر کا تھکا ہوا مسافر اپنی آخری آرام گاہ عیش باغ لکھنؤ میں آسودہ خواب ہے۔ خدا مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

☆☆

## اکابر امت کے حالات، ملفوظات، مکتوبات اور وصایا

تصانیف مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی

### مکتوبات خواجہ محمد معصوم

حضرت مجددؒ کے صاحبزادے اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات، جو ان کے ارشادات و ہدایات کے پورے کام کا آئینہ ہیں۔ قیمت - 55/-

### قافلہ اہل دل

مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ و جانشین حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ اپنے ملفوظات کے آئینہ میں دوران کے خلفاء کا تذکرہ۔ قیمت - 35/-

### تذکرہ شاہ عبدالرحیمؒ و ابوالرضاءؒ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ اور عم مکرم حضرت شاہ ابو الرضاء فاروقی دہلویؒ کے حالات ملفوظات اور مکتوبات کا انمول مجموعہ۔ قیمت - 18/-

### سراج الہند شاہ عبدالعزیزؒ مجددؒ دہلوی

مختصر حالات، ملفوظات، غیر مطبوعہ علمی و ادبی تبرکات۔ قیمت - 21/-

### تذکرہ حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ اور سلسلہ ولی اللہ کیا ایک گمنام درویش

حضرت شاہ ابوسعید قطبیؒ رائے بریلویؒ کے مختصر حالات۔ ساتھ میں ان کے ایک گمنام خلیفہ مجاز حضرت عبدالقادر خالص پوریؒ کا تذکرہ۔ قیمت - 14/-

ملنے کا پتہ : القرآن بکڈپو 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ-18

مولانا محمد زکریا سنہلی

استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

## محدث کبیر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

اور آپ کی شہرہ آفاق کتاب ”معارف الحدیث“

عم- محترم حضرت مولانا نعمانیؒ کی پوری زندگی دین اور گذری۔ اور خدمت دین کا یہ سلسلہ اتنا نوع بہ نوع اور مختلف الجہات۔ لوگوں کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل بہر حال ہے۔ عملی زندگی کے ابدی کامیاب مناظر بلکہ رئیس المناظرین تھے۔ اسی طرح کچھ وقت کے لئے وہ جماعت اسلامی کے ایک نہایت سرگرم رکن بلکہ اس کے مؤسسين میں نظر آتے رہے ہیں۔ پھر حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وینی دعوت میں (جسے عرف میں تبلیغی جماعت کہا جاتا ہے) شرکت و انہماک اور اُس کے لئے ہر طرح کی غیر معمولی قربانیوں کا دور چلا۔ اسکے علاوہ دوسرے دینی کاموں سے وابستگی اور اُن کے لئے دورے اور اسفار بھی جزو زندگی ہی رہے۔ اور ان سب کاموں کے ساتھ ماہنامہ ”الفرقان“ کی ادارت کی ذمہ داری نیز مختلف موضوعات پر پے بہ پے کتابوں کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مزید برآں زندگی کے اکثر حصہ میں وہ ہمیں ضروری قومی اور ملی کاموں میں بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ایسی ایک شخصیت کے لئے جس کے عملی میدان اتنے مختلف الجہات ہوں یہ امکان کہ وہ ایک عظیم اور بلند پایہ محدث بھی ثابت ہو ذرا کم ہی ہوتا ہے لیکن یہ امکان کبھی و قوع پذیر بھی بہر حال ہوتا ہے۔ اور حضرت مولانا مرحوم کا معاملہ الحمد للہ ایسا ہی ہے۔ وہ ان تمام مذکورہ مشاغل کے ساتھ ایک عظیم و کبیر محدث بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تحصیل علم و دین کے ایسے مواقع عطا فرمائے تھے جسے اس کا

خاص الخاص فضل ہی کہا جائیگا۔ وہ ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے خصوصاً ان کے والد باوجود تاجر اور زمیندار ہونے کے۔ دینی اور دنیوی معاملات میں نہایت خدا ترس، عبادت گزار اور صوفی صافی بزرگ تھے۔ پھر انہیں رسمی طالب علمی کے پورے زمانہ میں بہت ہی دین دار اور بلند پایہ اساتذہ میسر آئے۔ جن کا اثر آپ کی سیرت و کردار اور علمی و دینی مزاج پر پڑنا ناگزیر تھا۔ حضرت مولانا کریم بخش صاحب ”سنبھلی“ جو آپ کے ہم وطن، قریبی عزیز اور حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ رشید، اور اپنے وقت کے اصحاب درس اور اہل اللہ علماء میں شمار ہوتے تھے، حضرت مرحوم کے ابتدائی استاذ اور اتالیق تھے دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کا زمانہ شروع ہوا اس وقت دارالعلوم دیوبند میں ایسے اساتذہ تشریف فرما تھے کہ علم کے ساتھ تعلق مع اللہ میں شاید جس کی مثال سارے عالم اسلام میں بھی ملتی مشکل ہو ان حضرات کے سرخیل حضرت مولانا علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ تھے جو اپنے وقت کے حافظ ابن حجر اور علامہ مینی تھے۔ ان کے دیکھنے والوں اور قریبی واقفیت رکھنے والوں کا خیال ہے کہ نہ انکے دیکھنے والوں نے انکی مثال دیکھی نہ خود علامہ کشمیری نے اپنی نظیر دیکھی تھی۔ ایسے اساتذہ کرام سے بڑھنے کا شرف مولانا کو نصیب ہوا۔ علاوہ ازیں تحصیل علم دین لیلے جو دیگر اسباب و ذرائع ہیں اللہ تعالیٰ نے انکا بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔ والدین کا اخلاص انکی دعائیں رزق حلال پھر طالب علم (حضرت مولانا نعمانی) کا اخلاص نیت اور اپنے مقصد میں انہماک اور اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ غیر معمولی حافظہ اور ذہانت یہ سب چیزیں تھیں جن کو دالک فصل اللہ یوتیہ من یتنا، واللہ ذو الفضل العظیم کا مصداق ہی کہا جائے گا۔

مولانا نے دیوبند کے اساتذہ سے اکتساب فیض کیا اور ان کے بحر علم سے خوب خوب یہ اب ہوئے۔ خاص کر حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے ساتھ خصوصی عقیدت نے آپ کو بہت فائدہ پہنچایا۔ انھیں حضرت شاہ صاحب کے درس کی باتیں اس طرح یاد تھیں جیسے یہ نکل لی باتیں ہوں۔

۱۹۷۶ء میں احقر کا تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت مدرس ہوا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے ترمذی شریف پڑھانے کے لئے دی گئی۔ جتنی محنت و مطالعہ خود کر سکتا تھا کرتا تھا لیکن بہت سی جگہیں ایسی رہ جاتی تھیں جن میں تشنگی باقی رہتی۔ ایسے مقامات کے حل اور اپنی تشنگی کے لئے عم محترم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنا اشکال عرض کرتا تھا۔ آپ کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ بات سنتے ہی مسئلہ کی پوری وضاحت فرما دیتے۔ اکثر انداز یہ ہوتا تھا کہ ”بھئی حضرت

شاہ صاحبؒ تو اس بات کو اس طرح کہتے تھے۔ ”انداز بیان اتنا سادہ ہوتا کہ مشکل سے مشکل مسئلہ نہایت سہل ہو جاتا۔ حضرت شاہ صاحب کے حوالہ سے بعض ایسی باتیں آپ ذکر کرتے تھے جن کا احقر کو کسی شرح میں ذکر نہیں ملتا تھا۔ ایسی باتیں کافی ہیں لیکن یہاں زیادہ موقع نہیں، صرف ایک بات ذکر کرتا ہوں تاکہ ایک خاص علمی امانت محفوظ ہو جائے، اور ساتھ ہی یہ اندازہ بھی کیا جاسکے کہ حضرت مرحوم نے شاہ صاحب سے کس درجے کا استفادہ کیا تھا اور کس حد تک آپ کے افادات کو محفوظ رکھا تھا۔

ترمذی شریف کے آخر میں امام ترمذیؒ کا ایک مختصر سار سالہ ”کتاب العلل“ کے نام سے ہے جو غالباً عام طور پر پڑھایا نہیں جاتا احقر کو تو اسکا بڑھنایا نہیں۔ لیکن یہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جب اس کو پڑھانے کا موقع آیا تو ایک جگہ ایسی آئی کہ کسی طرح بات نہ بنتی تھی۔ وہاں پر بات یہ چل رہی تھی کہ بعض محدثین نے بعض جلیل القدر راویان حدیث کو ان کی جلالت شان کے باوجود ضعیف قرار دیا ہے۔ اور یہ سبب ضعف اتنا خفی ہے کہ

ہے اس کی مثال کے طور پر امام ترمذیؒ نے حضرت علی بن المدینی (۱)

نے اپنے استاذ یحییٰ بن سعید القطان سے (۲) محمد بن عمرو بن ملقمہ (۳)

کہ وہ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، تو حضرت استاذ (یحییٰ بن سعید)۔

العفو او تُشَدَّد؟“ یعنی جرح و تعدیل کے بارے میں تمہارے یہاں کچھ مفود در گذر رہا ہے یا تمہارا معیار اس کے بارے میں بہت سخت ہے؟۔ علی بن المدینی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ میرے یہاں شدت ہے اس پر حضرت یحییٰ بن سعید نے فرمایا تو پھر محمد بن عمرو تمہارے کام کے نہیں ہیں۔ یعنی تمہارے معیار کی رو سے وہ مجروح ہونگے۔ ثقہ نہیں مانے جائیں گے۔ اور سبب جرح یہ بتلایا کہ وہ ابو سلمہ (۴) اور یحییٰ بن عبد الرحمن بن حاطب (۵) کو اپنا ”شیخ“ بتلاتے ہیں۔ یہ وہ جگہ تھی جو کسی طرح حل نہیں ہوتی تھی اور وجہ اشکال یہ تھی کہ یہ دونوں حضرات جن کو محمد بن عمرو اپنا شیخ (استاذ) بتاتے ہیں اگر واقعی وہ دونوں ان کے شیخ ہیں تو پھر ایسا کہنے سے محمد بن عمرو کے مجروح ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اور اگر فی الواقع یہ دونوں حضرات ان کے

(۱) اپنے زمانے کے بلند پایہ محدثیں ہیں۔ امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ سمرقند کے باشندے تھے، ۲۳۴ھ میں وفات ہوئی۔

(۲) یہ بھی بصری ہیں اور علی بن المدینی کے استاد، محدثین میں نہایت بلند مقام اس وفات ۱۹۸ھ

(۳) مدینہ طیبہ کے ردیان حدیث میں سے ہیں۔ ۱۳۵ھ سال وفات ہے۔

(۴-۵) یہ دونوں حضرات بھی مدنی ہیں۔ سال وفات علی الترتیب ۹۴ھ اور ۱۰۴ھ سے۔

استاذ نہیں تو محمد بن عمرو کا انکو اپنا شیخ کہنا کھلی غلط بیانی ہے۔ اور اس شکل میں تو وہ کسی پست سے پست معیار والے محدث کے معیار پر بھی ثقہ نہیں قرار دئے جاسکتے۔ سخت معیار کی قید کا کیا سوال؟ الغرض مجھے کوشش کے باوجود کہیں اس اشکال کا حل نہیں مل پایا کہ آخر اس میں باریک اور خفی بات کیا ہے؟

میں عم محترم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا اشکال وضاحت کے ساتھ عرض کرنا چاہا، ابھی میں نے اپنے بات شروع ہی کی تھی کہ آپ مسکرائے اور فرمایا کہ جس وقت میں امر وہہ میں پڑھاتا تھا یعنی (۳۱-۱۹۳۰ء) اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ بیمار ہو کر ڈابھیل سے دیوبند واپس آچکے تھے۔ اور وہیں قیام تھا۔ میں ہر ایک دو ماہ کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اپنے اور مدرسہ کے دیگر اساتذہ کے کچھ علمی سوالات بھی لے جاتا اور حضرت سے ان کا جواب لیکر آتا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں کے ترمذی شریف کے استاذ نے میرے ذریعہ یہی اشکال حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں بھیجا۔ میں نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر جب یہ اشکال کیا تو حضرت شاہ صاحبؒ مسکرائے اور فرمایا لوگ اللہ جانے کس طرح پڑھاتے ہیں اور کس طرح اس جگہ سے گذر جاتے ہیں۔ آپ دوسرے شخص ہیں جنہوں نے یہ اشکال کیا ہے۔ پھر اشکال کا جواب دیا اور فرمایا۔ محدثین کی اصطلاح میں ”تیخ“ کا لفظ اُسی استاذ کے لئے بولا جاتا ہے جس کی باقاعدہ شاگردی کی گئی ہو۔ اور بکثرت روایات اُس سے لی ہوں۔ اگر صرف چند روایات لینے کی حد تک استاد شاگردی کا رشتہ قائم ہوا ہو تو ایسے استاد کیلئے شیخ کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ”شیخ“ کا لفظ استعمال کریگا تو اگرچہ یہ جھوٹ تو نہ ہو گا لیکن سننے والوں کیلئے غلط فہمی میں پڑنے کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے محمد بن عمرو کا یہ بیان کہ ابو سلمہ اور یحییٰ بن عبد الرحمن میرے شیخ ہیں جھوٹ تو نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ان دونوں سے بعض روایات حاصل کی ہیں لیکن دوسروں کے لئے غلط فہمی کا ذریعہ ہے کہ یہ باقاعدہ استاد شاگرد ہیں۔ اور یہ ایک بلند مقام محدث کی شان عالی کے خلاف ہے۔ لہذا جن حضرات کے یہاں جرح و تعدیل کے مسئلہ میں کچھ عنود و رگدڑ کی گنجائش ہے ان کے نزدیک تو محمد بن عمرو ثقہ ہی کہے جائیں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے کوئی جھوٹ نہیں کہا لیکن جو حضرات زیادہ محتاط ہیں اور ان کا معیار اس سلسلہ میں زیادہ سخت ہے ان کے یہاں محمد بن عمرو مجروح قرار دیئے جائیں گے۔ مسئلہ بالکل حل ہو گیا اور بات سمجھ میں آگئی۔ الغرض علمی مسائل میں مشکل سے مشکل مقامات پر حضرت مرحوم کے یہاں نہایت تشفی بخش جوابات ہوتے تھے۔

## معارف الحدیث

آپ کی جملہ تصانیف انتہائی سہل اور عام فہم زبان میں ہونے کے باوجود آپ کے رسوخ فی العلم اور قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ سے گہری واقفیت کی واضح دلیل ہیں لیکن معارف الحدیث تو چونکہ علم حدیث ہی کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے اس لئے اس میں آپ کے علم حدیث کا مقام جیسا واضح ہوتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ تصنیف کا مقصد جیسا کہ اسکی جلد اول کے دیباچہ میں ذکر فرمایا گیا ہے اس زمانہ کے خاص حالات و ضروریات کا لحاظ رکھ کر اردو میں حدیث نبوی کی ایک ایسی خدمت کرنا ہے جس کے ذریعے عام تعلیم یافتہ مسلمانوں تک رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و ہدایت پہنچے اور انکے لئے اتباع نبوی کی راہ ہموار ہو نیز بعض گمراہ فرقوں نے احادیث کے معانی و مطالب میں جو غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں یا آج کل کے حالات میں جب کہ مغربی علوم و نظریات کی ترقی اور اشاعت نے پوری انسانی دنیا کے طرز فکر، زیادہ متاثر کر دیا ہے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں جن غلط فہمیاں اُن کا سد باب ہو سکے۔ اس مقصد کے ماتحت جہاں اس کتاب کا عام فہم میں علمی شان کا ظہور بھی ناگزیر تھا۔ اور یہ بات کہ علمی گفتگو بھی بالہ کسی بڑی سے بڑی حدیث کی کتاب کی شرح کرنے سے بھی زیادہ مشکل اور محنت جس کا حق حضرت مولانا نعمانی جیسی شخصیت ہی ادا کر سکتی تھی۔ جس کا علم بھی وسیع و عمیق ہو، علم کے ساتھ دین میں بھی جس کا قدم راسخ ہو، جس کو قلم پر بھی اعلیٰ درجے کی قدرت ہو اور اپنے زمانے کے حالات اور مزاج سے واقفیت کے ساتھ فہم و فراست کی دولت سے بھی مالا مال ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس انتہائی اہم اور بروقت کام کیلئے اپنے فضل و کرم سے ایسی ہی شخصیت کا انتخاب فرمایا۔ اور یہ سلسلہ معارف الحدیث وجود میں آگیا۔ فلله الحمد۔

## معارف الحدیث کے مضامین

معارف الحدیث کی اب تک سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں، آٹھویں جلد بھی ان شاء اللہ جلد ہی طبع ہونے والی ہے۔ پہلے جلد میں عقائد کا بیان ہے جس میں حقیقت ایمان و اسلام، اسلامی اعمال، تقدیر اور قیامت اور اُس کے مابعد جنت، دوزخ سے متعلق احادیث کا بیان ہے۔ شروع میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ایک غیر معمولی، نہایت مفید اور علمی مقدمہ حجیت حدیث کے موضوع پر ہے جو خود ایک بیش قیمت کتاب

یار سالہ کا درجہ رکھتا ہے۔

دوسری جلد میں کتاب الرقاق اور کتاب الاخلاق سے متعلق احادیث ہیں۔ رقاق سے مراد رسول اللہ ﷺ کے وہ ارشادات، وہ خطبات و مواعظ اور آپ کی زندگی کے وہ حالات و واقعات ہیں جن کے پڑھنے اور سننے سے دل میں رقت و خشیت اور گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ رقاق کی احادیث ہی میں زہد کی احادیث بھی ذکر کی گئی ہیں جن کے پڑھنے سے دنیا کی طرف سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

کتاب الاخلاق میں پہلے وہ احادیث درج ہوئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق کا دین اسلام میں کتنا بلند مقام ہے۔ اور بد اخلاقی اللہ و رسول کے نزدیک کتنا بڑا جرم ہے۔ بعد ازاں اچھے اخلاق کے مختلف شعبوں مثلاً سخاوت، احسان، ایثار و قربانی، باہمی انس و محبت، دینی اخوت، نرم مزاجی، خوش کلامی، صدق و امانت، تواضع خاکساری، شرم و حیا، صبر و شکر اور اخلاص و للہیت سے متعلق احادیث مذکور ہیں اور ان کے مقابلے میں بد اخلاقی کے مختلف شعبوں کی مذمت اور ان کے برے انجام سے ڈرانے والی حدیثیں بھی اسی انداز سے درج ہوئی ہیں۔ کتاب کی تیسری جلد کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں خود مولانا کے قلم سے بعنوان دیباچہ علم حدیث کی تاریخ پر ایک بہترین اور بیش قیمت مگر مختصر مضمون ہے۔ حدیث تراویح پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے اسکا مطالعہ بے حد مفید ہو گا۔

کتاب الطہارۃ میں اولاً وہ احادیث ذکر فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں طہارت کس درجہ محبوب اور ناپاکی کس درجہ مبغوض ہے۔ پھر طہارت کی جملہ اقسام مثلاً استنجاء، وضوء، منسل، تیمم وغیرہ سے متعلق احادیث ہیں جن سے ان اہمال کا طریقہ اور ان کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے۔

کتاب الصلوٰۃ میں اولاً نماز کی اہمیت پر ایک نہایت جامع اور مفید مضمون ہے اس کے بعد اسی مضمون کی احادیث ہیں پھر اوقات صلوٰۃ، اذان، نماز باجماعت، مسجد کی اہمیت، نماز کے ارکان و اعمال کا صحیح طریقہ، پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ دوسری نمازوں مثلاً جمعہ، عیدین کی نماز، سورج و چاند گرہن اور خشک سالی کی نماز اور نماز جنازہ وغیرہ سے متعلق احادیث ہیں۔ جس میں احکامات کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کی کیفیات کا بھی بیان آتا ہے۔

کتاب کی چوتھی جلد کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج پر مشتمل ہے۔ کتاب کی جلد کے شروع میں بھی حضرت مولانا کے قلم سے دیباچہ ہے جس میں اس کتاب کا تعارف

اور اُس کی کچھ خصوصیات کا ذکر ہے۔ کتاب الزکوٰۃ کے شروع میں مولانا کا ایک تمہیدی مضمون دین میں ”زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کا مقام“ کے عنوان سے ہے جس میں زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کے مقام کے بیان کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ ماعین زکوٰۃ سے قتال و جہاد کرنے پر صحابہ کا اجماع امت مسلمہ کا پہلا اجماع ہے۔ پھر زکوٰۃ کی اہمیت سے متعلق دیگر احادیث اور اس کے بعد زکوٰۃ سے متعلق احکامات کی تفصیلی روایات ہیں۔ نیز نفلی صدقات کی اہمیت اور اُن پر اجر و ثواب کے وعدوں والی احادیث بھی آخر میں درج کی گئی ہیں۔

کتاب الصوم کے شروع میں ”اسلام کے ارکان اربعہ میں روزہ کی خاص نوعیت“ کے عنوان سے ایک مضمون ہے جس میں روزہ کی اس خاص تاثیر کا تذکرہ ہے کہ روزہ کے ذریعہ انسان میں صفت تقویٰ پیدا ہوتی ہے جو ایک ملکوتی صفت ہے اور صفت حیوانیت یا صفت بہیمیت پر قابو حاصل کرنے میں روزہ بڑا معین و مددگار ہوتا ہے۔ پھر رمضان المبارک اور اُس کے روزوں کے فضائل سے متعلق احادیث ہیں۔ احکامات کی بھی روایات ہیں اور اس کے تراویح، نفلی روزوں سے متعلق احادیث ذکر فرمائی ہیں۔

کتاب الحج کے شروع میں ایک مختصر سا مضمون ”حج کیا ہے؟“

میں حج کی حقیقت۔ کہ وہ اللہ کے دربار کی حاضری اور حضرت ابراہیمؑ

اور طور طریقوں کی نقل کر کے اُن کے سلسلہ اور مسلک سے اپنی وابستگی اور

اور اپنے کو ان کے رنگ میں رنگنے کا نام ہے۔ تفصیل سے اجاگر کی گئی ہے۔ اس کے بعد حج کی فرضیت، اسکی فضیلت اور حج نہ کرنے والوں کے لئے وعید کی احادیث ذکر کی گئی ہیں۔ اس کے بعد از اول تا آخر حج کے احکامات سے متعلق احادیث کچھ اس طرح ذکر فرمائی ہیں کہ اگر پڑھنے والا ذرا توجہ سے پڑھ لے تو حج کا پورا نقشہ ذہن نشین ہو جائے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حج جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے کے تذکرہ کی احادیث ہیں۔ آخر میں حرمین شریفین کے فضائل اور روزہ اطہر کی زیارت کی روایات ہیں۔

معارف الہدیث کی پانچویں جلد کا عنوان ہے ”کتاب الاذکار والدعوات“ اس جلد کا مقدمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔ جس میں دعا خصوصاً رسول اللہ ﷺ سے مروی و منقول دعاؤں کے بارے میں بہترین کلام فرمایا گیا ہے۔ اس مقدمہ کے چند جملے پڑھ لیجئے اور خود اندازہ کر لیجئے کہ پورا مقدمہ کس درجے کی افادیت کا حامل ہوگا۔ مولانا مدظلہ لکھتے ہیں۔



”آپ ﷺ نے انسانیت کے خزانے کو اور دنیا کے ادب کو دعاؤں کے ان حواہات سے مالا مال کیا جن کی نظیر اپنی آمداری و درخشانی میں صحف سماوی کے بعد مل سکتی۔ آپ نے اپنے مالک سے ان الفاظ میں دعا کی جن سے زیادہ موثر اور بلیغ الفاظ، جن سے زیادہ مہر و مہر و مہر و مہر انسان لائیں سکتا۔ یہ دعائیں مستقل معجزات اور دلائل نبوت ہیں۔ ان کے الفاظ تہمتیں ہیں۔ وہ ایک پیغمبر ہی کی زبان سے نکلے ہیں۔ ان میں نبوت کا نور ہے۔ پیغمبر کا یقین ہے۔ مدد کامل کا نیا ہے۔ محبوب رب العالمین کا اعتماد و تار ہے۔ فطرت نبوت کی معصومیت اور سادگی ہے۔ دل، رد مند و قلب مضطر کی بے تکلفی دے سکتی ہے۔ صاحب عرض و حاجت مند کا اصرار و اضطراب بھی ہے اور بارگاہ الوہیت کے ادب شاس کی احتیاط بھی، دل کی جراحت اور درد کی کک بھی ہے اور چارہ سار کی چارہ ساری اور دل واری کا یقین و سرور بھی، درد کا اظہار بھی اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ درد دہا، اونی و در مانی بنور۔“

حضرت مولانا علی میاں کے مقدمہ کے بعد حضرت مولانا نعمانی صاحب کے قلم سے ایک مختصر دیباچہ بھی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں کے ایک خاص پہلو کو بہت اجاگر کیا ہے کہ آپ کی دعائیں آپ کی نبوت کی دلیل ہیں جن کو غیر مسلموں میں دعوت اسلام کے لئے بطور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے اور مسلمانوں کے اطمینان قلب کا بھی ان میں بڑا سامان ہے۔

اس جلد میں اولاً ذکر اللہ کی فضیلت، اسکی عظمت اور برکات سے متعلق احادیث ہیں پھر بعض خاص اذکار کی فضیلت سے متعلق روایات ہیں۔ پھر دعا کی حقیقت، اسکے آداب اور اس سے متعلق ہدایات پر مشتمل روایات ذکر کی گئی ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جن میں آپ کی ہر طرح کی دعاؤں کا ذکر ہے۔ آخر میں صلوٰۃ و سلام سے متعلق روایات ہیں اور درود شریف کے مختلف الفاظ والی روایات کا بیان ہے۔

جلد ہشتم میں معاشرت یعنی آپسی تعلقات اور گھریلو زندگی نیز اپنے قرب و جوار کے اور مختلف جینتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے حقوق سے متعلق احادیث مذکور ہیں۔ اس کے دیباچہ میں حضرت مولانا نے اسلام میں معاشرتی احکام کی اہمیت اور حقوق العباد کے ادا کرنے کی تاکید اور اس کی ادائیگی میں کوتاہی پر اللہ کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب کی وعیدوں پر ایک نہایت مفید کلام فرمایا ہے۔ معاشرتی حقوق کی ان احادیث کے ضمن میں حیوانوں اور جانوروں تک کے حقوق سے متعلق احادیث بھی ہیں۔ اس کے بعد ”آداب ملاقات“ اور ”آداب مجلس“ کے زیر عنوان سلام مصافحہ، معانقہ، گھریں داخل ہونے کے آداب اور مجلس

سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کا بیان ہے۔ آپسی گفتگو، ہنسی مذاق وغیرہ کے سلسلہ میں نیز چھینکنے اور جھپٹائی لینے کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی کیا ہدایات ہیں اس کا بھی ذکر ہے۔ اس کے بعد کھانے پینے اور لباس کے احکام و آداب سے متعلق احادیث ذکر کی ہیں جن کے ضمن میں ستر اور پردے سے متعلق احادیث بھی آجاتی ہیں۔

جلد ہفتم میں اولاً کتاب المعاشرة کا باقی حصہ (جو جلد ششم میں نہ آسکا تھا) یعنی نکاح و طلاق سے متعلق احادیث ہیں۔ اس کے بعد کتاب المعاملات یعنی خرید و فروخت سے متعلق احادیث ہیں۔ کتاب المعاملات کا دائرہ کافی وسیع ہے اس میں رزق حلال حاصل کرنے کی فضیلت (خواہ وہ تجارت کے ذریعہ ہو یا صنعت و حرفت اور زراعت کے ذریعہ ہو) سے متعلق احادیث بھی درج ہیں۔ پھر ناجائز طریقہ پر کمائے ہوئے مال کی نحوست کو بیان کرنے والی روایات ہیں۔ اس کے بعد رباعی سود کی روایت کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد بیع و شراء کے احکامات متعلق روایات ہیں۔

اسی سلسلہ میں ہدیہ تحفہ دینے لینے کا ذکر اور اسکی فضیلت کا: اللہ، وصیت، نظام قضاء، نظام حکومت اور خلافت و امارت سے متعلق ہیں۔

جلد ہشتم جو ابھی زیر طبع ہے کتاب العلم اور کتاب المناقب والفصل و میرہ سے متعلق احادیث پر مشتمل ہے۔ ابواب العلم کے علاوہ اس میں رسول اللہ ﷺ، آپ کے صحابہ کرام، آپ کے اہل بیت (جن میں ازواج مطہرات، بنات طہبات اور آپ کے دونوں نواسوں) کے مناقب کا بیان ہے۔ اس کی طباعت کے بعد یہ کتاب مکمل ہو جائیگی۔ یہ کتاب اردو ہی نہیں غالباً دنیا کی کسی زبان میں بھی اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے۔

### معارف الحدیث کا نہج اور طرز

جس زمانہ میں حضرت نے اس کتاب کی تصنیف کا آغاز کیا تھا (یعنی بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کا آغاز) وہ زمانہ پوری دنیا میں مغربی علوم و نظریات کی ترقی اور بالادستی کا زمانہ تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ مذہب بیزاری اور اللہ و رسول کی باتوں پر بے اعتمادی تھا۔ اسی زمانہ میں فتنہ انکار حدیث بھی زوروں پر تھا۔ جس سے مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بہت متاثر نظر آ رہا تھا اور اس کی وجہ سے اُن کا ایمان متزلزل اور دینی حقائق پر سے یقین اٹھتا جا رہا تھا۔ اس لئے مصنف علیہ الرحمہ نے اس زمانہ کے حالات، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن و مزاج کو سامنے رکھ کر اپنی اس

کتاب کی تصنیف کا آغاز اس طرز پر کیا جس سے اولاً تو ایک مسلمان کو اللہ و رسول سے قلبی تعلق پیدا ہو، پھر قرآن و حدیث کے بیان کردہ حقائق پر یقین و اعتماد نصیب ہو جائے اور وہ قرآن و حدیث کے بیان کردہ حقائق کو حقائق سمجھنے لگے۔ محض تبرک کی چیزیں یا خدا نخواستہ افسانوی باتیں نہ سمجھے۔ الحمد للہ حضرت مصنفؒ اپنی اس کوشش میں بہت کامیاب ہیں۔ ویسے ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

کتاب کا انداز یہ رکھا گیا ہے کہ اولاً ایک موضوع کی احادیث کا انتخاب فرما کر ان کو ایک عنوان کے تحت رکھتے ہیں۔ عام طور پر اس عنوان ہی سے احادیث مذکورہ کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ پھر احادیث کو اس ترتیب سے ذکر کرتے ہیں کہ محض یہ ترتیب ہی بعض اوقات مطلب کے سمجھنے اور اشکالات کے رفع ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ حدیث کا متن درج کرنے کے بعد اس کا اردو ترجمہ کرتے ہیں جس میں اصل مقصود، حدیث کے مفہوم و مدعا کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اسی لئے تحت اللفظ ترجمے کی یا لغوی تراکیب کی پابندی نہیں فرماتے۔ اس کے بعد ”تشریح“ کے عنوان سے حدیث کے مفہوم کی وضاحت فرماتے ہیں۔ جس میں نفس حدیث کی وضاحت کے ساتھ حدیث پر واقع ہونے والے کسی اشکال یا کسی دوسری حدیث سے اس کے بظاہر تعارض و تضاد کا جواب اور حل بھی ہوتا ہے۔ اور ایسی احادیث کے درمیان نہایت سہل تطبیق ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی احادیث ذکر کرنے سے پہلے ایک تمہیدی اور مرکزی مضمون بیان فرماتے ہیں۔ جس میں آئندہ ذکر کی جانے والی احادیث کے مدعا و مقصد کا بیان نیز احادیث میں مذکور مسئلہ سے متعلق مختلف پہلوؤں پر کلام ہوتا ہے۔ یہ مضمون علم حدیث کے طلبہ بلکہ اساتذہ کے لئے بھی غیر معمولی اہم اور قیمتی شے ہے۔ اس سے اس سلسلہ کی احادیث کا صحیح مفہوم سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں فن حدیث سے مناسبت اور اس کا صحیح ذوق جو عام طور پر حدیث کی کتابوں کی کئی کئی شرحیں پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہو پاتا نصیب ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کا صحیح اندازہ کتاب پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

### خصوصیت اعتدال

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور دارالعلوم دیوبند کے دیگر اساتذہ حدیث کے ذوق و مزاج پھر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علوم و معارف سے ذہنی مناسبت اور زندگی بھر رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے شغف، کتب حدیث کا نہایت وسیع و عمیق مطالعہ اور اس کے ساتھ

ساتھ امت مسلمہ میں دینی دعوت کی فکر اور اس میں عملی انہماک یہ ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے حضرت مولانا کے مزاج میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ جو پوری کتاب میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا کسی بھی مسئلہ میں خواہ وہ اعتقاد سے تعلق رکھنے والا ہو یا عام زندگی کے اعمال سے یا وہ عبادات کے مختلف فیہ مسائل میں ہی سے کیوں نہ ہو، جادہ اعتدال سے کہیں ذرہ برابر بھی ہٹتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اصل حقیقت تو اس بات کی کتاب کے مطالعہ ہی سے سمجھ میں آئے گی۔ لیکن میں اس سلسلہ میں کچھ مثالیں بھی قارئین کے لئے ذکر کرتا ہوں کہ یہ تو اندازہ ان مثالوں سے ہو ہی سکتا ہے۔

فقہی اختلافات کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان ائمہ کے تمام فقہی مسائل ایک درخت کی قدرتی شاخیں یا ایک بڑے دریا سے نکلنے والی نہریں ہیں، ان سے کاسہ چشمہ ایک ہی ہے اور ان میں کوئی تضاد اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا ہے کہ ہماری درس گاہوں میں اس معاملے کو اس طرح بعض ائمہ کے بندے حدیث کے استاد ہونے کے باوجود حقیقت اور حقائق باطل کے اختلاف کا سادہ جہ دیتے ہیں۔ حضرت مصنفؒ کے ذوق و آپ کے ایک مکتوب کا کچھ حصہ نقل کرتا ہوں۔ جو یقیناً اے ایک یاسین صاحب کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا تھا جس میں :۔ میں معارف الحدیث کے ترجمہ کی اجازت چاہی تھی۔ ان صاحب کو ترجمے کی اجازت دیتے ہو۔ تحریر فرماتے ہیں کہ

” میں نے اپنے نزدیک ان احادیث کی ترجمہ میں مسلکی تعصب کی مایہ ناز ساری نہیں کی ہے بلکہ تعلق فقہی اختلافی مسائل سے ہے۔ ہاں یہ بات میرے پیش نظر ضرور رہی ہے کہ مصنفؒ صد میں روئے بولنے اور سمجھنے والوں کی غالب اکثریت جو حسی المسک ہے اس کو اپنے مسلک کے بارے میں اطمینانی نہ ہو۔ میں نے اس کو دینی مصلحت سمجھا۔ سہر حال اس صورت حال کا لحاظ کرتے ہوئے کہ سوا حلی رہاں بولنے والوں کی اکثریت شافعی المسک ہے، کتاب الصلوٰۃ میں یا جہاں بھی معارف الحدیث میں فٹ نوٹ لکھنے کی ضرورت سمجھی جاوے وہ ضرور لکھا جاوے۔ میرے نزدیک یہ بھی دینی مصلحت ہے۔“

حضرت مصنف کے اعتدال و بے تعصبی بلکہ درحقیقت آپ کے اس ذوق و مزاج کی دلیل کہ کسی بھی شخص، خواہ وہ اپنے امام، امام ابو حنیفہ ہی کیوں نہ ہوں، کے تعلق کے مقابلہ میں

وواجبات ہیں وہ غیر اہم اور غیر ضروری ہیں۔ ایسا سمجھنا اور احادیث میں ایسی موشگافیاں پیدا کرنا فی الحقیقت سلامت فہم اور خوش مذاقی سے بہت دور ہے۔ حدیث کے طالب علم کو یہ اصول ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ امت کے ایک شفیق معلم اور شفیق مربی ہی۔ اور شفیق معلم کا طریقہ یہی ہوتا ہے اور یہی اس کے لئے صحیح بھی ہے کہ وہ جس موقع پر جس بات کی تلقین و تعلیم زیادہ مناسب سمجھتا ہے بس اس وقت اتنی بات بتلاتا ہے۔

### گر کی باتیں

اپنی اس کتاب ”معارف الحدیث“ میں جو اگرچہ اُردو زبان میں ہے، مولانا نے بعض ایسے اصول بیان کر دیئے ہیں جو فن حدیث کے اساتذہ کے لئے بھی بہت مفید ہوں گے۔ اور یہ اصول بالعموم حضرت مولانا انور شاہ یا اُن کے اساتذہ یا پھر حضرت شاہ ولی اللہ کے ہی بیان کردہ ہوتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں قال لا اله الا الله دحل الحجة کی حاصی طول تشریح کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ اس قسم کی آیات یا احادیث پر غور کرتے وقت ایک اصولی بات یہ ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ اس قسم کی بشارتوں میں متکلم کا مقصد اور سطح نظر کسی عمل خیر کی ذاتی خاصیت اور اس کا اصل اثر بتلانا ہوتا ہے۔ قطع نظر اس سے اگر دوسرے اعمال کا تقاضہ اس کے خلاف ہو تو پھر انجام کیا ہوگا۔ اگر یہ چھوٹا سا نکتہ ملحوظ رکھا جائے تو وعدہ و وعید اور ترغیب و ترہیب کے سلسلہ کی صدا حدیثوں کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی اور اس کی وجہ سے جو الجھن ہوتی ہے وہ انشاء اللہ نہ ہوگی۔

حضرات اساتذہ ایسی سلجھی ہوئی اور مختصر باتوں کو زیادہ اہمیت اپنے درس میں نہیں دیتے حالانکہ یہ اصول و ضوابط فہم حدیث اور اطمینان قلب کیلئے بہت مفید و معاون ہوتے ہیں۔ خصوصاً نئے ذہن کو مطمئن کرنے کیلئے تو یہ اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔

کتاب کا اصل مقصد چونکہ مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین اور آپ کے بیان کردہ دینی حقائق سے قریب کرنا اور ان کے دل و دماغ میں ان حقائق پر یقین اور اطمینان پیدا کرانے کی کوشش کرنے کے علاوہ ان کو آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی ترغیب دینا بھی ہے۔ اس لئے کتاب میں جگہ جگہ دعوتی پہلو بھی ملتا ہے۔ مثلاً ہمایوں اور پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ایسے ارشادات جن میں انکی حق تلفی کرنے والوں کو آپ ﷺ نے بار بار قسم کھا کر فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ ذکر کرنے اور انکی حاصی تشریح کرنے کے بعد حضرت مولانا لکھتے ہیں ہم مسلمانوں کا اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اور عام ہندوگان خدا کے

ساتھ جو معاملہ اور برتاؤ ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کی روشنی میں ذرا ہم اپنے ایمانوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آپ کی ان احادیث کی رو سے ہمارا مقام کیا ہے اور ہم کہاں ہیں۔ اسی طرح یہ حدیث شریف کہ ”آدمی کے اسلام کی خوبی اور اسکے کمال میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ فضول اور غیر مفید کاموں سے بچے“ ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ لایعنی اور بے حاصل چیزوں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کرتے ہیں وہ نادان نہیں جانتے کہ اللہ نے ان کو کتنا قیمتی بنایا ہے اور وہ اپنے کیسے بیش بہا خزانہ کو مٹی میں ملاتے ہیں۔ اس حقیقت کو جس نے سمجھ لیا بس وہی دانا اور عارف ہے۔

اسی طرح کتاب الزکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض وہ روایات ذکر کر کے جن میں حتی الوسع سوالات سے منع فرمایا گیا ہے مولانا فرماتے ہیں افسوس جس پیغمبر کی یہ ہدایت اور یہ طرز عمل تھا اس کی امت میں پیشہ ور سانکوں اور گدا گروں کا ایک طبقہ موجود ہے اور کچھ لوگ وہ بھی ہیں۔ عالم یا پیر بن کر معزز قسم کی گداگری کرتے ہیں، یہ لوگ سوال اور گداگری اور دین فروشی کے بھی مجرم ہیں۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت جس کا ذکر مضمون میں پہلے ہی بعض اہم علمی باتوں کو مولانا نے بڑے سہل انداز میں ذکر کر دیا ہے ا لئے مزید ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے ہی قیام مکہ کے زمانہ میں ہی زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی لیکن یہ حکم اجمالی تھا تفصیلات ۲ھ میں نازل ہوئی ہیں۔ لہذا جن مصنفین نے یہ لکھا ہے کہ زکوٰۃ ۲ھ میں فرض ہوئی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے متعلق مسائل کی تفصیلات ۲ھ میں نازل ہوئی ہیں۔

یا اسی طرح ایک بہت ہی عمدہ بات روزہ سے متعلق ایک حدیث کی تشریح میں لکھی ہے۔ حدیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا ”علیک بالصوم فانہ لا مثل له“ یعنی روزہ رکھا کرو اس جیسا کوئی عمل نہیں۔ مولانا کی تشریح کا حاصل یہ ہے کہ ہر نیک عمل کی ایک خاصیت ہوتی ہے جس میں کوئی دوسرا عمل اس کا سہیم و شریک نہیں ہوتا۔ روزہ کی وہ خاصیت نفس کو قابو میں رکھنا اور اسکی خواہشات کو دبانے ہے۔ پس اس خاصیت میں روزہ کا کوئی مثل نہیں۔ اس تشریح کے بعد حدیث کے جملہ فانہ لا مثل له پر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

اس طرح ایک روایت میں سو آدمیوں کے قاتل کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے۔ اس کی

تشریح میں فرماتے ہیں یہ دراصل صرف ایک جزئی واقعہ کا بیان نہیں بلکہ اس پیرائے میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت و وسعت اور اس کے کمال کو بتلایا ہے۔

اسی طرح کی ایک بہت اہم علمی بات سجدہ تحیہ (سجدہ تعظیسی) کے عدم جواز کے بارے میں مولانا نے ایک حدیث کی تشریح میں تحریر فرمائی ہے۔ حدیث میں یہ ذکر ہے کہ آپ کو ایک اونٹ نے سجدہ کیا یہ دیکھ کر بعض صحابہ کرام نے اپنے لئے بھی یہ اجازت چاہی کہ ہم بھی آپ کو سجدہ کر لیا کریں۔ آپ نے منع فرمادیا۔

حضرتؒ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام کی اجازت طلبی سجدہ عبادت کے لئے تو ہو ہی نہیں سکتی۔ ظاہر بات کہ یہ اجازت مانگنا سجدہ تحیہ کے لئے ہی ہوگا۔ اور آپ نے اسے بھی منع فرمادیا۔ اسی طرح ایک حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کی بجائے مٹی یا بالو سے رگڑ کر صاف کر لئے مولانا فرماتے ہیں اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ کھانا کھا کر تولیہ یا کاغذ یا کسی بھی ایسی چیز سے ہاتھ صاف کئے جاسکتے ہیں۔ جن سے ہاتھوں کی صفائی ہو جائے۔ اور ایسا کرنا بھی سنت کے دائرہ میں ہی ہوگا۔

پوری کتاب اس طرح کی عالمانہ مگر نہایت سہل اور عام فہم باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور اپنے اصل مقصد میں بھی کہ مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے قرب بلکہ انس و محبت اور آپ آپ کے لائے ہوئے دین کی اتباع نصیب ہو جائے غیر معمولی حد تک کامیاب ہے۔

فن حدیث پر مولانا کی ایک درسی کتاب الفیۃ الحدیث بھی ہے جو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور وہاں کے سابق مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ جس میں ایک ہزار حدیثیں جمع کی گئی ہیں اسی لئے اس کا نام الفیۃ الحدیث ہے اس میں بھی احادیث کے انتخاب اور ان کی ترتیب سے فن حدیث میں مولانا کے غیر معمولی مقام اور مسلکی رواداری کے رویے کا صاف اظہار ہوتا ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند اور اس کے نفع کے بہت سے مدارس میں شامل درس ہے اور مشکوٰۃ المصابیح سے پہلے پڑھائی جاتی ہے۔

قطب الدین ملا، ایم، اے  
فاضل دینیات۔ بیلگام

## میری محسن کتاب ”دین و شریعت“

بعض مشاہیر اہل قلم نے ان کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جی۔ کت۔ ۱۱۰۔  
کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ یا ان کے ذہن و فکر کو ایک نیا محرک  
مشاہیر اہل قلم ہی کی پیروی میں ”میری محسن کتاب“ ایک ایسا عنوان  
نے بہت ساری کتابوں پر بہت کچھ لکھا ہے، اس موقع پر اس عاجز کا بھ  
کا ارادہ ہے۔

یہ خدا کا فضل و کرم اور لطف و احسان ہی تھا کہ اس عاجز کو شروع ہی سے مطالعہ کا شوق  
رہا، اسی کے ساتھ تحقیق و جستجو کا کچھ ذوق بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اسی ذوق مطالعہ کی وجہ  
سے بہت ساری کتابیں نظر سے گزریں، کوئی رہبر، کوئی مربی، اس امر میں نہیں تھا کہ صحیح کی  
طرف رہنمائی اور غلط کی نشاندہی کرتا۔

بچپن میں والد محترم جناب محمد حسین صاحب ملا مرحوم و مغفور کے ساتھ نمازوں کو  
جاتا اور کبھی اہم راتوں میں بیان ہوتا اس کو سنتا، اس لئے مزاج میں دینی رنگ شروع ہی سے تھا،  
لیکن دینی محنت کسی بھی نوعیت کی نہ ہونے کی وجہ سے پورے ماحول پر بے دینی و بدعات کے  
اثرات تھے، عاجز کی عمر دس گیارہ سال کی تھی کہ والد بزرگوار کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہائی اسکول کے  
زمانہ میں عربی زبان سیکھنے کے شوق و جذبہ نے ایک قاسمی عالم مولانا بشیر احمد صاحب فیض  
آبادی علیہ الرحمۃ (۱) کے پاس پہونچا دیا، اس کے نتیجہ میں خیالات میں تبدیلی آنا شروع ہوئی،

(۱) موصوف اچھے خطیب و واعظ تھے، ہزاروں اشعار اور برتے۔ حضرت مدنیؒ سے بیعت کا تعلق تھا، عاجز نے انہی سے صرف و

کوئی انتہائی کتابیں پڑھیں تھیں۔



عقائد شرکیہ اور اعمال باطلہ سے کچھ واقفیت ہو گئی۔ چند ہی سالوں میں کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ مولانا موصوف اپنے وطن واپس چلے گئے، لیکن یہ مدرسہ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے مولانا عبد الباری صاحب مدظلہ، (خلف مولانا عبد الجبار صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مراد آباد) مرحوم مولانا قاری ضیاء الدین صاحب بخاری خطیب بمبئی، مرحوم مولانا سراج احمد صاحب قمر بارہ بنکوی وغیرہ حضرات علماء کی خدمات میسر ہوئیں۔

بہر حال ایک وقت وہ آیا کہ میں اس مقام پر کھڑا تھا جہاں مذہبی گروہ بندیاں سامنے آتی گئیں اور مطالعہ کی سمتیں متعدد ہوتی گئیں۔ جماعت اسلامی کی کتابیں اور رسالے زیر مطالعہ رہے، ماہنامہ تجلی والحسنات وغیرہ کو بھی دیکھنے کا معمول رہا، پس اب تک خیالات کی جو عمارت کھڑی ہو گئی تھی وہ ڈھیر ہوتی نظر آنے لگی۔ پھر نگارشات ”نگار“ اور غلام جیلانی برق جیسے مصنفین کی تصنیفات ”دو اسلام“ اور ”دو قرآن“ جیسی کتابوں کے مطالعہ نے ایک ذہنی کشمکش اور تذبذب میں مبتلا کر دیا، اور باغی تحریرات نے بغاوت کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا اس میں کسی کی رہبری و رہنمائی بھی میرے نزدیک مشکوک تو تھی، معتبر نہیں تھی اس اندھا دھند مطالعہ نے ذہن کو اتنا پرانگندہ کر دیا کہ راہ حق کی جستجو میں اصل راہ ہی گم ہوتی نظر آنے لگی۔ تذبذب، شبہات، پرانگندگی، خلش، برہمی، بغاوت کی کشمکش، پتہ نہیں ذہن میں کیا کیا بھر گیا تھا، صحیح کیا ہے، غلط کیا؟ فیصلہ مشکل اور دل کا فیصلہ یہ کہ حق کی یافت کے بغیر زندگی مشکل۔ حضرات علماء کے بارے میں یہ بات گویا ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ بحث و مباحثہ کے گورکھ دھندوں کے علاوہ انھیں کچھ کام ہی نہیں، انہو اکتنی جسارت کی تھی یہ بات لیکن ع

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی

خدا کا کرم کہ ذوق تجسس حق کا آرزو مند رہا، اب یہ نہیں معلوم کہ کس پس منظر میں اور کیسے یہ دعا معلوم ہو گئی کہ

ربنا ارنا الحق حقاً و ارزقنا اتباعہ

وارنا الباطل باطلا و ارزقنا احتسابہ

خدا کا یہ بھی اس عاجز پر کرم رہا کہ اس نے اس دعا کے اہتمام کی توفیق نصیب فرمائی اور یاد پڑتا ہے کہ پانچ چھ سال تک اس دعا کا اہتمام رہا۔

حضرت کے قلم کی سادگی اور الفاظ کے نپے تلے استعمال نے متاثر کیا۔ بعد کے چند سالوں میں یہاں مولانا سراج احمد صاحب قمر مرحوم (بارہ بنکوی) (۲) مدرسہ فرقانیہ میں مدرسہ کیلئے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ مولانا علی میاں ندوی دامت برکاتہم کے قلم میں بلا کی بلاغت اور حضرت نعمانی کے قلم میں الفاظ کا حسن انتخاب جو لفظ جہاں تحریر فرمادیتے ہیں وہاں اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا ان کی تحریر کی انتہائی خصوصیت ہے۔

الفاظ کے اس بر محل استعمال کے علاوہ حضرتؒ کی تحریر کی سادگی و سلاست ہے، میری کوتاہ نظر میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ ۔

مقام کا ہو اور تحریر اتنی سلیس و سادہ ہو، علوئے مرتبت کے ساتھ تحریر کی اتنی سادی شاید مناسی شان گردانی جائے۔ لیکن حضرت مولاناؒ کے یہاں تو شان کی کچھ حقیقت ہی نہیں تھی وہ تو ”جان“ پر جاں چھڑکتے تھے۔ قلم کی شان و شوکت اپنا لوہا منواتی ہے لیکن سادگی و بے ساختگی دلوں کو متاثر کرتی ہے۔

اس سلاست و سادگی کی بھی ایک نرالی داستان ہے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۱ء کی رات آٹھ بجے یہ عاجز اپنے رفقاء کے ساتھ حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس موقع پر بر سبیل گفتگو فرمایا کہ ”اسلام کیا ہے“ کا مسودہ تیار ہو گیا تو اس کو اپنی اہلیہ محترمہ کے ہاتھ میں تھما دیا اور ان سے یوں کہا کہ اس کو پڑھو اور جہاں کوئی لفظ یا بات سمجھنے میں دشواری پیش آئے اس جگہ نشان

(۱) مولانا موصوف، یہاں پہلی میں ایک دارالعلوم چلاتے ہیں، اور جمعۃ العلماء سے تعلق ہے، قادیانیوں کا خوب تعاقب کیا۔

(۲) مولانا سر اج احمد صاحب قمر بارہ بنکوی اچھے شاعر اور خطیب تھے، بامیری ایکشن کمیٹی سے بھی تعلق رہا۔ دینی تعلیم کو نسل

لگادو۔ پھر نشان لگائے ہوئے مقامات کو اور زیادہ سہل الفہم بنا کر دوبارہ تحریر کیا۔ تب جا کر یہ کتاب قابل اشاعت سمجھی گئی۔ اس لئے اس کتاب کو ایک عامی سے عامی بھی مزے لیکر پڑھتا ہے اور آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا ہے۔

اسی بے ساختگی اور سادگی نے قلم میں ایک زبردست تاثیر عطا کی تھی۔ یہ تاثیر قوت آپکی تحریر کی تیسری نمایاں خصوصیت ہے۔ قلم کی اس اتر انگیزی نے اپنا اثر کہاں کہاں تک اور کتنا دکھایا اس کو اللہ علیم ہی بہتر جانتا ہے۔ خود حضرت نے مذکورہ گفتگو کے دوران یہ بھی فرمایا تھا کہ پنڈت سند رلال اس کتاب سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ (۱)

مذکورہ چوتھی خصوصیت کے علاوہ پانچویں خصوصیت وہ ہے کہ جس سے صرف نظر کرنا آپ کی تحریر کے حق میں نا انصافی ہوگی۔ پتہ نہیں کہ حضرت نے علم نفسیات حاصل کیا تھا یا یہ کہ نفس شناس اکابرین کی نگاہ فیض کی کرشمہ سازی تھی؟ اور یا پھر اللہ حکیم ہی نے ان کو اس دولت سے بہرہ ور فرمایا تھا کہ ذہن جدید کی نفسیات سے حد درجہ واقفیت رکھتے تھے۔ اور اسکو متاثر کرنے کے لئے سائنسی طرز تحریر (Scientific way Of writing) اختیار فرماتے تھے۔

بات کو ثابت کرنے کے لئے دلائل کے پر پیچ و طولیل راستے کے بجائے طریقہ وجدانی اختیار فرماتے تھے۔ جس کی وجہ سے قاری کا ذہن دلائل کی طرف جانیکی بجائے بات کو وجدانی طور پر قبول کر لیتا ہے۔ یہ آپ کی تحریر کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔

خبر بات دور چلی گئی۔ عاجز کے مطالعہ میں حضرت کی کتابیں آتی چلی گئیں۔ لیکن جس کتاب نے مجھے متاثر ہی نہیں بلکہ مسحور کیا وہ آپ کی ایک بہت ہی وقیع کتاب ”دین و شریعت“ ہے۔ پڑھتا چلا گیا، پڑھتا چلا گیا۔ جوں جوں آگے بڑھتا ہر دماغ کی گریں کھلنا شروع ہو گئیں۔

اس کتاب کا انداز تحریر ہی نرالا تھا۔ سادگی کے باوجود زبان و ادب کی چاشنی تھی۔ ایک ایسی چاشنی کہ کسی ادبی ذوق رکھنے والے کو متاثر کرنے کی پوری قوت اپنے اندر رکھتی تھی۔ پھر موضوعات مختلفہ و ضروریہ پر جس روانی، بر جستگی اور تسلسل کے ساتھ بحث کی گئی تھی۔ وہ بے مثال تھی۔ اور موضوع بحث کو کچھ ایسے نفسیاتی پہلوؤں کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ایک جدت پسند ذہن اس کو فوراً قبول کر لے۔ ان ساری باتوں نے از حد متاثر کیا اور

(۱) پنڈت جی سدھو ستال کے بہت مشہور پڑھے لکھے اور صاحب تصانیف شخصیت تھے، مسلم مجلس مشاورت کے زمانہ میں حضرت کا اس سے ملا حاض ہوا تھا۔

کتاب وصاحب کتاب کی عظمت کا معترف ہونا پڑا۔

اس کتاب میں عملی شریعت کے عنوان سے ارکان اربعہ کے سلسلہ میں جو بحث کی گئی ہے وہ ذہن جدید کی تشفی و اطمینان کے لئے کافی تھی۔ بہت مختصر مگر ضروری امور پر بحث کرتے ہوئے اور غیر ضروری حشو و زوائد سے اجتناب کرتے ہوئے بس اتنی بحث کی گئی ہے جتنی کہ ضرورت متقاضی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس بحث کو پڑھنے کے بعد شریعت اسلامی کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دینے والا بھی نماز کی طرف راغب ہو جائیگا۔ پھر نماز کو نماز بنانے کے لئے جو اصولی ہدایات دی گئی ہیں وہ ضخیم کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ اس طرح بقیہ ارکان زکوٰۃ، روزہ اور حج کے بارے میں اصولی بحث کی گئی ہے۔ اور ان ارکان کے سلسلہ میں عام طور پر جو غفلت اور کوتاہی ہوتی ہے اس کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

”اللہ کے جوہدے اس فریضہ کو ابھی تک ادا بھی کرتے ہیں اس میں سے کہ کے مارے میں اور ادائیگی کے طریقہ میں بڑی بے فکری اور بے اعتنائی ہے۔“

اور نفلی روزوں کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ ”نماز کے بارے میں ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو صرف فرض رکعتوں پر قناعت کرتا ہو اور سن و سال نہ پڑھتا ہو۔ بلکہ اگر کوئی ایسا طرز عمل اختیار کرے تو اسے بری نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور اس کے متعلق اچھا خیال قائم نہیں کیا جائے گا لیکن روزہ کے باب میں قریب قریب ہم سب کا طرز عمل یہ ہی ہے کہ بس رمضان کے روزے سال میں ایک دفعہ رکھ لیتے ہیں“ اور حج کی روح کے سلسلہ میں توجہ دلاتے ہوئے فرمایا ہے کہ

”امس ہے کہ لوگ مادی ضروریات کی تو فکر کرتے ہیں، ہمک، مرچ، اچار، چٹنی تک ساتھ لے جاتا چاہتے ہیں، دس دس جوڑے سواتے ہیں، اور مہینوں پہلے سے اس چیزوں کے انتظام کی فکر کرتے ہیں، لیکن حج کے لئے روحانی تیاری کی فکر کرنے کا بالکل رواج نہیں، اسی لئے اکثر جانے والے جیسے جاتے ہیں ویسے ہی چلے آتے ہیں۔“

یہی نہیں کہ صرف مرض دکھایا گیا ہو بلکہ موقع بہ موقع اس کا علاج بھی اور آسان نسخہ بھی بتایا گیا ہے، زیر بحث عنوان کے آخر میں ارکان اسلام کے رکن ہونے کی وجوہات بھی بڑے دلنشیں انداز میں پیش کی گئی ہے، جو بلاشبہ سیکڑوں صفحات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، مگر طوالت کے

خوف سے تفصیل میں نہیں جاسکتا۔

اخلاق حسنہ کے بارے میں اعمال صالحہ کی چار قسمیں بیان کر کے اخلاق کی امتیازی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور خلاصہ بحث کے طور پر یہ سطور قسم فرمائی ہیں

”سہر حال اخلاق کی اصلاح کا معاملہ صرف تکمیلی چیز نہیں ہے، کہ صرف برگ اور کامل بننے کے لئے اس کی ضرورت ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے اور دوزخ سے بچنے کے لئے جس طرح نمار، رورہ ضروری ہے اسی طرح برے اخلاق سے بچنا اور اچھے اخلاق کا اختیار کرنا ضروری ہے۔“

”معاملات اور معاشرت“ کے باب میں ان کی امتیازی حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا

ہے کہ

”ان میں اپنی دنیوی مسعت اور مصلحت اور اپنی خواہش نفس کی اور اللہ کے احکام کی تکفل دوسری تمام چیزوں سے زیادہ رہتی ہے اس لئے بندہ کی بندگی اور فرمایداری کا سب سے زیادہ سخت امتحان معاملات اور معاشرت کے احکام میں ہے۔“

اس کے بعد ”دین کی خدمت و نصرت“ کا عنوان ہے جو ۲۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے دینی خدمت کے سلسلے میں پھیلی ہوئی بیسیوں مغالطہ انگیزیوں سے نکالنے والا ہے جس میں کار نبوت، نیابت نبوت، اور دینی خدمت کے مختلف شعبے مثلاً دعوت و تبلیغ، تعلیم و تزکیہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور قتال فی سبیل اللہ وغیرہ پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ پھر اس دینی خدمت و نصرت ہی کے سلسلے میں خلافت راشدہ کے موقف و حقیقت پر بھی بحث کرتے ہوئے انتخاب خلیفہ کے مسئلے کی نوعیت پر کچھ اس طرح گفتگو کی گئی ہے کہ بہت سی وہ گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں جو مسئلے کے بارے میں شیعہ و سنی اختلاف کی بنیاد ہیں۔ اس بحث میں ایک سمجھ دار اور غور و فکر کرنے والے کے لئے اپنے لئے راستہ کا انتخاب کرنے کی بہترین رہنمائی موجود ہے۔

”سیاست و حکومت“ کے زیر عنوان اصولی امور کا ذکر کیا گیا ہے جن سے وہ مسلمان بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مسلم حکومتوں میں رہتے ہیں اور وہ بھی جو غیر مسلم اور سیکولر حکومتوں میں رہتے ہیں۔ اور ”اسلام کا مقصد اصلی قیام حکومت الہیہ“ کے نظریہ کے تحت جن مغالطوں دو چار ہونا پڑتا ہے اور راہ اعتدال چھوٹ جاتی ہے اس کی اصلاح کے لئے یہاں ایک معتدل

قرآنی راہِ عمل سامنے آجاتی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ سیاسی فکر و بصیرت رکھنے والوں کے لئے ایک بہت ہی مفید اور کارآمد حصہ ہے۔

سب سے آخر میں ”احسان و تصوف“ کا عنوان ہے۔ تصوف میری نظر میں وہ زہر تھا جو امت کو تریاق سمجھ کر دیا گیا تھا۔ اور اس لئے طبیعت کا یہ حال تھا کہ ع مجھے تو پسند نہیں یہ طریق خانقاہی

الغرض جتنا کچھ مغالطہ در باب تصوف تھا، اس باب نے اس سے نکال کر، ”احسانی کیفیت“ کی ضرورت اور اس کے متعلقات کے بارے میں اطمینان و انشراح نصیب فرمایا۔ اور حقیقت حال کا پتہ چلا کہ

سردیں مارا خبر اور را نظر  
اودرون خانہ ما بیرون در  
ماکیسا دوست ما مسجد فروش  
وز دست مصطفیٰ پیانہ نوش

در اصل یہ کتاب اسلام کی سب سے زیادہ بنیادی چیز ”توحید“

ہوتی ہے۔ اس باب میں توحید کے سلسلہ کی جتنی ضروری اور اصولی باتیں

ہے، ان اصولی مباحث نے اس سلسلہ کی بہت ساری گتھیوں کو سلجھا دیا۔ اور یہ بحث کچھ ایسی پر اثر اور پر کشش اور مبنی پر حقیقت تھی کہ اہل بدعت و ضلالت کی تعمیر کردہ بڑی بڑی عمارتیں ریت کا تودہ نظر آنے لگیں۔ اور یہ بیان قرآن کو زبان قرآن میں پیش کرنے کی ایک نہایت کامیاب کوشش تھی، گویا علوم قرآن اسلوب قرآن میں پیش کرنے کا ایک نادر ملکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ توحید و شرک کا فرق دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کی طرح الگ کر کے دکھادیا تھا۔

اس کے بعد مسئلہ آخرت کی حقیقت پر صرف دس صفحات کے اندر اس انداز میں بحث کی گئی تھی کی آخرت کی ضرورت اور اس کے لوازمات اور منافع کو دل کے ساتھ دماغ اور دماغ کے ساتھ دل بھی شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ (۱)

آخرت کے بعد، ”رسالت“ کا عنوان شروع ہو جاتا ہے۔ رسالت اور اس کے متعلقات کے سلسلہ کی یہ بحث قریباً (۶۰) ساٹھ صفحات پر پھیل گئی ہے۔ کتاب کا کوئی عنوان اور

(۱) طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو یہاں تک کا یہ تبصرہ اس بات کا متقاضی تھا کہ اس پر شرح و بسط سے لکھا جاتا لیکن اپنی بساط بھی تو ہو۔

موضوع اتنا طویل نہیں جتنا کہ یہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فکر و نظر یہیں زیادہ ٹھوکر کھاتی ہے۔ مصنف کی نگاہ حقیقت شناس نے اس کو دیکھ لیا تھا اس لئے اس بحث کو قدرے بڑھ و تفصیل سے تحریر کیا۔ کتاب کا یہی وہ باب ہے جس نے مجھے زیادہ متاثر کیا اور میرے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا۔

مقام رسالت کے سلسلہ میں مختلف اہل قلم کی جو افراط و تفریط مطالعہ میں آئی تھی، جس کی وجہ سے ذہنی خلش کا شکار ہو گیا تھا۔ اس باب نے تسلی اور تشفی کا کافی سامان بہم پہنچایا۔ بشریت انبیاء کے نزاعی مسئلہ کو اس سادگی کے ساتھ واضح کیا گیا تھا کہ مخالف و موافق ہر دو کے لئے حق کو عین الحق کے ساتھ دیکھنا آسان ہو۔ اور شدت جذبات پر ایسی پابندی لگادی گئی تھی کہ ع شرک کی حد میں نہ آجائے عقیدت بڑھ کر دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کی ”اجتہادی غلطیوں“ کی جو بھول ذہن کو لگ گئی تھی یا بعض تحریروں نے دی تھی اس سے نجات ملی۔ اس امر کو کس سادگی اور اعتدال کے ساتھ ”امر حق“ کی طرح پیش کیا گیا ہے اسکو ملاحظہ فرمائیے۔

”امیاء علیہم السلام کے ایسے اجتہادات عموماً صحیح ہوتے ہیں اور اگر کبھی لغزش (۱) ہوتی ہے تو فوراً وحی کے ذریعہ انکو اطلاع دے دی جاتی ہے اور اسکی تصحیح کر دی جاتی ہے اور حب وحی کے ذریعہ کوئی تصحیح نہ کی جائے تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حکم الہی وہی ہے جو نبی نے اپنے اجتہاد سے سمجھا اور پھر وہ مسئلہ اجتہادی نہیں رہتا بلکہ ”معلق بالموجی“ ہو جاتا ہے یعنی اسکا درجہ وہی ہوتا ہے جو وحی کے ذریعہ آنے والے احکام کا ہوتا ہے“

مقام ولایت کے سلسلہ میں ایک طرف سے جو غلو اور دوسری طرف سے جو صرف نظر مطالعہ میں آتا ہے اسکی وجہ سے کسی ذہن میں اس خلش کا پیدا ہونا یقینی ہے لیکن مقام ولایت کو یہاں جس اعتدال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ایک سلیم الطبع کی شرح صدر کے لئے کافی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں

”اسی عمدہ ایک بات یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کسی دلی کو ولی ماننا شرط ایمان تو نہیں ہے لیکن جو واقعی اولیاء اللہ ہیں تو وہ اس بات سے جاتکے سول یا موجود ہوں اس سے عداوت اور بغض و عناد رکھنا سخت محرومی ہے اور بڑا وبال ہے۔ حدیث قدسیہ میں عادی الہی و بیافقد آدنتہ الحرب (صحیح بخاری)

یعنی اللہ تعالیٰ کا رستہ ہے، جس نے میرے کسی دلی سے دشمنی کی تو میری طرف سے اسکو اعلان جنگ ہے اسلئے اولیاء اللہ کے ساتھ ہمارا رویہ ہمیشہ ادب و عظمت کا ہونا چاہئے۔ ہاں اسکی گنجائش ہے کہ ادب و عظمت کے باوجود کسی خاص معاملہ میں ہمیں انکی رائے سے اختلاف ہو، کیونکہ وہ پیغمبروں کی طرح معصوم اور واجب الاطاعت نہیں ہیں“

اعجاز قرآن اور فتنہ انکارِ معجزات پر جو بحث ہے وہ بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جدید ذہن زیادہ مخدوش نہیں ہوتا اس لئے ہمیں اس بارے میں کچھ زیادہ تحریر کرنا نہیں ہے۔ لیکن انکارِ حدیث کی وجہ سے عقل کی بے لگامی اور اسکے نتیجہ میں دین جو ایک کھلوڑ بن جاتا ہے اس اسلام سوز اور دین کش فتنہ پر جو مختصر اور اصولی بحث کی گئی ہے وہ قابلِ دید و مطالعہ ہے۔ اور اسی موضوع کے تحت مقامِ نبوت کو جس انداز میں کھولا گیا ہے وہ قلمِ نعمانیؒ ہی کا حصہ ہے۔

بیان عقائد کی بحث یہاں پہنچ کر ایک عجیب موڑ لیتی ہے۔ یہی موڑ ہے جس نے میری زندگی میں صحیح موڑ پیدا کر دیا۔ جیسا کہ عاجز نے شروع میں تحریر کیا ہے کہ مختلف مکاتب فکر کی تحریروں کا مطالعہ اس عاجز نے کیا تھا اور نتیجتاً ذہن میں وہ خلجان پیدا ہوا کہ کسی بھی مسئلہ پر انشراح نہیں ہو سکا۔ صحابہؓ معیارِ حق نہیں تھے۔ حسیت و شافعییت، تبعیت و سب و بریلویت یہ سب جہالت کی پیدا کردہ جماعتیں تھیں۔ مجددین نے ضرور کیس لیکن انکی کوششیں یا تو جزوی تھیں یا ان کے تجدیدی کارناموں اصل اسلام کے مقابلہ میں علماء نے دوسرا اسلام پیش کیا ہے۔ اور قرآن کئے گئے جو فی الواقع ہیں، بلکہ اس کے مقابلہ میں اس کی تفسیر اپنے خیالات۔

اس طرح اسلام اور قرآن کے متوازی ایک دوسرا اسلام اور دوسرا قرآن پیش کیا گیا ہے خیالات کی ان بھول بھلیوں میں ”راہِ حق“ گم ہو گئی تھی، ایک عجیب ادھیڑ بن میں مبتلا تھا۔ میں کہاں ہوں؟ میری منزل کیا ہے؟ یا کیا ہونی چاہئے؟؟ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ گھپ اندھیرے میں ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔ فکرِ مفلوج ہو گئی تھی، ذہن ماؤف تھا۔ اور قلب، مفلج، کروٹ کروٹ سلوٹیں تھیں۔ اپنے اس عالمِ اضطراب کی تعبیر واقعہ یہ ہے کہ میں الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ لیکن خدا کی مشیت، اس کے فضل و کرم نے سہارا دیا، کتاب کی بحث آگے بڑھتے ہوئے ”امت میں اختلاف عقائد کا آغاز“ تک پہنچ گئی تھی، ساتھ ہی دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں، سوچ چو کنا ہو گئی، پڑھتا گیا پڑھتا گیا، میرے محسن نے بتانا شروع کیا، یہ راستے مختلف کیوں ہوئے اور متعدد کیوں ہوئے۔

”بیان عقائد ہی کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی یہاں سمجھ لینی چاہئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان عقائد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن انھیں کے زمانہ میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے لوگ شہرِ لوگ اسلام میں داخل ہوئے، وہ اپنے ساتھ پرانے خیالات اور اپنا طرزِ فکر بھی لے کر آئے۔“



اور ان سب کے خیالات کی پوری اصلاح اور تصحیح ہمیں ہو سکی (اور عالم اسباب میں یہ ممکن بھی نہیں تھا)، بس ان ہی سے عقائد کا اور طرز فکر کا وہ اصولی اختلاف شروع ہوا جس نے امت میں بہت سے فرقے پیدا کئے۔

اس کے بعد فرقہ بندی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

”مردع میں اور غیر اہم مسائل میں رائے اور تحقیق کا اختلاف ایسی چیز نہیں ہے۔ جس سے فرقہ بندی پیدا ہو، بلکہ یہ توانگزی اور قدرتی ہے۔ فرقے جس اختلاف سے بنتے ہیں وہ عقائد اور اصول کا اختلاف ہے۔“

دماغ کی ایک گرہ کھل گئی کہ پھر یہ حنفیت و شافعییت جہالت کی پیدا کردہ جماعتیں کیوں ہونے لگیں؟ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں

”اور جیسا کہ میں عرض کیا یہ صحابہ کرام میں مائل نہیں تھا، اپنے عقائد اور طرز فکر کے لحاظ سے وہ سب ایک جماعت تھے۔“

ذہن کی ایک اور گرہ کھل گئی اور ضمیر نے پوچھا کہ کیا سب صحابہ اس معاملہ میں ایک جماعت ہو کر ”معیار حق“ نہیں ہو جاتے؟ اس کے بعد مختلف فرقوں کا تجزیہ کچھ اس طرح فرمایا ہے، کہ کوئی الجھن ہی باقی نہ رہے۔ تحریر فرمایا ہے

”پھر بعد میں جو فرقے پیدا ہوئے اگرچہ وہ بے گنتی ہیں لیکن اصولی طور پر ہم ان کو ”اہل السنۃ والجماعۃ“ اور ”غیر اہل السنۃ والجماعۃ“ کہہ سکتے ہیں،“

جزاک اللہ، بحث کو کتنا مختصر کر دیا کہ سمجھنا آسان ہو گیا، اور اب حق کی جستجو کرنیوالوں کے لئے مختلف فرق باطلہ کے نظریات کی بحث میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہ رہی اور ہاں اسکی ضرورت ہوگی کہ اہل السنۃ والجماعۃ اور غیر اہل السنۃ والجماعۃ کی حقیقت کو سمجھ لیں اور اس ضرورت کو مصنف ہم سے زیادہ بہتر سمجھتے تھے اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف و اصول کو بھی واضح کر دیا۔

”اہل السنۃ والجماعۃ کا اقدار یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو دین کی اصل و اساس ماننے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سنت یعنی آپ کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل کو اس کی شرح اور اس کے اجمال کی تفصیل سمجھتے ہیں۔ اور جو چیزیں قرآن مجید میں بیان نہیں کی گئی ہیں اور سنت میں ان کا بیان ہے ان کے ردیک وہ بھی واجب الاتباع اور جزو دین ہیں۔“

مختصر جملوں میں اہل قرآن جیسے گمراہانہ عقائد و طرز فکر کا باطل ہونا خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے بارے میں آگے مزید تحریر فرماتے ہیں

”کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی یہ حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ وہ جماعت صحابہ کی حیثیت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب و سنت کا جو مثلاً انھوں نے سمجھا اور جن امور پر ان کا اجماع ہو گیا وہ بھی صحابہؓ اور کسی مسلمان کو حق نہیں ہے کہ ان کے اجتماعی مسلک اور اجتماعی یعلموں کے حوالہ سے اختلاف کرنا ضلالت ہے کیونکہ دین جس ماحول اور جس فضا اور حریم میں آیا صحابہ کرام یقیناً اس کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے پھر انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا اور آپ ﷺ کی صحبت و تربیت سے مستفیض ہوئے۔ اس۔۔۔ دین کا عارف اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی روح اور فضاء کو سمجھنے والا نہیں ہو سکتا۔ پس دین وہ ہے جو انھوں نے سمجھا۔“

پھر مزید تشریح فرماتے ہیں کہ

”بس یہ ہے اصولی مسلک، اہل السنۃ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ کے بعد سنت اور جماعت صحابہ کی دین میں اتنی اہمیت تسلیم کی ہے اور آپ کو اتنا پابند یاد کیا ہے۔“

اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کی وضاحت کے بعد ”غیر اہل السنۃ والجماعۃ“ کے موقف کی وضاحت بھی فرماتے ہیں

”باقی دوسرے فرقوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنت کو اور جماعت صحابہ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے ان فرقوں میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے دو فرقے خوارج اور شیعہ ہیں۔ دین کے معاملہ میں صحابہ کرام ال (شیعوں) کے نزدیک قطعاً قابل اعتماد نہیں بلکہ ان کے اکثر فرقے تو جمہور صحابہ کرام کو معاذ اللہ مافق اور محمد بن دین سمجھتے ہیں اور جو مقام سنت کا ہونا چاہئے وہ ان کے ردیک ان کے ائمہ کے اقوال و افعال کا ہے۔۔۔۔“

اور خوارج کا حال یہ ہے کہ قرآن مجید کو تو دین کا بالکل محفوظ اور قطعی ماخذ مانتے ہیں اور سنت کی اہمیت بھی ان کے نزدیک قریب قریب ویسی ہی ہے جیسی کہ اہل السنۃ کے نزدیک ہے لیکن صحابہ کرام کے اجتماعی مسلک اور اجتماعی فیصلوں کا اتباع حصرح اہل السنۃ ضروری سمجھتے ہیں وہ نہیں سمجھتے، گویا ان کے نزدیک یہ ہو سکتا ہے کہ دین کی کسی حقیقت کو اور قرآن و سنت کی کسی بات کو سمجھے میں صحابہ کرام کی پوری جماعت یا انکی بڑی تعداد غلطی کر جائے اور بعد والے اس کو صحیح سمجھیں۔ لیکن اہل سنت اس خیال کو مگر ابی ملکہ سیکلڑوں گمراہیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔“

اہل سنت و غیر اہل سنت کے موقف کو واضح کرنے کے بعد بات کو مدلل بنانے کے لئے آگے چل کر حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا ایک مکتوب بھی درج فرماتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں کہ

” (اس عربی خط کا) مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام کی جماعت نے اپنے لئے جو خوبیاں اور عقیدہ پسند کیا اور جس کو انھوں نے اپنایا تم بھی اسی کو اپنے لئے پسند کرو اور اسکو اپنا مسلک بناؤ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم لائے تھے، صحابہ کرام اس سے پوری طرح واقف تھے اور دین کے بارے میں انھیں گہری بصیرت تھی جس سے ہر مسئلے کی تہہ تک پہنچتے تھے اور دینی حقیقتوں کے سمجھے پر وہ ہم تم سے زیادہ قادر تھے اور دین کے علم و فہم میں وہ دوسروں سے بہت زیادہ فصیلت رکھتے تھے۔ پھر بھی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ (اپنے اس خیال میں جو تم نے صحابہ کرام کے خلاف قائم کیا ہے۔) تم ہی راہ راست پر ہو تو گویا اس بات کے مدعی ہو کہ تم دین میں صحابہ کرام کی پوری جماعت سے آگے بڑھ گئے ہو ظاہر ہے کہ یہ کس قدر احمقانہ و گمراہانہ بات ہے۔“

صحابہ کرامؓ معیار حق تھے یا نہیں اس بحث سے قطع نظر، ان روشن تحریرات نے صحابہ کرام کی عظمت کو دل میں بٹھادیا اور جو اعتماد اس مقدس جماعت پر سے اٹھ گیا تھا اس اعتماد کو بحال کیا۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام کے متعلق تو ذہن صاف ہو گیا لیکن ”سلف صالحین“ ابھی تک ذہن میں ”غیر ضروری طور پر و خیل دین“ بنے ہوئے تھے۔ سلف صالحین کے بارے میں جو راہ اعتدال ہے دیکھئے اس کو کس حسن و خوبی کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔

”ہمارا اصل اور طریقہ کار تو یہ ہے کہ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ سلف صالحین نے اس بارہ میں کتاب و سنت کا مقصد و مشاعرہ سمجھا ہے اور ان سب کا یا جمہور سلف کا یہ متفقہ مسلک ہے تو ہم صرف اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کا اتباع ضروری جانتے ہیں اور اس کے خلاف ہر نئی رائے کو توسیل شیطانی سمجھتے ہیں۔ اور جو لوگ سلف صالحین کا اتباع نہیں چاہتے اور جن کو ال کے علم و فہم سے زیادہ اپنے علم و فہم پر اعتماد ہے وہ اپنی رائے اور سمجھ کا اتباع کرتے ہیں اور کتاب و سنت کا نام لیکر دوسروں کو بھی اس کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں۔ پس ہمارا اور ان کے طرز فکر اور طرز عمل میں فرق یہ نہیں ہے کہ وہ دین میں اصل سد کتاب و سنت کو قرار دیتے ہیں اور ہم سلف صالحین کو ملکہ یہ ہے کہ ہم کتاب و سنت کا متاع متعین کرنے میں سلف صالحین کے فہم و فکر کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور وہ اپنے خیالات اور اپنے فہم پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی بجائے سلف کے ال کی تقلید کریں۔ دراصل ال کی رہنیت بالکل وہی ہے جو ال و ارجح کی تھی اور وہ لوگوں کو سلف کے اتباع سے توجہ کر اپنے متعین میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جو سادہ اور ان کی بات مانتے ہیں وہ درحقیقت سلف صالحین کے اتباع سے آزاد ہو کر خود ان کے متبع اور مقتدی بن جاتے ہیں اور اس سے امت میں بے فہمی پھرتے اور نئے نئے گروہ پیدا ہوتے ہیں۔

ہر حال دین کے بارے میں سلف صالحین پر اعتماد اور ان کی اتباع ہمارا ہے اور اسی میں عام مسلمانوں کے دیں و ایمان کی حفاظت ہے۔“

اس وجدانی وضاحت نے سلف صالحین کی قدر و قیمت اور لیکن دماغ میں ابھی کچھ الجھنیں باقی تھیں۔ ’تقلید‘، ’اندھی تقلید‘، ’علماء کی کاسہ‘، میر کے فقیر‘ اور ’اجتہاد سے کام نہ لینا دین کو جامد بنانا ہے‘، جیسے الفاظ محیط ذہن کے اندر ابھی تک گردش کر رہے تھے کہ ”فقہی مسائل میں تقلید“ کے ضمنی عنوان کے تحت وہ بحث شروع ہو گئی کہ میرے خیالات میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ اس ضمنی عنوان کے تحت رقمطراز ہیں

”یہ ساری گفتگو تو ایمانیات اور عقائد میں تھی، فروع اور فقہی مسائل میں بھی ہمارے نزدیک ائمہ حق کی تقلید اور سلف کے اتباع ہی میں سلامتی ہے خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جبکہ اجتہاد اتنا رال ہو گیا ہے کہ جو لوگ قرآن وحدیث کے اردو ترجمے بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بھی اپنے کو اجتہاد کا حقدار سمجھتے ہیں۔

جو حضرات اہل علم کسی خاص فقہی مسلک کی تقلید پر مطمئن نہیں ہیں ان کے لیے بھی اتنا تو ہا بیت ہی ضروری ہے کہ جس مسائل پر ائمہ اربعہ غور کر کے متفق ہو چکے ہیں ان میں کوئی نئی راہ اختیار نہ کریں اور جن مسائل میں ان حضرات کے درمیان اختلاف ہے ان میں بھی ان سب سے الگ کوئی نئی رائے قائم نہ کی

جائے (۱) اس اصول کی پاسداری نہ کرنے میں سخت بے احتیاطی اور خود رائی بھی ہے اور امت میں اس سے انتشار بھی پیدا ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ”فیوض الحرمین“ میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (مدینہ طیبہ کے زمانہ قیام میں) مجھے تیس ایسی باتوں کی تاکید اور وصیت فرمائی جو میرے ذاتی رجحان اور طبعی میلان کے خلاف تھیں۔ ان میں سے ایک فقہی مسائل میں ان مذاہب اربعہ کی تقلید کا مسئلہ بھی تھا۔“

اسی سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف بھی انھیں کی کتاب کے حوالہ سے حاشیہ میں درج کیا گیا ہے کہ

”حضرت شاہ ولی اللہ اگر یہ مجتہد نہ طرر فکر رکھتے ہیں، ”جذہ المالفہ“ میں اس مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے صاف فرماتے ہیں (عربی ساری) مطلب یہ ہے کہ مذاہب اربعہ کی تقلید جائز اور صحیح ہوئے پر پوری امت کا کیا کہا جائے کہ اس کے قابل اعتبار عناصر کا اجماع ہے، خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جب کہ علم کم ہے اور ہوا پرستی اور خود رائی زیادہ، تو اب تو ان مذاہب کی تقلید میں دین کی مڑی حفاظت اور مصلحت ہے۔“

تقلید والی اس بحث کو سمیٹتے ہوئے آخر میں ایک قیمتی مشورہ بھی دیا ہے کہ

”اس وقت امت جس حال میں ہے اس کو ہمارے نئے اجتہادات کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کے لئے عملی جدوجہد کی اور اس راستے میں اپنی جانوں کو بے قیمت کرے کی ضرورت ہے۔“

زعم فکر و نظر نے دین کے بارے میں جن بھول بھلیوں میں پہنچا دیا تھا ان سے ان مباحث نے مجھے باہر نکالا، فرق مختلفہ و ضالہ کا باطل ہونا اور مسلک اہل السنۃ و الجماعۃ کا حق ہونا مجھ پر واضح ہو گیا، اور اس پر انشراح نصیب ہوا، احقاق حق اور ابطال باطل کی یہ سعی مشکور کچھ ایسے اچھوتے انداز میں کی گئی ہے کہ طبیعت میں جو ایک طرح کا بھٹکاؤ تھا، وہ ختم ہو گیا زندگی کو ایک صحیح رخ مل گیا، اور تذبذب و کشمکش حق و باطل سے نجات ملی۔ باغی ذہن کو اسوۂ صحابہ کی عظمت و عظمت کا معترف ہونا پڑا، فی الواقع اضطراب دل کو سکون ملا، مجھے ایسا لگا کہ طلسم سمندر

باقی صفحہ ۲۵۲

(۱) یہ بات بھی صرف ایسے اہل علم کے لئے ہے جو واقعہ دین میں اس درجہ کا درک رکھتے ہوں اور اپنی ذات کی حد تک اس پر عمل ال کے لئے روا ہو سکتا ہے لیکن وہ اس امر کے داعی نہیں ہوں گے ورنہ عوام ان کی تقلید میں اپنے مفاد کے لئے ایک اور میں ایک امام اور دوسرے امر میں دوسرے امام کی مات لے لیں گے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

## حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

### نقوش و تاثرات

#### حضرت مولانا نعمانیؒ سے ربط و تعلق

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے غائبانہ ربط و علقہ کا آغاز ۱۹۶۰ء

بچپن میں ہو چکا تھا، حضرت والد ماجد جناب حاجی محمد رفیق صاحب ذخیرہ کتب میں معارف الحدیث کی ابتدائی دو جلدیں اور غالباً کتابوں کی ورق گردانی کی سعادت اسی وقت حاصل ہو چکی تھی جسہ اور اردو کی معمولی شد بد ہو چکی تھی، مولانا نعمانیؒ کا سادہ و آسان کے لئے بھی قابل فہم تھا اس لئے ان کی کتابوں کی طرف طبیعت کھینچتی تھی۔

مکتب کی تعلیم کے بعد عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم کے لئے مشرقی یوپی کے قدیم و بافیض مدرسہ جامعہ نور العلوم بہرائچ میں داخل ہوا، نور العلوم میں جمعیتہ الطلبہ کی لائبریری اردو کے منتخب معیاری لٹریچر پر مشتمل تھی، اردو زبان کے اکثر صاحب فکر، قابل ذکر مصنفین کی کتابیں وہاں موجود تھیں اور اردو زبان کے اہم جرائد و مجلات بھی لائبریری میں آتے تھے، ان میں حضرت مولانا نعمانیؒ کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ الفرقان لکھنؤ بھی تھا، اس سے استفادہ کا موقع گاہے بہ گاہے ملتا رہتا تھا، جمعیتہ الطلبہ کے تحت ہر ہفتہ جمعرات کے روز بعد نماز مغرب طلبہ مختلف حلقوں میں تقسیم ہو کر تقریر کی مشق کیا کرتے تھے، ان ہفتہ واری جلسوں میں تقریر کرنے کے لئے دوسرے طلبہ کی طرح میں بھی خطبات مدراس (علامہ سید سلیمان ندوی) اور ”اسلام کیا ہے؟“ (مولانا محمد منظور نعمانیؒ) سے تقریر کی تیاری کیا کرتا تھا، اس طرح خطبات مدراس کے متعدد خطبے اور ”اسلام کیا ہے“ کے کئی اسباق زبانی یاد ہو گئے تھے۔

مدرسہ نور العلوم بہرائچ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر رہا

لرہتا تھا، کیونکہ مدرسہ نور العلوم بہرائچ کے بانی حضرت مولانا محفوظ الرحمن نامی کا حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق تھا۔

میرے نور العلوم بہرائچ پہنچنے سے پہلے حضرت مولانا نامی کا انتقال ہو چکا تھا لیکن نور العلوم بہرائچ سے حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا مخلصانہ تعلق پہلے کی طرح قائم تھا، اور مدرسہ کے ماحول میں ایک سر پرست اور بزرگ کی طرح مولانا نعمانی کا ذکر خیر رہا کرتا تھا۔

۱۹۷۰ء میں احقر تعلیم کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچا، اس وقت ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اصحاب علم و فکر کی بہترین کہکشاں تھی۔ ہندوستان کے اکثر ممتاز زمین علماء شوریٰ کے ممبر تھے۔ سال میں دو مرتبہ شوریٰ کا اجلاس ہوا کرتا تھا اور شوریٰ کے اجلاس کے موقع پر دارالعلوم دیوبند کی رونق بہت بڑھ جاتی تھی۔ حضرت مولانا نعمانی مجلس شوریٰ کے بہت موثر اور موثر ممبر تھے۔ ارکان شوریٰ میں غالباً سب سے سینئر بھی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس اُس دور میں محض قانونی خانہ پری کے لئے نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ شوریٰ کے اجلاس میں دارالعلوم دیوبند کے چھوٹے بڑے انتظامی و تعلیمی معاملات پر کھل کر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس لئے دو تین روز تک شوریٰ کا اجلاس بہت انضباط و تسلسل کے ساتھ چلا کرتا تھا اور نرم گرم معاملات پیش آتے رہتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو متعدد بار دیکھنا یاد ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بار دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں مولانا نعمانی مرحوم کی تقریر بھی ہوئی تھی، جس میں انھوں نے اپنی طالب علمی کے واقعات اور اساتذہ و مشائخ کا ذکر بڑے موثر پیرائے میں کیا تھا۔

### معارف الحدیث پر ایک تاثر

۱۹۷۴ء، میری طالب علمی کا آخری سال ہے، اس سال کی ڈائری میں حضرت مولانا نعمانیؒ کی اہم ترین کتاب معارف الحدیث کے بارے میں یہ تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں۔  
”۲۶ رمضان ۱۹۹۴ء، مولانا منظور نعمانی اس زمانے کے ممتاز عالم دین ہیں، موصوف نے اسلامیات کا کافی ذخیرہ اردو میں منتقل کیا ہے، اس کی زبان بھی شستہ اور سلیجھی ہوئی ہے، عام طور پر علماء کی طرح ان کی اردو میں ثولیدگی نہیں ہے۔

”مولانا نے بہت دنوں پہلے بریلی سے الفرقان نکالنا شروع کیا تھا، جو بحمد اللہ اب تک پابندی سے نکلتا ہے، اس پرچہ نے اسلام کی بہت خدمت انجام دی ہے، خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام سے قریب لانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔

”مولانا نے کافی دنوں پہلے الفرقان میں احادیث نبویہ کی مختصر انداز میں تشریح کرنی شروع کی تھی۔ عام فہم ترجمہ، مختصر سی تشریح، جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اشکالات کا ازالہ، ان خصوصیات نے اس سلسلہ مضامین کو مقبول عام بنا دیا، ان مضامین کو مکتبہ الفرقان نے کتابی شکل میں معارف الحدیث کے نام سے شائع کیا ہے۔ اب تک اس کی پانچ یا چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے اس دور ان معارف الحدیث کا مطالعہ کیا، اس عظیم خدمت حدیث پر مولانا کے لئے دعا نہ کرنا بہت ہی ناسپاسی اور کم ظرفی ہوگی۔

”جلد اول کے شروع میں محدث کبیر شیخ حبیب الرحمن اعظمی کا مقدمہ ہے، جس میں موصوف نے فتنہ انکار حدیث پر رد کرتے ہوئے قرآن اور عقل و نقل کی روشنی میں احادیث کی جحیت کو ثابت کیا ہے۔ اس مقدمہ نے کتاب کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ جلد دوم کے شروع میں مولانا علی میاں ندوی (دامت برکاتہم) کا مختصر مگر فکر انگیز مقدمہ ہے، موصوف نے فتنہ انکار حدیث کے نقصانات کو نئے انداز میں واضح کیا ہے اور مسلمانوں کی جوارثات مرتب کیے ہیں، ان کی طرف اشارات کیے ہیں۔

معارف الحدیث کا یہ سلسلہ اب بھی الفرقان میں جاری ہے۔

تک پہنچائے اور مسلمانوں کو اس سے صحیح معنی میں استفادے کی توفیق۔۔

الفرقان کے مستقل مطالعہ کی وجہ سے مولانا نعمانی کی خدمات اور طرزِ مدرسے واقفیت کسی حد تک زمانہ طالب علمی ہی سے تھی، حافظہ پر زور ڈالتا ہوں تو یاد پڑتا ہے کہ کبھی کبھی مولانا سے مراسلت بھی کرتا تھا۔ مولانا کے بعض خطوط بھی میرے نام آئے لیکن میری زندگی میں ترتیب و انضباط کا جو فقدان رہا اس کی وجہ سے بزرگوں کے خطوط کی حفاظت بھی نہیں کر سکا۔

الفرقان میں مضامین کی اشاعت اور

حضرت مولانا نعمانیؒ کی ہمت افزائی

دارالعلوم دیوبند سے دورہ حدیث اور افتاء کرنے کے بعد ایک ایک سال مدرسہ محمدیہ میل کھیرالا (ضلع بھرت پور، راجستھان) اور مدرسہ ہدایت المسلمین کرہی (ضلع بستی) سے منسلک رہا، اس کے بعد تین سال مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں تدریسی خدمات انجام دیتا رہا، اس زمانہ میں حضرت مولانا نعمانی سے ربط و تعلق رہا، الفرقان میں مضامین اشاعت کے لئے بھیجتا رہا،



مولانا کی کرم فرمائی اور ذرہ نوازی سے الفرقان میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ الفرقان جیسے مستند و معیاری رسالہ میں مضامین کی اشاعت مجھ جیسے نو عمر کے لئے بڑے اعزاز اور عزت افزائی کی بات تھی۔

مدرسہ امدادیہ مراد آباد کے زمانہ قیام میں احقر نے جناب قاضی عدیل عباسی مرحوم کی کتاب ”تحریک خلافت“ پر ایک مبسوط تبصرہ لکھ کر الفرقان میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ اس مضمون کی دوسری قسط موصول ہونے پر حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو گرامی نامہ تحریر فرمایا وہ اتفاق سے آسانی کے ساتھ مل گیا اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف کس طرح خورد نوازی کرتے تھے، ان کی مکتوب نگاری کا ایک نمونہ بھی قارئین کے سامنے آئے گا۔

۶۷۹/۶/۲۵

ناسمہ سحانہ

برادر مکرم! احسن اللہ الیکم والیہا سلام ورحمت  
مضمون کا دوسرا حصہ بھی آج پہنچ گیا، اس کو میں نے دیکھ بھی لیا، حالانکہ پہلی قسط کو ابھی نہیں دیکھ سکا تھا، انشاء اللہ آج ہی یا کل دیکھوں گا۔

دوسرا حصہ جو آج دیکھ لیا ہے اللہ نے آپ سے خوب لکھوایا..... واقعہ یہی ہے کہ ”تحریک خلافت“ کے دور میں دونوں شخصیتوں خلیفہ عبد الحمید اور کمال پاشا دونوں کے بارے میں بہت ہی غلط اور خلاف واقعہ ذہن بنا تھا۔ قاضی صاحب ان چیزوں سے بالکل بے خبر ہیں جو بعد میں خاص کر عربی میں لکھی گئی ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو (کمال ہی کے دور میں یا اس کے بعد متصلا) ترکی میں رہے تھے اس کے متعلق بہت سخت رائے رکھتے تھے اور اس کے بارے میں ہندوستانی علماء کی ناواقفیت کو بڑا جرم قرار دیتے تھے۔

انشاء اللہ تعالیٰ پہلی قسط آپ کے مضمون کی جولائی ہی کے شمارہ میں آجائے گی۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

پانچ سال مختلف مدارس میں گزارنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں احقر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے منسلک ہوا، اس وقت سے ہر ماہ ایک دو بار حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری کا

معمول تھا، ملاقات کے لئے عموماً عصر کے بعد حاضری ہوتی تھی۔ حضرت مولانا نعمانی بڑے تپاک، محبت کے ساتھ ملتے تھے، چائے وغیرہ کا ضرور نظم فرماتے، مولانا مرحوم کو چائے کا اعلیٰ ترین ذوق تھا، ان کے یہاں ہمیشہ بہت معیاری اور نفیس چائے پینے کو ملتی، بعض خوش مذاق احباب کے بہ قول اس جیسی چائے کے لئے شدر حال جائز بلکہ مستحسن ہے۔

### حضرت مولانا نعمانی کی مجالس

مولانا نعمانی مرحوم کی ہر مجلس بڑی علم آموز، معلومات افزا ہوتی تھی، ان کی مجلس میں لایعنی باتوں کا گذر نہیں تھا، حافظہ بڑا غضب کا تھا، پیری اور معذوری کے عالم میں بھی ان کا حافظہ جوان اور تازہ تھا۔ ساٹھ، ستر سال پرانے واقعات اس طرح تفصیل اور تیقن کے ساتھ سناتے تھے گویا یہ ابھی کل کے واقعات ہوں، ماضی کے اور اہل پلٹتے تو تاریخ کا دفتر کھل جاتا، اپنے اساتذہ و اکابر کے علم و فضل، اخلاص و للہیت، تواضع و بے نفسی کے واقعات بہت سناتے، تحریک آزادی، تحریک خلافت، لیگ و کانگریس کی کشمکش، جمعیت کے بارے میں بہت سی وہ معلومات دیتے جو مدون تاریخ کے اور نہیں ہو سکیں، مولانا نعمانیؒ کے بیان کردہ واقعات و حقائق قلمبند کر سوانح کا بڑا قیمتی اور نادر ذخیرہ ہوتا لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا اور اب مولانا کے سینے میں دفن ہو کر چلے گئے۔

میری ڈائری میں ۲۶ اپریل ۱۹۸۱ء کو حضرت مولانا نعمانیؒ سے ایک ملاقات کا ذکر ہے، اس ملاقات میں مولاناؒ نے جو باتیں فرمائی تھیں انھیں میں نے ڈائری میں قلمبند کر لیا تھا، اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے کیونکہ یہ گفتگو بعض اہم تاریخی حقائق پر مشتمل ہے۔

”... پھر عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا منظور نعمانی سے ملاقات کی غرض سے ان کے مکان پر حاضر ہوا۔ مزاج پر سی کے بعد حضرت مولانا نے تاریخ آزادی ہند کا ایک ورق الٹا، انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ میں جمعیت العلماء کی کانگریس میں غیر مشروط شرکت کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن میرا جھکاؤ حضرت مدنی ہی کے سیاسی موقف کی طرف تھا، حضرت مدنی انگریز کے خلاف ہر محاذ پر اور ہر ایک کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار تھے، کانگریس میں ان کی غیر مشروط شرکت میں ان کی خود اعتمادی کو بھی بڑا دخل تھا کہ پہلے انگریز نہیں پھر سب دیکھ لیا جائے گا، جمعیت کے مف اول کے بہت سے رہنما اس غیر مشروط شرکت کے خلاف تھے مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا ابوالحسن سجاد صاحب بہاری، مولانا سجاد صاحب کارشاد مجھے اب تک یاد ہے کہ

زادی کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ مکمل انقلاب نہیں ہے، کہ قدیم عمارت کو بالکل مسمار کر کے نئی عمارت حسب منشا تعمیر کی جانے والی ہو۔ بلکہ مرحلہ وار اقتدار کی منتقلی ہو رہی ہے۔ جی تدریجاً عمارت کی ایک ایک اینٹ نکال کر ان کی جگہ دوسری اینٹیں فٹ کی جا رہی ہیں۔ تو میں دیکھنا یہ ہے کہ اس میں ہمارا کتنا روزافٹ ہو رہا ہے۔ جمعیت العلماء پر مولانا مدنیؒ کے اثرات سب سے زیادہ تھے اس لئے انھیں کے موقف کو جمعیت کا موقف مانا گیا اور مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا سجاد صاحب وغیرہ نے ذہنی اختلاف کے باوجود اسی موقف کو اختیار کیا۔“

حضرت مولانا نعمانیؒ کی اکثر مجالس اسی طرح کی تاریخی، دینی معلومات پر مشتمل ہوا رتی تھیں، اب انتہائی قلق ہو رہا ہے کہ سیکڑوں بار کی حاضری میں انھوں نے جو مفید اور اہم تفسیریں خود میرے سامنے بیان فرمائیں اگر انھیں قلمبند کر لیا ہوتا تو بڑا علمی و دینی سرمایہ ہوتا۔ ایک بار میں نے عرض کیا اردو زبان میں علمی، دینی، تاریخی مضامین لکھنے کے لئے کس صنف کا اسلوب اخذ کیا جائے تو مولانا نعمانیؒ نے سید سلیمان ندوی رحمۃ الہ علیہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے اور ان کا اسلوب اخذ کرنے پر زیادہ زور دیا۔

ایک بار اکابر دیوبند کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان حضرات کے معاصرین میں ایسے متعدد علماء تھے جو علم و فضل میں ان سے کم رتبہ نہیں تھے لیکن حد درجہ اخلاص و للہیت اور تواضع و وجہ سے اکابر دیوبند کا چراغ زیادہ روشن ہوا۔

### زبیت کا خاص انداز

مولانا نعمانیؒ کی تربیت کا بھی لطیف اور حکیمانہ انداز تھا، اس سلسلے کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، مولانا کی خدمت میں عام طور پر ہم تین لوگ ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے (۱) جناب مولانا میاء الحسن صاحب اعظمی مرحوم استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۲) جناب مولانا ٹمٹس نبریز خان سابق رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ و حال استاذ شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، ور (۳) احقر۔ مولانا اعظمی مرحوم میرے اساتذہ کی عمر کے تھے، مولانا ٹمٹس تبریز خاں صاحب بھی عمر و علم میں مجھ سے بڑھے ہوئے تھے لیکن ان دونوں حضرات کی کرم فرمائی اور خوردنوازی نے مجھے ان سے بے تکلف بنادیا تھا۔ حضرت مولانا نعمانیؒ کے یہاں حاضری کے موقع پر اکثر ثوق ملاقات میں میں ان حضرات سے آگے بڑھ جاتا اور مولانا نعمانیؒ سے پہلے مصافحہ کر لیتا۔ ایک بار ایسے ہی موقع پر جب میں نے پیش قدمی کر کے مولانا سے سلام اور مصافحہ کیا تو مولانا نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کر کے فرمایا ”کتر الکثر“ (بڑوں کو بڑائی دو) یہ ایک حدیث کے الفاظ

ہیں، جسے میں نے بار بار پڑھا اور پڑھایا تھا۔ لیکن اس موقع پر مولانا نعمانی نے حدیث کے الفاظ زبان سے ادا کیے تو معافی کی ایک دنیا ذہن میں گردش کرنے لگی اور مفہوم حدیث کی وسعت پوری طرح ذہن پر منکشف ہو گئی۔ اس حدیث سے وابستہ واقعہ یہ ہے کہ ایک انصاری صحابی کو خیبر میں کسی یہودی نے قتل کر دیا، مقتول صحابی کے تین اعزہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں اس معاملہ قتل کو پیش کرنے حاضر ہوئے۔ مقتول کے بھائی جوان تینوں میں سب سے کم عمر تھے انھوں نے گفتگو کا آغاز کیا اس موقع پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ”کسر الکمر“ (بڑوں کو بڑائی دو یا بڑوں کی تعظیم کرو) آپ کا اشارہ اس جانب تھا کہ تینوں اعزہ میں جو سب سے معمر ہیں انھیں پہلے مقدمہ پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ حضرت مولانا نعمانی نے اس حدیث کو بجا طور پر ملاقات اور مصافحہ پر بھی منطبق کیا۔ آج کل احادیث میں مذکور اس قسم کے آداب کا ہماری دینی مجلسوں میں بھی لحاظ نہیں کیا جاتا، کوئی بزرگ اگر ہاتھ لگ جائے تو مصافحہ کرنے والے اس ر ٹوٹ پڑتے ہیں، خود اس بزرگ کے آرام و اذیت کا خیال بھی نہیں۔ ک۔

کرنے والے بوڑھے اور ضعیف لوگوں کو کون خاطر میں لاتا ہے، انھیں ہوئے نوجوان آگے بڑھ جاتے ہیں۔

غیر معمولی صبر و شکر

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے عمر کا خاصا طویل حصہ جسمانی معذوریوں میں گزارا، ۱۹۷۳ء میں جب وہ مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے تھے، دیوبند میں رکشا سے گرنے کی وجہ سے ان کی کولھے کی ہڈی کھسک گئی، اس کے بعد سے موصوف تقریباً صاحب فراش ہی رہے، آخری چند سال تو اس طرح گزرے کہ اٹھنا بیٹھنا کروٹ لینا سب کچھ دوسروں کے ہاتھوں ہوا کرتا تھا، شدید تکلیفوں سے دوچار رہے، سماعت، بصارت گویائی سب بری طرح متاثر ہوئی لیکن یادداشت اور دماغ برابر کام کرتے رہے، ان تکلیفوں اور معذوریوں میں مولانا نعمانی کا صبر و شکر قابل رشک تھا، کبھی حرف شکایت زبان پر لاتے نہیں سنا، زبان ذکر سے تر رہتی تھی اور اللہ کے بے پایاں انعامات یاد کر کے سراپا پاس رہتے تھے۔ ملاقات کرنے والوں سے حسن خاتمہ کی دعا کے لئے ضرور کہتے۔

ماہنامہ الفرقان سے اولاد کی طرح تعلق

الفرقان سے مولانا نعمانی کو ایسا ہی تعلق تھا جیسا تعلق ماں باپ کو اپنی عزیز ترین اولاد

سے ہوتا ہے۔ تمام معذوریوں کے باوجود ”الفرقان“ کے تمام مضامین حرف بہ حرف پڑھتے یا سنتے اور اس کی افادیت و معیار اور اشاعت کے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔

دو تین سال پہلے کی بات ہے مولانا کی بیماری اور معذوری آخری درجہ کو پہنچی ہوئی تھی اور بیماری کا سلسلہ کافی دراز ہو چکا تھا، میرا خیال تھا کہ مولانا نعمانیؒ اب الفرقان کے مضامین سے بے خبر ہوں گے۔ اسی دوران یکساں سول کوڈ کے بارے میں میرا مضمون الفرقان کے چار شماروں میں شائع ہو چکا تھا، کئی مہینہ کے بعد برادر م مولانا شمس تبریز خان صاحب کے ساتھ مزاج پرسی کے لئے مولانا کے دولت کدہ پر حاضر ہوئی، بیماری کی شدت کی وجہ سے ارادہ تھا کہ اہل خانہ یا خادم سے حال معلوم کر کے چلے آئیں گے کیوں کہ مولانا کا حال یہ تھا کہ جب ملاقات کے لئے حاضری ہوتی تو پورے اہتمام کے ساتھ بیٹھتے تھے، خادم سے اصرار کے ساتھ آخر تک بٹھانے کے لئے فرماتے، کئی بار اصرار کے ساتھ عرض کیا گیا کہ آپ لیٹے رہیں، بیٹھنے کی زحمت نہ کریں لیکن مولانا گویا اس پر قادر نہیں تھے کہ ملاقات کے وقت لیٹے رہیں خادم نے آکر حال بتایا اور ہم دونوں کا سلام حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کیا، تو انھوں نے فوراً اصرار کے ساتھ اندر بلایا۔ ہم لوگ حاضر ہوئے تو مولانا سہارے سے بیٹھے ہوئے تھے، سلام و مصافحہ کے بعد بولنے کی کوشش کرنے لگے حالانکہ گویائی بھی کافی متاثر تھی بہت مشکل سے چند جملے بول پاتے تھے، فرمایا ”آپ کے مضمون کی ساری قسطیں سن لیں، ماشاء اللہ بہت اچھا اور کامیاب مضمون ہے، اسے تو انگریزی میں آنا چاہئے۔ میں اس میں حصہ لینا چاہتا ہوں“ پھر فرمایا ترجمہ کے لئے کون مناسب رہے گا؟ حید آباد کے ایک وکیل صاحب تھے، بہار کے گورنر بھی رہے تھے مولانا نام سوچ رہے تھے، نام زبان پر نہیں آ رہا تھا میں نے عرض کیا غالباً آپ جناب یونس سلیم صاحب کا نام لینا چاہتے ہیں، فرمایا: ہاں! وہ اچھا ترجمہ کر سکتے ہیں، میں نے عرض کیا وہ خود کافی معمر اور مشغول ہو گئے ہیں، ان کے لئے ترجمہ کرنا مشکل ہو گا، آپ دعا فرمائیں کسی سے ترجمہ کرایا جائے گا میں نے گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مذکورہ بالا بات عرض کی، کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت مولانا نعمانیؒ کافی تھک چکے ہیں اور ضعف بڑھتا جا رہا ہے۔

میرے لئے یہ بات حد درجہ استعجاب کی تھی کہ مولانا اس شدید معذوری اور بیماری کے زمانہ میں بھی الفرقان کے مضامین پر مکمل نظر رکھتے ہیں اور ان کے ہم کی علالت اور ذہن

ن صحت میں کوئی مناسبت نہیں ہے، ہم جیسوں کا حال تو یہ ہے کہ ذرا مرض نے شدت اختیار کی لھنا پڑھنا سب بھول جاتے ہیں، مطالعہ کی ہمت نہیں ہوتی۔

### ررم فرمائیاں

مولانا نعمانیؒ کی کرم فرمائیاں اور قدر افزائیوں کو کس قدر یاد کیا جائے، قدم قدم پر انھوں نے حوصلہ بڑھایا، ہمت دلائی، ہم جیسے خوردوں کے ساتھ بھی اکرام کا معاملہ فرمایا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور شایان شان معاملہ فرمائے۔

۲۷ اگست ۱۹۹۰ء کا تحریر کردہ ان کا ایک مکتوب پیش نظر ہے، ان دنوں بھی ان کی حدوری آخری حدود کو چھو رہی تھی لیکن الفرقان کے مضامین پابندی سے پڑھتے تھے اور ہمت فزائی کے کلمات تحریر فرماتے تھے، خط کا متن یہ ہے

باسمہ سبحانہ

برادر مکرم و محترم مولانا عتیق احمد بستوی صاحب رید م۔

سلام و رحمت

ماہ رواں اگست کے شمارہ میں آپ کا مضمون پڑھوا کر سنا۔ دل۔

نے سلطان عبدالحمید خاں ثانی کی دو ڈائریوں کا ذکر کیا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کی بنیاد پر آپ خود لکھیں، کوئی دوسرا آدمی میری نظر میں نہیں ہے جو اس کام کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکے۔

جی چاہتا ہے کہ آپ کو تشریف لانے کی زحمت دوں دار اس موضوع پر تفصیل سے کچھ بات کروں لیکن اب حال یہ ہے کہ بولنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ چند سطریں بھی بمشکل املا کر اسکا ہوں۔

آپ کے لئے اللہ تعالیٰ دعا کا اہتمام آپ کے حق کے مطابق عطا فرمائے اور اس گنہ گار بندہ کی دعائیں قبول فرمائے، خود دعاؤں کا سخت محتاج اور طالب ہوں۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود قاسمی عفی عنہ

۵ صفر ۱۴۱۱ھ

خط لکھا کر ختم کر چکا تھا، بعد میں خیال آیا کہ دولت عثمانیہ کی تاریخ جس کی ضرورت کا آپ نے ذکر کیا ہے بنام خدا اس کام کو آپ ہی شروع کر دیں، آپ کے مضمون سے اندازہ ہے کہ

آپ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے اس کو بہتر طریقہ پر پورا کر سکیں گے، والسلام آخر۔

حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میں دولت عثمانیہ پر کام تقریباً مکمل کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ایک ملاقات میں جب میں نے ان سے ذکر کیا کہ میں نے کئی سالوں کی محنت کے بعد دولت عثمانیہ کی خصوصاً اس کے دور زوال (الغاء خلافت وغیرہ) کی تاریخ مکمل کر لی ہے۔ اسی سلسلے میں انیسویں بیسویں صدی کی چار تحریکات (فری میسن، صہیونیت، عرب قومیت، ترک قومیت) کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اسی کے بعض حصے الفرقان میں اشاعت کے لئے دیئے تھے۔ اب صرف اتنا کام باقی ہے کہ اس موضوع پر آئی ہوئی چند نئی کتابوں سے مدد لے کر کچھ ترمیم و اضافہ کیا جائے اور آخری نظر ڈال کر اسے کتابی صورت میں اشاعت کے لائق بنایا جائے تو حضرت مولانا کی خوشی و مسرت کی انتہا نہ رہی بہت دعائیں دیں اور اصرار کے ساتھ فرمایا کہ جس طرح ہو سکے اس کام کو آخری شکل دے لیں اور اشاعت کے قابل بنادیں لیکن اپنی محرومی کو کیا کہوں کہ اب تک دولت عثمانیہ والا کام چند دوسرے کاموں کی طرح اسی حال میں پڑا ہوا ہے، دیگر تدریسی و تصنیفی مصروفیات اور کچھ فطری کاہلی کی بنا پر اب تک اسے آخری شکل نہیں دے سکا، اگر مولانا نعمانیؒ کی حیات میں یہ کام منصہ شہود پر آتا تو کتنی دعائیں ملتیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو آخری شکل دے کر منظر عام پر لانے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

صفحہ ۲۴۲ کا بقیہ

سے بچ کر ساحل سکون و طمانیت پر آگاہ ہوں، اس دن سے آج تک یہ حال ہے کہ کہیں کوئی مغالطہ انگیزی کی بات درپیش ہوتی ہے تو مسلک اہل سنت والجماعت کے آغوش حقیقت میں سکون حاصل ہو جاتا ہے ع

جزاک اللہ چشم باز کردی

کاش یہ کتاب ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں پہنچ جاتی!!..... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف کی اس کتاب کو ان کے لئے ذخیرہ آخرت بنا دے۔ آمین

اللهم اهدنا الی سواء السبیل -- رسالہ انزع قلوبنا بعد ارہدیتنا وھب لنا من لدنک رحمہ

☆☆

انک اب الوھاب۔

جناب اسیر اوروی، بنارس

## اسلامی ہند کی ایک تاریخ ساز شخصیت

مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلی مدیر الفرقان ۳۴ مئی ۱۹۹۹ء کو ۹۲ سال کی عمر میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، پوری زندگی انھوں نے دین حق کی سر بلندی اور اسلام دشمنی کے خلاف جدوجہد کی۔ ان کی دینی جدوجہد باطل کی راہ میں پیش قدمی کو نہ روک سکے۔ ساحل پر کھڑے ہو کر طوفاں بہت ہوتے ہیں لیکن دریا میں اتر کر طوفان کی ہولناکیوں اور ہلاکت خیز یور کا حوصلہ اور ہمت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے، ان کی تعداد اتنی مختصر ہوتی ہے۔ انگریزوں پر گنا جاسکتا ہے، ایسے ہی کیا اب افراد میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی شامل ہے۔

ان کا عزم آہنی، ان کی ہمت فولادی، ان کا جوش عمل طوفان بدوش، ان کا حوصلہ ناقابل شکست، دین کی راہ میں ان کی جدوجہد سیماب صفت، وہ جس مہم پر چلے پورے جوش و خروش اور پورے دلوں کے ساتھ چلے، ان کا دل دین حق کی سر بلندی کے جذبات سے معمور، ان کا دماغ علوم و معارف کا خزانہ، ذہانت و فطانت ان کی کنیر، زور استدلال زور بیان ان کا غلام، علماء حق کے خلاف فتنہ برپا کرنے والوں کے محاذ پر پوری جاں سپاری اور جذبہ فداکاری کے ساتھ ٹوٹ پڑنے والے، کبھی بھی تو دل جذبات کے لاؤشکر لے کر اتنی تیز روی کے ساتھ پیش قدمی سے آگے بڑھا کہ عقل اور مصلحت دونوں اپنی جگہ دم بخود اور حیرت زدہ رہ گئیں، سست گامی انھوں نے کبھی نہیں سیکھی، تیز گامی بلکہ برق رفتاری ان کی فطرت تھی۔

میدان عمل کا انتخاب

مولانا مرحوم دینی جدوجہد اور اپنی عملی سرگرمیوں میں اپنی راہ خود منتخب کرتے، کسی



خارجی دباؤ یا کسی دوسرے کے مشوروں کا ان کی عملی سرگرمیوں میں کبھی کوئی دخل نہیں رہا، دل میں جو جذبہ ابھرتا دل کی گہرائیوں سے ابھرتا۔ مصلحت اندیشی، خطرات کے احتمالات کا کہیں دور دور گزر نہیں ہوتا، انجام سے بے پروا ہو کر طوفان میں چھلانگ لگا دینا ان کا مزاج تھا، عقل دلی جذبات کے تابع تھی، دل اپنی پسندیدہ راہ پر چل پڑتا، عقل مصلحت اندیش کو اس کا دامن پکڑنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

جب مولانا نعمانی دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۲۷ء میں سند فضیلت لیکر اپنے وطن سنبھل میں لوٹ کر آئے تو پورے ہندوستان میں بدعات و خرافات، مشرکانہ عقائد اور رسم و رواج کی حمایت میں بدایوں اور بریلی کے علماء نے ایک شور برپا کر رکھا تھا، ان تمام خرافات کو سند جوازی ہی نہیں دے رکھی تھی بلکہ ان بدعات کی مخالفت کرنے والوں کو سب و شتم اور دشنام طرازی سے آگے بڑھ کر ان پر کفر کا فتویٰ دے رکھا تھا۔ علماء دیوبند نے ان بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد و خیالات کے خلاف جہاد چھیڑ رکھا تھا اور جاہلی رسم و رواج کے خلاف اپنی تحریک اصلاح جاری کر رکھی تھی۔ وہ اسلام کو صحیح خد و خال کے ساتھ مسلم معاشرہ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ علماء سوء جو ان خرافات کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان کے مفاد پر اس سے ضرب پڑتی تھی اسلئے وہ تحریک اصلاح کو ناکام بنانے کیلئے ہر طرح کی سازشوں میں مصروف تھے اور اصلاح کی مہم میں پوری جال سپاری کے ساتھ حصہ لینے والوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے اور ان پر اپنی کمینہ گاہوں سے زہریلے تیر بر سارے تھے۔ علماء حق کو ذلیل و رسوا کرنے اور جاہل عوام کو ان کے خلاف اشتعال دلا کر ان کی جان کا دشمن بنانے کی ہر امکانی جدوجہد کر رہے تھے اور وہ بڑی حد تک اپنی تک و دو میں کامیاب بھی ہو رہے تھے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے تھے کہ علماء حق کو بعض مقامات پر جانے میں جان کے خطرات لاحق تھے۔

نھیک یہی ماحول تھا اور یہی حالات تھے جب مولانا نعمانی دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر وطن آئے تھے۔ سنبھل اور امر وہہ کے مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے چار سال گزار چکے تھے۔ اسی تدریسی دور میں بریلوی فرقے سے تین چار مناظرے مختلف مقامات پر کر چکے تھے، لیکن مولانا نعمانیؒ اپنی اس محدود جدوجہد اور عملی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اس سے بہت آگے جانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ تکفیری فتنے کی شدت کا تقاضا کچھ اور تھا، وار بچانے کے ساتھ ساتھ وار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے انھوں نے ایک بار حالات کا جائزہ لیا اور ذہن میں لائحہ عمل بنایا اور دشمن کی کلائی مروڑ کر اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے کا جذبہ ابھرا

اور یہ جذبہ اتنی شدت سے ابھر کہ انجام سے بے پروا ہو کر اس دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑنے اور فتنوں کے سرچشمہ اور منبع و مخرج بریلی جا کر اس فتنہ کے دہانے کو بند کرنے کا عزم کر لیا، ساری مصلحتوں اور خطروں کو پس پشت ڈالا۔ عقل اور آل اندیشی دامن پکڑتی رہی لیکن آپ دامن جھٹک کر آگے بڑھ گئے اور بریلی پہنچ کر وہیں خیمہ گاڑ دیا۔

بے خطر کو دہڑا آتش نمرود میں عشق  
عقل ہے محو تماشا لے لب بام ابھی

### مناظروں کا دور

آپ نے بریلوی مکتب فکر کے سب سے مضبوط قلعہ مدرسہ منظر اسلام بریلی پر حملے کے آغاز سے اپنی مہم شروع کی اور خود ان کے مدرسہ میں گئے جو ان کا ایک محفوظ قلعہ تھا، مولانا احمد رضا خان صاحب تو ”حسام الحرمین“ کی تلوار اپنے جانشینوں کے ہاتھ سفر پر جا چکے تھے البتہ ان کے جانشین تخت اقتدار پر متمکن تھے۔ مولانا کا چیخ دیا لیکن جب مناظرہ کی نوبت آئی تو اپنی جگہ انھوں نے اپنے مولوی سردار احمد گورداسپوری کو اپنا وکیل بنا کر کھڑا کر دیا اور ی ضلع اعظم گڑھ کا مناظرہ

بریلی کے مناظرہ کے کچھ ہی دنوں بعد میرے وطن اور ی ضلع اعظم گڑھ میں ہندوستان گیر شہرت کا مناظرہ ہوا۔ یہاں بریلوی مکتب فکر کے دو ممتاز اور سربر آوردہ مولوی صاحبان موجود تھے ایک مولوی نعیم الدین مراد آبادی اور دوسرے مولوی حشمت علی پبلی بھیتی، یہ دونوں ایک جلسہ عام میں تقریر کیلئے بلائے گئے تھے، دن میں جلسہ ہو رہا تھا۔ ا بجے کا وقت ہو گا، چیخ پر مولوی حشمت علی صاحب تقریر کر رہے تھے اور مولوی نعیم الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی صورت حال میں مولانا عبداللطیف نعمانی نے جلسہ عام میں جا کر ان دونوں کو مناظرہ کا چیخ دیا اور ان کے فرار کا راستہ بند کر دیا، اسکے باوجود مولوی نعیم الدین پبلی ٹرین سے فرار کر گئے البتہ عوام نے مولوی حشمت علی صاحب کو زبردستی روک لیا۔ پھر تین دنوں تک بڑا ہی ہنگامہ خیز مناظرہ ہوا۔ ہمارا چھوٹا سا گاؤں اور ی آدمیوں کا جنگل بن گیا تھا۔ پورا ضلع سٹ آیا تھا۔ مناظرہ کا موضوع مسئلہ علم غیب تھا۔ لیکن فریق مخالف کبھی اصل موضوع پر گفتگو نہ کر سکا۔ جب عقائد کی دقیق ترین بحثوں پر گفتگو آتی تو وہ حسام الحرمین کے فتوؤں کی بات لے آتے، اکابر علماء دیوبند

کی کتابوں کی عبارتوں پر تقریر شروع کر دیتے، جب جب مولانا نعمانی اصل موضوع پر ان کو گھیر کر لے آتے تو اول فول بکنا شروع کر دیتے۔ جھنجلاہٹ، برہمی، سخت سست الفاظ کا استعمال مولوی حشمت علی کی طرف سے مسلسل چلتا رہا، علماء دیوبند کے کفر کا اعلان دانت پیس پیس کر کرتے، مولانا نعمانی مولوی حشمت علی کی اس حرکت مذہبوحی پر صرف مسکراتے رہتے تھے، جب مولانا نعمانی کی گرفت سے نکلنے کی کوئی شکل نہیں رہی تو اپنے ہم مشربوں سے کہہ کر بذریعہ پولیس تیسرے دن مناظرہ بند کرادیا۔ حلقہ کے تھانیدار نے نقض امن کا اندیشہ بتا کر اعلان کر دیا کہ کل سے مناظرہ بند کیا جاتا ہے۔ اگرچہ موضوع مناظرہ ہر مولانا کے سارے سوالات تشنہ جواب ہی رہے، مولوی حشمت علی نے اصل موضوع پر کبھی گفتگو کرنے کی جرأت ہی نہیں کی لیکن عام مسلمانوں نے علی رؤس الاشہاد یہ جان لیا کہ حق مولانا نعمانی کی طرف ہے۔ فریق مخالف کے پاس سوائے سب و شتم، دشنام طرازی اور کافر گری کے اور کوئی علمی جواب نہیں، وہ آخر تک اپنی کم علمی کی پردہ پوشی کی جدوجہد میں مصروف رہے۔

تین دنوں کے بعد یہ مناظرہ بند تو ہو گیا لیکن اس کا اثر ہمارے ضلع اعظم گڑھ کے مسلمانوں پر اتنا بڑا کہ یہاں کی نوے فیصد آبادی جو بدعات و خرافات میں مبتلا تھی وہ اس سے تاب ہو گئی اور ضلع اعظم گڑھ کے سواد اعظم نے مولانا نعمانی کے اس جرأت مندانہ اقدام سے حق کی روشنی پالی اور سابقہ روش سے ایک دم کنارہ کش ہو گئے، سوائے چند چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے پورا ضلع ان بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد و خیالات سے پاک ہو گیا۔ اور ان لاکھوں مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی جو توفیق حاصل ہوئی اسکے اجر میں مولانا مرحوم اجر عظیم کے مستحق ہوئے۔

### وہابی اور وہابیت کا طعنہ

مولوی احمد رضا خان صاحب نے جب دجل و فریب سے کام لیکر علماء حق کے خلاف، علماء حجاز سے فتویٰ حاصل کیا تھا اس وقت حجاز پر ترکوں کی حکومت تھی اور جب وہ ہندوستان لوٹ کر آئے اور اس فتویٰ کو حسام الحرمین کے نام سے طباعت کا انتظام کر رہے تھے تب تک حجاز میں انقلاب آچکا تھا، ترکی حکومت خلافت عثمانیہ کی طرف سے حجاز کا گورنر شریف حسین تھا، اس زمانہ میں انگریزوں کا فوجی جنرل ولسن جدہ میں مقیم تھا۔ اس نے شریف حسین کو ورغلا کر باغی بنادیا اور اس نے بغاوت کر کے حجاز سے ترکی حکومت کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔، اسی جنگ عظیم کے موقع پر انگریزوں نے ترکی حکومت کے حصے بخرے کر کے خلافت عثمانیہ کا وجود

مثادینے کی کارروائیاں شروع کر دیں جسکی وجہ سے پورے عالم اسلام میں تہلکہ مچ گیا۔ ہندوستان میں اسی واقعہ کی وجہ سے تحریک خلافت چلی۔ یہ اتنی طاقتور تحریک تھی کہ انگریزی نظم حکومت بے اثر ہو کر رہ گیا، عوام نے اپنی پولیس اور اپنی عدالتیں قائم کر لیں۔ سارے باہمی مسائل از خود حل کرتے، مقدمات کے فیصلے کرتے۔ مجرموں کو سزائیں دیتے، پورے ملک میں ”خلافت زندہ باد“ کے نعرے کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری تمام سیاسی پارٹیاں یا تو خلافت تحریک کی حمایت کرتیں یا مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں، اور ان کی سرگرمیوں پر اوس پڑ گئی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ہندوستان کے ہیر و بن گئے۔ سارے مسلمان تو ہم آواز تھے ہی، غیر مسلم بھی نعرہ تکبیر اللہ اکبر میں ہم آواز تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کا اتنا شاندار، بے مثال مظاہرہ ہندوستان کی تاریخ نے کبھی نہیں دیکھا تھا جو شخص یا جماعت کوئی ایسا کام کرتا یا ایسی بات کہتا جس سے اس اتحاد پر ضرب پڑتی تو پورے ملک کی اس پر لعنت لگے۔

خلافت کی مخالفت کرنے والوں کے جنازے پڑے رہ جاتے، ان کو دھتے۔

لیکن ہندوستان کے مقدر میں ابھی غلامی کے بہت دن خلافت عثمانیہ کی بحالی کیلئے پوری قوت سے تحریک چلائی جا رہی تھی۔ ایک ترکی لیڈر مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنے ہاتھوں قباء خلافت کو تار تار کر دیا۔ اور ترکی لی سرزمین سے خلافت کا جنازہ نکال دیا۔ ہندوستان کی تحریک خلافت اپنی موت آپ مر گئی۔

تحریک خلافت کے اس پورے دور میں مولوی احمد رضا خان کی حسام الحرمین کی تلوار زنگ کھاتی رہی کیونکہ اسکی اشاعت سے اتحاد و اتفاق میں خلل پڑتا تھا۔ اس طرح کی اٹھنے والی ہر آواز کو عوام گلا گھونٹ کر بند کرنے کیلئے بیٹابی کے ساتھ دوڑ پڑتے تھے اس لئے ان کی تکفیری مہم اپنی قبر میں سوتی رہی، لیکن حالات نے پلٹا کھایا حجاز میں شریف حسین کی بغاوت کی سزا والی نجد سلطان عبدالعزیز بن سعود نے شریف حسین پر حملہ کر کے دی، شریف حسین کو شکست ہوئی، پورے حجاز پر سلطان عبدالعزیز کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے اپنے مسلک کی رو سے قبروں پر بنے ہوئے قبوں کو منہدم کر دیا، سلطان کے اس اقدام کی خبر جب ہندوستان پہنچی تو اسکی مذمت میں جلسے ہونے لگے، رضا خانی جماعت نے اس معاملہ کو اپنی جماعت کا ایثوۂ بنالیا اور علماء دیوبند کو سعودی حکومت کے ان اقدامات سے جوڑ دیا اور ان کو وہابی اور نجدی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ حسام الحرمین کی تلوار از سر نو سان چڑھائی گئی، تحریک خلافت کے پورے دور میں ان کی تکفیری مہم جو

مرده خانے میں لاش کی طرح پڑی رہی، پھر اس میں جان ڈالی گئی اور پھر وہ میدان میں آ گئے۔ اس دور میں مولانا نعمانی جان ہتھیلیوں پر لیکر ان تمام مقامات تک پہنچنے کی کوشش کرتے جہاں رضا خانی جماعت کے نمائندوں نے زہر افشانی کی ہے۔ ہر طرح کے خطرات کا سامنا کرتے، ان کے تمام جبہ قبہ والے مولویوں کو مولانا نعمانی کا چیلنج عام تھا۔ کیسا ہی خطرناک ماحول ہو، کتنے ہی اندیشناک حالات ہوں، آپ کا بروقت اس مقام تک پہنچنا ضروری تھا۔ مولانا مرحوم پورے دس سال تک مسلسل ان کے تعاقب میں رہے، ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں بچا، جہاں رضا خانیوں نے بدعات و خرافات کی حمایت میں لن ترانیاں ہانکی ہوں اور مولانا نعمانی کی حق کی آواز وہاں نہ گونجی ہو، بریلوی مکتب فکر کے لوگ مسلمانوں کی شکل و صورت میں رہ کر اسلام کی شکل بگاڑنے والے جہاں بھی گئے ان کو لکارا، ان کے خلاف تقریریں کیں، مضامین لکھے، مناظرے کئے اور تمام متنازع فیہ مسائل کو علم و استدلال کی روشنی میں حق کو اتنا واضح کر دیا کہ ہندو سان کا سواد اعظم جسکو قدرت نے ذرا بھی علم دیا تھا، سچائی کو پا گیا اور اس نے بدعات و خرافات سے توبہ کر لی۔ احقاق حق اور ابطال باطل کا کوئی دقیقہ آپ نے نہیں چھوڑا، دس برسوں کی انتھک جدوجہد کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اب جو لوگ اپنے آباء اجداد کی گمراہیوں میں مبتلا ہیں وہ وہ حق کی روشنی کو سر کی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اسکو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تب آپ نے فیصلہ کیا کہ اب مناظروں کی ضرورت نہیں، اب اسکی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ اب مثبت انداز میں دین کی خدمت ہی وقت کی ضرورت ہے۔

### جماعت اسلامی کی تشکیل

اس غور و فکر کے دور میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جو کبھی جمعیت علماء ہند کے اخبار میں کام کرتے تھے، اب اپنا ایک رسالہ حیدر آباد سے ترجمان القرآن کے نام سے جاری کر رکھا تھا، مولانا نعمانی اسکی ابتدائی اشاعت سے اسکا مطالعہ کر رہے تھے۔ آپ ترجمان القرآن پابندی سے دیکھتے اور پڑھتے تھے، اس میں اقامت دین، حکومت الہیہ کا قیام اور اسلامی انقلاب کی جو دعوت دی جا رہی تھی بدرجہ آپ اس سے متاثر ہوتے رہے یہاں تک کہ کچھ دنوں بعد یہ دعوت آپ کے دل کی آواز بن گئی۔ دل جذبات سے سرشار، ایثار و قربانی آپ کی فطرت آپ کا مزاج، دین و ملت کی خدمت کیلئے سوز و گداز سے بھرا ہوا دل رکھتے تھے، اثر پذیری اس کا ایک عنصر تھا، مولانا نعمانی مودودی صاحب کی تحریروں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دل ان کی اقامت دین اور اسلامی انقلاب کی دعوت سے ہم آہنگ ہوتا چلا گیا، دل کی تڑپ بڑھتی چلی گئی اور

آپ کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دین کی خدمت کا اس سے بہتر طریقہ موجودہ دور میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

مودودی صاحب کے ذہن میں اب تک کسی تنظیم کا کوئی خاکہ نہیں تھا، نہ جماعت بنانے کا کوئی ارادہ، کچھ ہی دنوں بعد جب ایک جماعت کی تشکیل کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کا اظہار کیا تو سب سے پہلے جس نے پوری صدق دلی اور پورے جوش و جذبے سے مودودی صاحب کا ساتھ دیا اور دست تعاون بڑھایا وہ مولانا نعمانی مرحوم تھے، جماعت اسلامی کی تشکیل میں ان کی حیثیت شریک غالب کی تھی۔

### شک کا کاٹنا

مگر کچھ ہی عرصہ بعد آپ کو احساس ہوا کہ جو راہ منتخب کی گئی ہے۔  
ترکستان کو جارہی ہے۔ مولانا نعمانی شدت دین پسندی اور اسلام کے  
سرشار ہونے کی وجہ سے مودودی صاحب کے حلقہ اثر میں آگئے اور  
سال ضائع ہو گئے۔  
خدمت دین کی نئی راہیں

مولانا نعمانی اس دور کے مشہور بزرگ مولانا شاہ عبدالقادر راپوری رحمۃ اللہ علیہ سے  
بہت متاثر تھے، آپ نے ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔  
حضرت رائے پوری نے بیعت کے بعد آپ کو بانی تبلیغ جماعت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی  
طرف رجوع کرنے اور ان کی خدمت میں حاضری کے لئے تاکید فرمائی، شاید اس میں راز یہ تھا  
کہ جماعت اسلامی کے تعلق سے جو روحانی کرب اور ذہنی و فکری زخم لگے ہیں ان زخموں کا مداوا  
اس طرح ہو جائیگا، مولانا نعمانی پہلی فرصت میں نسبتی نظام الدین دہلی اس وقت حاضر ہوئے جب  
مولانا محمد الیاس صاحب بستر علالت پر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ انھوں نے اس  
حالت میں بھی مولانا نعمانی کا کھڑے ہو کر استقبال کیا اور فرمایا کہ میں انشاء اللہ اس بیماری سے  
اچھا ہو جاؤں گا اور مولانا نعمانی سے وعدہ لیا کہ کچھ وقت جماعت میں لگائیں گے، آپ نے وعدہ  
کر لیا، قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید، مولانا محمد الیاس صاحب اس تشویشناک بیماری سے صحتیاب  
ہو گئے۔ مولانا نعمانی پہلی بار ان کے ساتھ میوات کے سفر میں گئے پھر کچھ دنوں کے بعد مولانا  
کاندھلوی نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ کا سفر کیا۔ اس جماعت میں شریک ہونے کیلئے

مولانا نعمانی بریلی سے لکھنؤ پہنچے اور ان کے ساتھ رہ کر پوری دیدہ ریزی کے ساتھ جماعت کے کاموں اور اصولوں کو دیکھا اور اس کے طریقہ کار کا گہرا مطالعہ کیا جب دل اس طریقہ کار کی افادیت پر مطمئن ہو گیا تو پوری بصیرت اور انشراح قلب کے ساتھ بقیہ زندگی دعوت و تبلیغ کے لئے وقف کر دی اور اپنے رسالہ الفرقان کو دعوت و تبلیغ کیلئے خاص کر لیا۔ آپ نے اس سلسلہ میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور زندگی کا بیشتر حصہ اس مقدس راہ میں صرف کرتے رہے۔

### زندگی کا آخری دور

میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک پورے چار سال لکھنؤ میں رہا وہیں مولانا مرحوم کی دید و شنید حاصل ہوئی اور کبھی کبھی سلام و مصافحہ کی سعادت بھی ہوتی۔ بعض معاملوں میں ایک دو بار مولانا کے گھر پر بھی حاضری رہی۔ مولانا مجھ سے واقف نہیں تھے البتہ غائبانہ میرا نام جانتے تھے جیسا کہ مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی نے بتایا کہ جب تمھاری کتاب مولانا موصوف کو دی اور مصنف کا تعارف کرانا چاہا تو مولانا نے فرمایا کہ میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں، غائبانہ تعارف کا واقعہ یہ ہوا کہ جب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا تو ایک مشہور عالم نے اکبر کی گمراہی کا واحد ذمہ دار ابوالفضل اور فیضی دونوں بھائیوں کو ثابت کیا، میں اس سے متفق نہیں تھا، میں نے ایک مضمون لکھا جس میں میں نے فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ذمہ دار ملا عبد القادر بدایونی، ملا عبد اللہ سلطانپوری اور ملا عبد النبی کو بھی قرار دیا جو اکبر کے دربار سے وابستہ تھے اور فیضی اور ابوالفضل کے جرم کو کچھ ہلکا دکھانے کی کوشش کی تھی۔ مضمون اشاعت کیلئے الفرقان کو بھیج دیا۔ مولانا میرے مضمون سے متفق نہیں تھے۔ لیکن الفرقان میں شائع کیا البتہ مضمون سے پہلے سات آٹھ صفحات کا نوٹ لکھا، پھر اسکے بعد میرا مضمون اور پھر مضمون کے خاتمہ پر تین چار صفحات کا استدراک، میرے مضمون کو دونوں طرف سے گھیر کر پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا۔ میں طالب علم، مولانا عالم بے مثال۔ کچھ کہنے کی میری جرأت کہاں! میرے لئے یہی کیا کم تھا کہ مولانا نے میرے مضمون کو درخور اعتنا سمجھا، اسی مضمون کی وجہ سے مولانا مجھ سے غائبانہ واقف تھے۔ مولانا سے بالمشافہ ایک دو بار ملنے کے باوجود میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا، بس ایک ارادتمند کی طرح کبھی کبھی سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل کر لیا کرتا تھا۔ البتہ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں چار سالوں تک آپ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کرنے کی سعادت ملی۔ میری قیامگاہ سے چند قدموں کے فاصلہ پر مرکز کی مسجد تھی جس میں آپ جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے، دو رکعت نماز

جناب سید ثناء اللہ  
فاضل جامعہ رحیمہ لاہور

## ایک تاریخی شہادت

بخدمت جناب مولانا خلیل الرحمن صاحب سجاد نعمانی ندوی  
السلام علیکم کے بعد مزاج بخیر۔

آپ کے والد گرامی قدر حضرت علامہ محمد منظور صاحب نعم  
کا پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا۔ آپ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ اللہ  
میں جگہ عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق دے آمین۔  
رہا ہوں جو میں نے زمانہ طالب علمی میں کیا جو انکے علم و فضل سے تعلق رہا ہے۔ میں صاحب  
۳۵-۱۹۳۶ء میں جامعہ اچھرہ لاہور میں حضرت مولانا علامہ مہر محمد صاحب مرحوم سے قاضی  
مبارک امور عامہ بیضاوی شریف پڑھا کرتا تھا۔ مسجد وزیر خاں لاہور میں دیوبندی اور بریلوی  
حضرات کے درمیان درج ذیل مسائل متنازعہ پر مناظرہ ہونا طے پایا۔ علم غیب، حاضر و ناظر، مختار  
کل۔ اجتماع تین دن ہوتا رہا لیکن افسوس کہ علماء کرام کی باہمی شرائط نے نہ ہو سکیں اور کوئی نتیجہ  
خاطر خواہ برآمد نہ ہوا۔ اس مناظرہ میں علماء دیوبند کی طرف سے حضرت مولانا محمد منظور صاحب  
نعمانی اور مولانا ابوالوفا شاہ جہانپوری تھے۔ ادھر بریلویوں کی طرف سے مولوی حشمت علی وغیرہ  
درجنوں آئے ہوئے تھے۔ گو میں اس وقت طالب علم تھا۔ لیکن آپ کے والد محترم مرحوم و  
مغفور کی گفتگو سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ علم و عرفان کے پہاڑ ہیں اور جسم ظاہری علم پر ایک  
پردہ ڈالا گیا ہے۔ اگر مناظرہ ہو جاتا تو ہمیں یقین کامل تھا کہ بریلوی علماء کو ایسی عبرتناک شکست  
ہوتی جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھی جاتی۔ اسکے علاوہ میرا دوسرا مشاہدہ۔  
سلانوالی ضلع سرگودھا میں جو مناظرہ مولوی حشمت علی بریلوی سے علم غیب پر ہوا اس جلسہ کے  
صدر مولوی کرم دین صاحب دبیر رئیس اعظم آف بھین ضلع جہلم تھے۔ جنہوں نے آپ کی



گفتگو کی سنجیدگی اور متانت کو دیکھا۔ ادھر مولوی حشمت علی بریلوی کی دشنام طرازی اور مہکڑ بازی کو بھی دیکھا۔ حالانکہ مولوی کرم دین صاحب ہمیشہ بریلوی علماء کی حمایت کرتے رہتے تھے اور خود بھی بڑے سخت بریلوی تھے۔ مگر اس مناظرہ میں نعمانی صاحب کی سنجیدگی اور حشمت علی صاحب کی مہکڑ بازی کو دیکھ کر بریلویت سے بہت متنفر ہوئے۔ آپ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے رابطہ قائم کیا اور اپنے بیٹے قاضی مظہر حسین صاحب کو دیوبند میں داخلہ دلوا یا۔ جہاں جا کر قاضی صاحب نے علم حاصل کیا اور بعد میں حضرت مدنیؒ کے خلیفہ بنے۔ میں نے یہ مناظرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اللہ آپ کے والد صاحبؒ کے درجات بلند کرے، آمین۔

الراقم

سید ثناء اللہ فاضل نیلا گنبد، جامع رحیمہ لاہور  
 خلیفہ مجاز حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ  
 صدر گوگیرہ، ضلع اوکاڑہ

صفحہ ۲۶۰ کا بقیہ

جو چند منٹوں میں ادا ہو جاتی تھی اس کا تاثر آج تک مرے دل میں موجود ہے۔ مولانا پر خوف و خشیت الہی کا غلبہ تھا، آپ کے خشوع و خضوع اور استغراق کا عالم دیدنی ہوتا تھا۔ قرأت کرتے ہوئے آپ کی آواز شدت گریہ سے بھرا جاتی تھی۔ ترغیب و ترہیب کی آیتوں پر ہچکیاں بندھ جاتیں، تھر تھراتے ہونٹوں اور کپکپاتی ہوئی زبان سے الفاظ قرآنی کی ادائیگی اور اس پر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آپ کی غمناک آواز ایسی کیفیت پیدا کرتی تھی کہ خود میری آنکھیں بھر آتی تھیں، طویل علالت کے باوجود دماغ برابر کام کرتا رہا، یادداشت صحیح تھی۔ بہت سی تحریریں جو بعد میں شائع ہوئیں اسی معذوری کے زمانہ میں املا کرائیں، بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نعمانی زندگی کی آخری سانس تک دین کی خدمت پوری قوت ایمانی کے ساتھ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اس مجبوری میں بھی جبکہ اپنی ضرورتوں کے لئے بھی زبان کو جنبش دینی دشوار تھی، دین و شریعت کی سرافروزی اور سر بلندی کے لئے کام کرتے رہے۔

والک فصل اللہ یوتیہ من یشاء، اللھم اعمر وارحم وانت خیر الراحمین

☆☆☆

## والد ماجدؒ

### کچھ یادوں کی روشنی میں

عمر کی سوئی ستر (۷۰) کے ہند سے جا لگی ہے۔ اس کے اتنا ۱۰  
طور سے ان کے زیر سایہ گزرے۔ حافظہ اچھا ہوتا تو کام کی باتوں پر  
ہو جاتی۔ مگر یہ پہلے ہی کچھ اچھا نہ تھا۔ اب تو حال اور بھی خراب ہے۔ تا  
نمایاں ترین خصوصیت

ان کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت سراپا مقصدیت اور اسکے مطابق مشغولیت  
تھی۔ عمر کا کوئی لمحہ انہیں ضائع کرتے اور کسی ایسے کام میں صرف کرتے نہ پایا جس کے بارے میں  
خیال کیا جاسکے کہ وہ آخرت میں کام آنے والا نہ تھا۔ متعدد اصحاب نبی ﷺ کی روایت سے  
ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ حشر میں آدمی کو چار سوالوں کا سامنا کئے بغیر چھڑکارا نہیں ملے  
گا (۱) عمر کا ہے میں خرچ کی؟ (۲) (خاص کر) جوانی کی قوتوں کا مصرف کیا رہا؟ (۳) جو علم پایا تھا  
اس پر کیا عمل کیا؟ (۴) مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ مال کے بارے میں تو ان کے والد  
ماجد علیہ الرحمہ کی دعا تھی کہ ”اے اللہ دولت تو اسکے پاس کبھی نہ ہو، البتہ اس کا کام بھی نہ رکے۔“  
اور یہ دعا انہوں نے اپنے اس بیٹے کے لئے جو انہیں بہت ہی عزیز تھا۔ عزیز تر ہی ہونے کی بنا  
پر۔ بیت اللہ الحرام کے روبرو مانگی تھی۔ اور وہ زندگی بھر ان پہ سایہ کئے رہی۔ اس لئے مال کے  
بارے میں تو بظاہر ایسا کوئی خاص سوال ان سے ہونے کی نوبت نہ آئیگی۔ والعلم عند اللہ۔ البتہ  
عمر انہیں بھرپور عطا ہوئی، (۲۳ ۱۱ھ تا ۷۱ ۱۱ھ مطابق ۱۹۰۶ء تا ۱۹۹۷ء) جسمانی قوت کے لحاظ  
سے بھی وہ سوائے آخری دس پندرہ سال کے نہایت خوش نصیب لوگوں میں رہے۔ اور منہ کے  
باب میں بھی بے شک اللہ کا ان پر عظیم احسان تھا اور آخر تک رہا۔ مگر ان کی زندگی کی جس نمایاں

خصوصیت سے بات شروع ہوئی ہے وہ جیسے اللہ نے انہی تین باتوں کے سوالوں سے سرخ رو ہو کر نکلنے کے لئے انہیں بخش دی تھی۔

### جواں عمری کا حال

راقم الحروف جو ان کی اولاد میں سب سے بڑا ہے، اسکی عمر تین چار سال رہی ہوگی، کہ والد ماجد کو رنگون (برما) کا ایک سفر وہاں کے صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایک دینی ضرورت کیلئے کرنا پڑا (۱۹۳۱ء) اور کوئی چھ ماہ قیام رہا۔ کام ایسا تھا کہ ان کے ہم مشرب و ہم مذاق کئی دوست بھی ساتھ تھے۔ ہر علاقے میں کچھ قابل دید چیزیں ہوتی ہیں۔ سیر و تفریح کے مقامات بھی ہوتے ہیں۔ مہینوں کے طویل قیام میں پارٹی کے سب لوگ کبھی کبھی سیر و تفریح کی غرض سے یا عجائبات دیکھنے کی خاطر نکل جایا کرتے تھے۔ مگر والد ماجد کو وہ لوگ کبھی ساتھ نہ لے جاسکے۔ خود سناتے تھے کہ ایک دن ان دوستوں نے کہا کہ بھی آج تو بالکل ہی ایک نرالی چیز دیکھنے چل رہے ہیں۔ اس میں تو چلے ہی چلو۔ پوچھا کیا؟ کہا کہ سفید ہاتھی سنا تو بہت تھا، مگر معلوم ہوا ہے کہ یہاں عجائب گھر میں وہ موجود بھی ہے۔ اسی کو دیکھنے چل رہے ہیں۔ فرماتے تھے، میں نے جواب دیا۔ لا حول و لا قوۃ، یہ بھی کوئی ایسی شئی ہوئی؟ ہاتھی میں نے دیکھا ہے۔ بارہا دیکھا ہے۔ اور سفیدی بھی۔ میں دونوں کو آسانی تصور میں یکجا کر سکتا ہوں۔ پھر کاہے کے لئے، اپنا وقت اس کے لئے کہیں آنے جانے میں لگا دوں؟ جبکہ میرے وقت کا نہایت بہتر مصرف موجود ہے اس وقت ان کی عمر ۲۶-۲۷ سال رہی ہوگی۔

### مردِ کار

وہ اپنی جبلت کے اعتبار سے مردِ کار تھے۔ ہر مشغلے کو افادیت کی ترازو میں تولنا ان کا طبعی مذاق تھا۔ جہاں ٹھوس اور کھری افادیت نہ ہو ادھر کو انکی طبیعت راغب ہی نہ ہوتی تھی راقم السطور نے جب سے ہوش سنبھالا ہے بندوق کے شکار کو اپنے گھرانے (دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد) کا ایک عمومی شوق پایا ہے۔ اور اس شوق کیلئے سہولت فراہم کرنے میں ہمارے وطن کے محل وقوع کا بھی دخل ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ والد ماجد نے اس خاندانی شوق میں کبھی دلچسپی نہ لی ورنہ کبھی تو ہم ان کو دیکھتے کہ سنبھل آئے تو ایک آدھ دن اس تفریح کیلئے بھی چلے گئے۔ ہمارے لئے تو سنبھل یہو نچکر ممکن نہیں رہتا کہ اس شوق کا شکار نہ ہوں۔

تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے نیند کم آنے کی شکایت ہو گئی تھی۔ کوئی علاج کارگر

نہ ہو رہا تھا ایک ڈاکٹر نے (شاید کچھ زیادہ تفصیل سے حالات معلوم کر کے) رائے دی کہ آپ کو دواؤں کی نہیں ذہنی تفریح کی ضرورت ہے آپ کا دماغ ہر وقت سنجیدہ مصروفیت میں رہتا ہے اسکو کوئی وقت تفریحی مشغلے کا ملنا چاہئے ایسے مشاغل کے سلسلہ میں مثال کے طور پر انہوں نے ایک مشغلہ یہ بھی تجویز کیا تھا کہ کبوتر پال لیں اور ٹھوڑی دیر ان کا داندہ پانی کراتے ہوئے ان سے مشغول ہو جایا کریں اس طرح ذہن آپ کی سنجیدہ مصروفیت سے تھوڑی سی راحت کا وقت پالیا کرے گا۔ یہ کوئی بھوپال کے ڈاکٹر تھے۔ اس زمانے میں اہل بھوپال کو والد صاحب سے کچھ بہت خصوصی تعلق ہو گیا تھا۔ پس کسی طور پر دہاں جانا ہوا تھا تو واپس آکر لطیفے کے طور سے ہم لوگوں کو یہ ڈاکٹری مشورہ بہت ہنستے ہوئے سنایا۔ اور یہ مشورہ بس ایک لطیفہ ہی بن کر رہ گیا۔

یہ یا کوئی بھی دوسرا ہلکا سا تفریحی مشغلہ وہ اس طبی مشورے پر اختیار کر لیتے تو یہ یقیناً کسی غیر ضروری کام میں وقت ضائع کرنے والی بات نہ ہوتی۔ ”لیکن رنگون والا قصہ بتا رہا ہے کہ ان کا مزاج تو بالکل نوجوانی ہی میں ”کام اور بس کام“ کے سانچے میں ڈھل گیا۔ شغل کا مشورہ انہیں جس وقت دیا گیا تھا اس وقت عمر بچاس سے بھی قدرتی طور سے پختہ تر۔ اور اس مزاج اور اسکی پختگی ہی نے انہیں دراصل پہونچایا جس مقام سے وہ دنیا سے اٹھ کر آخرت کے راہی ہوئے۔

الارار الصالحین۔

### اس مزاج کار کی فتوحات

اپنی طالب علمی کی زندگی کے حالات میں انہوں نے لکھا ہے کہ ابتدائی سات سال انہوں نے محض ضائع کئے، کچھ پڑھ کر نہ دیا۔ اور پھر اللہ نے شوق کے اسباب پیدا کر دئے تو آئندہ سات سال میں ساری کسر پوری کر کے تعلیم کو تکمیل تک پہونچا دیا۔ انہی سات سال میں دراصل ان کے ”ہمہ تن کام“ واسے مزاج کی داغ بیل پڑی۔ اور نتیجہً نمایاں حیثیت میں فراغت حاصل ہوئی۔ پھر اسی مزاج نے ان کو مناظرے کے اس میدان میں آنا فانا نمایاں کیا۔ جوان کی عملی زندگی کا اولین میدان تھا۔ اس مزاج کی بدولت وہ اپنے موضوع پر اس غیر معمولی حد تک حاوی ہوئے کہ مقابل کے مناظر نے اگر کسی ایسی کتاب کی کوئی عبارت اپنی دلیل میں پڑھی جو کتاب اس وقت ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ اس کتاب کا ذرا فلاں صفحہ پڑھے وہاں آپ کا جواب موجود ہے۔ اس پر اگر مقابل مناظر نے کہا کہ نہیں آپ خود پڑھ کر سنائیے، تو برجستہ اس ساز کی کوئی کتاب اپنی کتابوں میں سے اٹھالی اور کہا کہ کھولے فلاں صفحہ اور

سطر فلاں اور حافظے سے عبارت پڑھنا شروع کر دی۔ اور مقابل کو آخر تک شبہ بھی نہیں ہو سکا کہ یہ عبارت کتاب سے نہیں حافظے سے پڑھی جا رہی ہے۔ اپنے موضوع پر اس درجے کا حاوی ہونا اسکے بغیر کہاں ممکن ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کام بنالے؟

وہ سات سال جس میں انہوں نے دل لگا کے پڑھا۔ انہی کے سلسلے کی ایک بات یہ کہتے ہوئے سنائی تھی کہ ”اللہ معاف کرے“ اور وہ یہ تھی کہ منطق کی ایک کتاب قطبی نام سے درس نظامیہ میں ہے، اس کتاب کے بارے میں ذکر فرماتے تھے — اور شاید یہ تذکرہ اس وقت کی بات ہو جب یہ راقم السطور اس کتاب کو پڑھ رہا تھا — کہ ”میں نے یہ کتاب حفظ کر ڈالی تھی۔ اور اللہ معاف کرے اپنے ساتھیوں کا امام بن کے ان کو اس کتاب سے گویا تراویح پڑھایا کرتا تھا۔“ قطبی کوئی بڑے درجوں کی کتابوں میں نہیں ہے۔ اس کے بعد کوئی چار سال اور تعلیمی سلسلہ رہا ہو گا۔ تو ظاہر ہے کہ جہاں قطبی کے زمانے سے یہ حال ہو وہاں بخاری اور ترمذی کے سال میں کیا کچھ نہ رہا ہو گا؟ اور اسی وجہ سے وہ بات ممکن ہو سکی ہو گی جو،، تحدیثِ نعمت،، میں آئی ہے کہ تعلیم کے آخری زمانے میں ہی انہوں نے اُس میدان کی علمی ضرورتوں سے بھی اپنے آپ کو کافی حد تک مسلح کر لیا تھا جس میدان سے اٹھنے والی ہل مس مسارر کی صدا میں ان کے کانوں سے ٹکرار ہی تھیں۔ یعنی دعوتِ شرک و بدعت کے مقابلہ میں احیاءِ توحید و سنت کا میدان۔

### وقت کے معاملہ میں حساسیت

ہمہ تن کام ہی کے اس ذوق و مزاج نے انہیں اپنے وقت کے معاملہ میں بوجد حساس بنا دیا تھا۔ طبعاً وہ خشک نہ تھے۔ اسکو تمام قریبی تعلق والے جانتے ہیں۔ لیکن بے ضرورت ایک منٹ بھی کسی کو دینا انہیں اپنے وقت کا ضیاع معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں مجلس نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی جس میں نشست اور گفتگو کو انکے معیار ضرورت کا پابند رہنا مشکل ہوتا۔ البتہ عصر بعد کیلئے دروازے کے باہر لکھو ادا تھا کہ کوئی ملنے کو آنا چاہے تو اس وقت میں آجائے یعنی اس کام کیلئے باقاعدہ وقت فارغ نہیں تھا۔ کوئی آگیا تو اسکو وقت دیا ورنہ اس وقت میں بھی ضرورت ہوتی تو وہ اپنا کام کرتے۔

### ایک کیفیتِ استغراق

کام اور ہمہ تن کام نے جو کہ زیادہ تر دماغ ہی سے تعلق رکھتا تھا ذہن و دماغ کو ایک ایسے

استغراق کی کیفیت دیدی تھی کہ راہ چلنے میں بھی انکو پوری طرح اس سے چھٹکارہ نہیں ملتا تھا ساتھ چلتے ہوئے اگر وہ ساتھ والے سے بات نہیں کر رہے ہیں تو انکے چہرے پر نگاہ پڑنے سے صاف نظر آجاتا تھا کہ دماغ کہیں مشغول ہے۔ دیوبند کے سفر میں رکشا کا جوائیکسیڈنٹ ۱۹۷۳ء میں ہوا جس نے کو لھے کی ہڈی میں فریکچر کیا۔ اور وہ بالآخر سخت معذوری اور عوارض کا باعث بن گیا وہ اسی استغراق و محویت کا نتیجہ بظاہر اسباب تھا ورنہ اگر انکی راستے پر نظر ہوتی تو کچھ نہ کچھ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر سکتے تھے اور بالکل بے خبری کے عالم میں جھٹکا کھا کر گرنے کی جو صورت پیش آئی وہ شاید نہ آنے پاتی۔ ویسے مقدمات اپنا راستہ ہر حال میں بنا لیتے ہیں۔

اس انہماک و استغراق کی بدولت ان کو روزہ بہت آسان تھا اپنے لکھنے پڑھنے کے کام پر بیٹھنے کے بعد وقت کا ان کو پتہ ہی نہیں رہتا تھا۔ اور ایک دفعہ تو روزے کے عالم میں اس محویت نے عجیب ہی تماشہ کیا، تبلیغی مرکز لکھنؤ والا مکان تھا نہایت مختصر مکان۔ اسکے اور کی منہ (میں) فقط ایک چھوٹا سا کمرہ تھا بس ایک تخت اور پلنگ کی گنجائش کا۔ وہی انکے لگے۔

پشت کی طرف بھی ایک دروازہ مرکز میں اتر جانے کیلئے تھا۔ مرکز میں گھر میں آنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تو اس پشت کے دروازہ سے ا

جاتے تھے۔ رمضان کے دنوں میں ایک دن مغرب کی اذان ہو جانے۔

ہوئی جب تک گھروالوں نے یہ دیکھ کر کہ اذان ہو جانے پر بھی افطار کیلئے نہیں اترے، یہ وہاں جا کر انہیں بتایا کہ اذان ہو چکی، افطار نہیں کریں گے؟ حالانکہ اذان کی جگہ کمرے کی پشت کے دروازے سے متصل ہی تھی مگر انہیں بالکل خبر نہ ہوئی نہ معلوم وہ کب تک لکھتے ہی رہتے اگر بہن نے اوپر جا کر بتایا نہ ہو تا کہ ابی اذان ہو گئی۔

زندگی کا اصل مشغلہ اور اس کیلئے جذبہ کا عالم

الغرض عمر کا کوئی لمحہ کسی ایسے شغل میں صرف کرتے ہوئے انہیں نہیں پایا جس کے بارے میں خیال ہو کہ وہ آخرت میں کام آنے والا نہ تھا۔ ان کی زندگی کا اصل مشغلہ جس میں وہ ہمہ تن کام کی کیفیت کے ساتھ عملی زندگی کے اولین دن سے لگے رہے وہی دین ملت کی خدمت و نصرت تھا جس کے حوالے سے انہیں پہچانا جاتا تھا اور انشاء اللہ یہی حوالہ ان کی پہچان ہمیشہ رہیگا۔ اس مشغلے کی مختلف عملی شکلوں میں سے دو چیزیں عمر بھر قائم رہیں۔ تحریر و تصنیف اور وعظ و تقریر۔ باقی درس و تدریس کا بھی ایک وقت رہا اور شرک و بدعت کے خلاف مناظرانہ نبرد آزمائی کا بھی! اور یہ نبرد آزمائی والادور۔ جو ان کی عین جوانی کا دور ہے۔ اسکے بارے میں تو وہ

فرماتے تھے کہ اللہ نے ”اس زمانے میں ایک جہادی اسپرٹ عطا کر رکھی تھی۔ دل مچلتا تھا کہ زندگی اسی راہ میں کام آجائے۔“ اور ”کام آجانے“ کی بات کا پس منظر یہ تھا کہ اس سلسلہ میں اکثر بڑے خطرناک ماحول سے واسطہ پڑتا تھا۔ اسی دور میں انہوں نے (۱۹۳۴ء-۱۳۵۳ھ) سے الفرقان جاری کیا تھا اور اس کام کیلئے انتخاب جس جگہ کا کیا اسکا نام بریلی تھا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی بریلی نہیں۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب کی بریلی۔ یہ انتخاب بجائے خود شہادت ہے کہ جذبات کی جولانی ضرور شہادت کی طلب تک لے گئی تھی۔

الفرقان کی دعوت کیا تھی؟ اس کے الفاظ بھی، جو ہر ماہ ٹائمیل کے آخری صفحے پر شائع ہوتے تھے، اس وقت کے جذبے کی بے تابی کا پتہ دیتے ہیں۔

## من انصارى الى الله

اللہ کے راستے میں کون کون میری مدد کرے گا۔

میرا مقصد دین الہی کی اشاعت اور توحید و سنت کی حمایت و حفاظت ہے میں چاہتا ہوں کہ تمام مسلمان حقیقی معنی میں خدائے واحد کے پرستار ہو جائیں۔ میری تمنا ہے کہ مدنی آقا کا علم صداقت ہمیشہ سر بلند رہے اس کے دشمن نگوں سار ہوں، میری آرزو ہے کہ دنیا کے سارے انسان خدا کے اس ہاشمی محبوب کے قدموں سے وابستہ ہو کر دین و دنیا کی عزت حاصل کریں جو بنی نوع انسان کا سب سے بڑا محسن ہے۔ ان پاکیزہ مقاصد کی کامیابی کیلئے میری ہر قسم کی اعانت بالخصوص توسیع اشاعت کی سعی کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ☆

الفرقان

بے تاب جذبے کا ایک نیا سفر

الفرقان کا اجراء ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ اگلے ہی سال یعنی ۱۳۵۲ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانوں کو ایک جزوی قسم کی خود مختاری دینے کے لئے ایک بل پاس کیا۔ جو قانون بن کر انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کہلایا اسکے ماتحت صوبائی اسمبلیاں اور حکومتیں بننے کے لئے ۱۳۵۶ء میں صوبائی انتخابات ہوئے اور ۱۳۵۷ء میں یہ حکومتیں بن گئیں۔ برطانوی ہندوستان کی اس آئینی تبدیلی کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی کلی خود مختاری اب زیادہ دور نہیں ہے۔ تب اس آزاد اور خود مختار ہندوستان کے جمہوری نظام حکومت میں مسلمانوں کا درجہ اور ان کی زندگی کا نقشہ کیا ہوگا؟ یہ

سوال ہر سوچنے اور سمجھنے والے سے جواب کا طالب ہو اسید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جو ان دنوں حیدر آباد دکن سے ترجمان القرآن نامی رسالہ نکال رہے تھے انہوں نے اس سوال کو پوری اہمیت کے ساتھ موضوع بنا کر اظہار خیال کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس نے والد ماجد کی پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور یہاں سے ان کا ذہن اس محدود میدان عمل سے نکل کر جو اُس وقت الفرقان کا خاص نشانہ تھا، اس نئے میدان کی طرف متوجہ ہو گیا جس میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے ملی تشخص اور دینی تقاضوں کے ساتھ انکی بقا کا مسئلہ فیصل ہونا تھا اور جو زیادہ اہم ہی نہیں زیادہ بڑا میدان عمل بھی تھا۔ اپنے سابق میدان میں وہ سردار و سپہ سالار تھے، مگر اس نئے میدان میں تابع کی حیثیت قبول کرتے ہوئے انھوں نے اولاً مودودی صاحب ہی کی طرف دیکھا جنھوں نے اس مقصد کے لئے ایک تنظیم کی دعوت شروع کر دی تھی۔ لیکن ان سے ملنے کے بعد ان کی زندگی کا جو نقشہ دیکھا تو اسے اس میدان عمل کے لئے کچھ امہ

آئے۔ (۱)

اب وہی ”کام اور ہمہ تن کام“ کی لگن والی روح بے چین تھی۔  
دنوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سیرت سید احمد شہید ”چھپی ار  
آئی۔ یہ گویا ایک نئی سمت سے نظر آنے والی روشنی کی کرن ایک پروانہ صفت دیو دے  
تھی۔ اسکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”خوب یاد ہے کہ اسے پڑھ کر اندر ایک آگ سی بھڑک گئی میں نے اسی وقت مولانا علی میاں کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتے پر خط لکھا اس میں کتاب سے متعلق اپنا تاثر ظاہر کیا تھا اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ مجھے صفائی سے بتائیے کہ آپ نے بس یہ کتاب لکھنے کے ارادہ کیا تھا جو لکھی گئی یادہ کام بھی کرنے کا ارادہ ہے جس کا یہ کتاب تقاضہ کرتی ہے؟ اگر یہ دوسری بات ہے تو میں آپ سے جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی مجبوری نہ ہو تو قریبی فرصت میں یہاں بریلی ایک دو دن کیلئے تشریف لے آئیں۔ اور اگر آپ کسی وجہ سے اس وقت نہ آسکتے ہوں تو مجھے بواپسی مطلع فرمادیں۔ میں انشاء اللہ خود آجاؤں گا۔“ (۲)

اس پر مولانا کا جواب اپنے وطن رائے بریلی سے آیا کہ میں اس وقت یہاں گھر پر مقیم

(۱) ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت“ ص ۳۰-۲۹ (مطبوعہ الفرقان بکڈ پو لکھنؤ)

(۲) سرگزشت ص ۳۳-۳۲۔



ہوں اور فلاں وجہ سے اس وقت سفر سے معذور ہوں آپ خود ہی یہاں تشریف لے آئیں۔ اسکا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ ”میں ممکنہ عجلت سے روانہ ہو گیا اور رائے بریلی پہنچ گیا“ (۱)  
 رائے بریلی پہنچ کر مولانا علی میاں سے گفتگو کی۔ مولانا بھی مودودی صاحب کے ان مضامین سے متاثر تھے والد ماجد نے ان کو مودودی صاحب کے قریب جانے اور پھر پلٹ آنے کا قصہ بھی بتایا اور آخر میں دونوں اس بات پر متفق ہوئے!

”اس وقت کے خاص حالات کے مطابق دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے جو کچھ ہو سکے وہ کرنا چاہئے اور بنام خدا اس کا آغاز کر دینا چاہئے“

لیکن اس آغاز کیلئے دونوں کے سامنے رکاوٹ یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس کام کیلئے امارت اور امیری کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ کچھ دوستوں کی طرف نظر گئی اور اس کیلئے ان سے براہ راست اور بلا تاخیر ملنے کا بھی فیصلہ کر کے دونوں نے کئی مقامات کے سفر کرنے کا فیصلہ کیا جن میں ایک سفر اتنے دور دراز کا بھی ہوا کہ ہندوستان کی سرحد افغانستان سے ملنے جا رہی تھی۔ لیکن ان سفروں اور ملاقاتوں کے باوجود وہ مردِ کاران کے ہاتھ آئے سکا جس کی انہیں تلاش تھی۔ اس تلاش کا ایک بندہ خدا نے مذاق بھی مولانا مودودی سے روگردانی کے جرم میں اڑایا ہے کہ لیجئے ایک امیر ڈھونڈنے گھومتے پھر رہے تھے! ایسا ہی کچھ موقع رہا ہو گا جب علامہ اقبال نے فرمایا

کم نظر بے تابی جا نم نہ دید

آشکارم دید و پنہا نم نہ دید (۲)

جذبہ اپنی جگہ بے تاب و بے قرار ہی رہا حتیٰ کہ ایک بار پھر سے بہا کر وہ مودودی صاحب کے قریب لے ہی گیا۔ اور جماعت اسلامی کی تاسیس عمل میں آگئی۔ یہ اگست (۱۹۴۱ء) کی بات تھی (۳) پشمان کوٹ کی بستی دارالاسلام جمالیپور جو ایک صاحب خیر (مرحوم چودھری نیاز علی صاحب) نے دینی کاموں کیلئے وقف کے طور پر بنائی تھی۔ وہ بستی جماعت کا مرکز بنانے کے لئے حاصل کی گئی۔ مودودی صاحب اور دوسرے بعض اہم ارکان کے لئے طے ہوا کہ وہ

(۱) ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت“ ص ۳۳۔ (۲) دیکھنے کی چیز میری روح کی جیتابی اور جذبہ کی بے قراری تھی۔ مگر براہِ کم نظری کا کہ اسے اندر کی یہ شے تو نظر نہ آئی بس باہر ہی کے منظر پر نظر تک رہ گئی۔

(۳) تفصیل کیلئے ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت“

وہیں مستقل قیام کریں۔ چنانچہ جون (یا جولائی) ۱۹۴۲ء میں والد ماجد بھی بریلی سے ترک سکونت کر کے پنجاب کی اس بستی میں جا ترے۔ یہ راقم السطور بھی ساتھ تھا۔ والدہ ماجدہ کو (جو ۱۹۴۳ء میں مرحومہ ہو گئیں) اور میرے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمن، کو کچھ ٹھہر کر بلانے کے خیال سے عارضی طور پر سنبھل میں، دادا اور دادی جان کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔

ایک نہ بھول سکنے والا واقعہ

یہ قیام اگرچہ دیر پا ثابت نہ ہوا اور جذبے کی بے قراری کو کچھ حقائق سے ٹکرا کر بالآخر سپردال ہی دینا پڑی۔ (۱) مگر یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ لن کے جذبے اور ان کی لگن کی کیا کیفیت تھی کہ وہ ایک بار پھر اسی جذبے کے ہاتھوں مجبور ہو کر مودودی صاحب کی طرف واپس گئے ایک چھوٹا سا واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک جمعہ کا دن تھا۔ دیکھا کہ والد ماجد اپنے پیچھے سائیکل کے کیریر پر بیٹھ رہے ہیں۔ کس لئے؟ پٹھانکوٹ کی کسی موقع پر پہنچ کر تقریر کرتا ہے۔ یقیناً والد ماجد نے مجھ سے ذکر فرمایا ہو۔ کے لئے اس طرح کی ضرورت سے باہر جاتا ہے۔ مگر مجھے اپنے حافظے نہیں۔ تاہم ان کا سائیکل کے کیریر پر بیٹھنا اس طرح یاد رہ گیا ہے جیسے وہ کھینچ جاتی ہے۔ اور یہ یقیناً اس وجہ سے کہ یہ ان کی عرفی حیثیت اور مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ایک اچھنبے کی سی بات تھی۔ مگر ان کی لگن اور جذبہ ان باتوں کو نہیں دیکھتا تھا۔

”سپاہی نہ کہ قائد“

اوپر مودودی صاحب کی طرف پہلی بار جا کر اول وہلہ ہی میں مایوسانہ پلٹ آنے کا جو ذکر مولانا علی میاں کی ملاقات سے پہلے آیا ہے۔ اسکی وجوہات کا تذکرہ اپنی سرگزشت میں کرنے کے بعد لکھا ہے

”مولانا کی طرف سے تو میں اس معاملے میں بالکل مایوس ہو گیا۔ لیکن ان کی تحریروں اور اپنے غور و فکر سے اس وقت جس قسم کی دینی جدوجہد کو میں نے ضروری سمجھ لیا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اس کا تقاضا روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن خود اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا پورا ادراستہ اسے جائزہ لیکر میں اپنے بارے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس قسم کے کسی کام میں قائد و علیر دار بننے کے لائق نہیں ہوں۔ ہاں اگر کہیں ایسا کام شروع ہو تو میں ان شاء اللہ اس کا ساتھ دینے والا ایک سپاہی بن سکتا ہوں۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ اللہ کا کوئی بندہ یا کچھ بندے جو مل سکیں وہ اس طرح کا کوئی کام کریں تو میں ان کے ساتھ لگ جاؤں“ (۲)

(۱) یہ ۱۹۴۲ء کے آخر کی بات ہے۔ (۲) ماثیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

بس یہی سپاہیانہ جذبہ تھا کہ انہیں ایک فرض کی ادائیگی کے لئے، کسی کے پیچھے سائیکل کے کیر پر پر بیٹھ کر بھی جانے میں مطلق عار نہ ہوئی، اور وہاں کے ماحول میں خود موجود ہونے کی بنا پر، بلا کسی تقابل کی نیت کے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہاں جو اور چند حضرات کسی عرفی حیثیت کے تھے، ان میں سے کسی کے بارے میں بھی اس ”سپاہیانہ“ روش کی توقع کرنا آسان نہ تھی۔

### حاصل بیان

بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے۔ ورنہ مدعا صرف یہ تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے والد ماجد کو بالکل شروع سے ہی اپنے دین برحق کے سلسلے میں ایسی مقصدی لگن دیدی تھی کہ عمر کے کسی لمحے کیلئے کسی غیر شرعی مصرف کی تو گنجائش ہی کیا محض مباحات (جائز امور) کا درجہ رکھنے والی چیزوں کیلئے بھی مشکل ہی سے ان کے یہاں گنجائش ہوتی تھی۔ اور یہ لگن اور اسکے مطابق مشاغل ظاہر ہے کہ علم پر عمل کے خانے کے سوا اور کسی بھی خانے میں نہیں ڈالے جاسکتے۔ یعنی یہ مقصدی مشاغل تمام تر نتیجہ ہی تھے اپنے علم پر عمل کے ذوق و شوق کا۔

### دوسرے ناگزیر مشاغل کا حال

رہے زندگی کے دوسرے مشاغل جنہیں بشری فطرت لازم کرتی ہے، جنکا بشری علائق مطالبہ کرتے ہیں یا جن سے تمدنی زندگی میں مفر نہیں، ان سب میں بھی ان کا قدم راقم آثم کی واقفیت کی حد تک، وہیں تک جاتا تھا جہاں تک فطرت کے تقاضوں یا علائق کے حقوق و مطالبات کی ادائیگی ہو جاتی ہو، ہاں البتہ اس زمرے کے جن اعمال میں نفس کی لذت کا کوئی حصہ نہ ہو اور وہ تمام تر ثواب ہی ثواب اور فضیلت ہی فضیلت ہوں ان میں وہ ایسے ہی ذوق و شوق سے مشغول ہوتے تھے جیسے کہ مذکورہ بالا مقصدی مشاغل میں ان کا حال دیکھا جاتا تھا۔ کسی جنازے کی نماز میں کوئی دوسرا صاحب علم موجود ہوتا تو خود پیچھے رہنے کی کوشش کرتے۔ مگر دوستوں (اور یہ لفظ ان کے یہاں بڑا وسیع تھا) میں کسی کا انتقال ہو جاتا تو نہ ہلانے کیلئے خود آگے بڑھتے اور قبر میں بھی اسے اپنے ہی ہاتھوں سے سلانا چاہتے تھے۔

حضرت سید عبد الرب صاحب صوفی ایم اے (م ۱۹۷۷ء) جن سے والد ماجد کا بہت

۱۔ (پچھلے صمے کا حاشیہ) جو جہات کی تحصیل کے لئے ”سرگردشت“ دیکھنی چاہئے۔ یہاں اس تذکرے کا اس اتقا اقتاس کا ہی ہو گا کہ ”دو تین دن وہاں مولانا کے ساتھ رہ کر ان کے بارے میں تو دیکھ لے بیٹھ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اچھا سوچے اور بہترین لکھنے والا تو بنا دیا ہے لیکن دینی انقلاب کی مقدس مہم چلانے کے لئے جو صعوات اور حرمہ کی چاہئے اس سے مولانا بہت دور ہیں۔ اور بظاہر ان معائنات اور اس زندگی کے حاصل کرنے کا ان میں کوئی خاص داعیہ اور ارادہ بھی نہیں ہے، اس لئے مولانا کی طرف سے تو میں اس معاملے میں بالکل مایوس ہو گیا۔“ (صفحہ ۳۲)

قدیم اور دلی تعلق تھا ان کی وفات پر ان کے بارے میں آپ نے دسمبر ۱۹۷۵ء کے الفرقان میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں اس بات کا افسوس کرتے ہوئے کہ ان کو غسل دینے کا موقع نہ مل سکا، حالانکہ اس کے لئے ان کی خواہش بھی تھی، لکھا ہے "اللہ کی توفیق سے میرا معمول ہے کہ اموات کو غسل دینے کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں، خاص کر اللہ والوں کو غسل دینے کی مجھے حرص ہے۔"

اسی طرح ایک طرف یہ حال کہ بے وقت بے ضرورت یا ضرورت سے زائد کسی کا بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اور دوسری طرف یہ کہ والد ماجد کو آنکھوں کے آپریشن کی ضرورت ہوئی ہے تو ان کو دہلی لے جا رہے ہیں اور پھر آٹھ دن، دس دن جس قدر بھی قیام کی ضرورت ہوئی نہایت خوشی سے وہاں ان کے ساتھ رہ رہے اور خدمت گزار رہے ہیں۔ پھر والدہ ماجدہ مرحومہ (یعنی ہماری دادی صاحبہ) اس ضرورت کے مرحلے میں آتی ہیں۔ تو انکے بھی خود ہی دہلی لیجاتے ہیں خود ہی ساری خدمت گزاری کرتے ہیں۔ اس کے خالہ صاحبہ کو لاحق ہوتی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب قیام بریلی سے۔ صاحبہ مرحومہ کو سیتاپور لیجاتے ہیں (جہاں لکھنؤ سے قربت کے ساتھ بھی ہندوستان میں یکتا درجہ کا ہے۔) اور ان کے ساتھ ایک خدمت اپنے بڑے بھائی صاحب (یعنی ہمارے بڑے تایا ابا مرحوم) کو یہ مرحلہ پیش آتا ہے ہواٹے سے بھی اسی طرح وقت فارغ کر لیتے ہیں۔

### رسمیات سے بعد کی کیفیت

اسکے برعکس کسی تقریب میں شرکت کے لئے وقت نکالنا ان کیلئے بڑا مشکل تھا۔ زیادہ وسیع الفاظ میں کہئے تو رسمی قسم کے کسی بھی اجتماع سے انہیں بالکل مناسبت نہ تھی۔ کسی خاص تعلق کی رعایت سے شریک بھی ہوتے تو بالکل نپے تلے انداز میں بس ایک "فرض کی ادائیگی" جیسا معاملہ ہوتا۔ کہنے کو کوئی خشک مزاجی بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن ان کی پوری زندگی پر نظر کرتے ہوئے انصاف کی بات غالباً یہ ہوگی کہ ان چیزوں میں انکی روح کیلئے لذت کا کوئی سامان نہیں ہوتا تھا اور یہ گویا ان کی "کمزوری" تھی کہ جہاں ان کی روح لذت نہ پائے وہاں ان کا دل نہیں کھلتا تھا۔ خاص طور سے اگر نمود و نمائش یا آرائش و زیبائش کی کوئی صورت تقریب میں نمود پذیر ہے تب تو وہاں وہ قدم رکھنے کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ لکھنؤ کے ایک صاحب نے اپنی بیٹی کا نکاح پڑھوانے کی خواہش ظاہر کی۔ راقم الحروف کے ہم عمر ہوتے تھے (اور ہیں) ان سے کوئی خاص

تعلق کی بات تو نہ تھی۔ لیکن غالباً اس بات کی قدر کرتے ہوئے کہ وہ ایک دوسرے حلقے سے باضابطہ اور نہایت گہرا تعلق رکھتے ہوئے یہ خواہش لے کر آئے تھے، والد ماجد نے منظور فرمالیا۔ اور اس منظوری میں اس حسن ظن کا یقین داخل رہا ہو گا کہ نکاح کی تقریب میں وہی سادگی ہوگی جو اہل دین کے یہاں ہونی چاہئے۔ بلکہ ان کے مزاج میں معاملے اور بات کی صفائی کا جو عنصر تھا اسکی بنا پر تو اس کا بھی غالب امکان ہے کہ اس معاملے میں اپنا اصول بتادیا ہو۔ لکھنؤ کی مشہور قیصر باغ بارہ دری میں یہ تقریب نکاح منعقد ہونا تھی، جو ہمارے گھر سے بالکل قریب ہی ہے۔ والد ماجد وقت مقررہ پر وہاں پہنچ رہے تھے کہ مکمل شادی والی آرائش وزینت کا منظر پایا۔ بس وہیں سے گاڑی واپس کرائی۔ اور ان سے معذرت کہلا بھیجی۔ اور ایسی ہی خلاف مزاج صورت خود اپنی ایک پونی کی شادی میں پیش آگئی تو اسکے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ ذرہ برابر کوئی فرق دیکھنے میں نہیں آیا۔

راقم الحروف کے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمن نعمانی کا نکاح تو راقم کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ رخصتی ایک دو سال کے بعد ہوئی۔ اس وقت لکھنؤ کے جس مکان میں ہم لوگ رہ رہے تھے وہ دو منزلہ تھا اوپر کی منزل میں تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ حفیظ میاں کی دلہن کی آمد کی تاریخ مقرر ہوئی تو جی میں آئی کہ دلہن والے کمرے کے دروازوں پر پردے لٹکا دیے جائے۔ کبھی کا پرانا روغن بے رنگ ہو چکا تھا۔ نیز دروازوں پر پردے لٹکا دیے جائیں۔ حفیظ میاں کے ایک دوست ان دنوں آئے ہوئے تھے وہ ان کاموں میں مددگار ہوئے۔ وہم بھی نہیں گذرا کہ یہ چیز والد کو ناگوار ہوگی۔ وہ ان دنوں میں کسی سفر میں تھے، باقی سب گھر والے بھی مع حفیظ میاں کے سنبھل گئے ہوئے تھے۔ وہیں سے دلہن کو آنا تھا۔ اور اپنے سفر سے واپس ہوتے ہوئے والد بھی ان لوگوں کے ساتھ واپس آنے والے تھے۔ واپسی کے بعد دوسرے تیسرے دن وہ جو اوپر گئے اور نئی دلہن والے کمرے پر کچھ ”دلہنیت“ کے آثار دیکھ آئے تو نیچے آکر نہایت ناخوشی کا اظہار فرمایا۔ بات ۵۰-۵۵ء کی ہے۔ بہت اچھی طرح تو یاد نہیں ہے۔ غالباً ان کو زیادہ ناگوار یہی پردوں سے ہوئی اور شاید کا شانہ نبوت کا وہ واقعہ یاد آگیا کہ رسول مقبول ﷺ ایک مرتبہ سفر سے تشریف لائے تو عائشہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر ایک پردہ لٹکا ہوا پایا (جو برائے ضرورت نہیں بلکہ برائے زینت تھا) آپ نے اسے ناپسند فرمایا کہ اللہ کا حکم نہیں ہے کہ ہم درودیوار کو لباس پہنائیں۔ (۱)

## سادگی اور بے تکلفی سے اُنس

مزاج کی یہ سادگی اور بے تکلفی، بلکہ تکلفات سے وحشت و دوری عمر بھر ان کا خاصہ رہی۔ ۷۵ء کی بات یاد آرہی ہے راقم الحروف کی صحت کی خرابی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ انگلینڈ میں اقامت پذیر ضلع بھڑوچ (گجرات) کے مولانا یعقوب قاسمی نے الفرقان میں بار بار اسکا تذکرہ دیکھ کر تبدیلی آب و ہوا کیلئے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ ان کا مرسلہ ٹکٹ بمبئی سے سفر کا تھا۔ والد ماجد نے ضرورت سمجھی کہ بمبئی تک وہ خود بھی میرے ساتھ سفر کریں۔ بمبئی ان مقامات میں سے ہے جہاں کے لوگ انہیں بہت ابتدائی دنوں سے جانتے اور مانتے آئے ہیں بعض اہل تعلق کو انہوں نے اطلاع دیدی تھی۔ اچھی خاصی تعداد میں لوگ اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے باہمی مشورے سے قیام کیلئے جگہ تجویز کر رکھی ہوگی۔ چنانچہ ہم لوگ اسٹیشن سے وہاں لے جا کر اتارے گئے۔ یہ ایک شاندار قسم کا وسیع و عریض امہ :

صحیح الفاظ میں کوٹھی تھی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا اشتہار ان دنوں انہیں مہربان کی کوٹھی تھی یعنی کوئی غیر لوگ نہ تھے تعلق رکھنے والا۔ بھی تھے اس میں اشتہار دیکر اسکی مالی مدد بھی کرتے تھے، مگر یہ اتفاق

کے یہاں اتار اگیا مجھے وثوق سے یاد نہیں کہ اسی دن شام کو یا دوسرے دن ۲۰ مسجد میں منتقل ہو گئے۔ جو کھوکھا بازار کی مسجد کہلاتی تھی اور تبلیغی جماعت کا مرکز تھی اور پھر جہاز پر سیٹ کی بکنگ اور بعض دوسرے مراحل سفر طے ہونے کے انتظار میں ایک ہفتہ یا عشرہ یہ قیام رہا، بات کیا تھی؟ صرف یہ کہ امیرانہ طرز رہائش کے ساتھ ساز کرنا والد ماجد کے بس کی بات نہ تھی (الایہ کہ کسی امیر کے بہ باطن درویش و فقیر ہونے کو وہ جانتے ہوں یا پھر مجبوری کی بات ہو) مسجد کے اوپر ایک سادہ سا کمرہ تھا اگر یادداشت غلطی نہیں کر رہی ہے تو اسکے فرش پر سونا اور لیٹنا ہوتا تھا اور یہ تو اچھی طرح یاد ہے کہ نہایت سادہ سا کھانا نیچے کسی عام سے ہوٹل سے آجاتا تھا۔ یہ وہ ماحول اور معیار زندگی تھا جس میں انکی روح خوش رہ سکتی تھی۔ تکلفات کا سایہ ہو تو گر انبار ہو جاتی تھی۔

تکلفات سے طبیعت کی دوری ہی کا نتیجہ تھا کہ اپنے گھر کے کام انہیں خود کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔ اپنے گھر کے ہر طرح کے کام کیلئے وہ بازار جاسکتے تھے۔ گوشت لانا ہو سبزی ترکاری لانا ہو۔ کپڑا خریدنا ہو۔ غرض جو بھی گھر کی ضرورت ہو وہ بے تکلف اسے انجام دیتے تھے (الایہ کہ کوئی اور اسے انجام دینے کیلئے موجود ہو۔ اور اللہ کا فضل تھا کہ اس نے دین کی فہم کے

ساتھ امور دنیا کی سمجھ بھی بھرپور عطا فرمائی تھی۔ گھر کی ضروریات ہی کی طرح اپنے ذریعہ معاش، کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات کی تیاری کے سلسلہ میں جس کام کی بھی خود انجام دہی کا تقاضہ پیدا ہو جائے اسے بے تکلف خود انجام دے سکتے تھے۔ کتابت کی تصحیح تو اکثر خود کرتے ہی تھے ضرورت ہو تو پریس جاسکتے تھے۔ کاغذ کی خریداری کر سکتے تھے اور کاغذ دیکھتے تو بہر حال تھے کہ مناسب ہے یا نہیں۔

### خادم نہ کہ مخدوم

اس مزاج نے انہیں عمر کے اس آخری دور کے سوا جس میں معذورانہ مجبوری کی صورت پیدا ہو گئی تھی خدمت سے ہمیشہ بے نیاز رکھا۔ سفر آئے دن تیار رہتا تھا۔ مگر تنہا ہی کرتے تھے۔ محض خدمت یا معاونت کے نام سے کسی کو ساتھ لینے کا سوال نہ تھا بلکہ کوئی تعلق والا کسی اور عنوان سے از خود کسی سفر میں ساتھ ہو گیا اور دل میں یہ بھی سوچ لیا کہ راستہ میں خدمت کا بھی موقع ملے گا تو اسے محض مایوسی کا موقع ملا۔ چودھری عبدالمنان نام کے ایک صاحب (اللہ غریق رحمت کرے مرحوم ہو چکے ہیں) بہت محبت رکھتے تھے گھر در کے بکھیرڈوں سے بھی آزاد تھے غالباً دیوبند سہارنپور کے ایک سفر میں اسی طرح سے ساتھ ہو گئے۔ واپس آکر بتانے لگے کہ بھی کان پکڑے، خدمت کو سوچ کر گئے تھے اٹے مخدوم بن کر آئے ہیں جس ضرورت کے موقع پر چاہا کہ اسکو انجام دیں، فرمایا کہ نہیں تم بیٹھو، میں زیادہ واقف ہوں کہ، مثلاً، چائے اس اسٹیشن پر کہاں اچھی ملتی ہے، اس طرح وہ اپنے ساتھ الٹی ہماری بھی خدمت کرتے گئے اور کرتے آئے ہیں۔

### شیخ بے مشیخت

انہیں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری جیسے شیخ وقت سے خلافت حاصل تھی۔ اور پھر ان کا درجہ حضرت شاہ صاحب کی نظر میں وہ تھا جس کے راوی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں کہ اگر اللہ نے قیامت کے دن پوچھا کہ میرے لئے کیا لائے ہو تو حضرت نے دو آدمیوں کا نام لیکر جن میں ایک نام مولانا منظور صاحب کا تھا فرمایا کہ ان دو کو بارگاہ الہی میں پیش کر دوں گا۔ اسکے باوجود ہم نہیں دیکھتے کہ انہوں نے دینی خدمت کا وہ ذوق و ولولہ رکھتے ہوئے جو زندگی بھر گویا ان کی پہچان بنا رہا بیعت اور پیری مریدی کے ذریعہ انجام دی جانے والی دینی خدمت کی راہ کو بھی اسی ذوق و ولولے والے انداز سے اپنایا ہو۔ حالانکہ انہیں تو خود اس راہ

سے بہت کچھ نفع پانے کا تجربہ ہو چکا تھا، بیعت وہ کر لیتے تھے مگر اس قدر کم اور اتنی خاموشی سے کہ بیعت ہونے والوں کے علاوہ کم ہی لوگ انکی زندگی کے اس پہلو کو جانتے ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ راقم نے بھی کبھی کسی کو بیعت ہوتے نہیں دیکھا اس کاراز بھی میری نظر میں اصلاً یہی ہے کہ ایسا کرنے میں خواہی نہ خواہی ایک مشیخت کا ہالہ ان کی شخصیت کے گرد بن جاتا۔ ان کے آگے پیچھے لوگ ہوا کرتے، اور یہ بات انھیں بالکل گوارا نہ تھی۔

مشیخت کو بھلا کیونکر راہ ملے؟

مشیخت کا ہالہ؟ عمر بھر طالب ہی بنے رہنے کا ذوق جسے ملا ہو مشیخت کو اسکے یہاں بھلا راہ ملے بھی کیسے؟ ”تحدیثِ نعمت“ ان کی آخری کتاب، جس کی اشاعت عین مرض و فاق میں ہوئی اس ذوق کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اس میں وقت کے معروف مشائخ، ایک مفصل تذکرہ اسی انداز کا حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جو دہ پ بھی پایا جاتا ہے جن کو اس تذکرے کی اشاعت سے پہلے شاید ہی کوئی ان کی زندگی بھی ایک قابل استفادہ نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اتفاقاً انکو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو انکی طالبانہ نظر نے ”اللہ کے اس بندے“ میں جو ”(تعمیراتی) ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا اپنے ہاتھ سے ایک خط بھی نہیں لکھ سکتا تھا حتیٰ کہ تلفظ بھی پورا صحیح نہ تھا“ دین کا وہ فہم پڑھ لیا ”جو سیکڑوں پڑھے لکھوں بلکہ فارغ التحصیل عالموں سے بھی اچھا تھا“ اور جس کی ”عملی زندگی“ کو پایا کہ ”ہم جیسوں کیلئے بڑی سبق آموز ہے“ اور اسلئے عمر بھر ان کے ساتھ وہی عقیدہ مندانہ معاملہ رکھا جو بزرگوں کے ساتھ اہل طلب کا ہوا کرتا ہے۔ ان کی شانِ طلب کا اندازہ کرنے کیلئے اس تذکرے کے یہ الفاظ پڑھ لینے کے ہیں کہ

”دیکھنے میں ایسے سادے اور لباس اتنا معمولی کہ اگر کوئی ناواقف ان کو اثر ف منزل (ان کا ذاتی مکان) کے بڑے دروازے کے پاس بیٹھا ہوا دیکھے جہاں وہ کبھی کبھی بیٹھتے رہتا تو زیادہ سے زیادہ ان کو وہاں کا درہان سمجھے۔ اور اگر کوئی ان کو اثر ف منزل کی مسجد میں دیکھے جہاں چھوٹا سا ایک حجرہ اب ان کی قیام گاہ ہے تو مسجد کا خادم اور جاروب کش تصور کرے۔ لباس کے علاوہ بھی ان کے کسی ڈھنگ سے کوئی آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ دنیا یا دین کی لحاظ سے بھی یہ شخص کوئی بڑا آدمی ہے۔“ (ص ۱۳-۳۱۳)

اس کتاب کا ایک اور تذکرہ بھی اسکے طالبانہ ذوق اور محبت، آشنائی کی ایسی ہی کلی شہادت دیتا ہے۔ یہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا تذکرہ ہے۔



کے یہاں والد ماجد کی اذیلین حاضری ۱۹۴۵ء۔ یا ۱۹۴۶ء میں ہوئی یعنی جبکہ آپ خود مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رانیپوری سے بیعت ہو چکے تھے اس بیعت کے بعد آپ کا رابطہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے بھی قائم ہوا اور ان بزرگوں کی وفات تک قائم رہا۔ لیکن یہ خود حضرت رائے پوریؒ کی ہدایت و رہنمائی سے ہوا تھا اور خود حضرت رائے پوریؒ بھی ان دونوں بزرگوں کے ساتھ بہت ہی محبت اور بہت قریبی رابطہ رکھتے تھے مگر حضرت شاہ و صی اللہ صاحب کے بارے میں ہمیں کوئی ایسی بات نہیں ملتی (دونوں بزرگوں کا مکانی فاصلہ بھی بہت طول طویل تھا۔ حضرت رائے پوریؒ کی بالکل مغربی سرحد پر اور حضرت شاہ و صی اللہ صاحب نہایت مشرق کی سمت میں) اسکے باوجود ہم حضرت شاہ و صی اللہ صاحب کے یہاں بھی انکو اس تذکرہ کی روشنی میں ایسا ہی سراپا نیاز اور سراپا طلب پاتے ہیں جیسی طلب اور جیسی نیاز مندی کے ساتھ وہ اپنے شیخ کے یہاں حاضر ہوتے رہے یا نہ کورہ بالا ان دونوں بزرگوں کے یہاں جن کی طرف خود ان کے شیخ نے رہنمائی کی تھی اور سلسلہ حضرت شاہ و صی اللہ صاحب کی وفات (۱۹۶۶ء) تک نہ صرف جاری رہا بلکہ شان طلب میں اضافے کے ساتھ جاری رہا۔ وہ ہفتوں ہفتوں کیلئے وقت نکال کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ان کے قیام و مستقر کی تبدیلیوں کے ساتھ کبھی گورکھپور کبھی الہ آباد اور کبھی بمبئی حاضر ہوتے۔ ان کی خانقاہ میں بہ نیت استفادہ قیام کرتے۔

زیادہ سے زیادہ مدظلہ

کیا کیا باتیں اس مشیخت نا آشنائی کی ذکر میں لائی جائیں۔ ۱۹۹۰ء کی بات ہے آفتاب عمر لب بام آرہا ہے سارے بزرگ جاچکے ہیں اور اپنی عمر کے اب بس وہ آپ ہی باقی ہیں یہ راقم آٹھ اگلے ارشاد پر اپنے ایک پرانے مضمون پر نظر ثانی کر کے اسے ”واقعہ کربلا اور اسکا پس منظر“ نامی کتاب کی شکل میں لاتا ہے یہ کام محض ان کے ارشاد کی تعمیل میں ہوا تھا اس لئے اسکو انہی کے نام سے منسوب کرتے ہوئے انتساب کی عبارت میں جب نام لکھا تو اسکے ساتھ دامت برکاتہم کے احترامی الفاظ شامل کر دئے۔ مسودے ہی کی حالت میں اسکو دیکھا تو فرمایا کہ یہ تو بہت زیادہ ہے زیادہ سے زیادہ ”مدظلہ“ لکھ دو یعنی زیادہ سے زیادہ وہ لکھ دو جس سے کم درجے کا کوئی لفظ ایک باپ کیلئے دستیاب نہیں ہے اور جو بلا تفریق ہر باپ کے حق میں موزوں ہوتا ہے نہ کہ ”دامت برکاتہم“ جیسا کوئی لفظ جس سے ایک دینی و روحانی بزرگی کا اظہار ہوتا ہے۔

خود کو کمتر سمجھنے کی طلب

اللہ نے ان کو دعا کا بہت خاص ذوق بخشا تھا اور پھر قدرتی طور پر ان دعاؤں سے بہت خاص مناسبت تھی جو آنحضرت ﷺ سے ماثور اور منقول ہیں اس چیز کو انہوں نے اللہ کی ایک بڑی نعمت کے طور پر اپنی کتاب ”تحدیثِ نعمت“ میں لکھوایا ہے۔ اور ان سیکڑوں ماثور دعاؤں میں سے ایک دعا کا بطور خاص بھی ذکر کیا ہے جو یہ ہے

اے اللہ مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور  
دوسروں کی نگاہ میں بڑا بنا دے۔

وفات سے تین چار سال پہلے ایک طویل بیماری پیش آئی معمولی نزلہ زکام اور حرارت سے آغاز ہوا۔ جو انکو ایک عام شکایت تھی ذرا سی بھی سردی لگ جانے سے پیدا ہوا۔  
طول کھینچا اور وہ شدت اختیار کی کہ پورے پچاس دن نرسنگ ہوم میں علاج سے فرق نہ پڑا حتیٰ کہ سحر کاشہ ہونے پر اس رخ سے علاج ہوا۔  
ٹوٹا۔ قدرتی طور پر اہل تعلق کے علم میں ہر طرف بات آگئی اور عیاء تعلق آنے لگے انہی میں کانپور کے مفتی منظور صاحب مظاہری ایک دن تشریف لائے۔  
کہ مفتی صاحب نے کوئی بات اظہار تعلق کی کہی تھی اس پر یابلس ان کے تشریف لانے ہی پر ایک شکر گزارانہ گریہ کی کیفیت کے ساتھ فرما رہے تھے کہ مفتی صاحب اللہ نے اپنے کرم سے لوگوں کی نگاہ میں تو بڑا بنادیا، کاش اپنی نگاہ میں چھوٹا بننا بھی موت سے پہلے نصیب ہو جائے۔ یاد کر لیجئے کہ اوپر جو بات ”دامت برکاتہم“ کے سلسلے کی گذری ہے وہ ۹۰ء کی تھی، یعنی وفات سے چھ سال پہلے کی اور یہ بات اس کے دو تین سال بعد ہو رہی ہے۔ یعنی اپنی نگاہ میں چھوٹا بننے کی ان کی خواہش ان کے ان تمام احوال کے باوجود تسکین پانے کو تیار نہ تھی جن کی روشنی میں ایک دوسرا آدمی یہ کہنے میں حق بجانب ہو گا کہ وہ خود کو ہیچ سمجھنے کی ایک مثال اس زمانے میں قائم کر گئے جب اس وصف کا چلن زمانے سے اٹھ چکا تھا۔

## تنقید و تنقیص کی برداشت

اس دعا و طلب کی عند اللہ قبولیت کہیں یا اس میں ان کی صداقت کا ایک نشان کہ مزاج میں حدت اور غصہ ہونے کے باوجود اپنے بارے میں تنقید و تنقیص پر برہم ہوتے ہوئے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ بعض موقعوں کی باتیں اس وقت یاد آرہی ہیں۔

(۱) ۵۷-۵۶ء میں جب جماعت اسلامی پاکستان اپنے ایک سخت بحرانی دور سے گزری اور بہت سے لوگ اس وقت اس سے الگ ہوئے تو الگ ہونے والے ممبران شوریٰ میں سے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب (لاہور۔ حال فیصل آباد) نے ان اختلافات کے سلسلے میں مودودی صاحب کے بعض افکار پر اپنے رسالے ”المسر“ میں اپنی رائے اور اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلہ مضامین میں سے ایک مضمون پر اس راقم الحروف کی نظر رک گئی اور اس میں مودودی صاحب کے جس نظریہ پر کلام تھا، راقم نے اسے الفرقان میں موضوع گفتگو بنالیا۔ عنوان تھا ”دین میں حکمت عملی کا مقام“ یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے، اور کوئی چار قسطوں میں یہ مضمون پورا ہوا۔ مودودی صاحب نے اس کا براہ راست تو نہیں لیکن بالواسطہ اس طرح جواب دیا کہ اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن میں اس مضمون کی بابت ایک جواب طلب مراسلہ شائع کر کے اپنے مراسلہ نگار کو مخاطب بنایا۔ اس جواب کا پہلا پیرا اگر اے الفرقان کے مضمون نگار کی نیت میں خرابی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے الفاظ بالکل صاف اور بدیہی طور پر بتا رہے تھے کہ یہ جواب راقم الحروف کے بجائے اس کے والد ماجد کو الفرقان کا مضمون نگار قرار دیکر لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں کہا گیا تھا کہ

” اصل بنائے بحث بجائے خود یہ مسائل نہیں ہیں بلکہ دل کا

ایک پرانا بخار ہے جو مدتوں سے موقع کی تلاش میں دبا پڑا تھا۔ اور اب اس کو

رکالنے کے لئے کچھ مسائل بطور حیلہ ڈھونڈ لیے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ راقم الحروف پر صادق آنے کا تو کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا تو مولانا سے کبھی کوئی ایسا واسطہ نہیں رہا تھا کہ بخار و غبار پیدا ہوا ہوتا۔ اور وہ دبا پڑا ہوتا۔ ہاں والد ماجد کا ضرور ان سے ایسا واسطہ رہا تھا، جو ان کے بارے میں اس طرح کا گمان مولانا کے دل میں گذر سکے۔ پھر یہ پیرا اگر جن الفاظ پر ختم ہوتا تھا وہ تو گویا بول رہے ہیں کہ نشانے پر والد ماجد ہی کی ذات ہے اور وہ الفاظ یہ تھے

”اگر خدا کا خوف اور ایک ایک لفظ پر اس کے حضور باز پرس کا خطرہ

نہ ہوتا تو میں بطور نمونہ بتاتا کہ آدمی تقوے اور خشیت کا لباس زور (۱)

پہن کر کیسی کچھ باتیں خود ان لوگوں کے خلاف بنا سکتا ہے۔“

جن حضرات نے جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کے تعلق سے والد مرحوم کی ”سرگزشت“ پڑھی ہوگی انھیں تو تفصیل کے ساتھ معلوم ہو گا کہ مودودی صاحب اور جماعت سے علاحدگی کی بنیاد، مودودی صاحب میں اس صفت تقویٰ ہی کا مسئلہ تھا جو ایک اسلامی امیر میں ہونی چاہیے، پس یہ الفاظ کہ ”آدمی تقویٰ اور خشیت کا لباس زور (بنادٹی لباس ولبادہ) پہن کر“ ایک کھلی چوٹ تھے۔ اور اس طرح مودودی صاحب نے خود اپنے الفاظ میں اپنے ہی ”دل کا ایک پرانا بخار“ اس موقع پر نکال لیا تھا (۱)۔ اور اس راقم کو تو اس سے اگرچہ اسلئے بہت تکلیف ہوئی کہ اس کی خطا میں مرحوم نے اس کے والد کو پکڑ لیا تھا مگر والد مرحوم میں (اللہ ان کو رحمتوں سے نوازے) کوئی علامت ایسی نہیں پائی جس سے ظاہر ہو کہ انھوں نے بھی اس چوٹ کا کوئی اثر لیا ہے۔ بلکہ عمر بھر کبھی بھی ان سے کوئی سخت لفظ مودودی صاحب کے بارے میں نہ آیا۔

(۲) اور اس سے چھ سات سال پہلے اسی طرح کا وہ واقعہ

خلاف ایک سخت فضائلک میں پیدا ہوئی۔ اس میں اکابر دیوبند کے

نے اس موقع پر ایک مفصل مضمون ”جماعت اسلامی اور اس کے

الفرقان میں لکھا جس کا اصل مقصد تو فتووں سے اختلاف تھا مگر

واقعی قابل اصلاح باتیں خود والد ماجد کی نظر میں تھیں ان کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس پر

نہایت تند و تیز جواب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی (مرحوم) کے قلم سے آیا۔ کیا تندی و

تیزی تھی کہ بس ”اللہ دے اور بندہ لے“ کہئے۔ ”میری غلطیاں“ کے عنوان سے ایک مختصر

مضمون والد ماجد نے اس پر لکھا۔ ایک لفظ کسی سختی و برہمی کا نہیں تھا۔ البتہ رنج و ملال کا اظہار تھا

کہ ان کو کس قدر غلط سمجھا گیا۔ اور آخر میں یہ کہ دراصل غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اپنے اور

اکابر جماعت کے درمیان وہ باہمی اعتماد اور حسن ظن فرض کر لیا جس کی موجودگی میں ایک

دوسرے کی غلطیوں کی نشاندہی میں حرج نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا اصلاحی اسی جگہ واپس

آگئے جس جگہ ان کو پہلے فرض کیا گیا تھا، مگر غلط ثابت ہوا تھا۔ یہ قصہ پورا کا پورا اسی نمبر

میں ہو سکتا ہے کہیں درج کیا جائے۔

(۳) جس زمانے میں ”ندائے ملت“ ہفتہ وار کی عملی ذمہ داری زیادہ تر والد ماجد اور ان

(۱) واقعہ یہ ہے کہ یہ بخار مودودی صاحب ہی کے دل میں ہو سکتا تھا اسلئے کہ دوسرے طرف سے ان کے تقویٰ کا سوال اٹھایا گیا

تھا۔ سوال اٹھانے والے کے دل میں تو کوئی بخار دما رہا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ضمنی بات بھی ایک لطیف

کی حیثیت سے قابل ذکر ہے کہ مودودی صاحب کی اس جوابی تحریر میں ”طفل کتب“ کی پھبتی بھی موجود تھی۔ جو ظاہر ہے کہ

راقم آثم ہی کو صاحب مضمون مان کر چست کی جا سکتی تھی، نہ کہ مولانا کے ہم عمر میرے والد ماجد پر۔

کے دو بیٹوں (عتیق و حفیظ) پر تھی، اس زمانے میں اخبار کے ادارتی کام میں مدد کے لئے کسی موزوں آدمی کی تلاش چل رہی تھی۔ دیوبند کے ایک جرنلسٹ جمیل مہدی مرحوم کے بارے میں والد ماجد کو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے کام کے ہیں۔ ان کو والد ماجد لے آئے اور پھر وہ گویا فرد خاندان بن گئے۔ ایک عرصے بعد ہم لوگوں نے ندائے ملت سے اپنا تعلق ختم کر لیا تو جمیل صاحب نے اپنا اخبار عزائم کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اولاً چند روزہ تھا پھر روزنامہ ہو گیا۔ ہم لوگوں سے تعلق ویسا ہی رہا۔ اسی دوران میں وہ وقت آیا کہ دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ کے بعد شوری اور مہتمم کے اختلاف کا قضیہ کھڑا ہو گیا۔ جمیل مہدی حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم اور ان کے صاحب زادگان سے تعلق رکھنے والوں میں سے تھے انھیں قدرتی طور پر والد ماجد کے موقف سے اتفاق نہیں ہو سکا۔ اور اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن حضرت قاری صاحب کے انتقال کے بعد وہ بہت جذباتی ہو گئے اور یہاں کے سارے تعلق کو بھول کر اپنے اخبار میں والد ماجد کے خلاف ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔ راقم کا اس زمانے میں ہندوستان آنا ہوا تو غالباً اس کی بیس قسطیں نکل چکی تھیں، جو قسطیں راقم نے دیکھیں ان کا جمیل مہدی (جن کو برادرانہ تعلق کی بنا پر جمیل بھائی کہا جاتا تھا) سے تعلق ناقابل یقین تھا۔ ان میں تنقید ہی نہیں تضحیک تھی۔ بہت رنج ہو نچا اور ان کی طرف جانے کے لئے قدم نہ اٹھ سکے۔ والد ماجد کو غالباً اندیشہ تھا، کئی دن کے بعد پوچھا جمیل کی طرف بھی گئے؟ میں نے کہا جی نہیں چاہتا، تو فرمایا نہیں بھی چلے گئے ہوتے، ان کی باتیں تم جانتے ہو کچھ زیادہ خیال کرنے کی تھوڑی ہی ہوتی ہیں۔ چند دن کے بعد پھر پوچھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں ارادہ نہیں کر سکا پھر ترغیب دی لیکن اپنا ظرف ان کا سنا نہ تھا۔ رنج نے پاؤں ادھر کو اٹھنے ہی نہ دیئے، حالانکہ انھوں نے اپنے اخبار میں میرے لندن سے آمد کی خبر ایسے انداز سے دی تھی گویا وہ اپنی طرف کو میری راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ مرحوم پھیپھڑوں کے مریض تھے۔ اس قصے کے بعد جلد ہی مرض زیادہ ترقی کر گیا اور حالت یاس میں اپنے وطن جانے لگے۔ تو والد مرحوم نے ان کو کچھ مالی ہدیہ بھجو کر رخصت کیا اور پھر جب انتقال کی خبر ملی تو برادر م مولوی محمد زکریا راوی ہیں کہ بڑی رقت طاری ہوئی اور دیر تک ہاتھ اٹھائے دعا کرتے رہے۔

(۴) ان کی خواہش اور فرمائش پر لکھی ہوئی میری کتاب ”واقعہ کربلا“ پر ایک بڑا محافلانہ اور معاندانہ تبصرہ پاکستان کے ایک ماہنامے میں آیا۔ یہ بہت مفصل تھا اور لکھنے والے صاحب اچھے پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے مگر ان کے جذبات کی معاندانہ کیفیت نے ایسی رکاکت اور تہذیبی

گراؤٹ ان کے قلم پر طاری کر دی تھی کہ پڑھتے ہوئے گھن آئے، راقم کے بارے میں تو جو کچھ رکاکت تھی وہ تھی۔ خود والد ماجد کے بارے میں اس کی سطح یہ تھی ان کے جو چند صفحات افتتاحیہ کے طور پر کتاب میں شامل ہوئے تھے ان صفحات میں حادثہ کربلا سے متعلق اپنے گھر اور شہر کا ماحول بتاتے ہوئے جس میں بچپن گذرا تھا ایک جملہ یہ لکھا کہ ”مجھے چھ سات سال کی عمر میں پورا شعور آ گیا تھا، مجلسوں میں (عشرے کی مجلسوں میں) جو کچھ سنتا تھا اسے سمجھتا تھا“ تبصرہ نگار کو اس بیان میں شاید کچھ مبالغہ نظر آیا تو اپنے شک و شبہ کے اظہار کے لئے جو پیرایہ بیان انھیں پسند آیا وہ یہ تھا کہ اس عمر میں تو ہمارے یہاں بچے ننگے پھر کرتے ہیں۔

راقم الحروف ان دنوں لندن میں تھا اور ایک دوست کو یہ تبصرہ کہیں سے پہنچ گیا تھا جو انھوں نے مجھ کو بھیج دیا تھا۔ اس کو پڑھ کر جو تاثر ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر تھا مگر والد ماجد نے یہ ہے جس میں اس تبصرے کو اس کی رکاکت کی طرف اشارے کے تبصروں کے مقابلے میں اس لئے قابل لحاظ قرار دیا گیا تھا کہ اس میں بعض متعین گرفتیں تھیں۔ اگرچہ وہ تھیں سب جذباتیت کا نتیجہ۔ اور تھا کہ آئندہ ایڈیشن میں بعض تعبیرات میں تبدیلی مناسب سمجھو۔ مدعا زیادہ واضح ہو جائے۔

راقم الحروف ایسے معاملات میں اپنے والد ماجد کی بڑائی سے پوری طرح واقف تھا اور اس معاملے میں ان کو اپنے اکابر کے قدم بقدم پایا تھا مگر اتنی بڑائی سے کبھی واقفیت کا موقع پہلے نہ ملا تھا۔ وہ ایک نو عمر آدمی کی تحریر میں اپنی ایسی توہین و تکذیب دیکھتے ہوئے بھی جسے میں شاید ہمیشہ ناقابل معافی پاتا رہوں قابل لحاظ کا لفظ اس کے لئے استعمال فرما رہے تھے۔ اور جن اعتراضات کو بدینتی پر اگر نہیں تو بد فہمی پر محمول کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا تھا، ان کے بارے میں وہ توجہ دلانا مناسب خیال فرما رہے تھے کہ آئندہ ایڈیشن میں تعبیر کی مناسب تبدیلی سے اپنا مدعا اور مافی الضمیر زیادہ واضح کر دیا جائے۔ یعنی اس درجے کے کم فہموں کی رعایت میں جو کمی رہ گئی ہے اسے دور کر دیا جائے۔ (۱)

(۱) ایک اعتراض مثلاً یہ کیا گیا تھا کہ فلاں عبارت (حاشیہ ص ۲۷ طبع دوم) میں حضرت معاویہ کو ”امام فاجر“ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات سوائے ایک بدینیت یا بد فہم کے کوئی اور اس لئے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کتاب کا تو سب سے بڑا امتیاز یہی ہے۔ جو بعض کے نزدیک اس کی سب سے بڑی خرابی ہے۔ کہ صحابہ کرام کی شان کا بلا تفریق تحفظ ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کی سب سے زیادہ ضرورت حضرت معاویہ ہی کے سلسلے میں پیش آتی ہے جس میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ اور یہ بات کچھ لوگوں کو جاہل برائی کی

راقم نے بعض موقعوں پر ان کی زبان سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا تھا کہ کسی نے آپ کی صیغہ النسی پر حملہ کرنے والے الفاظ بولے تو حضرت نے بلا کسی اشتعال کے فرمایا کہ بھائی میرے والدین کے نکاح کے گواہ ابھی موجود ہیں۔ مذکورہ بالا خط پڑھ کر میرے دل نے کہا کہ بے شک انھیں حق ہے کہ بزرگوں کے ایسے واقعات نصیحت کے لئے سنائیں۔

### حزبیت سے بالاتری

دیوبند میں پڑھا۔ مسلک دیوبند اور اکابر دیوبند سے وہ محبت کہ تعلیم کے دوران ہی میں اس مسلک اور اس کے اکابر کے خلاف غوغا آرائی سنی تو وہیں اس سے نپٹنے کی تیاری شروع کر دی اور عملی زندگی کے میدان میں جو اپنا پہلا نقش ثبت کیا وہ اس مسلک حق کے خلاف فتنہ اٹھانے والوں کا وہ تعاقب تھا کہ برصغیر میں پھیلی ہوئی پوری جماعت دیوبند کے لئے وہ باعث فخر ہو اور اکابر کی نگاہ میں قابل رشک قدر و منزلت پائی اور پھر عمر کے چالیسویں سال میں وہ وقت آیا کہ اکابر نے اپنے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اپنے پہلو بہ پہلو ایک رکن کی حیثیت سے ان کا انتخاب کیا تو اس مجلس میں بھی اپنے خلوص، جذبہ وفا اور جذبہ عمل کے زیر اثر وہ وقعت پائی کہ اکابر کے گذر جانے کے بعد ان کی رائے کو جو وزن ملتا تھا وہ ان کے کسی بھی ہمسر کے لیے قابل رشک تھا۔ دنیا سے وہ اس حال میں گئے کہ بلا ادنیٰ اختلاف دارالعلوم اور اس کی شوریٰ کی سب سے موقر و محترم شخصیت تھے۔ اس سب کے باوجود حزبیت اور مسلکی گروہیت سے بالاتری کا کیا حال تھا؟ صرف ایک بات کا تذکرہ بالکل کافی ہے۔

انتقال کے بعد ماہنامہ مینات کراچی کے ایڈیٹر محترم مولانا محمد یوسف لدھیانوی زید مجد ہم نے جو تعزیتی مضمون اپنے ماہنامے میں بالاقساط تحریر فرمایا اس کی پہلی ہی قسط میں انھوں نے آپ کا ایک خط شائع کیا ہے، جس کا ایک جزویہ ہے۔

”اس مہینہ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو دارالعلوم دیوبند میں تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے اجلاس بلایا گیا ہے۔ یقین ہے کہ جناب کی خدمت میں بھی دعوت نامہ پہنچا ہو گا۔ دعوت نامے میں ایک بات بہت غلط لکھ دی گئی ہے اگر آپ کو وہ دعوت نامہ پہنچا ہو گا تو آپ نے بھی محسوس فرمایا ہو گا کہ غلام احمد قادیانی کا تعاقب سب سے پہلے حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے فرمایا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خاص کر پنجاب کے حضرات علماء کی طرف سے اس کا تعاقب حضرت شاہ صاحب کی پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو گیا تھا۔ میں نے دعوت نامہ ڈاک سے ملتے ہی لکھا تھا کہ فوراً اس غلطی کا تدارک کیا جائے۔ بڑی فاحش اور رسوا کن غلطی ہے۔ ہاں میرے نزدیک یہ بات صحیح ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے قادیانیت کے خلاف جنگ کا خاتمہ کامیابی کے ساتھ حضرت شاہ صاحب اور ان کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلامذہ کے ذریعہ کر لیا۔“ (مینات اگست ۱۹۹۹ء ص ۱۲)

اکابر دیوبند میں بھی حضرت انور شاہ صاحبؒ وہ ہستی ہیں جن سے والد ماجد کا تلمذ بھی ہے اور علمی و روحانی ہر دو طرح سے وہ تاثر و عقیدت بھی جو اپنی مثال آپ ہے۔ اور جس کا بیان اکثر قارئین ”تحدیثِ نعمت“ میں پڑھ چکے ہوں گے۔ لیکن نہ دارالعلوم سے ان کی محبت اس کی روادار ہو سکی اور نہ حضرت شاہ صاحب سے تاثر و عقیدت کہ جو خراجِ تحسین (CREDIT) کسی اور کا حصہ ہے اُسے اپنے کچھ لوگوں نے غلطی سے بھی اپنے اکابر کے حصے میں ڈال دیا ہے تو اُسے طرح دے جائیں (۱)۔ اس غلطی کیلئے ”فاحش“ سے آگے بڑھ کر ”رسوا کن“ کا لفظ حزبیت سے ان کی بالائری کا جو درجہ ظاہر کرتا ہے اسے کسی شرح و بیان کی حاجت نہیں۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ ورنہ ان کی پوری زندگی الحمد للہ حزبیت اور گروہی ذہنیت سے بالاتر رہنے کی شاہد ہے۔ ابھی دو تین صفحے پہلے ”جماعت اسلامی اور اسکے خلاف فتوے“ کے عنوان سے ان کے جس مضمون کا تذکرہ گزرا وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ۱۰۱۔

بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہ اُس جماعت کی فی الجملہ حمایت میں لکھا گیا چلے تھے۔ بلکہ جس کے قائد و سربراہ کے اپنے ساتھ معاملے سے اُنھیں ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت“ میں موجود ہے

### اعتمادِ فکر

حزبیت اور گروہی ذہنیت سے یہ بالائری جس چیز نے اُن کے لئے آسان کی بظاہر اُن کی سوچ اور فکر کا اعتماد ہے، جس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اُن کے امام ہیں۔ اور ابتداءً اُن کے ذہن کا یہ سانچہ بننے میں اُن کے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے فیضِ صحبت کی بھی علامات پائی جاتی ہیں۔ الحمد للہ کہ اُن کے اس اعتمادِ فکر کا ایک مرقع اُن کی کتاب ”معارفِ الحدیث“ کی شکل میں اُن کے بعد بھی موجود ہے۔ اور جو لوگ بھی اعتماد کو بحیثیت ایک اصول کے پسند کرتے ہیں اُن کیلئے وہ ایک نمونہ ہے کہ اس اصول کو، جس کا برتنا بیحد مشکل اور ”کارِ شیشہ و آہن“ ہے، کس طرح واقعی معنی میں برتنا جاتا ہے۔

اسی کتاب کے سلسلے میں ایک خط کا جواب مجموعہ مکاتیب میں سامنے آیا ہے جس کی چند سطریں یہاں نقل کر دی جائیں تو اُن کی سوچ و فکر کا انداز بہت ہی کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ خط کینیا کے ایک صاحب کو سوا حلی زبان میں معارفِ الحدیث کے ترجمے کی اجازت دینے کیلئے

(۱) اس باب میں وہ اپنے زمانے کے لوگوں میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم کا اہمیت سے ذکر فرمایا کرتے تھے جو اہمیت جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔



لکھا گیا ہے: ارشاد ہوتا ہے:

”معارف الحدیث کی تمام جلدوں کی سواہلی زبان میں ترجمے کی میرے طرف سے اجازت ہے

میں نے اپنے نزدیک اُن احادیث کی تشریح میں مسلکی تعصب کی بنا پر بے انصافی نہیں کی ہے جن کا تعلق فقہی اختلافی مسائل سے ہے۔ ہاں یہ بات میرے پیش نظر ضرور رہی ہے کہ برصغیر ہند میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی غالب اکثریت جو حنفی المسلک ہے اس کو اپنے مسلک کے بارے میں بے اطمینانی نہ ہو۔ میں نے اسکو دینی مصلحت سمجھا۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً فیوض الحرمین میں تحریر فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تین وصیتیں میرے ذاتی رجحان کے خلاف فرمائیں۔ اُن میں سے ایک یہ تھی کہ اپنے ملک میں جا کر وہاں کے عامہ مسلمین کے رویے کے خلاف رویہ و مسلک اختیار نہ کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہی تھا کہ ان کے خلاف عمل کرنے سے امت میں انتشار پیدا نہ ہو۔

بہر حال اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ سواہلی زبان بولنے والوں کی اکثریت شافعی المسلک ہے کتاب الصلوٰۃ میں یا جہاں بھی فٹ نوٹ لکھنے کی ضرورت سمجھی جائے، وہ ضرور لکھا جائے، میرے نزدیک یہ بھی دینی مصلحت ہے۔“ (۱)

## حمیتِ دینی

اعتماد اور حمیت دو چیزوں کا جمع ہونا آسان نہیں ہوتا۔ اعتماد الٹھیراؤ چاہتا ہے اور حمیت بے چینی اور بے قراری۔ مگر اللہ تعالیٰ نے والد مرحوم کیلئے آسان کیا تھا۔ تقریباً ساری عملی زندگی کے رفیق خاص حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے انتقال کے بعد جو پہلی تعزیتی تقریر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فرمائی اس کا ایک جملہ یہ بھی تھا کہ ”اُن کے اندر اللہ تعالیٰ نے متضاد صفات و صلاحیتیں ودیعت فرمائی تھیں“ ان صفات میں سے حمیتِ دینی کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) یہ پورا خط حصہ مکاتیب میں شائع کیا جا رہا ہے۔ وہاں اس کو مکمل شکل میں پڑھا جاسکتا ہے اور پڑھا جانا چاہئے کہ بات اس سے بھی زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

”اللہ تعالیٰ نے مولانا کو دوسرا وصفِ حمیتِ دینی عطا فرمایا تھا۔ جس کی میں شہادت دیتا ہوں، ایک رفیق کی حیثیت سے، اُن کے ایک ہم سفر کی حیثیت سے اور اُن کے ایک معادن کی حیثیت سے بھی، کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو حمیتِ اسلامی و حمیتِ دینی کا وہ جوہر عطا فرمایا تھا۔ جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔“ (۱)

اس جوہرِ حمیت کا اظہار اُن کی عملی زندگی کے روزِ اول ہی سے ہوا۔ جماعتِ دیوبند کے اعتقادی مسلک پر حملہ آوروں کے تعاقب کا جو لولہ انگیز حال ہم اُن کے اس عہدِ اول میں دیکھتے ہیں وہ اسی دینی حمیت کا ایک ظہور تھا۔ کہ حق کو حملہ آوروں کے زرخے میں پایا تو سینہ سپر ہو گئے۔ محض ایک جماعتی جذبے اور عصبيت سے اُس کا تعلق ہم اس لئے نہیں جوڑ سکتے کہ حزبیت اور گروہی ذہنیت سے اُن کی بیزاری و بلندی کی کیفیت کا وہ حال ابھی ہم پڑھ آئے ہیں کہ اسکے بعد کسی گروہی جذبے کی نسبت ان کی طرف کرنا بڑی بے انصافی ہو گی۔

یہ حمیت ہر موقع و محل کے مناسب رنگ میں اُن کی دمساز کے بیان کے مطابق علامہ مشرقی کی تحریک کا فتنہ اٹھا تو وہ حرکت میں مسلمانوں کے مستقبل کا سوال پیدا ہوا تو وہ بے چین ہو پڑی۔ مسلمانو راستے سے شدھی کے حملے کی منصوبہ بندی نظر آئی تو اس دینی حمیت اور اسلام

مقابلے کی بساط بچھائے بغیر چین نہ پایا۔ اور جب عمر اسی (۸۰) کو پہنچ گئی تھی، مختلف عوارض نے قویٰ بہت متاثر ہی نہیں کر دئے تھے بلکہ پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ اُس وقت اُن کی اس دینی حمیت کو امام خمینی کے چیلنج نے چھیڑا تو پتہ چلا کہ اس زار و نزار بوڑھے جسم میں وہ حمیت اُسی طرح جوان ہے۔ دورِ جوانی جیسی محنت کر کے ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ لکھ ڈالی۔ حضرت مولانا علی میاں نے اس محنت اور انہماک کی بابت اس کتاب کے مقدمے میں تحریر فرمایا تھا کہ

”انہوں نے اس محنت اور انہماک کے ساتھ کام شروع کیا کہ بارہا ان کی صحت خطرے میں پڑ گئی۔ اور اہل تعلق کو اس بارے میں فکر و تشویش لاحق ہوئی۔ لیکن مولانا اپنی افتادِ طبع اور زندگی بھر کے معمول کے مطابق اپنے کو اس سے باز نہیں رکھ سکے۔“

اور پھر ”ازدول خیزد بر دل ریزد“ کے مصداق یہ آواز جو اس چیلنج کے مقابلے میں اٹھنے والی اکیلی اور تنہا اور ایک نامانوس سی آواز تھی دیکھتے ہی دیکھتے عالمِ اسلام کے دل کی آواز بن گئی۔ ملکوں (۱) حضرت مولانا کی یہ تقریر الفرقان بابت ماہ جولائی ۱۹۷۷ء میں چھپ چکی ہے۔

ملکوں اس کے ترجمے اپنی اپنی زبانوں میں ہوئے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اردو لٹریچر میں اس وسعت کے ساتھ آنا فانا پھیلنے والی کوئی دوسری کتاب اور نہیں ہے۔ اور ایسے ہی کوئی دوسری کتاب نہیں ہے جو ایران کے نام نہاد ”اسلامی“ انقلاب جیسی کسی زبردست تحریک کے آڑے آنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ بیجانہ ہو گا اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ قبولیت و تاثیر عمر بھر کی حمیت کا اُسکے آخری وقت میں عطا ہونے والا ایک انعام تھا۔ واللہ اعلم عند اللہ۔

### فکرِ آخرت

دلوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ لیکن تمام ظاہری علامات کے اعتبار سے اُن کی زندگی کا سب سے اہم اور رہنما اصول آخرت کی فکر اور یومِ حساب کا خوف تھا۔ اور شاید یہ برکت اور کرامت ہو اُس فکرِ آخرت کی جس کا ثبوت اُن کے والد ماجد (راقم کے دادا علیہ الرحمہ) نے ایک بڑی دنیاوی ترغیب کے اُس موقع پر دیا تھا جب ضلع کے انگریز کلکٹر نے اُن کے گھر پر ایک ملاقات میں بچوں اور اُن کی تعلیم کو پوچھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ پانچ لڑکوں میں سے کسی ایک نے بھی انگریزی اسکول میں نہیں پڑھا اور نہ پڑھ رہا ہے۔ اپنی ذاتی دلچسپی کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ کم از کم ایک کو تو ————— جو عمر کے لحاظ سے والد ماجد ہی ہو سکتے تھے ————— انگریزی پڑھائی جائے۔ جس کے بعد وہ خود اپنے اختیارات سے اسکے لئے ترقی کی راہ بنائے گا۔ تو دادا جان مرحوم اس مشورے کو اس لئے اہمیت دینے کو تیار نہ ہوئے کہ اس تعلیم سے اُن کی اپنی آخرت کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ دادا جان مرحوم کے اس طرز فکر کی برکت صرف والد ماجد ہی میں نہیں، الحمد للہ اُن کی تمام اولاد میں قائم رہی اور بظاہر سب اسی حال میں دنیا سے گئے کہ فکرِ آخرت کی دولت اُنھیں میسر تھی۔ والد کے بڑے چھوٹے تمام بھائی بہن اُن سے پہلے رخصت ہو گئے تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

آخرت کی فکر اور اُسکی باز پُرس کا استحصال اختلافات کے موقع پر بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسے سنگین قسم کے چند مواقع والد ماجد کی زندگی میں میرے اپنے دورِ شعور میں آئے۔ ان میں سب سے سنگین دارالعلوم دیوبند کے اختلافات کا قضیہ تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ جو سب الفرقان میں شائع ہوتا رہا۔ وہ ساری تحریریں کم از کم راقم الحروف کی نظر میں اس بات کی گواہی کیلئے کافی ہیں کہ اس قضیہ میں اُن کے موقف اور ان کے رویے کی اصل بنیاد بحیثیت رکنِ شوریٰ اپنی ذمہ داری کے سلسلے میں آخرت کے سوال و جواب کی فکر تھی۔ اور اسی لئے اُن کے بیانات کی تمام سختی و صراحت کے باوجود آدمی کہیں وہ بات نام کو بھی نہ پائے گا کہ

”جنگ اور محبت میں سب کچھ روا ہے۔“ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر مولانا حبیب الرحمن قاسمی نے مئی جون ۱۹۹۹ء کے شمارے میں ایک مفصل تعزیتی ادارہ یہ لکھا تھا، اس میں دارالعلوم کے اسی قصبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

”حضرت مولانا نعمانی نور اللہ مرقدہ کی ایک اور صفت جس سے بندہ بیحد متاثر ہوا وہ ان کی آخرت کی جوابدہی کی فکر ہے۔ دارالعلوم کے اسی ہنگامے کے دوران میں بندے کو مولانا سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ اور ہنگامے سے نینٹے کے متعلق طویل طویل گفتگو کی بھی نوبت آئی۔ مگر مولانا کو کبھی آخرت کی جوابدہی کی فکر سے خالی نہیں پایا۔ جبکہ ایسے معاملات میں عام طور پر اچھے دیندار اور پرہیزگار لوگ بھی تساہل سے کام لیا کرتے ہیں۔“

اس اقتباس کی اہمیت یہ ہے کہ راقم الحروف کے علم کی حد تک مولانا حصہ دار حصہ قاسمی کا کوئی خصوصی یا عقیدہ مند نہ تعلق والد ماجد سے کبھی نہیں تھا۔ آخرت اور خوف خدا کی شہادت دینے کی حد تک اُسی وقت جاتا ہے جب اُسے غیر معمولی اثر لینے پر مجبور ہی کر دے۔

کسی بھی اختلاف کے موقع پر کبھی کوئی سخت اور ایسا لفظ جوابدہ ہو اُن کی زبان سے سنایا نہیں۔ کبھی غیبت یا طنز و تعریض کا کلمہ سنایا نہیں۔ یقیناً یہ بھی فکر آخرت ہی تھی جو انھیں اپنی غلطیاں ماننے اور اُن کا اعلان کر دینے پر آمادہ کر دیتی تھی۔ اور اس حد تک کہ وہ اپنے ہم عصروں میں اس وصف کے لئے مشہور ہوئے۔

رضا بالقضا

کوئی شکر کا کلمہ اللہ کے اس احسان کا حق ادا نہیں کر سکتا کہ زندگی کا آخری تقریباً سال کا زمانہ جو طرح طرح کی معذوریوں اور تکلیفوں سے پُر رہا اور اس حد تک کہ پر سش حال کرنے والے متعدد خطوں کے جواب میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ اگر موت کی دعا منع نہ ہوتی تو دعا کرتا کہ اب اُٹھالیا جاؤں۔ اس حال کے باوجود اس تمام عرصے میں کبھی دبی زبان سے بھی کلمہ شکایت اور شکوہ احوال سننے میں نہیں آیا۔ اور ہم لوگوں کو رضا بالقضا اور صبر و ضبط کی جو تعلیم اس حال کو مسلسل دیکھنے میں ملی اسکی کوئی قیمت بتائی نہیں جاسکتی۔ بس کلمہ استغفار اور فضل و عافیت کی دعا ہی زبان پر رہتی تھی ....

اے اللہ اپنے اس بندے کے بارے میں ہمارے گمانوں کو اپنے کرم سے سچ ٹھہرا۔ اُسکی خوبیوں کا ہمیں وارث بنا۔ اور اس کی جدائی کے اجر سے محروم نہ فرما۔ آمین۔ ☆☆

## ماہنامہ الفرقان کے مدیر اعزازی اور اس خاص اشاعت کے مرتب مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی اہم تصانیف

### واقعہ کربلا اور اس کا تاریخی پس منظر

واقعہ کربلا اور اس کے پس منظر کا بیان ایک طویل عرصہ سے دو متضاد نقطہ ہائے نظر کی انتہا پسندانہ کشاکش کا شکار ہے۔

یہ کتاب دونوں انتہا پسندیوں کے درمیان ایک نقطہ اعتدال سامنے لاتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس واقعہ سے متعلق تاریخی حقائق کو اس سے پہلے کبھی اتنا چھانا اور پھٹکا نہیں گیا جتنا اس میں اور نہ کبھی اتنی احتیاط اور غیر جانبداری سے حقیقت کی تلاش کی گئی ہے۔

مصنف نے ایک طرف سبط رسول سیدنا حسینؑ کی احترام کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا، دوسری طرف حضرت معادیہؑ کے شرف صحابیت کا حق بھی ہر لمحہ نگاہ میں رکھا اور تیسری طرف حق اور سچائی کے اپنے تقاضوں پر بھی کہیں آنچ نہیں آنے دی ہے۔ قیمت عام ایڈیشن -/50 روپے

### انقلاب ایران اور اس کی اسلامیت

مکمل غیر جانبداری اور توازن کے ساتھ اس کتاب میں ایران کے اسلامی انقلاب کی اسلامیت کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان گوشوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کو پیش نظر رکھے بغیر انقلاب ایران کی اسلامیت کے بارے میں صحیح رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ قیمت صرف -/15 روپے

### طلاق مطلق

### راستے کی تلاش

### مجھے ہے علم انزال

تین طلاق برابر ایک طلاق کے سب سے اہم وکیل  
حافظ ابن قیم کی بحث کا عام فہم جائزہ  
قیمت -/35

مسلم مسائل پر  
اوارتی مضامین کا بہترین انتخاب  
قیمت صرف -/45

علمی و دینی  
اور تاریخی حقائق کا مجموعہ  
قیمت -/55

ملنے کا پتہ : الفرقان بک ڈپو 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ - 18

ڈاکٹر شمس تبریز خاں  
استاذ شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

## اکابر علمائے دیوبند کے سلسلہ زریں کی آخری کڑی عالم ربانی حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی عالم دین دنیا سے اٹھتا ہے تو اس سے دین و ملت میں ایک رخنے اور خلا پیدا ہو جاتا ہے، عالم باعمل فاضل حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے انتقال پر ملال کو اب قریب بھی تازہ ہے۔ اور اہل دل کے ولوں میں عرصہ دراز تک تازہ آیات سے دین و ملت کی صفوں میں ایسا ہی خلا محسوس ہو رہا ہے علیہ وسلم نے کی تھی۔

وما کاں قیس ہدکے ہلک واحد  
ولکھ سیاں قوم تہد ما

ملت اسلامیہ ہند کے لئے جن علماء و مشائخ کی بابرکت ہستیاں سہارا بنی ہوئی ہیں اور جنگی دعائیں فرد و جماعت کے حق میں مستجاب کہیں جاسکتی ہیں اور جن کا وجود دنیا کو اللہ کی رحمت کا سایہ عطا کرتا اور اسکے عقاب و عتاب سے پناہ بنتا ہے، ان میں عالم ربانی حضرت مولانا نعمانیؒ کی ذات بابرکات بھی تھی جن کی وفات پر ملت اسلامیہ ہند بجا طور پر اپنے کو یتیم و بے سہارا محسوس کر رہی ہے، حضرت مولانا کی ذات ایک مثالی و ربانی عالم کا دلکش نمونہ تھی جس کا عمل اسکے علم سے بھی زیادہ متاثر کرتا تھا، وہ ایسے عالم باعمل تھے جنہیں دیکھ کر سلف صالحین کی یادہ تازہ ہو جاتی تھی اور اسلام کی مردم سازی و مردم گری پر یقین بڑھ جاتا تھا، ان کا سیدھا سادہ لباس 'لباس التقویٰ' کی مثال تھا، اس پر ان کا سادہ عمامہ (جس کا شملہ بقدر علم طویل ہونے کے بجائے سر سے غائب رہتا تھا) ان کی سادگی اور اتباع سنت کا مظہر ہوتا تھا، اللہ کے ذکر اور توبہ و استغفار اور کلمہ طیبہ کے ورد سے ان کی زبان ہر وقت تروتازہ رہتی تھی اور سننے، پاس بیٹھنے والوں پر اس کا خاص

اثر ہوتا تھا اور غفلت دور ہو جاتی تھی، ان کی معتنم ہستی ان اللہ والوں میں سے تھی جنہیں دیکھ کر خدا کی یاد آتی ہے اور دل و نیا سے سر دھو جاتا ہے، اس دور آخر میں وہ اکابر علمائے دیوبند کے سلسلہ زریں کی آخری کڑی تھے، جس سے اسلاف دیوبند کی علمی و عملی جامعیت کی نمائندگی ہوتی تھی اور علم و عمل کے ہر میدان میں ان کا اختصاص و امتیاز ظاہر ہوتا تھا۔

حضرت مولانا نعمانیؒ کی پاکیزہ شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں میں تقویٰ و طہارت اور کتاب و سنت کی تعلیمات پر مداومت و استقامت۔ دین کا علم راسخ اور اسکا حفظ و اتقان۔ عقائد صحیحہ پر ایمان و ایقان، اور انکی حفاظت و اشاعت کیلئے فکر و دل سازی، نیرت ایمانی و حمیت دینی، اور بدعت و انحراف کے خلاف حساسیت، ملت کی صلاح و فلاح کی ہمہ وقتی ہمہ جہتی فکر اور نازک ترین مرحلوں میں اسکی دستگیری و رہنمائی، اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ فراوان، ذاتی و جماعتی اصلاح و تزکیہ، تعلق باللہ اور آخرت کی فکر، حق گوئی و بیباکی اور اخلاقی جرأت و استقامت، اشاعت اسلام و تبلیغ دین کی علمی و عملی جدوجہد اور اس کے لئے سادہ و داعیانہ اسلوب کا انتخاب، فراست ایمانی و حکمت دینی کے ذریعے عصری تقاضوں کی تکمیل اور عصر حاضر میں اسلامی اقدار و افکار کی علمی و عملی پیش کش جیسی اوصاف حمیدہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

آپ کا ورع و تقویٰ مثالی تھا اور اس کا انھیں ہمیشہ التزام و اہتمام رہا، برسوں امین آباد کی مرکز والی مسجد کے مکان میں قیام رہا، جہاں نماز باجماعت کے ساتھ درس و افادہ بھی رہتا تھا، جماعت تبلیغ اور اس کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے انھیں اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کو شروع ہی سے خاص قربت و مناسبت حاصل رہی ہے، چنانچہ ان حضرات کے جماعت کے ساتھ تاثیر و تاثر کے دو طرفہ تعلقات قائم رہے، اسکے علاوہ وہ اکابر علماء و مشائخ وقت سے مستفید ہوئے اور ان کے معتمد علیہ بھی رہے، اور اپنے تقویٰ اور روحانی اہلیت کے سبب حضرت مولانا عبدالقادر راپوریؒ کی خلافت سے سرفراز ہوئے۔

شدید اعدا اور امراض میں مبتلا ہونے کی حالت میں بھی میں مولانا نعمانیؒ کو اشاروں سے مگر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے دیکھتا تھا، انھیں دنوں میں ہم اور مولانا عتیق احمد صاحب بستوی جب بھی حاضر خدمت ہوتے تو ہم سے باتیں کرتے ہوئے بھی وقفہ وقفہ سے کلمہ استغفار کا ورد جاری رہتا تھا، ان کی خوش اخلاقی و تواضع کا یہ حال تھا کہ چائے بسکٹ سے ہماری ضیافت کرتے اور اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر ہمیں ممنون و محبوب کرتے تھے، اخیر عمر میں رقت طبع بہت بڑھ گئی تھی، جب دعا کی درخواست کی جاتی تو دعا دینے کے ساتھ اپنے لئے

بھی دعا کی فرمائش کرتے اور فرماتے کہ میں خود گنہگار اور دعا کا محتاج ہوں اور یہ کہتے ہوئے ان کی آواز گلوگیر اور آنکھیں تر ہو جاتی تھیں، مرض الوفات کے آخری چالیس دنوں میں جب کچھ سکتے و غشی کی کیفیت طاری رہی اسکے متعلق صاحبزادہ گرامی قدر مولانا سجاد نعمانی صاحب کا بیان ہے کہ ان کا یہ اختیاری سکوت، تبیل الی اللہ کے احوال و کوائف اور رفیق اعلیٰ کی طرف یکسوئی کی کیفیات سے معمور تھا۔

علم دین میں انھیں رسوخ و وثوق حاصل تھا جسے انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے بڑے اساتذہ اور خاص طور سے محدث عصر علامہ انور ستاہ کشمیریؒ سے حاصل کیا تھا، مناظرہ سے مناسبت ہونے کی وجہ سے کتاب و سنت اور اہلسنت کے عقائد و علم الکلام کی کتابوں کے حوالوں کا انھیں بہت خیال رہتا تھا، اور محدثانہ ذوق کی وجہ سے صحت روایت اور استناد کا بھی اہتمام رہتا تھا حتیٰ کہ گفتگو میں بھی سنی ہوئی روایتوں کو راوی کے الفاظ ہی میں بیان کیا

تھے۔ جسکے بہت سے نمونے ان کی آخری کتاب ”تحدیث نعت

ہیں، اللہ نے حافظہ بھی بہت اچھا عطا کیا تھا جسکی وجہ سے علامہ علماء کے اقوال انھیں کے الفاظ میں نقل فرماتے تھے۔ کتاب و

مطالعے کے سبب دین کے اصول و مبادی، اہلسنت کے عقائد

اور شرک و بدعت کے حدود و قیود اور انکے نازک و باریک فرق و اختلاف پر بیسی ان لی مبصرانہ و محققانہ نظر تھی ایسی معاصر علماء میں شاید ہی کسی کی ہو، انکی بیشتر کتابیں کتاب و سنت ہی کے صاف شفاف مآخذ اور ان کے حوالوں سے مزین ہیں اور ان میں ضعیف و مشکوک روایتوں سے پرہیز کیا گیا ہے، اس لئے ان کی کتابیں کتاب و سنت اور عقائد صحیحہ اور علم صحیح کے نور سے روشن ہیں اور عوام و خواص ان سے بے کھٹک مستفید ہو سکتے ہیں۔

عقائد صحیحہ پر ان کے ایمان و یقان کا تقاضا تھا کہ انھیں بریلویوں اور قادیانیوں سے

مناظرے کرنے پڑے اور اس سلسلہ کی کتابیں لکھنی پڑیں، بریلویوں کی بدعات و رسوم اور اکابر علمائے دیوبند پر انکے الزامات کے دفاع میں انھوں نے ”بوارق الغیب“ اور فیصلہ کن مناظرہ“ لکھی، اسی طرح قادیانیت کی تردید میں کئی رسالے لکھے، اسی طرح خاکسار تحریک کے ذریعے علماء سے بے اعتمادی اور دینی روایات کی نئی تاویل اور انحراف و تجدد کے خلاف بھی انھوں نے بردقت آواز اٹھائی، اہلسنت کے عقائد صحیحہ کے خلاف جب بھی کوئی تحریک وجود میں آئی انکی غیرت ایمانی و حمیت دینی بیدار ہو گئی اور انکے حساس ذہن و شعور اور پختہ دینی مزاج و مذاق نے



اسکے خطرات اور آئندہ اثرات و نتائج کو بہت پہلے محسوس کر لیا اور عامۃ المسلمین کو ان سے بچانے اور آگاہ کرنے کا فرض کفایہ انجام دیا۔

امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے بعد حلقہ دیوبند سے رد شیعیت پر علمی کام بہت کم ہوئے لیکن خمینی صاحب کے ذریعے ایران کے انقلاب نے جب نئی حکمت عملی اور نئے عزائم کے ساتھ شیعیت میں کچھ اصلاح و تجدید کے ذریعے سنی مسلمانوں اور عالم اسلام کو پرچانے اور رجھانے کی بھرپور کوشش کی تاکہ ایرانی انقلاب کو برآمد کیا جاسکے اور اسکے مذہبی و سیاسی دائرہ اثر کو بڑھایا جاسکے، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ شط العرب اور خلیج عرب کے مسئلے پر عراق سے زمینی و علاقائی طویل تصادم نے ایرانی انقلاب کی طرف سے عالم اسلام اور عربوں کو چوکنا کر دیا اور یہ انقلاب حقیقی اسلامی انقلاب کا بہروپ بھرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، اس انقلاب کے جارحانہ عزائم نے عالم اسلام کو تذبذب میں ڈال دیا کہ وہ ایرانی بادشاہت کو بہتر سمجھیں یا ”اسلامی جمہوری“ ایران کو؟

عالم اسلام کو اس انقلاب کے دعوائے اسلامیت اور خمینی صاحب کے افکار و عزائم سے آگاہ کرنے اور اس کا علمی و تنقیدی جائزہ لینے کے لئے مولانا نعمانیؒ نے خمینی صاحب کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کر کے ان کے مذہبی و سیاسی خیالات سے پردہ اٹھایا، ایرانی انقلاب کے پروپیگنڈے اور دعوائے اسلامیت سے سادہ دل سنی مسلمانوں کی خوش فہمی اور اپنے موقف پر بد اعتمادی و بدگمانی کے خطرے کا انھیں شدت سے احساس ہوا اور اللہ نے ان سے اس نازک مرحلے پر تاریخی کام لیا۔ ان پر یہ احساس اس قدر غالب تھا کہ دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کیا اور ان سے کام لیا، کچھ مضامین مجھ سے بھی ترجمہ کرائے اور وہ سلسلہ مضامین لکھوا یا جو ”تاریخ اسلام میں شیعیت و باطنیت کا منفی کردار“ کے عنوان سے چارپانچ قسطوں میں الفرقان میں شائع ہوا اس کے ساتھ ہی دو جلدوں میں شیعوں کے کفر کے بارے میں علمائے اسلام کا متفقہ فیصلہ شائع کیا، جو بہت سے سنی مسلمانوں کی مرعوبانہ ذہنیت اور شیعیت سے ناواقفیت کے موجودہ حالات میں بڑی جرأت و عزیمت کا کام تھا۔

علم و عمل میں امتیاز کے ساتھ وہ اقامت دین و اعلاء کلمۃ اللہ کے معاشرے میں اسلامی اقدار و اعمال اور مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کی جدوجہد میں ہمیشہ سرگرم رہے، اسی جذبے کے تحت جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جماعت اسلامی قائم کی تو وہ ان کے شریک کار اور رفیق رہے، اگرچہ بعض وجوہ سے جلد ہی ان سے الگ ہو گئے، جس کی تفصیل انھوں نے

”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت“ میں بیان کی پھر ان کو حضرت مولانا الیاس کی دعوت و اصلاح و تبلیغ میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آئی اور وہ ان کی دعوت دین میں جوش و خروش کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اور تبلیغی دوروں میں دور دراز مقامات کے اسفار کئے اور ہزاروں بندگان خدا کی اصلاح و ہدایت کا ذریعہ بنے۔ اخیر میں اگرچہ تبلیغی جماعتوں میں عملی شرکت موقوف ہو گئی تھی مگر تبلیغ کے ذمہ داروں اور کارکنوں کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ اور اپنی دعاؤں سے ان کی ہمت افزائی اور سرپرستی فرماتے رہے۔

ملت کی دینی رہنمائی کے ساتھ حتی الامکان انھوں نے اس کی سیاسی خدمت بھی کی، مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلاف کے زمانہ میں انھوں نے مولانا مدنی اور جمعیۃ علماء ہند کے موقف کا ساتھ دیا اور تقسیم ہند کے مطالبے سے اختلاف کیا انھوں نے اپنے اس موقف کی حمایت اس خوبی کے ساتھ کی کہ ایک مرحلے پر حضرت تھانویؒ بھی ان کے ساتھ تھے (۱) جس کی روداد ان کی کتاب ”تحدیثِ نعمت“ میں دیکھی

پاکستان اور مسلمانوں کے ہندوستان میں قیام اور ان کے قدم جما۔ مساعی جیلہ یادگار ہیں ان میں ایک نام مولانا نعمانیؒ کا بھی ہے۔

آزاد ہندوستان میں جب ۱۹۶۰ء میں جبل پور، جمشید پور، فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تو انھوں نے دیگر مسلم لیڈروں کے ساتھ مل کر آواز اٹھائی اور نو بابت بھانے جی وغیرہ ہندو لیڈروں سے مل کر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور مسلم مجلس مشاورت کے تحت تمام مسلم جماعتوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تاکہ مسلم جماعتیں اپنے علاحدہ وجود کے ساتھ بھی مشترکہ ملی مسائل پر متفقہ موقف اختیار کریں تاکہ ان کا سیاسی و سماجی وزن محسوس کیا جاسکے، یہ ایک بہترین سیاسی پالیسی تھی جس کو اپنا کر ملت اسلامیہ آج بھی ہندوستانی سیاست میں اپنا موثر رد ادا کر سکتی ہے وہ مسلمانوں کے انگریزی اخبار کے لئے بھی دوسرے علماء کے ساتھ کوشاں رہے، علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام، اور پیش آئندہ مسائل میں مسلم موقف کی وضاحت و اشاعت میں شریک رہے۔

حق گوئی و بیباکی، صاف گوئی اور اخلاقی جرأت کے لئے بھی وہ بہت ممتاز تھے، جس

(۱) یہاں فاضل مضمون نگار کو سہو ہوا ہے یہ تقسیم ہند کے مطالبے سے پہلے کی بات ہے۔ اور اس کا تعلق کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلاف سے نہیں تھا۔ تفصیل تحدیثِ نعمت میں ہے۔ (الفرقاں)

طرح دین میں بدعت و انحراف کے خلاف وہ ہمیشہ سینہ سپر رہے اسی طرح اپنی جماعت دیوبند کے معاملات میں بھی جس رائے کو صحیح اور دارالعلوم دیوبند کے حق میں مفید سمجھتے اس پر اصرار کرتے تھے اور کسی کی منہ دیکھی نہیں کہتے تھے، آٹھویں دہائی کے شروع میں دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے بعد جب دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا محمد طیب صاحب اور مجلس شوریٰ کی اکثریت کا اختلاف سامنے آیا تو انھوں نے حضرت مہتمم صاحب کی دیرینہ خدمات اور ان کی برگزیدہ شخصیت اور علمی و دینی وجاہت کے باوجود مجلس شوریٰ کا ساتھ دیا، کسی ملامت کی پرواہ نہ کی اور مجلس شوریٰ کے پلڑے میں اپنی شخصیت کا پورا وزن ڈال دیا۔

اپنے سارے کمالات و خصوصیات کے باوجود حضرت مولانا نعمانیؒ کی سیرت کا قابل تحسین و لائق تقلید پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی اصلاح اور تعلق باللہ کی ترقی سے کبھی غفلت نہیں برتی اور اس کے لئے وقت کے بیشتر علماء و مشائخ سے مخلصانہ تعلق قائم رکھا اور ان کی صحبتوں سے مستفید ہوئے اور ان کے معتمد علیہ ٹہرے۔ اس سلسلے کی اہم تفصیلات ان کی کتاب ”تحدیث نعمت“ میں آگئی ہیں۔

مولانا نعمانیؒ کی تقریر و تحریر میں بہت کم فرق تھا، دونوں میں بڑی سادگی و صفائی، ابلاغ و ترسیل، افہام و تفہیم اور اپنی بات کو ذہن نشیں بلکہ دل نشیں بنادینے کی خدا داد صلاحیت تھی، تقریر آیات و احادیث کی روشنی میں آسان اور عام فہم اسلوب میں کرتے، اور اسی طرح تحریر میں بھی نپے تلے جملے ہوتے اور وہ حشو زائد، لفاظی و عبارت آرائی سے بالکل خالی ہوتی تھی، اس کے پیچھے ان کا اخلاص اور فکر مندی، اور امت کی خیر خواہی اور اس کے لئے درمندی کے جذبات کا فرما ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ان کی بات پہنچ جائے اور وہ کتاب و سنت کی تعلیمات، عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ سے واقف ہو کر اپنی زندگی میں اسلام کی مطلوب تبدیلی لے آئیں اور صحیح معنوں میں مسلمان بنیں۔

ماضی قریب کے علماء میں حضرت تھانویؒ اور حضرت مولانا زکریاؒ کے بعد مولانا نعمانیؒ کی کتابیں اپنی قوت تاثیر و تسخیر، عام فہم و سادہ داعیانہ اسلوب، اور سہل و آسان طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہیں جسے دین کا کام کرنے والوں کو اپنا رہنما بنانا چاہئے۔

اخیر میں ان کی خاص ادائیگی ان کے ذوق دعا کا ذکر بہت ضروری ہے، جو تمام ہی انبیاء و اولیاء اور صالحین کی سیرت کا بنیادی جوہر اور ان کی کامیابیوں کا سر اکبر ہے، ان کی ہر تقریر و تحریر مسنون دعاؤں، تضرع و ابتهال، عبدیت و انابت کے سوز ساز سے مزین و مرصع ہوتی تھیں۔

انھیں دعا مانگنے کا سلیقہ آتا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں عیدین کی نمازوں کے بعد جس خلوص و خیر خواہی کے ساتھ وہ خطاب کرتے اس کا خاص اثر محسوس ہوتا تھا، اخیر میں اجتماعی توبہ کی تلقین کرتے اور اس میں خود کو بھی شامل کر لیتے، پھر جس درد و سوز اور الحاج و زاری کے ساتھ دعا مانگتے اس سے وہ مجلس و عظ و دعاء، مجلس آہ و بکا بن جاتی، اور اکابر اولیاء اللہ کی مجلس و عظ و تذکیر کا منظر سامنے آ جاتا تھا۔

رب کریم و رحیم سے ہماری دعا ہے کہ اپنے دین کے اس مخلص و ممتاز داعی اور مبلغ و منادی کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت بخشے ہوئے ان کا بہترین اجر و جزاء عطا کرے، اور انھیں اعلیٰ علیین، فردوس بریں، اور جوار رحمت میں جگہ دے، اور ان کے پسماندگان کو صبر و سکون عطا کرنے کے ساتھ ملت اسلامیہ کو ان کا بدل و نعم البدل بھی عطا کرے۔ اللہم لا تقنا بعدہ و لا تحرمنا احرہ، و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

Excellence *is an*  
**OB**session  
*with us !*

DIGITAL COLOR SCANNERS &amp; PROCESSORS

**anugraphix**

6, Park Road, Lucknow 226 001

Phone 239150, 239673

**Scanning • Planning • System work • Plate making**

## ہماری مطبوعات

قیمت	نام مصنف	نام کتب
15/-	محمد علی صدیقی	اسلامی تہذیب کی تہمید حدید
100/-	مولانا سید اسد گیلانی	رسول اکرم کی حکومت انقلاب
125/-	محلہ	
35/-	مصطفیٰ ساعی	سیرت النبی
12/-	ماہل حیر آبادی	نور محمدی
70/-	عبد اللہ فہد طاجی	تاریخ دعوت و جہاد
120/-	منکین جباری	اللہ کے سپاہی
5/-	محمد دکی کرمانی	جس میں سے نقطہ نظر کی ضرورت
5/-	ڈاکٹر منظور عالم	تحریک اسلامی، فکری اور عملی محرکات
25/-	ایم ایس اے	اسلام کا آسان کورس
15/-	عبد العزیز سلی طاجی	نکس راہ (تاریخ ایس آئی ایم)
40/-		تحریک اسلامی مشکلات، مسائل، آزمائش فتنی کس
20/-		دعوت اسلامی پندرہویں صدی میں شیخ محمد عمرانی
25/-		سوشلزم یا اسلام ڈاکٹر خورشید احمد
مولانا مقبول احمد سیوہاری کی تین بابا بک کتب		
سرنامہ ابن بطوطہ		
179 صفحات	سائز 23x36	قیمت 35/-
عجائزات ہند (سیاحوں کی زبانی)		
88 صفحات	سائز 23x36	قیمت 17/-
سات سو سال پہلے کا ہندوستان		
122 صفحات	سائز 23x36	قیمت 22/-
ہماری درسیات		
قیمت		
20/-	اقراء قاعدہ (آرٹ پیپر)	
127/-	اقراء اردو پرانہ اور اول تا ہشتم	
40/-	اقراء حوش حطی اول تا ہفتم	
56/-	اقراء کلریمک بک اول تا ہفتم	
50/-	مولانا محمد القادر حیلانی	قرآن مجید پاکت سائز مع ترجمہ
55/-	عمر حیات حال عوری	ہندوستان میں ملی مسائل
35/-	ڈاکٹر عبدالصود مرروق	فکری پیلہار، اسکے منصوبے اور اختیار
20/-	سید سلیمان مدوی / مولانا مودودی	عہد سوسی کا نظام حکومت
35/-	مولانا عبداللہ قادریاوی	قرآنی شخصیات
10/-	ماہل حیر آبادی	علائی کا سلسلہ
7/-	ماہل حیر آبادی	اسلامی ریاست میں عورت کے حقوق
40/-	ماہل حیر آبادی	قرآن میں عورت کی حیثیت
25/-	ماہل حیر آبادی	دلہن کا ماحول
200/-	سید قطب ترجمہ سید حامد علی - حلد اول (سورۃ العنقرہ و سورۃ البقرہ)	تفسیری غلال القرآن (اردو)
140/-	(سورۃ آل عمران) حلد دوم	" "
160/-	(سورۃ النساء) حلد سوم	" "
135/-	(سورۃ المائدہ) حلد چہارم	" "
140/-		تفسیری غلال القرآن (پارہ مم)
15/-	مولانا سید علی مودودی	عہد سوسی کا نظام حکومت
25/-	یوسف القرضاوی	انوال السلوک کا ترجمہ نظام
50/-	محمد علی الہامی	اسلامی زندگی کتابت کی روشنی میں
60/-	عبد اللہ فہد طاجی	نولاد ہے موسیٰ
60/-	ریب العمرانی	رعداں کے شب و روز
20/-	عبد اللہ بلع ستر	ہم دعوت کا کام کیسے کریں
5/-	محمد شریف قریشی	اسلامی نظام ہمیں کیا دے گا
65/-	مریس نوکالے	ماہل، قرآن اور سائنس
35/-	طلیل احمد حامدی	جہاد اسلامی
ریہ طبع	بکی النجفی	تحریک اور دعوت
45/-	محمد حامد الواعصر	وادی میل کا قافلہ سخت حال
20/-		اسلام میں اخلاق کے اصول و آداب ڈاکٹر محمد حارث عباس

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

**New Crescent Publishing Co.**

2035, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi-6 (India)

Phone . 3262545, Fax 91-11-3282834

مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی

## حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

افسوس ہے کہ مولانا محترم کا یہ مضمون جو الماع میں شائع ہوا ہے ہمیں آپ کی طرف سے اس وقت ملا جب نمبر کی چھپائی شروع ہو رہی ہے محور آپ کچھ اختصار کرنا پڑ رہا ہے۔ مرتب

جب سے شعور کی آنکھ کھلی، اپنے والد ماجد حضرت مولانا بدولت گھر میں روز آنہ آنے والی ڈاک کا ایک پلندہ اڑا کئے سے وصول شامل دیکھا۔ اس ڈاک میں خطوط کے علاوہ ماہانہ اور ہفتہ وار جرائد و رسائل میں ہوتے تھے۔ جب یہ جرائد و رسائل آتے تو انھیں الٹ پلٹ کر انکی کم از کم ورق لردانی کا شوق مجھے اس وقت سے تھا جب ان جرائد و رسائل کے مندرجات کا تقریباً اسی فیصد حصہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتا تھا۔ انہی رسائل میں ایک ماہنامہ ”الفرقان“ لکھنؤ بھی تھا، جس پر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا اسم گرامی متواتر دیکھ دیکھ کر یہ نام دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اور بچپن میں یہ بات ذہن میں جم گئی تھی کہ بزرگ ایسے اہل قلم میں سے ہیں جن کی نگارشات اپنی فہم کی سطح سے بالاتر ہوتی ہیں۔

جب رفتہ رفتہ حرف شناسی میں اضافہ ہوا تو یہ نگارشات کچھ کچھ سمجھ میں بھی آنے لگیں، بالخصوص ”الفرقان“ میں ”معارف الحدیث“ کے مسلسل عنوان کے تحت احادیث نبوی ﷺ کی جو عام فہم تشریح حضرت مولانا کے قلم سے شائع ہو رہی تھی، اسکا بیشتر حصہ فہم سے بالاتر نہ رہا، اور اس طرح مولانا سے غائبانہ ایک انسیت پیدا ہونے لگی۔

پھر طالب علمی کے دوران علمائے دیوبند اور علمائے بریلی کے مسلکی اختلافات پر متعدد کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی۔ اکابر علمائے دیوبند کی جن بعض تحریروں پر علمائے بریلی کی طرف سے سخت اعتراضات کئے گئے تھے۔ ان کے بارے میں حقیقت حال کی وضاحت بہت سے

حضرات نے کی، لیکن اس موضوع پر جس کتاب نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی کتاب ”فیصلہ کن مناظرہ“ تھی اس کتاب میں حضرت مولانا نے جس مدلل، دلنشین اور مستحکم انداز میں ان تحریروں کی وضاحت فرمائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد کسی بھی انصاف پسند انسان کے دل میں ان اکابر کے عقائد کے بارے میں کوئی ادنیٰ شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ کتاب کا نام تو اگرچہ فیصلہ کن مناظرہ ہے۔ جس سے تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام قسم کی مناظرانہ کتاب ہوگی اور ہماری شامت اعمال سے مناظرے کے بارے میں یہ تاثر بن گیا ہے کہ یہ ایک فرقہ دارانہ اکھاڑے کا نام ہے جس میں دومنہ زور پہلوان ہر حق و ناحق حربے سے ایک دوسرے کو زیر کرنے کے داؤں استعمال کرتے ہیں اور اس داؤں بیچ میں حق طلبی کا جذبہ پچل کر رہ جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی کتاب اس قسم کی مناظرانہ فضا سے کوسوں دور ہے۔ بلکہ اسکو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیک نیتی والا مناظرہ کیا ہوتا ہے؟۔ اصل میں ”مناظرہ“ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ”مل جل کر کسی مسئلے پر غور کرنا“۔ مولانا نے اس کتاب میں مناظرے کی اسی حقیقت کی عملی تفسیر پیش کی ہے ان کا انداز و اسلوب عامیانہ مناظرہ کا اسلوب نہیں، خالص علمی، مثبت، معروضی اور مدلل انداز بیان ہے۔ جس کا مطمح نظر حق کی تفہیم ہے، نہ کہ مخالف کی تذلیل۔

پھر ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ پاکستان اور ہندوستان کے علماء نے مل کر غلام احمد پرویز صاحب کی کتابوں کا جائزہ لیا اور ایک متفقہ فتویٰ مرتب کیا جس میں کہا گیا تھا کہ پرویز صاحب اپنے بعض گمراہانہ عقائد و افکار کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ فتویٰ پرویز صاحب کی کتابوں کی چھان بین کے بعد مرتب کیا گیا تھا۔ اور اس پر تمام مسلم مکاتب فکر کے علماء کے دستخط تھے۔

اس موقع پر پرویز صاحب کے حلقے نے یہ کہہ کر آسمان سر پر اٹھالیا کہ علماء کرام کا تو مشغلہ ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کافر بناتے رہتے ہیں، اسلامی عقائد و اصول سے ناواقف بہت سے دوسرے حضرات بھی اس پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اس فتوے کو اعتراضات کا نشانہ بنانے لگے۔ اس موقع پر فتویٰ کی تائید اور اس پروپیگنڈے کی تردید میں بھی متعدد مضامین و مقالات منظر عام پر آئے لیکن اس موضوع پر سب سے زیادہ مدلل، زوردار اور دل میں اتر جانے والی تحریر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی تھی جو ”الفرقان“ میں شائع ہوئی۔ اور اسے پاک و ہند کے بہت سے علمی مجلات نے نقل کیا۔ مولانا کے مستحکم انداز تحریر کا قائل تو میں پہلے بھی تھا، لیکن اس

تحریر سے اندازہ ہوا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی کس غیر معمولی صلاحیت سے مالا مال فرمایا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس مضمون نے ”تکفیر“ کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کی دھند صاف کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

بعد میں مولانا کی بہت سی تحریریں پڑھنے کا موقع ملتا رہا، اور ان سے غائبانہ عقیدت و محبت پیدا ہوتی گئی، لیکن پاک و ہند کے تباہ داریں کی وجہ سے انکی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ بالآخر پہلی بار مکہ مکرمہ میں انکی زیارت ہوئی۔ اور اس کے نتیجے میں مراسلت کا سلسلہ بھی قائم ہوا۔ کوئی نئی کتاب آتی تو مولانا شفقت فرما کر احقر کو اس سال فرماتے، اور مختلف مسائل پر خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ افسوس ہے کہ مولانا کے ابتدائی کچھ خطوط میرے پاس محفوظ نہ رہے لیکن بعد میں میں نے اکثر خطوط محفوظ بھی رکھے۔ اس

مرتبہ پاکستان تشریف لائے۔ اور دارالعلوم میں خطاب بھی فرمایا۔ اس کی وفات ہو چکی تھی، اور انکے ذکر مبارک کیلئے البلاغ کا مفتی اعظم نمبر احقر کی فرمائش پر اس کیلئے مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا، اور ہندوستان جا کر نمبر کی زینت بنا۔

مولانا نے اگرچہ ”الفرقان“ کی ادارت اپنے فاضل صاحبزادے جناب مولانا عتیق الرحمن صاحب سنبھلی کے سپرد کر دی تھی لیکن وقت کی تقریباً ہر اہم ضرورت پر انکی تحریریں الفرقان میں شائع ہوتی رہتی تھیں اسی دوران سعودی عرب میں علمائے دیوبند کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں نے وہاں یہ تاثر پھیلانا شروع کیا کہ علمائے دیوبند علمائے نجد کے سرخیل شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بارے میں معاندانہ رائے رکھتے ہیں، اور انکے بارے میں توہین آمیز رویہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ مولانا نے اس تاثر کے ازالے کیلئے ”الفرقان“ میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس میں شیخ محمد بن عبد الوہاب اور علمائے دیوبند کے درمیان وجوہ مماثلت شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی تھیں، اور شرک و بدعت کی تردید میں دونوں کے درمیان جو قدر مشترک تھی، اس پر زور دیا گیا۔ اگرچہ یہ مضمون بھی مولانا کی عام عادت کے مطابق بدلل اور مفید تھا، لیکن اس کی چند قسطیں پڑھنے کے بعد مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ تصور کے صرف ایک رخ ہی پر ختم نہ ہو جائے۔ اور علمائے دیوبند کو شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بعض نظریات سے جو واقعی اختلاف رہا ہے۔ اس کے تذکرے سے خالی نہ رہ جائے۔ چنانچہ میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اپنے اس طالب علمانہ اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے یہ



درخواست کی کہ مضمون کا تاثر یہ ہر گز نہ ہونا چاہئے کہ علماء دیوبند اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کے نظریات میں کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔ اس کے بجائے جس حد تک اور جتنا اختلاف تھا اس کا اظہار بھی ریکارڈ درست رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ جس کے بغیر یہ سلسلہ مضامین ادھر ادھر رہے گا، اور اس سے مزید غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔

میں نے لکھنے کو تو یہ خط لکھ دیا تھا، لیکن بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ مولانا کے مقام بلند کے آگے میری حیثیت انکے ایک ادنیٰ شاگرد کی بھی نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جسارت کر کے میں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہو، لیکن میرے خط کے جواب میں مولانا کا جو گرامی نامہ آیا۔ اس میں انہوں نے اپنی بڑائی کی انتہا کر دی۔ میری گزارش پر کسی ناگواری کا اظہار تو کجا، میری اتنی ہمت افزائی فرمائی کہ میں پانی پانی ہو گیا۔

دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر جب مجھے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تو میں دیوبند کے بعد لکھنؤ بھی گیا، اس سفر کا بڑا مقصد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کی ملاقات تھی۔ مولانا علیہ الرحمہ اس وقت بہت کمزور ہو چکے تھے، لیکن احقر کو نہ صرف شرف ملاقات بخشا، بلکہ میرے استحقاق سے کہیں زیادہ شفقت اور اکرام کا معاملہ فرمایا۔

مولانا کی آخری ایام حیات کا ایک بڑا تالیفی کارنامہ مولانا کی کتاب ”ایرانی انقلاب“ ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے ”الفرقان“ میں ایک سلسلہ مضامین سپرد قلم کیا تھا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس موقع پر بھی حضرت مولانا نے احقر کو مندرجہ ذیل خط تحریر فرمایا۔

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۳ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ

برادر مکرّم محترم جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدکم۔ سلام و رحمت  
خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔

”البلّاغ“ غالباً پابندی سے روانہ ہوتا ہوگا، لیکن کبھی کبھی ہی پہونچتا ہے، خدا کرے  
”الفرقان“ پابندی سے پہونچتا ہو۔ معلوم ہوا ہے کہ دفتر سے پابندی سے روانہ کیا جاتا ہے۔  
ایران کے انقلاب اور خمینی سے متعلق ”الفرقان“ کے تین شماروں میں جو کچھ لکھا  
گیا ہے خدا کرے نظر سے گذرا ہو (اس کی پہلی قسط تو ذیقعدہ کے بینات میں بھی شائع ہو گئی ہے)

شیعہ عقائد کے بارے میں علمائے اہل سنت کی طرف سے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن مولانا نے اس کتاب میں ایک نئے اسلوب سے ان مباحث پر گفتگو کی ہے، اور بہت سی ایسی معلومات فراہم کی ہیں، جو پردہ خفا میں تھیں، میں نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بھی حضرت مولانا کی خدمت میں ارسال کئے، خود میں نے اس سے جس طرح استفادہ کیا تھا، اس کا تذکرہ کیا، لیکن ساتھ ہی کچھ طالب علمانہ گزارشات مسئلہ تکفیر کے سلسلے میں پیش کیں۔ حضرت

مولانا نے یہ کتاب ضعف و علالت کے دور میں لکھی تھی، اور اس کے بعد یہ کمزوری بڑھتی ہی چلی گئی، جسکی وجہ سے مراسلت کا سلسلہ بھی برقرار نہ رہ سکا۔ آنے جانے والوں سے مولانا کی مسلسل بیماری اور معذوری ہی کی اطلاعات ملتی رہیں، اور ایک طویل عرصہ ایسا گذر ا کہ مولانا سے کوئی قابل ذکر رابطہ نہ رہ سکا، اور بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جو ہر انسان پر آنا مقدر ہے۔ مولانا علمی و دینی خدمات کا بڑا سرمایہ ہمارے لئے چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی ”سرگزشت حیات“ خود انہی کے قلم سے لکھی ہوئی شائع ہو چکی ہے، جو مجھ جیسے ہر طالب علم کیلئے موعظت و نصیحت کے نہ جانے کتنے باب کھولتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو مقعد صدق میں اپنے مقامات قرب سے نوازے۔ ان کی زلات کی مکمل مغفرت فرمائے۔ اور انکے فیوض کو امت کیلئے جاری و ساری رکھے۔ آمین۔

☆☆☆

With Best Compliments From :

*Sabir Ali (Siddiqui)*

Prop

- ❖ KARN ARMS CORPORATION
- ❖ M. A. BUILDERS
- ❖ NEW M. A. PROPERTY DEALERS
- ❖ AVADH VIHAR SAHKARI AVAS SAMITI LTD

2, Naya Gaon (West), Near Latouche Road, Lucknow  
Ph 216222, 341302, (R) 264748 Mobile 9838020254

سجاد نعمانی

## وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں

[حسن ترتیب کا تقاضہ تھا کہ یہ مضمون اس حصہ مضامین (گھبائے تارہ) کی صف اول میں جگہ پاتا۔ مگر محترم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کے مضمون کی طرح یہ بھی، باوجود اندروں خانہ سے ہونے کے، ایسے آخری وقت میں ملا کہ اس سے بہتر جگہ کے تمام امکانات مسدود تھے، نمبر کی ترتیب مکمل ہو چکی تھی ————— مرتب]

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے کئی پہلو

جاسکتا ہے۔ ان کا علمی رسوخ و احتیاط، ان کا تفقہ فی الدین، ان کی جر

ورقت قلب، ان کا حساس اور درد مند دل، ان کی مثالی استقامت، ان کا

(اس زمانے میں) عدیم المثال تواضع و بے نفسی، حب مال و جاہ سے ان کے دل کی سلامتی، ان کا

اخلاص و للہیت، ان کی عالی ہمتی و بلند حوصلگی، آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنے کی ان کی مستقل

عادت، غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ ان کا شفقت بھرا برتاؤ، اپنی غلطیوں کے اعتراف و رجوع

اور اپنی کمزوریوں کی تشخیص و استحصال کے سلسلے میں ان کا مثالی طرز عمل، ان کا ذوق عبدیت

و انابت، ان کا جذبہ اتباع سنت، ان کا حکیمانہ طرز استدلال اور سلیس طرز بیان، آسان اور سادہ

لفظوں میں عمیق اور مشکل مضامین کو بیان کر دینے پر ان کی خداداد قدرت، حرمین شریفین

حاضری کے موقع پر ان کے احوال و کیفیات، وسعت قلبی، حقیقت پسندی، ہر قسم کی عصبيت

سے دل و دماغ کی سلامتی اور مقاصد شریعت کے فہم کے سلسلہ میں مزاج ولی الہی سے ان کی

گہری مناسبت، دین کی حفاظت و اشاعت کے سلسلہ میں ان کی مجددانہ حساسیت و حمیت اور پھر اس

سب کے ساتھ اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کے سلسلے میں ان کا وہ عجیب و غریب حال جس کی منظر کشی

شاید کوئی بھی نہ کر سکے، یہ اور اس طرح کے نہ جانے کتنے پہلو ہیں جن کا تذکرہ ہم جیسے طالب

علموں کے لئے بہت مفید ہوگا۔ اور امید ہے کہ الفرقان کی اس خصوصی اشاعت میں جو اسی

فائدے کی امید میں مرتب کی جا رہی ہے، بہت سے اہل علم و فضل کی زبانی آپ اس بندہ خدا کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا تذکرہ پڑھیں گے اور آئندہ بھی پڑھتے رہیں گے۔

اس ننگ خاندان کو عرصے تک تو اس کی ہمت ہی نہ پڑی کہ وہ بھی اس عظیم شخصیت کا تذکرہ و تعارف کرانے والوں کی صف میں شامل ہو مگر جب اپنے بڑوں کے پیہم اصرار کے ساتھ سامنے سپردِ الٰہی ہی پڑ گئی اور اس غریب نے بنام خدا کچھ لکھنے کا ارادہ کر ہی لیا تو اس کی نگاہ انتخاب حضرت بانی الفرقان کی شخصیت کے صرف اُس پہلو پر نکل گئی جس کی طرف 'مضمون کے عنوان میں علامہ اقبال کے ایک مشہور شعر کے ایک مصرع کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے۔ ع۔ ”وہ ہند میں سرمایہ ملت کا گنہگار“۔ اب آئیے دیکھیں کہ حضرت مجدد الف ثانی کی شان میں کہا گیا یہ مصرع اُن کے ایک عقیدہ مند اور خوشہ چیں کے تذکرہ میں مستعار لینا کیوں روا سمجھا گیا ہے ۲۴۴

### پس منظر

سنجھل ضلع مراد آباد کے ایک معزز دیندار گھرانے کے اک ۱۶ سالہ نوجوان کو مشیت الہی تعلیم کے بہانے وہاں سے نکال کر پہلے مشرقی یوپی کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ منولائی ————— میں اسے رسمی تعلیم جو ملی وہ تو ملی ہی، اک اضافی — اور بہت ہی اہم۔ دولت اسے وہ ملی جسے آپ ”ملتی احساس“ یا ”انقلابی عزائم“ کا نام دے سکتے ہیں۔ منو کے بعد مشیت الہی اسے عقابوں کے سب سے بڑے نشیمن دار العلوم دیوبند لے گئی، جہاں اسے علم میں رسوخ اور دین میں صلابت کے ساتھ ساتھ ان عزائم میں پختگی کی دولت بھی بخشی گئی۔ آگے بڑھنے سے پہلے صاحب تذکرہ ہی کی زبانی پہلے یہ آپ بتی سن لیجئے۔

”یورپ کی پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء پر ختم ہوئی تھی، یاد ہے کہ اس کے خاتمے تک ملک کی فضا ایسی تھی کہ عام آدمی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہاں انگریزوں کی حکومت نہیں رہے گی یا اس کے خلاف کوئی تحریک ہی اٹھ سکے گی۔۔۔۔۔ پھر اس جنگ ہی کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا ہوئے جو ہندوستان میں ”تحریک خلافت“ برپا ہونے کا سبب بنے جس نے چند ہی مہینوں میں ہندوستان میں اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں میں وہ انقلاب برپا کر دیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا

جو دو تین سال تحریک خلافت کے خاص مرد و شباب کے تھے (قریباً ۲۳-۲۲-۱۹۲۱ء) اُس زمانہ میں میرا قیام ایک طالب علم کی حیثیت سے ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ منو میں تھا۔ یوں تو ملک کے سب ہی حصوں میں تحریک خلافت کا رور شور تھا لیکن منو کا جو حال تھا وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے بڑے یا چھوٹے شہر کا رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ چونکہ تحریک کے پروگرام میں سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا اس لئے خلافت کمیٹی نے اپنی

عدالتیں بھی قائم کی تھیں۔ یاد آتا ہے کہ متو کے معمر بزرگ شاعری جامع مسجد کے امام مولانا بشیر اللہ صاحب اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل مولانا محمد ضمیر صاحب اور مولانا عبداللہ شائق مرحوم (جو ایک بہت تیز اور ذی استعداد اہل حدیث عالم تھے) اس عدالت کے قاضی (جج) تھے۔ ہر قسم کے مقدمات اور نزاعات مسلمانوں کے بھی اور غیر مسلموں کے بھی اسی عدالت میں آتے تھے اور ان کے فیصلے کئے جاتے تھے اور فریقین ملاچون وچہ ان فیصلوں کو مانتے تھے۔ مسلمانوں میں بعض آوارہ مزاج لوگ تازی پیتے تھے، خلافت کے رضاکار جو پولیس والی خدمات بھی انجام دیتے تھے ان کو پکڑ لاتے اور عدالت کے حکم سے ان کے کوڑے لگائے جاتے اور کوئی سرکشی اور سرتابی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ متو میں سرکاری تھانہ اور اس طرح کے دوسرے سرکاری ادارے اور محکمے موجود تھے لیکن اس عرصہ میں ان لوگوں کے لئے گویا کوئی کام نہیں تھا۔ جرائم اور لڑائی جھگڑے بڑی حد تک ختم ہو گئے تھے، کم از کم متو کا تو یہی حال تھا کہ وہ حقیقی معنی میں دارالامن بلکہ ایک طرح کا ”دارالاسلام“ بن گیا تھا

اس تحریک خلافت نے بعض غیر معمولی اثرات چھوڑے، ان میں سے ایک یہ کہ عوام تک کے قلوب میں انگریزی حکومت کی مخالفت بلکہ دشمنی رچ بس گئی، اس کا خوف دلوں سے بالکل نکل گیا اور ہم جیسے لوگ بھی اپنی حکومت اور کم از کم اس فضا کا خواب دیکھنے لگے جو تحریک خلافت میں قائم ہو گئی تھی، اور راقم سطور نے مسو میں دیکھی تھی۔

اس کے بعد تعلیم کے آخری دور میں دو سال میرا قیام دارالعلوم دیوبند

پیدا کئے تھے، یہاں کی فضا نے ان کی آبیاری کی اور ان کو مشتعل اور مستحکم کیا۔“

(ماخوذ از ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت، اور اب میر

(۲)

مگر دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جب حضرت والد ماجدؒ اپنے وطن سیہل پھونچے تو وہاں کا ماحول کچھ اور ہی تھا، بریلی کے تکفیری فتنے نے انتشار و فراق کی آگ بھڑکا رکھی تھی، بچہ بچہ اکابر اہل علم کو کافر کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ آج کل عام طور پر لوگ اس تکفیری فتنے سے واقف نہیں ہیں رضا خانیت کو صرف چند بدعات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کچھ تاریخ بھی حضرت والد ماجدؒ ہی کی زبانی یہاں سنادی جائے

” خان صاحب (یعنی مولوی احمد رضا خاں صاحب) نے پہلے تو عمرہ تک حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کو اپنی بدگوئی اور کفریاری کا نشانہ بنایا اور اپنے رسالوں اور فتوؤں میں ایسے ایسے گندے اور خبیث عقیدے ان کی طرف منسوب کئے جن کی نقل سے بھی ایمانی روح لرزتی ہے اسکے بعد انہوں نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ اکابر جماعت کو اپنی مشن ستم کے لئے انتخاب کیا۔ سب سے پہلے ۱۳۲۰ھ میں اپنی کتاب ”المعتمد المستند“ میں ان حضرات کو انکار ختم نبوت اور تکذیب رب العزت اور رسول اللہ ﷺ کی تنقیص والہانت کا مجرم قرار دے کر ان کی قطعی تکفیر کی، لیکن ان کی فتوے بازی اور کافر سازی چونکہ نہایت بدنام اور رسوا ہو چکی تھی اسلئے اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، یہاں تک کہ جن بزرگوں کی تکفیر کی گئی تھی انھوں نے بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے اپنے فتوے کا یہ حشر دیکھ کر ایک نیا منصوبہ بنایا۔ ۱۳۳۲ھ میں ان برہمنوں کی تکفیر کا ایک فتویٰ انہوں نے مرتب کیا جس میں ان کی قطعی تکفیر کی ایسی قطعی تکفیر کہ جو شخص ان کو مسلمان مانے یا ان کے کافر ہونے

میں بھی شک کرے اس کے بارے میں بھی کہا کہ وہ بھی قطعی کافر دائرہ اسلام سے خارج اور جہنمی ہے تکفیر کی اس سر اسر جعلی اور نصریانہ دستاویز کو لے کر مولوی احمد رضا احمد خاں صاحب اسی سال حجاز گئے اور مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے حضرات علماء و مفتیان کے پاس پہنچ کر نہایت ہی عیارانہ اور پر فریب انداز میں ان حضرات سے فریاد کی کہ ہندوستان میں اسلام پر بڑا سخت وقت آگیا ہے، مسلمانوں ہی میں بعض لوگ ایسے ایسے کافرانہ عقائد رکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور عام مسلمانوں پر بھی ان کا اثر پڑ رہا ہے، ہم غرباء اس فتنہ کی روک تھام کر رہے ہیں مگر اس مہم میں ہم کو آپ کی اس مدد کی ضرورت ہے کہ ان بد عقیدہ لوگوں کی تکفیر کے اس فتوے کی آپ حضرات بھی تصدیق فرمادیں، چونکہ آپ اللہ کے مقدس گھر اور رسول اللہ ﷺ کے پاک شہر کے رہنے والے ہیں اس لئے دینی رہنمائی کے بارے میں ہندوستان کے عام مسلمانوں کو آپ ہی حضرات پر پورا اعتماد ہے اور اس کی وجہ سے اس فتوے پر آپ ہی کی تصدیقی مہر میں ہندوستان کے عام مسلمانوں کو کفر و بد دینی کے اس سیلاب میں بہنے سے راک کھتی ہیں ورنہ فتنہ ایسا شدید ہے کہ ان کا ایمان پر قائم رہنا مشکل ہے۔ الحمد للہ دے خدا کے شیر والی غیاث العیاض اے لشکر محمدی کے شہسوار! (۱)

الغرض مولوی احمد رضا خاں صاحب نے ان علماء حرمین کے سامنے جو اصل واقعات سے بالکل بے خبر تھے اور اردو زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ان کا رجوع جماعت دیوبند کی وہ کتابیں بھی نہیں پڑھ سکتے تھے جس کی طرف خاں صاحب نے کمریہ معاصیہ مسوب کئے تھے ایسا یہ جعلی فتویٰ پیش کیا (تو) بہت سے یک دل علماء نے پورے دینی حوش کے ساتھ اس تکفیری فتوے پر تصدیق لکھ دیں

فقہ مختصر یہ جعلی فتویٰ ہندوستان لاکر ایک شور و ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے متعلق مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے علماء و معینین نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے کہ (معاذ اللہ) یہ سب قطعی کافر اور مرتد ہیں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاں صاحب کی اس چال نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک طوفانی فتنہ کھڑا کر دیا اور شاید ہزاروں یا لاکھوں سادہ دل سندھ و مولوی احمد رضا خاں صاحب کی فتوے بازی سے بالکل متاثر نہ تھے علماء حرمین کے نام سے اس فتنے میں متلا ہو گئے۔

اسکے بعد علمائے دیوبند کی طرف سے صحیح صورت حال کی وضاحت کے لئے جو سنجیدہ علمی تحریریں لکھی گئیں ان کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد حضرت والد ماجدؒ نے لکھا ہے کہ ”ان رسالوں نے معاملہ کو صاف کر دیا اور گویا بحث (اور سرے) ختم کر دی گئی، لیکن مولوی احمد رضا خاں صاحب کی طرف سے تکفیر و تفریق کی مہم اسی طرح جاری رہی، مگر ان جوابات کے بعد اس میں کوئی جان نہیں رہی، اور بار بار سرد پڑ گیا۔

پھر ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۶ء) میں یعنی حسام الحرمین کی پہلی اشاعت سے قریب دو برس بعد مولوی احمد رضا خاں صاحب کے اخطاف نے اس فتنہ کو پھر ایک دفعہ زور شور سے اٹھایا۔ اور پھر فتویٰ بازی، چیلنج بازی اور اشتہار بازی کے ذریعہ اپنے بازار میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی اور رنج و افسوس کے ساتھ عرض کرتا پڑتا ہے کہ نیچارے عام مسلمانوں کو پھر دیکھا گیا کہ

(۱) مولوی احمد رضا خاں صاحب نے جو فتویٰ علماء دین کے سامنے پیش کیا تھا جو بعد کو ”حسام الحرمین“ کے نام سے چھپ کر شائع ہوا، یہ اس کی تمہید کا حاصل اور خلاصہ ہے۔

مذہب سے تاواقیفیت اور سادہ لوحی کی وجہ سے پھر ان فتنہ برداروں کا شکار ہو رہے ہیں اور ایسے ایسے حامل حس کو کلمہ بھی نہیں آتا ان فتنہ برداروں کی ماتوں سے متاثر ہو کر اور کار تو اب سمجھ کر اکابر علماء اور برہم گاہ دین کو کافر کہتے پھر رہے ہیں اور گالیوں سے اپنی رمائیں ناپاک کر رہے ہیں۔ گھر گھر خانہ جنگیاں ہیں اور مسجدیں اور عبادت گاہیں تک میدان جنگ بنی ہوئی ہیں۔“

یہ تھا ماحول اس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں کا۔ خود سنبھل کا حال دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد واپس جا کر حضرت والد ماجدؒ نے یہ پایا تھا کہ ”میرے وطن اور قرب وجوار میں اس وقت اس فتنے کے شعلے خوب بھڑک رہے تھے۔“ (ایضاً)

اب ایک طرف وہ بلند تمنائیں تھیں جو تحریک خلافت کے زمانے میں حضرت والد ماجد کے دل میں پیدا ہوئیں اور جنہیں دارالعلوم کی فضا سے مزید تقویت ملی۔ اور دوسری طرف یہ زمینی حقیقت تھی کہ اپنے وطن میں اور قرب وجوار کے علاقوں میں مسلمانوں کا داخلی انتشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ گھر گھر، مسجد مسجد خانہ جنگی کا ماحول تھا۔

بالکل فطری بات تھی کہ ان کی توجہ پہلے اپنے گھر کو ٹھیک لگی ہوئی اس آگ کو بجھانے کی طرف جاتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہو ر

”اس آگ کے بجھانے اور اسکے لگانے والوں کے آخری حد تک مقابلہ او

سال تک اپنے دوسرے کاموں درس و تصنیف وغیرہ کے ساتھ یہ شعل بھی سرگرمی سے ر

دس سالہ دور پر محیط اس محاذ پر ان کی جدوجہد کی پوری تاریخ اور اسلئے اثرات سے جائزہ کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی آج کل تو شاید اس کام کی واقعی اہمیت و ضرورت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے راقم الحروف کا احساس کہ اگر بریلی کی وہ تکفیری مہم کسی مزاحمت کے بغیر اسی طرح چلتی رہتی تو آج شاید کوئی قابل اعتبار اگر وہ یہاں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والا اور مختلف اصلاحی، تعلیمی، دعوتی اور ملی کام کرنے والا باقی ہی نہ رہتا یہ کام جو اللہ نے حضرت والد ماجدؒ سے ان کی عملی زندگی کے ابتدائی دور میں لیا، کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بعد کے بہت سے تبلیغی، اصلاحی، دعوتی اور ملی کاموں کے لئے راہ ہموار ہوئی مللہ الحمد

ولہ الشکر۔

مگر ایسا بھی نہیں ہوا کہ ان کا دل و دماغ اس طرح اس فتنے کے مقابلے میں مشغول و منہمک ہو جاتا کہ انہیں ہند میں اسلام پر ہونے والے دوسرے حملوں کی خبر ہی نہ ہوتی۔۔۔ چنانچہ ٹھیک اسی انہماک کے دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بیرونی حملوں کے مقابلے سے بھی غافل نہ ہوئے۔ سب سے سخت حملہ آریہ سماج کی طرف سے ہو رہا تھا۔ آئیے دیکھیں کہ انہوں نے اس محاذ پر کیا خدمت سرانجام دی؟



## آریہ سماج کا مقابلہ

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی جب شروع ہوئی تھی تب تو تحریک خلافت کی وجہ سے ہندوستان کا ماحول جیسا بن گیا تھا اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے حضرت والد ماجدؒ نے لکھا تھا ”ہندو اور مسلمان دونوں پورے اشتراک بلکہ اتحاد کے ساتھ تحریک (تحریک خلافت) چلا رہے تھے لیکن مسلمانوں کے جذباتی مزاج، بے پناہ جوش و خروش اور مسئلہ خلافت کی خاص مذہبی نوعیت نے تحریک پر اسلامی رنگ غالب کر دیا تھا۔ “ اللہ اکبر ” ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک نعرہ تھا، حد یہ تھی کہ بہت سے ہندو لیڈر جس طرح آریہ ہند کے موضوع پر تقریر کرتے تھے اسی طرح خلافت کے مسئلہ پر بھی بالکل مسلمانوں کے انداز میں بلکہ ایک حد تک مولویانہ انداز میں تقریریں کرتے تھے۔ ہمارے ضلع مراد آباد میں میرے وطن سننیل سے بالکل قریب ایک چھوٹا سا قصبہ سرسی ہے، وہاں کے ماسٹر چند لال جنھوں نے تحریک ہی کی وجہ سے اسکول کی ملازمت سے استغفا دیا تھا، بڑے اچھے مقرر تھے۔ ان کی تقریروں میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ”أخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب“ بالکل صحیح الفاظ میں اور صحیح اعراب کے ساتھ ان کی زبان سے بار بار سننا اچھی طرح یاد ہے۔ “ [ماخوذ از ”مولانا سودودی کے ساتھ“ ص ۱۳-۱۴]

مگر اس تیسری دہائی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ملک کا ماحول بدل دیا گیا تھا، تحریک خلافت ختم ہو چکی تھی، انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کا محاذ ٹھنڈا کر دیا گیا تھا، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہا تھا۔ آریہ سماج کی طرف سے اسلام پر حملے شروع کر دائے گئے تھے، توفیق الہی نے حضرت والد ماجدؒ کو اس محاذ پر بھی دفاعی جنگ لڑنے کی ہمت و طاقت بخشی۔ الفرقان کے پہلے ہی شمارے میں ”آریہ سماج کو ایک اصولی مباحثہ کی دعوت“ کے زیر عنوان پورے آریہ سماج کو چھ بنیادی مسائل پر ایک فیصلہ کن اور نتیجہ خیز گفتگو و مباحثہ کی دعوت حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن چاند پوری کی زبانی دی گئی ہے۔

پھر چوتھے شمارے میں اس سلسلے کے دو مضامین ہیں ایک خود حضرت والد ماجدؒ کے قلم سے جس کا عنوان ہے، ”اسلام پر آریہ سماج کی نئی پورش، سماجی دنیا کو ہمارا انعامی چیلنج“، اس مضمون میں مسلمانان ہند کے اک بہت بڑے طبقے کو ملت اسلامیہ سے الگ کر کے انہیں کفر و ارتداد کی کھلی دعوت پر مشتمل آریہ سماج کی طرف سے شائع شدہ اک اشتہار کا جواب دیا گیا ہے، اس اشتہار میں حضرت والد ماجدؒ کے بقول:

”مسلم پیشہ و اقوام نور باف، فدا ف، موچی، منہسار، ناکی، قصاب وغیرہ کو بڑے زور و شور کے ساتھ ویدک دھرم کی دعوت دی گئی ہے (یہ کہہ کر کہ) اسلام تم کو مساویانہ حقوق دینے کے لئے تیار نہیں مگر ویدک دھرم کامل مساوات کا حامل ہے، لہذا تم لوگ اسلام سے قطع تعلق کر کے ویدک دھرم میں آ جاؤ

(مزید یہ کہ) اس اشتہار میں اصول مساوات کے متعلق وید کے کچھ منتر بھی لکھے گئے ہیں اور اس کے بالمتقابل

مولوی احمد رضا صاحب کے فتاویٰ رضویہ حصہ سوم، ملفوظات حصہ دوم، اور بہار شریعت (مصنفہ مولوی محمد احمد علی صاحب و مصدقہ مولوی احمد رضا صاحب) سے کچھ عبارتیں (اسلام میں مساوات نہ ہونے کے دعویٰ کی دلیل کے طور پر) نقل کی ہیں۔

اشتبہار کا خلاصہ نقل کرنے کے بعد اور اس کی اصولی تردید کرنے کے بعد حضرت والد ماجدؒ نے جس لب و لہجے میں اس مسئلہ پر اپنے درد و کرب کا اظہار کیا تھا اس سے ہمارے زیر بحث مرحوم پر چونکہ روشنی پڑتی ہے اور ایک نمونہ بھی ان کے اس دور شباب کے طرز تحریر کا سامنے آجاتا ہے اس لئے اس مضمون کی چند سطریں ذیل میں نقل کی جا رہی ہیں۔

”اللہ اللہ! ایک دھرم اور مساوات کا دعویٰ اور وہ بھی اسلام کے مقابلے میں، وہ اسلام کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے

ہا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی (اب۔ لوگوں ہم نے تم سب کو ایک مرد اور

ایک عورت سے پیدا کیا ہے یعنی تم

ہی ماں باپ کی اولاد۔“

(حتیک تم میں ریا۔“

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

خو زیادہ متقی، پر ہیر گار ہو (خواہ وہ کس

وہ اسلام جس کا عام اعلان یہ ہے

سارے مسلمان آپس میں۔

اما المؤمنون احوۃ

خواہ سید ہوں یا شیخ، جو لاپے ہوں یا موچی، ثانی ہوں یا قصائی، کھال پکانے والے ہوں یا بھٹیاریے۔

وہ اسلام جس کا داعی صاف صاف دیا کو تلا گیا

لا فصل لعربی علی عجمی - ولا

لعجمی علی عربی ولا لابیض علی

اسود ولا لاسود علی ابیض

الا بالقوی

عرب کے کسی باشندے کو عجم کے کسی باشندے پر اور  
عجم کے کسی شخص کو عرب کے کسی شخص پر، گورے کو  
کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فصلیت نہیں،

فصلیت کا دار و مدار حد اتری پر ہے۔

وہ اسلام جس نے دنیا کو مساوات کا سبق پڑھایا، دلیل کو عریضایا، دیا کے دھتکارے ہوؤں کو سینے سے لگایا، شاہ و گدا کو  
ایک صف میں کھڑا کیا، جس نے جہش کے سیاہ فام علام (حضرت بلالؓ) کو حضرت فاروق اعظمؓ کی رماں سے سیدنا (ہمارے سردار)  
کہلایا، اس اسلام کے مقابلے میں آج وہ دھرم جس نے اصول مساوات کا خون کیا، انسانوں کو چار درنوں میں تقسیم کر کے  
غریب شوروں کو انسانی حقوق سے بھی محروم کیا، وہ دھرم اسلام ہی سے سیکھ کر مساوات کا دعویٰ کر رہا ہے۔

کس نیا موخت علم تیرا من کہ مرا عاقبت نشانہ نکر

یہ بندہ ناچیز پہلے تو اپنے پیشہ در بھائیوں سے عرض کرتا ہے کہ تم سرور کو نین ﷺ کے نام لیوا ہو، تم قرآن کو صحیفہ  
خداوندی جانتے ہو جس کے ایک ہاتھ میں اس محبوب خدا سید الانبیاء کا دامن ہو، اور دوسرے ہاتھ میں قرآن پاک، وہ ہر گز  
ذلیل نہیں، جو اس کو ذلیل کہتا ہے وہ خود ذلیل ہے، عزت کا معیار صرف ایمان و تقویٰ ہے، دیکھو قرآن کی صاف تعلیم ہے

وللہ العزۃ و لرسولہ و للعلمین عزت صرف اللہ کو ہے اور اس کے رسول کو اور ایمان

ولکن المافعین لا یعلمون والوں کو، لیکن منافق لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔

بہر حال میرے پیشہ ور بھائیو اتم ایمان اور مومن کا مرتبہ خود قرآن میں دیکھو، صاحب قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ملفوظات طیبہ (احادیث پاک) میں دیکھو اور دشمنانِ دین کی چالوں میں نہ آؤ اور خوب سمجھ لو کہ جو شخص تمہارے ہاتھ سے مدنی آقا کا دامن چھڑانا چاہتا ہے جو تمہارے ہاتھ میں قرآن کے بجائے دید وینا چاہتا ہے وہ تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ الخذرا اے عھولے موسم الخذرا“

مضمون کا اختتام ایک چیلنج اور ایک اعلان پر کرتے ہوئے اس مردِ حق نے لکھا تھا

”یہ سدہ آریہ سماج ودوانوں کو عموماً آریہ سماج امرِ سر کے پردھان و متری صاحبان کو خصوصاً مکمل لفظوں میں چیلنج کرتا ہے کہ اگر آپ حضرات اصول مساوات کے متعلق اسلام اور ویدک دھرم کی تعلیمات کا موازنہ کرنے کے لئے تیار ہوں اور اسی حق و مائل کا معیار قرار دیں تو بندہ اس کے لئے حاضر ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسلام حقیقی اور کامل مساوات کا حامی ہے اور ویدک دھرم اس کا سخت دشمن، میں انشاء اللہ معترقب الفرقان میں اس موضوع پر ایک مستقل سلسلہ مضامین شروع کروں گا جس میں پوری طرح ہر دو مذاہب کی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے گا، اگر کوئی سماجی دوست اس کا جواب لکھنے کے لئے تیار ہوں تو مجھ کو مطلع فرمائیں تاکہ دفتر سے الفرقان ان کے نام جاری ہو جائے اور وہ جس پرچہ میں اپنا جواب شائع فرمائیں وہ دفتر الفرقان میں بھجوائیں۔“

اسی شمارے (یعنی پہلی جلد کے چوتھے شمارے بابت ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ) میں حضرت والد ماجد نے اس موضوع پر دوسرا مضمون ”دیدوں میں تہذیب سوز تحریف“ کے زیر عنوان شائع کیا ہے، مضمون نگار کوئی ”جناب آتما نند صاحب بانی ست دھرم“ ہیں۔ جن کے تعارف میں حضرت والد ماجد نے لکھا ہے کہ وہ

”پہلے ویدک دھرم کے پابند تھے، لیکن دیدوں کے مطالعہ کے بعد دیدوں سے آپ کی عقیدت جاتی رہی۔ اب آپ اپنا اکثر وقت ویدک دھرم کے کھنڈن (رد) میں صرف کرتے ہیں۔ اپریل ۱۳۴۷ء میں لکھنؤ میں آریہ سماج سے میرا مناظرہ تھا وہاں آپ بھی تحریف رکھتے تھے۔ اور کچھ مختصر سی گفتگو دیدوں کے متعلق آپ نے بھی کی تھی جس سے اتنا اندازہ ہوا تھا کہ آپ سنسکرت کے بڑے فاضل ہیں اور آریہ سماجی مناظرین میں بھی آپ جیسے سنسکرت دان کم ہیں۔“

اس مضمون کے مطالعہ سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اسکی اشاعت کی وجہ حضرت والد ماجد کا یہ احساس بھی تھا کہ دفاعی حکمت عملی ہی کا تقاضا بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ خود صرف دفاع کرتے رہنے کے بجائے دشمن کو ہی دفاع پر مجبور کر دیا جائے۔ مضمون کی تمہید کی ان سطروں میں اس جانب اشارہ بھی ملتا ہے۔

”یہ مضمون صرف اس غرض سے شائع کیا جاتا ہے کہ دیو پرکاش جی اور ان جیسی ذہنیت رکھنے والے دوسرے سماجی حضرات جو قرآن عزیز پر اس قسم کے ہتاک حملے کرتے رہتے ہیں اپنی روش پر غور کریں اور آئندہ سے شیشے کے گھروں میں بیٹھ کر دوسروں کے آئینی ابوانوں پر پتھر نہ پھینکیں۔“

پھر الفرقان کے پانچویں شمارے (جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ) میں حضرت والد ماجد نے ”اسلام اور ویدک دھرم کا موازنہ، حقیقی مساوات کس میں ہے“ کے زیر عنوان اسی موضوع پر

ایک طویل علمی مضمون لکھا جس میں ویدک دھرم کے بدنام زمانہ ورن آشرم (طبقاتی نظام) کا ویدوں اور منوسمیتی وغیرہ کے حوالوں کے ساتھ تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات بیان کیں۔

اس کے بعد اگلے شمارے میں آریہ سماجیوں کے ایک اخبار (آریہ پتر) کی طرف سے حضرت والد ماجدؒ نے اپنے نام لکھے گئے ایک کھلے خط کے جواب میں جس میں انہیں بحث و مناظرہ کا چیلنج دیا گیا ہے چیلنج قبول کرتے ہوئے ”مناظرہ منظور“ کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا ہے۔ اس دور میں الفرقان کی فائلوں میں آریہ سماج سے حضرت والد ماجد کے دو مناظروں کی مفصل روداد بھی محفوظ ہے۔ پہلی روداد جلد (۱) کے شمارہ (۹، ۱۰، ۱۱) اور جلد (۲) کے شمارہ (۵) میں شائع ہوئی تھی۔ دوسرا مناظرہ بریلی میں آریہ سماج بریلی کے سالانہ جلسہ کے موقع پر انہی کی دعوت پر ہوا تھا، اس کی روداد دوسری جلد کے شمارہ (۸، ۹) کے پہلے شمارے تک مسلسل شائع ہوئی ہے۔

الغرض اس دور میں آریہ سماجی یلغار کے مقابلے میں روداد جان کر اندازہ ہوتا ہے کہ مشیت الہی نے ہند میں سرمایہ کا بھی اپنے اس سپاہی سے لے لیا۔ تمام تعریف اسی اللہ کے لئے ہے۔

### ڈاکٹر امبیڈکر کا اعلان تبدیلی مذہب

ہندوستان کی مذہبی و سیاسی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ اس وقت رونما ہوا تھا جب ڈاکٹر امبیڈکر نے (غالباً) ۱۹۳۵ء میں برہمنی جبر و استبداد اور ہندو تہذیب کے ظالمانہ نسلی و طبقاتی امتیاز پر مبنی نظام سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے تبدیلی مذہب کا راستہ اختیار کرنے کا دھماکہ خیز اعلان کر دیا تھا۔ صاحب الفرقان کے حساس دل نے ڈاکٹر امبیڈکر کے اس اعلان کا بھی فوری طور پر نوٹس لیا، اور فوراً ہی ایک مختصر سا مضمون ”عالمگیر مذہب“ کے زیر عنوان لکھا۔ اس کے بعد ربیع الثانی اور جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ کے شماروں میں ”تمام اقوام عالم پر پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ احسان ہے کہ آپ نے روحانیت کو جمہوری کر دیا“ کے زیر عنوان ایک اور مضمون لکھا۔

اسلام میں مساوات کے موضوع پر اس زمانے میں ”الفرقان“ کے صفحات میں حضرت والد ماجدؒ اور بعض دوسرے حضرات کے جو مضامین شائع ہوئے تھے، ان سب کا تعلق اس فضا سے صاف محسوس ہوتا ہے جو اچھوتوں کی تحریک اور آریہ سماج کے حملوں کے ملے جلے اثرات سے ہندوستان میں بنی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں حضرت والد ماجدؒ کی فکر مندی اور ان کے

بعض قریبی لوگوں کی توقعات کا اندازہ اس دور میں ادارہ الفرقان کے رفیق مولانا سید محبت الحق صاحب حسینی محشر کے ایک شعر سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے الفرقان کو خطاب کر کے کہا تھا۔

میرے الفرقان! تو درس اخوت عام کر!

دیکھ اب وہ تیری جانب کفر مائل ہو گیا

ایک خاص ذکر کے لائق بات اس شعر کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اس پہلے مصرعہ میں اخوت کے لفظ کے نیچے بطور وضاحت لکھا ہوا ہے ”مساوات“۔ اور ”کفر مائل ہو گیا“ کے نیچے لکھا ہوا ہے ”اچھوت اقوام کے رجحانات“۔ اس سے شعر کا مفہوم اور اس کا پس منظر بالکل متعین ہو جاتا ہے۔

سطور بالا میں آگے بڑھنے سے پہلے ایک پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ جو جائزہ راقم سطور نے پیش کیا ہے وہ الفرقان کے صرف ابتدائی تین سالوں پر مبنی ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہ دور ہے جس میں، عام خیال کے مطابق جو بڑی حد تک صحیح بھی ہے، حضرت والد ماجدؒ کی زیادہ تر توجہ بریلی کی تکفیری فتنے اور دوسرے داخلی فتنوں کے مقابلے کی طرف تھی، امید ہے کہ اس جائزہ سے اتنی بات ضرور سامنے آگئی ہوگی کہ وہ اپنی عملی زندگی کے اس ابتدائی دور میں بھی خارجی حملوں اور فتنوں کے مقابلے سے غافل نہیں رہے۔ ایک ۲۸-۲۹ سالہ نوجوان سرمایہ ملت کی نگہبانی کے سلسلے میں اتنے مختلف محاذوں پر جان کھپائے، بلاشبہ اس میں کم از کم ہم جیسوں کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز

اور

حضرت والد ماجدؒ پر اس کا اثر

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں باشندگان ہند کے اس مظلوم و محروم طبقے نے کچھ جرأت مند قدم اٹھانے شروع کئے تھے جو صدیوں سے اعلیٰ ذات والوں کے ظلم سے رہا تھا، کہ انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی وہ جدوجہد، جو تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد گویا ملتوی کر دی گئی تھی ۱۹۳۰ء میں پھر شروع کر دی گئی۔ (اس بار قیادت کانگریس کر رہی تھی اور

ساتھ دے رہی تھی ”جمعۃ العلماء“ جبکہ تحریک خلافت میں صورت حال اس کے برعکس تھی اور جب ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر امبیڈکر نے صاف صاف تبدیلی مذہب کا اعلان کر دیا تو ۳۶ء میں برطانوی حکومت نے انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر جنرل الیکشن کا اعلان کر دیا۔ جس میں مسلمان نمائندوں کو مسلمان ہی ووٹ دے سکتا تھا اور ہندوؤں کو صرف ہندو (۱)۔

یہ الیکشن اور اسی کے نتیجہ میں ملک کے تمام صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہو گئیں اور دوسرے صوبوں میں کچھ دوسری مقامی پارٹیوں کی مخلوط حکومتیں بن گئیں اور تبھی سے یہ بات بالکل یقینی ہو گئی کہ برطانوی اقتدار سے ملک کے بالکل آزاد ہو جانے کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے اور یہ سوال سب سے زیادہ جواب طلب اور توجہ طلب بن گیا کہ آزاد ہندوستان کا تہذیبی اور سیاسی نقشہ کیا ہوگا؟ کیا وہی ہوگا جس کی امید میں علماء کرام کا

طبقہ تحریک آزادی میں شریک تھا؟ یعنی یہ کہ تحریک آزادی میں  
کے بعد مسلمان آزاد ہندوستان میں اپنے ملی مفاد اور قومی خصوصیات  
العیین کے مطابق اپنے ملی نظام کی تشکیل کر سکیں گے۔

اس دور میں حضرت والد ماجدؒ کی ذہنی وابستگی جمعۃ العلماء۔

وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

”خلافت تحریک ختم ہو چکی تھی، ان جذبات کو کسی درجہ میں غذا دیے والی مسلمانوں کی جماعت جمعۃ العلماء ہندی میدان میں رہ گئی تھی، اور دارالعلوم میں تعلیم پائے ہوئے ہم جیسے لوگ اپنے اکابر کے تعلق سے اس کو اپنی جماعت سمجھتے اور اس سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے، راقم سطور کی بھی اسی سے وابستگی رہی میری یہ وابستگی ذہنی اور فکری لحاظ سے بہت محبت اور راسخ تھی اور میں ملک کی آزادی کے سلسلے میں اس کی جدوجہد اور قربانیوں کو پورے یقین و اطمینان کے ساتھ ”نبی سبیل اللہ“ ہی جانتا اور سمجھتا تھا“ (مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت )

(۱) اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں عرصہ سے کھٹنے والے کچھ سوالات کی طرف اہل نظر کی توجہ مبذول کروں، شاید کسی کی عنایت سے ان سوالوں کے تشفی بخش جوابات راقم الحروف کو مل جائیں۔ اور ملکی سیاست کا اصل محور میاں ہو جائے۔

۱۔ پہلا سوال یہ ہے کہ تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد آزادی کی جدوجہد کیوں ملتوی کر دی گئی تھی؟ پھر ۳۷ء میں کانگریس نے اسے جب دوبارہ شروع کیا تو کیا اس کا کوئی تعلق اچھوتوں کی تحریک سے تھا۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے ۳۵ء میں جوائنٹ ایکٹ بنایا، اور پھر اس کے تحت ۳۶ء میں جنرل الیکشن کرا کے ہندوستان کو حکومتی اختیارات منتقل کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا، کیا اس کا کوئی تعلق تبدیلی مذہب کے بارے میں ڈاکٹر امبیڈکر کے اعلان سے تھا؟ اور اس الیکشن اور اسکے نتیجوں کا کیا اثر اس تحریک تبدیلی مذہب پر پڑا؟

۳۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ ۳۶ء کے جنرل الیکشن نے کیا ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت کی باقاعدہ خرم ریزی کا کام نہیں کیا تھا؟

مگر ۱۳۶ء کے جنرل الیکشن کے بعد جو صورت حال سامنے آئی اس نے حضرت والد ماجد کے حساس اور مضطرب دل کو بے چین کر دیا۔ کیونکہ یہ حقیقت اُن کے سامنے اب بالکل واضح ہو گئی تھی کہ (خود انہی کے لفظوں میں)

”انڈیز پیتل کا مگر لیں کی قیادت میں آزادی کی تحریک جس طرح چل رہی ہے اس کے نتیجے میں جو آزادی حاصل ہوگی اور جو جمہوری قومی حکومت قائم ہوگی وہ ہم مسلمانوں کی آرزوؤں اور اسگوں کے مطابق نہ ہوگی بلکہ حاص کر اقلیتی صوبوں میں ان کی تہذیب اور ان کے ملی تشخص کے لئے نئے نئے خطرات پیدا ہو جائیں گے۔“ (ایضاً)

مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کی غیر اسلامی فکر و زندگی کی وجہ سے پہلے ہی سے حضرت والد ماجد کو کوئی توقع نہیں تھی کہ اُن کی تحریک کے نتیجے میں ہندوستان میں یا اسکے کسی حصے میں دینی سر بلندی اور احیاء ملت کی دیرینہ تمنا پوری ہوگی۔ البتہ دارالعلوم اور جمعیت العلماء سے وابستہ علماء کرام کے اس حلقے سے انہیں چونکہ عقیدہ تمندانہ و وابستگی تھی اور دین اور اسکے احیاء کے لئے ان کی فکر مندی و درد مندی سے، اور آزادی کی جدوجہد میں انکی شرکت کے اصل محرک ”آزاد ہندوستان میں شرعی نظام کے قیام“ سے وہ بخوبی واقف تھے، اسلئے انہیں ان حضرات سے اور ان کے طریقہ کار سے اچھی امیدیں تھیں مگر ۱۳۶ء کے الیکشن کے بعد ملک کی نئی صورت حال نے انہیں از سر نو حالات کے تجزیہ اور غور و فکر پر مجبور کر دیا۔۔۔

وہ اس صورت حال کا کتنی بے چینی اور کتنی گہرائی سے مطالعہ کر رہے تھے اور غور و فکر اور تجزیہ کے ذریعہ ہندوستان میں اسلامی وجود کے مستقبل کے بارے میں کیسے شدید خطرے محسوس کرنے لگے تھے، اور ان کا حساس دل اس سلسلہ میں کس قدر مضطرب تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی اس دور کی تحریروں کا مطالعہ ضروری ہوگا۔۔۔ ہم سر دست صرف چند اقتباسات پیش کر کے ان کے دل کی کیفیت کی ایک جھلک اپنے ناظرین کو دکھلانا چاہتے ہیں۔

الفرقان کے ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۵۷ء کے شمارے میں انہوں نے ”ہمارا نصب العین اور طریق کار“ کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا جس میں پہلے تو الجمعیت کے ادارہ کا یہ اقتباس نقل کیا ہے

”آخر ہم موجودہ نظام حکومت میں تبدیلی کیوں چاہتے ہیں، ہم ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے کیوں دشمن ہیں؟ کیا اس لئے کہ ”رام راج“ قائم کریں؟ کیا اس لئے کہ اپنے حقوق کو نظر انداز کر دیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔۔۔ ہم ہندوستان میں ایک نئی قومی جمہوریت کے لئے اس لئے جدوجہد کر رہے ہیں کہ ہم اپنے قومی و مذہبی حقوق سے پوری طرح متمع ہوں گے۔ ہم ہر اس ضابطے اور قانون کو ختم کرنے کی جدوجہد کریں گے جو ہمارے حقوق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم اس مطالبے سے کسی طرح دستبردار نہیں ہو سکتے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی زندگی پر پوری طرح اسلامی شریعت حاوی ہوگی۔“

یہ اقتباس نقل کر کے اور اس شہادت کے بعد کہ واقعی ”ان حضرات کے عزائم یہی ہیں

”گھمٹ لیں گے سامنے صرف آزادی اور انصاف تسلط سے ملک کی خلاصی کا سلسلہ یہی نہیں ہے بلکہ اسی کے ساتھ ملکی حکومت کی تشکیل و تعمیر کا ایسا ہی سلسلہ ہے اور اس کے لئے اس کے بینیت طر حویا، اصول اور وقتہ ہے اوس کے مطابق وہ مستقل کی تعمیر میں اس وقت مضبوط ہے، اس میں صرف یہ کہ ہمارے ان مہام کی تشکیل کے لئے کوئی گھمٹ لیں نہیں ہے بلکہ صحیح ترتیب ہے کہ اس میں اور ہمارے انصاف میں انصاف کی سست ہے۔“ (سطح انصاف، برعور مایا جائے۔۔۔ سجا)

”اس کا اسام یہ بھی ہو گا کہ آپ کی قوم یا یستلرم (گاندھی اور تیور ماسد) کے ساتھ۔“

اس مضمون کا یہ جملہ بھی نقل کرنے کے لائق ہے

حالات کی راکت کا احساس مجھے یہ سہ تینھ صاف صاف ۶ ص کردیے پر محور کر رہا ہے۔

کی غیر متروط حمایت کړے والوؤں میں میرے بعض ایسے مقدس ورک بھی ہیں جس کا موز کا سمہ صوبے سے لیں، ر سیں، لیکن اس معاملہ میں مجھے اتالیقیں حاصل ہے کہ میں مدد سلیمان کی طرح اہل کی حباب میں عادت عرصہ کرنے کی حرأت کړوؤں گا۔ احطط بحالہ بحطط نہ حبرأه

ٹھیک اسی زمانے میں بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے مخصوص طاقتور اسلوب میں، نہایت ٹھوس دلیلوں کی روشنی میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار اپنے رسالے 'ترجمان القرآن' کے صفحات میں شروع کیا تھا۔

مولانا مودودی کے اس سلسلہ مضامین کی وجہ سے حضرت والد ماجدؒ کو ان سے فکری و جذباتی ہم آہنگی کا احساس ہوا، اور پھر آگے چل کر دو مرتبہ انہوں نے انہی کو شش کی کہ ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل کا جو نقشہ ان کے ذہن کے مطابق زیادہ صحیح تھا اور جسکی جھلک انہیں مولانا مودودی کے افکار اور تہمتاؤں میں بھی نظر آرہی تھی ان کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعہ وہ اسی نقشہ کے مطابق عملی جدوجہد کا بیڑا اٹھائیں، لیکن ان اسباب کی بناء پر جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں اور جن کا تفصیلی تذکرہ وہ اپنی کتاب ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف“ میں کر چکے ہیں، ایسا عمل نہیں ہو سکا۔



ہندوستان میں اندلس کی طرح سرمایہ ملت کے لٹ جانے کے خطروں کو شدید سے شدید تر ہوتا، اور اپنی آرزوؤں کو خاک میں ملتا ہوا دیکھ کر اس حساس بندہ خدا کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ ہم جیسے بے حس تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسے سخت صدمے اور اسکے نتیجہ میں اتنی شدید بیماری سے انھیں دوچار ہونا پڑا تھا کہ زندگی کے لالے پڑ گئے تھے، بالآخر اللہ نے دستگیری کی اور عارف باللہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کی ہدایت پر ایک جذبہ طالبانہ اور اپنا بے قرار دل لے کر وہ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں پہنچ گئے۔ اور یہاں پہنچ کر انہیں محسوس ہوا کہ ”جالینجاست“۔

اور پھر حضرت مولانا الیاسؒ اور انکی دینی دعوت کے ساتھ انہیں جو تعلق خاطر ہوا، اور جس طرح اپنی مخصوص حساس، درد مند اور سراپا عمل طبیعت کے ساتھ وہ تبلیغی جدوجہد میں لگے، اس کی تاریخ ایک ضخیم کتاب چاہتی ہے، مجھے تو یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس کے پیچھے ان کا یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ نئے ہندوستان میں عام مسلمانوں کو متحدہ قومیت اور اکثریتی کلچر کے رنگ میں رنگ جانے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر جزوی یا کلی ارتداد کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچانے کے لئے عام مسلمانوں سے رابطے، اور انہیں اسلام پر جمائے کے لئے عمومی جدوجہد کی یہ سب سے آسان اور موثر عملی شکل ہے۔ اسی زمانے میں دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی ایک مسلم کانفرنس کے موقع پر جمع ہونے والے رہنمایان قوم اور زعماء ملت کے نام اپنے ایک پیغام میں انہوں نے لکھا تھا

”اس تقسیم اور سوادہ کے بعد یہاں کی سیاست کے نقشے میں خود تبدیلیاں ہوئی ہیں اور مستقبل میں ان سے بھی بڑی جن تبدیلیوں کے امکانات نظر آ رہے ہیں، اگر آپ نے ان پر غور کیا ہو گا تو آپ کو ضرور اس کا اندازہ ہو گا کہ مستقبل کے جدید ہندوستان میں غالباً صرف وہی لوگ اسلام پر قائم رہ سکیں گے جو حقیقت مسلمان ہوں گے یعنی جو اسلامی روح اور اسلامی زندگی کے حامل ہوں گے۔ اور ان کے علاوہ جو لوگ صرف نام کے مسلمان ہوں گے اور اسلام ان کی روح میں اور ان کے دل میں اتر ا ہوا نہ ہو گا وہ اپنی جگہ قائم نہ رہ سکیں گے۔ یا تو خدا خواست کھلم کھلا کوئی دوسری قومیت اختیار کر لیں گے جیسا کہ بعض مقامات پر ہو چکا ہے اور بعض علاقوں میں اب بھی تیزی سے ہو رہا ہے یا اگر کوئی لادینی تحریک کسی وقت اس ملک میں قوت پکڑ گئی تو وہ لادینی اور لاندہ ہی راہ اختیار کر لیں گے

ہماری قوم کے سیاسی اور معاشی مسائل کی جو واقعی اہمیت ہے ہم اس سے بھی ناواقف نہیں ہیں اور خصوصاً ملک کی تقسیم کے بعد یہ مسائل جتنے نازک اور قابل فکر ہو گئے ہیں اس کا بھی ہمیں خوب اندازہ ہے اور اس لئے ایمان داری سے ہماری یہ رائے ہے کہ ان مسائل کو صحیح طور سے حل کرنے کے لئے جن کوششوں اور تدبیروں کی ضرورت ہے ان میں بھی کوئی کمی اور کوتاہی کرنا گناہ ہے لیکس اس کے ساتھ ہم بہت صفائی کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دین و ایمان اور ان کی اخروی مددگی اور تقاضے ملی کی نزاکت اور اہمیت کو محسوس نہ کرنا اور اسکے لئے اس وقت جس فکر و تدبیر کی ضرورت ہے اس سے غفلت نہ کرنا

اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کی تدبیر اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قوم میں دینی روح اور اسلامی زندگی کو عام کرنے کی پوری جدوجہد کی جائے اور اصلاح امت اور احیاء دین کی اس دعوت کو ایک ”عوامی تحریک“ بنادیا جائے۔“  
(آگے چل کر حضرت والد ماجدؒ نے اس مقصد کے لئے تبلیغی کام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا)

”عام مسلمانوں کی اس ایجابی و اخلاقی اصلاح اور مدد سی پیداری کا نتیجہ صرف یہی نہ ہوگا کہ مستشرقین کے جدید ہندوستان میں ان کے وجود بدینی اور ثقافتی ملی اور ان کی مخصوص تمدن کے لئے جو خطہ محسوس کیا جارہا ہے قوم اس سے محفوظ ہو جائے گی۔ بلکہ اس وقت مردہ ملی اور خود فراموشی کی جو کیفیت قوم میں عام طور سے پیدا ہو گئی ہے۔ تناء اللہ، آہ۔ آہ۔ آپ جانتے رہے گی اور اس کے بجائے اولوالعزمی اور خود اعتمادی کی دلی مولیٰ روح ابھ آئے گی۔“

(القرقاں ص ۱۷۱ تا ۱۷۲)

اس زمانے کی ان کی تقریروں اور تحریروں پر مشتمل جو مواد القرقاں میں محفوظ ہے وہ سب اس کا گواہ ہے کہ تبلیغی محنت کی تکمل میں ان کے فکریا گیا تھا جس سے افراد کی ایمانی تربیت کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند، بچایا جانا ممکن نظر آنے لگا تھا جس کے منصوبے انگریز اور برہمن دمانہ پس کہا جاسکتا ہے کہ تبلیغی جدوجہد میں ان کی عملی شرکت بھی ہند۔ مشتمل ان کی کتاب زندگی کا ایک باب تھا، نہایت اہم باب۔“  
اور غالباً یہی سبب تھا کہ تبلیغی کام کے بارے میں مکمل انشراح و اطمینان کے باوجود اور اس میں پوری سرگرمی و انہماک کے ساتھ عملی مشغولیت کے باوجود وہ ہندوستان کے افق پر بار بار بار منزل لانے والے متحدہ قومیت اور برہمنی کلچر کے خطروں کو محسوس کرنے اور ان کے مقابلے کی ہر ممکن تدبیر سے عین اس انہماک کے دور میں بھی غافل نہیں ہوئے بلاشبہ یہ سب اللہ کی خاص توفیق و عنایت کا ہی کرشمہ ہے! ورنہ۔۔۔  
”اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں“

### تقسیم ہند کے بعد

تقسیم ہند کا فیصلہ اصولی طور پر ۱۹۴۷ء ہی میں ہو گیا تھا۔ اس کے فوراً بعد حضرت والد ماجدؒ نے لکھنؤ منتقلی کا فیصلہ کر لیا۔ سنبھل سے بریلی وہ منتقل ہوئے تھے بریلی کے تکفیری فتنے کے مقابلے کے لئے۔ اور بریلی سے لکھنؤ منتقلی کا ان کا فیصلہ ان طوفان خیز آندھیوں کے مقابلے کے لئے زیادہ یکسوئی کی نیت سے تھا جو ملک میں مشرکانہ احیائیت اور برہمنی فسطائیت کی چل رہی تھیں۔ اور خطرہ تھا کہ یہ آندھیاں آنے والے دنوں میں اس ملک میں مسلمانوں کی ایک خاصی

بڑی تعداد کو دین حق سے کہیں روگرداں نہ کر دیں۔

انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے، وہ اپنے ذوق کو اکثر ”حکم“ بنا کر فیصلے صادر کرتا ہے۔ کسی کو بریلویت جیسے داخلی فتنوں کے مقابلے کے میدان سے زیادہ مناسبت ہے تو وہ حضرت والد ماجدؒ کی زندگی کے دور اول کو زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کسی کو ان کے دوسرے دور کی خدمات سے زیادہ مناسبت ہے تو وہ انکی عملی زندگی کے دور ثانی کو زیادہ تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ رہا وہ مرد حق تو وہ ہر طرح کی داد و تحسین سے بالکل بے نیاز، اپنے ذوق کو بار بار قربان کر کے اور اپنی عقل و فہم کی حد تک صرف اور صرف امت کی ضرورت کو اور رضاء الہی کو پیش نظر رکھ کر کام کرتا رہا۔ ترجیحات بدلتا رہا۔ اور اس امید کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کی ان کاوشوں کو بنظر رضاء و محبت دیکھ لے گا اور غلطیوں اور کوتاہیوں کو جو اسکی نگاہ میں بے حساب تھیں، معاف فرما دے گا۔

خیر! یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو زبان قلم پر آگیا، میں عرض تو یہ کر رہا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانان ہند کو جینے کا سلیقہ سکھانے، ان کے حوصلوں اور ایمان کو قائم رکھنے اور ان مشکل حالات سے ایک مسلمان کی طرح نبرد آزما ہونے، اور شکست خوردہ نفسیات کا شکار ہونے سے بچانے کیلئے جو انتھک محنت، اپنی پوری شخصیت کو جھونک کر اللہ کے اس بندے نے کی ہے وہ ایک اور نمونہ ہے احساس ذمہ داری کا اور محنت و جانفشانی کا۔ ایک طرف الفرقان کے ہر شمارے میں وہ اپنے دل کا درد نکال کر رکھتے تھے اور دوسری طرف ملک کے طول و عرض میں جا جا کر عام مسلمانوں کے قدم جمانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان کے اس دور کے مضامین اور تقریریں سب اسی محور کے ارد گرد ہوا کرتی تھیں۔ شاید ہی کوئی واقعہ ایسا ہوتا ہو جس کا اثر مسلمانان ہند پر پڑنے والا ہو اور الفرقان اس کا نوٹس نہ لیتا ہو۔ اور اس بارے میں صحیح رہنمائی فراہم کرنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ مثال کے طور پر جب گاندھی جی اسی ہندو فسطائیت کے ہاتھوں ہلاک کئے گئے تو الفرقان نے اس پر اظہار غم بھی کیا اور گاندھی جی کی بھلائوں کا اعتراف بھی کیا۔ اور ساتھ ہی ان مسلمانوں کو بڑی صراحت کے ساتھ ٹوکا بھی جو گاندھی جی سے اظہار عقیدت کے سلسلے میں غلو اور بے اعتدالی سے کام لے رہے تھے۔ اسی طرح دسمبر ۱۹۴۹ء میں بابری مسجد میں مورتیاں رکھی گئیں تو اس پر حضرت والد ماجدؒ نے اپریل ۱۹۵۰ء کے شمارے میں ایک ادارہ لکھا جس میں بعض باخبر کانگریسی لیڈروں کے حوالے سے یہ بات ریکارڈ میں آگئی کہ یہ ایک اتفاقی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس ملک میں ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دے کر اپنی روٹیاں سینکنے

سے دلچسپی رکھنے والے سیاسی عناصر نے یہ قدم دراصل اسلئے اٹھایا تھا کہ ”وہ قتل و غارت کے اس طوفان کو جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں اٹھا تھا اور گاندھی جی نے اپنی جان کی قربانی دیکر جس کو اس وقت روک دیا تھا اب پھر نئے سرے سے اٹھانا چاہتے ہیں۔ بابر کی مسجد کا قضیہ دراصل اس سلسلے کا پہلا قدم ہے اور اس کے بعد وہ مسلسل اسی طرح کے بہت سے قدم اٹھائیں گے۔“

ان وقتی مسائل کے علاوہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا، ان میں اللہ پر یقین و اعتماد اور خود اعتمادی پیدا کر کے انھیں نئے سرے سے ایک بامقصد اجتماعی زندگی گزارنے پر آمادہ کرنا یہی عرصہ تک اس بندہ خدا کی شب دروز کی دھن رہی۔ میرے سامنے اس سلسلے کا ان کی بے شمار تحریریں ہیں۔ حیران ہوں کہ کس کو یہاں نقل کروں کہ بالآخر ایک مضمون کا انتخاب کر کے اس کی تلخیص پیش اکتوبر ۱۹۴۹ء کے شماروں میں انھوں نے ”ہندوستانی مسلمانوں کا لکھا تھا

”سلطنت معلیہ کا چراغ گل ہونے کے بعد اس ملک میں جس وقت انگریزی حکومت قائم ہوئی اس وقت سے اب سی خرابیوں کے باوجود یہاں کی مسلمان سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں چند ایسی صفات موجود تھیں جو انگریزی اثرات سے ان کے دین اور ان کی تہذیب کی دیرینہ حفاظت کر سکتی تھیں۔ (مثلاً) عقائد کی میادیں محفوظ تھیں۔ دلوں میں دین کی عظمت تھی۔ اپنے دین اور اپنی تہذیب کی برتری کا یقین تھا۔ دینی غیرت و حمیت تھی، خائفانہوں میں خاصانہ خدا تھے۔ علماء کا علم زیادہ تر رائج تھا اور ان میں دینی پختگی اور کردار کی مضبوطی تھی۔ اور اسی کے ساتھ انگریزی حکومت اور انگریزی تہذیب سے ان کو سخت نفرت تھی۔“

مگر انگریزی دور حکومت میں مسلمانوں کی ان صفات میں رابر انحطاط آتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ہم نے اپنے کو اس حال میں پایا کہ موجودہ مسلمان قوم کے سربرآوردہ طبقے میں کافی تعداد ایسوں کی ہے جنہیں اسلام کے بنیادی عقیدوں پر پورا یقین نہیں رہا ہے۔ دینی غیرت و حمیت دلوں سے نکل چکی ہے۔ وہ معمولی معمولی فائدوں کے لئے دشمنان اسلام کے ساتھ جاسکتے ہیں، اغراض پرستی اور ابن الوقتی ہمارے خوش حال طبقے کا عام مزاج بن چکا ہے۔ اس لئے بڑے بڑے گناہوں اور منافقانہ حرکتوں پر اب سوسائٹی میں کوئی احتساب نہیں ہوتا اور چونکہ یہ باتیں ان لوگوں میں عام ہیں جو قوم میں بڑے اور تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں اسلئے اب جاہلوں، غریبوں کی نظروں میں بھی ان باتوں میں کوئی برائی نہ رہی اور ان میں (یعنی عوام میں) ایک خطرناک چیز یہ (مزید) ہے کہ وہ دین کی اصولی اور بنیادی باتوں سے بھی نا آشنا ہیں۔ خود علماء کے طبقے میں بھی بہت فرق پڑ گیا ہے۔ علم میں رسوخ و بصیرت اور دین میں تفقہ کی شان رکھنے والے ہزاروں میں دو چار بھی نکلے مشکل ہیں۔ اس طرح تقویٰ اور سیرت کی بلندی اور عزیمت و استقامت کی صفات رکھنے والے اہل علم عقائد کی طرح نایاب یا بہت ہی کمیاب ہیں۔

ان کمزوریوں کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے انقلاب اور نئی قومی حکومت کا ہم کو استقبال کرنا پڑا ہے۔ دوسری طرف ملک

کے حالات کا نقشہ یہ ہے کہ

تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً بارہ تیرہ فیصد ہے۔ یعنی گویا غیر مسلم آبادی سات مئی اکثریت میں ہے۔ اسلئے حکومت کا سارا نظم و نسق جمہوریت کے اصول کے مطابق قدرتی طور پر اس اکثریت ہی کے ہاتھ میں ہے اور رہے گا۔

اس اکثریت میں ایک عنصر ہے جس کی صاف رائے یہ ہے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کو اس ملک میں مسلمان رہ کر اور عزت کے ساتھ جینے کا کوئی حق نہیں رہا ہے۔ اسلئے اسکے خیال میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کا جبر و تشدد درست ہے۔ عام پبلک کے علاوہ حکومت کے انتظامی عملہ میں بھی اس طرح کے خیالات رکھنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ پس اگر یہ طبقہ ہی کسی وقت برسر اقتدار آگیا تو موجودہ مسلمان قوم کے جو طبقے دین میں کچے ہیں اور اس وقت بھی جن کا تعلق دین سے زیادہ پختہ نہیں ہے ان کا جو حشر ہو گا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اکثریتی طبقے میں (اگرچہ) طرز حکومت اور نظام حکومت کے متعلق الگ الگ رائیں ہیں۔ اور مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کے معاملے میں بھی سب یکساں نہیں ہیں۔ مگر اس خواہش میں قریب قریب سب شریک ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کو اب اپنی ملی انفرادیت اور تہذیبی و معاشرتی امتیاز کو ختم کر کے اکثریت کا ایک غیر متمیز جزو بن جانا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے ایک طرف تو ایسے قوانین بنائے جا رہے ہیں جن کے بعد مسلمانوں کی ملی خصوصیات و امتیازات کے باقی رہنے کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف ”الاس علی دین ملوکھم“ کے طبعی قانون کے مطابق خود مسلمانوں کے بعض طبقوں میں ہندو تہذیب و معاشرت اختیار کر بیکار حمان تیزی سے پیدا ہو رہا ہے۔

تیسری چیز جو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اثر انداز ہو گی وہ آئندہ کا تعلیمی نظام ہے۔ انگریزوں نے جو نظام تعلیم قائم کیا اگرچہ اس کا مقصد حکومت کی مشین چلانے کے لئے صرف سستے پرزے تیار کرنا تھا، ہندوستانیوں کو انگریز بنانا، ان کے پیش نظر نہ تھا لیکن اسکے باوجود ہندوستان کی تمام قوموں میں یورپین تہذیب اور یورپین طرز فکر پیدا کرنے میں اس نے جتنا کام کیا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اس سمجھا جاسکتا ہے کہ اب جبکہ تعلیم لازمی ہو گی اور اس کا مقصد یہ ہو گا کہ اسکے ذریعہ تمام ہندوستانیوں کے خیالات اور طرز زندگی میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا کی جائے ”تا کہ نہ گوید بعد اریں من دیگرم تود گیری“ تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے دینی و ملی خصائص و امتیازات کا کیا حشر ہو گا؟

دوہتے اور مہ کھولے سامنے کھڑے ہیں، ایک کمیونزم جس کا دھاراپوری تیزی سے ایشیا کی طرف آرہا ہے خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے حالات اس وقت کچھ ایسے ہیں کہ اکثر صوبائی حکومتوں کے غلط رویہ کے رد عمل کے طور پر وہ آسانی سے ہر اس دعوت و تحریک کے ہمدرد بنائے جاسکتے ہیں جو موجودہ نظام کو الٹ کر نئی بساط بچھانے کی دعویدار ہو اور ”کامل مساوات“ اس کا نعرو ہو۔

دوسرا نقطہ ”نظریہ وحدت ادیان“ ہے۔ بہت امکان ہے کہ جن طبقوں میں دین سے جہالت، مایوسی، نفاق کی یہ بیماریاں موجود ہیں وہ نظریہ وحدت ادیان قبول کر لینے ہی کو عزت و عافیت کا ذریعہ سمجھ کر قبول کر لیں۔

یہ فتنہ اس لئے اور زیادہ خطرناک ہے کہ اس وقت اس کی داعی اور علمبردار گاندھی جی، راج گوپال اچاریہ جی، بی۔ بی۔ پنڈت سندھ لال جی جیسی باوقار شخصیتیں ہیں۔

اور مردین کے محافظوں کا یہ حال ہے کہ ان میں سے بہت سوں کے لئے واقعی مصلحتوں کی رعایت ’معاذ حق‘

نومر“ کی تعمیل سے اس نازک ترین وقت میں بھی رکاوٹ بن گئی ہے، یا ”مدارات“ اور ”مدہنست“ کی حدود ان کی نگاہوں میں مجلسیں ہو گئی ہیں۔

آگے چل کر حالات کے اس تجزیہ کے بعد ان سے نبرد آزما ہونے کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

”انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ کے مختلف دور ہوتے ہیں، پہلا دور سخت آزمائشوں کا دور ہوتا ہے، اس دور میں سچے اور کچے لوگ ان کی جماعت میں آتے ہیں جنہیں دین و ایمان ہر دوسری چیز سے زیادہ پیارا ہو جاتا ہے۔ وہ سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں۔ پھر ان صادقین کی قربانی اور ثابت قدمی کامیابیوں کے دروازے کھول دیتی ہے اور وہ دوسرا دور آ جاتا ہے جبکہ پیغمبر کی دعوت قبول کرنے والوں کو آزمائشوں سے کوئی سابقہ نہیں پڑتا بلکہ دنیا کی ساری کامرانیوں اور اقبال مندیاں اس دور میں اس دین کے سایہ تلے آ جاتی ہیں۔ یہ دور ظاہر اس امت کے عروج و اقبال کا دور ہوتا ہے۔ لیکن دراصل روال و انحطاط کی بنیاد اسی دور میں پڑ جاتی ہے۔ امت میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہو جاتی ہے جس کی، استغ، دین اور دینی دعوت کے ساتھ اصلی ایمان والی وابستگی نہیں ہوتی، اس دور میں امت کی حیثیت۔

ملکہ وہ دنیا کی قوموں میں سے ایک قوم بن جاتی ہے۔ جس میں علم و عمل، افکار و خیالات، کے آدمی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ اس دور میں بہت سے ایسے لوگ بھی اس امت میں پیدا ہو جاتے ہیں جو واقعی نہیں ہوتے، ان کا تعلق دین سے صرف موروثی اور برائے نام ہوتا ہے۔ کتنا ہی لسا ہوا اسکے نتیجہ میں وہ تیسرا دور ضرور آتا ہے جسکے حالات اس امت کے لئے پھر اور قائم رہنے کے لئے عزم و ہمت اور جالی دہائی قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

دعوت اسلام کا ابتدائی دور اس امت کے لئے پہلا دور تھا، پھر خلافت راشدہ ہی کے زمانے میں دوسرا دور شروع ہو گیا جو ایک ہزار سال تک چلا اور اب پچھلی صدی سے اسلامی دنیا کے بہت بڑے حصے میں تیسرے دور کا آغاز ہے۔ جن ممالک میں اس دور کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہو چکی ہیں ان میں ایک ہندوستان بھی ہے۔ جہاں کے حالات تیسری سے ایسے ہوتے جا رہے ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں یہاں وہی اہل عزیمت سچے مومن و مسلم رہ سکیں گے خود کی پوری سچائی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیں گے کہ ہم کو ہر حال میں مومن و مسلم رہنا اور ایمان و اسلام کے ساتھ جینا اور مرنے کا ہے ہم کو اور ہماری نسلوں کو حکومتی عہدے ملیں یا نہ ملیں، نوکریاں ملیں یا نہ ملیں، ٹھیکے اور تجارت کے اچھے مواقع ملیں یا نہ ملیں اور ظاہر ہے کہ یہ عزم وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دین کی حقیقت سمجھ کر اس پر ایمان لائے ہوئے ہوں اور ہر منفعت و مصلحت کو اس کے لئے قربان کر سکتے ہوں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت میں یہ چیز اس وقت موجود نہیں ہے۔ پس مستقبل میں یہاں کے مسلمانوں کے اسلام پر قائم رہنے کا دار و مدار اور تمام تر انحصار ظاہر اسی رہے کہ حقیقی ایمانی روح، ضروری درجہ کی دینی واقفیت اور عزیمت و استقامت کی صفت ان میں عام کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کام کے لئے جو طریقہ کار ہمارے نزدیک صحیح ہے اور جس پر ہم کو پورا یقین ہے اسکی پوری تفصیل ایک مستقل

رسالہ ”دعوت اصلاح و تبلیغ“ میں اس سے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ البتہ چند اصولی باتیں یہاں بھی عرض کی جاتی ہیں

۱۔ مسلمان قوم کے افراد کی بہت بڑی تعداد اگرچہ دین کی بنیادوں سے بھی بے خبر ہے تاہم یہ خارج امر ملت نہیں ہے۔

ابنیں اپنا اسلامی بھائی سمجھ کر اور ان کی اس غفلت و جہالت کا بہت کچھ اپنے کو بھی دے دار مان کر کام کرنا ہو گا۔

۲۔ بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہیں دین کی ضروری باتوں کا علم تو ہے لیکن زندگی دین کے مطابق نہیں ہے۔

لہذا ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ صرف کسی عمومی تعلیمی یا اشاعتی اسکیم کے ذریعہ دینی احکام و مسائل کا ان کو صرف معلوم کرادینا کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ان کے دلوں میں احکام کی عظمت پیدا ہو، اور اسکے لئے انبیاء کے طرز پر ایسی جدوجہد ضروری ہے جس میں جذبات کا رخ پھیر دینے کی طاقت ہو اور جس میں کچھ بتلانے اور پہنچانے سے زیادہ ایمانی جذبات پیدا کرنے کی کوشش ہو۔

۳۔ مستقبل کے ناسازگار حالات میں ہم کو اور ہماری نسلوں کو چٹکتی کے ساتھ دین و ایمان پر قائم رہنے کے لئے دین کے ساتھ جس درجے کی محبت اور جیسی استقامت و عزیمت کی ضرورت ہے وہ تھی یہاں ہو سکتی ہے جب سب کی زندگی کو دعوتی بنادیا جائے کیونکہ کسی عقیدے یا طرز زندگی کی طرف دعوت خود اس پر راسخ اور پختہ ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔

۴۔ اس مقصد کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ ضروری درجہ کی دینی تعلیم کا ایسا ہمہ گیر انتظام ہو کہ ہر شخص خواہ اس کی عمر کچھ ہو اور اس کے احوال و مشاغل کچھ ہوں وہ آسانی سے دین کی ضروری واقفیت حاصل کر سکے۔ یہ تعلیم مساجد میں آسانی سے ہو سکتی ہے اور کتنا ہی بھی ہو سکتی ہے اور ربانی بھی۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن مندوں کو خاص فکری یا عملی صلاحیتیں بخشی ہیں ان کو اس کام میں لگائے اور ان کی حداداد صلاحیتوں سے دیں کہ وہ اپنے نچھوڑنے والے کی خصوصیت سے کوشش کی جائے۔ البتہ اس راہ میں کسی کو بھی حقیر دے کا نہ سمجھا جائے۔ کوشش ہر ایک پر کی جائے اور ہر آنے والے کی پوری قدر کی جائے۔

۶۔ اس کام کا یعنی احیاء دین و اصلاح امت کی جدوجہد کا سب سے مزاحق حضرات علماء پر ہے، اس لئے ال پر حق ہے کہ اپنی توجہات عالیہ زیادہ سے زیادہ اس کام کی طرف لگائیں۔

۷۔ علماء کے علاوہ دوسرا طبقہ جس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اہل وجاہت اور اصحاب دولت و ثروت کا ہے۔ قوم کے عوام اسی طبقے کا اتباع کرتے ہیں، یہ اگر سبکی کی راہ پر آجائے تو پوری قوم کا ایک منہ آساں ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس دنیا میں کوئی بڑا کام مادی و مسائل کے بغیر نہیں چلتا۔

۸۔ احیاء دین اور اصلاح امت کی اس جدوجہد کے ہر مرحلے پر اسکی نہایت احتیاط کی جائے کہ کسی وقت بھی یہ جدوجہد حاکم مادی مسائل سے تعلق رکھے والی قومی اور سیاسی تحریکات سے مشتبہ نہ ہو، اور نہ اس طرح کی کسی قومی تحریک سے اس کا رشتہ جڑے پائے۔

۹۔ گزشتہ دور میں ہماری قومی پالیسی یہ رہی کہ یہاں کے دوسرے باشندوں سے حقوق و منافع کی حصہ رسانی کی تعلیم پر ہم لڑتے جھگڑتے رہے اور اپنے طرز عمل سے اہل ملک کو بتلاتے رہے کہ گویا حقوق و منافع کے ال ہی مسئلوں کو ال کی طرح ہم بھی مدگی کے اصل مسائل سمجھتے ہیں۔ اور حضرت محمد ﷺ کا جو پیام ہدایت لے کر ہمارے اسلاف عرب سے نکلے تھے اس کو ہم نے یکسر چھوڑ دیا۔ اور برائیاں ہم نے اختیار کر لیں۔ ایسی حالت میں دوسرے باشندوں کا بڑاؤ اگر ہمارے ساتھ غیر منعطاف ہو تو اسکے لئے تو اگرچہ یہ درست نہیں لیکن ہم کو اس کے سوا توقع کرنے کا کیا حق ہے؟ اس لئے ملک کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ ہمارا تاؤ اسلام کے مقرر کئے ہوئے اصول اخلاق، احسان و انصاف اور خیر اندیشی کی بنیاد پر ہو، اور ال کے متعلق دوسرے تمام مسئلوں سے زیادہ فکر ہم کو اس کی ہو کہ اللہ کے ال بندوں کا رشتہ بھی اللہ کی ہدایت اور اس کے بھیجے ہوئے دیں حق سے جڑ جائے اور یہ پیارے بھی رحمۃ اللعالمین سیدنا حضرت محمد ﷺ کو پہچان لیں اور ان کی لائی ہوئی رمتوں اور برکتوں میں ال کا بھی حصہ ہو جائے۔ و بیکوں الدین کلمہ للہ“

یہ مضمون ایک نمونہ ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے اس مرد حق کی بیداری کا، اسکی وقت نظر اور وسعت نظر کا، نیز اس کی حق گوئی و بیباکی کا بعد میں آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی انفرادیت اور ملتی تشخص کی حفاظت کی جتنی بھی سنجیدہ اور ٹھوس کوششیں ہوئیں مثلاً دینی تعلیمی کونسل، مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ ان سب میں حضرت والد ماجد کا کلیدی اور بنیادی حصہ رہا۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ جو آج تک ہندوستان میں اندلس کی تاریخ نہیں دوہرائی جاسکی، اور نہ یہاں کے نہتے اور کمزور مسلمانوں کے ساتھ وہی کیا جاسکا جو اسی خطہ زمین پر بدھوں اور جینیوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ یہ دراصل نتیجہ ہے اس ملک کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے کسی خاص فیصلے کا جسکے نتیجہ میں اس نے یہاں (الف ثانی کے مجدد) سید احمد سرہندی، اور اس دور کے فاتح حضرت شاہ ولی اللہ جیسی ہستیاں پیدا کیں۔ فیوض کا سلسلہ جاری رکھا۔

والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی زندگی کے با  
عمر کے تیس سال بھی نہیں ہوئے تھے عالم ربانی حضرت مولانا  
معمولی طور پر صاحب کشف و فراست تھے) یہ جو کہا تھا کہ

”معلوم ہوتا ہے کہ قسام ارلے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی دمام محمد صم کا وجود سعودی مرض سے  
لے تجویز فرمایا ہے کہ موجودہ دور کے دشمنوں سے اسلام کی عزت بچائیں (ماخوذ از الفرقان جلد ۱ شمارہ ۷)  
اور یہ بات جو مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی زبان  
سے حضرت والد ماجد کی وفات کے بعد نکلی تھی کہ

”مولانا کا بڑا اتنیاری کمال یہ تھا کہ انہوں نے اس ملک کے حضرات کو سمجھا اور اس حقیقت کو سمجھا کہ یہ ملک  
مسلمانوں کے لئے دوسرا عین ہے۔ سن جائے نیز یہ کہ مولانا کی جامعیت اور ال کا خاص کمال یہ تھا کہ ال کی توجہ مسلمانوں کے  
اپنے احکامات اور اس کے تقاضوں پر بھی رہی اور ال مخالفہ منصوبوں اور حضرات پر بھی جو ماہر سے ال کی طرف رخ کر رہے  
تھے“

یہ سب دراصل اشارہ کرتی ہیں ان کی شخصیت کے اسی پہلو کی طرف جسکی طرف سطور  
بالا میں ناظرین کرام کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

راقم الحروف یہاں یہ بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہے کہ حضرت والد ماجد کی  
شخصیت کے اس پہلو کے انتخاب کا محرک اس کا یہ احساس بھی ہے کہ حالات اب پہلے سے زیادہ  
سخت ہیں۔ ہمارا ملک اب پہلے سے کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ اُس تنگ نظر گروہ کی گرفت میں  
ہے، دوسری طرف ہمارا اپنا حال بھی پہلے سے زیادہ خراب ہے۔ ضرورت ہے کہ ہند میں سرمایہ



ملت کی تنہائی کے کام کی طرف توجہ بڑھائی جائے اور اس کے لئے علمی دفاع بھی کیا جائے اور دعوتی و عملی اقدام بھی۔ اللہ کرے کہ اس تذکرے سے یہ فائدہ ہو... لکھنے والے کو بھی اور پڑھنے والوں کو بھی، ورنہ ”پدرم سلطان بود“ سے کیا فائدہ؟

بس اب صفحات کی گنجائش ختم ہو چکی ہے بلکہ شاید میں مقررہ حد سے آگے ہی بڑھ چکا ہوں۔ کہنے کو ابھی بہت کچھ باقی ہے بلکہ سبھی کچھ باقی ہے، مگر  
ع۔ داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار  
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والد ماجد کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ہمیں انکے، اور انکے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔

رب اور عسی ان اشکر نعمتک النی اعمت علی و علی والدی  
وا ان اعمل صالحاً ترصاه و ادحلی برحمتک فی عبادک الصالحین

☆☆☆

## ہماری چار نئی کتابیں

- |      |   |
|------|---|
| 40/- | ۱۔ عورت اسلام سے پہلے اور اسلام میں (ایک تقابلی مطالعہ) |
| 25/- | ۲۔ تبلیغی و اصلاحی تقریریں                              |
| 16/- | ۳۔ نماز کیسے پڑھیں؟                                     |
| 30/- | ۴۔ سیرت حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنؤی                      |

نوٹ : اپنے کسی قریبی کتب فروش سے طلب کریں یا ہمیں لکھیں۔

پتہ : مکتبہ ایوب کا کوری لکھنؤ۔ 227107

جناب محمد یونس سلیم۔ نئی دہلی  
سابق ڈپٹی منسٹر حکومت ہند و گورنر بہار۔

## ایک مدبر و مفکر عالم دین

اچھی طرح یاد نہیں کہ عالم ربانی مولانا منظور نعمانیؒ = شرف حاصل ہوا تھا۔ خیال پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ حیدر آباد میں تبلیغی اجتماع کی خبر کے سلسلہ میں اخبار میں مولانا مرحوم کی تشریف تھی اور میں مولانا نعمانیؒ سے سکندر آباد کی جامع مسجد میں جا کر ملا تھ پیش آئے تھے اور بعض دینی و سیاسی امور پر بڑی دیر تک گفتگو رہی تھی۔ تفصیلی ملاقات اور مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ جب ملا تھا جب میں غالباً اگست ۱۹۶۱ء میں خاص طور پر مولانا مرحوم اور علی میاں سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ گیا تھا اور پچھری روڈ پر مولانا ہی کے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا تھا۔ تقریب ملاقات یہ تھی کہ جمعۃ العلماء ہند نے دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن ڈاکٹر سید محمود مرحوم کی صدارت میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور جھکو کنونشن کا سکریٹری بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود کی بڑی خواہش تھی کہ کنونشن مسلمانان ہند کا ایک نمائندہ اجتماع ہو جس میں ہر طبقہ اور مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے اہل الرائے کو مدعو کیا جائے۔ خاص طور پر جماعت اسلامی کے زعماء اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی کی شرکت کی اہمیت پر خاص طور پر توجہ مرکوز تھی۔ جماعت اسلامی کے قائدین اور مولانا علی میاں اور مولانا نعمانی کو کنونشن میں شرکت پر آمادہ کرنے کی سعی و جدوجہد ان حضرات سے میرے سپرد کی گئی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے مولانا منظور نعمانی سے ربط پیدا کیا اور تاریخ مقررہ پر لکھنؤ پہونچکر مولانا مرحوم کے یہاں ہی پچھری روڈ پر مولانا کے مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر ہوا تھا۔ دو-تین دن کے قیام میں کئی نشستوں میں ملک و ملت کے سیاسی و اجتماعی مسائل پر بڑی تفصیلی گفتگوئیں رہیں۔ ہر نشست میں علی میاں بھی تشریف فرما رہتے تھے۔ یہ

پہلا موقع تھا کہ اس قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ملک کے سیاسی امور اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل پر مولانا سے گفتگو اور تبادلہ خیال کا موقع ملا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے حیدر آباد میں پولیس ایکشن کے بعد اکابر جمعیت العلماء کے علاوہ متعدد علماء کرام اور قائدین ملت سے سیاسی اور ملی مسائل پر گفتگو اور تبادلہ خیال کا موقع ملا تھا لیکن لکھنؤ کے دوران قیام میں مولانا نعمانیؒ کی سیاسی بصیرت اور ملک و ملت کے مسائل پر حقیقت پسندانہ سوچ اور فکر نے اس قدر متاثر کیا کہ مولانا کی دینی اور سیاسی بصیرت اور سیاسی امور پر انکے حقیقت پسندانہ نقاط نظر نے مجھے ان کا گرویدہ بنادیا۔ مولانا نے جس محبت، شفقت اور اخلاص کا برتاؤ اس ملاقات میں کیا تھا اس کو نہ صرف مرحوم آخر وقت تک نباہتے رہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ انکی عنایتوں، شفقتوں اور بزرگانہ سرپرستیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

لکھنؤ کی اس گفتگو کے دوران یہ ذکر بھی آیا تھا کہ ملک کے سیاسی و ملی حالات کا تقاضا ہے کہ جماعت اسلامی کے نمائندوں کو مسلم کنونشن میں شرکت کے لئے بہر طور پر آمادہ کیا جانا مناسب ہوگا۔ مولانا علی میاں اور مولانا نعمانیؒ دونوں نے میری گزارش کو شرف قبولیت بخشا اور کنونشن میں شرکت کی دعوت کو قبول فرمایا۔ میں لکھنؤ کی کامیابی پر مسرور دہلی واپس ہوا اور جب میں نے مولانا حفظ الرحمن مرحوم اور ڈاکٹر سید محمود مرحوم کو ان دونوں علماء کرام کی شرکت پر آمادگی کی خبر سنائی تو یہ دونوں حضرات بھی بہت مسرور اور مطمئن ہوئے لیکن بد قسمتی سے یہ مسرت عارضی ثابت ہوئی۔

لکھنؤ کی مہم سر کرنے کے بعد میں نے جماعت اسلامی کے ارباب حل و عقد سے ربط قائم کیا۔ مولانا ابواللیث مرحوم اور محمد یوسف مرحوم سے بڑی تفصیلی گفتگو جماعت کے اس وقت کے مرکزی دفتر سوئیاں والاں میں رہی اور قرار پایا کہ جمعیت العلماء کی پالیسیوں اور طریقہ کار انداز فکر کے متعلق ارباب جماعت اسلامی کو جو شبہات و اختلافات ہیں ان کو رفع کرنے کے لئے اور کھلے دل سے تبادلہ خیال کرنے کی غرض سے جمعیت العلماء کے ارباب حل و عقد اور جماعت اسلامی کے نمائندوں کے درمیان مذاکرات منعقد ہوں، چنانچہ ماہنامہ برہان کے دفتر میں جو ایک طرح سے مولانا مفتی عتیق الرحمن کی قیام گاہ تھی اس غرض کے لئے ملاقاتیں، گفتگوئیں اور بحث و مباحث شروع ہوئے۔ مولانا حفظ الرحمن مرحوم اور مولانا مفتی عتیق الرحمن مرحوم جمعیت العلماء ہند کے نمائندے کی حیثیت سے اور مولانا محمد یوسف مرحوم اور محمد مسلم مرحوم مدیر ”دعوت“ جماعت اسلامی کے نمائندے کی حیثیت سے مذاکرات

میں شریک ہوئے۔ دو۔ تین دن تک کئی کئی نشستوں میں تبادلہ خیال اور بحث و مباحث کا سلسلہ جاری رہا لیکن بد قسمتی سے گفتگو ناکام ہو گئی۔ اس کے دوسرے دن ہی یہ خبر مقامی اخباروں اور نیشنل پریس میں شائع ہو گئی کہ جماعت اسلامی نے مسلم کنونشن کے اجلاسوں میں شرکت سے انکار کر دیا۔

اخباروں میں اس خبر کے شائع ہونے کے تیسرے چوتھے دن مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کا گرامی نامہ مجھے موصول ہوا جس میں مولانا نے تحریر فرمایا تھا کہ کنونشن میں جماعت اسلامی کے شرکت سے انکار کر دینے کی خبر اخباروں میں شائع ہونے کے بعد موصوف اور علی میاں باہم مشورہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جماعت اسلامی کے انکار کر دینے کی وجہ سے (۱) صورت حال بالکل بدل گئی ہے اس لئے ایسی حالت میں ان دونوں حضرات کی کنونشن میں شرکت، بھی سود مند و مناسب نہ ہوگی۔ اس اطلاع سے ہم سب لوگوں کو بہت

ہندوستان کی آزادی کے بعد اپنی نوعیت کا یہ پہلا کنونشن  
لوگوں کی سربراہی بھی حاصل تھی جنہوں نے جنگ آزادی میں کات  
لے کر بے مثال قربانیوں کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ جمعیت العلماء

الرحمن کی مجاہدانہ سرگرمیاں ان کے مخلصانہ کردار کا لوہا سارے ملک سے منواتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمن کی کوششوں سے کنونشن ہر طرح نہایت کامیاب رہا اور کنونشن کے صدر ڈاکٹر سید محمود جو جاوہر لال نہرو کے ساتھی اور دوست تھے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری رہ چکے تھے اور متعدد بار جنگ آزادی کے دوران قید و بند کی سختیاں اٹھا چکے تھے کنونشن کے صدر تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اسی کنونشن میں اپنا وہ تاریخی خطبہ صدارت پڑھا تھا جس میں انھوں نے واضح الفاظ میں بلا خوف اور بغیر جھجک کے فرمایا تھا کہ کانگریس کی حکومت کے غیر انصافانہ اور تفریقانہ رویہ اور بعض چوٹی کے کانگریسی لیڈروں کی تنگ نظری نے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے

(۱) یہاں محترم معصوم نگار کے بیاں میں کچھ تسامع معلوم ہو رہا ہے۔ راقم الحروف (عتیق الرحمن) اس موقع کی مشاورتوں میں عواما شریک رہا تھا، اسکی یادداشت کے مطابق نیشنل اخبارات میں واقعہ یوں بیاں کیا گیا تھا کہ جماعت اسلامی کو شریک نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور حضرت مولانا علی میاں یاد اللہ ماجد (مولانا نعمانی) کی طرف سے عدم شرکت کا فیصلہ بھی اسی صورت میں حق بجانب ہو سکتا تھا، اسلئے کہ انکا نقطہ نظر یہ تھا کہ کنونشن کو پوری طرح مسلم نمائندہ کنونشن بنانے کی کوشش کی جائے۔ اور جماعت کو تریک نہ کرنے کا فیصلہ شاید اس لئے کرنا پڑا ہو کہ ان لوگوں کے یہاں اس وقت تک سیکولر ازم قطعی راسخ تھا اور کنونشن والے مرات اس سے احتیاب کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ (عتیق)

ہی ملک میں دوسرے درجے کا شہری بنادیا ہے۔ خطبہِ صدارت کے اس جملے پر جس کو قومی پر لیں نے نمایاں تشہیر دی تھی جو اہر لال نہرو ڈاکٹر محمود پر بہت برہم ہوئے تھے اور مسلم کنونشن کے وفد کی موجودگی میں دونوں میں کافی تو تومیں میں رہی تھی۔ کنونشن کے انعقاد کا مقصد ہی یہی تھا کہ کانگریسی حکومت کو جھنجھوڑا جائے اور ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ ہر میدان میں نامنصفانہ اور امتیازی سلوک کے نتائج و عواقب سے متنبہ کیا جائے۔ چنانچہ کنونشن کے اختتام کے بعد قومی اخباروں میں اس موضوع پر ہفتوں بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رہا۔

کنونشن کے انعقاد کے چند ہفتے بعد دہلی میں ڈاکٹر سید محمود سے جو میری ملاقات ہوئی اور کنونشن کی روداد اور اس کی تفصیلات پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے نہایت رازدارانہ طور پر مجھ سے فرمایا کہ اگرچہ بظاہر کنونشن بہت کامیاب رہا اور ایک حد تک اس کے خاطر خواہ نتائج بھی ظاہر ہوئے ہیں لیکن میں بالکل مطمئن نہیں ہوں اور کنونشن میں جماعت اسلامی کے نمائندوں اور مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی کے شریک نہ ہونے کا مجھے بڑا ملال ہے۔ ڈاکٹر محمود نے فرمایا کہ ملک کے حالات کا تقاضا ہے کہ ایسے تمام مسائل پر جو مسلمانوں کے مشترکہ مسائل ہیں سیاسی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر تمام مسلم رہنما ایک پلیٹ پر جمع ہوں اور ایسا لائحہ عمل بنائیں کہ مشترکہ مسائل میں باہمی اتفاق و تعاون سے اپنی اپنی جماعتی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے باہمی مشوروں سے مشترکہ پروگراموں اور لائحہ عمل کو مل جل کر عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ ۱۹۶۳ء میں مولانا حفظ الرحمن کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔

مولانا کے انتقال کی وجہ سے مسلم قیادت میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا اور جمعیتہ العلماء ہند شدید اختلافات انتشار اور اقتداری رسہ کشی کا شکار ہو گئی۔ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں ملک کے مختلف حصوں میں خاص طور پر مغربی بنگال اور بہار کے مختلف شہروں میں جن میں بطور خاص رانچی اور روڑکیلا وغیرہ کے بھیانک فسادات میں مسلمانوں کو بہت زیادہ جانی و مالی نقصان سے دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے ملک کی فرقہ وارانہ فضا کافی مکدر ہو گئی اور ان بھیانک فسادات نے مسلم قیادت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسی زمانہ میں میرا دہلی آنا ہوا اور میری ڈاکٹر سید محمود سے ملاقات ہوئی تو دوران گفتگو میرے لکھنؤ جانے کے ارادہ کا بھی ذکر آیا۔ جب میں ڈاکٹر صاحب مرحوم سے لکھنؤ جانے اور مولانا منظور نعمانی سے ملاقات کرنے کے پروگرام کا ذکر کیا تو ڈاکٹر سید محمود سن کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک مولانا منظور نعمانی کی تعریف و توصیف کرتے رہے اور انکی اصابت رائے اور سیاسی فہم و بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے سے فرمایا کہ جب میں مولانا

مرحوم سے ملوں تو ان کو تیار کروں کہ وہ مولانا علی کیاں کو آمادہ کریں کہ لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک ایسے اجتماع کا منصوبہ بنایا جائے جس میں سارے ہندوستان سے ہر طبقہ اور ہر ملک فکر کے نمائندوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور اس وقت کی ملک کی سیاسی اور فرقہ وارانہ فضاء کے پیش نظر اک ایسا لائحہ عمل بنایا جائے کہ مشترک ملی مفاد کے معاملات میں مل جل کر کام کرنے کی راہیں ہموار ہو سکیں۔

مولانا نعمانیؒ نے علالت اور تیز بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود جس انہماک اور دلچسپی سے تمام مسائل پر غور و فکر اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیا اس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا اور نہایت دیانت داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ یہ مولانا نعمانیؒ کی شخصیت تھی جس نے علی میاں کوندوہ میں اجتماع کے انعقاد کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کیا۔

۱۹۶۲ء کے وسط میں ندوۃ العلماء میں مسلمانوں کے ایک :

منصوبہ مسائل کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد تیار کر لیا گیا کر دیئے گئے کہ جمعیت العلماء ہند، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ اور اجتماع میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔ مولانا حفظ الرحمنؒ کے انتقال العلماء ہند شدید اختلافات کی آماجگاہ بن گئی تھی، مولانا اسعد مدنی اور مولانا منشی حسین الرحمن کے حامیوں کے علیحدہ علیحدہ گروپ بن گئے۔

چنانچہ ندوۃ العلماء میں منعقد ہونے والے اجتماع میں شرکت کا مسئلہ بھی جمعیت العلماء کے حلقوں میں نزاعی بن گیا تھا، مولانا اسعد مدنی کسی ایسے اجتماع میں جس میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو شرکت کے لئے مدعو کیا گیا ہو شرکت کرنا جمعیت العلماء کی قوم پرستانہ پالیسی کے مغائر سمجھتے تھے۔ مفتی عتیق الرحمنؒ مرحوم کا نقطہ نظر مختلف تھا، ان کا قول یہ تھا کہ ایسے مسائل جو تمام مسلم جماعتوں میں مشترک ہوں ان پر غور و فکر کرنے اور ایک مشترک لائحہ عمل بنانے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر تمام مسلم جماعتوں کا اکٹھا ہونا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بطور خاص فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر ریلیف اور امدادی کاموں میں اشتراک عمل سے وقت، صلاحیت اور مالی وسائل ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیں گے۔

مندرجہ ذکر باہمی تناؤ نے پیچیدہ شکل اختیار کر لی اور اس کے امکانات پیدا ہو گئے کہ جمعیت العلماء، ندوۃ العلماء میں منعقد ہونے والے اجتماع میں شرکت سے انکار کر دے۔ یہاں س نزاعی مسئلہ کے تصفیہ کے لئے جمعیت العلماء ہند کی محل عاملہ کا اجلاس ندوۃ العلماء کے کونٹ

کی تاریخ سے عین دو تین دن قبل لکھنؤ میں منعقد ہونا کا منصوبہ بنایا گیا، مجھے اس جلسہ میں شرکت کے لئے بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ اس صورت حال کے رونما ہونے کا سب سے زیادہ دکھ اور صدمہ مولانا منظور نعمانی مرحوم کو تھا چنانچہ مولانا مرحوم نے مجھے حیدر آباد خط لکھا اور اپنے دلی احساسات کا اظہار کرتے ہوئے نہایت پر زور الفاظ میں مجھے جمعیت العلماء کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت کرنے کی تاکید فرمائی خط کے علاوہ تار کے ذریعہ بھی شرکت کے لئے اصرار فرمایا۔ تاریخ مقررہ سے دو ایک دن قبل میں لکھنؤ پہنچ گیا۔

جمعیت العلماء کی مجلس عاملہ کی نشست ممتاز دارالیتامی امین الدولہ پارک میں منعقد ہوئی۔ ماحول میں کافی تناؤ تھا۔ گھنٹوں کے بحث و مباحثوں کے بعد خدا خدا کر کے مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا منظور نعمانیؒ نے جمعیت العلماء کے ارباب حل و عقد سے اور بطور خاص مولانا اسعد مدنی اور مولانا مفتی عتیق الرحمنؒ سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کر کے تمام نشیب و فراز کو واضح کیا اور ندوہ کے اجتماع میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کے لئے نہایت اہم اور بے مثال رول ادا کیا۔ مولانا کی اصابت رائے اور غیر جانبدارانہ رویہ کا سبھی احترام کرتے تھے اس لئے اس کھتی کو سلجھانے میں مولانا کی مساعی سے بڑی مدد ملی۔

جمعیت العلماء کے اس متفقہ فیصلہ کے باوجود دلوں میں شکوک و شبہات اور ذہنی تحفظات کا ماحول برقرار رہا اور باوجود سعی و کوشش کے اس کا ازالہ نہ ہو سکا جس کا اظہار آخر کار ندوۃ العلماء کے اجتماع کے افتتاحی اجلاس میں دونوں کے نمائندوں نے کھل کر کر ہی دیا۔ جس روز مسلم کنونشن کا افتتاحی اجلاس ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا اس روز کنونشن کے صدر ڈاکٹر سید محمود کے افتتاحی ارشادات کے بعد جب شرکاء اجتماع کی تقریریں شروع ہوئیں تو ایک بار جمعیت العلماء کے نمائندوں اور جماعت اسلامی کے نمائندوں میں ایسی گرما گرم بحثیں شروع ہو گئیں کہ ایک طرح سے تو تو میں میں کی نوبت آگئی یہاں تک کہ کنونشن کے اجلاس کو ملتوی کر دینا پڑا۔ اس بد بختانہ صورت حال نے ساری توقعات پر پانی پھیر دیا اور ہفتہ بھر کی کوششوں کو خاک میں ملا دیا۔

صدر جلسہ کے اجلاس کو ملتوی کر دینے کے بعد صورت حال کو سنبھالنے کے لئے باہم صلاح و مشورے شروع ہوئے۔ مولانا منظور نعمانیؒ اس موقع پر بھی نہایت فراست اور معاملہ فہمی سے کام لے کر دونوں جماعتوں کے نمائندوں سے علیحدہ علیحدہ گفتگوئیں کیں اور انہما

و تفہیم کے بعد اجلاس میں دونوں گروہوں کے نمائندوں کو شریک ہونے اور خوش گوار و پرسکون ماحول میں کنونشن کی کارروائیوں کو چلنے دینے پر آمادہ کر لیا۔ مزید برآں سہ پہر کو کنونشن کا اجلاس شروع ہوا، تو مولانا علی میاں نے نہایت موثر اور فکر انگیز خطاب کے ذریعہ متخاصمین کو غیرت دلائی اور ملت کو جگ ہنسائی سے بچنے کیلئے باہمی جزوی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر برادرانہ اور دوستانہ ماحول میں کنونشن کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے لئے بڑی الہامی تلقین فرمائی اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ندوۃ العلماء کا یہ تاریخی اجتماع نہایت پُر امن اور برادرانہ ماحول میں اختتام پذیر ہوا اور ایک متفقہ تجویز کے ذریعے مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔

یہ مولانا نعمانی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کنونشن میں جمعیت العلماء کا حصہ لیا گیا۔  
کے درمیان تناؤ اور کشمکش کے ماحول کے باوجود مجلس مشاورت گرامر مباحث کے بعد منظور کی جاسکی۔  
مولانا منظور نعمانیؒ نہایت بالغ نظر، متبحر اور راسخ الہامی اور ملکی امور میں سیکور اور غیر فرقہ وارانہ نظریہ فکر کے  
مجلس جماعت اسلامی ہند کے برخلاف وسیع الخیال سیاسی مسلک ہی کو آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے مناسب اور سودمند سمجھتے تھے اور اپنے اس مسلک کا اظہار برملا کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔

میری مرحوم بیٹی حمیرا مولانا مرحوم سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی، بڑی شفقت، محبت اور پیار سے اس کو دینی مسائل سمجھاتے اور اس کے سوالات کے جوابت دیتے، اس کے انتقال پر مولانا مرحوم نے جو تعزیت کا خط تحریر فرمایا تھا اس نے ہم غم زدہ ماں باپ کے زخموں پر مرہم کا کام کیا تھا، میری اہلیہ بھی مولانا کی بڑی معتقد تھیں، نہایت ذوق و شوق سے ان کی تصنیفات پڑھتی تھیں جس کا سلسلہ اب بھی باقی ہے، جب کبھی مولانا تشریف لاتے تو بڑی عنایت اور شفقت سے اُن سے گفتگو کرتے اور پند و نصیحت سے سرفراز فرماتے۔

ایک خط جو مولانا نعمانیؒ نے میری اہلیہ کے عریضہ کے جواب میں تحریر فرمایا تھا اس مضمون کے جزو کے طور پر پیش کر رہا ہوں، اس گرامی نامہ میں مولانا نے میری اہلیہ کو جو دینی و فقہی مشورہ دیئے ہیں اس سے پڑھنے والوں کو استفادہ کا موقع ملے گا اور یہ اندازہ لگانے میں



آسانی ہوگی کہ کس طرح ایک سچے، باعمل اور مصلح عالم دین کی طرح مولانا نعمانی نجی خط و کتابت میں بھی پند و نصیحت اور تبلیغ و تنذیر کو ملحوظ رکھتے تھے اور اللہ کے رسول کے ذریعے آئے ہوئے دین کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کے فریضہ کی انجام دہی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

بصمیم قلب دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان مخلصانہ خدمات کو قبول فرمائے اور اپنے خاص اور مقبول بندوں کے زمرے میں شامل کر کے اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔  
(آمین)

حضرت مولانا کا گرامی نامہ راقم کی اہلیہ کے نام

محمد منظور نعمانی

(پونا اور بلگام کے درمیان چلتی ٹرین سے)

۲۲ فروری ۱۹۶۸ء

محترمہ بہن سلام و رحمت!

۱۵ فروری کا مرحومہ اخلاص نامہ مجھے ۷۱ کو مل گیا تھا، ہر بڑے سفر سے پہلے میرا حال یہ ہوتا ہے جن کاموں سے فارغ ہونا اور جن حسابات کو صاف کرنا ضروری ہوتا ہے، روانگی کے وقت تک انہی میں مصروف رہتا ہوں، ڈاک کئی دن پہلے سے جمع ہوتی رہتی ہے جسکے جواب کا موقع سفر شروع ہونے پر ہی ملتا ہے۔ آپ کا خط میں نے پڑھ تو اسی دن لیا تھا اور ۱۸ کو جب یونس سلیم صاحب تشریف لائے تو ان سے ذکر بھی آگیا تھا۔ لیکن جواب کا وقت آج سے پہلے نہیں مل سکا۔ ۱۹ کی صبح کو میں بمبئی کے لئے روانہ ہوا اور اب ایسا ہوا کہ جو ضروری کام پہلے ختم کرنے تھے وہ میں نہیں کر سکا۔ بمبئی پہنچ کر کل شام تک ان میں مصروف رہا، الحمد للہ ان سے فارغ ہو کر بمبئی سے یہ سفر شروع کیا میں اس وقت بھٹکل جا رہا ہوں، انشاء اللہ ۲۶ کو پھر بمبئی واپس پہنچ جاؤں گا، پی فارم کا مرحلہ میرے سامنے تک طے نہیں ہو سکا تھا لیکن معلوم ہو گیا تھا کہ انشاء اللہ ہو جائے گا۔ اگر اللہ نے ایسا ہی کیا تو ۲۹ فروری کو روانہ ہو سکوں گا۔

بہت اچھا آپ کے لئے اہتمام سے مغفرت و رحمت کی دعا بھی کروں گا اور روضہ اقدس پہ صلوٰۃ و سلام بھی عرض کروں گا۔ دعاؤں کا کام آنا بالکل برحق ہے اور آخرت میں ہم

دیکھیں گے کہ بہت سے بندوں اور بندویوں کو دعائیں کہیں سے کہیں پہنچا دینگی لیکن اپنے عمل سے دعا کو تقویت پہنچانا ایک درجہ میں شرط ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو ایک رات ایک خادم صحابی کی خدمت سے بہت آرام پہنچا۔ آپ نے خوش ہو کر فرمایا ”سل“ (کچھ مانگنا چاہو تو مانگو) انھوں نے عرض کیا ”مرافقت کی التجو“ (جنت میں آپ کی رفاقت اور معیت چاہتا ہوں) آپ نے ارشاد فرمایا ”فاعنی علی کثرة السجود“ (پھر میری مدد کرو سجدوں کی کثرت سے، یعنی نماز زیادہ پڑھا کر) اس سے معلوم ہوا کہ حضور کی اس قسم کی دعاؤں کے لئے بھی عمل سے تقویت کی ضرورت کس درجہ میں تھی۔

خواتین کے لئے رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کی زیادہ تر غیب دی ہے۔ یہ دو چیزیں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، نماز اور اللہ کی رضا اور رحمت کی امید۔ اس کے احسن پر خرچ کرنا۔ پونس سلیم صاحب کے سرمایہ میں سے بھی آپ میں خرچ کریں گی اس کا ان کو اور آپ کو دونوں کو پورا پورا ثواب ادا کریں اور آپ سے منی آرڈر کریں تو ان کے اجر میں ذرہ تعالیٰ آپ کو ان کے برابر اجر اپنی طرف سے الگ عطا فرمائے گا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا صریح وعدہ ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کا اجر اس دنیا میں بھی عطا فرمایا جائے گا اور اس عاجز کا مسلسل تجربہ ہے صحیح نیت کے ساتھ جتنا خرچ کرنے کی توفیق مل جاتی ہے اللہ تعالیٰ ہاتھ کا ہاتھ کسی بھی راستہ سے اس سے زیادہ عنایت فرمادیتا ہے۔ اللہ سے تجارت کرنے والا کبھی خسارہ میں نہیں رہے گا۔ دور قریب کے رشتہ داروں میں اگر کچھ ایسے لوگ ہوں جنکی آمدنی کم اور مصارف زیادہ ہوں وہ مناسب سے مقدم ہیں، یہ ظاہر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ یہ زکوٰۃ یا صدقہ ہے، آپ تحفہ اور خدمت کے عنوان سے دینگی تو اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کا صدقہ ادا ہوگا۔

یہ سوچنا کون ضرورت مند ہیں اور اس کو کس طرح خوبصورتی سے پہنچایا جائے کہ اس کو اپنی کمتری کا احساس بھی نہ ہو ذہن و دماغ کی بہت بڑی عبادت ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
محمد منظور نعمانی

جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر

## تعاون کی اپیل

جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر ایک خالص علمی، تحقیقی، دعوتی اور فلاحی ادارہ ہے جو کہ حکومت جموں و کشمیر سے باضابطہ رجسٹرڈ ہے۔  
الحمد للہ! اس مرکز کو سر کردہ اہل علم و فضل کی سرپرستی حاصل ہے، دُنیا کے اہم علمی و دینی مراکز کے ساتھ اس کے گہرے روابط قائم ہیں۔

اس مرکز نے بہت سے اہم اور مفید علمی و تحقیکی ہاتھ میں لئے ہیں، جن کی تکمیل و استاعت پر ریکثیر خرچ ہونے کا تخمینہ ہے، نیز مرکز نے علمی نوادرات، مسودات، مخطوطات اور مطبوعات دِیگرہ کو محفوظ کرنے کا ایک بہت بڑا منصوبہ بھی ہاتھ میں لیا ہے۔

### اس ادارہ کے ساتھ تعاون کی دو صورتیں ہیں

- (۱) فراہمی سرمایہ
  - (۲) ریسرچ لائبریری کے لئے کتابوں کا ہدیہ۔ خاص کر قلمی کتابیں، تاریخی سندیں، دستاویزات اور پرانے رسائل و جرائد کی فائلیں آپ اس ادارہ میں محفوظ کرائیں، تاکہ ارباب ذوق اور ریسرچ اسکالراں سے استفادہ کر سکیں۔
- اہل علم اور اصحاب خیر دونوں طبقوں سے بھرپور تعاون و اشتراک کی درخواست ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنے عطیہ جات سے خود بھی تعاون کریں گے اور اپنے دوست و احباب کو بھی ادارہ کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ فرمائیں گے۔

والا حمر علی اللہ

ترسیل زر اور حط و کثات کا پتہ

Abdur Rahman Kondoo

محمد الرحمن کوندو

Director

ڈائریکٹر

Jammu & Kashmir Islamic Research Centre

جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر

Kokernbagh, P O Nowshahra,

کوکر باغ۔ پی او۔ نوشہرہ،

Srinagar 190011 (Kashmir)

سرینی گمر ۱۹۰۰۱۱ (کشمیر)

مولانا فرید الوحیدی

جدہ، سعودی عربیہ

## مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ

دن تاریخ تو اب یاد نہیں مگر اس بات سے کہ میری عمر اس وقت سات یا آٹھ سال کی رہی ہوگی، یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ ۳۵ء یا ۳۶ء کا زمانہ رہا ہو گا اپنے گھر میں ایک کتاب بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا اسے دیکھنے سے یہ مطلب کسی طرح نہیں نکلتا۔

چکی بات تو یہ ہے کہ پڑھنا لکھنا تو قاعدے قرینے سے بہتر تہتر ایک نعمت پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ کتاب اور کہ تھا تو دیوانگی کی حد تک شوق سے پڑھنے کی کوشش کئے بغیر ہاتھ

غرض نہیں تھی کہ کس موضوع کی کتاب ہے کیا مضمون ہے کیا لکھا ہے بس ایک سونہا بو پورا ہوتا رہتا تھا۔ وحیر حلیس فی الرمان کتاب۔ بیسیوں برس بعد یہ شعر پڑھا تو طبیعت باغ باغ ہو گئی، طبیعت کے اس انداز اور زندگی کے اس باب میں بڑے بڑے لطیفے گزرے۔ اس مضمون میں ان تفصیل کا موقعہ کسی طرح نہیں ہے۔ بات صرف یہ بتانی ہے کہ باپ دادا کے پاس ایک کتاب ”الفرقان“ بریلی مرتبہ محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ نظر پڑی۔ اپنی افتاد طبع کے مطابق بڑے شوق سے پوری ہی کتاب الٹ پلٹ کر ڈالی۔ کتاب کی پشت پر جو مضمون نظر آیا وہی تھا جو اس مضمون کا عنوان ”من انصاری الی اللہ“ ہے۔ یہ جاذب نظر تو تھا ہی مگر آج بھی خوب یاد ہے کہ اسکا ایک ایک حرف دل میں اترتا چلا گیا۔ والدہ مرحومہ روز سونے سے پہلے کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ان میں جو عناصر بار بار گوش گزار ہوتے تھے وہ ”مہاجر“ اور ”انصار“ کے الفاظ تھے یہ اسمائے مبارکہ نہ صرف یہ کہ سمجھ میں آ گئے تھے بلکہ یاد بھی ہو گئے تھے۔ اللہ کا نام تو دن رات حرز جاں اور ورد زبان تھا ہی اس طرح یہ آیت کا عنوان کسی قدر سمجھ میں آ گیا کچھ دنوں کے بعد اپنے والد صاحب مرحوم (۱) سے اسکا مطلب پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ کتاب نہیں بلکہ مہینہ کے

(۱) مضمون نگار کا تعلق حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے گھرانے سے ہے۔ حضرت کے حقیقی بیٹے مولانا حیدر احمد جو حضرت کے لیے مولانا

اولاد بھی تھے اور مالکی امدت کے زمانے میں آپ کے ساتھ امیر بھی رہے، فرید الوحیدی امی مولانا حیدر احمد صاحب کے فرزند ہیں۔

بہینہ شائع ہونے والا ایک ماہ وار رسالہ اور اسکے آخری صفحہ پر یہ مضمون نہیں بلکہ اشتہار ہے جس کا عنوان قرآن پاک کی یہ آیت ہے۔

یہی وہ پہلی تقریب تھی جس نے الفرقان اور اسکے فاضل مدیر سے ایک خاص قلبی تعلق پیدا کر دیا جو وقت اور عمر کے ساتھ بڑھتا رہا اس دوران میں جب میری دیوبند میں تعلیم کا کل ابتدائی دور تھا۔ لوگوں سے سنا کہ مولانا منظور صاحب تشریف لارہے ہیں۔ میں تو ”انصارِ اللہ“ میں شریک تھا ہی دارالعلوم دیوبند کے بہت سے طلبہ میں بھی مولانا سے ملاقات کا شوق یکھا۔ مولانا تشریف لائے تو حیرت ہوئی کہ الفرقان کی اتنی طویل صحبت کے نتیجہ میں جو شکل شامل اور شبہات اور شخصیت ذہن میں مولانا کی مرتسم ہو گئی تھی وہ اس سے تو بالکل ہی مختلف نکلے۔ نہ جبہ و دستار، نہ عصا، نہ تسبیح بس ایک سادہ سی مولویانہ اور مومنانہ شخصیت، ڈھیلا ڈھالا مدرسوں والا کرتا، سید ہاپا جامہ، دستار کی جگہ ایک معمولی سا رومال، سیاہ داڑھی اور جوانی کی عمر، لہجیت خوش بھی ہوئی اور یہ ہمت بھی ہوئی کہ ان سے بات بھی کی جاسکتی ہے اور ان کے قریب جگہ بھی مل سکتی ہے۔ اپنی عمر کا وہ دور شروع ہو چکا تھا جب رسائل اور جرائد کے مضامین روائی و رد لکھنے سے سمجھ میں آنے لگے تھے مولانا سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ صوفیانہ اور اعظانہ طرز کے خشک مزاج اور شدت پسند نہیں ہیں بلکہ دینی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اور نوجوان طلبہ کے ساتھ تفہیم و تفہیم کرتے ہوئے زبردستی کے بجائے کشادہ روی اور فراخ دلی کے ساتھ اپنی بات مخاطب کے دل میں اتار دینے کا سلیقہ رکھتے ہیں اگر کوئی بری بات ہو تو اللہ معاف کرے مگر اس وقت میرے دل میں یہی خیال آیا کہ ”زائد خشک“ ہونے کے بجائے مولانا منظور صاحب ”روشن خیال“ عالم ہیں۔ نوجوانوں سے شکفتہ زبان میں بات کرتے ہیں۔ مونیوں کے ساتھ انکی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور علماء کے ساتھ ان کے معنی و معنی طرز میں مخاطب کرتے ہیں طلباء اور علماء کے ایک مجمع سے خطاب کیا تو واعظانہ اور خطیبانہ عبارات آرائی کے بجائے سلیس اور دل نشیں اسلوب میں گفتگو کی۔ حاضرین میں اکثر لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ مولانا ذاتی طور پر اسی سے مخاطب ہیں۔

اسی زمانے کے آس پاس یہ شہرت سنی کہ بڑے صف شکن اور زلزلہ انگن مناظر مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب چاند پوری مشہور مناظر تھے ایسے کامیاب کہ لوگ انکو ابن شیر خدا علی مرتضیٰ مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب کہتے اور لکھتے تھے۔ افسوس کہ صغر سنی اور کم نمائی کی بنا پر مولانا موصوف کے علمی منصب سے واقف اور مستفید نہیں ہو سکا۔ مگر مولانا منظور

صاحبؒ کی مناظرانہ قابلیوں اور کامیابیوں کا غلطہ جب بلند ہوا تو مجھے کسی قدر شعور آچکا تھا۔ ان مناظروں کے جو حالات میں پڑھتا تھا اور اہل علم حضرات کی جو رائے سنتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ مولانا کے مباحث اور مناظروں میں الزامی اور الجھے ہوئے جوابوں کے بجائے علمی اور تحقیقی رنگ غالب ہوتا تھا اور یہی ایک وجہ تھی کہ پیشہ ور مناظرین اور مخالفین کا کوئی حربہ اور حملہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ میں کامیاب نہیں سنا گیا۔ علمی اور تحقیقی زندگی کی بالکل ابتداء سے اعدائے اسلام اور فرق باطلہ کے مقابلہ اور مباحثہ کے جذبات مولانا کے دل میں موجزن ہو گئے تھے۔

”اس عاجز نے بریلوی فتنے کے خلاف دیوسد کے رہائے غالب علمی ہی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ ماتی دونوں فتنوں، قادیانیت اور آریہ سماجیت کے مقابلہ کا داعیہ اور اسکی صلاحیت بھی معلوم ہوا۔ دارپوں کے ساتھ ان سب کے ساتھ بھی عماد آرائی میں حصہ لینا شروع کرنا۔ مقابلہ میں کامیاب و سر فراری نہیں کیا بلکہ اس میدان میں حوثیق اس سے وعدہ مقبول بندوں کی نگاہ میں میرے لئے وسیلہ اختیار و اعزاز بھی بنا دیا“ (۱)

بات بڑی ہے اور چھوٹے منہ سے اچھی بھی نہیں لگتی مگر فرق باطلہ اور اعداء دین کے مقابلہ میں جو مجاہدانہ، مخلصانہ اور مومنانہ خدمتیں مولانا نے اپنی ساری زندگی میں انجام دی ہیں وہ مجاہدین اسلام اور جاں نثاران حق کے گروہ میں آپ کو بڑے امتیازی اور خصوصی درجہ پر فائز کرتی ہیں۔ افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان حائر۔ یہ بات غور کرنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ اسوقت کے معاندین حق میں زیادہ تر جماعتیں اور فرقے وہ تھے جن کو اسوقت کے سلطان جائز کی تائید اور مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ بریلویت، قادیانیت، فرقہ واریت، کیسی کیسی عداوتیں، مخالفتیں اور طاغوتی طاقتیں تاک لگا لگا کر حملہ آور ہوتی تھیں۔ سنبھل سنبھل کر نشانہ لگاتی تھیں مگر ایک مرد درویش انکے مقابلے میں تنہا ساٹھ ستر برس تک نبرد آزما رہا۔ ع۔ ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلارہا تھا وہ مرد درویش جسکو حق نے دیئے تھے انداز خسروانہ افسوس کہ ان مناظروں اور مقابلوں کا کوئی مرتب اور مفصل مجموعہ موجود نہیں ہے۔ بہت پہلے کی کوئی کتاب ’صاعقہ آسمانی بر فرقہ رخصاخانی‘ دیکھنی یاد آتی ہے ممکن ہے اب بھی کہیں دستیاب ہو جائے۔

(۱) ’تحدیثِ نعمت‘ مرتبہ مولانا عتیق الرحمن نعمانی، ص ۳۸، مطبوعہ القرآن پبلشرز لاہور

ایک بڑی اہم بات قابل توجہ یہ ہے کہ ”الفرقان“ محض ایک ماہوار رسالہ نہیں بلکہ ایک مستقل اور مکمل تحریک تھی جسے وقت کے اکابر امت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان بزرگوں نے اعلان کیا تھا کہ الفرقان ایک دینی اور علمی تحریک ہے۔ تبلیغ دین حق اور تائید اہل سنت نیز ردِ مفرق باطلہ اسکا مقصد ہے۔ امت کے افراد و اعیان سے امید کی جاتی ہے کہ اسکی آواز شہر شہر اور قریہ قریہ پہونچا کر حق کی نصرت اور مدد کریں۔ جن اسلاف و اکابر کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا انکے نام بھی سن لیجئے۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علماء ہند، شیخ الحدیث والنفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی صدر مجلس احرار، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری امیر انجمن خدام الدین لاہور، حضرت مولانا مفتی محمد مقیم صاحب لدھیانوی، مناظر اسلام مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، حضرت مولانا محمد طیب صاحب ”مہتمم دارالعلوم دیوبند“ مناظر اسلام مولانا اسعد اللہ صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، حضرت شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی۔ (۱)

قصہ مختصر یہ کہ انھوں نے دین و مذہب کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں انکی تفصیل تو ”الفرقان“ ہی کے صفحات بیان کر سکتے ہیں۔ ان چند صفحات اور محدود وقت میں اسکی گنجائش کہاں سے نکالی جائے کہ ساٹھ ستر برس کی طویل اور جاں کاہ خدمات کے تذکرہ کا حق ادا کیا جائے۔ پھر بھی دو چار کارہائے نمایاں پر ایک طائرانہ نظر تو ڈالتے ہی چلے۔

سبھی جانتے ہیں کہ بریلوی اور بدعتی مذہب ایمان و توحید کے خلاف ایک مہلک اور خاموشی سے سرایت کر جانے والا زہر ہے۔ ابتدائی حالات میں اس کا اندازہ بہت کم ہوتا ہے مگر جب اسکی جڑیں شرک اور کفر تک پہونچ جاتی ہیں تب یہ سرطان ناقابل علاج ہی ہو جاتا ہے۔ ابھی ایک آدھ صفحہ پہلے گذر چکا ہے کہ مولانا محمد منظور صاحب نے اس فرقہ کے خلاف بالکل ابتداء سے پوری تندہی اور بے جگری کے ساتھ علم جہاد بلند کیا اور اسکے مقابلہ میں شمشیر برہنہ ہو کر میدان میں اترے۔ اسکے خطرناک نتائج سے عام مسلمانوں کو گھر گھر جا کر خبردار کیا۔ اسکے اعیان و مبلغین کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کیا۔ اسکے رد میں مضامین، کتابیں اور رسالے شائع کرتے رہے اور اس راستے میں ایسی قربانیاں دیں کہ آخر کار اسکی جڑیں ہلا کر ہی دم لیا۔ اسکے علاوہ

ایک معرکہ اور بھی سنئے۔ پچاس ساٹھ برس پہلے کی بات ہے کہ ملک میں عنایت اللہ مشرقی نامی ایک صاحب نے گمراہی اور باطل افکار پھیلانے کا کام بہت تیزی سے شروع کیا۔ اپنی اس تحریک کا نام انھوں نے جماعت خاکسار رکھا مگر عوام اسے پیچھے پارٹی کے نام سے پکارتے رہے۔ شروع شروع میں یہ ایک سیاسی اور عسکری جماعت نظر آتی رہی۔ مگر بہت جلد ایک خاص طبقے میں شہرت اور مقبولیت کے زور پر اس جماعت نے اسلام کے بنیادی عقائد پر بھی ہرزہ سرائی شروع کر دی۔ پہلے تو علمائے حق اور مصلحین امت نے اسکی طرف کوئی توجہ نہیں دی مگر جب دیکھا کہ آہستہ آہستہ یہ سائے امت کی دیواروں تک پہنچنے لگے تب انکی آنکھیں کھلیں اور اس پاک اور مقدس جماعت نے اسکے سد باب کیلئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ’الفرقان‘ بھی اس فریضہ کی ادائیگی میں مکمل طور پر شریک رہا۔

”خاکسار تحریک کا مسئلہ اسوقت مسلمان ہند کے اہم“

ہے۔ وہ اس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ اگر چندے کی رفتار رہی تو یہ

مصر توں اور ملت پر مرتب ہوئے والے اسکے مہلک اثرات اور نتائج

ہیں تو قریب بہ محال ضرور ہو جائے گا“ (۱)

یہ چند الفاظ مولانا نے اس خطرہ کے مہلک اثرات کے بارے میں لکھے اور اسکے ساتھ ہی اسکے خلاف الفرقان کی جدوجہد کا تذکرہ ہمیں ان الفاظ میں ملتا ہے

”میری تعلیم دارالعلوم دیوبند کی تھی اور اس سے پہلے جن دوسرے مدارس میں پڑھا

تھا ان کے اساتذہ بھی دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ تھے، اسی وجہ سے میرا یہاں دس دی تھا تو

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اثر سے اور پھر خلافت تحریک سے جماعت دیوبند کا بن گیا تھا۔

اسی بنا پر شروع سے جمعیۃ علماء سے تعلق رہا“ (۲)

ہندوستان کی سیاست میں مولانا کا ایک خاص مسلک تھا۔ فکر اور ذہن کے اعتبار سے وہ

آزادی اور اسکے لئے مشترکہ ہندو مسلم جدوجہد کے حامی تھے

خوب سمجھ لیجئے کہ جمعیۃ علماء ہند نہ صرف آل انڈیا کانگریس سے ہم آہنگ تھی بلکہ متحدہ قومیت کی زبردست حامی تھی۔ لیکن مولانا کا تعلق محض ذہنی اور فکری موافقت تک محدود تھا۔ عملی



سرگرمیوں، سیاسی کانفرنسوں اور دھواں دھار تقریروں اور دوروں سے بالکل ہی الگ تھا۔ اسلئے کہ مولانا کی زندگی اور اسکی تنگ و دو ساری کی ساری ہمیشہ دینی خدمات اور اسلامی تحریکات کیلئے وقف رہی۔ لیکن آزادی اور تقسیم کے نتیجہ میں جب مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا اور انکی دینی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی تباہ کرنے کے پروگرام بننے لگے تو مولانا تعمیلی اقدام سے الگ نہ رہ سکے اور سب سے پہلے آپ نے اپنے رفقاء کے ساتھ دینی تعلیم کی اشاعت اور جدوجہد کا پروگرام بنایا۔ یہ اسکیم بڑے زور و شور سے چلی اور گاؤں گاؤں، گھر گھر اسکی آواز پہونچی اور پورے مشرقی یوپی میں قصبات و دیہات میں دینی تعلیم کے مدارس و مکاتب قائم ہو گئے۔ بعد میں وہ ابتداء والی سرگرمی اگرچہ باقی نہیں رہی تاہم ابھی تک پوری طرح جان باقی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی مرد خدا غیب سے برآمد ہو اور ایک کام کر جائے۔ اسی سلسلے کی کڑیاں مجلس مشاورت کا قیام اور ہفتہ وار 'ندائے ملت' کا اجراء تھا۔ مجلس کا انعقاد دوسرے بعض اکابر کے ساتھ مولانا منظور صاحب کا بڑا کارنامہ تھا۔ اور 'ندائے ملت' مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی زیر ادارت جاری ہوا تھا۔ قانونی طور پر تو معلوم نہیں مگر ذاتی طور پر میں نے دیکھا تھا کہ یہ اخبار بھی مولانا نعمانی ہی کی زیر نگرانی شروع ہوا تھا۔ ابھی حال میں مولانا عتیق الرحمن کے الفرقان میں شائع شدہ اداریوں کا ایک مجموعہ 'راستے کی تلاش' شائع ہوا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ مجموعہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں چھپے اور ہندوستان کے ہر مسلمان کے ہاتھ میں پہونچے۔ یہی نہیں بلکہ راستے کی اس تلاش کیلئے ان مضامین میں اشارہ کئے ہوئے لائحہ عمل کی بنیاد پر ایک ہندستان گیر تحریک چلائی جائے۔ کچھ بعید نہیں کہ مسلمان انگریزائی لیکر اٹھ کھڑا ہو اور یہ خستہ و درماندہ قافلہ منزل کی طرف ایک بار پھر گامزن ہو جائے۔

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے  
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

الفرقان کے ان اداریوں کا تذکرہ اسلئے سامنے آگیا کہ اگر ندائے ملت کے مقالات اور اداریوں کو اسی طرح جمع کر کے شائع کیا جائے تو شاید بڑی بیداری کا سبب ثابت ہو۔

مولانا منظور صاحب کی تالیفات اور مقبول عوام و خواص تصنیفات 'اسلام کیا ہے؟' 'معارف الحدیث' 'تذکرہ مجدد الف ثانی'، 'آپ حج کیسے کریں؟' وغیرہ وغیرہ کم و بیش چالیس

کتابیں اس قابل ہیں کہ اس مضمون میں انکے تعارف کا پورا پورا حق ادا کیا جائے۔ مگر بات نکلے گی تو پھر بہت دور تک جائیگی۔ قلم کو روکا نہ جائے تو لہزید حکایت طویل تر ہوتی جائیگی۔ کسی طرح صفحات اور وقت کی گنجائش میں کھینچ تان کر بھی لی جائے تو قارئین کے صبر کے پیمانہ پر کیسے قابو پایا جائے۔ ۷

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر

بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ ذکر یہ تھا کہ بچپن میں الفرقان کے آخری صفحہ پر اس آیت مں انصاری الی اللہ کے ساتھ جو اپیل کی گئی تھی اسکی حلاوت و بلاغت ذہن پر آج تک اسی طرح تروتازہ ہے۔ ہزاروں اعلانات نظر سے گزرے اور سیکڑوں اشتہارات پڑھے مگر ایسا موثر اور بلیغ اعلان دیکھنا یاد نہیں آتا۔

ایک آخری حکایت رہی جا رہی ہے۔ حضرت مولانا عاجز پر کیسی عجیبی شفقت فرماتے تھے، کتنی محبت کرتے تھے، یہ تدبیریں چاہتا ہے کہ پورا قصہ صفحات قرطاس پر الٹ دیا جائے مگر درمدخ خود کی قباحت بھی ہے۔ بزرگوں کے احوال میں بعض مضامین اور سیریں مولفین نے گھما پھر کر سارا قصہ اپنی ہی تعریف اور بڑائی پر ختم کر ڈالا ہے اسلئے اس باب کو یہیں تہہ کر دینا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی کوئی تاریخ تھی جب مجھے حضرت مولانا منظور صاحب نعمانیؒ کی زیارت سے آخری بار مشرف ہونے کا موقع ملا۔ حالت دیکھ کر دل پر شدید صدمہ گذرا، ہلنا جلنا مشکل تھا، مجھے دیکھ کر بیتاب ہو گئے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اٹھ کر بیٹھنا چاہا مگر اتنی سکت کہاں تھی۔ اشارہ سے بیٹھنے کی خواہش کی۔ خدام نے مشکل سے بٹھایا۔ میرے ہاتھ چومے، میرے سر پر ہاتھ رکھنا چاہا مگر ہاتھوں میں یہ طاقت بھی نہ تھی۔ میں نے سر جھکا کر ہاتھوں کے قریب کر دیا اور آخر کار یہ نعمت نصیب ہو گئی۔ بات کرنی چاہی مگر آواز نہ نکلی۔ دماغ نے سوچا کہ آج اچھی طرح زیارت کر لو، آئندہ یہ مقدس اور مبارک چہرہ دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو، ہاتھوں اور پیشانی کو جی بھر کر بوسہ دے ڈالا کہ پدرانہ شفقت کا یہ لمحہ پھر ملے یا نہ ملے۔

گلوں کو دیکھ لے جی بھر کے بلبل

خبر کیا پھر بہار آئے نہ آئے

گلوں کو دیکھ لے جی بھر کے بلبل  
خبر کیا پھر بہار آئے نہ آئے

مگر دل نے کہا کہ ایسا نہ ہو گا، اللہ نے چاہا تو سال بھر بعد پھر زیارت ہوگی، بہر حال کسی نہ کسی طرح دکھے ہوئے دل سے رخصت ہونا ہی پڑا، یہ آنکھیں کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب کو روتی ہیں۔ اس دل نے کتنی عظیم الشان ہستیوں کا ماتم کیا ہے۔ مگر مولانا کے وصال سے تو ایسا معلوم ہوا کہ سر پر سے آسمان ہی ہٹ گیا ہوا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی  
ایک شمعِ رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

لکھنؤ سے واپسی کے دس ہی بارہ دن کے بعد اطلاع ملی کہ مولانا اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ رد اللہ مصححہ واسکھ اللہ فی اعلیٰ حیاتہ — سدا رہے نام اللہ کا۔

# SCAN

(System Consultancy & Application Network)

- ❖ **ACE** (Academy of Computers & Education)
- ❖ **HARD** (Hardware Assembly, Research & Development)
- ❖ **MAS** (Marketing & Advertising System)
- ❖ **DATA TEAM**

- ☆ Computer Hardware/Software Training
- ☆ Computer Repairing, Maintenance & Sales
- ☆ Data Processing
- ☆ Authorised Dealer of InPage (Urdu) Software (ایک مکمل اردو پبلشر)

A Block, 11nd Floor, Karamat Market, Nishatganj, Lucknow Ph. . 331608 Fax . 338573

نوٹ - ان بیج اردو سافٹ ویئر کے سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے رجوع کریں

پاگہر نمبر : 9628-549485

صوفی رحمت اللہ صاحب (۱)

مظہر العلوم، ٹوگلیاں۔ بہرائچ

## مال باپ سے زیادہ شفیق

حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کا حادثہ ہم لوگ ہے، حضرت کی رحلت سے ہم لوگ یتیم ہو گئے۔ کوئی باپ اپنے بیٹے طرح کی خیر خواہی، دینی ہو یا دنیاوی نہیں کر سکتا، جتنی خیر خواہی ملاقات پر خوش ہوتے، محبت سے پیش آتے، گھریلو حالات یہاں تک کہ کھیتی باڑی کے حالات دریافت فرماتے، بچوں کی تعلیم کے بارے میں اور مدرسہ کے بارے میں پوچھتے، اس کے بعد دعائیں دیتے، نچی، یا مدرسہ کا کوئی اہم کام یا ضرورت بتلاتا تو فوراً ہاتھ اٹھا دیتے، اور خوب الحاح وزاری کے ساتھ دعا مانگتے جو کام مشورہ طلب ہوتا اس کے لئے مشورہ دیتے اور فرماتے، حافظ جی سے مشورہ کر لینا (مراد حافظ محمد اقبال صاحب مدظلہ مہتمم مدرسہ فرقانیہ گوئڈہ)۔

حضرت مولانا کے تعلق سے پہلے ہم لوگ شرک و بدعات و خرافات میں مبتلا تھے۔ یہاں تک گمراہی تھی کہ ہمارے والدین، دادا، پردادا، تعزیہ رکھتے، گاؤں اور قرب و جوار میں محرم کے دنوں میں تعزیہ کا بہت اہتمام کرتے، محرم میں جو باجے بجاتے ہیں اس کا بھی انتظام رکھتے تھے، والد صاحب دو دو حول، دو جوڑ بھانجھ، اور دو تاشے رکھتے، گاؤں کے لوگوں کو یہ سب بجانے کے لئے دیتے، ہمارے دادا اور والد صاحب اور پورا خاندان سلون کے پیر صاحب سے مرید تھے، یہ سال میں ایک بار ضرور آتے، اور ہفتہ عشرہ ہمارے اسی چوپال میں ٹہرتے اور شرک و بدعت کی تعلیم دیتے، ایک مرتبہ یہ پیر صاحب آئے تو والد صاحب نے اسی چوپال میں ان کی

یا۔

(۱) صوفی صاحب حضرت مرحوم کے وابستگان دامن میں سے ہیں، ان کا مضمون اس رشتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھنا چاہئے۔

چارپائی بچھادی، جہاں آدھے چوپال میں تعزیہ رکھا تھا پیر صاحب نے دیکھا کہ تعزیہ زمین پر رکھا ہے۔ والد صاحب پر بہت خفا ہوئے اور ڈانٹ کر کہا تم نے تو غضب کر دیا، امام حسین کو زمین پر رکھا ہے اور ہم کو چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہہ رہے ہو، بہر حال چارپائی کھڑی کر دی گئی، جاڑے کا مہینہ تھا، پیال زمین پر ڈالا گیا اور پیر صاحب کا بستر زمین پر لگایا گیا۔

بہرائچ میں مدرسہ نور العلوم اور نور العلوم کے بانی حضرت مولانا محفوظ الرحمن نامی رحمۃ اللہ علیہ کو ہمارے والد صاحب جانتے تھے، مگر ان پیر صاحبان نے بدظن کر رکھا تھا، اور بتلاتے رہتے تھے کہ مدرسہ نور العلوم مت جانا، یہ لوگ گمراہ ہیں، یہ بزرگوں کو نہیں مانتے، اللہ تبارک تعالیٰ مولانا محفوظ الرحمن نامی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کو نور سے بھر دے، جنھوں نے مدرسہ نور العلوم قائم کر کے علم کی شمع روشن فرمائی، اور بہت سے علماء تیار ہوئے، مدرسہ نور العلوم ہی کے فارغین میں ایک مولانا عبدالرحیم تھے جن سے ہم لوگوں کا تعلق ہوا، اور وہ ہمارے یہاں تشریف لانے لگے، ان سے کچھ دین کی روشنی معلوم ہونے لگی، ان مولوی صاحب سے بہت تعلق ہو گیا، یہ مولوی صاحب بہت بااخلاص اور ملنسار تھے اور بہت ہی محبت سے بات کرتے تھے، ہمارے والد صاحب بھی ان سے بہت متاثر اور مانوس ہو گئے، بدعتی پیروں کی قلعی کھانے لگی، پیر صاحب سے بدظنی پیدا ہوئی، مولوی عبدالرحیم صاحب سے مشورہ کیا گیا کہ ہم لوگوں کو کوئی صحیح پیر بتلائیں۔ یہ مولوی عبدالرحیم اس وقت ضلع بستی میں کسی مدرسہ میں پڑھاتے تھے، اور اس علاقہ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کئی بار تشریف لے گئے تھے، حضرت مولانا نعمانی صاحب سے مولوی عبدالرحیم بہت متاثر تھے، انھوں نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ مولانا نعمانی صاحب سے بیعت ہو جائیں، بتلایا کہ علماء تو اور بھی بہت ہیں مگر آپ لوگوں کو نعمانی صاحب سے بہت فائدہ ہوگا، کہ آپ لکھنؤ رہتے ہیں اور وہاں تبلیغی مرکز ہے، جماعتوں سے بھی جوڑ ہو جائے گا، علاقہ میں دین کا سلسلہ چل پڑے گا۔

ہم نے مولانا عبدالرحیم صاحب سے گزارش کی کہ آپ مولانا نعمانی صاحب سے ملاقات کرادیں، انھوں نے کہا کہ مولانا مدرسہ فرقانیہ گوٹہ تشریف لاتے رہتے ہیں، مدرسہ فرقانیہ مولانا کی آمد کا پروگرام معلوم کر کے بتلائیں گے، چند دنوں کے بعد مولانا عبدالرحیم صاحب گھر تشریف لائے، اور یہ خوشخبری سنائی کہ گوٹہ مدرسہ فرقانیہ میں کانفرنس ہونے والی ہے، انیسویں ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کرام تشریف لائیں گے تو انیسویں حضرت مولانا نعمانی صاحب ضرور تشریف لائیں گے، اور مزید یہ بھی فرمایا کہ حافظ محمد اقبال صاحب جو مدرسہ

فرقانیہ میں درجہ حفظ کے استاذ ہیں حضرت مولانا نعمانی صاحب کا حافظہ جی سے بہت تعلق ہے۔ آپ لوگ پہلے حافظہ جی سے ملاقات کر لیجئے گا، وہ مولانا سے ملا دیں گے۔ کانفرنس کی تاریخ آئی ہم کوئی آدمی گونڈہ حاضر ہوئے، اس کانفرنس میں قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالوفاء صاحب، مولانا محمد قاسم شاہجہاں پوری، مولانا محفوظ الرحمن نامی، ناظم مدرسہ نورالعلوم بہرائچ، اور بہت سے علماء تشریف لائے تھے، اس زمانہ میں مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے مہتمم مولانا افضال الحق صاحب تھے، اس وقت مدرسہ فرقانیہ میں مسجد نہیں تھی، مدرسہ سے پورب تھوڑی دور پر مسجد تھی، عصر کی نماز کے وقت جب سب لوگ نماز کے لئے مسجد جانے لگے، تو ایک صاحب سے معلوم کیا کہ:

محمد اقبال صاحب کون ہیں، انھوں نے بتلایا کہ وہ حافظ صاحب ہیں  
کیا تمہ نماز کے لئے جا رہے ہیں، آگے بڑھ کر حافظہ جی سے بات کی  
سے بات کی، اور فرمایا کہ مغرب سے پہلے یا بعد میں ہم سے مل لینا، جا  
بات کیا، حافظہ جی نے فرمایا کہ ہم نے مولانا صاحب سے بات کر لیا ہے

فجر کی اذان سے قبل آجائیں ہم اور حاجی رحمت اللہ صاحب ثانی اور عظیم اللہ ماموں اسی وقت پہنچ گئے حضرت نے بیعت فرمایا، بہت دیر تک دعائیں دیں، کچھ ہدایتیں کیں، کچھ تسبیحات پڑھنے کی بتلائیں، اور فرمایا کم سے کم مہینہ میں ایک خط اپنی حالت لکھ کر بھیج دیا کرنا، اور ہمارے یہاں مرکز میں آنے کی کوشش کرنا، اور پتہ بھی نوٹ کرادیا۔

ہم نے اور بھائی رحمت اللہ صاحب ثانی نے مرکز چانا شروع کر دیا، دین کی باتیں معلوم ہونے لگیں، تعزیہ اور محرم میں جو بدعتیں و خرافات ہوتی تھیں، ان سے نفرت ہونے لگی، والد صاحب اور گاؤں گھر کے لوگ دین سمجھنے لگے، ایک دن وہی پیر صاحب سلون والے آئے، میں کہیں گیا ہوا تھا، والد صاحب نے پیر صاحب کو ادب و احترام سے بٹھایا، اور پیر صاحب سے ہماری ساری داستان کہہ سنایا، والد صاحب نے کہا کہ رحمت اللہ لکھنؤ جاتے ہیں، ایک وہاں مولانا ہیں ان سے ملتے ہیں، وہ ان کو بہت چاہتے ہیں، وہاں جماعت کا کام ہوتا ہے، رحمت اللہ بہت باتیں دین کی سیکھ کے آئے ہیں، اور بتلاتے ہیں، والد صاحب نے اپنے سیدھے پن سے سب پیر صاحب سے کہہ سنایا، والد صاحب نے سمجھا تھا کہ پیر صاحب رحمت اللہ سے خوش ہو جائیں گے، لیکن اسکا الٹا ہوا، یہ سب سننے کے بعد پیر صاحب بہت خفا ہو گئے، اور والد صاحب کو بہت ڈانٹا اور بہت

غیظ و غضب میں ہو کر والد صاحب پر برستے رہے، اور کہتے رہے کہ تیرا لڑکا گمراہ ہو گیا، وہابی ہو گیا، اب تو تباہ ہو جائیگا، مٹ جائیگا، تیرے لڑکے نے بڑا غضب کر دیا، یہ سب کہہ کر اور بہت ناراض ہو کر دوسروں کے گھر چلے گئے، میں گھر آیا والد صاحب نے داستان سنائی اور بتلایا کہ پیر صاحب بہت ناراض ہو کر چلے گئے ہیں، کیا کیا جائے، ہم نے کہا چلے جانے دو، اللہ ہر چیز کا مالک ہے، پیر کے اختیار میں کچھ نہیں، والد صاحب خاموش ہو گئے، صبح معلوم ہوا کہ پیر صاحب فجر کی اذان سے قبل ہی گاؤں سے چلے گئے، پھر کبھی اس گاؤں میں آنے کا نام نہیں لیا۔

کئی بار لکھنؤ مرکز سے جماعتیں آئیں، حضرت مولانا نعمانی صاحب بھی تشریف لائے، حضرت مولانا کے ہمراہ محترم حافظ محمد اقبال صاحب بھی تشریف لاتے رہے، گاؤں کے کافی لوگ بیعت ہوئے، ہمارے والدین اور پورے گھر والے بیعت ہوئے اور ساری بدعتوں، برائیوں سے توبہ کی، تعزیہ کو دفن کر دیا، دوسرے گاؤں کے لوگوں نے مشورہ دیا کہ تعزیہ نہیں رکھنا ہے تو دوسروں کو دیدو، چونکہ تعزیہ کاٹھ کی تھی بہت مضبوط بنی تھی، ہم نے کہا، دوسرے کو دیدیں گے تب بھی یہ گناہ ہوتا رہیگا اور ہم بھی اس گناہ میں ملوث رہیں گے، اسلئے دفن ہی کرنا بہتر ہے۔ محترم مولانا اور حافظ جی نے مکتب پر توجہ فرمائی، محترم حافظ جی نے مجھے بھی مدرسہ میں پڑھانے کیلئے ارشاد فرمایا، ہم نے بھی مدرسہ میں پڑھانا شروع کیا، میں نے اپنے نانا صاحب کے پاس قرآن پاک کا ناظرہ پڑھا تھا حافظ جی جب ندوۃ العلماء لکھنؤ میں درجہ حفظ میں پڑھانے کے لئے تشریف لائے تب حافظ جی نے مولانا صاحب سے ہمارے بارے میں مشورہ کیا کہ رحمت اللہ کچھ دن کے لئے ہمارے پاس دارالعلوم آجائیں اور قرآن پاک کی اصلاح کر لیں، پڑھنے پڑھانیکا کچھ سلیقہ آجائے، حافظ جی کے حکم سے دارالعلوم گیا، حافظ جی کو قرآن پاک سنانا شروع کیا، ہمارے کھانیکا بار حضرت مولانا نے برداشت کیا، کھانے کے پیسے دارالعلوم کے مطبخ میں جمع کر دیا، اور ہم کو مطبخ سے کھانا ملتا رہا، ندوہ سے واپسی پر مدرسہ میں پڑھاتا رہا، مدرسہ میں جو ضرورت ہوئی تعلیمی ہو یا تعمیری، حافظ جی سے اور مولانا صاحب سے عرض کرتا رہا، مدرسہ کی کسی ضرورت پر حضرت مولانا سے دعاء کیلئے کہتا تو حضرت فرماتے، دعا بھی کرونگا، اور دعا بھی، اور حضرت بقدر ضرورت دریافت فرما کر مالی تعاون فرمادیتے۔

ہم ایسے حقیر ذلیل، دیہاتی، جاہل سے جو کسی مصرف کے نہیں تھے حضرت بڑی محبت فرماتے، مرکز بیونچے پر پہلے کھانا پوچھتے اور کھلاتے، فجر کی نماز کے بعد کبھی ہم کو گھر آنے کیلئے جلدی ہوتی اور چلنے لگتا تو حضرت حکما روکتے اور اندر تشریف لیجا کر شام کا جو بچا ہوتا وہی بلا تکلف

عنایت فرماتے اور فرماتے کھا کے جاؤ، تم تو صبح کھاتے ہو، کھلاتے رہتے اور مسکراتے رہتے، اماں ابا نے اتنی محبت نہیں کی جتنی شفقت و محبت مولانا صاحب فرماتے تھے چلتے وقت کچھ روپے بھی عنایت فرماتے، نہیں لیتا تو اصرار کر کے دیتے، لیکن حضرت کبھی اپنی تعریف سننا گوارہ نہیں فرماتے تھے، شروع میں تعلق ہونے کے بعد ہم نے خط لکھا، القاب میں، آقائی مولائی، لکھدیا، حضرت نے تحریر فرمایا، آقائی مولائی ایسے بڑے بڑے الفاظ مت لکھنا۔

مدرسہ کے ہال کمرے میں پختہ فرش نہیں تھا، فرش بننے کے لئے حضرت سے دعا کی گزارش کی، حضرت نے بدست محترم حافظ محمد اقبال صاحب مدظلہ رقم عنایت فرمائی، اور فرش بن گیا، بچے فرش پر بیٹھ کر پڑھنے لگے، ہم نے حضرت کے پاس کچھ تعریفی الفاظ لکھ دیئے، حضرت نے جواب میں لکھا کہ، مجھے اپنی تعریف کی رشوت کی ضرورت نہیں۔

دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں، بس اللہ کا شکر ادا کرو، اللہ قبول فرمائے

دوبلیا بانس گاؤں کے احباب مولانا منفعت علی مرحوم مولانا

عبدالقدیر خاں صاحب، حاجی عبدالوحید خاں صاحب نے خواہش کی

یہاں بانس گاؤں تشریف لائیں، حضرت سے گزارش کی گئی حضرت

حالانکہ اس وقت قیصر گنج سے بانس گاؤں جانے کیلئے راستہ اچھا نہیں تھا، راستے میں ندی بھی پڑتی تھی، بانس گاؤں کے احباب بیل گاڑی لائے تھے، حضرت بیل گاڑی پر بیٹھے، کچھ دور چل کر بالو پڑتا تھا، بالو میں بیلوں کو گاڑی کھینچنے میں حضرت نے تکلیف محسوس کی فوراً گاڑی سے اتر پڑے اور کافی دور تک جہاں تک بالو تھا پیدل چلتے رہے، بانس گاؤں پہنچ کر وہاں بہت پردرد تقریر فرمائی، لوگ بہت متاثر ہوئے، بہت بڑا مجمع ہوا تھا، بہت سے لوگ بیعت بھی ہوئے، ان کے دینی تعلق و محبت دیکھ کر حضرت بہت خوش ہوئے، بہت دعائیں دیں، چلتے وقت ان لوگوں نے کچھ رقم پیش خدمت کی، حضرت نے قبول نہیں فرمایا، ان لوگوں نے بہت اصرار کیا تو حضرت نے صرف کرایہ جوڑ کر لے لیا۔

قیصر گنج سے تقریباً ایک میل اتر موضع برخودارہ پور کے حاجی دین محمد صاحب تھے جب

مولانا صاحب ہمارے یہاں تشریف لاتے تو حاجی صاحب اپنے یہاں سے کافی آدمی اپنے ہمراہ لاتے، اور بہت غور و فکر کیا تھا تقریر سنتے، ایک بار بہت عاجزی کر کے حضرت کو اپنے یہاں لے گئے وہاں کافی آدمی جمع ہوئے، دین کی باتیں وہاں بھی لوگ بیعت ہوئے، شرک و بدعت سے لوگوں نے توبہ کی، نماز پڑھنے کا عہد کیا، پھر حضرت سے گزارش کی، حضرت یہ



جماعت کے ہمراہ تشریف لائے، ابکی کندیلہ اور میر گنج وغیرہ تشریف لے گئے، میر گنج جسکو ہم لوگ بدعت کا گڑھ کہتے تھے، جردل سے میر گنج جانے کے لئے یکہ کیا گیا تھا، لیکن راستہ نامہوار تھا، گھوڑے کو یکہ کھینچنے میں تکلیف ہو رہی تھی حضرت پیدل تشریف لے گئے انھیں بزرگوں کی برکت کا نتیجہ ہے کہ میر گنج میں اپنا مدرسہ قائم ہو گیا علمائے کرام کی آمد ہونے لگی، کندیلہ میں بھی حضرت تشریف لے گئے، وہاں بھی اجتماع ہوا، لوگ جمع ہوئے، دین کی باتیں سنیں، انھیں اللہ والوں کی برکت ہے کہ کندیلہ میں تبلیغی جماعت کا کاہور رہا ہے۔ مسجد، مدرسہ ترقی پر ہیں۔

ہمارے ہی گاؤں سر دوپورہ کے مولوی احمد حسین صاحب جو اس وقت بہرائچ سرکاری ماڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے، حضرت مولانا سے بیعت کے ارادہ سے لکھنؤ مرکز ہمارے ساتھ تشریف لے گئے، اس وقت مولوی صاحب داڑھی نہیں رکھتے تھے، ہم نے مولانا صاحب سے تنہائی میں عرض کیا کہ یہ مولوی صاحب جو ساتھ آئے ہیں، بہت نیک، پڑھے لکھے آدمی ہیں، حضرت سے بیعت ہونا چاہتے ہیں، مگر ابھی داڑھی نہیں ہے، حضرت ہنسنے لگے اور فرمایا انشاء اللہ داڑھی بھی ہو جائے گی، مولوی صاحب بیعت ہوئے، اسی وقت سے داڑھی رکھ لی، لکھنؤ مرکز سے ایک بڑی جماعت گورکھپور، بستی، وغیرہ کی طرف جانے کے لئے نکلی، جس میں حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، حاجی بادشاہ علی، سید لیاقت حسین، ڈاکٹر فیض اللہ، حاجی عبدالقوی وغیرہ تھے، اسی سفر میں اللہ نے ہمیں بھی توفیق عطا فرمائی، جماعت کے ساتھ ۲۲ دن رہ سکا، میں حضرت مولانا صاحب ہی کے قریب سوتا تھا، سوتے وقت مولانا روزانہ فرمادیتے کہ رحمت اللہ تہجد کے وقت آنکھ کھلے تو ہمیں بھی جگا لینا لیکن ۲۲ دن حضرت کے ساتھ رہا، ایک دن بھی ہم کو جگانے کی نوبت نہیں آئی، ہماری آنکھ کھلتی تو دیکھتا کہ حضرت وضو کر رہے ہیں، یا نماز پڑھ رہے ہیں، یاد عا میں مشغول ہیں حالانکہ دیر میں سونا ہوتا تھا، دیر تک تقریر ہوتی تھی۔

ہم نے حضرت سے اور حاجی بادشاہ علی صاحب سے مرکز میں گزارش کیا کہ ہمارے یہاں کے لئے اب پھر جماعت بھیجی جائے، ہماری گزارش پر اتوار ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو مرکز سے چار دن کے لئے جماعت آئی، اتوار ۲۰ اکتوبر جردل، دو شنبہ فخر پور، سہ شنبہ کو بہرائچ، چہار شنبہ کو نوگنیاں اس جماعت میں مولانا محمد ثانی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے تھے، حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ سے کوئی بہت ضروری کام کی خبر آ جانے سے واپس تشریف لے گئے تھے، صرف ایک دن جردل میں قیام فرمایا تھا۔ اور رات میں تقریر فرمائی، بہت زیادہ مجمع ہوا تھا،

تبلیغی کام کے مقصد کو بہت ہی اچھے انداز میں سمجھایا تھا، مولانا عبد الجلیل رحمۃ اللہ علیہ بہت متاثر ہوئے تھے، تنہائی میں مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبد الجلیل ”دیر تک گفتگو کرتے رہے تھے۔ بعد میں مجھ سے حضرت نے فرمایا کہ تم نے کبھی بتلایا نہیں کہ جبرول میں ایسے بزرگ عالم رہتے ہیں

والد صاحب کے انتقال پر ہم نے حضرت کو دعائے مغفرت کے لئے لکھا تھا، والد صاحب کی پہلے کی زندگی بدعت کے کاموں میں گزری، بعد میں حضرت سے بیعت ہونے پر توبہ اور اچھے اعمال کی توفیق اللہ نے دی، حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے والد صاحب مرحوم کے انتقال کا حال معلوم ہوا، ان کا حق تھا اور حق ہے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت و رحمت کی دعا کا اہتمام کیا جائے، الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے بڑی عمر نصیب زندگی سے توبہ و اصلاح کی توفیق بھی عطا فرمائی، اگر آخری وقت۔

نصیب ہو جائے تو کافی ہے، الحمد للہ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے اللہ تعالیٰ مغفرت کا معاملہ فرمائیں گے، اور تمہاری دعاؤں سے انشاء گا۔ تمہارے لئے اور تمہارے والد مرحوم کے لئے دعاء کرتا ہوں اور در۔

والسلام محمد منظور نعمانی

ہوں۔

۱۹ نومبر ۱۹۷۹ء

حضرت مجھ ایسے حقیر ذلیل دیہاتی سے کس قدر محبت فرماتے تھے ایک بار حضرت نے تیس روپے منی آرڈر بھیجا، اور منی آرڈر فارم کے نیچے تحریر فرمایا کہ ”صوفی رحمت اللہ آج میرے دل میں آیا کہ تمہارے گھر بھر کی دعوت کروں، اسلئے تیس روپے منی آرڈر ہے“

حضرت مولانا کی محبت والفت و کرم کے بیشمار واقعات ہیں، ایک واقعہ بتا کے بس کرتا ہوں حضرت کی دعاؤں سے اللہ نے مجھ ایسے کمزور و بے بس کو حج کی سعادت توفیق فرمائی، حج سے واپسی پر حضرت سے ملنے کے لئے حاضر ہوا، اس وقت حضرت کی طبیعت خراب تھی، چلے آنے کے بعد جو خط حضرت نے تحریر فرمایا، ملاحظہ فرمائیں

باسمہ سبحانہ

برادر مرعوزیم صوفی رحمۃ اللہ زیدت حسنا تکم . سلام و رحمت

خدا کرے تم مع متعلقین بخیر و عافیت ہو،

جس دن اور جس وقت تم مجھ سے ملنے آئے تھے میری طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی،

اسلئے میں تم سے تمہارے مبارک سفر کے بارے میں باتیں بھی نہیں کر سکا اور جب تم نے جانا چاہا تو میں نے نہیں روکا، میری نیت تم کو ہدیہ پیش کرنے کی تھی، وہ بھی اس وقت میں یاد نہ آیا، جب تم جانے لگے تو یاد آیا، تم کو واپسی کے لئے اور اندر آنے کے لئے آواز دی، لیکن تم نکل چکے تھے، سن نہیں سکے بعد میں افسوس ہوا اور قلق ہوا، اب وہ منی آرڈر کے ذریعہ روانہ کر رہا ہوں مجھ سے تم کو جو کچھ ملتا ہے، خواہ کسی ذریعہ سے ملتا ہے، اسکو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھنا چاہئے، اور شکر ادا کرنا چاہئے، تمہارے لئے اور تمہارے مدرسہ کے لئے دعاء کرتا ہوں، اور خود دعاؤں کا بہت محتاج ہوں، جب تک زندگی مقدر ہے اللہ تعالیٰ ایمان، اعمال مرفیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت، نعمتوں کا شکر، گناہوں سے استغفار کے اہتمام اور عافیت کے ساتھ پورے فرمائے، مقررہ وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جاؤں، اور ارحم الراحمین اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادے، بس یہی سب سے بڑی حاجت ہے۔

والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(اس خط پر تاریخ نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ستمبر ۱۹۸۸ء کا ہے)

☆☆

محمد حسان نعمانی

## حضرت ابی علیہ الرحمہ کی ذاتی اور گھریلو زندگی

ابیؑ کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں ایک قریبی مشاہد کی حیثیت سے ان کے ذاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

میرے سن شعور کا آغاز مرکز والے مکان میں ہوا، ان دنوں (۱۹۸۰ء) -  
دوسری تھی، حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم کا قیام ان  
کمرے ہی میں رہتا تھا۔ اگرچہ ان کا گھر (جس میں ان کے برادر  
اور خاندان کے دوسرے افراد رہتے تھے) مرکز سے چند قدم  
لکھنؤ میں ہوتے ان کا قیام مرکز ہی میں ہوتا تھا۔ ابیؑ کا جو وقت اس

کاموں میں صرف ہوتا وہ تو گھر میں ان کے کام کے کمرہ میں صرف ہوتا تھا اسلئے علاوہ انکا زیادہ تر  
وقت حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی معیت ہی میں گذرتا تھا۔ وہ مولانا کے ساتھ ہی ناشتہ  
کرتے اور کھانا کھاتے، تمام نمازیں بھی ساتھ ہی پڑھتے تھے، جہاں تک یاد ہے ان دنوں مرکز سے  
متعلق اور وہاں آنے والے زیادہ تر لوگ دونوں بزرگوں کو چھوٹے مولانا اور بڑے مولانا کے نام  
ہی سے پکارتے تھے، لیکن میں نے دونوں کو ایک دوسرے کی ایسی تکریم کرتے دیکھا ہے کہ جس  
سے ظاہر ہی نہیں ہوتا تھا کہ بڑا کون ہے اور چھوٹا کون؟ مولانا مدظلہ کے آرام کے وقت ہم میں  
سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ ذرا سی آواز نکال سکے، ابی رحمۃ اللہ علیہ کبھی سفر میں ہوں تو ممکن  
ہے کہ ہم نے اپنے بچنے کی وجہ سے مولانا کے آرام کا خیال نہ کیا ہو ورنہ ہماری ذرا سی آواز نکلی اور  
سزا ملی۔ میں کھیل کا زیادہ شوقین تھا اس لئے سزا میرے حصے میں زیادہ آتی۔

اس وقت مرکز والی مسجد موجودہ مسجد کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹی تھی لیکن ان دو  
بزرگوں کی برکت سے وہ عوام و خواص کی مرجع تھی۔ عصر حاضر کے اکابرین اور اہل اللہ میں سے

شاید ہی کوئی ایسا ہو جو وہاں نہ آیا ہو، خاص طور پر ماہ صیام اور اسکے آخری عشرہ میں تو اسکی روحانی فضا اپنے شباب پر ہوتی تھی، یہ تھا خوش قسمت ہیں وہ جن کو وہ ماحول دیکھنا نصیب ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے مرکز کو بے لوث اور پر خلوص خدمت گزاروں کی ایک ٹیم بھی مہیا کی تھی، جن میں زیادہ تر تہجد گزار تھے اور ساتھ ہی ان بزرگوں پر پروانوں کی طرح نثار بھی ————— بھائی عبدالسلام (۱) صاحب اور مولوی محمد سلیم (۲) صاحب کے نام ان میں سر فہرست ہیں۔

مرکز والے مکان میں ابی کا پندرہ سال سے زیادہ قیام رہا وہاں عام طور پر ان کی صحت اچھی رہی اس کے بعد نظیر آباد والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ پھر ۱۹۷۴ء میں دیوبند میں رکشا الٹ جانے کے نتیجے میں اکیڈنٹ کا شکار ہو کر عمر کے آخری پچیس سال زیادہ تر معذوری کی حالت ہی میں گزارے۔

صحت کے دنوں میں ابی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سخت جدوجہد، جفاکشی اور مشقتوں سے مہم تھی، میرے شعور کے آغاز کے وقت ان کی عمر ۵۳-۵۵ سال سے کم نہ ہوگی لیکن اس کے بعد بھی ۱۶-۱۷ سال تک وہ جوانوں سے زیادہ جوان تھے، مکان کے تو لفظ ہی سے وہ نا آشنا تھے، بڑے بڑے اسپورٹس مین بھی جسمانی طور پر اتنے فٹ نہ ہوتے ہوں گے جتنے کہ وہ تھے۔ آواز اس قدر زوردار تھی کہ خود بتاتے تھے کہ جب لاؤڈ اسپیکر عام نہیں ہوئے تھے، دس دس ہزار کے جمع تک ان کی آواز آسانی سے پہنچ جاتی تھی۔ پھر معذوریوں آئیں تو وہ جسمانی حد تک محدود رہیں، دل و دماغ آخر آخر تک جوان رہے، یادداشت بلا کی تھی، برسوں پہلے کہی باتیں انھیں الفاظ میں سنا دیا کرتے تھے جن الفاظ میں خود کہی یا سنی تھیں۔

ابی کی عملی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے تمام اعمال و افعال کو عبادت بنادیا تھا، ان کے یہاں نہ تو اوراد و وظائف کی کثرت ملتی ہے نہ نوافل کی ————— ان کے معمولات میں کوئی ایسا عمل نظر نہیں آتا جو عام آدمی کے لئے مشکل یاد شوار ہو، انھوں نے اپنے عمل سے دین کے ”یئر“ ہونے کو ثابت کر دکھایا۔ جب تک صحت رہی گھر کا سودا سلف لانے میں کبھی نہ ہچکچائے، اپنی ڈاک خود نمٹاتے اور زکوٰۃ و زانی رقوم کے ایک ایک پیسے کا حساب خود رکھتے، وقت کی قدر انکے یہاں جیسی تھی وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے، ایک منٹ بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلاوجہ لوگوں سے ملاقات انھیں پسند نہ تھی کسی دینی فائدے کیلئے لوگ بیٹھیں تو بہت مبارک ورنہ کسی کا بیٹھنا انھیں اچھا نہ لگتا۔ اسی وجہ سے انکے پاس حواریوں کا

جٹکھٹ بھی نہ لگ سکا۔

طبیعت میں احتیاط اور احساس ذمہ داری ہر معاملہ میں تھا۔ خطوط لکھاتے تو الفاظ انتہائی نپے تلے ہوتے، اگر کاتب سننے میں غلطی کے باعث یا اپنی فہم کے مطابق جانے انجانے میں الفاظ کی ترتیب میں رو و بدل کر دیتا تو جب دستخط کرنے کیلئے خط پر نظر ڈالتے تو وہاں آکر فوراً رک جاتے اور اسکی اصلاح کراتے، اگرچہ ہمارے خیال میں اس لفظ کی تقدیم یا تاخیر سے جملہ کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہوتا لیکن ایسا لگتا کہ ان کے نزدیک عظیم فرق ہو گیا ہو۔

ان کے کسی نہ کسی فعل سے ان کے کمال احتیاط کا ہمیں روز مشاہدہ ہوتا بلا مبالغہ سینکڑوں واقعات اس بابت ذہن میں ہیں لیکن ایک واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ان کے طرز عمل کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

ایک مرتبہ کوئی اوستھی صاحب (اس وقت پورا نام یاد نہیں)

لڑ رہے تھے انھوں نے چاہا کہ مسلم گریجوٹ ووٹس کی حمایت حاصل کی جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہمارے گھر کے ایک بچہ۔

بیٹے کے دوست تھے اس بچے کی ہمت ابیؑ سے اس اپیل پر دستخط

خاموشی سے اس پر ابیؑ کے دستخط کر دیئے۔ جب یہ اپیل مقامی روزنامہ میں ہوئی اور اس پر ابیؑ رحمہ اللہ کی نظر پڑی تو انھوں نے فوراً اس سلسلے میں ایک تردیدی بیان اشاعت کے لئے قومی آواز کو بھیج دیا اس کا علم کسی طرح اوستھی صاحب کو ہو گیا، تو انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ابیؑ رحمہ اللہ اپنے تردیدی بیان کی اشاعت پر زور نہ دیں کیونکہ اس سے انکالیکشن کا لحد ہو سکتا تھا، ان کے لڑکے نے تو رو رو کر محلہ سر پر اٹھالیا، نیز ہمارے اس عزیز نے اپنی سی کوشش کر لی لیکن ان کے یہاں یہ بات، جو عام طور پر لوگوں کے یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اتنی زیادہ اہمیت رکھتی تھی کہ وہ کسی طرح اپنے تردیدی بیان کی اشاعت روکنے پر راضی نہ ہوئے اور اپنے گھر کے بچے کی غلطی کی پردہ پوشی کا خیال بھی انھیں اس پر راضی نہ کر سکا، انھوں نے نہ صرف قومی آواز کے ایڈیٹر کو فون کر کے اس تردیدی بیان کی اشاعت کی تاکید کی بلکہ بعض دوسرے اخبارات کو بھی اپنا بیان اسی وقت میرے ذریعہ بھیجا۔ انکا فرمانا تھا کہ ”یہ معاملہ شہادت کا ہے اور قیامت میں اس کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی میں ایک ایسے شخص کے بارے گواہی کیسے دے سکتا ہوں جسے میں جانتا تک نہیں۔“

جرات کے وصف سے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو پوری طرح آراستہ کیا تھا کیسے بھی

حالات ہوں ان کو کبھی خوف زدہ یا پریشان نہیں دیکھا۔ ۷۴ء کے سخت مسلم مخالف حالات اور فرقہ وارانہ فضا میں انھوں نے جرأت کے نمونے پیش کئے، اپنی کتاب ”انسانیت زندہ ہے“ میں انھوں نے جو چار اہم واقعات نقل کئے ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔

فتنوں کے رد کے سلسلے میں مخالفین نے بارہا انہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دیں لیکن وہ ان سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔ مناظروں کے دور میں اس طرح کی دھمکیوں کے جواب میں انھوں نے لکھا

”او صداقت کے دشمن ۱ محمد منظور نعمانی فانی ہے اسکو خاکیا جاسکتا ہے مگر خدا کا مقدس دین غیر فانی ہے اسکی خدمت بھی غیر فانی ہے اسکو کوئی نہیں مٹا سکتا، تاریخ عالم شاہد ہے کہ جس نے اس کو مٹانے کا ارادہ کیا تو خود صفحہ ہستی سے مٹ گیا، اگر بالفرض مجھے اس سلسلے میں موت آئی تو موت ہی میرے کام کے بقا و دوام کی ضامن ہوگی۔“

ابی علیہ الرحمہ فرض نمازیں ہمیشہ باجماعت ہی پڑھتے تھے اور جماعت کو نماز کی پابندی کا بہترین نسخہ بتاتے تھے فرماتے تھے کہ جو جماعت کی پابندی کرنا چاہتا ہے وہ تکبیر تحریمہ میں پہونچنے کی عادت ڈالے ممکن ہے کبھی تکبیر تحریمہ چھوٹ جائے لیکن انشاء اللہ جماعت اسے ضرور ملے گی اور جو نماز کی پابندی کرنا چاہتا ہے وہ جماعت کی پابندی کا خیال کرے اس طرح ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اسکی جماعت چھوٹ جائے لیکن انشاء اللہ اس کی نماز نہیں چھوٹے گی۔ اس سلسلے میں انکا ذاتی عمل یہ دیکھا کہ جب معذوری کی وجہ سے مسجد جانے کے قابل نہ رہے تو بھی اپنی امکانی کوشش سے ہر نماز جماعت سے ہی ادا کی۔ جماعت کی خاطر نماز کو مؤخر یا مقدم بھی فرمادیتے اور کبھی جمع بین الصلوٰتین بھی کرتے، گھر میں کوئی بڑا نہ ہوتا تو گھر کے کسی بچے ہی کو شریک کر لیتے لیکن نماز باجماعت ہی ادا کرتے۔ جب امامت فرماتے تھے تو مقتدیوں کا بے حد خیال کرتے تھے اور اکثر مختصر ہی نماز پڑھاتے تھے۔

نماز میں استحصار کا بے حد خیال رہتا تھا، جہری نماز میں اکثر و بیشتر دیکھا گیا کہ جب بھی آیات موعظت و موعبت آجائیں آواز بھر آجاتی اور گریہ طاری ہو جاتا۔ خاص طور پر نیت کے وقت استحصار کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ تکبیر کہہ کر نیت باندھ لی اور پھر نیت توڑ کر مقتدیوں سے دوبارہ نیت باندھنے کو کہا، بعد میں کسی کے معلوم کرنے پر بتایا کہ نیت کے وقت استحصار نہیں تھا، فرماتے تھے کہ نیت کے لئے عقد اللسان شرط نہیں استحصار شرط ہے

کہ اس کے بغیر نیت کا اعتبار نہیں۔

ان کی نفل نمازیں اکثر بہت طویل ہوتی تھیں کسی بھی آیت یا دعائیہ کلمہ کو بار بار پڑھتے، ایسا لگتا تھا کہ جب تک دل کی کوئی خاص کیفیت نہ ہو جائے وہ اس سے آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتے ہوں۔ بعض دفعہ قعدہ میں اللہم اِنی طَلَمْتُ نفسی (صرف ان الفاظ کو) درجنوں بار دہراتے سنا۔ خاص طور پر تہجد کی نماز میں جو کیفیت ہوتی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، اس میں گریہ کا زبردست غلبہ ہوتا تھا۔ سجدوں میں ماثورہ دعاؤں کی کثرت اور ان کی ادائیگی کا خاص انداز، ایک بندہ کا اپنے رب سے بلکہ بلکہ کر سوال کرنا، یہ ایک عجیب و غریب روح پرور منظر ہوتا تھا۔ چونکہ یہ نماز بالکل تنہائی میں ہوتی تھی اسلئے اس وقت ”اختفاء“ کے سارے پردے اٹھ جاتے تھے اور صحیح معنوں میں ان کی اصل شہنہ آتی تھی، اے اللہ! ہمیں بھی ایسی نمازیں یا انکا کوئی حصہ نصیب فرما

تہجد کی نماز کے بعد جہری ذکر کا معمول تھا، اندازاً ایک ڈیز لگتا ہوگا ہم لوگوں کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس ذکر سے وہ کسی خاص ہو رہے ہیں، اُس وقت کے اُن کے سرور کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی

اپنے بچپن میں ان کو کثرت سے روزے رکھتے دیکھا، خاص طور پر ”معارف الحدیث“ کی تالیف کے دنوں میں یا الفرقان کے لئے کسی اہم مضمون کی تصنیف کے دوران تو روزے کا معمول ہی تھا، ماہ مبارک میں وہ سحری بالکل آخر وقت میں کھاتے بلکہ اکثر فجر کی اذان شروع ہوتی تو ان کی سحری شروع ہوتی، فرماتے تھے کہ لوگ احتیاط میں فجر کی اذان وقت سے قبل دے دیتے ہیں۔ سحری کے اوقات میں مساجد سے لاؤڈ اسپیکروں سے روزہ داروں کو جگانے کے سلسلے میں جو شور کا سلسلہ ہوتا اس سے بہت تکلیف محسوس کرتے، ان کی نماز تہجد میں اس سے بہت خلل پڑتا اس شور شرابہ کو وہ بہت غلط سمجھتے تھے، اس سلسلے میں الفرقان میں بھی انھوں نے کئی بار لکھا اور ایک دو دفعہ تو اس بابت اپیل چھپوا کر تقسیم بھی کرائی، افطار میں عجلت فرماتے بسا اوقات مطلع دیکھ کر روزہ افطار فرما لیتے۔

زکوٰۃ کا وہ پورا حساب رکھتے تھے، اپنی زکوٰۃ پیشگی ادا کرتے رہتے اور ماہ مبارک آنے پر ایک ایک پیسے کا حساب لگا کر حساب بیاق کر دیتے۔ بہت سے عقیدت مند حضرات ان کے ذریعے اپنی زکوٰۃ کی ادائیگی کراتے تھے وہ اس کا مکمل حساب الگ رکھتے جب تک خود اس حال میں رہے خود لکھتے رہے بعد میں یہ خدمت میرے حصے میں آئی۔



انھوں نے باقاعدہ قرآن کریم حفظ نہیں کیا تھا لیکن پچاس پچپن سال کی عمر کے بعد جب بھائی صاحب، مدظلہ نے الفرقان کی ادارتی ذمہ داری پوری طرح سنبھال لی تو انھوں نے قرآن کریم حفظ کر نیکارادہ کیا اور اپنی تمام مصروفیات کے باوجود بائیس پارے حفظ کر لئے پھر انھیں احساس ہوا کہ جو کچھ یاد کیا ہے اس کو یاد رکھنا مشکل ہو رہا ہے تو اسی کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے رہے، تلاوت کے اوقات کے علاوہ اکثر نفل نمازوں اور خاص طور پر اوابین میں اسکو برابر دہراتے رہتے۔

دعا سے انھیں خاص لگاؤ تھا، اسی وجہ سے ”معارف الحدیث“ کی جلدوں میں جلد پنجم (جو کتاب الاذکار والدعوات پر مشتمل ہے) سے انھیں زیادہ تعلق نظر آتا تھا۔ عام طور سے معارف کی اس جلد اور اپنی کتاب ”نماز کی فضیلت“ پڑھنے کیلئے بار بار توجہ دلاتے۔ ہر مشکل مسئلے اور پریشانی کا حل ان کے یہاں دعا اور نماز تھی۔ بیمار یوں یا کسی بھی قسم کی تکالیف کے لئے ہمیشہ کوئی دعا ہی پڑھنے کے لئے بتاتے۔ آپریشن کے لئے اوٹی (Operation Theater) جاتے وقت یا اللہ یا رحمن یا رحیم پڑھنے کی ہدایت فرماتے۔ شدید درد گردہ اور بعض دوسرے سخت امراض میں انھوں نے اکثر لا الہ الا انت سبحانک اسی کست من الطالبین پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ کسی مریض کی حالت مایوس کن ہوتی تو متعلقین کو تلقین فرماتے کہ یا اللہ یا سلام کثرت سے پڑھیں۔ خود ان کی طبیعت کئی مرتبہ زیادہ خراب ہوئی تو ہم لوگوں نے اس بابت ان کی تعلیم کو اپنایا، اور وہ مایوس کن حالت سے باہر آ گئے۔

معاشرت و معاملات میں ہدایات ربانی اور خواہشات نفسانی نیز احکام شریعت اور دنیوی مصلحت و منفعت کے مابین کشمکش عبادات وغیرہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ کی بندگی و فرمانبرداری اور شریعت رسول کی تابعداری کا جیسا امتحان اس میں ہوتا ہے۔ کسی دوسرے میدان میں نہیں ہوتا۔ مجھے ابی رحمۃ اللہ علیہ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، میں یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ وہ معاشرت و معاملات کے باب میں اللہ کے احکام اور شریعت رسول کی کامل تابعداری کرتے تھے، بلکہ اس کے تحت آنے والے زندگی کے ہر پہلو کو انھوں نے احکام شریعت کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

اہل قرابت، ہمسایہ کمزور و حاجت مندوں کا انھیں بے حد خیال تھا۔ نہ جانے ان کی کس کس طرح مدد فرماتے تھے۔ مدد کا بھی ان کا عجیب طریقہ تھا۔ وہ انتہائی خاموشی سے تو ہوتی ہی لیکن اس کی بھی کوشش کی جاتی کہ جس کی مدد کی جارہی ہے وہ اس کا عادی نہ ہو جائے۔ اس لئے

کبھی کبھی یہ قرض کے نام سے بھی کی جاتی — اہل خاندان اور تعلق والوں کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا وہ خیال رکھتے۔ کسی کی بچی کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ اس کی شادی نہیں ہو رہی ہے تو اس کی فکر کرتے۔ اس کے لئے دعا بھی کرتے اور کوشش بھی۔ کسی عزیز کی عمر زیادہ ہو رہی ہوئی تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی طرف توجہ دلاتے۔

ابیؒ مہمانوں کی تواضع حتی الامکان بہتر سے بہتر کرتے۔ لیکن اس کے لئے اپنے کو کبھی مشکل میں نہ ڈالتے۔ گھر میں جو اچھی سے اچھی چیز میسر ہوتی وہ پیش فرمادیتے۔ ایک طریقہ اور تھا تواضع ضیف کا۔ اور اس کو وہ تھانوی طریقہ بتاتے تھے۔ وہ یہ کہ کبھی کبھی آنے والے مہمان کی خدمت میں کھانے کی رقم ہدیہ فرمادیتے اور فرماتے کہ آج کا کھانا وہ ان کی طرف اپنی سہولت سے کہیں کھالیں۔

کسی مہمان کی آمد کی اطلاع مل جاتی تو اس کا انتظار وقت سے پہلے

کے استقبال کی تیاری شروع کر دیتے۔ خاص طور پر حضرت مہ

جاتی تو بہت پہلے سے تیار ہو کر ان کا انتظار کرتے۔ اور ہم لوگوں

کے لئے سڑک پر کھڑے ہو جائیں۔ کبھی اس کے خلاف ہو جاتا

آتی سخت ناراض ہوتے۔ آنے والے کسی مہمان کے سلسلہ میں اگر

توجہ یا بے اعتنائی کی شکایت ملتی تو بہت خفا ہوتے۔ ایک مرتبہ مولانا حبیب ریحان خان بھوپال

تشریف لائے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میں ان کی طرف پوری توجہ نہ دے سکا۔ انھوں نے واپس

جا کر ابی علیہ الرحمۃ کو اس کی شکایت لکھ دی تو سخت سرزنش کی اور بعد میں احساس ہوا کہ

سرزنش غالباً کچھ زیادہ ہو گئی تو یہ سطوریں لکھ کر مجھے دیں۔

”معلوم ہے کہ تم اپنے کام میں ایسے منہمک ہوتے ہو کہ کسی طرف توجہ نہیں کر پاتے۔

لیکن تم خود سمجھ سکتے ہو یہ رویہ اخلاقی نقطہ نظر کے علاوہ کاروبار کے لئے بھی مضر ہے، اگر

مناسب سمجھو تو دفتر میں کسی ایسے آدمی کا ہونا ضروری ہے جو آنے والوں سے مناسب بار

کر سکے اور دفتر کا کام بھی کرے۔ یہ مسئلہ خود تمہارے لئے قابل غور و فکر ہے، اگر ضرور

سمجھی جائے تو مجھ سے مشورہ بھی کر لیا جائے۔

مجھے احساس ہے کہ بعض مرتبہ غصہ میں بہت نامناسب لفظ نکل جاتے ہیں اس پر بہر

افسوس ہے۔ استغفار بھی کرتا ہوں۔“

شاید اس پر یقین کرنا آسان نہ ہو کہ اسے چھوٹوں بلکہ بہت چھوٹوں سے بھی معا

مانگنے میں انھیں ذرا تکلف نہ ہوتا۔ اپنی اولاد یا اپنے خادم کو کبھی کچھ کہہ دیا تو ان سے فوراً معافی مانگتے، مولوی ارشاد سے تو بعض مرتبہ ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ معافی مانگتے تھے۔

اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے لئے بھی ابی علیہ الرحمہ کے دل میں نفرت کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اگر کسی ذاتی معاملہ میں کسی کارویہ ان کے لئے تکلیف دہ ہوتا تو اس کا تو جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اس کو معاف کر دیتے اور اس کے لئے دعا کرتے، البتہ اگر مخالفت کسی دینی امر کی ہوتی تو اس بات کی وضاحت کرنا اور حق کو آشکارا کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

لیکن اس سلسلہ میں اس کے نازیبا رویہ کی کوئی شکایت نہ کرتے۔ خاص طور پر قضیہ دارالعلوم دیوبند کے دوران ان کے خلاف کیا کچھ نہیں لکھا گیا، اور لکھنے والے بھی ان کے اپنے حلقہ ہی کے تھے۔ ان میں سے ایک ہمارے جمیل بھائی مرحوم (ایڈیٹر روزنامہ عزائم لکھنؤ) تھے۔ ابی علیہ الرحمہ ان کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے، وہ بھی ابی کی اسی طرح عزت کرتے تھے اور اباجی ہی کہا کرتے تھے۔ لیکن قضیہ دارالعلوم کے مسئلے میں انھوں نے پچاس سے زیادہ قسطیں اس بابت ابی کے خلاف ”عزائم“ کے ادارتی کالم میں لکھ ڈالیں اور ان میں نفس مسئلہ پر بحث کم اور ذاتیات پر زیادہ تھیں اور سارا زور قلم شخصیت کو مجروح کرنے پر صرف کیا گیا۔ ابی علیہ الرحمہ ان دنوں خاص طور پر ”عزائم“ کا پابندی سے مطالعہ کرتے اگر کسی دن اخبار نہ آتا تو ہم لوگوں کو بھیج کر منگاتے اور ان کے ادارے پڑھتے۔ کبھی پڑھتے پڑھتے رونے لگتے، کبھی کلمہ استغفار پڑھنے لگتے لیکن جمیل بھائی مرحوم کے خلاف انھوں نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا، اگر ہم میں سے کسی نے اس سلسلے میں ان کے تاثرات جاننا چاہے تو ابی نے ان کے لئے صرف دعائیہ کلمات ہی کہے، ادارے پر کسی قسم کے تبصرے سے ہمیشہ گریز کیا۔

ابی کے ساتھ جمیل بھائی کے مذکورہ رویہ کے باوجود جب وہ بہت زیادہ بیمار ہو کر شہر کے بلرامپور اسپتال میں داخل ہوئے تو ابی کی پریشانی دیکھنے کے قابل تھی، ابی کی طبیعت بھی ان دنوں کافی خراب تھی لیکن جیسے ہی جمیل بھائی مرحوم کے بارے میں معلوم ہوا ان کی مزاج پر سی کے لئے پہلے تو مجھے بھیجا اور پھر اگلے روز مجھے ساتھ لیکر خود بھی اسپتال تشریف لے گئے۔ جمیل بھائی کا عجیب حال ہوا، وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لئے ابی کو صرف دیکھتے رہے، بہت زیادہ بولنے والا وہ شخص اس وقت ایک لفظ بھی نہ بول سکا صرف نم آنکھوں سے اپنے طرز عمل کی معذرت ہی کرتے رہے، اللہ تعالیٰ جمیل بھائی کی مغفرت فرمائے، یہی مرض انکا مرض الوفا ثابت ہوا۔ ابی علیہ الرحمہ یوں تو بہت خوش مزاج تھے، سب سے چکار کر بولتے۔ چکار کرنے کی

عادت ایسی پڑ گئی تھی کی بعض وقت اپنے برابر والوں یا عمر میں کچھ بڑوں کو بھی چکار بیٹھتے اور پھر خود مسکرا کر معذرت کر لیتے — لیکن اولاد کے بارے میں وہ کافی سخت تھے، غالباً ان کی تربیت کے لئے سختی کو ضروری سمجھتے تھے۔ چاہتے تھے کہ اولاد زندگی کے ہر شعبے میں آداب اور شریعت کی پوری پابندی کرے اور وہ ظاہری طور پر بھی شریعت کے پورے پابند نظر آئیں۔ اس لئے ان کے شرعی لباس کا بھی خیال رکھتے تھے اور اس میں کافی سختی بھی کرتے تھے، ہم لوگوں کو ہمیشہ کرتا، پاجامہ پہناتے، پاجامہ ٹخنے سے نیچے کبھی نہیں ہوتا تھا، جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو ہمیں بھی اپنے ساتھیوں کی طرح قمیص پہننے کو شوق ہوا، عید کا موقع تھا، ہمارے کپڑے ہمیشہ اپنی سلواتے تھے اس بار ہم نے خود سلوا لئے، عید سے ایک دن قبل کپڑے سل کر آئے تو ابی کی نظر ان پر پڑ گئی بس جلال ہی تو آگیا، کالردار قمیض دیکھ کر فوراً قیمتی منگائی اور اسے کالرا کاٹ دیئے۔ پھر ہماری سزایہ ٹھہری کہ ہم کو وہی قمیص عید کے دن پہننی پڑی۔

ابی ”کو بچوں کا دوستوں میں بیٹھنا، کھیل کود میں وقت صرف طور پر ترک نماز تو بالکل ہی برداشت نہیں کرتے تھے، بچوں کی غائبی میں ان کی اچھی مرمت بھی کر دیتے تھے لیکن غصے کے بعد ان کا مذاق ہے، جب بھی زیادہ غصہ آتا تو اس کے فوراً بعد ہمارے رہائشی مکان — اور وضو فرماتے، اکثر وضو کے بعد نفل پڑھتے اور دعا و استغفار کرتے۔

ابی علیہ الرحمہ کو رسومات اور اسراف سے بہت نفرت تھی، انھوں نے اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادیاں بہت سادہ انداز میں کیں، بڑے بھائی صاحبان کی شادیاں تو ہمارے سامنے نہیں ہوئیں لیکن بچپن میں ہم ان شادیوں کی سادگی کے بارے میں والدہ مرحومہ سے بہت کچھ سنا کرتے تھے، البتہ بہنوں کی شادیاں ہمارے سامنے ہوئیں، ہماری بڑی ہمیشہ کا عقد ابی نے اپنے بھتیجے برادر محمد مولانا محمد زکریا سے اور چھوٹی ہمیشہ کا اپنے بھانجے برادر محمد نظیف الرحمن سنبھلی سے کیا۔ یہ شادیاں اسی طرح سادہ اور بے رسوم تھیں۔

ہم دو بھائیوں یعنی میرا اور مولوی سجاد میاں کا ولیمہ مشترک ہوا تھا، ابی علیہ الرحمہ بہت ہی کم لوگوں کو شرکت کی دعوت کی اجازت دے رہے تھے جبکہ ہم دونوں اور خاص طور پر برادر عزیز مولوی سجاد میاں کا حلقہ خاصا وسیع تھا، شاید ہم لوگوں کے خیال سے انھوں نے سختی نہیں کی جس کو ہم نے ان کی رضامندی سمجھا لیکن حقیقت اس وقت کھلی جب انھوں نے ولیمہ میں شرکت نہ کی اور کمرے میں مقفل ہو کر بیٹھ گئے۔

ان کی ذاتی اور خانگی زندگی کی ایک جھلک دکھانے کے بعد اس مضمون کو ان کے اپنے نام ایک مفصل اور پُر درد مکتوب پر ختم کرتا ہوں جو میرے لئے ہمیشہ مشعل راہ بنا رہا ہے، اور اپنے اندر افادیت کے ہزاروں پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

عزیز من حسان میاں ۱ سلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم سلام و رحمت

جیسا کہ میں نے خط کے آخر میں لکھا ہے اسکو محفوظ رکھو اور بار بار تنہائیوں میں پڑھو میں مہینوں غور و فکر کے بعد ایسا فرض سمجھ کر اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور تم سے اچھی امید رکھتے ہوئے یہ نظریں لکھ رہا ہوں — اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ تم ابھی صاحب اولاد نہیں ہو — رب کریم اپنے فضل و کرم سے تم کو صالح اولاد عطا فرمائے، جو دنیا و آخرت کے لحاظ سے تمہارے لئے خیر اور رحمت کا وسیلہ بنے۔

میرا اندازہ ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہیں ہو تا وہ اسکا اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ ماں باپ کو اولاد سے کیسا تعلق ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنے حقیقی بھائی اور اپنے باپ کے بارے میں بھی نہیں چاہتا کہ وہ وہ اس سے بڑھ جائیں لیکن اولاد کے بارے میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کو اللہ وہ بھی عطا فرمادے جو مجھ کو عطا نہیں ہوا۔ ان کی راحت سے دلی راحت و سکون اور ان کی تکلیف سے دلی تکلیف اور بے چینی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ تم کو محفوظ رکھے جب کبھی تم درد گردہ کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہو تمہیں یا کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ میرا حال کیا ہوتا ہے۔ صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر دعائیں کرتا ہوں اور جو کچھ بھی کر سکتا ہوں کرتا ہوں، صرف تمہارے ہی ساتھ نہیں تم سب بہن بھائیوں کے ساتھ یہی معاملہ ہے اور یہ بالکل فطری بات ہے اور غیر اختیاری ہے۔

مرنے کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے وہ میرے لئے بھی غیب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اسکا ایسا یقین نصیب فرمایا ہے کہ اچھے برے اعمال کے جو نتائج اور ثواب و عذاب کی جو شکلیں قرآن پاک یا رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں ان کو گویا آنکھ سے دیکھتا ہوں۔

ذرا سوچو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیسے انعامات فرمائے ہیں، تم ایسے گھر میں پیدا ہوئے جہاں بقدر ضرورت بلکہ فراغت کے ساتھ دنیا بھی تھی۔ اور اسکے فضل و کرم سے دین بھی۔ تمہاری والدہ مرحومہ ہمارے کھر آنے سے پہلے سے تہجد گزار تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر کچھ خاص صلاحیتیں رکھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں، سخت کوشش اور محنت اور مالی معاملات

میں امانت وغیرہ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے بیوی ایسی عطا فرمائی جس میں میرے خیال میں وہ سب خوبیاں ہیں جو ہونی چاہئیں۔ وہ بفضلہ تعالیٰ نماز کے علاوہ تلاوت کی بھی پابند ہے، مجھے اس سے وہ سب راحتیں ہیں جو کوثر یا حمیرا سے ہوتی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وہ سب تمہیں نصیب فرمایا جو اس وقت تم کو نصیب ہے۔ اطمینان اور خوشحال زندگی کا سامان۔ تم اللہ تعالیٰ کے ان سب انعامات کو یاد کر کے سوچو کہ تمہارا معاملہ اور رویہ اس کریم کے ساتھ کیا ہے۔ میں دیکھتا بھی ہوں اور رخسانہ کے ذریعہ بھی مجھے معلوم ہے کہ نماز تم قریباً پابندی سے پڑھتے ہو۔ یہ حال نماز نہ پڑھنے سے بلاشبہ بہتر ہے۔ لیکن جماعت کا ترک اور خدا کے گھر سے بے تعلقی یہ بہت خطرناک اور اللہ تعالیٰ کو بہت ناراض کرنے والا عمل ہے۔

یوں تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کا کتنا وقت باقی ہے لیکن مجھے شدید شہ

میرا وقت اب زیادہ باقی نہیں ہے (اس لئے ضعف کے باوجود آٹھ

شیعیت سے متعلق کام مکمل ہو جائے) بہر حال وقت موعود کے

میں شدید خواہش ہے کہ میرے سامنے ہی تہلے اندر وہ تبدیلی آجائے

کم سے کم صرف تین باتوں کا عزم کر لو [۱] ایک مسجد

کی پابندی [۲] دوسرے جو دینی شخصیتیں میری معذوری کی وجہ سے گھر پر ان ہیں مثلاً حضرت

مولانا علی میاں مدظلہ، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب اور حافظ محمد اقبال صاحب جیسے حضرات

جو اس زمانے کے اہل اللہ میں سے ہیں اور وہ سب ہی حضرات جو دین کی نسبت سے میرے پاس

آتے ہیں ان کے ساتھ حسن تعلق [۳] تیسرے دینی مجالس اور دینی خدمت کے سلسلوں سے

کسی نہ کسی درجہ کا ربط و تعلق ————— ان میں سے کوئی بھی نہ محنت طلب کام ہے نہ کہیں آنے

جانے کا ————— قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا جو شخص

دنیا میں جن لوگوں سے خاص ربط و تعلق رکھے گا وہ آخرت میں انہیں کے ساتھ ہوگا۔

تم اس خط کو بار بار پڑھو اور اللہ تعالیٰ تم کو جو عزم و ہمت کا جو ہر کا دیا ہے اس سے کام لیکر فی

الحال صرف ان تین باتوں کا فیصلہ کر لو۔ والسلام (محمد منظور نعمانی)

یکم شعبان ۱۴۰۴ھ، یوم جمعہ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ابی علیہ الرحمۃ کی منشاء اور خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا

فرمائے، اور میں ان تین باتوں پر پوری طرح عمل کر سکوں جن کا تذکرہ نقل کردہ مکتوب میں کیا گیا ہے

، قارئین کرام سے بھی دعاؤں کے اہتمام کی استدعا ہے۔



محمد یحییٰ نعمانی

معلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

# نانا جان رحمۃ اللہ علیہ

کیا دیکھا ☆ کیا پایا

راقم سطور نے جس وقت ہوش سنبھالا، وہ وقت حضر۔

سرگرمی و نشاط اور خارجی اعمال و کوششوں کے بعد کا زمانہ تھا۔ ٹانگ کے ٹر پیرے۔ بیجہ۔ میں زیادہ چلنے پھرنے اور اسفار سے (تقریباً) معذوری ہو چکی تھی، عمومی ضعف کے علاوہ بلڈ پریشر کا عارضہ بھی مستقل ہی تھا اس لئے یہ کہنا بالکل جی بر حقیقت ہو گا کہ ان کی شخصیت کے متعلق میرا مشاہدہ بڑا محدود ہے۔ اور پھر اس مشاہدہ کا بھی ایک حصہ بچپن کی ابتدائی کچی اور نا پختہ عقل و فہم کا ہے۔ ایک چھوٹے بچے کو گھر کے بڑوں اور پھر اتنے بڑوں کی ذات سے جو سروکار ہوا کرتا ہے سب جانتے ہیں۔ اس کے علم میں کتنی باتیں آتی ہیں۔

الغرض میرے پاس بیان کرنے کو آخری ۱۵-۱۶ سال کے کچھ اپنے مشاہدات و تاثرات ہی ہیں اسی لئے کسی طرح میری تحریر کی حیثیت کسی سوانحی مضمون یا مقالہ کی نہیں ہو سکتی بلکہ میں نے اپنی فہم کی حد تک انکی ان چند خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہا ہے جن میں وہ ممتاز تھے۔ درحقیقت میں نے انکے اندر بعض غیر معمولی صفات دیکھیں۔ جن کے قلب و دماغ میں انمٹ نقوش ثبت ہو گئے ہیں ان میں یقیناً وہ ہم سب کیلئے قابل تقلید تھے۔

اخلاص و للہیت

اخلاص پورے دین کی روح ہے۔ دینی اعمال کی ساری اہمیت اسی پر منحصر ہے۔ حضرت



نانا جان کی ساری خصوصیات میں، میں اپنے علم شعور کی حد تک اس صفت کو انکا بنیادی امتیاز کہہ سکتا ہوں۔ میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ انہوں نے کوئی کام اللہ کی رضا کے علاوہ کسی اور غرض سے کیا ہو۔ جو کرتے اللہ کیلئے کرتے۔ وہ اپنے اخلاص کا خود امتحان لیتے رہے اور اپنا بذات خود محاسبہ کرتے رہتے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کی علالت اور معذوری کے بعد دارالعلوم کے منتظمین نے ان سے دارالعلوم میں چند گھنٹے پڑھانے کی فرمائش کی۔ ابتدا میں وہ صرف ایک گھنٹہ پڑھانے کیلئے راضی ہوئے مگر جب مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کی علالت کا سلسلہ دراز ہو گیا تو ان سے باقاعدہ دو گھنٹے بالمعاوضہ پڑھانے کی فرمائش کی گئی شروع میں وہ اپنی مصروفیت کی بنا پر راضی نہیں ہوئے۔ فرماتے تھے کہ بعد میں میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اپنے آپ کو اس منصب سے بڑا سمجھنے لگا ہوں، میں نے جائزہ لیا، بعد ازاں حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا صاحب کے مشورے پر اس ذمہ داری کو قبول کر لیا اگرچہ دو سالوں میں ہی اندازہ ہوا کہ تدریس کی ذمہ داری اور مطالعہ کی مشغولیت کی وجہ سے دیگر بہت سارے کاموں کا حرج ہو رہا ہے اس لئے پھر اس ذمہ داری سے معذرت کر لی۔

### اختفاء حال

مجلس میں گفتگو کرتے مگر اپنے بارے میں تقریباً نہیں، اپنا کوئی واقعہ نہ کوئی قصہ، ہم لوگوں کو بڑی تشنگی رہتی کہ انہوں نے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا کوئی اگر انکی کچھ ستائش کرتا یا کسی کام کی افادیت کا تذکرہ کرتا تو پہلے وہ اس کو اللہ کی توفیق و اعانت کا نتیجہ بتاتے اور اسکے بعد بھی اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہونے لگتے۔ مجلس میں انکی ناگواری کا اندازہ اس طرح ہوتا کہ چہرہ جھک جاتا اور کلمہ طیبہ یا استغفار کا زیر لب یا ہلکی سی آواز سے ورد شروع ہو جاتا۔ کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہو گی کہ ہمارے علاقہ میں بارش کی شدید کمی محسوس کی گئی لوگوں کو زبردست قحط سالی کا اندیشہ تھا۔ حضرت نانا جان اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی طرف سے نماز استسقاء کا اعلان کیا گیا، بعض اخباروں نے نماز کی خبر کے ساتھ دونوں حضرات کیلئے غیر معمولی تعریفی کلمات لکھے۔ اور اس سے بھی چند سال پہلے کا واقعہ لکھا کہ ایسی ہی قحط سالی کے نتیجے میں ہی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نے نماز استسقاء پڑھائی اور طویل دعا کرائی تھی اور واقعتاً لوگ اپنے گھروں کو بھگتے ہوئے پہونچے۔ بہر حال عین نماز استسقاء سے پہلے یہ واقعہ یاد ہے کہ مولانا جان نے اپنے بارے میں ان تعریفی کلمات کو مبالغہ آمیزی کی قرار دیا اور آ

کیلئے اس طرح کی باتوں سے اخبارات سے دور رہنے کی خواہش ظاہر کی۔

## انکسار و تواضع

تواضع کا وہ پیکر تھے۔ ہمارے آبائی وطن سنبھل کے قریب کے کسی دیہات سے ایک صاحب کسی سرکاری کام کے سلسلے میں لکھنؤ آئے، عمر تقریباً ۶۰ سال سے اوپر ہو گئی۔ انکی وضع قطع، ہیئت اور بات چیت سے تو اندازہ نہیں لگتا تھا کہ وہ حضرت نانا جان کو یا کسی عالم کو جانتے بھی ہو گئے بس ہو سکتا ہے کسی نے آتے وقت ذکر کر دیا ہو۔ نانا جان اس وقت کچھ لکھنے میں مشغول تھے لہذا کہلادیا کہ اس وقت مہمانوں کے کمرے میں آرام فرمائیں شام کو ملاقات ہوگی، وہ صاحب ناراض ہو گئے اور واپسی کیلئے سامان اٹھالیا میں نے آکر پوری بات عرض کی فوراً خود اٹھے (اگرچہ اس وقت بھی چلنا خوب مشکل تھا اور چھڑی کے سہارے ہی ممکن تھا۔ ساتھ اپنے کمرے میں لیکر آئے ان کی پوری بات سنی اپنے ساتھ بڑی سادگی سے معذرت خواہی کی اور انکے اس کام کے سلسلے میں آئے تھے۔

بعض ریسرچ اسکالرس نے اپنے تحقیقی مقالوں کیلئے درخواست اور اپنی شخصیت اور کاموں کے متعلق ضروری معلومات لکھوادیں، ایسا متعدد بار ہوا، مگر آپ نے ہمیشہ ازراہ تواضع و انکسار اور اپنی اخفاء کی افتاد کی بنا پر اس طرح کے تعاون سے معذرت لری، بلکہ ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ اس سے مجھے اپنی نیت کیلئے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ برادر محترم جناب عبید الرحمن سنبھلی بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ لکھنؤ میں مقیم تھے (۱) اور خطوط کے جواب کی ذمہ داری ان پر ہی تھی جب بھی ایسے خطوط آئے آپ نے یہی جواب دلویا کہ آپ کے حسن ظن پر اللہ آپ کو جزائے خیر دے میری ذات اس قابل نہیں ہے کہ اس کو باقاعدہ تحقیق و ریسرچ کا موضوع بنایا جائے راقم سطور سے بھی اس طرح کے چند جوابات لکھوائے گئے۔

ایک مرتبہ ایک تبلیغی اجتماع میں بیان کیلئے بہرائچ جانا ہوا، سفر میں رات کو دیر ہو گئی، اجتماع گاہ پہنچے جہاں سارے ہی لوگ سوچکے تھے، چپلوں کی جگہ پر ہی خالی جگہ ملی کسی کو جگانا مناسب نہ سمجھا وہیں بستر بچھایا اور چپلوں کے اوپر ہی سو گئے۔ آخر شب میں جب کچھ لوگ اجتماع گاہ سے باہر نکلے، تو وہاں کسی کو نامناسب جگہ سوتے ہوئے دیکھ کر بڑا سخت ست کہا مگر انکی پشیمانی کی کوئی انتہا نہیں رہی جب انہوں نے دیکھا کہ سونے والا کون ہے؟

(۱) ایک مدت سے آل انڈیا ریڈیو کی مارمات کے سلسلے سے دہلی میں قیام ہے۔

نانا جان کے نزدیک کپڑوں وغیرہ مظاہر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میری والدہ محترمہ کبھی عرض کرتیں کہ نئے کپڑے بنالیں تو فرمادیتے کہ بیٹی اب کپڑے کیا بنائیں اب کفن ہی بن جائے گا۔ اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔ ایک کرتا میں کافی عرصہ سے دیکھتا تھا۔ گھر میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ کرتا ۳۰ سال سے زیادہ پرانا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے برکت بھی اس میں عجب ہے کہ اب تک پھٹا نہیں۔ گذشتہ ۱۵-۱۶ سال میں ان کے لئے اندر پہننے کی بنیان نما کرتیاں تو کافی سلوائی گئیں مگر کرتے شاید ہی چارپانچ سے زائد سلے ہوں۔

ایک مرتبہ مغرب کے بعد لیٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اچانک آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، پھر آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اور فرمایا کہ اللہ کی خاطر ذلیل ہونا بھی بڑا اعزاز ہے اور یہ اللہ اپنے خاص محبوب بندوں کو ہی عطا کرتا ہے۔ اس کے بعد بعض بزرگوں کے اس سلسلہ کے واقعات سنائے۔

## رقت قلب

آپ کی رقت قلب کا حال دیکھنے والے ہی جانتے ہیں۔ شاید ہی اس زمانہ میں رقت قلب کا یہ حال کہیں دیکھا گیا ہو۔ تقریروں میں بھی خود رو رو پڑتے اور خوب خوب رلاتے، دھل سا جاتا۔ وعد و بشارت یا انداز و وعید کی کوئی آیت ہو یا کوئی حدیث کسی بزرگ کا تذکرہ ہو کوئی اہم واقعہ ہو، اگر بیان فرماتے تو بیان کرنا مشکل ہو جاتا۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھ جائیں آنکھیں بغیر جھپکے نہیں رہتیں۔

اکابر دیوبند اور سلسلہ ولی اللہی کے مشائخ سے حضرت نانا جان کو غیر معمولی قبلہ عقیدت اور ذوقی مناسبت تھی۔ حافظہ میں ان حضرات کے بے شمار واقعات ہمیشہ تازہ رہتے۔ جب کبھی تذکرہ نکل آتا اور کوئی واقعہ بیان فرماتے تو گریہ طاری ہو جاتا۔ ایک مرتبہ دارالعلوم کے طلبہ کی ایک جماعت ملنے آئی، ان سے بات کرتے ہوئے اسی طرح کے سیاق میں یہ فرمایا ہمارے اکابر کو نسبت بعض دیگر ممالک کے علما کے جو ممتاز کامیابی ملی اس کا سبب یہ نہیں تھ وہ علمی اعتبار سے ان سے بہتر تھے۔ بلکہ اس کا اصل سبب ان کی للہیت، زہد و تقویٰ، ذوق عبادت سادگی و اخلاص اور مجاہدہ کا مزاج جیسی صفات تھیں۔ ہمارے مدارس صرف ایک دانش گاہ تھے۔ بلکہ وہ دعوت و احیائے دین کی جدوجہد کے مراکز تھے۔ اور یہاں کی زندگی کا عمود، ہمارے لئے ایک ایسا نظام مقصد کی زندگی کا ہونا چاہئے۔ (پھر اس کے بعد دو باتیں

واقعات بھی سنائے)

## ذوق عبادت

اللہ تعالیٰ نے نانا جان پر جو احسانات فرمائے ہیں سمجھتا ہوں کہ ان میں ایمان کے بعد سب سے عظیم انعام عبادت کے باب کی وہ خاص توفیق ہے جو ان کو عطا ہوئی تھی، عبادت اور خاص طور پر ذکر و دعا جو تمام ہی عبادت کی روح ہیں ان کے لئے ذوقی اور طبعی چیزیں بن گئیں تھیں۔ خاص طور پر نماز میں تو ایسا معلوم ہوتا کہ صفت عبدیت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی نمونہ نہیں مل سکتا۔ انکی نماز روح نماز یعنی رجوع و انابت، خشیت و تضرع، اور حضوری کی کیفیات سے معمور ہوتی۔ عام طور پر نماز سوائے جماعت کی امامت کے طویل ہی پڑھتے لیکن خاص طور پر تہجد بہت طویل ہوتی جس میں کافی لمبی قرأت ہوتی تقریباً ایک ڈیڑھ پارہ یومیہ پڑھتے۔ بسا اوقات سورہ فاتحہ میں ہی کافی وقت لگ جاتا۔ ”اهدنا الصراط الہ“ آیات کو دھراتے جاتے، آواز کچھ بلند ہو جاتی اور آنسوؤں بھی ایسا ہی حال ہوتا تھا کسی آیت پر ایسا خوف طاری ہوتا بندھ جاتیں اور کہیں ایسا کیف ہوتا کہ محسوس ہوتا کہ ار کیفیات کے سبب ہے۔

رکوع و سجدہ دونوں طویل ہوتے۔ مگر سجدہ کچھ زیادہ لمبا ہوتا تھا۔ سجدہ میں مسنون و ماثور دعائیں بکثرت مانگتے۔ اور شاید ہی کوئی سجدہ آہ و بکا سے خالی ہوتا۔ ماثور دعاؤں سے ان کو خاص ذوقی مناسبت تھی، ٹانگ میں فریکچر کی وجہ سے مستقل تکلیف رہتی جس کی وجہ سے کھڑا ہونا بہت دشوار ہو گیا تھا اور اسی لئے نمازیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ مگر سجدے اتنے طویل ہوتے کہ اچھا بھلا صحت مند آدمی بھی تھک کر چور ہو جائے۔ سجدہ میں تسبیحات کے بعد دعاؤں کا سلسلہ جو شروع ہوتا تو یکے بعد دیگرے دعائیں آتی جاتیں۔ ایک ایک سجدہ میں کئی کئی کیفیات آتیں اور گزر جاتیں۔ گریہ کی وجہ سے سانس ٹوٹ جاتی، الفاظ منہ سے نہ نکلتے۔ نماز کے اختتام پر ”اللہم ایمی ظلمت نفسی ظلماً کبیراً“ سے شروع ہونے والی وہ مسنون دعا ضرور پڑھتے جو آل حضرت ﷺ نے حضرت ابو بکر کو تلقین فرمائی تھی اور اسکے ابتدائی چند کلمات بلا مبالغہ بیسیوں مرتبہ بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ دہراتے ... نماز کی یہ صورت و کیفیت کبھی کبھار کا واقعہ نہیں روزانہ کا معمول تھا، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسی نماز اپنی زندگی میں نہیں دیکھی، بس!!

لاتسأل عن حسہن و طولہن“  
رمضان المبارک میں ذکر و تلاوت وغیرہ کی مشغولیات بڑھ جایا کرتیں، ضعف و

کمزوری کے باوجود پورے رمضان میں پندرہ (۱۵) قرآن ختم کر لینے کا معمول رہا تھا۔ اور اس سے پہلے کا معمول اس سے زیادہ کارہ چکا تھا بالکل آخری سالوں میں جب ضعف اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور خود زیادہ تلاوت کی سکت نہ رہ گئی تھی تب بھی دوسروں سے قرآن مجید اور حضرت تھانویؒ کی مرتب کردہ دعائیں بھی پڑھا کر سنتے۔

سحری بس (شاید) سنت ہی کی ادائیگی کیلئے کرتے۔ عام لیام کے مقابلہ میں لمبی تہجد اور وتر ہوتیں اور جب بالکل چند منٹ باقی رہ جاتے تو دو چار لقمہ کھا لیتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ وقت سب سے قیمتی وقت ہوتا ہے اور عام طور پر لوگ اسے سحری کے غیر ضروری اہتمام اور فضول باتوں کی نظر کر دیتے ہیں۔ افطار سے قبل خود بھی دعا کا اہتمام فرماتے اور سارے ہی متعلقین کو اسکی ہدایت بھی کرتے۔

### علم و عمل کی جامعیت

نانا جان کا ایک خاص امتیازی وصف علم و عمل کی جامعیت اور توازن و اعتدال تھا۔ ایک طرف علمی رسوخ و گیرائی اور دوسری طرف وسیع تر عملی میدان اور متنوع و گونا گوں مشاغل و مصروفیات۔ جہاں تک علم کا تعلق تھا تو دینی علوم خصوصاً علم حدیث سے انکا خاص اشتغال تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز صاحب فن اساتذہ خصوصاً امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ اور حضرت شاہ صاحب کے علمی مزاج و مذاق سے وہ خاص طور پر متاثر تھے۔ اسکے علاوہ معارف الحدیث کی تالیف کی وجہ سے (جس کا سلسلہ کئی دہائیوں تک جاری رہا) ان کو حدیث میں غور و تدبر اور وسیع تر مطالعہ کا موقع ملا۔

فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے علم حدیث میں فتنوں اور فکری انحراف سے محفوظ رکھنے کی خاص تاثیر رکھی ہے۔ ہر زمانے کے مخصوص سیاسی و اجتماعی حالات نے امت مسلمہ کیلئے متعدد فتنے کھڑے کئے۔ بسا اوقات ان فتنوں کے سیلاب میں بہہ جانے سے جو لوگ بچ رہے وہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لیکن بحیثیت مجموعی امت کو انحراف سے بچانے والی چیز علم حدیث ہی ثابت ہوا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ علم حدیث کا مطالعہ صرف فقہی و کلامی مسائل کے تناظر میں کرنا خود علم حدیث کے ساتھ بڑی نا انصافی ہے جس سے ایک طرف سنت رسول کی اصل روشن و دیدہ زیب تصویر سامنے نہیں آ پاتی۔ اور دوسری طرف خود امت کیلئے علم حدیث بہت محدود ہو جاتا ہے ان کے نزدیک یہ مسائل سنت نبویہ کے 'مشتملات' کا ایک حصہ ہیں اور یقیناً وہ ان میں بھی رہنما ہے مگر اسکا اصل حصہ وہ محکمات ہیں جن میں امت میں کوئی

اختلاف نہیں ہے۔ اور وہ ہی سنت نبوی کا اصل پیغام ہیں۔ اور اس میں ساری امت کیلئے رہنمائی اور معرفت خداوندی کے بے شمار خزانے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید سلسلہ معارف الحدیث کی تالیف کا ایک مقصد سنت نبویہ پر غور و فکر کے انداز کو عام کرنا بھی رہا ہو اور اس میں متعدد جگہ اس طرح کے اشارات بھی آئے ہیں۔

وہ حکمت ولی اللہ کی تفسیر و تشریح کا ایک کامیاب ترین انداز سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جتنا مطالعہ اور علم بڑھتا جاتا ہے عمومی طور پر حضرت شاہ صاحب کی حکمت کی گہرائی عیاں ہو جاتی ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ کم از کم حجتہ اللہ البالغہ مدارس کے نصاب کا لازمی جزو ہو۔ مگر یہ فرمایا کہ اس کو پڑھانے کیلئے جیسے علماء مطلوب ہیں اب ان کی تعداد بہت کم ہے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ حجت اللہ اگر مشکوٰۃ شریف کی شرح نہیں ہے تو کم از کم اس کو سامنے رکھ کر ضرور لکھی گئی ہے مجھے خاص طور پر حجتہ اللہ کے باب حقیقہ۔  
التوحید، کے غور سے پڑھنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ یہ بحث تو ہے۔

والد ماجد (مولانا محمد زکریا صاحب) سناتے ہیں کہ جب تو بارہا ایسا ہوا کہ کسی مسئلہ میں مطالعہ کرتے کرتے صبح ہو گئی اور ایسا۔  
میں فوراً باجی (۱) کے پاس حاضر ہوا اور رات کے مطالعہ کا خلاصہ پیش کر کے اپنا اشکال رکھا انہوں نے دو جملوں میں کوئی ایسی بات فرمادی کہ سارا مسئلہ حل ہو گیا۔  
حدیث کے علاوہ تفسیر و فقہ پر بھی نظر کم نہ تھی اگرچہ تفسیر و فقہ کو مستقل موضوع بنا کر انہوں نے کوئی محنت نہ کی تھی سوائے عمومی مطالعہ کے جو ان کی زندگی کا جز تھا۔ ایک مرتبہ اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ اصول تفسیر میں اسلامی مکتبہ میں بڑا خلا ہے۔ چند نقوش اولیں قسم کی چیزوں کے علاوہ اس موضوع پر کوئی چیز نہیں ملتی اسباب نزول کے سلسلہ میں وہ شاہ ولی اللہ کے نقطہ نظر کے مداح تھے۔ نیز نسخ کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ شاہ صاحب کی بیان کردہ آیات کی تعین و تعداد میں کوئی اختلاف ہو سکتا ہے۔ البتہ شاہ صاحب نے جو نقطہ نظر حقیقتِ نسخ اور مفسرین کے یہاں اسکے استعمال کے متعلق پیش کیا وہ بہت تحقیقی ہے۔

شرعی علوم میں اس گہری بصیرت کا نتیجہ انکا علمی اعتماد و توازن تھا بڑے سے بڑے معرکۃ الآراء مسئلہ میں اعتماد کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ہر رائے کو اسکے اپنے

زاویہ نظر سے دیکھتے ان کی متعدد کتب، معارف الحدیث، دین و شریعت، اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور ہندوستان کے علماء حق پر اسکے اثرات نامی کتاب میں اسکے بہت سارے شواہد ملتے ہیں۔ اسکے علاوہ الفرقان کے فائلوں میں ایسے کافی مقالات و مضامین موجود ہیں جو دو مختلف انتہا پسند رایوں کے درمیان راہ اعتدال کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

عام علمی اشتغال اور لکھنے پڑھنے کی مصروفیتوں نے آپ کو دوسرے دینی و ملی تقاضوں سے غافل نہیں کیا دعوتی و ملی کاموں کیلئے دوروں و اسفار کی ایسی کثرت رہتی تھی کہ ہر وقت گھر پر سفر کا سامان تیار رہتا تھا۔ ایک نہیں دو دو بستر بندھے رہتے کہ مبادا ایک سفر سے آئے اور اس قابل نہ ہو کہ اگلے سفر میں جاسکے تو دوسرا بندھنے اور تیار کرنے کی وجہ سے کچھ تاخیر نہ ہو۔

راقم کو انکی اس خاص کیفیت دیکھنے کا تھوڑا بہت موقعہ اس وقت ملا جب وہ ایرانی انقلاب اور شیعیت کی تالیف میں مشغول تھے۔ حالات کی نوعیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اس انقلاب کی فتنہ سامانیوں اور کسی تدارک نہ کرنے کی صورت میں اسکے خطرناک نتائج کا اندازہ (کم از کم اس وقت) بہت ہی کم لوگوں کو تھا حضرت تانا جان اس انقلاب کو محض ایک سیاسی انقلاب نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسکے نزدیک یہ انقلاب ایک عالمی شیعہ دعوت کا قیام تھا جو زبردست مشنری طاقتوں، حکومتی ذرائع، افرادی جوش و حوصلہ اور بلا کے ذہین دماغ جیسے وسائل سے لیس تھی جسکا کام ایران کے انقلاب کے بعد ختم نہیں بلکہ شروع ہوا تھا۔ دوسری طرف ایرانی حکومت کے خیرہ کن پروپیگنڈے اور جذباتی نعروں نے انقلاب کے ظلم و بربریت اور سفاکیوں ہی نہیں بلکہ انقلاب کے حقیقی مقاصد پر ایسا خوشنما پردہ تانا ہوا تھا کہ مسلم عوام ہی نہیں اہل فکر و دانش حضرات کی زبانیں بھی تحسین و آفریں کی صداؤں سے نہ جھلکتی تھیں۔ گویا عالم اسلام میں ایک ہمہ گیر شیعہ دعوت کیلئے زمین تیار ہو چکی تھی۔ بلکہ کئی ممالک خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکہ اور افریقہ کے متعدد ممالک سے ایرانی داعیوں کی عملی سرگرمیوں کی اطلاع بھی ملنی شروع ہو چکی تھی۔

اس صورت حال نے ان کو بے چین کر دیا، اور وہ اپنے ضعف پیری و سارے عوارض بھلا کر ایک نئی مہم پر اتر گئے پہلے انتہائی توسعہ کیساتھ انقلاب کی تاریخ، پس منظر و محرکات اور ٹیم کی شخصیت کا مطالعہ کر کے کتاب لکھی پھر برصغیر ہندوپاک و بنگلہ دیش کے علماء و اصحاب فضل کو اس کے ذریعہ فرد افراد مخاطب کیا۔ کتاب کے نسخے بھیجے، مراسلات کی، اس مطالعہ کے نتیجے میں ان پر یہ بھی منکشف ہوا کہ اثنا عشری عقائد و آراء مکمل طور پر کفریہ ہیں اور اسی صورت

حال کا تقاضہ ہے کہ ان کو ایک استفتاء کی شکل میں مرتب کر کے ارباب افتاء سے رائے طلب کی جائے اور اگر انکی رائے بھی یہی ہو تو عوامی آگاہی کیلئے اسکو نشر بھی کیا جائے۔ انہوں نے ایک مفصل استفتاء مرتب کر کے ہندو بنگلہ دیش کے تمام قابل ذکر علماء و اصحاب افتاء اور اداروں کو بھیجا اور اس سلسلہ میں وہ اتفاق رائے پایا گیا کہ جسکی خود حضرت نانا جان کو بھی توقع نہ تھی اس کی پوری تفصیل الفرقان (اور دیگر کئی رسالوں) نے اپنی خصوصی اشاعتوں میں محفوظ کر دی ہے۔

اسی مقصد کیلئے والد ماجد (جناب مولانا محمد زکریا صاحب) اور خال محترم جناب مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی کو لیکر سعودی عرب کا سفر کیا، اور وہاں کے ذمہ داروں اور علماء سے ملاقات کر کے ان کی توجہ اس فتنہ اور اسکے وسیع تر عزائم و خطرناک منصوبوں اور عالم اسلام کی تشویشناک صورت حال کی طرف مبذول کرائی، ان کا خیال تھا کہ ایک عظیم جگہ کا پروپیگنڈہ کا مقابلہ کوئی حکومت یا حکومتی وسائل رکھنے والی تحریک ہو کہ وہاں کے علماء اس فتنہ کی خطرناکی کا کسی حد تک احساس تو رہے بنا پر کچھ کرنے کیلئے اپنے پاس گنجائش نہیں پاتے۔ مجھے اس وقت کی انکی کیفیتیں یاد ہیں۔ ان کو نہ اپنے امراض

بلڈ پریشر تشویش انگیز حد تک بڑھا ہوا تھا اور وہ دن رات مطالعہ اور تالیف میں سبوں رہے اس خانہ کی منتیں سماعتیں ڈاکٹروں کے اصرار، سب ایک طرف اور انکی اپنی دھن ایک طرف، یہ تک ہوتا کہ رات کو جب سب سو جاتے وہ اٹھتے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور ایک ہاتھ میں کتاب لیکر مطالعہ میں مشغول ہو جاتے اور اوپر اس انداز سے لحاف ڈھک لیتے کہ روشنی کی کوئی کرن باہر نہ نکلنے پائے خال محترم جناب حسان نعمانی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ اس طرح آپ اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے۔ فرمایا میں اس کام سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتا ہوں اس لئے کہ میرے علاوہ بظاہر کوئی یہ سب کرنا نظر نہیں آتا چاہتا ہوں کہ اپنے وقت کے آنے سے پہلے یہ کام کرتا جاؤں۔

## دینی غیرت و حمیت

آپ کی ایک خاص صفت، دینی غیرت و حمیت تھی وہ اللہ کے دین کو نقصان پہنچتا دیکھ کر تڑپ جاتے اور کچھ کرنے کیلئے بے چین ہو جاتے اور اس پر خاموش رہنا ان کیلئے ممکن نہ ہوتا ایک واقعہ میرے سامنے کا ہے جس سے انکی شدت غیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔



دہلی کے ایک صاحب نے مساجد سے متعلق ایک تنظیم بنائی اور اسکی بالکل ابتدا میں انہوں نے حضرت سے اپنی تنظیم اور اسکے مقاصد کا ذکر کیا۔ اس تنظیم کے مقاصد جو بھی رہے ہوں لیکن فی الواقع اسکا نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ مسلمانوں کی مساجد براہ راست حکومت کی دست درازیوں اور مکمل دخل اندازی کا شکار ہو جائیں۔ حضرت نے پہلے تو اسکے مضر پہلوؤں (جو ایک عام آدمی کیلئے بھی واضح تھے) کی طرف توجہ دلائی مگر جب انہوں نے اپنی بات پھر دہرائی تو بات برداشت سے باہر ہو گئی، چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور بلند آواز سے کہا، بھائی میں یہ سننے کی سکت نہیں رکھتا، خدا مجھے وہ دن نہ دکھائے، انہوں نے پھر کچھ عرض کرنا چاہا، پھر فرمایا میں کچھ نہیں سن سکتا بس اب آپ چلے جائیں۔ انکے جانے کے بعد بھی طبیعت متاثر رہی لیٹ گئے لیکن طبیعت کی بے چینی کم نہیں ہوئی بلڈ پریشر چیک کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کافی بڑھا ہوا تھا۔

### صبر و تحمل

کیسی ہی شدید تکلیف ہو اور کیسا ہی مشکل مرحلہ ہو ان کی زبان شکر ہی ادا کرتی رہی۔ زبان پر حرف شکایت تو درکنار اشارہ بھی کبھی قلت رضا کا گزر نہیں ہوا۔ آخری چند سالوں میں معذوری کے ساتھ تکلیفیں بھی بڑھ گئیں تھیں مگر کبھی چہرے کے تاثرات سے بھی شکوے کا اندازہ نہ ہوا۔ آنکھ کا پہلا آپریشن ہوا اور ناکام ہو گیا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ آنکھ کا باقی رہنا بھی مشکل تھا خدشہ تھا کہ شاید آنکھ نکال دینی پڑے۔ اس وقت ڈاکٹروں کی رائے یہ ہوئی کہ براہ راست آنکھ کی پتلی میں صبح و شام دو وقت اعلیٰ طاقت کے اینٹی بائیٹک انجکشن لگائے جائیں تو شاید آنکھ بچ جائے۔ مگر مشکل یہ پیش آئی کہ کسی وجہ سے آنکھ پر سن کرنے والی دوائی اثر کرنا بند کر دیا یعنی اب آنکھ کی پتلی میں بغیر سن کئے انجکشن لگنا تھا۔ ڈاکٹروں کو کسی طرح ہمت نہیں ہوتی تھی الغرض آپ سے عرض کیا گیا فرمایا کہ اگر آپ حضرات کی رائے ہے تو کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ صبح شام دونوں وقت آنکھ کی پتلی میں انجکشن لگے۔ اللہ سب کو عافیت دے اس تکلیف کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مگر آہ کہ صبر کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب انجکشن کی سوئی اندر جاتی تو شدت تکلیف میں اللہ ہی کا نام نکلتا اور جب دوا انجکٹ کی جاتی تو اس سے بھی زیادہ درد ناک انداز میں اللہ ہی کا نام نکلتا اور جیسے ہی سوئی باہر آتی تو پھر زبان سے بجائے تکلیف کے اظہار کے بس الحمد للہ ہی چند بار نکلتا۔

## حقوق العباد میں احتیاط

حقوق العباد کا معاملہ بڑا سنگین ہے حضرت نانا جان کے یہاں اس کی بڑی فکر تھی اپنے خوردوں بلکہ خوردوں کے خوردوں تک کو اگر کبھی کچھ کہہ دیتے تو تھوڑی ہی دیر کے بعد معافی مانگ لیتے۔ اور بغیر کسی واقعہ کے بھی کبھی کبھی سب سے معافی مانگتے۔ میں نے انکی زبان سے اس پورے ۱۴-۱۵ سال کے عرصہ میں کسی چھوٹے بڑے کی غیبت نہیں سنی۔ شاید عام حالات میں اس کو مبالغہ سمجھا جائے کہ اس پورے عرصہ میں صرف ایک مرتبہ انہوں نے ایک دینی ضرورت سے ایک صاحب کی ایک کمزوری میرے سامنے ذکر کی۔

انہوں نے اپنے یرس (ہوئے) میں اپنے خرچ اور زکوٰۃ و صدقات اور دیگر امانتوں کے لئے الگ الگ حصے مقرر کر رکھے تھے اور گھر کے سب لوگوں اور خدام کو اسکی اطلاع بھی کر رکھی تھی، کہیں آپس میں مل نہ جائیں۔

یہ چند تاثرات اور کچھ منتشر سی یادیں تھیں جو قلمبند

کہ ان سطروں میں حضرت نانا جان کی ذات والا صفات کی بس کچھ سے دعا ہے کہ ہم سب کو آپ کی ان صفات کی اتباع کی توفیق عطا

☆☆☆

ڈاکٹر محمد مسلم شبنم نوری  
سربراہ شعبہ فارسی ممتاز ڈگری کالج، لکھنؤ

## عجب اک مطلع انوار تھے منظور نعمانی

شریعت کے علمبردار تھے منظور نعمانی طریقت کے حسیں کردار تھے منظور نعمانی  
فقیہ عصر حاضر اور محدث عالم و فاضل مبلغ تھے بڑے دیندار تھے منظور نعمانی  
کیا نور قلم سے چاک سینہ کفر و ظلمت کا عجب اک مطلع انوار تھے منظور نعمانی  
مفکر مصدر علم و عمل خلق و محبت تھے سراپا پیکر ایثار تھے منظور نعمانی  
گذاری عمر ساری دین حق کی پاسبانی میں مجاہد عالم بیدار تھے منظور نعمانی  
رواں ہیں قافلے تبلیغ کے جو سارے عالم میں انھیں کے قافلہ سالار تھے منظور نعمانی  
کہاں سے لائے گی دنیا بھلا اب ایسی شخصیت گل صدر نگ تھے، گلزار تھے منظور نعمانی  
نکلتا ہے انھیں کے نام سے سال وفات انکا یہیں تک زیت کے حقدار تھے منظور نعمانی

شبِ اہلسنیہ تھیں تمام سویریاں مارشِ ذی الحجہ وصال یار سے سرشار تھے منظور  
بشیش پیروی حضرت نعمان اے شبنم والدہ مر  
خاصہ  
اسی نسبت کے وہ حقدار تھے منظور نعمانی

جناب حافظ سید محمد صدیقی

## باتیں جو یاد رہ گئیں

”حافظ سید محمد صاحب تقریباً بارہ سال ادارہ القرآن سے وابستہ رہے ہیں۔ اور دل کا ہر لمحہ وابستہ ہیں، تبلیغی کام سے بھی نوعمری ہی سے تعلق ہے۔ جماعتوں میں بھر رہے ہوئے انھیں اوقات کی کچھ باتیں انھوں نے ہم کو قلمبند کر کے دی:

لکھنؤ میں جب تبلیغی کام شروع ہوا اور جماعتیں نکلنے لگیں تو جماعت جانوروں کے گھر پر تحقیق کے لئے آیا کرتے تھے کہ آپ جماعت میں کیوں گئے تھے اور کیا بیان کیا اور اس کام کا مقصد کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مولانا کے پاس بھی اس محکمہ کے لوگ اسی طرح تحقیقات کے لئے آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا علی میاں مدظلہ دعوت و تبلیغ کے سلسلہ سے عرب ممالک کے سفر پر تشریف لے گئے تھے۔ اس زمانے میں مولانا بلوچپورہ میں رہتے تھے۔ رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا۔ مولانا اعتکاف میں تھے، سی، آئی، ڈی، کے ایک صاحب آئے اور مسجد میں ہی مولانا سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تبلیغی کام سارے ہندوستان میں ہو رہا ہے بلکہ اب تو جماعتیں عرب و دوسرے ممالک میں بھی جا رہی ہیں، اتنا بڑا کام ہو رہا ہے مگر اس کا نہ کوئی دفتر ہے، نہ صدر، نہ سکرٹری پھر یہ کام کیسے چل رہا ہے۔ مولانا نے ان صاحب سے پوچھا کہ آپ کے مذہب کا بانی کون ہے۔ انھوں نے یہ مذہب کیسے پھیلایا، ان کا دفتر کہاں تھا۔ اس کا صدر، سکرٹری کون تھا۔ سی، آئی، ڈی، والے نے جواب دیا کہ ہمارا مذہب تو ریشیوں، منیوں نے پھیلایا نہ ان کا کوئی دفتر تھا، نہ صدر تھا نہ سکرٹری مولانا نے فرمایا کہ یہ کام بھی ریشیوں، منیوں والا ہے۔ اس کا نہ کوئی صدر ہے نہ سکرٹری اور نہ کوئی دفتر

ہے جب تک ریشیوں، مینوں کے طریقہ پر ہوگا چلتا رہے گا۔ جس دن اسکا صدر اور سرکریٹری بنا دیا جائیگا یہ کام ختم ہو جائیگا۔ یہ سن کر اس نے جواب دیا کہ مولانا صاحب! ہماری سمجھ میں تو بات آگئی مگر ہم اپنے افسر کو نہیں سمجھا سکتے۔ ہم تو آپ کے پاس (اپنی ڈیوٹی نبھانے) آتے ہی رہیں گے۔

ایک مرتبہ ٹرین کے سفر میں ایک پنڈت جی کا ساتھ ہو گیا جو کافی پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ اردو اور فارسی سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے مولانا سے پوچھا کہ یہ سوال ہم کئی لوگوں سے کر چکے ہیں مگر کسی نے اطمینان بخش جواب نہیں دیا وہ یہ کہ خدا کو آپ بھی مانتے ہیں ہم بھی مانتے ہیں پھر آپ اپنے آپ کو مسلمان اور ہمیں کافر کیوں کہتے ہیں؟ مولانا نے جواب دیا کہ صرف ”کو“ اور ”کی“ کا فرق ہے۔ ہم خدا کو بھی مانتے ہیں اور خدا کی بھی مانتے ہیں اس لئے مسلمان ہیں۔ آپ خدا کو تو مانتے ہیں مگر خدا کی نہیں مانتے اس لئے کافر ہیں۔ پنڈت جی نے کہا ”مولانا صاحب! آپ نے بہت مختصر جواب سے مسئلہ حل کر دیا ورنہ ہم بہت لوگوں سے یہ سوال کر چکے تھے۔ سب نے بڑے تفصیلی جوابات دیئے مگر کوئی ہمیں مطمئن نہ کر سکا۔“

ایک مرتبہ میں اپنے تینوں بیٹوں کو مولانا کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ چھوٹے دونوں کار حجان دینداری کی طرف تھا بڑے بیٹے میں اس لحاظ سے کمی تھی۔ میں نے مولانا سے پہلے ہی بات کر رکھی تھی کہ ذرا آپ بڑے والے کو نصیحت فرما دیجئے گا۔ مولانا نے بڑے کے بجائے دونوں چھوٹوں کو نصیحت کی۔ مقصود یہ تھا کہ شیطان انہیں دینداری کے زعم میں مبتلا نہ کر دے کہ دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھنے لگیں اور ”کبر“ میں مبتلا ہو جائیں۔

جماعت کے ایک سفر میں ضلع بستی کے ایک گاؤں میں جانا ہوا۔ گاؤں کا راستہ خراب تھا۔ مقامی ذمہ دار سواری کے لئے ہاتھی لائے اس پر بیٹھ کر مولانا گاؤں تشریف لے گئے۔ مگر واپسی میں کئی کلو میٹر پیدل چل کر آئے ہاتھی پر نہیں بیٹھے فرمایا اس پر بیٹھنے سے ”کبر“ پیدا ہوتا ہے۔

لہ  
ص  
صل

ایک مرتبہ فرمایا کہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حیوانی اور شیطانی۔ لوگ حیوانی

کو بڑا سمجھتے ہیں حالانکہ شیطانی گناہ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ چوری، ظلم، اور زنا، وغیرہ حیوانی گناہ ہیں اور بہتان، غیبت، کبر وغیرہ شیطانی گناہ ہیں۔

ایک تبلیغی سفر میں بڑی جماعت ساتھ تھی۔ تقریباً دس کلومیٹر جانا تھا۔ جاتے وقت سب کے لئے سواریوں کا انتظام ہو گیا لیکن واپسی میں صرف چار یکوں (ٹانگوں) کا انتظام ہو سکا۔ مولانا نے کمرہ اور تازک مزاج لوگوں کو سواری پر بٹھادیا باقی سارے ساتھیوں کو پرانے واقعات سناتے ہوئے پیدل لے آئے۔ اتنا لمبا سفر تھا لیکن ساتھیوں کو پتہ بھی نہیں چلا۔

ایک دفعہ مولانا کے ہمراہ ہم چار ساتھی گورکھپور جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ ریلوے کراسنگ پر ٹرین رک گئی۔ ہم اتر کر نماز پڑھنے لگے۔ مولانا امامت کر رہے تھے۔ شروع ہوتے ہی سیٹی کی آواز آئی۔ مولانا نے بہت مختصر نماز پڑھا۔ کی ایک رکعت چھوٹ گئی تھی ان کی نیت تڑوا کر سب کو جلدی جذبہ میں چلتی ٹرین میں بیٹھے۔

ایک بار عید الاضحیٰ کے موقع پر لکھنؤ کے ایک علاقہ میں فساد ہو گیا تھا۔ دوسرے دن ہفتہ واری اجتماع میں بیان فرمایا کہ اسلام جذبات سے نہیں روکتا مگر ہوش کے ساتھ اور فرمایا کہ جذبات کے گھوڑے پر سوار رہو مگر عقل کی مشعل ہاتھ میں رہے۔

جس زمانے میں ندوۃ العلماء میں جمعرات کا اجتماع ہوتا تھا۔ بیان کے بعد حسب معمول دعا بھی ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی دعا نہیں کراتے تھے اور فرماتے تھے کہ کہیں یہ بھی رسم نہ بن جائے اور لوگ دعا کو بھی ضروری سمجھنے لگیں۔ ایک مرتبہ نویں ذی الحجہ کو مختصر بیان کر کے فرمایا کہ آج صرف دعا ہوگی کیونکہ حجاج کرام میدان عرفات میں دعائیں مصروف ہوں گے۔ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے یہ کہہ کر طویل دعا کرائی، خود بھی روئے اور سارا مجمع روتا رہا۔

ایک مرتبہ تبلیغ کے کام کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اس کام کو حق اور ضرورت سمجھ کر رہا ہوں۔ جس روز دیکھوں گا کہ اس میں رسمیت آگئی ہے تو منظور پہلا شخص ہو گا جو اس کام کی

مخالفت کرے گا۔

ایک دفعہ انا وہ کے اجتماع سے واپسی میں کانپور میں گاڑی بدلنا تھی۔ کینٹین میں چائے پینے گئے اس وقت چائے کی قیمت چار آنے تھی مولانا نے کینٹین کے ملازم کو الگ سے ایک روپیہ دیا۔ پھر فرمایا کہ یہ سمجھتا ہے کہ مولوی لوگ کچھ دیتے نہیں، ان کی طرف کم توجہ دیتا ہے اب ان کی طرف بھی توجہ کرے گا۔

ایک حجام کو خط بنوانے کے لئے گھر پر بلوایا۔ اس زمانے میں خط بنوائی دو آنے پڑتے تھے مگر مولانا نے اس کو ایک روپیہ دیا۔ مولوی حسان یا مولوی سجاد میاں نے بہت غور سے دیکھا۔ بعد میں مولانا نے فرمایا کہ میں نے خط بنوائی نہیں دی بلکہ وہ اپنا وقت خرچ کر کے آیا ہے اس کے وقت کے پیسے دئے ہیں آئندہ جب بھی بلوائیں گے فوراً آجائے گا۔

اسی طرح رکشہ سے کہیں جانا ہوتا تو پیشگی کر لیا طے کر کے رکشہ پر بیٹھتے مگر بعد میں اکثر ویبشتر رکشہ والے کو زیادہ پیسے دیتے۔

ایک مرتبہ نکاح پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ مہر کی رقم لڑکے کی حیثیت سے زیادہ تھی۔ مولانا نے سمجھایا مگر لڑکی کے والد مہر میں کمی کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ مولانا نے نکاح نہیں پڑھایا اور واپس آ گئے۔

ہمارے ایک ساتھی کے نکاح میں شرکت کی اور نکاح پڑھایا۔ مولانا کے احترام میں لوگ نکاح کے بعد خاموش بیٹھے رہے اور چھوہارے یونہی رکھے رہے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ خوشی کا موقع ہے یار خجنگا۔ یہ کہہ کہہ چھوہارے خود ہی لٹا دیئے اور خود بھی لے لیا۔

مرکز کے قیام کے زمانہ میں نماز جماعت کی امامت مولانا ہی فرماتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نیت باندھنے کے بعد توڑ دیتے اور پھر دوبارہ نیت باندھ دیتے۔ بعض لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ بغیر استکھار کے نیت باندھ لی تھی۔ نیت باندھنے سے پہلے استحصار (یعنی دل دھار)

ع م

پوری طرح حاضر ہونا) ضروری ہے۔

ایک مرتبہ ہم الفرقان کا چندہ وصول کر کے لائے اور تھیلے میں رکھ کر کسی کام سے پوسٹ آفس چلے گئے۔ واپس آ کر دیکھا تو تھیلے میں روپے نہیں تھے۔ دفتر الفرقان میں ہم اور ہمارے ایک ساتھ صرف دو آدمی تھے۔ ہم نے مولانا سے ذکر کیا تو پوچھا کہ کسی پر شک ہے۔ ہم نے اپنے دوسرے ساتھی پر شک ظاہر کیا کیونکہ تیسرا کوئی آدمی وہاں آیا نہیں تھا۔ مولانا نے فرمایا اتنے نیک آدمی پر شک کرتے ہو۔ فوراً ان سے معافی مانگو کہ ہم نے آپ پر ناحق شک کیا۔ دوسرے دن مولانا نے پھر دریافت فرمایا کہ تم نے معافی مانگ لی؟ ہم نے کہا ابھی نہیں۔ مولانا نے فرمایا کسی پر شک کرنا بہت بڑا گناہ ہے، معافی مانگ لو۔

۵۷ء میں لکھنؤ کے مرکز کی پہلی مرتبہ تعمیر ہوئی۔ تعمیر نگرانی میں ہوا تھا۔ تعمیر کے بعد مولانا دیکھنے کے لئے تشریف اچاروں طرف پھول پتی کی نیل کا بارڈر بنا ہوا تھا۔ مولانا وکیل صاحب اس کی کیا ضرورت تھی۔ قوم کا پیسہ برباد کیا۔ وکیل صاحب نے کہا میٹیریل بیچ کیا تھا اسی سے بنوادیا۔ مولانا نے فرمایا کہ اسے بنانے میں کئی دن لگ گئے ہوں گے۔ اس کی مزدوری تو دینا پڑی ہوگی۔ یہ اسراف ہے اور جائز نہیں ہے۔

ایک دفعہ ایک تعلق والے صاحب کے یہاں ایک تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے، وہاں بہت سادگی تھی۔ صرف روشنی ضرورت سے زیادہ تھی۔ روشنی دیکھ کر فوراً اسی رکشہ سے واپس آ گئے۔ تقریب میں شرکت نہیں فرمائی۔ اللہ ان کی قبر میں زیادہ سے زیادہ روشنی عطا فرمائے۔



عبدالرؤف صدیقی  
ایڈیٹر ”ٹریڈ کرائیکل“۔ کراچی

## علم و عمل کی ایک جیتی جاگتی شخصیت

چار اور پانچ مئی ۱۹۹۷ء ششی کی درمیانی رات مسلمانوں کے لئے غم و اندوہ کی دردناک تکلیف لے کر آئی تھی۔

ہر کام کے لئے ہر چند کہ ایک وقت معین ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی بعض امور، وقت کے ہاتھوں اس طرح انجام پاتے ہیں کہ دل و دماغ سارے کلیے بھول کر، ایک جان لیوا غم کے غار میں گرتے چلے جاتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ایک سانحہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۴۱۷ قمری کو ظہور پذیر ہوا جس نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ صد ہا افراد ملت اس وقت دھاڑیں مار مار کر رونے لگے جب انھیں معلوم ہوا کہ عہد حاضر میں اسوۂ محمدی کے عالم اور پابند عالم دین اور محدث وقت مولانا محمد منظور نعمانی اللہ کو پیارے ہو گئے۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے پیارے تودہ زندگی بھر رہے ہوں گے، بالآخر انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کو سوپ دی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ”کا قیام“ (از ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۶ء) بریلی کے ”گھیر عبد القیوم“ کے ایک مکان میں تھا۔ میری اوائل عمری تھی۔ گھیر عبد القیوم صاحب مرحوم میں قریب قریب ہم ایک ہی خاندان کے افراد رہتے تھے۔

وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے میں بھی بڑا ہوتا گیا مولانا سے قلبی تعلق دوسری جنگ

عظیم کے آخری دنوں (۱۹۳۱ شمسی) میں ہوا تھا میری نشست گاہ حضرت مولانا کے دفتر (ماہنامہ ”الفرقان“) سے متصل تھی میں ایسے اخبارات کا مطالعہ باقاعدہ کیا کرتا تھا جو اس زمانہ میں سیاسی دنیا کے ممتاز اخبارات تھے۔ ان میں ”مدینہ“ (بجنور یو۔ پی) مولانا عثمان فارقلیط کی ادارت میں شائع ہونے والا روزنامہ ”الجمعیۃ“ (دہلی) اور روزنامہ ”زمزم“ (لاہور) میرے مطالعہ میں رہتے تھے، صحافت کا چمکہ مجھے اسی دور سے لگا۔ مولانا مرحوم کے ساتھ دو ایک مرتبہ تبلیغی جماعت کے اجتماع میں حاضری کا موقع بھی مجھے ملا۔

میرے محلہ میں جو مسجد تھی، مولانا نعمانیؒ اس میں اعزازی خطیب تھے۔ مولانا کا انداز بیان نہایت سلیس، سبکھا ہوا، عام فہم اور دل پر برہ راست اثر کرتا تھا میرے خاندان کے تمام جوان اور بزرگ حضرات اگرچہ مولانا کے عالم باعمل ہونے کی صفات عالیہ اور حسن کردار سے بہت متاثر تھے اور اتنا ہی ان کا احترام بھی کرتے تھے لیکن ان کی پیرہن کے جس کا مجھے آج بھی تکلیف دہ احساس ہوتا ہے۔

حضرت مولانا صاحب فجر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے۔

تھے یہ ان کا معمول تھا۔ ماہنامہ ”الفرقان“ جس کا اجراء انھوں نے پاکستان سے چند سال پہلے جب مولانا بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے تو ”الفرقان“ دس سو ہو گیا۔

پاکستان آ جانے کے بعد دو یا تین مرتبہ حضرت نعمانی صاحبؒ کی قدم بوسی کے لئے لکھنؤ گیا وہ کتنے شفیق اور مجھ سے کس قدر محبت فرماتے تھے اسے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں جب لکھنؤ جاتا تو قیام مولانا کے دولت کدہ پر کرتا تھا مولانا چونکہ کہیں گئے تھے جس سے ان کی کولھے کی ہڈی اتنی متاثر ہو گئی تھی کہ وہ چل پھر نہیں سکتے تھے۔ لیکن دوران قیام میں مجھے ناشتہ اور رات کا کھانا اپنے سامنے کھلاتے تھے اور مجھ سے نام بنام میرے خاندان کے ایک ایک فرد کی خیر و عافیت دریافت فرماتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا علیہ الرحمہ ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانہ میں موٹر کے اجلاس میں شرکت کے لئے مولانا علی میاں صاحب کے ہمراہ پاکستان آئے تھے اور ان سے میری ملاقات ہوئی تھی اس سے آٹھ دس سال پہلے حج کے موقع پر منی میں ان سے اس وقت ملاقات ہوئی جب مولانا علیہ الرحمہ شیطان کو کنکریاں مار کر آرہے تھے اور میں کنکریاں مارنے جا رہا تھا۔ اس موقع پر ان سے تفصیلاً ملاقات ہوئی۔

مولانا نعمانی صاحب مرحوم و مغفور کا دامن طعن و تشنیع، طنز و مزاح اور عیب جوئی سے پاک رہا۔ ملی فروغی مسائل پر انہوں نے اپنے دامن کو کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔

**تقسیم ہند کا مسئلہ**

ہندوستان کی تقسیم کے مسئلے پر ہندوستان کے علماء دین دو بلاکوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ہمارا گھرانہ مسلم لیگی تھا لیکن مولانا نے کبھی مسلم لیگ کو اپنی مخالفت کا نشانہ نہیں بنایا۔ اگرچہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے بٹوارے سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہوں گے انہیں اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ چند گمراہ جو شیلعے نوجوان اپنے علماء دین کے ساتھ جو ناشائستہ برتاؤ کر رہے ہیں وہ شعائر اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ ہندوستان کی تقسیم سے یہاں کے مسلم باشندے جو کرداروں کی تعداد میں ہیں ان کے مصائب و آلام ختم نہیں ہو سکیں گے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ شعائر اسلامی کی خلاف درزی، جن گمراہ نوجوانوں سے سرزد ہوئی اس کا کفارہ آج ہم سب لوگ ادا کر رہے ہیں، ہم میں رواداری قطعی مفقود ہو گئی ہے کبھی جاگیرداروں کے نام پر کبھی صوبائیت کے نام پر، کبھی فرقہ داریت کے نام پر کبھی چھوٹی چھوٹی برادریوں اور قبیلوں کے نام پر یہاں خواہ مخواہ بے بات کے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان لے رہا ہے، مسلمانوں کو کھلے عام لوٹ رہا ہے۔ مسلمان، مسلمانوں کے ہاں ڈاکے ڈال رہے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کی املاک تباہ کر رہے ہیں، خواتین کی آبروریزیاں کر رہے ہیں، مساجد کے تقدس کو پامال کر رہے ہیں اور اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہیں کہ

اللہ تعالیٰ کے نزدیک، صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ غیر مسلم کو ناجائز قتل کرنا اسے بے حرمت کرنا اس کی املاک کو نقصان پہنچانا ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔

میں ایک عاجز دنیا دار آدمی ہوں لیکن دین حنیف کی تھوڑی بہت رمت جو یہ خاکسار اپنے وجود خاکی میں پاتا ہے، یہ مولانا علیہ الرحمۃ کے فیض صحبت اور ان کی خصوصی توجہ کا اثر ہے اور ان کا وہ احسان ہے جس کی جزاء رب کریم و رحیم ہی انھیں عطا فرما سکتا ہے۔

اللهم اعمره وارحمه وعافه واعف عنه واکرم برله ووسع مدخله واعسله بالماء والثلج

والبرد ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدس و ادخله يارب جنتك مع السيبين و

الصدیقین والشهداء والصالحین وحسن اولئک رفیقاً آمین یارب العالمین ۔

محمد فرقان محمد نعمان القاسمی  
ملکہ مکرمہ

## اپنی باتیں کچھ ناقابل فراموش یادیں

حضرت اقدس مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمہ اللہ علیہ کا تعلق

پھر اس کے بعد جب ابتدائی کلاس میں مولانا مرحوم کی کتاب اسلام

نام ذہن میں نشیں ہو گیا ویسے تو ہمارے والد صاحب مرحوم کا بہت

مرحوم جب بھی کسی کام سے لکھنؤ جاتے تو حضرت مولانا سے ضرور

تھے۔ گہرا تعلق اس بنا پر بھی تھا کہ جب رسالہ الفرقان بریلی سے شائع ہوا

والد صاحب مرحوم اور چچا محمد عرفان بیگ صاحب مرحوم نے بھی کچھ عرصہ اس رسالہ کے

سلسلہ میں خدمت کی جو شاید پرانی فائلوں میں ابھی موجود ہو۔ اس طرح سلسلہ بڑھتا گیا پھر ایک

دور ایسا آیا کہ حضرت مولانا نے مولوی حسان نعمانی اور مولانا زکریا صاحب و مولانا خالد صاحب

کو مدرسہ نور العلوم بہرائچ والد صاحب مرحوم کی زیر نگرانی تعلیم کیلئے بھیجا۔ جو مستقل کئی سالوں

تک حضرت مولانا کی یاد کا سبب بنے رہے اور ہمارا ایک پرانا تعلق حضرت مولانا سے قائم

رہا۔ لیکن اس کے باوجود مولانا سے ملاقات اور انکی زیارت سے لطف اندوز نہ ہو سکا اور اس امید

اور محبت کو لئے ہوئے ہم حجاز مقدس بھی آگئے بفضلہ واحسانہ کئی سال کے بعد حجاز مقدس سے

جب ہم اپنے رشتہ داروں سے ملنے کی غرض سے آئے تو پھر حضرت مولانا کی یاد امنڈ پڑی اس

پہلی زیارت کے بعد پھر سلسلہ ملاقات کا شروع ہو گیا پھر بارہا ملاقات و زیارت اور گفتگو نیز

ساتھ میں تناول کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ قربان جاؤں اس پاک روح پر !

ایک بار کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ جانا ہوا تو مولانا کی یاد تازہ ہو گئی دل چاہا کہ ملاقات بھی

کر لوں۔ لیکن جب بھی پہنچتا تو دیکھتا کہ مکان پر ایک تختی لٹکی ہوئی ہے ”مولانا کی طبیعت ناساز

ہے ملاقات کیلئے بعد العصر تشریف لائیں“ اس تختی کو دیکھ کر مایوسی کے ساتھ واپس ہونا پڑتا اور

کچھ دل میں ملال بھی ہوتا۔ کہ جب بھی آؤ تو یہ تختی لکھی ملتی ہے! ایک بار دہلی کے سفر سے لکھنؤ کا گزر ہوا۔ وقت تقریباً صبح کا تھا خیال آیا کہ اب تو حجاز مقدس کی روانگی ہے کاش مولانا سے ایک منٹ کی ملاقات ہو جاتی (توڑ ہے قسمت) مایوسی کے ساتھ ساتھ گھر کی طرف قدم بڑھائے قریب پہونچا تو دیکھا تختی وہی حسب معمول لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس مرتبہ مایوسی کے ساتھ کچھ امید اور خوشی بھی شامل تھی۔ تختی پر نظر پڑتے ہی میں نے بے دھڑک دستک دیدی تھوڑی دیر انتظار کے بعد ایک آواز بھی لگادی۔ کسی نے دروازے کے سوراخ سے دیکھا اسکے بعد تھوڑی دیر میں دروازہ کھل گیا اور اندر جانے کی اجازت مل گئی، سامنے ہی کمرے میں حضرت مولانا جلوہ افروز تھے۔ نظر پڑتے ہی دل میں ایک محبت اور فرحت محسوس ہوئی جسکا اظہار مشکل ہے سلام اور مصافحہ کے بعد میں نے کہا حضرت الوداع کا سلام کرنے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا بیٹے! تم تو کافی عرصہ سے آئے ہوئے ہو ملاقات اب کی! تو میں نے اپنی پوری تختی کی کہانی سنا دی ہستے ہوئے فرمایا ”بیٹے یہ تختی تو یہاں کے مقامی لوگوں کیلئے ہے کہ وقت بے وقت چلے آتے ہیں باہر سے آنے والوں کیلئے کوئی وقت نہیں، تم تو اپنے ہو۔ تمہارے لئے ہر وقت دروازہ کھلا ہے“ یہ سنا تھا کہ دل باغ باغ ہو گیا۔

غالباً ۱۹۸۵ء میں رابطہ عالم الاسلامی کے اجلاس میں حضرت نے اپنی معذوری کے باوجود مع بھائی سجاد صاحب اور استاذی مولانا زکریا صاحب کے ساتھ شرکت فرمائی اور عمرہ اور زیارت کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ کچھ بہت معمولی سی خدمت کا موقع ملا جسکا حقیقت میں کوئی شمار نہیں۔ اس خدمت سے اتنا متاثر ہوئے کہ وطن پہونچنے پر زیارت حرمین کے عنوان سے جو سفر نامہ تحریر کیا تو اس میں ہم سبھی کا نام بنام تذکرہ کیا اور اپنی محبت اور بہت سی دعاؤں سے نوازا۔ اللہ رب العزت اپنی شان کے مطابق اسکا انھیں نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

یہ ہیں اہل ظرف کہ اس تھوڑی سی خدمت کو فراموش نہیں کیا بلکہ اس وقت سے ابھی تک پابندی کے ساتھ رسالہ الفرقان ’فرقان‘ کے نام جاری کر دیا۔ جو کہ ابھی تک جاری ہے، اللہ جل جلالہ اسکے بدلے میں صد یقین شہداء اور صالحین کا مرتبہ نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین بڑے لوگوں کی یہ ہیں بڑی باتیں۔

انھیں احسان اور محبت کی بنا پر حضرت مولانا رحمہ اللہ علیہ کی یاد طواف اور ملتزم پر ضرور آتی ہے اللہ پاک اپنی بے شمار رحمتوں سے نوازے اور مغفرت فرما کر اعلیٰ درجات سے سرفراز کرے۔ آمین۔

خدا رحمت کند ایں عاشق پاک طہیست را

حافظ محمد ابراہیم قاسمی  
ادار العلوم تحانیہ اکوڑہ خٹک۔ پاکستان

## مرثیہ فارسی

برسانحہ آر تحال حضرت العلامہ مولانا محمد منظور نعمانی نور اللہ مرقده  
مدیر الفرقان لکھنؤ

نعرہ زدہاتف کہ دردا شیخ بانی برفت یعنی آں علا.

از درودیواری آید صدائے درد و غم آں متاع علم و دانش سیف رحمانی برفت

شور بلبل بر نیاید خندہ گل بے مزہ یک گل تازہ ازیں بستان عرفانی برفت

آں خلیب بے مشیل و آں ادیب بے عدیل بہر حفظ دین و ملت تنج مبرا نی برفت

حالی سنت کہ بود و حاجی بدعات و شرک ترجمان دیوبند آں شیر یزدانی برفت

واقف اسرار قرآن شارح علم حدیث آں مبلغ بے بدل داعی لاٹانی برفت

منصور نعمانی مدہ تاریخ وصال آں مرحوم بحساب ہجری ۱۴۱۷ھ حاصل میشود۔ قاسمی

رونقِ بزمِ صحافتِ زینتِ اقلیمِ علم      رازدانِ مکرِ رفس و ”قلبِ ایرانی“ برفت  
 او مناظر بود قابلِ بہرِ نشردینِ حق      پیکرِ نطقِ فصیحِ وزورِ برہانی برفت  
 مستمندِ برحالِ مسلمِ تالہِ سنجِ برضعفِ او      رشکِ تقویٰ افتخارِ بزمِ روحانی برفت  
 نابغہ ’ روزگارے در سوادِ ہند بود      آں مثالِ وصفِ بوذرِ فقرِ سلمانی برفت

سرگروہِ بزمِ اصحابِ عزیمتِ درِ زماں  
 کوکبِ آں چرخِ دانشِ حسرتا فانی برفت



**U.P. GUN HOUSE**

83, Naya Gaon (West), Lucknow-18  
 Ph. : 220786, 230786, 202786

# فکر نعمانی کی جھلکیاں آئینہ الفرقان میں

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش  
ہے رگِ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو  
اقبال







## اگر رسول اللہ ﷺ اس زمانے میں ہوتے!

[قرآن پاک امت کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ بالعموم اس کے پیغام سے بے پردا ہے، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ موجود ہوں اور اہل ایمان ان کی طرف سے غافل۔ یہ اس مضمون کا حاصل ہے اور دعوت ہے۔ رجوع الی القرآن ۱ صفر و ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ میں چھپا۔ مرتب]

فرض کیجئے اگر رسول اللہ ﷺ اس زمانے میں ہوتے

اور کسی قابل اعتماد اور باوثوق ذریعہ سے ہم کو معلوم ہو،  
آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نہایت اہم پیغام سنا۔

و ضلالت اور نجات و ہلاکت کے راستوں کو صاف بیان کرے۔

بندوں پر اللہ کی حجت تمام کر دی جائیگی، اور مقدس رسول کی زبانی اللہ پاک کا یہ آخری پیغام ہوگا جس کے بعد ہم کوئی الہی پیغام اور رسول خدا کا کوئی جدید بیان نہیں سن سکیں گے۔ اور اس مقررہ و مشہور مقام پر پہنچنا بھی ہمارے لئے بہ آسانی ممکن ہوتا، اور اس تاریخ کے آنے کے بعد میں ابھی اتنے دن بھی باقی ہوتے کہ اس سرکاری پیغام کی اصلی زبان اگر ہم نہ جانتے ہوتے تو اس کا سیکھ لینا بھی اس عرصہ میں ہمارے لئے ممکن ہوتا جس کے بعد ہم اس پیغام کو اس کی اصلی اسپرٹ میں پوری طرح سمجھ سکتے اور پھر اس کے سیکھنے کے وسائل بھی ہم کو میسر ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اس زبان کے سیکھنے کی کوئی کوشش نہ کرتے، اور جب وہ مبارک دن آجاتا تو اللہ کے اس نہایت اہم پیغام اور رسول کے اس آخری بیان کو سننے یا بعد کو بالواسطہ ہی اس سے واقفیت حاصل کرنے کا خیال بھی ہمارے دل میں نہ آتا اور اس کی طرف ہم کوئی توجہ ہی نہ کرتے، تو کیا دنیا کی کوئی عقل بھی ہمارے اس طرز عمل کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتی تھی کہ ہمارے دلوں میں اللہ و رسول کی کوئی عظمت و وقعت اور ہماری نظروں میں ان کے پیغاموں کی کچھ بھی قدر و قیمت ہے؟

کوئی دوسرا کچھ کیوں کہے! آپ ہی خوب سوچ سمجھ کر اپنے دلوں سے اس کا جواب لیجئے! —  
 اچھا اگر آج کسی شخص کے متعلق آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس نے اللہ و رسول اور  
 انکے مقدس پیغاموں کی طرف سے اتنی ہی بے اعتنائی اور ایسی ہی لاپرواہی اختیار کر رکھی ہے تو  
 کیا اس کے بعد بھی دولت ایمان و ایقان سے اس کی محرومی میں آپ کو کچھ شک شبہ ہو گا؟

سوال کی جو صورت سطور بالا میں آپ کے سامنے رکھی گئی ہے کیا یہ محض فرضی ہے؟  
 بیشک رسول اللہ ﷺ اپنے جسد غصری کے ساتھ اس دنیا میں رونق افروز نہیں ہیں  
 لیکن اللہ پاک کا جو آخری فیصلہ کن پیغام اس کے آخری رسول، حضرت محمد عربی (فداہمی وابی)  
 لیکر آئے تھے وہ بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے آج ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر جانے  
 پر بھی اپنی اسی شان جلالی و جمالی اور اسی شادابی و تازگی کے ساتھ موجود ہے، ہمارے گھروں میں  
 اس کی کئی کئی کاپیاں اور کئی کئی نسخے رکھے ہوئے ہیں — اب ہم جس وقت چاہیں خداوند  
 قدوس کے اتارے ہوئے اور مقدس رسول کے لائے ہوئے اس ”پیغام ہدایت“ کو بالکل اسی  
 کے اصلی لفظوں میں دیکھ سکتے ہیں پڑھ سکتے ہیں اور اگر ان کو تھوڑی سی بھی عربی آتی ہو تو خود اس  
 کا مطلب و منشاء سمجھ سکتے ہیں، اور کسی درمیانی واسطہ کے بغیر اس سے براہ راست ہدایت حاصل  
 کر سکتے ہیں، اللہ کی رضامندی اور فلاح دینی و اخروی کے طریقے اس سے دریافت کر سکتے ہیں،  
 گویا یوں سمجھئے کہ نہایت پیاری اور بحد شیریں عربی زبان بولنے والا اور عربی بین ہی  
 میں خدا کا ”پیغام ہدایت“ سنانے والا ایک زندہ جاوید پیغمبر (بشکل قرآن ہمارے گھروں میں آج  
 بھی موجود ہے۔

لیکن ہمارا برا تاؤ اس کے ساتھ کیا ہے؟ — کتنے ہم میں ہیں جو اس سے ہدایتی  
 تعلق رکھتے ہیں —؟ کتنے ہیں جو اس سے اچھی طرح فیض حاصل کرنے کے لئے اور اس کو براہ  
 راست سمجھنے کے لئے عربی زبان سیکھ چکے ہیں یا سیکھ رہے ہیں؟ اور کتنے ہیں جو عربی زبان نہ  
 جاننے اور اس کے لئے کوئی ذریعہ بھی نہ پاسکنے کی مجبوری سے کسی اردو ترجمہ یا تفسیر کی روشنی میں  
 یاد رس قرآن کے کسی حلقہ میں شریک ہو کر ہی اس کی بات سمجھنے کی اور اس سے ہدایت حاصل  
 کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے لئے اپنے وقت کا کچھ حصہ صرف کرتے ہیں؟

ذرا ہندوستان ہی کے ”نو کروڑ مسلمانوں“ پر اس جہت سے ایک نظر تو ڈالئے اور سوچئے کہ  
 کتنی گہرائی ہے ان کے ایمانی دعووں میں اور کتنا تعلق ہے ان کو اللہ و رسول اور ان کے پیغاموں سے؟

اللہ کے بندو! رسول کی محبت کا دم بھرنے والو اور قرآن کی عظمت و تقدیس کی قسمیں کھانے والو! اللہ و رسول کے اس مقدس پیغام (قرآن) کے ساتھ یہ بے اعتنائی اور یہ لاپرواہی! کیا خدا کے سامنے اپنے اس تغافل مجرمانہ کی تم جواب دہی کر سکو گے؟ اور کیا عذر ہوگا تمہارا اس وقت جب رب العزت کے تحت جلال کے سامنے اس کا رسول فریادی بن کر درد و حسرت کے ساتھ کہتا ہوگا۔

یا رب ان قومی اتحدوا هذا القرآن مهجورا (اے میرے خداوند! میری اس قوم نے اس قرآن کو بالکل چھوڑ رکھا تھا)۔

قرآن پاک کے ساتھ مسلمانوں کے معاملہ پر اگر آپ طبقہ وار نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ ”مسلمان“ کہلانے والی امت میں ایک بہت بڑی بلکہ خارج از حد و شمار تعداد تو ان قطعاً تعلیم یافتہ سب سے نیچے کے طبقہ کے عوام کی ہے جن بے جا

پھر ان سے کچھ کم تعداد میں دوسرے درجہ کے وہ عوام کسی پرانے طرز کے مکتب میں بیٹھ کر یا کسی ”حافظ جی“ سے قرآن بعد بھی اس کو کھول کر دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی، بجز اس کے کہ محلہ، برادری، سلسلہ، کوئی مر جاتا ہو اور پڑوس یا قرابت کے خیال سے اس کے ”تیجے“ میں ایک آدھ پارہ پڑھنا پڑ جاتا ہو۔ پھر وہ بھی اپنے لئے نہیں بلکہ اس مر جانے والے کو ”بخشنے“ کے لئے بلکہ فی الحقیقت تو اکثر و بیشتر صرف محلہ یا برادری کا ”حق“ اتارنے ہی کے لئے تو اس طبقے کا تعلق ”قرآن مجید“ سے بس کسی کی موت اور تیجے ہی کا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اس قسم کے لوگوں سے کچھ کم تعداد میں کچھ ایسے نیک لوگ بھی ہیں ”جو حصول ثواب و برکت“ کی خاطر کبھی کبھی یا روزمرہ قرآن مجید کے پارہ دو پارہ کی تلاوت تو کرتے ہیں اور بڑی خوش اعتقادی سے کرتے ہیں مگر بیچارے اسکے مطلب و مقصد سے قطعاً نا آشنا ہیں، کیونکہ عربی جو اس زبان ہے اس سے واقف نہیں اور جس زبان میں پڑھنا لکھنا وہ جانتے ہیں مثلاً اردو تو اگرچہ اس میں اب بہت سے ترجمے اور تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور ایک اردو داں انکی مدد سے بھی قرآن مجید کے مطلب و مقصد سے اچھی خاصی حد تک آشنا ہو سکتا ہے لیکن ان بیچاروں کے ذہن میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور اپنی عملی زندگی کے لئے اس سے

ہدایت لینا بھی کوئی بہت ضروری بات ہے، اس لئے مدتِ العمر وہ بس تلاوت ہی کا ثواب حاصل کرنے پر قانع رہتے ہیں، گویا کہ قرآن مجید بس ان کی تلاوت ہی کے لئے نازل ہوا ہے اور اس سے زیادہ اس کا کوئی مطالبہ ان سے نہیں ہے اسی واسطے قرآن پاک کے مطالب و مقاصد سے واقفیت حاصل کرنے کا کوئی داعیہ کبھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتا،

رہا جدید تعلیم یافتہ طبقہ تو باسٹھنائے شواہد اس کی غالب ترین اکثریت نے دین کے تمام ہی علمی و عملی شعبوں سے جیسی کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے، اور حیاتِ دنیا ہی کی کامرانیوں کو ح نظر بنا کر جوارِ شادِ ربانی -

لا ریب، جو لوگ (موت کے بعد عالم آخرت میں) ہماری لقا (یعنی دربارِ خداوندی میں حاضری اور پیشی) کے امیدوار نہیں ہیں اور حیاتِ دنیا ہی سے خوش اور اس میں من ہیں اور جو ہماری آیتوں سے غفلت و بے پروائی برتتے ہیں ان سب کا ٹھکانا جہنم ہوگا اپنی بدکرداریوں کے بدلے۔

إِنَّ الدِّينَ لَا يَرْحُمُونَ لِقَاءَ مَا وَرَّضُوا بِأَلْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَأُطْمِئِنُّوْا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ أُولَٰئِكَ مَا وَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔

کا ہو بہو مصداق ہو گیا۔ اسکو قرآن پاک بلکہ خود قرآن نازل کرنے والے اور اس کے لانے والے (اللہ و رسول) کے ساتھ جیسی کچھ دلچسپی ہے وہ ہر واقفِ حال کو معلوم ہے۔

ان تمام طبقات کی بہ نسبت محدود اور قلیل التعداد ایک گروہ ”باضابطہ علمائے کرام“ کا بھی جو اپنی اس قلت کے باوجود بھی ہزاروں سے متجاوز اور لاکھوں کے شمار میں ہوگا، ان حضرات نے بر سہا برس دینی مدرسوں میں گزار کے عربی زبان سیکھی ہے، اسکی صرف و نحو تک پر آٹھ آٹھ دس دس کتابیں پڑھی ہیں، معانی اور بیان و بدیع میں بھی کم از کم ”تلخیص المفتاح“ اور ”مختصر المعانی“ تو ضرور ہی ان کے زیرِ درس رہی ہوگی، فقہ اور حدیث کی بہت سی کتابوں پر بھی انھوں نے عبور حاصل کیا ہے، قرآن کی تفسیر کے نام سے بھی کم از کم ایک کتاب ”جلالین“ تو سبقاً سبقاً پڑھی ہی ہوگی، اور اگر خوش نصیبی سے تعلیم کسی بڑے ”دارالعلوم“ میں ہوئی ہے تو شاید ”بیضاوی“ و ”مدارک“ کا کچھ حصہ بھی زیرِ درس رہا ہو، اس لئے قرآن پاک میں تدبر و تفکر اور اس کی ہدایات سے براہِ راست استفادہ کم از کم ان کا تو شغلِ حیات ہی ہونا چاہئے، اور ان کے متعلق تو یہ امید بجا اور درست ہی ہونی چاہئے کہ اللہ کی اس کتابِ عظیم سے ان کا تعلق بڑا گہرا

ہوگا اور یہ خوش نصیب حضرات تو ”قرآن حکیم“ کی تلاوت بالکل اس طرح اور اس تصور کے ساتھ کرتے ہوں گے کہ اُن کے سامنے گویا ایک پیغمبر ہے جو خدا کی غیر مشکوک وحی ان کو سنارہا ہے اور وہ اپنے سینے کے کواڑ کھول کے اس کے سامنے اس کا درس ہدایت سننے اور اُس پر عمل پیرا ہونے ہی کیلئے بیٹھے ہیں۔

مگر آہ کہ یہاں بھی یہ امید بڑی حد تک پامال ہی ہے۔ مستثنیات کو چھوٹ کر (جن کا شمار غالباً پانچ فیصد ع بھی نہ ہوگا) اس طبقہ علماء کا عام حال بھی اس باب میں دوسروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہاں بھی قرآن مجید کی عموماً ”تلاوت“ ہی کی جاتی ہے اور ”کتاب ہدی“ و ”موعظہ و ذکر“ ہونے کی اس کی جو اصل حیثیت تھی وہ یہاں بھی عموماً کم از کم عملاً تو فراموش ہی کر دی گئی ہے۔ حالانکہ خود اس کا نازل کرنے والا اسی میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ ”یہ کتاب اسی واسطے بھیجی جا رہی ہے کہ تم غور و تامل سے اس کی باتیں سنو، اس کے احکامات سمجھو، ہدایت و نصیحت حاصل کرو۔“

کتاب ارسلنا الیک لیدروا آیاتہ (یہ قرآن) ایک کتاب -  
ولیتذکر اولوا الالباب - نازل کیا ہے کہ لوگ اس عقل و دانش اُس سے نصیحت

اور جو لوگ آیات قرآن کو سمجھ بوجھ کر اُس سے ہدایت و نصیحت حاصل نہیں کرتے ہیں اُن کے متعلق ارشاد ہے -

اعلا یتدروا القرآن ام علی قلوب کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر اقفالہا تالے چڑھے ہوئے ہیں!

وا اسماء! اللہ پاک تو ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن پاک کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ذرا گوش دل سے سنو! کیسی پیاری اس کی یہ صدا ہے۔

لقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر ہم نے نصیحت کے واسطے قرآن کو آسان کیا، ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت لینے والا؟

لیکن ہم نے شاید یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جہاں تک دینی ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ہے اُس کے لئے تو دوسرے وسائل (مثلاً بزرگان کرام اور پیران عظام) ہی کافی ہیں، اور قرآن تو بس ”ثواب تلاوت“ حاصل کرنے کیلئے گویا ”وظیفہ“ کی ایک کتاب ہے۔  
حتیٰ کہ نماز میں قرآن پاک جو پڑھا جاتا ہے تو عام خیال اُس کے متعلق بھی یہی ہو گیا

ہے کہ بس صحت حروف کے ساتھ ”قرأت“ ہو جانی چاہئے، اسی لئے پوری توجہ الفاظ کے سنوار اور اتار چڑھاؤ، نیز آواز میں جاذبیت و دلکشی پیدا کرنے پر تو صرف کی جاتی ہے، مگر ان الفاظ کے ذریعہ جو کچھ ہدایت قرآن مجید دینا چاہتا ہے اور یہ الفاظ جس کے لئے بس ایک حسین اور مقدس پیرہن اور بہترین واسطہ تبلیغ کی حیثیت رکھتے ہیں اُس کی طرف دھیان دینے کی مطلق ضرورت نہیں سمجھی جاتی، گویا جسم و پیرہن کی آرائش و تزئین کی تو پوری کوشش کی جاتی ہے مگر جان اور روح سے مکمل بے پروائی برتی جاتی ہے (۱)، اور یہ بدیہی حقیقت گویا بالکل ہی فراموش کر دی گئی ہے کہ ”کتاب الہی“ کی قرأت کا اصلی اور اولیٰ مقصد تو تذکیر و تذکرہ ہی ہو سکتا ہے، حضرت علی مرتضیٰ کا مشہور اثر ہے۔

لا حیر فی قرأۃ لیس فیہا تندر ولا جس قرأت و تلاوت کے ساتھ تذکرہ و تذکرہ ہو اور  
حیر فی عبادۃ لیس فیما تفقہ جس عبادت میں تفقہ نہ ہو اُس میں کچھ خیر نہیں۔  
(رواہ رزین، جمع الفوائد ج ۲، ص ۲۷۹)

خبر بات کچھ طویل ہو گئی ورنہ عرض تو صرف یہ کرنا تھا کہ قرآن پاک کے ساتھ اس وقت ہمارا برتاؤ کیا ہے؟ اور ہونا کیا چاہئے؟  
پھر یہ سب کچھ سامنے آ جانے کے بعد اس سلسلہ کا تیسرا اور آخری سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب حالات یہ ہو چکے ہیں تو اب چارہ کار کیا ہے  
چیت یار ان طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

### چارہ کار

پس اگر آپ نے معاملہ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر لیا ہے، اور اس سلسلہ میں آپ پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس سے آپ عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو پہلا کام آپ کا یہ ہے کہ اولاً اس نقطہ نظر سے اپنے ہی طرز عمل پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اگر خدا نخواستہ آپ نے بھی اب تک قرآن پاک کے سمجھنے اور اس سے ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کی کوشش میں کوتاہی کی ہے تو آئندہ کیلئے آج ہی سے رویہ کو بدل دیجئے! اس طرح، کہ اگر آپ خدا کے فضل و کرم سے

(۱) ”مفسرہ تہذیب“ تائید بنی ”اعلیٰ الصبح“ میں بحوالہ شیخ ابی غالب مکی رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث میں الفاظ نقل کی ہے ”لیس للعبد من صلوة الا ما نقل منها“ (ج ۱، ص ۳۶۵) یعنی بندہ کو اسی نماز بلکہ اتنی ہی نماز کا اجر و ثواب ملے گا جو اس نے

بہ  
الد  
ماص

قرآن پاک سمجھنے کے بقدر عربی جانتے ہیں تو اب ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کے ارادہ سے اس کو سمجھ سمجھ کر پڑھنے کی عادت ڈالئے! اور اگر آپ اتنی عربی نہیں جانتے ہیں تو پھر کسی عربی داں کی مدد سے اتنی عربی سیکھ لیجئے اور یقین کیجئے کہ اگر اس راہ میں آپ کو کوئی اچھا رہنما مل گیا تو بس دو تین مہینے کی معمولی محنت سے آپ قرآن فہمی کی ضرورت کے بقدر عربی سیکھ سکیں گے، اور جو کمی رہ بھی جائے گی وہ انشاء اللہ قرآن پاک کے اشتغال سے یوں ہی پوری ہوتی رہے گی، بلکہ اس عاجز کا تجربہ تو صرف ایک مہینہ کا بھی ہے۔

کاش میرے سر دوسرے کاموں کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو جی چاہتا تھا کہ میں شہر بہ شہر گشت کر کے اسی کی تبلیغ کرتا پھرتا اور جو لوگ عربی زبان کو مشکل سمجھ کر اس کی تحصیل سے ہچکچاتے ہیں اور اس لئے قرآن و حدیث کی برکات سے محرومی ہی پر قائل ہو جاتے ہیں ان کو صرف ایک مہینہ میں بعون اللہ تعالیٰ اتنی عربی سکھا کر دکھاتا جس کے ایک عربی داں طالب علم کی طرح پڑھ سکتے اور اپنی ذاتی بصیرت، موعظت حاصل کر سکتے۔ ہاں اگر توفیق الہی نے مساعدت کی نہ جن سے اپنے اس تجربہ کے افادہ کو کچھ عام اور وسیع کر سکا۔

المستعان۔

بہر حال، تو اگر آپ اللہ پاک کے اتارے ہوئے اور اس کے رسول کے لائے ہوئے اس مقدس و مبارک ”ہدایت نامہ“ سے براہ راست واقفیت و آشنائی پیدا کرنے کیلئے، گویا (مجازی زبان میں) خدا اور اس کے رسول کی باتیں دہر دہر سننے اور بلا واسطہ ان سے مستفیض اور لذت اندوز ہونے کیلئے صرف دو تین مہینے تک بھی بس گھنٹہ دو گھنٹہ یومیہ خرچ کر سکتے ہوں تو آپ کو چاہئے کہ اس میں کوتاہی نہ کریں، اور آپ کے محلہ میں، یا آپ کی بستی سے قریب جہاں بھی کوئی مولوی صاحب ایسے موجود ہوں جو اس سلسلہ میں آپ کو کچھ مدد دے سکیں تو ضرور آپ ان کی مدد سے عربی زبان سیکھنے کی کوشش میں ابھی سے لگ جائیں (۱)، اور جب مہینے دو مہینے میں عربی سے آپ کو کچھ بھی شدید ہو جائے تو پھر آپ کسی عالم دین ہی سے قرآن پاک کا درس لینا شروع کر دیں۔

اور اگر کسی وجہ سے آپ کیلئے اس طرح عربی زبان سیکھ کر درس قرآن لینے کا امکان نہ

(۱) اگر وہ صاحب بھی ”تھوڑے وقت میں اور مختصر راستہ سے عربی زبان سکھا دینے“ کی کوئی خاص بصیرت نہ رکھتے ہوں تو وہ اس عاجز سے خط کتابت کر کے اس بارہ میں مشورہ لے سکتے ہیں۔

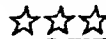


ہو تو پھر کم از کم اس کی کوشش کیجئے کہ آپ کی بستی کی مسجد میں ترجمہ قرآن کا درس ہوا کرے اور آپ اس میں شریک ہو کر حسب مقدور مطالب قرآنی کے سمجھنے کی کوشش کریں نیز دوسروں کو بھی اس کی اہمیت جتلا کر شرکت درس اور اس سے استفادہ کی ترغیب دیں۔

اور اگر بالفرض آپ کسی ایسی جگہ رہتے ہیں کہ وہاں کوئی شخص ترجمہ قرآن پڑھانے والا ہے ہی نہیں اور اس لئے درس قرآن کے اجراء کا انتظام آپ کے بس میں نہیں ہے تو پھر کم سے کم اس کا التزام کیئے کہ ہر روز قرآن مجید کا جتنا حصہ آپ پڑھ سکتے ہوں ترجمہ ہی کے ساتھ پڑھیں، اور تا مقدور ترجمہ کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں، پھر جتنی بات سمجھ میں آتی جائے اس سے اپنے لئے ہدایت و نصیحت لیتے رہیں۔ (۱)

امید ہے کہ اگر اس طور پر ترجمہ کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے کی آپ نے مستقل عادت ڈال لی اور تسلسل کے ساتھ اللہ پاک کی اس کتاب سے لپٹے رہے اور اس کے سمجھنے کی کوشش میں اس طرح ہی آپ لگے رہے تو قرآن مجید کا کافی حصہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ سمجھ سکیں گے۔

البتہ یہ بات بہر حال اور سب کیلئے ملحوظ رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید ”ہدی للمتقین“ ہے لہذا اس سے ہدایت و نصیحت کا نور انہی خوش بختوں کو حاصل ہو سکتا ہے جن میں ”تقویٰ“ ہو یعنی اللہ کا خوف اور عاقبت کی فکر ہو اور اسی کی بے چینی ان کو طلب ہدایت کیلئے قرآن پاک کے پاس لانے والی ہو، نہ کوئی اور شوق، اور نہ کوئی دوسری غرض ——— ورنہ ہم اور آپ سب ہی جانتے ہیں کہ ابو جہل اور ابو لہب تو آج کل کے ہر بڑے سے بڑے عالم دین سے بہتر قرآن کی زبان جانتے تھے لیکن چونکہ دل ایمان اور تقویٰ سے خالی تھے اس لئے اس بحر ہدایت سے ان کو ایک قطرہ بھی نہیں مل سکا، وما نعی الآيات والدرع قوم لا یؤمنون۔



(۱) قرآن پاک کے اردو تراجم میں قدیم اور مستند ترین ترجمے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کے ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں کچھ توربان کی نامانویت کی وجہ سے اور کچھ ان حضرات کے الزامی اختصار کی وجہ سے غیر عربی داں عوام کو قرآن مجید میں وہ کچھ زیادہ مدد نہیں دے سکتے۔ اس مقصد کے لئے موجودہ تراجم میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ کا ترجمہ راقم نے نزدیک زیادہ کارآمد ہے، نیز اردو تفاسیر میں آپ کی تفسیر ”پاک قرآن“ بھی اردو داں طبقہ کے لئے

تفسیر ترمذی اور تھانوی کی تفہیم تفسیر ہے۔

نیز ”ہدینہ پریس“ بنجورہ کا شائع کردہ قرآن مجید بھی اس سلسلہ کی ایک بہتر چیز ہے جس میں ترجمہ حضرت شیخ ابنا

مشرعہ۔ مرتب

لد  
ص

## درس قرآن پاک

## سورہ توبہ کی اہمیت، اُس کے ناقابلِ فراموش اسباق

## اور اس کا خاص پیغام

تبلیغی مرکز لکھنؤ کی مسجد میں ہر اتوار کو بعد نماز مغرب آیہ کا درس  
کرتا تھا۔ یہ اسی سلسلے کا ایک درس ہے۔ ۱۳ جون ۱۹۷۷ء کو۔

## حمد و صلوٰۃ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ  
بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ  
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ

(حائِمَةُ سُورَةِ الرَّاءِ)

یہ سورہ توبہ کی آخری دو آیتیں ہیں جو آج میں نے پھر تلاوت کی ہیں، پچھلے ہفتہ اس  
سورت کے آخری دور کو ع کا درس ہوا تھا اور ان دونوں آخری آیتوں کا بھی ترجمہ کر دیا گیا تھا اور  
مختصر تشریح بھی کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد آج سورہ یونس کا درس شروع ہونا چاہئے  
تھا، لیکن سورہ توبہ کی غیر معمولی اہمیت اور اس کے مضامین کی خاص نوعیت کی وجہ سے میں نے  
ارادہ کیا کہ آج بھی اسی سورت کے اہم مضامین کا اعادہ کیا جائے اور اس میں امت کو جو خاص  
سبق دئے گئے ہیں ان کو دہرایا جائے اور سمجھنے اور یاد کرنے کی کوشش کی جائے۔  
حضرت عمرؓ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ سورہ توبہ کا علم حاصل کرنے کی خاص  
طور سے تاکید فرماتے تھے۔ دراصل اس سورت کے ذریعہ اس ہدایت کی تکمیل ہوئی

ہے جو آغاز نبوت سے نازل ہونا شروع ہوئی تھی اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کیسا ایمان اللہ کے ہاں قابل قبول ہے اور اللہ و رسول کے ساتھ اور دین کے ساتھ مومن کا تعلق کیسا ہونا چاہئے۔

یہ سورت حضور ﷺ کے آخری دور حیات میں نازل ہوئی ہے — رسول اللہ ﷺ کے زمانہ نبوت کو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تین دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔  
(۱) آغاز نبوت سے مدینہ طیبہ ہجرت فرمانے تک کے قریباً ۱۳ سال یہ پورا اکی دور ہے۔  
(۲) ہجرت سے فتح مکہ تک کے قریباً ۸ سال، یہ گویا درمیانی دور ہے۔  
(۳) فتح مکہ سے وفات تک کے قریباً ڈھائی سال، یہی آپ کا آخری دور حیات ہے، اسی میں ہر حیثیت سے دین کی تکمیل ہوئی ہے۔

یہ سورہ براءۃ جیسا کہ آپ حضرات کو بھی اس کے مضامین سے اندازہ ہو چکا ہو گا اسی آخری دور میں نازل ہوئی ہے — ۹ھ کے وسط میں مشہور روایات کے مطابق رجب کے مہینہ میں رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک والا سفر فرمایا، یہ آپ کا اور آپ کے اصحاب کرام کا سب سے طویل اور نہایت پر مشقت جہادی سفر تھا اور اس لحاظ سے بھی نہایت پر خطر تھا کہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور سلطنت یعنی رومی حکومت کی باقاعدہ اور نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ فوج سے جنگ کا امکان تھا جو لاکھوں کی تعداد میں تھی اور اس دور کے لحاظ سے بہترین اسلحہ اور ہر قسم کے سامان جنگ سے لیس تھی، اور آپ کے ساتھ صرف تیس ہزار کی جمعیت تھی جو رومی فوج کے مقابلہ میں بالکل ہی بے سرو سامان تھی، حد یہ ہے کہ ان مجاہدین کے لئے غذا کی اتنی کمی تھی کہ بعض دنوں میں اللہ کے بندوں نے ایک ایک کھجور کھا کر گزارا کیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ موسم سخت گرم تھا اور بعض منزلوں پر پینے کیلئے پانی بھی نصیب نہیں ہوتا تھا، اسی لئے اس غزوہ کا ایک نام ”عروۃ العسره“ بھی ہے۔ یعنی تنگی اور فقر و فاقہ والا غزوہ۔  
سورہ توبہ کا کچھ حصہ تبوک سے کچھ پہلے اسی کے سلسلہ میں نازل ہوا تھا، اور کچھ حصہ تبوک کے سفر کے دوران میں نازل ہوا، اور زیادہ تر اس سفر سے واپسی کے بعد نازل ہوا ہے۔

بہر حال اس کے مضامین کا بہت کچھ تعلق غزوہ تبوک اور اس کے سلسلہ کے واقعات سے ہے۔ میں اس غزوہ کے واقعات پوری تفصیل سے پچھلے ہفتوں کے درس میں موقع بہ موقع بیان کرتا رہا ہوں۔

\_\_\_\_\_ مختصر طور سے اس وقت پھر ذکر کرتا ہوں۔

واقعات کا سلسلہ یوں ہے کہ عرب کی مغربی سرحد پر جو شام کے علاقہ سے ملتی ہے عرب عیسائیوں کی کئی ریاستیں تھیں جو رومی شہنشاہی کی باج گزار تھیں اور گویا اس کی سرپرستی میں تھیں۔ جب ۸ھ میں مکہ معظمہ اور طائف کے فتح ہو جانے کے بعد قریا پورے عرب پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا تو سرحد کی ان عیسائی ریاستوں نے محسوس کیا کہ یہ ابھرتی ہوئی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی نئی طاقت کسی وقت ہمارے لئے بھی خطرہ کا باعث بن سکتی ہے، وہ ایک ہی سال پہلے غزوہ موتہ میں مسلمانوں کی حوصلہ مندی اور جرأت و جانبازی کا تجربہ کر چکے تھے۔ انھوں نے اس بات کو رومی حکومت تک بھی پہونچایا جس کا اس وقت شام پر اقتدار تھا اور پھر رومی حکومت کی پوری امداد اور پشت پناہی کا اطمینان حاصل کر کے یہ منصوبہ بنایا کہ یوری طاقت سے مدینہ پر ایک بھرپور حملہ کر کے اس نئی ابھرتی طاقت کو اسی مرحلہ میں کچل دیا جائے اور پوری تیز رفتاری کے ساتھ اس کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ۱۰ھ

حکمت عملی کے طور پر یہ طے کیا کہ ان کو حملہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ ان پر ضرب لگائیں اور مسلمانوں کی ایمانی طاقت اور ان کو ادیس تاکہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔

اس کے لئے عالم اسباب میں یہ ضروری تھا کہ مجاہدین کی زیادہ سے زیادہ تعداد آپ سے ساتھ ہو اس لئے آپ نے مدینہ طیبہ اور قرب وجوار کے تمام مسلمانوں کو اس جہادی مہم کے لئے تیاری کا اور اس میں حصہ لینے کا اعلان عام جاری فرمادیا، اس سے پہلے کسی مہم اور جنگ کے لئے کبھی بھی اس طرح کی نفیر عام نہیں دی گئی تھی۔ غزوہ تبوک ہی میں آپ نے یہ حکم جاری کیا کہ ہر مسلمان جو معذور و مجبور نہیں ہے اس میں شرکت کرے۔ اور اتفاق کی بات کہ موسم انتہائی گرم تھا، اور مدینہ کے باغوں میں کھجوروں کے تیار ہونے اور پکنے کا زمانہ تھا اور اسی پر اہل مدینہ کی معیشت کا دار و مدار تھا، اس حالت میں اپنے باغوں کو چھوڑ کر جانا بڑا سخت امتحان تھا۔ اسکے علاوہ سفر دور دراز کا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسی فوج کے مقابلہ کے لئے جانا تھا جو اس وقت کی دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور فوج تھی اور جس نے چند ہی برس پہلے دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت فارس کی فوجوں کو شکست دے کر دنیا بھر پر اپنی برتری کا سکہ جمادیا تھا اور اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ اسی بنا پر منافقین یہ سمجھتے تھے کہ اس سفر میں جانا موت کے منہ میں جانا ہے اور جو جائے گا وہ واپس نہیں آئے گا، وہیں کے چیل کوئے اور جانور ان کی لاشوں کو کھائیں گے۔ اس

لئے ان منافقین نے طرح طرح کے حیلے بہانے کئے اور نہیں گئے۔ ان منافقین کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے ایمانوں میں کچھ ضعف تھا اور اس لئے کم ہمتی تھی وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح بچ جائیں تو اچھا ہے۔

انہی حالات میں یہ پر جلال آیتیں نازل ہوئیں۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ امْضُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّا قُلْنَا إِلَى الْأَرْضِ ارْجِعُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْأَجْرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْأَجْرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ  
إِنَّا نَعْلَمُ وَأَعِدُّنَا لَكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَ يَسْتَدِلُّ قَوْمًا عَيْرَكُمْ وَلَا تَصْرُوهُ نَبِيًّا“

”یعنی اے مسلمانوں تمہارا یہ کیا حال ہے کہ جب تم کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کے راستے میں قربانی اور جانبازی کے لئے قدم اٹھاؤ اور چلو تو تم بجائے اٹھ کھڑے ہونے کے زمین پر پڑ جاتے ہو، کیا تم نے آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کی خوش عیشی کو اپنے لئے پسند کر لیا ہے، حالانکہ دنیا کا ساز و سامان آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں بالکل ہی بیچ ہے اگر تم نے اس دعوت پر لبیک نہیں کہا اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نہیں چلے تو اللہ کی طرف سے تم پر بڑی سخت مار پڑے گی اور پھر وہ اپنے دین کی خدمت کے لئے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے خود ہی محروم ہو جاؤ گے۔“

ان پر جلال آیتوں کا روئے سخن دراصل ان مسلمانوں کی طرف تھا جن میں کچھ ضعف اور تذبذب تھا۔ ان آیتوں نے اس تذبذب کو ختم کر دیا اور ہر مخلص مسلمان نے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اللہ کی شان کہ کعب بن مالکؓ جیسے کئی ایسے مخلص مسلمانوں سے جو صف اول کے مخلصوں میں تھے لغزش ہو گئی اور وہ صرف سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے پیچھے رہ گئے، ان کے واقعات تفصیل سے پہلے بیان کئے جا چکے ہیں اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان واقعات میں امت کے لئے کتنے اہم سبق ہیں۔

الغرض ان کے علاوہ مدینہ طیبہ اور قرب وجوار کے قریباً سب ہی مسلمان حضور ﷺ کی نفیر عام پر لبیک کہہ کے آپ کے ساتھ تبوک کے لئے روانہ ہو گئے، ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔ مدینہ طیبہ سے تبوک تک کا ۱۴-۱۵ دن کا راستہ تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ بڑا ہی پر مشقت اور بڑے سخت مجاہدہ کا سفر تھا۔ لیکن مسلمانوں کی اس پیش قدمی نے ان عرب ریاستوں کے حوصلے پست کر دئے جو مدینہ طیبہ پر حملہ کا منصوبہ بنا رہے تھے اس لئے انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ مدینہ کی اسلامی حکومت سے مصالحت کر لی جائے، یہ رسول اللہ ﷺ کی

اور مسلمانوں کی بڑی کامیابی تھی، چنانچہ قریباً بیس دن تبوک میں قیام کر کے اور اس سرزمین پر اللہ کا نام بلند کر کے، اذانیں دے کے اور نمازیں پڑھ کے آپ واپس تشریف لے آئے، اور آپ کے اس سفر نے اس علاقہ میں اسلام کے نفوذ کی اور آگے کی بڑی کامیابیوں کی راہ ہموار کر دی، اور دور دور تک مسلمانوں کی دھاک بٹھادی ————— اسکے علاوہ بہت سے داخلی فائدے ہوئے وہ مار آستین منافقین جن کا نفاق اب تک دبا ہوا اور چھپا ہوا تھا، اس غزوہ تبوک نے ان کا پردہ فاش کر دیا، اور سورہ توبہ کی آیات نے انکو بالکل عریاں کر دیا پھر ان میں سے بہت سوں کا نفاق ختم ہو کر انکے اندر ایمان آ گیا اور اس غزوہ کے سخت مجاہدہ نے مومنین صادقین کو اور نکھار دیا اور انکے ایمانوں میں بڑی ترقی ہوئی — اور کعب بن مالک وغیرہ چند مخلصین جو محض سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے اس غزوہ میں جانے سے رہ گئے تھے ان پر سخت عتاب ہوا اور انکو مقاطعہ کی ایسی سخت سزا دی گئی کہ قرآن پاک میں اسکا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ۔۔۔ ”وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ“ (یعنی ان کیلئے زندگی سے تنگ آ گئے) مگر انھوں نے اللہ و رسول اور دین ۔ اخلاص کا پورا پورا ثبوت دے دیا تو انکی سچی توبہ کی بنا پر انکی معافی امت کو قیامت تک کیلئے ایک بڑا سبق دے دیا گیا۔

اسی سفر تبوک کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ جس طرح منافقین یہ جھتے تھے کہ یہ تبوک جانے والے مسلمان اب واپس نہ آسکیں گے اور رومی فوج ان سب کا وہیں خاتمہ کر دے گی اسی طرح عرب کے مختلف علاقوں کے وہ مشرکین جن سے رسول اللہ ﷺ نے معاہدے کر لئے تھے انھوں نے بھی یہی سمجھا اور ایسی شرارتیں شروع کر دیں جو معاہدوں کے بالکل خلاف تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک سے واپس آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان معاہدوں کو فسخ کئے جانے کا اعلان فرمادیا اور ان سب کیلئے چار مہینے کی مہلت کا بھی اعلان فرمادیا گیا، اور جن قبیلوں اور علاقوں کے مشرکوں نے عہد شکنی نہیں کی تھی انکے متعلق اعلان فرمادیا گیا کہ ان سے معاہدہ مقررہ میعاد تک قائم رہے گا لیکن آئندہ اس میں توسیع نہ ہوگی — اس سورہ توبہ کے ۳-۴ کو ع قریباً ۳۰ آیتوں میں تمام مشرکین عرب کے سلسلہ میں ایسے فیصلے اور نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس حکم اور فیصلہ کا مقصد یہ تھا کہ عرب کا وہ خاص علاقہ جسکو د عوت توحید اور دین حق اسلام کا مرکز بننا تھا وہ شرک سے بالکل پاک صاف ہو جائے، بتوں سے اور بت پرستی سے کعبۃ اللہ کی تطہیر کی طرح یہ چیز رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے خاص مقاصد میں سے تھی، اور

اب اس کی تکمیل کا وقت آگیا تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی حکم آیا کہ آئندہ مشرکوں کو اپنے مشرکانہ عقائد اور رسوم کے ساتھ حج میں شریک ہونے کی اور کعبہ کے طواف وغیرہ کی بلکہ مسجد حرام میں داخلہ کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ یہ سب نہایت اہم احکام اور فیصلے تھے۔ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ ہجری کے حج سے کچھ ہی پہلے سورہ توبہ کا یہ ابتدائی حصہ نازل ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے طے فرمایا کہ ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) آپ کے خاص نمائندہ اور امیر حج کی حیثیت سے اس سال حج کریں اور آپ کی طرف سے اللہ اور رسول کے اہم فیصلوں کا حج میں شریک ہونے والے تمام عربوں کے سامنے اعلان کریں۔ صدیق اکبر کے روانہ ہو جانے کے بعد بعض تجربہ کار لوگوں نے حضور کو توجہ دلائی کہ عربوں کا پرانا دستور یہ ہے کہ کسی معاہدے کے فسخ کرنے کا اعلان یا تو صاحب معاہدہ خود کرے یا پھر اسکا کوئی قریبی عزیز اور رشتہ دار کرے۔ اس بات کے سامنے آنے کے بعد آپ نے حضرت علی مرتضیٰ کو روانہ کیا جو آپ کے حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد تھے، چنانچہ صدیق اکبر نے یہ اعلان انھیں سے کرایا۔ تو جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ سورہ برأت کی شروع کی قریباً تیس آیتوں کا تعلق انھیں اہم فیصلوں سے ہے۔

سورہ برأت کی ان آیتوں میں ایک طرح سے گویا تمام مشرکین عرب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا تھا۔ قدرتی طور پر اس کے اثرات بہت سے مسلمانوں پر بھی پڑ سکتے تھے، کسی کے باپ یا بھائی ابھی شرک ہی کی حالت میں تھے، کسی کے دوسرے قریبی عزیز مشرک تھے، اب ان سب ہی کے خلاف اعلان جنگ ہو گیا تھا۔ اسکے علاوہ یہ بھی امکان تھا کہ اس نئی پالیسی کے اعلان کے بعد جنگوں کا ایسا سلسلہ چھڑ جائے جن سے کبھی فرصت نہ ملے اور سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے۔ غالباً ان خیالات نے کچھ کچھ مسلمانوں کے دلوں میں کچھ وسوسے پیدا کئے ہو گئے۔ اور اگر اس وقت ایسے وسوسے پیدا نہ بھی ہوئے ہوں تو اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ ایسے سخت حالات میں ایسے وسوسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور قرآن مجید کو قیامت تک کے حالات اور امکانات کے پیش نظر ہی نازل ہوا تھا، لہذا یہی سلسلے اس سلسلے کی آیتوں کے آخر میں مسلمانوں کو مخاطب فرما کر یہ نصیحت کی گئی تھی۔

بقدر

”قُلْ اِنْ كَانَ اٰمَازُكُمْ وَاِساؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالُكُمْ  
فَمِنْهُمْ هٰذَا تَحَارَّةٌ تَحْشُوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرَصُّوْنَهَا اَحَبُّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ  
وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ“

۱۱

خاص

اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل کو کٹھن لے اور چانچ لے اگر اس کا حال یہ ہے کہ اپنے ماں باپ، اپنی اولاد، اپنی چھیتی بیویوں اور دوسرے قریبی عزیزوں، رشتہ داروں سے یا اپنی کمائی ہوئی دولت اور اپنے چلتے ہوئے کاروبار سے یا اپنے مکانات اور جائیداد سے اسکو ایسا تعلق ہے جو اللہ و رسول کے حکم کی تعمیل میں اور دین کے راستے میں قربانی دینے سے رکاوٹ بن سکتا ہے تو وہ اللہ کے ان بندوں میں سے نہیں ہیں جو اسکی رحمت اور عنایت کے مستحق ہوں بلکہ وہ ”فاسقین“ میں سے ہے۔ جس کو خدا کے عذاب کا انتظار کرنا چاہئے اور ایسے لوگ ہدایت کی نعمت سے محروم رہیں گے۔ اور پھر خداوندی رحمت اور جنت سے بھی محروم رہیں گے۔

میرے محترم بھائیو! اگر ہمارے دلوں میں کچھ بھی ایمانی رفق ہو تو یہ بڑی لرزادینے والی آیت ہے، آج جہاد و جاں فروشی کا وہ میدان تو ہمارے سامنے نہیں۔ نازل ہونے کے وقت صحابہ کرام کے سامنے تھا، لیکن امتحان کے ہیں، روزمرہ ایسے حالات اور معاملات سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے کہ حکم پر چلیں اور دین کے مطالبہ اور تقاضے کو پورا کرنے کا فیہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے یا ہماری بیویوں اور دوسرے گھر والوں کی ناراضگی؟ ذرا سوچیں کہ ایسے موقعوں پر ہمارا طرز عمل کیا ہوتا ہے؟ ہم چھوٹے چھوٹے مقدّموں میں جیت حاصل کرنے کے لئے اور بس اپنی ناک اونچی رکھنے کیلئے بے تکلف جھوٹی گواہیاں دے دیتے ہیں جو اشد حرام ہے۔ دین کے تقاضے ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے اس کے لئے اپنا آرام بھی قربان نہیں کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا کھلا فیصلہ یہ ہے کہ جن کا یہ حال ہو وہ اللہ کی نگاہ میں سخت مجرم ہیں اور اس کے مستحق ہیں کہ ان پر خداوندی عذاب کے کوڑے برسیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو جو آگاہی دی تھی وہ ہم آپ کو سب کو اور قیامت تک کے مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ سورہ توبہ کی یہ آیت ایک کسوٹی ہے جس سے ہر ایک اپنا ایمان چانچ سکتا ہے اور ایک آئینہ ہے جس میں ہم میں سے ہر ایک اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ سورہ برأت کی ابتدائی قریبات میں آیتوں کا تعلق مشرکین کو برباد کرنے کے بارے میں نئے فیصلے اور نئی پالیسی سے ہے۔



اسکے بعد ان اہل کتاب کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے اور ان سے جہاد کی دعوت دی گئی ہے جو اس وقت اسلام کو منادینے اور نور حق کو گل کر دینے کے منصوبے بنا رہے تھے اور انھوں نے اپنے پیغمبروں کا لایا ہوا دین اور ان کی شریعت کو چھوڑ کے اپنے نفس کی اور شیطان کی پیروی اختیار کر لی تھی۔ اس موقع پر قرآن پاک میں ان کے ٹھینٹھ مشرکانہ عقائد کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

”اتحدوا احبارہم و رہماہم ارباناً من دون اللہ و المسیح اس مریم و ما امروا الا لیعدوا اللہ الہا واحداً لا الہ الا هو سحانہ عما یشرکون“

یعنی انھوں نے اپنے احبار و رہما کو یعنی عالموں اور درویشوں کو خدا کے علاوہ اپنا رب بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی خدا بنالیا ہے حالانکہ توریت و انجیل کے ذریعے انکو توحید کی تعلیم دی گئی تھی لیکن انھوں نے اس خداوندی تعلیم کو پس پشت ڈال کر یہ مشرکانہ طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

پھر اس کے آگے کی آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ ان کے مذہبی پیشواؤں، پیروں اور پادریوں کی سیاہ باطنی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

”یا ایہا الدین آموا ان کثیراً من الاحبار و الرہما لیأکلوا اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ“

یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے یہ پیرپادری جو بظاہر بڑے مقدس اور مہاتما بنے ہوئے ہیں ان میں سے بہت سوں کا حال یہ ہے کہ وہ ریاکار اور مکار ہیں اور حرام اور ناجائز طریقوں سے بس دنیا بٹورتے ہیں اور اپنے ماننے والے سیدھے سادے عوام کو لوٹتے ہیں اور اپنی جیبیں اور اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ یہ بالکل دولت کے پجاری ہو گئی اور انھوں نے خدا کے بجائے مال و دولت کو اپنا مقصود و معبود بنالیا ہے۔

ان آیتوں کا اگرچہ براہ راست تعلق بگڑے ہوئے یہود و نصاریٰ اور ان کے حرام خور اور ریاکاریوں، پادریوں سے ہے، لیکن ہم مسلمانوں کے لئے اور خاص کر ہم جیسوں کے لئے جن کو لوگ مذہبی عالم اور دینی پیشوا سمجھتے ہیں ان آیتوں میں بڑا سبق اور بڑی آگاہی ہے حضور ﷺ کی مشہور حدیث ہے ”لتسعن سنن من کان قبلکم شرّاً شبر و دراعاً مدارع“ جس کا مطلب یہ ہے کہ میری امت کے لوگ وہ سب کچھ کریں گے جو پہلی امتوں، یہودیوں اور نصاریوں نے کیا اور بالکل ان کے قدم پر قدم چلیں گے۔ یہاں تک کہ اگر پہلی امتوں کے

بد بخت نے اپنی ماں کے ساتھ حرام کیا تھا تو میری امت میں بھی یہ ہو کر رہے گا۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد کا مقصد دراصل امت کو خبردار کرنا تھا کہ وہ اس خطرے سے اپنی حفاظت کرے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ حضور ﷺ نے فرمایا تھا وہ سب سامنے آ رہا ہے۔ امت میں اعمال و اخلاق کی وہ ساری خرابیاں اور وہ سب اعتقادی گمراہیاں پیدا ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں جو یہود اور نصاریٰ میں تھیں۔ وہ کون سا جرم اور گناہ ہے جو مسلمانوں میں نہیں ہے اور وہ کون سا فسق و فجور ہے جو دین و مذہب ہی کے نام پر بزرگان دین کے عرسوں میں نہیں ہو رہا ہے اور وہ کون سا شرک ہے جو ان کے مزاروں پر نہیں ہو رہا ہے۔ قبروں کو سجدے ہو رہے ہیں، مراویں مانگی جا رہی ہیں، نذریں چڑھائی جا رہی ہیں، الغرض وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو یہود و نصاریٰ کرتے تھے۔

اور جس طرح انکے پیرواری دین کے نام پر دنیا کماتے اور بھاری کے نمونے بھی اس امت کے پیروں اور مولویوں میں موجود ہیں بے لاگ ہے اسکی کسی سے رشتہ داری نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ والا شرک یا کوئی جرم کرے تو جہنم میں جائے اور مسلمان کہلا جائے۔ وہاں کا قانون تو یہ ہے - ”فمن يعمل مثقال ذرة خیراً یره و من شرأیره“۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سورہ توبہ کی ان آیات ”اتحدوا احبارہم و رہبانہم ارباباً من دون اللہ“ سے لیکر ”یا ایہا الدین آموا ان کثیراً من الاحبار و رہبان“ الایہ کا تعلق اگرچہ براہ راست یہود و نصاریٰ سے ہے، لیکن ان میں ہم مسلمانوں کیلئے بھی بڑا سبق ہے۔ یہ آیتیں جن میں اہل کتاب کی گمراہیوں اور ان کے صریح مشرکانہ عقائد اور ان کی اسلام دشمنی اور نور اسلام کو مٹا دینے کے منصوبوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے خلاف جہاد اور قتال کی تیاری کی مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے، یہ دراصل غزوہ تبوک کی تمہید ہے جسکا میں ابھی تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ مختلف پہلوؤں سے اس غزوہ میں بڑے خطرات تھے اور بڑی سخت آزمائش تھی اسلئے منافقوں کے علاوہ بعض کچے دل کے اور کم ہمت مسلمان بھی اس سے کترانا چاہتے تھے تو آگے کی آیتیں نازل ہوئیں۔

”یا ایہا الدین آموا مالکم اذقیل لکم انصروا فی سبیل اللہ انناقلکم الی الارض۔ الایہ“.....



میں کہیں کہیں بطور مقابلہ مومنین صالحین کے کردار کا بھی ذکر آگیا ہے۔ اس کے بعد ان چند مخلص مسلمانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو صرف سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے غزوہ تبوک میں جانے سے رہ گئے تھے اور خود ان کو اس کا بے انتہار خج و غم تھا اور انھوں نے پوری سچائی کے ساتھ حضورؐ کے سامنے اپنے فسور کا اقرار کر لیا تھا اور بعضوں نے تو مسجد نبوی کے ستون سے اپنے کو باندھ دیا تھا اور طے کر لیا تھا کہ حضور ﷺ ہی معافی دے کر اپنے ہاتھ سے گھولیں گے تو کھلیں گے ورنہ اسی طرح بندھے بندھے مر جائیں گے، میں ان حضرات کے واقعات متعلقہ آیتوں کے درس میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ سورہ کے تیرہویں رکوع میں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے

”وآخرون اعترفوا بذنوبهم خلطوا عملاً صالحاً وآخر سيئاً عسى الله ان يتوب عليهم، ان الله غفور رحيم“

یعنی کچھ بندے وہ ہیں جنھوں نے دلی ندامت کے ساتھ کر کے خود اپنے کو پیش کر دیا ہے، ان کا حال یہ کہ انھوں نے اچھے عمل بھی ان سے سرزد ہوئے ہیں وہ امید کر سکتے ہیں کہ اللہ مہربان اور ان کی توبہ قبول کر لے۔ اللہ غفور رحيم ہے۔

پھر دو تین آیتوں کے بعد فرمایا گیا ہے - ”وآخرون مرحون لامر الله اما يعدهم واما يتوب عليهم والله عليم حكيم“ یعنی غزوہ تبوک میں نہ جانے والے اہل ایمان میں سے کچھ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم کے انتظار میں ملتوی ہے وہ انھیں عذاب دے یا ان کی توجہ قبول فرما کر معاف فرمادے۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر! قرآن مجید کا یہ انداز بیان کعب بن مالک اور ابو لہبہ انصاری جیسے صف اول کے مخلصین کے حق میں ہے جو ہمیشہ اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت اور دین کی خدمت اور اس کی راہ میں ہر قربانی کرتے رہے، ان میں سے کئی ایک بدری بھی تھے۔ ان سے بس یہ غلطی ہوئی تھی کہ سستی کی وجہ سے غزوہ تبوک سے پچھڑ گئے تھے، اسی پر اتنا سخت عتاب ہوا کہ کعب بن مالک اور ان کے دو اور ساتھیوں کا پچاس دن تک مکمل مقاطعہ رہا، کوئی مسلمان ان سے بات چیت نہیں کرتا تھا، ان کے سلام کا جواب تک نہیں دیتا تھا۔ اس آیت میں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا معاملہ خدا کے حکم پر موقوف ہے، وہ احکم الحاکمین چاہے عذاب دے چاہے معاف فرمائے۔

ذرا غور کیجئے ان آیات میں کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کا ایسے انداز میں ذکر کیا گیا ہے جیسے کہ وہ بڑے ہی مجرم تھے۔ ذرا ہم اپنے بارے میں سوچیں کہ اللہ و رسول کے احکام کی فرمانبرداری اور دین کے لئے جان و مال کی قربانی کے معاملے میں ہمارا حال کیا ہے اور ہمارا انجام کیا ہونے والا ہے۔

پھر اس سے اگلے رکوع میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ سچے مسلمان کا اللہ کے ساتھ کیا معاملہ اور دین کی راہ میں قربانی کے بارہ میں کیا رویہ ہونا چاہئے اور اس کی زندگی کا کیا رنگ ہونا چاہئے۔ سنئے فرمایا گیا -

”ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة ، يقاتلون في سبيل الله فيقتلون ويقتلون وعداً عليه حقاً في التوراة والاحيل والقرآن ومن اوفى بعهدہ من الله فاستشرو سيعكم الذي تايتمون به ودالذو القور العظیم“

مطلب یہ کہ جو سچے ایمان والے ہیں ان کی جانیں اور ان کے مال اللہ نے جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ اب کسی سچے مسلمان کی جان و مال اسکی اپنی ملک نہیں ہے۔ بلکہ وہ اللہ کے ہاتھ بچ چکا ہے۔ اب ان کا کام یہ ہے کہ جب ان کو راہ خدا میں جہاد اور جاں بازی کے لئے پکارا جائے وہ لبیک کہہ کے میدان میں آجائے، خدا کے اور اسکے دین حق کے دشمنوں کے مقابلہ میں جنگ کریں، ماریں اور مریں۔ اور اس طرح خدا کے ہاتھ بچی ہوئی جان و مال اسکی راہ میں قربان کر دیں اور اسکے عوض جنت اور اس کی لازوال نعمتیں اور ابدی عیش و آرام حاصل کریں۔ آگے فرمایا گیا ہے ”وعداً عليه حقاً في التوراة والاحيل والقرآن“ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملہ بالکل پکا ہے، کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ پہلے مقدس صحیفوں توراة و انجیل میں بھی اس کا اعلان ہو چکا ہے اور اب قرآن میں بھی اسکی ضمانت دی جا رہی ہے۔ اور خدا سے زیادہ وعدہ کا سچا کون ہو سکتا ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ مومنین کا اپنے اللہ کے ساتھ یہ ایسا نفع بخش سودا ہوا ہے جس پر انھیں جتنی بھی خوشی اور مسرت ہو برحق ہے، یہ ان کی بہت ہی بڑی فیروز مندی ہے۔ دالک هو القور العظیم۔

ذرا غور کیجئے اللہ ہی کی دی ہوئی ایک فانی جان جو دیر سویر ختم ہونے ہی والی ہے اور مال و دولت جس کو یا خرچ ہونا ہے یا مر کر ترکہ میں چھوڑ دینا ہے اس کو اللہ کے حکم پر اسکی راہ میں قربان کر کے آخرت کی حیات ابدی اور جنت حاصل کر لینا کتنا نفع بخش سودا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدر دانی دیکھئے کہ وہ خود ہمارا خریدار اور طالب بنا ہے، یہ

نہیں فرمایا کہ مومنین نے اپنی جان اور مال کے عوض ہم سے جنت خرید لی ہے بلکہ یوں فرمایا کہ ہم نے جنت ان کے لئے لکھ دی ہے۔ اور اس کے بدلے ان کی جانیں اور انکے مال ہم نے خرید لئے ہیں، ہم انکے خریدار بنے ہیں۔ خرید و فروخت کے معاملے میں ہمیشہ خریدنے والا طالب ہوتا ہے۔ جو قیمت ادا کر کے مطلوب چیز کو خرید لیتا ہے۔ قیمت کی حیثیت تو خرید و فروخت کے ایک وسیلے کی ہوتی ہے۔

اسکے بعد والی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان مومنین کی زندگی کا کیا ڈھنگ ہوتا ہے اور کیا ان کے اوصاف و احوال ہوتے ہیں — فرمایا گیا ہے -

”التائبون العابدون الحامدون السائحون الراكعون الساجدون الامرون بالمعروف والنہي عن المنکر والحافظون لحدود اللہ وبشر المومنین“

یعنی یہ اپنی خطاؤں، قصوروں سے توبہ کرنے والے اور اللہ کے عبادت گزار بندے ہوتے ہیں ان کی زبانوں پر خدا کی حمد و تسبیح رہتی ہے، یہ خدا کی راہ میں

قریب کے علاقوں میں پھرتے ہیں — (جس دن ان آیتوں کا

کہ ”السائحون“ کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، میرے نزدیک اس کہ

راہ میں پھرنا مراد ہے۔ عبادت اور ذکر و تسبیح کی طرح خدا کی راہ میں پھرنے کا خاص جز تھا، ہمارے اس دور میں تبلیغی جماعت کے مخلصوں کا پھرنا دیکھ کر یہ بات خوب جھٹکتی ہے۔

آتی ہے) — آگے فرمایا گیا ہے ”الراكعون الساجدون“ یعنی یہ لوگ ذوق و شوق سے نمازیں پڑھتے ہیں اور اس سے روحانی غذا حاصل کرتے ہیں۔ ”الامرون بالمعروف والنہي عن المنکر“ یعنی ان ذاتی اعمال و اشغال کے علاوہ اللہ و رسول کے حکم کے مطابق یہ دوسرے

بندگان خدا کی بھی فکر کرتے ہیں۔ اچھے کام کرنے اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لئے کہتے ہیں اور برے کاموں سے ان کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں — آخر میں فرمایا گیا ہے

”والحافظون لحدود اللہ“ یعنی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی محافظت اور پابندی کرتے ہیں،

یعنی جن کاموں اور جن باتوں سے منع فرمادیا گیا ہے ان کی طرف قدم نہیں اٹھاتے

یہ ہے سچے ایمان والوں کی پوری تصویر! آگے ارشاد فرمایا گیا ہے ”وبشر المومنین“ یعنی اے پیغمبر ہمارے ان صاحب ایمان بندوں کو جو اپنا جان و مال اور سب کچھ ہمارے ہاتھ بچ چکے اور جن

کے یہ اوصاف و احوال ہیں ان کو ہماری رضا اور جنت کی خوشخبری دے دیجئے، ہماری طرف سے وہ ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔

ان دو آیتوں نے ہمارے سامنے سچے مسلمانوں کی ایسی مکمل تصویر رکھ دی ہے کہ اسکو سامنے رکھ کے ہم میں سے ہر ایک اپنی ایمانی حالت اور اسلامیت کو جانچ پرکھ سکتا ہے۔ اس میں جتنی کمی ہو سمجھنا چاہئے کہ اتنی ہی ایمان میں اور اسلامیت میں کمی ہے۔

چومی گویم مسلمانم بلرزم  
کہ دانم مشکلات لالہ را

پھر چند آیتوں کے بعد اسی سچی اسلامیت اور ایمان صادق کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

”یا ایہا الدین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین“

یعنی اے مسلمانو! جنہوں نے اسلام کو بطور دین کے قبول کر لیا ہے اللہ سے ڈرو، اپنے اندر تقویٰ اللہ کی کیفیت پیدا کرو اور مومنین صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔

سورہ توبہ کے ان تمام مضامین کے بعد جن میں ہر قسم کے اور ہر درجہ کے نفاق اور دین کی راہ میں قربانی سے گریز، بلکہ معمولی کوتاہی اور سستی پر بھی سخت عتاب کیا گیا ہے اور انتہائی جلال کے کوڑے برسائے گئے ہیں تو ان مضامین کے بعد یہ آیت ”یا ایہا الدین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین“ بڑی معنویت رکھتی ہے۔ اس آیت کی جو دعوت و پکار صحابہ کرام کے لئے تھی وہ میرے اور آپ کے لئے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی مخاطب کر کے فرما رہا ہے ”یا ایہا الدین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین“۔ مجھے اور آپ کو دل سے اور عمل سے جواب دینا چاہئے کہ اے ہمارے اللہ ہم نے فیصلہ کر لیا، تو توفیق دے کہ تیرا تقویٰ اور صادقین کی معیت نصیب ہو جائے۔

اس کے بعد اب اس سورہ کی ان آخری دو آیتوں پر آجائے جو میں نے شروع میں تلاوت کی تھیں اور جن پر یہ سورہ ختم ہوئی ہے۔

آپ حضرات نے اس پوری سورت کے درس سے خود بھی محسوس کیا ہو گا اور میں بھی برابر عرض کرتا رہا ہوں کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے جلال کا بڑا ظہور ہوا ہے۔ مشرکین، یہود و نصاریٰ، منافقین اور وہ مسلمان جن کے ایمانوں میں کچھ ضعف تھا اور وہ صحابہ کرام جن سے دین کے بارہ میں کچھ بھی سستی اور کمزوری ظاہر ہوئی تھی ان سے کے خلاف اس سورت میں بڑا سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے اور سب ہی کو جھنجھوڑا گیا ہے، اسی لئے حضرت حذیفہ اس سورت کو ”سورت العذاب“ کہا کرتے تھے۔ لیکن اس کا خاتمہ ایسی آیت پر کیا گیا ہے جو رحمت سے بھرپور ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

لقد جاءكم رسول من انفسكم عربر عليه ما عنتم حريص عليكم  
بالمؤمنين رؤوف رحيم ۵

مطلب یہ ہے کہ خدا نے تم سب طبقوں پر یہ رحمت فرمائی ہے کہ ایسا رسول تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے جو خود تمہیں میں سے ہے، تم اس کو چانچ پر کھ سکتے ہو اور وہ تمہارا ایسا غمخوار و غمگسار ہے کہ تمہاری تکلیف و مشقت اس پر بھاری اور شاق ہے، اس کو تمہاری فوز و فلاح کی بڑی حرص اور فکر و لگن ہے اور خاص کر ایمان والوں کے لئے وہ بڑا ہی شفیق و ہمدرد ہے اور اس کا قلب رافت و رحمت سے معمور ہے۔ تو اے سب لوگو! تمہیں اللہ کی اس نعمت اور رحمت کی قدر کرنی چاہئے اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرنا چاہئے۔ اور اس کے رؤف و رحیم پیغمبر کی رافت و رحمت سے فائدہ اٹھانا چاہئے اخاص کر ایمان والوں کو چاہئے کہ اس کی مدامت بر چل کر اور اس کا اتباع کر کے اللہ کی رضا اور رحمت اور جنت حاصل کرے۔ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے -

”فان تولوا فقل حسبي الله لا اله الا هو، عليه توكلت وهو

یعنی اگر یہ لوگ رحمت کی اس پکار کو بھی نہ سنیں اور اے پیغمبر

تم ان سے کہدو کہ مجھے تم سے کچھ لینا نہیں، میرا اللہ مجھے کافی ہے، وہی اور صرف۔  
ہے، میرا اسی پر اعتماد و بھروسہ ہے، اور وہ ”رب العرش العظيم“ ہے۔ اس آیت پر یہ سورت ختم ہے۔  
یہ سورہ توبہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں رسول اللہ ﷺ کے آخری دور حیات میں نازل ہوئی ہے اور اس کے مضامین کی نوعیت ایسی ہے کہ گویا یہ الوداعی پیغام اور وصیت نامہ ہے، غالباً اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی تاکید فرماتے تھے کہ ہر مسلمان اس کا علم حاصل کرے تاکہ اس سے اس کو برابر ہدایت اور روشنی ملتی رہے۔ میں نے بھی آج اسی لئے اس کے اہم مضامین کو دہرا دینا مناسب سمجھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب حضرات کو اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں اس کی بالکل آخری آیت کے متعلق ایک حدیث اور سن لیجئے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے سنن ابی داؤد میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صبح و شام سات سات دفعہ یہ کلمہ پڑھ لیا کرے ”حسبی الله لا اله الا هو عليه توكلت وهو رب العرش العظيم“ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مشکلات و مہمات حل ہوئی رہیں گی اور اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔

سبحانك اللهم وبحمدك بشهد ان لا اله الا انت يستعمرک

ونتوب اليك، وصلى الله على سيده الكريم وعلى آله واصحابه اجمعين ۵



## چند بہت ہی مفید کتب

حج کے سفر کی عاشقانہ و مستانہ داستان  
مولانا مرحوم کے البیلے طرز بیان میں۔  
قیمت - 8/-

زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک  
مرتبہ مولانا عتیق احمد قاسمی  
زکوٰۃ کے لئے مالک بنانا لازم ہے یا نہیں۔  
اس پر علماء کرام کی آراء پڑھئے۔

قیمت - 70/-

مکتوبات نعمانی  
مرتبہ مولانا محبت الحق صاحب  
حضرت مولانا نعمانیؒ کے کچھ مکتوبات  
بنام جناب الحاج عزیز الہی خاں صاحب  
قیمت - 25/-

معمولات یومیہ  
از ڈاکٹر عبدالحی مدظلہ  
اصلاح نفس کے سلسلہ میں  
روز آئے معمولات کا جامع نصاب۔ قیمت - 3/-  
صبح و شام کی ماثورہ دعائیں  
دعاؤں کا عجیب و غریب مجموعہ قیمت - 5/-

احکام نماز  
قرآن مجید اور احادیث میں وارد نماز کے بارے میں  
۲۰-۲۰ منتخب احکام کا مجموعہ۔ قیمت - 2/-

انیس نسوان  
عورتوں کے لئے بہترین اصلاحی کتاب۔ قیمت - 8/-

حفظ الایمان  
از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ  
سجدہ قبور، طواف قبور اور علم غیب نبوی کے متعلق  
حکیم الامت کا معروف رسالہ۔  
اہم ترسیمات اور مولانا نعمانیؒ کی نظر ثانی کے بعد  
اب بطلان شامل کر کے شائع کیا گیا ہے۔  
قیمت - 6/-

قرآنی علاج  
از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ  
ہر قسم کی بیماریوں کا علاج قرآنی آیات کے ذریعہ  
قیمت - 5/-

بریلوی فتنہ کا نیا روپ  
از مولانا محمد عارف سبحانی

استاذ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ  
یہ کتاب ارشاد القادری کی کتاب "زلزلہ" کا جواب  
ہی نہیں بلکہ بریلوی فتنہ پر ایک ضرب کاری ہے۔  
مسلم علم غیب اور کائنات میں تصرف کے عقیدہ  
کی جو تنقیح کی گئی ہے وہ اس کتاب کا خاص تحفہ ہے۔

قیمت - 27/-

تاریخ میلاد  
از مولانا عبدالحکیم مرزا پوری

قیمت - 25/-

دربار نبوت کی حاضری  
از مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم

ملنے کا پتہ : للفرقان بکلیو 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ - 18

## حنفیت اور اہلحدیثیت !

اے کاش لوٹ آئے گزر اہوا زمانہ

[ایک مرد انا کی تائید میں مارچ ۱۹۷۹ء کا نگاہ اولیں]

پاکستان میں ہمارے ایک بہت مخلص اور قدیم دوست حکیم  
ہیں، راقم السطور نے گزشتہ شعبان (جولائی) میں پاکستان کا جو سفر  
”الفرقان“ میں آپ نے بھی پڑھا ہوگا اس میں حکیم صاحب کا  
ہونے والے ہفت روزہ ”المسنر فیصل آباد“ کا نیز ان کے قائم کئے ہوئے جامعہ تعلیمات  
اسلام کا تذکرہ بھی کیا گیا تھا کئی مہینے ہوئے ان کے ہفت روزہ ”المسنر“ کا ایک ضخیم خصوصی  
شمارہ ”جامعہ نمبر“ موصول ہوا تھا، اس کے تمام مضامین و مقالات ”جامعہ تعلیمات اسلامیہ“ ہی  
سے متعلق ہیں۔ اس میں حکیم صاحب کی ایک تقریر بھی ہے جو کسی خاص موقع پر  
”جامعہ“ ہی میں کی گئی تھی اس میں حکیم صاحب نے ان دواعی اور محرکات کو بیان کیا تھا جنہوں  
نے ان کو خاص عزائم اور تصورات کے ساتھ یہ جامعہ قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ اس سلسلہ میں  
پانچواں محرک بیان کرتے ہوئے حکیم صاحب نے فرمایا:

”ہم خلوص نیت سے وہ ماحول اسر نوپیدا کرنا چاہتے ہیں جو اس صدی کے شروع میں اہل اللہ کے یہاں  
موجود تھا۔ مولانا مفتی محمد حسن (۱) دیوبندی مسلک کے جید عالم اور پائے کے برگ تھے لیکن ان کا

(۱) حضرت مولانا مفتی محمد حسن ”حکیم الامت“ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے جلیل القدر خلیفہ ارشاد تھے۔ ملک کی  
تقسیم سے پہلے امرتسر میں قیام رہا، جب پاکستان بنا تو لاہور تشریف لائے اور ”جامعہ اشرفیہ“ کی بنیاد ڈالی۔ اللہ تعالیٰ نے  
غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی تھی۔ (نعمانی)

تعلق شاگرد ہونے کا بھی اور محبت رکھنے کا بھی امام عبد الجبار غزنویؒ (۱) سے تھا، اور اس تعلق کو انھوں نے اس قدر عظیم جانا اور اتنا عزیز سمجھا کہ وفات کے مہینے تک آپ مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمہ کے ہاں ملاقات کے لئے تشریف لے جاتے اور اسی طرح مولانا داؤد غزنویؒ بھی اسی طرح محبت سے ان کے ہاں آتے جاتے ان کے مابین ربط کی کیفیت یہ رہی کہ تقریباً ہر مہینے مولانا مفتی محمد حسنؒ مولانا داؤد علیہ الرحمہ کے ہاں ملنے جاتے اور مولانا داؤد بھی اسی طرح کوشش کرتے کہ ملاقات کا سلسلہ جاری رہے۔ مفتی محمد حسن نور اللہ مرقدہ کی زندگی کے آخری مہینے کی یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مفتی صاحبؒ اپنی گاڑی پر تشریف لے گئے پہلے وہ شیر انوالے دروازے سے مولانا احمد علیؒ کے پاس گئے۔

اسکے بعد جب مفتی صاحب، عبد الرحیم شیش محل روڈ مولانا سید داؤد غزنویؒ کے یہاں تشریف لے گئے تھے مولانا غزنوی نے فرمایا کہ حضرت آپ نے رحمت گوارہ فرمائی مجھے پیغام بھیج دیا ہوتا، میں حاضر ہو جاتا، مفتی صاحبؒ نے فرمایا، طبعیت کا تقاضہ یہی تھا کہ خود آؤں۔

یہ تھا وہ ماحول جو ابھی کل تک ہمارے یہاں موجود تھا، اور اسی ماحول کا یہ ایک شمر بھی ہم نے دیکھا کہ مولانا احمد علی علیہ الرحمہ جو پاک و ہند میں عظیم شہرت رکھتے تھے اور لاہور میں تو آپ نے نصف صدی سے زائد قرآن مجید کا درس دیا، ہزاروں شاگرد آپ کے حلقہ درس کے تھے اور لاکھوں معتقد، مگر آپ نے اس وجاہت و مقبولیت کے باوجود عید کی نماز کا کوئی الگ اہتمام نہیں فرمایا اور آپ ہمیشہ اقبال پارک میں مولانا سید داؤد غزنویؒ کے پیچھے ہی ادا فرماتے رہے تا آنکہ آپ اپنے آقا کے حضور حاضر ہو گئے۔“ (المبصر فیصل آباد جامعہ ممبر صفحہ ۵۳-۵۴)

ان واقعات کے ذکر کے بعد حکیم صاحب نے اس تقریر میں اپنا یہ حال بیان کیا ہے کہ ان حنفی و سلفی مخلص علماء ربانین (حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحبؒ، حضرت مولانا احمد علیؒ، حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ) کی یکے بعد دیگر وفات ہو گئی تو میرے قلب میں اس کا شدید داعیہ اور تقاضا پیدا ہو کہ اسے امکان بھر ایسے علماء تیار کرنے کی فکر اور کوشش کی جائے جو ”خصیت، مابالجمہ شیت“ جیسی کسی فرقہ وارانہ نسبت کے بجائے رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور تقویٰ و تعلق باللہ کو اخوت و مودت کی بنیاد بنائیں اور مسلمانوں کو ”امت واحدہ“ بنانا جن کا

(۱) حضرت مولانا عبد الجبار غزنویؒ بر مغیر میں سلفی مسلک کے ربانی عالم تھے۔ ورع و تقویٰ اور تعلق باللہ میں مہی علماء ملتہ کا نمونہ تھے۔ مولانا سید داؤد غزنویؒ ابی کے گھرانے کے چشم و چراغ تھے مسلک کے ساتھ ان ایمانی صفات و خصوصیات میں م

## نصب العین ہو۔

اللہ تعالیٰ حکیم صاحب کے مخلصانہ جذبے اور عزم و ارادہ کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے اور اپنی خاص نصرت سے اس عظیم مقصد میں کامیاب فرمائے۔  
واقعہ یہ ہے کہ خفیت اور اہل حدیث کے مسلکی اختلاف کا درجہ وہی ہے جو ہمارے ان قریبی اکابر کے طرز عمل سے سامنے آیا جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں حکیم صاحب نے کیا ہے۔

اس برصغیر میں فقہ حنفی کو کتاب و سنت پر مبنی یقین کرتے ہوئے اس پر عمل کرنے والے علماء احناف خاص کر وہ جو دیوبند کے تعلیمی سلسلہ اور مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں (اور یہ عاجز بھی اسی سلسلہ کے ادنیٰ تلامذہ میں سے ہے) اور اسی طرح حضرات علماء اہل طبقوں میں جو واقعی اصحاب علم ہیں جہاں تک راقم السطور کا علم، معترف اور اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان دیار میں حضرت و سنت کے علم میں امامت کا درجہ عطا فرمایا تھا اور جن اہل علم نے اس مطالعہ کیا ہے ان میں سے کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کے ہاں

ہے۔ وہ کسی متعین امام و مجتہد کی تقلید کے بغیر کتاب و سنت اور صحابہ و تابعین کے فتاویٰ کی پیروی کو بھی برحق اور سلف امت کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ اور اسکو بھی حق و صحیح اور دین و اہل دین کی مصلحت قرار دیتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کی فقہ کا (اور خاص کر ہمارے اس برصغیر میں فقہ حنفی) کا اتباع کیا جائے، کہ ان ائمہ کے فقہ کی بنیاد بھی کتاب و سنت اور صحابہ و تابعین کے فتاویٰ پر ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے علم سے بلا واسطہ اور بالواسطہ روشنی حاصل کرنے والوں میں وہ اہل بھی تھے جن پر اپنے ذوق و رجحان کی بناء پر پہلا رنگ غالب تھا اور انھوں نے اسی کو اپنایا اور وہ بھی جنھوں نے دوسرے طریقہ میں زیادہ سلامتی سمجھی اور اسی کو اختیار کیا (اور خود حضرت شاہ صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا) پھر درمیان میں ان تاریخی اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں بد قسمتی سے ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اس ذوق و مسلکی اختلافات میں بہت ہی نامناسب شقاق و افتراق کی شکل اختیار کر لی، ایک طرف کی شدت جارحیت دوسری طرف کی جارحیت اور بے اعتدالی کا سبب بنی اور بارہا نوبت سر پھنول اور قدمہ بازیوں تک پہنچی اور کفر کی عدالتوں نے فیصلے کئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

الحمد للہ وہ زمانہ ہم سے پہلے گزر گیا، اللہ تعالیٰ موجودہ دور کے دونوں طبقوں کے اہل علم رہنماؤں کو توفیق دے کہ وہ مسلک و طرز عمل کے اس اختلاف کو اسی حد تک رکھیں جو اس کا درجہ اور مقام ہے اور دینی اخوت و مودت پر اسکو اثر انداز نہ ہونے دیں۔  
حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب نے حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ کا جو طرز عمل بیان کیا ہے وہ ہم سب کے لئے ”اسوہ حسنہ“ ہے ————— واللہ يقول الحق وهو يهدي السبيل۔



بانی الفرقان نمبر ۱۹۹۸ء کی جملہ کامیابی کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ

### اولاد ایجنسی

نیو بلڈنگ، امین آباد، لکھنؤ فون 214054

ڈسٹریبیوٹر۔ دواخانہ طیبہ کالج، اے ایم یو۔ علی گڑھ

بہار نو  
بے بی ٹانک  
بچوں کے تمام اعضاء کو طاقت بخشتا ہے۔  
دانت نکلنے کی تکلیف سے دور رکھتا ہے۔

خون صفا  
حوں کی خرابی، پھوڑے  
پھنسی اور خارش کے  
لئے

دماغین  
دماغی کام کرے والوں  
کے لئے بہترین تھ

— انگوری مشہور ہر بل ٹانک —

معدہ، حگر، گردوں کی کمزوری کو دو کرتی ہے۔  
انگوری ہر موسم اور ہر عمر کے لئے مفید اور صحت بخش ہے۔

# الْحَذَرُ، فَالْحَذَرُ!

[۱۹۴۵ء کی بحرانی سیاسی فضا میں لکھا گیا الفرقان کا ایک ادارہ جو جلد (۱۲) شمارہ (۳) میں ”بدگوئی اور تہمت تراشی کی وبائے عام“ کے عنوان سے شائع ہوا — مرتب]

جب کسی شہر یا کسی علاقہ کی آب و ہوا خراب ہو جاتی ہے اور کوئی بیماری پھیل جاتی ہے تو بہت سے ایسے لوگ بھی جو حفظانِ صحت کے اصولوں سے واقف اور عملاً اس سے احتیاط کرتے ہیں، اوقات وہ بھی اس وبائے عام کا شکار ہو جاتے ہیں بالکل یہی حال اختلاہ بھی ہے جب کسی قوم میں کوئی برائی وبائے عام کی طرح پھیل جاتی۔ زندگی والے بھی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی پار میں ناخدا ترسانہ بدگوئی، افشاءِ عیوب، اور محاسبہ آخرت سے بے پرواہی پر تہمت تراشی کی جو دباؤ اس وقت ہماری قوم پر سلب ہے دیکھا جا رہا ہے کہ بعض اٹھے اٹھے اہل علم اور بظاہر خدا ترس حضرات بھی اس میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

مسلم لیگی مسلک رکھنے والے ایک صاحبِ علم جو معمولی درجہ کے کوئی غیر معروف مولوی نہیں ہیں۔ بلکہ اچھی علمی شہرت کے مالک ہمارے لئے بھی قابلِ احترام ”بزرگ“ ہیں چند روز ہوئے ان کا ایک خط اس عاجز کے نام آیا تھا جس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی دیانت پر ایک نہایت رکیک عامیانہ اور سو قیانہ اتہام اسی بے باکی اور سہل انگاری کے ساتھ لکھا ہوا تھا جس طرح کہ محاسبہ آخرت سے بے خوف اور ناخدا ترس عوام عام طور سے آجکل کہنے اور لکھنے کے عادی ہیں۔ یہ ایک طرف کا حال ہے۔ ساتھ ہی دوسری طرف کی بھی سن لیجئے۔

جمعۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے ایسے ہی ایک اچھے خاصے عالم نے حال کی ایک گفتگو میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے متعلق اظہارِ خیال فرماتے ہوئے ریاست حیدر آباد سے انکی وظیفہ یابی کا ذکر کیا، اور اپنی کسی تحقیق اور اپنی معلومات کی بناء پر نہیں، بلکہ کسی ہندو کی صرف قیاس آرائی کا حوالہ دیتے ہوئے اس عاجز کے سامنے فرمایا، کہ موصوف کو یہ وظیفہ در حقیقت انگریزی سرکار کے خزانے سے بوساطت ریاست حیدر آباد ملتا ہے۔ اور مولانا موصوف

کی طرف سے مسلم لیگ کی موجودہ سرگرم حمایت درحقیقت اس وظیفہ ہی کا نتیجہ ہے ”إِنَّا لِلّٰہِ  
وَرَأْنَا اِلَیْہِ رَاحِعُونَ۔“

یہ بھی واضح رہے کہ جن مولوی صاحب نے یہ فرمایا وہ حدیث میں حضرت مولانا شبیر  
احمد صاحب کے شاگرد بھی ہیں۔

آخرت کی باز پرس اور مواخذہ خداوندی سے قطع نظر سیاسی بحران نے ان حضرات کی  
عقل عام کو بھی اتنا ماؤف کر دیا ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں اسکے بدیہی نتائج کو بھی یہ محسوس نہیں  
کرتے کتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب آپ خود حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے متعلق ایسی  
لغوبات زبان سے نکالتے ہیں جو مسلمہ طور پر آپ کی جماعت کے صف اول کے عالم ہیں حضرت  
شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں، حدیث میں آپ کے استاذ ہیں، محدث ہیں، مفسر ہیں، اور کل  
تک جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی رہے ہیں تو آپ دنیا کو یہ بتلا دیتے ہیں کہ آپ کا  
چوٹی کا عالم۔ آپ کا استاذ حدیث، آپ کا مفسر قرآن، اور برہنہ بر سر تک جمعیۃ العلماء کی مجلس  
عاملہ کا رکن رہنے والا بھی اپنے ایمان اور ضمیر کو فروخت کر سکتا ہے۔ مَا لَکُمْ لَا تَنْتَعُرُونَ۔

پیشک آپ کسی بڑے سے بڑے عالم اور شیخ وقت کے ماہر سیاست ہونے سے انکار کر سکتے ہیں  
آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سیاست حاضرہ کے مبصر یا عملی تجربہ کار نہیں ہیں۔ اسلئے انکی رائے  
ہمارے نزدیک وزن دار نہیں، لیکن انکی دیانت اور انکے ایمان و ضمیر پر حملہ یقیناً گناہ عظیم ہے اور  
اس بارے میں حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب بلکہ عام اہل ایمان کے  
بارے میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اللہ کے نزدیک ہر صاحب ایمان کے ایمان کی عزت کعبۃ اللہ کی  
حرمت سے بھی زیادہ ہے پھر ان میں جو ایمان اور عمل صالح میں جتنا بڑا ہے اس کی حرمت کا حق  
بھی ویسا ہی بڑا ہے، اور اس کو بے ایمانی اور بددیانتی سے منہم کرنا عظیم ترین گناہ ہے جسکی سنگینی کم  
ار کم اہل علم کو تو معلوم ہے۔ جاہل عوام یا ناخدا ترس لیڈروں سے ایسی باتیں سن کر تو صرف دل  
ہی دکھتا ہے، لیکن جب دین کے جاننے والوں، مدرسوں میں پڑھنے پڑھانے والوں اور خانقاہوں  
سے تعلق رکھنے والوں سے بھی ایسی ناخدا ترسانہ باتیں سنی جاتی ہیں تو خطرہ ہوتا ہے کہ شاید دینی  
برکتیں ان سے بھی سلب ہونی مقدر ہو چکی ہیں، اور اللہ ان کو بھی اپنی نظروں سے گرا دینا چاہتا

ہے، حدیث نبویؐ میں وارد ہوا ہے۔ اِذَا تَسَاءَلْتَ اُمَّنًی سَقَطَتْ مِنْ عَیْنِ اللّٰہِ مِیْرَی امْتِ حَبِ  
اَیْتٍ مِّیْنِ بَدَوًی اَرَبًی تَوَالَّدَ کِی اَنْکُھُ سَہْ رَجَیْکِی۔

اللہ کے کسی بندہ کے ایمان و ضمیر پر حملہ کرنا درحقیقت اپنے ایمان اور اپنی دیانت

خطرہ میں ڈالنا ہے ایک حدیث کا مضمون ہے کہ جو شخص اللہ کے کسی بندہ پر ایسی تہمت لگائے جس سے وہ عند اللہ بری ہے تو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر لیا ہے کہ اس تہمت لگانے والے کو وہ اسی برائی میں ضرور مبتلا کریگا اور اس سے پہلے اس کو موت نہ دیگا۔ (العباد باللہ۔

قرآن مجید نے تو ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم برابر اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کریں کہ ہمارے دلوں میں کسی ایمان والے کی طرف سے کینہ اور بدخواہی نہ ہو (ولا تحعل فی قلوبہ ما علیا للذین آمنو رما انک رؤف رحیم) مگر کیا قلب موضوع ہے کہ آج امت کے خواص تک کے قلوب اپنے بھائیوں اور دینی بزرگوں تک کی بدگمانیوں اور کینوں سے بھرے ہوئے ہیں اور زبانیں بدگوئیوں اور تہمت تراشیوں کیلئے وقف ہیں۔ اور کس بناء پر؟ صرف اس بنیاد پر کہ مسلمانان ہند کی نمائندگی کا حق صرف مسٹر جناح اور انکی مسلم لیگ ہی کو ہے، یا کانگریسی مسلمانوں کو بھی؟ اور مسلمانوں کیلئے تقسیم ہند کا نظریہ بہتر ہے یا اتحاد ہند کا؟ ظاہر ہے کہ۔

مسئلوں کا کچھ بھی تعلق نہیں، بلکہ خالص ”قوم پرستانہ“ اور ”مفہ

کئے ہوئے یہ دونوں مسئلے ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کو بھی دیا۔

جہالت یا بڑی ظالمانہ جسارت ہے۔ اور پھر اس اختلاف کی۔

بدگمانیاں اور بدزبانیاں خود اپنے اوپر ظلم عظیم ہے جو شخص بھی قیمت لے رہا ہے۔ بدگوئیوں اور ان پر ناروا، بدگمانیوں اور تہمت تراشیوں کا بوجھ لیکر میدان حشر میں آئیگا، اسکا

معاملہ بڑا بھاری اور حساب بڑا سخت ہوگا۔ فالحدرد الحدرد

☆☆☆



Q. M. Asif

**ASIF CONSTRUCTION COMPANY**

- BUILDER
- PROMOTER
- COLONISERS

339, 3rd Floor, Prince Complex, Hazratganj, Lucknow - 226 001  
Ph (O) 212623 (R) 218927 Fax , 0522-273999



# کیا ابھی وقت نہیں آیا؟

## تقسیم ہند کے بعد کی ایک پکار

(الفرقان، جمادین ۱۴۲۶ھ، ۱۹۴۷ء)

ہندوستان کی سیاست جس رخ پر نہایت تیز رفتاری سے جا رہی ہے اور اس سے جو نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور اس ملک کے بالخصوص مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کا مسئلہ جس قدر نازک اور ان کا مستقبل جس قدر بھیانک ہوتا جا رہا ہے اس سے ہر باخبر اور صاحب فہم و فکر مسلمان کسی نہ کسی درجہ میں پریشان ہے اور مسلمانوں کے قومی مسائل سے تعلق و دلچسپی رکھنے والی مختلف جماعتیں اپنی اپنی صوابدید کے مطابق ان مشکلات کو حل کرنے اور ان پر قابو پانے کے لئے مصروف جدوجہد بھی ہیں۔ لیکن خیالات و نظریات کے بڑے بڑے اختلافات کے باوجود ان سب کے طرز فکر اور طریق کار میں ایک عجیب وحدت اور یکسانیت بھی ہے اور وہ یہ کہ سب کے سب معاملہ پر صرف مادی پہلو ہی سے غور کرتے ہیں اور اس لئے جو کوششیں بھی اس سلسلہ میں ہماری مشہور اور قابل ذکر قومی جماعتوں کی طرف سے ہو رہی ہیں وہ سب مادی تدبیروں ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اگر بالفرض اس ملک کی کسی دوسری قوم کو (جو خدا سے بالکل نا آشنا اور ایمان کی دولت سے محروم ہو بلکہ جو دشمن دین و ایمان ہو) ایسے حالات پیش آجائیں جو اس وقت ہم مسلمانوں کو درپیش ہیں تو یقیناً وہ قوم بھی وہی سب کچھ کرے گی جو ہماری قومی اور سیاسی جماعتیں عام طور سے اس وقت کر رہی ہیں اور اس کی پالیسی بالکل وہی ہوگی جو آج ہماری ہے۔ الغرض یہ بات خواہ کتنی ہی رنج و افسوس کے قابل ہو اور ہمارے قومی کارکنوں کو خواہ کتنی ہی کڑوی لگے مگر یہ ایک غیر مشتبہ حقیقت اور ناقابل انکار واقعہ ہے کہ ہماری قومی اور سیاسی پالیسی کا رشتہ انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی سے گویا کہ کٹ چکا ہے اور کم از کم زندگی کے اس نہایت اہم شعبہ میں ہم دنیا کی خدا فراموش اور مادہ پرست قوموں کے پورے پورے پیرو ہو گئے ہیں انہی کی طرح سوچتے ہیں اور انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اگر اس صاف گوئی سے آپ کے دل پر چوٹ لگے یا اس

حقیقت میں آپ کو کوئی شک و شبہ ہو تو اللہ تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ کو ماحول کے اثرات اور جذبات سے صاف کر کے ہماری مندرجہ ذیل گزارشات پر غور کیجئے۔

ساری دنیا کی خدا آشنا قوموں اور نبوت کی روشنی سے محروم تمام طبقوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان پر جو حالات آتے ہیں اور دنیا میں جو انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں وہ ان کا کوئی خاص تعلق اللہ کے ارادہ اور مشیت سے نہیں سمجھتے اور اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جو خاص قوانین کارفرما ہیں (مثلاً قانون تکوین، قانون ابتلاء، قانون مکافات وغیرہ وغیرہ) وہ چونکہ ان کو بالکل نہیں جانتے، اور اس عالم کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو وہ سلسلہ اسباب ظاہر ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اس لئے صرف ظاہری تدبیروں اور مادی کوششوں ہی سے انکا مقابلہ کرتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے کسی قوم پر کوئی دوسری طاقت اگر حملہ کر دے اور اس کو شکست دے کے اس کے ملک پر قبضہ کر لے تو اس کے زعماء اور مفکرین اس سانحہ پر صرف اس لئے کہ ہمارے دشمن کی فوجیں تعداد میں ہم سے زیادہ اور زیادہ منظم اور کے پاس سامان جنگ ہم سے زیادہ اور ہم سے بہتر تھا، بحری برتری اور میں ان کو برتری اور فوقیت حاصل تھی، میدان جنگ جغرافیائی حیثیت اور ہمارے لئے ناسازگار تھا وغیرہ وغیرہ۔

الغرض دنیا کی تمام خدا شناس قومیں اپنی مغلوبیت اور شکست کے اسباب و وجوہ پر صرف اس طرح سے غور کرتی ہیں اور اس لئے ان کی جدوجہد صرف ظاہری تدبیروں، اسباب و وسائل کی تیاریوں اور مادی کوششوں ہی میں منحصر رہتی ہے اور کون باخبر اور حقیقت شناس اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت ہم مسلمانوں کی قومی پالیسی بھی اصولاً بالکل یہی ہے۔ یہی ہمارے قائدین کا طرز فکر ہے اور یہی طریق عمل ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا بتلایا ہوا طریقہ اس سے بالکل اور بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ان کے فکر و نظر کا اوّلیٰ اور اساسی نقطہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اور کسی فرد یا کسی قوم پر جو اچھے برے حالات آتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ سلسلہ اسباب ہی کے راستہ سے آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب ایک علیم و خبیر اور حکیم و بصیر قادر مطلق ہستی کے حکم سے ہوتے ہیں، لہذا دنیا کے ہر واقعہ کے متعلق ہمیں اسی یقین و اذعان کی بنیاد پر سوچنا اور اسی کے مطابق طریق کار اختیار کرنا چاہئے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس کو باقی رکھنا یا ختم کر دینا یا بدل دینا صرف اسی کے دست قدرت میں ہے اور وہ اگرچہ تو ظاہری اسباب و وسائل کی نامساعدت کے باوجود سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ اسباب و

وسائل کی کمی اور کمزوری کی تلافی اپنی غیبی مدد سے کر کے بہتوں کے مقابلہ میں تھوڑوں کو، زور آوروں کے مقابلہ میں بے وسیلوں اور ساز و سامان سے تہید ستوں کو اپنی خاص مدد سے کامیاب کر سکتا ہے اور اس بارہ میں اس کی خاص سنت اور خاص قانون ہے۔

اور انبیاء علیہم السلام کی سچائی اور رہنمائی پر ایمان و یقین رکھنے والوں اور ان کے طریقہ پر کام کرنے والوں نے بارہا اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے اس خاص ”قانون نصرت“ کا تجربہ بھی کیا ہے۔ قرآن مجید میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے زور آور اور سرکش مخالفوں اور فرعون و نمرود جیسے طاقتور حکمرانوں کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ درحقیقت اسی سنت اللہ کی مثالیں ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی اس سنت اور نصرت کی کار فرمائی کیلئے کچھ اصول اور شرائط ہیں، جن کا تعلق عقائد و خیالات، اعمال و اخلاق، سیرت و کردار غرض انسان کی پوری زندگی سے ہے اور جس کا ایک مختصر اور جامع عنوان ”ایمان والی زندگی“ ہے تو اگر کوئی قوم اور امت اجتماعی طور پر ان اصول پر کار بند ہو جائے اور انہیں اصولوں کے ماتحت جدوجہد کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ اختصاصی معاملہ کرتا ہے کہ تعداد میں کمی اور اسباب و وسائل میں کمزوری کے باوجود اپنی غیبی مدد سے اس کو کامیاب اور نحمدہ کر کے اس دنیا میں بھی عزت و سر بلندی کا مقام عطا فرماتا ہے۔

لیکن اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر یہ قوم کسی وقت اس راہ سے منحرف ہو جائے اور اس کا طرز زندگی بدل جائے تو پھر اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی بدل جاتا ہے اول اول تو اس کو متنبہ کرنے اور چونکا نے کیلئے اس پر مصیبتیں بھیجی جاتی ہیں، دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ ان انتباہی کارروائیوں سے بھی کوئی سبق نہ لے اور اپنے حال کو درست نہ کرے تو پھر اس کیلئے دنیا میں مستقل ذلت و پستی اور تباہ حالی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے (یہودیوں کے متعلق قرآن مجید نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اسی سنت اللہ کی مثال ہے)

بہر حال دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور قوموں کے اچھے برے حالات بالخصوص کتاب و پیغمبر سے وابستگی رکھنے والی امتوں کے عروج و زوال کے متعلق یہ ہے انبیاء علیہم السلام کے طرز فکر اور طریق کار کا اولیٰ اور اساسی نقطہ ————— بیشک وہ ترک اسباب اور ترک تدابیر کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ حدود اللہ کے اندر تمام ممکن اسباب و تدابیر کے استعمال کا اور استطاعت کی آخری حد تک جدوجہد کا سبق دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ان اسباب سے بالاتر اور اس کے ارادہ اور مشیت کو اصل کار فرمایقین کرتے ہیں اور اس لئے اس کی رضا جوئی اور اس کی خاص مدد کے استحقاق کو سب سے بڑی اور بنیادی تدبیر اور اصل فیصلہ کن کوشش سمجھتے ہیں۔

## ہندوستان کی تقسیم پر پہلا تاثر

[۳ جون ۱۹۴۷ء کو ملک کی تقسیم کے فیصلے کا اعلان ہوا تو اس پر پہلا تاثر الفرقان  
بابت جمادی الاولیٰ والاخریٰ ۱۳۶۶ھ کے نگاہ اولیں میں حسب ذیل تھا۔ مرتبہ ۲]

ہندوستان کا وہ سیاسی نزاع جس نے ادھر چند سال سے  
کر رہا تھا خدا خدا کر کے کسی طرح اس کا فیصلہ ہو گیا اور ملک کی  
ہندوستان دو حصوں میں بٹ جائے گا، ایک چھوٹا سا حصہ پاکستان بنے گا۔  
مسلمانوں کا اقتدار ہو گا اور باقی حصوں میں ہندو اکثریت کا اقتدار رہے گا، اس وقت پاکستانی علاقوں  
میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے کچھ اوپر ہے اور اس سے کچھ ہی کم وہ ہندوستان  
کے غیر پاکستانی علاقوں میں ہیں۔  
اس تقسیم کے مفاد و مضار کی تفصیلات سے قطع نظر، اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ  
مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت ملک کی تقسیم اور قیام پاکستان ہی کے حق میں تھی اور اگرچہ  
پنجاب و بنگال کی تقسیم کی وجہ سے ان کی مانگ اور امید و آرزو کے لحاظ سے ناقص اور کٹا پٹا ہی  
پاکستان بنا، مگر بہر حال وہ بن گیا اور پاکستان کا مطالبہ کرنے والی مسلم اکثریت نے اس فیصلہ کو اپنی  
فتح ہی سمجھا اور ہم بھی اس میں اس کو فتح یاب ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر قیام پاکستان کا  
مقصد و ملتہا صرف یہی ہو کہ مسلم اکثریت والے علاقوں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے سیاسی و  
اقتصادی غلبہ سے نجات حاصل ہو جائے اور ان کی ایک ایسی قومی حکومت قائم ہو جائے جس کے  
زیر سایہ وہ ویسی ہی آزادانہ مادی ترقیاں کر سکیں جیسی کہ دنیا کی دوسری خود مختار قومیں کر رہی ہیں  
تو ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ ایک سچے مسلمان کے لئے دین و ایمان کے  
نقطہ نظر سے اس میں کوئی بڑی خوشی کی بات نہیں ہے۔

خدا پرستوں اور دین اسلام پر حقیقی ایمان و یقین رکھنے والوں کے نزدیک اصل اور سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس حکومت (پاکستان) کا اور اس کے چلانے والوں کا رویہ اللہ و رسول اور ان کی ہدایات و تعلیمات کے بارہ میں کیا ہو گا؟ آیا وہ مقصد حکومت اور طرز حکومت میں ٹرکی و ایران وغیرہ کی طرح یورپ و امریکہ کی تقلید کریں گے یا ان ہی خدا ناشناس قوموں سے روشنی حاصل کریں گے یا اسلام کو صحیح ترین اور صالح ترین نظام زندگی یقین کرتے ہوئے اور اللہ کے احکام کی ازلی ابدی صداقت پر ایمان پر رکھتے ہوئے رسول خدا ﷺ اور خلفاء راشدین کے اسوہ حسنہ سے روشنی حاصل کریں گے؟

— افسوس ازمانہ کے پھرے ہوئے حالات اور قوم کے بگڑے ہوئے مزاج اور اسلام کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے عام قوم کی ناواقفیت بالخصوص اس کے زعماء و قائدین کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس امید کے لئے کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔

— ہاں مایوسی کی اسی شب تاریک میں روشنی کی ایک جھلک بھی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں امت کی عام دینی اصلاح اور دعوت اسلام کے احیاء کی جو کوششیں مختلف شکلوں میں ہو رہی ہیں اگر ان کے مخلص کارکن اور دوسرے عام دیندار اور دین کا درد رکھنے والے مسلمان صورت حال کو صحیح طور سے سمجھ لیں اور عوام مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت اور ان میں صحیح اسلامی روح پیدا کرنے کے لئے محض لوجہ اللہ تعالیٰ اس طرح کی جاں فروشانہ کوششیں کریں، جیسا کہ اس کا مقصد کا حق ہے تو ہوا کا رخ ان شاء اللہ تعالیٰ پھر سکتا ہے، یہ زمانہ بادشاہی کا نہیں بلکہ عوامی طاقت کا دور ہے۔

بلکہ ہندو اکثریت کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کی مشکلات کا حل بھی صرف یہی ہے کہ ان کو سچا مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے۔ مسلمان اگر سچے اور سیرت و کردار کے مسلمان بن جائیں تو یقیناً دشمنوں کی دشمنی محبت و عقیدت سے بدل جائے، اور دوسرے ان کو اپنے واسطے ذریعہ برکت سمجھنے لگیں، اور اگر کسی ملک کی شریر فطرتیں صالح اور راست باز ایمان والوں کے ساتھ بھی بدی سے پیش آئیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت اپنا کام کرے گی۔

افسوس اہم نے اسلام کو اور اسلام کے ساتھ اللہ کے معاملہ کو ابھی سمجھا ہی نہیں اگر ہم سچے مسلمان ہو جائیں تو بیسویں صدی کی خدا ناشناس دنیا بھی ”معجزات“ دیکھ سکتی ہے۔ وائٹم  
الاعلوان ان کشم مومیں۔

## انتخابی جنگ میں دین و اخلاق کی پامالی پر

### الفرقان کا احتساب

ایہ ۱۹۴۶ء کے اس الیکشن کی بات ہے جو پاکستان یا متحدہ ہندوستان کے سوال پر لڑا گیا تھا۔

[الفرقان کے پچھلے چند نمبروں کے ان مضامین کی بنیاد جن میں مسلمانوں کا الیکشن کے سلسلہ کی غلط کاریوں پر دینی و اخلاقی نقطہ نظر سے احتساب کیا گیا۔ ایک صاحبِ علم اور صاحبِ صلاح برگ نے (جو مسلم لیگ کے - میں (یقیناً اخلاص اور خیر خواہی کی بناء پر) اپنے اس احساس کا اظہار - لیگ والوں کی جو شکایت کی گئی ہے وہ ”مبلغی حکمت“ کے خلاف - ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مسلم لیگ کے ساتھ ہے لہذا ان سے یہ شکایت اور احتساب کے بجائے ان میں ایک فیصدی درجہ کی بھی اگر کوئی خوبی ہے تو اسی کو اجاگر کر کے ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ موصوف کا خیال ہے کہ ”ان کی غلط کاریوں پر احتساب کرنا، ان پر ہدایت کا دروازہ بند کر دینا ہے۔“

نیز موصوف نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی فرمایا ہے کہ ان مضامین میں جو کچھ لیگ والوں کے متعلق لکھا گیا ہے وہی درحقیقت دوسری جانب (یعنی موصوف کے خیال میں مخالفین لیگ کی جانب) میرے میلان اور جھکاؤ کا نتیجہ ہے، چونکہ اسی عرصہ میں اور بھی بعض حلقوں سے ان مضامین کے متعلق اسی طرح کے احساسات سننے میں آئے اس لئے مولانا موصوف کو جو جواب دیا گیا ہے ”الفرقان“ ہی کے ذریعہ اس کی اشاعت مناسب معلوم ہوتی ہے۔]

”الفرقان“ کے پچھلے چند نمبروں میں الیکشن میں حصہ لینے والی مختلف مسلمان پارٹیوں کے طرزِ عمل پر جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے، میں نے اپنے نزدیک بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے اور فیما بیں ویس اللہ اپنے اندازہ کی حد تک عدل کی میزان میں تول تول کے اور بہت ضروری سمجھ کے لکھا ہے اور اس یقین کے باوجود لکھا ہے کہ دونوں گروہوں سے تعلق رکھنے والے مجھ سے سخت

ناراض ہوں گے (اور یہی ہوا) مگر اللہ تعالیٰ راضی ہو گا اور اس لئے میں تو اپنے اس عمل پر اللہ تعالیٰ سے اجر کا امیدوار ہوں۔

اس کا اصلی اور حقیقی علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں یا آپ جیسے حضرات کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ لیکن مجھے اپنی اس رائے پر بڑا وثوق ہے کہ الیکشن کے اس طوفان بد تمیزی میں دینی و اخلاقی حدود کی عدم رعایت بلکہ پامالی جس طرح ایک عام مسلمہ اصول بن گئی تھی اور تب سے حاملانِ دین بھی جس طرح اپنی محتاطانہ اور مستبانہ خصوصیات کھو کر اس گندے سیلاب میں نہبے اور اپنی پارٹی کی انتہائی درجہ کی ناخدا ترسانہ اور بادشاہانہ (۱) حرکات پر بھی واجبی احتساب تک سے انھوں نے سکوت اختیار کیا تو ایسی وباء عام کی صورت میں (اشخاص و افراد کو نامزد کئے بغیر اور نامنصفانہ طور پر کسی ایک ہی پارٹی کو بدف بنائے بغیر) اس بارہ میں دینی تعلیم کا اظہار، اور عند اللہ ان حرکات کی معصیت کا جو درجہ ہے اُس کا اعلان اور اُس کی اشاعت اور عادلانہ احتساب میرے نزدیک تو فرائض میں سے تھا۔

مجھے معلوم نہیں دوسروں کا مذر اللہ کے یہاں کیا ہو گا (ولست علیہم بکلی) لیکن میں نے تو اپنے لئے کوئی مذر اور خاموشی کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں پائی۔

حضرت مولانا! میں نے کتاب و سنت سے اس بارہ میں جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس وقت امت اجتماعی طور سے کسی گندگی کو اینٹانے لگے، اور اس کی گندگی کا احساس عام ذہنوں سے زائل ہو رہا ہو، اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کو سخت معوص ہیں امت کا اجتماعی ضمیر ہنسی خوشی ان کو ہضم کرنے لگے، تو ایسے وقت میں احتساب اور تواصی بالحق اور تہاہی عن المسکر کے فریضہ کی نوعیت خاص ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر علماء بنی اسرائیل سے جو تغافل ہوا قرآن مجید ہی میں کتنی سختی کے ساتھ اُن کے اس جرم پر وار و گیر کی گئی ہے۔؟

محترم مولانا! الیکشن کے زمانہ میں جو کچھ ہوا میرے علم و اندازہ میں وہ چند آدمیوں کی یا آپ کے الفاظ میں ”لڑکوں“ کی سیرت کی خرابی اور بد اطواری نہیں تھی، بلکہ امت کا اجتماعی ذہن مسخ ہو رہا تھا، اس لئے میں نے بالالتزام اور مسلسل اس کے بارے میں حق کا اظہار و انتباہ ضروری سمجھا۔

نیز میں اس کو حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی عام تبلیغی حکمت عملی کے خلاف اور اس سے متضادم بھی نہیں سمجھتا، لیکن اگر بالفرض ایسا ہوتا تو بھی میں پورے شرح صدر کے ساتھ (استدلالی شرح صدر نہ کہ انکشافی جس کی مجھے ہوا بھی نہیں لگی ہے) اپنے ہی علم و یقین کے مطابق عمل کرنا اپنا دینی فرض سمجھتا۔ (الفرقان جمادی الاولیٰ و آخری ۱۳۶۵ھ)

## ہمارا نصب العین اور طریق کار

[۱۹۳۹ء کی ایک سیاسی تحریر (۱) جس میں جمعیت علماء ہند کی سیاسی پالیسی پر ایک رکن جمعیت کی حیثیت سے گفتگو کی گئی ہے۔ تحریر طویل تھی۔ یہاں صرف اس کا اناحصہ درج کیا جا رہا ہے جس سے اس وقت کے طرز فکر کا اندازہ ملے۔]

۲۸ جنوری ۱۹۳۹ء کے ”الجمعیت“ میں بذیل ”شذرات“ لکھا گیا ہے۔۔۔  
 ”آخر ہم موجودہ نظام حکومت میں تبدیلی کیوں چاہتے ہیں، ہم ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے کیوں دشمن ہیں، کیا اسلئے کہ رام راج قائم کریں؟ کیا اسلئے کہ اپنے حقوق کو نظر انداز کر دیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔۔۔ ہم ہندوستان میں ایک نئی قومی جمہوریت کے لئے اسلئے جدوجہد کر رہے ہیں کہ ہم اپنے قومی و مذہبی حقوق سے پوری طرح متمتع ہونگے، ہم ہر اس ضابطہ اور قانون کو ختم کریں گے اور ختم کرینگی جدوجہد کریں گے جو ہمارے حقوق پر اثر انداز ہوتے ہیں ہم اس مطالبہ سے کسی طرح دست بردار نہیں ہو سکتے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انکی زندگی پر پوری طرح اسلامی شریعت حاوی ہوگی۔“

جو لوگ ”بزرگان جمعیت“ سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں انکو بالیقین معلوم ہے کہ ان حضرات کے عزائم یہی ہیں اور انکے سامنے یہی نصب العین اور یہی مطمح نظر ہے، اور اولاً بالذات ان حضرات کی ساری جدوجہد اسی مقصد کیلئے ہے۔۔۔ لیکن اسوقت اصل سوال یہ ہے کہ اسمیں کامیابی کس طرح ہو سکتی ہے اور کس راہ سے ہم اس منزل مقصود تک پہنچ سکتے



ہیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس بارہ میں ارکان جمعیتیہ کی رائے ایک نہیں ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسکی واحد صورت یہی ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ کانگریس سے وابستہ ہو کر اسکو مضبوط بنائیں اور اسکے زیر قیادت ملک کی آزادی کیلئے جنگ کریں، ان مساعی کے نتیجہ میں جب ہندوستان سے انگریزی اقتدار اٹھ جائیگا، اور ملک قطعی طور پر آزاد ہو جائیگا تو ہمکو اختیار ہوگا کہ اپنے لئے جو قانون مناسب سمجھیں بنائیں اور اپنی زندگی کے لئے جو نقشہ چاہیں تیار کریں — یا یوں سمجھئے کہ جب ملک کی آزادی میں ہماری قربانیاں بھی شریک ہو گئی تو آئندہ قائم ہونیوالی ملکی جمہوری حکومت ہمارے اس مطالبہ کو رد نہ کر سکے گی کہ ”مسلمانوں کیلئے الکی ”شریعت“ کے مطابق علیحدہ قانون ہونا چاہئے — یا یہ کہ اُس وقت ہم اس سے بزدل اپنے اس مطالبہ کو منوالیں گے اور اس کو ماننا پڑے گا — یہ ہیں اُن حضرات کی آرزوئیں جو مسلمانوں کے ملی مفاد کیلئے بھی کانگریس کی شرکت اسکے نظام عمومی سے وابستگی ضروری قرار دیتے ہیں۔

جمعیتیہ ہی کے بعض دوسرے ارکان کی رائے اسکے خلاف ہے، انکا خیال ہے کہ کانگریس کے اصول اور اس کا موجودہ طریقہ کار ہمارے اس نصب العین سے نہ صرف یہ کہ بیگانہ ہیں، بلکہ غائر نظر سے دیکھا جائے تو تضاد کی نسبت رکھتے ہیں اسلئے اس کے اصولوں کی پیروی کر کے اور قوم کو اسکے ساتھ چلا کے ہم کسی وقت بھی اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے — میں خود اسی آخری رائے کو صحیح رائے سمجھتا ہوں اور مختصر اسکے وجوہ بھی پیش کرتا ہوں۔

اس کاوش سے میرا مقصد کسی گروہ، کسی جماعت یا کسی بزرگ کو ملزم کرنا نہیں ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ رہنمایان ملت پھر اس پر غور فرمائیں — ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اور اپنے ہی ہاتھوں سے وہ سب کچھ ہو جائے جسکے تصور کیلئے بھی ہم میں سے کوئی تیار نہیں ہے، مجھے اس پر اصرار کا حق نہیں ہے، یہی رائے صحیح ہے کیونکہ یہ وحی والہام سے تو معلوم ہی نہیں ہوئی ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی میں کوئی غلطی ہو، جہاں جہاں تک غور و فکر اور اپنی بصیرت رہنمائی کر سکی ہے میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں — لیکن اگر ثابت ہو جائے کہ صحیح طریقہ کاریہ نہیں بلکہ دوسرا ہے تو پھر الحمد للہ بلا ادنی تردد کے اسی کو اختیار کیا جائے گا اور کوئی استنکاف و استکبار ان شاء اللہ رجوع الی الحق سے مانع نہ ہوگا — اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے مسائل میں اپنی غلطی محسوس کرنا اور ایک راستہ پر پڑ کر پھر اس سے ہٹنا بڑا مشکل کام ہے حتی کہ خود مجھ سے ایک اچھے خاصے صاحب نے اب سے چند مہینے پہلے فرمایا تھا کہ ”بھلا بیس برس سے ہم قوم کو جو مشورہ دے رہے ہیں اس کے خلاف کس طرح زبان کھول سکتے ہیں اور کس

منہ سے قوم کے سامنے جاسکتے ہیں۔“ لیکن خدا پرستوں کا شعار تو یہی ہونا چاہئے کہ خواہ وہ کسی راستہ پر کتنے ہی دور نکل گئے ہوں لیکن جس لمحہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ راہ غلط ہے اور اس پر چلنا مفاد ملت کے خلاف ہے تو اسی لمحہ وہ اپنے پاؤں لوٹ جائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے درمیان کسی جائداد کے بوارہ کا سوال نہیں ہے سب کے سامنے ملت ہی کا مفاد ہے جو سب کو یکساں ہی عزیز ہے اسلئے اسمیں کسی کے پرستی اور جیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللهم اربا الحق حقاً وارزقنا اتعاه والباطل باطلا وارزقنا احتسابه

اصل مسئلہ پر غور کرنے کے لئے پہلے اسکی ضرورت ہے کہ کانگریس کے اصول اور اس کے اس وقت کے طریق پر ایک گہری نظر ڈالی جائے۔ جو لوگ اس موقع پر بلند آہنگی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ ”کانگریس بس ملک کو آزاد کرانا چاہتی ہے اور اسمیں شامل ہو کر ہمیں آزادی ملک کے لئے جنگ کرنی چاہئے۔“

غالباً انھوں نے صورت حال پر پوری طرح غور نہیں کیا

آزادی اور اجنبی تسلط سے ملک کی خلاصی کا سببی پہلو ہی نہیں ہے ؛ کی تشکیل و تعمیر کا ایجابی پہلو بھی ہے اور اس کے لئے اس کے

نقشہ ہے اور جس کے مطابق وہ مستقبل کی تعمیر میں اس وقت مصروف ہے۔

کہ ہمارے ان عزائم کی تکمیل کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اس میں اور ہمارے اس نصب العین میں جس کے لئے بقول مدیر الجمیۃ ہم موجودہ نظام حکومت میں تبدیلی چاہتے ہیں اور جس کے واسطے ہماری ساری جدوجہد ہے تضاد کی نسبت ہے۔

(۱) کانگریس کا پہلا بنیادی اصول جس پر وہ ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتی ہے

اور کر رہی ہے ”نیشنلزم“ ہے یعنی ”واحد قومیت“ کا نظریہ ہے، اس اصول کے ہوتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ ”جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی زندگی پر اسلامی شریعت پوری طرح حاوی ہوگی اور گویا ان کو حق ہوگا کہ وہ دیگر باشندگان ملک سے الگ اپنا قانون و دستور اسلامی شریعت کو بنائیں، ایسے ہی حضرات سے ممکن ہے جو یا تو نیشنلزم کی حقیقت سے واقف نہیں، یا پھر بلا سوچے سمجھے بات کہنے کے عادی ہیں۔“

اس نظریہ ”قومیت“ کا تو منشاء ہی یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہر ہندوستانی

صرف باشندہ ہند یا ”ہندوستانی قوم“ کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے شریک ہوگا اور اسٹیٹ کے معاملات میں فرقہ وارانہ اصولوں پر کوئی تقسیم و تفریق نہ ہوگی۔ جو حضرات اس غلط فہمی

میں مبتلا ہیں ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ حضرات کے یہ عزائم آجکل کی اصطلاح میں اعلیٰ درجہ کی ”کیوسٹ“ اور فرسودہ خیالات جو نیشنلزم“ اور نظریہ واحد قومیت کے صریح منافی بلکہ اس کی ضد ہیں، اور اسکے مان لینے کے بعد ان کا مطالبہ بھی یقیناً ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔

(۲) کانگریس کا دوسرا بنیادی اصول انگلستانی طرز کی وہ ”وحدانی جمہوریت“ ہے جسکی بنیاد اسی واحد قومیت کے نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ اس میں کسی قوم کو بحیثیت مستقل قوم کے تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ علی الاطلاق کثرت رائے ہی حاکم اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اس قسم کی جمہوریت کا مستقل فائدہ اسی قوم کو پہنچ سکتا ہے جو بلحاظ تعداد اکثریت میں ہو، اور اس راستہ سے بالآخر اکثریت والی قوم ہی بلا شرکت غیر سارے اختیارات کی مالک بن جاتی ہے۔ اس اصول پر مستقبل میں کانگریس جو حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اس کا نمونہ اس وقت خود ادارہ کانگریس ہے، چونکہ اس کا نظام اسی قسم کی جمہوریت پر قائم ہے اس لئے اس پر اول سے آخر تک اکثریت ہی والی قوم کا قبضہ ہے اور اگر کسی مسلمان کو کوئی عہدہ ملا ہوا ہے تو وہ صرف دوسروں کا رحم و کرم یا دانشمندانہ انتخاب ہے حتیٰ کہ اگر ہندوستان کے سارے مسلمان متفقہ طور پر کسی مسلمان کے متعلق مثلاً حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیتہ علمائے ہند کے لئے یہ چاہیں کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن ہو جائیں تو وہ اپنی اجتماعی طاقت سے بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ دوسری قوم نہ چاہے، لیکن اس کے برعکس اگر دوسری قوم کسی مسلمان ہی کو منتخب کرنا چاہے تو وہ صرف اپنے دونوں کی طاقت سے کر سکتی ہے، اگرچہ ایک مسلمان بھی اس کے حق میں نہ ہو۔

بہر حال کانگریس کے موجودہ نظام میں مسلمانوں کی نمائندگی خود مسلمانوں کے اختیار میں نہیں ہے۔

### چند خام خیالیاں

اس مسلک کے جن دوستوں اور بزرگوں سے اب تک تبادلہ خیالات کا موقع ملا ہے ان کے خیالات اور ان کے توقعات اس بارے میں کچھ عجیب عجیب ہیں۔

پچھلے دنوں ایک صاحب سے اسی موضوع پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے میری اس قسم کی باتوں کے جواب میں فرمایا کہ بے شک کانگریس کے یہ اصول تو ہمارے ملی مقاصد کے ضرور خلاف ہیں لیکن اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس میں شامل ہوں اور اپنی طاقت سے ان اصولوں کو بدلوائیں، میں نے عرض کیا کہ اس کی عملی صورت کیا

ہے۔ جہاں تک چار آنہ والی ممبری کا تعلق ہے وہ تو اختیاری ہے کے ہر شخص سال میں چار آنہ ادا کر کے کانگریس کا عمومی ممبر بن سکتا ہے لیکن اس کو اس سے زیادہ کچھ حق نہیں ملتا کہ وہ مقامی کانگریس کمیٹی یا براؤنسل (صوبہ کمیٹی) کی رکنیت کے امیدواروں کو ووٹ دے سکے۔ اور کانگریس کے تمام انتخابات اسی واحد قومیت اور وحدانی جمہوریت کے اصول پر ہوتے ہیں جن کی رو سے ممکن ہے (بلکہ اگر اکثریت رحم و کرم سے کام نہ لے یا کسی وقت اپنی مصلحت اسی میں سمجھے کہ مسلمانوں کو منتخب نہ کیا جائے تو اغلب بلکہ یقینی ہے) کہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں دو دو چار چار مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکیں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں (جس کے ہاتھ میں کانگریس کی پالیسی ہے) ان کا تناسب پانچ فیصدی بھی نہ ہو سکے اور اگر بالفرض اکثریت رحم و کرم ہی کی پالیسی پر کاربند رہے اور مسلمانوں کو بھی ان کے حق کے مطابق کانگریس میں نمائندگی کا موقع دے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکے گا کہ مسلمان پچیس تیس فیصدی ہی پہنچ جائے۔

تو کوئی امکان ہی نہیں — پس یہ امید رکھنا اگر مسلمان کی زیادہ ہو جائیں تو وہ اپنی رائے کی قوت سے کسی وقت اس کے فیصلوں میں کرا سکیں گے محض خام خیالی ہے۔

اور یہ جو فرض کر لیا گیا ہے کہ ”اکثریت“ مسلمانوں کو ان — میں نمائندگی کا موقع دے محض فرضی ہی بات ہے ورنہ اس وقت تک کے تجربات صاف بتلا رہے ہیں کہ ان کی خود غرضانہ ذہنیت سے اسکی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بعض حضرات اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں ہیں لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اس وقت تو کانگریس کی ان تمام چیزوں سے چشم پوشی کر کے اس میں شامل ہو کر ملک کو آزاد کرالو، اس کے بعد سب کچھ منوالینا آسان ہوگا۔

درحقیقت یہ بھی نہایت غلط بلکہ مہلک تخیل ہے اس سوال کو بعد کے لئے اس وقت ملتوی کیا جاسکتا تھا، جبکہ کانگریس کی جنگ آزادی خالص انقلابی ہوتی لیکن در صورت کہ اس کی جنگ کی نوعیت دستوری یا نیم دستوری اور نیم انقلابی ہے اور قدیمی نظام حکومت کی تخریب کے ادعاء کے ساتھ ہی ساتھ وہ انگریزی حکومت سے تعاون بھی کرتی ہے اور اسی اثنا میں جدید قومی حکومت کی تدریجی تعمیر بھی کرتی جا رہی ہے — یہ خیال قائم کرنا (کہ اس وقت تو کانگریس جو کچھ کر رہی ہے کرنے دو بلکہ ہر معاملہ میں اس کی تائید و حمایت ہی کرو، اور جن غلط یا صحیح بنیادوں پر ہندوستانی اسٹیٹ کا ارتقاء اس کے ہاتھوں ہو رہا ہے ہونے دو، بعد میں ہم اس کو اپنی منشاء کے

مطابق بنالیں گے) ایک ایسی سطحی بات ہے جس کو صرف بے غوری یا سادہ لوحی کا نتیجہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

بعض مقررین اس موقع پر بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ بھائی! یہ وقت ان باتوں کے چھیڑنے کا نہیں ہے پہلے ملک کو آزاد ہونے دو پھر بس ہندو مسلمانوں کا معاملہ رہ جائے گا اور نبٹ لیا جائے گا بھلا موحد مسلمان ان دھوتی بند مشرکوں، بت پرستوں سے دب جائے گا۔؟ اسلام اگر صداقت ہے اور مسلمان اگر خدا کے پرستار ہیں تو کوئی وجہ نہیں کے ہندو کسی وقت ہم کو دبا سکے یا ہماری بات نہ مانی جائے۔ نعرہ تکبیر ————— اللہ اکبر زندہ باد۔

ہم جیسے کم تجربہ کار یا ”نا تجربہ کار“ جب اس قسم کی مجذوبانہ تقریریں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں سے (جو خیریت سے اپنے کو سیاسی واقف کار بلکہ میدان سیاست کا شہسوار بھی سمجھتے ہیں) سنتے ہیں تو بخدا غرق حیرت رہ جاتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہی حضرات جس وقت ملک کی آزادی کی ضرورت ثابت کرنے پر آتے ہیں تو ان کا سارا زور اسی پر ہوتا ہے کہ انگریز نے اسلام کو سخت نقصان پہونچایا ہے اس نے مسلمانوں کی حکومت کو برباد کیا، بہت سے اسلامی علاقوں کی آزادی سلب کر کے وہاں کے مسلمانوں کو اینا غلام بنالیا، اس نے نہ صرف ہماری حکومت اور دولت ہی چھینی ہے بلکہ ہمارے مذہب کو بھی برباد کر ڈالا ہے“ (اور بے شک یہ سولہ آنے صحیح ہے بلکہ اسلام اور مسلمان پر انگریز کے مظالم اس سے بدرجہا زیادہ ہیں) لیکن یہی حضرات جب مسلمانان ہند کے مستقبل پر آتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں واحد خدا کے پرستار ہیں بھلا کوئی ہم کو دبا سکتا ہے؟ — گویا ان کی اسلامیت صرف ہندوؤں کے مقابلہ میں ہے ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح ہماری ہی بعض منظم کاریوں کی وجہ سے انگریز کو یہ موقع ملا کہ وہ یہ ظلم و ستم ہم پر کر سکا اسی طرح ہماری غلط روی ہندی مشرکوں کو بھی اس کا موقع دے سکتی ہے۔

## معرکہ القلم (۸) فیصلہ کن مناظرہ

(پیوستہ بگزشتہ)

[الفرقان کے اولین فائل میں سے اس مناظرانہ تحریر کا ایک ٹکڑا جس کی اشاعت کا تقاضہ الفرقان کے اجراء کا فوری باعث ہوا تھا، تاریخی حیثیت کے علاوہ کئی پہلوؤں سے قابل دید ہے۔ — مرتب]

(خانصاحب بریلوی حکیم الامت مدظلہ کے متعلق کفر کی فرد جرہ)

وہذا لفظہ الملعون ان صح حکم  
 علی ذات السی المقدسة تعلم المعیبات  
 کما یقول نہ رید فالمستول عنہ انہ مادا  
 اراد بهذا أ عص العیوب ام کلها فان  
 اراد العص فای خصوصية فيه لحصره  
 الرسالة فان مثل هذا العلم بالعیب  
 حاصل لرید وعمر و بل لكل صی  
 ومحسوس بل لجميع الحيوانات والہائم  
 وان اراد الكل بحيث لا یستد منه فرد  
 فطلانہ ثابت نقلاً وعقلاً۔ اقول فانظر  
 الی ثار حتم اللہ تعالیٰ کیف یسوی  
 بین رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ  
 وسلم و بین کذا و کذا۔

اور اسکی مد  
 مقدسہ یہ  
 صحیح ہو تو دریافت سب یہ امر ہے کہ اس  
 غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب۔ اگر  
 بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی  
 کیا تخصیص ہے۔ ایسا علم غیب تو رید و عمر و بلکہ  
 ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کیلئے  
 بھی حاصل ہے۔ الی قولہ۔ اور اگر تمام علوم  
 غیب مراد ہیں اس طرح کہ اس کی ایک فرد  
 بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل نقلی  
 و عقلی سے ثابت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ  
 تعالیٰ کی مہر کا اثر دیکھو یہ شخص کیسی برابری  
 کر رہا ہے رسول ﷺ اور جنس و چناں میں۔

اس جگہ خان صاحب نے حضرت حکیم الامت کے متعلق جو سخت اور متعفن کلمات استعمال کئے

ہیں ان کا جواب تو ہم اس وقت کچھ نہیں دے سکتے اور اس وقت کیا! کسی وقت بھی نہیں دے سکتے، اس کا ترکی بہ ترکی اور کلمہ بکلمہ جواب وہی بازاری دے سکتا ہے جو گالیوں کے فن میں بھی مجددانہ شان رکھتا ہو، ہم تو اس فن سے بالکل عاری اور عاجز ہیں۔  
ادھر قرآن حکیم کا ارشاد ہے

قل لعنادی یقول التی ہی احسن ان الشیطان یرع سیهم، ان الشیطان کان للانسان عدواً مبیاً ہ  
اے رسول آپ میرے (ایمان والے) بندوں سے کہئے کہ وہ بات کہیں جو اچھی ہو، تحقیق شیطان پھوٹ ڈلواتا ہے اکے درمیان، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

دوسری جگہ خود حضور کو ارشاد ہے

ادفع بالنئی ہی احسن السیئة آپ بدی کا جواب نیکی سے دیجئے  
پس حسب فرمودہ قرآن ہم خان صاحب کی ان گالیوں کے جواب میں صرف حق تعالیٰ سے یہ عرض کریں گے کہ خداوند! اخان صاحب تو اس دنیا سے جا چکے اب تو ان کی اولاد کو ایسی بری عادتوں سے بچا جو دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں حرمان و خسران کا باعث ہوں۔  
تم شوق سے مجھے کو سو میں تم کو عداوتوں جو میرا برا چاہے خدا! اس کا بھلا ہو

اسکے بعد ہم اصل بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ”واللہ الہادی الی سبیل الرشاد“ معلوم ہوتا ہے کہ حسام الحرمین لکھتے وقت خان صاحب نے قسم کھائی تھی کہ کسی معاملہ میں بھی محض سچائی اور دیانت داری سے کام نہ لوں گا، غور تو کیجئے، کہاں حفظ الایمان کی اصل عبارت اور اس کا حقیقی اور واقعی مطلب اور کجا خان صاحب کا تصنیف کردہ یہ لعنتی مضمون۔ کہ ”غیب کی باتوں کا جیسا علم رسول اللہ ﷺ کو ہے ایسا تو ہر بچے اور ہر پاگل بلکہ ہر جانور اور ہر چارپائے کو حاصل ہے“ (معاذ اللہ منہ) کاش خان صاحب اپنا فیصلہ ”کفر سنانے سے پہلے“ ”حفظ الایمان“ کی پوری عبارت بغیر قطع و برید کے نقل کر دیتے تو ناظرین کو خود ہی حقیقت معلوم ہو جاتی اور آج ہم کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ”حفظ الایمان“ حضرت حکیم الامت (دامت برکاتہم) کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں تین بحثیں ہیں اور تیسری بحث یہ ہے کہ ”حضور سرور عالم ﷺ کو عالم الغیب کہنا درست ہے یا نہیں“ واضح رہے کہ مولانا کی بحث اس میں نہیں ہے کہ ”حضور اقدس“ کو علم غیب تھا یا نہیں؟ اور تھا تو کتنا؟ بلکہ وہاں مولانا مدظلہ

صرف اتنا ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور کو ”عالم الغیب“ کہہ نہیں سکتے۔ اور ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے، کسی صفت کا واقع میں کسی ذات کے لئے ثابت ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اس کا اطلاق بھی اس پر جائز ہو، قرآن کریم میں حق تعالیٰ کو ہر چیز کا خالق بتلایا گیا ہے (۱)۔ اور تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ عالم کی ہر چیز صغیر ہو یا کبیر عظیم ہو یا حقیر سب اسی کی مخلوق ہے، لیکن بایں ہمہ فقہاء کرام تصریح فرماتے ہیں کہ اسکو ”خالق القدرہ والختازیر (۲)“ کہنا ناجائز ہے۔ علیٰ ہذا قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے زرع (کاشت) کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے لیکن اس کی ذات پاک پر زارع (کاشتکار) کا اطلاق درست نہیں اسی طرح بادشاہ کی طرف سے لشکر کو جو عطیادائیے جاتے ہیں اہل عرب ان پر رزق کا اطلاق کرتے ہیں چنانچہ لغت کی عام کتابوں میں یہ محاورہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ”ررف الامیر الحد (۳)“ لیکن بایں ہمہ بادشاہ کو رزاق یا رزاق کہنا ہرگز درست نہیں۔ اور حضور کے فضائل مبارکہ پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

آپ خود ہی اپنے نعل مبارک کو ٹانگ لیا کرتے تھے اور خود

اس کے باوجود حضور اقدس کو ”حاصف العل“ ”جفت

دوئے والا“ نہیں کہا جاسکتا۔ بہر حال یہ حقیقت ناقابل انکار

ذات کسی ذات میں پائی جاتی ہے اور اس کا اطلاق درست نہیں

تمہید سے ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ حضور کو علم غیب ہونا، نہ ہونا ایک الگ بحث ہے اور آپ کی ذات قدسہ پر عالم الغیب کے اطلاق کا جواز، عدم جواز ایک الگ مسئلہ ہے اور ان دونوں میں باہم تلازم بھی نہیں، جب یہ بات ذہن نشین ہو گئی تو اب سمجھئے کہ حفظ الایمان میں اس موقع پر حضرت مولانا مدظلہ کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ حضور کی ذات مقدسہ پر عالم الغیب کا اطلاق ناجائز ہے۔ اور حضور کو جس طرح خاتم النبیین، سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، وغیرہ وغیرہ القابات سے یاد کر سکتے ہیں، اس طرح لفظ ”عالم الغیب“ سے حضور کو یاد نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس مدعا کی دودلیلیں مولانا نے پیش کی ہیں، پہلی دلیل کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ چونکہ عام طور پر شریعت کے محاورات میں ”عالم الغیب“ اسی کو کہا جاتا ہے جس کو غیب کی باتیں بلا واسطہ اور بغیر کسی کے بتلائے ہوئے معلوم ہوں (اور یہ شان صرف حق تعالیٰ کی ہے) لہذا اگر کسی دوسرے کو عالم الغیب کہا جائے گا تو اس عرف عام کی وجہ سے لوگوں کا ذہن اسی طرف جائے گا کہ ان کو بھی ”بلا واسطہ غیب کا علم ہے“ (اور یہ عقیدہ صریح شرک ہے) پس حق جل مجدہ کے سوا کسی اور

(۱) اللہ خالق کل شیء وخلق کل شیء فقد رتقدیر (الی غیر ذلک من الآیات) (۲) بدردوں اور سوڈوں کا خالق۔ (۳) میرے لشکر کو رزق دیا۔



کو ”عالم الغیب“ کہنا بغیر کسی ایسے قرینے کے جس سے معلوم ہو سکے کہ قائل کی مراد ”علم غیب بلا واسطہ نہیں ہے“ اسلئے نادرست ہو گا کہ اس سے ایک مشرکانہ خیال کا وہم ہوتا ہے، قرآن و حدیث میں ایسے کلمات سے منع فرمایا گیا ہے جس سے اس قسم کی غلط فہمیوں کا اندیشہ ہو، چنانچہ قرآن کریم میں حضور کو لفظ ”راعنا“ سے خطاب کرنے کی ممانعت، اور حدیث شریف میں اپنے غلاموں اور باندیوں کو ”عبدی“ و ”امتی“ کہنے سے نہی اسی لئے وارد ہوئی ہے کہ یہ کلمات ایک باطل معنی کی طرف موہم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ خود متکلم کا قصد ایسا نہ ہو۔ یہ ہے حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کے پہلی دلیل کا خلاصہ، مگر چونکہ خانصاحب کو مولانا کی اس دلیل پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ تقریباً یہی مضمون خود خانصاحب نے بھی ”الدولة المکیة“ میں ایک جگہ پوری تفصیل سے لکھا ہے اس لئے اس کی تصویب و تائید میں ہم کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور اب مولانا مدظلہ کی دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسی میں وہ عبارت واقع ہے جس کے متعلق خانصاحب کا دعویٰ ہے کہ

”اس میں تصریح کی کہ غیب کی باتوں کا جیسا علم رسول خدا ﷺ کو ہے ایسا تو ہر بچے اور ہر یاگل اور ہر جانور اور ہر چارپائے کو حاصل ہے“

لیکن ہم حفظ الایمان کی اصل عبارت نقل کرنے سے پہلے تسہیل فہم کے لئے یہ بتلادینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری دلیل میں مولانا نے مسئلہ کی دو شقیں کر کے ان میں سے ہر ایک کا ابطال کیا ہے اور حاصل مولانا کی اس دوسری دلیل کا یہ ہے کہ جو شخص حضور کی ذات مقدسہ پر عالم الغیب کا اطلاق کرتا ہے اور آپ کو ”عالم الغیب“ کہتا ہے (مثلاً زید) وہ یا تو اس وجہ سے کہتا ہے کہ اس کے نزدیک حضور کو بعض غیب کا علم ہے۔ اور یا اس وجہ سے کہ آپ کو کل غیب کا علم ہے یہ دوسری شق تو اس لئے باطل ہے کہ اس حضرت کو کل غیب کا علم نہ ہونا دلائل عقلیہ و نقلیہ سے ثابت ہے (اور خود مولوی احمد رضا خانصاحب بھی اس سے متفق ہیں) اور پہلی شق (یعنی بعض غیب کی وجہ سے حضور کو عالم الغیب کہنا) اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ ہر انسان بلکہ حیوانات تک کو ”عالم الغیب“ کہا جائے کیوں کہ غیب کی بعض باتوں کا علم تو سب کو ہے۔ کیوں کہ ہر جاندار کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ضرور ہے جو دوسرے سے مخفی ہے۔ پس اس شق کی بنا پر چونکہ سب کو عالم الغیب کہنا لازم آتا ہے اور یہ عقلاً، نقلاً، عرفاً غرض ہر حیثیت سے باطل ہے لہذا ملزوم (یعنی زید کا حضور کو بعض علوم غیبیہ کی وجہ سے عالم الغیب کہنا) بھی باطل ہو گا۔ یہ ہے مولانا کی ساری تقریر کا خلاصہ ... ..

## نیک ارادے کے ساتھ سنیما بینی؟

[الفرقان ۱۳۵۳ھ - ۱۹۳۲ء میں بریلی سے جاری ہوا۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا صدق (لکھنؤ) پہلے سے نکل رہا تھا۔ بائی الفرقان کی نظر میں وہ اس قدر قابل تعریف اور قابل قدر تھا کہ ۱۳۵۵ھ کے الفرقان نمبر (۷) میں ”مرص الخاد کے دو حکیم“ کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا تو اس دو میں ایک نام مولانا دریابادی کا تھا۔ لوگوں کو توجہ دلائی گئی تھی کہ ”صدق“ کا مطا۔ کی تفسیر چھپی تو اس کا بھی نہایت اہتمام سے الفرقان میں کئی بار در میں پڑھا گیا کہ مولانا نے ایک شرعی مقصد سے سنیما دیکھا۔ بائی الفرقان نام و نشان کے ”ایک مشہور دینی جریدے کے محترم مدیر“ کو توجہ بہت خلاف امید ملا تو دوبارہ مذکورہ بالا عنوان سے جو کچھ لکھا گیا وہ حضرت ماں پہلوا جا کر کرتا ہے۔ اسکی اشاعت جمادین ۱۳۶۲ھ کے شمارے میں ہوئی۔۔۔۔۔ مرتب]

”سنیما بینی“ کے متعلق ایک مشہور صحیفہ کے محترم ایڈیٹر کی ایک نہایت خطرناک علمی غلطی کا تذکرہ دلی رنج و قلق کے ساتھ ”الفرقان“ کے گزشتہ پرچہ کے انہی صفحات میں کیا گیا تھا، خود اُن محترم سے بھی اپنی رائے پر ”نظر ثانی“ کی درخواست پوری دلسوزی سے کی گئی تھی، اور دوسروں کو اس غلطی سے بچانے کا جو فرض اپنے اوپر عائد ہوتا تھا اپنے امکان بھر اس کی ادائیگی بھی پوری کوشش کی تھی۔ شکر گزار ہوں کہ ”اُن محترم“ نے میری اس کوشش کو تو مخلصانہ اور خیر خواہانہ ہی سمجھا، لیکن رائے میں کوئی تبدیلی اس کے بعد بھی نہیں ہوئی بلکہ پوری قوت و شدت کے ساتھ موصوف کو اب تک اپنے اس نظریہ پر اصرار ہے کہ — سنیما بینی اگرچہ فی حد ذاتہ معصیت اور حرام و فسق ہی ہے لیکن اس قسم کے معاصی و فواحش کے ارتکاب سے بھی بہت سے ”دینی فوائد“ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اگر ان ”دینی فوائد“ ہی کی نیت سے اس حرام و فسق (سنیما بینی) کا ارتکاب کر لیا جائے اور اسکے ذریعہ حاصل کئے ہوئے

معلومات و تجربات سے ”دین کی خدمت و تبلیغ“ میں کام لیا جائے تو امید یہ ہے کہ یہ فعل قابل مواخذہ نہ ہوگا۔

محترم موصوف نہ صرف یہ کہ اپنے اس غلط تر اور خطرناک نظریہ پر مصر ہی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس غلطی میں اپنا ہم نوا کرنے پر وہ اپنے دماغ و قلم کی پوری قوت صرف فرما رہے ہیں اور اس مہینہ میں ان کے اخبار کا کوئی پرچہ بھی غالباً اس کوشش سے خالی نہیں رہا ہے۔

جن محترم بزرگ کا اس قضیہ سے تعلق ہے چونکہ دین ہی کے واسطے سے یہ ناچیز بھی ان سے کچھ نیاز مند نہ ربط و تعلق رکھتا ہے، نیز اس وجہ سے کہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے وہ نرے اڈیٹر نہیں ہیں بلکہ دین کے مخصوص اور دردمند خادموں میں ان کا شمار ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ ”تفسیر قرآن“ ان کا ایک ایسا تازہ دینی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ایک بہت بڑے طبقہ کیلئے ان کی بات ”دینی سند“ ہو سکتی ہے نیز یہ کہ وقت کے بعض اکابر علماء و مشائخ سے ان کی ایک طرح کی عقیدہ مندانه یا ارادہ مندانه وابستگی بھی لوگوں کو معلوم ہے۔ غرض ان وجوہ سے چونکہ ان کی اس غلط روی کے اثرات بہت متعدی ہو سکتے ہیں (اور خود راقم کے علم میں ہے کہ ہو رہے ہیں) اس لئے دل کو سخت رنج و قلق ہے۔ اسی قلبی اذیت نے اشاعت گزشتہ میں وہ سطریں لکھادی تھیں، اور یہی تاثر آج بھی اس اظہار درد و کرب پر مجبور کر رہا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں تک کسی کے ذاتی فعل کا تعلق ہو سکتا ہے اس پر کسی کو ”واویلا“ کی کیا ضرورت، اس دنیا میں آج کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے اور ہم میں سے کتنوں کا دامن آثام و معاصی سے بالکل پاک صاف ہے، سو جہاں تک ان کے ذاتی فعل کا تعلق ہے اس کے متعلق تو بجز اس کے کچھ عرض کرنا نہیں کہ اللہ پاک اس کو اور اس کے علاوہ بھی ہماری ان کی ساری خطاؤں کو معاف فرمائے اور اپنی ناراضی کے سارے ہی موجبات سے بچنے کی ہم سب کو توفیق دے!

البتہ اس سلسلہ میں اپنے ایک بالکل غلط نظریہ کو وہ جو ایک مستقل اصول کے طور پر اب پیش کر رہے ہیں اور اپنے اخبار کی قریباً ہر اشاعت میں کسی نہ کسی پیرایہ سے وہ دوسروں کو بھی یہ باور کرانے کی مسلسل کوشش فرما رہے ہیں کہ ”شیطان شناسی“ کیلئے — یا ”شیطان شناسوں“ کیلئے اس قسم کے معاصی کا ارتکاب، ان کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات و تجربات سے خدمت دین میں کام لینے کے واسطے، اگر کیا جائے تو یہ کوئی مواخذہ کی چیز نہیں ہے بلکہ گویا دینی خدمت کی یہ بھی ایک راہ ہے۔

پاک مقاصد کے لئے ناپاک ذرائع سے کام لینے کی شریعت اسلامی نے ہم کو ہرگز تعلیم نہیں دی ہے اور نہ ہم کسی ایسی ”خدمت دینی“ کے مکلف ہیں جو کسی ”حرام اور فسق“ کے ارتکاب پر موقوف ہو، بلکہ اس کو خدمت دین شمار کرنا ہی انتہا درجہ کی غلط فہمی ہے۔ صدقہ و خیرات کس قدر محبوب عبادت ہے، لیکن اگر کوئی شخص ناجائز و ناپاک ذرائع سے روپیہ حاصل کر کے اس کو راہ خدا میں خرچ کرے تو نصوص ناطق ہیں کہ وہ اس کے منہ پر مار دیا جائے گا۔ اَللّٰهُ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا الطَّيِّبَ (حدیث) اللہ پاک ہے اور صرف پاک

اور ڈاکہ زنی کرے کہ ان طریقوں سے جو مال اس کو حاصل ہو

دین و خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ "میں صرف کرے گا، اور

سے وہ ایسا کرے بھی، تو کیا عند اللہ وہ کسی اجر کا مستحق ہوگا؟ یا تریت۔۔۔ کہ وہ اپنی اس ”نیک نیتی“ کی وجہ سے مواخذہ خداوندی ہی سے چھوٹ جائے گا؟ کم از کم میرے علم میں تو کوئی ایسا استثنائ نہیں ہے۔

مشرکین عرب کے متعلق قرآن مجید ہی کی گواہی ہے کہ وہ ”بت پرستی“ کے بارہ میں اپنی ”نیت“ اور اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے کہتے تھے۔

ہم تو اپنے ان دیوتاؤں کی پوجا بس اسلئے کر لیتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں۔

ما عبدُهم الا ليقربونا  
الى الله زُلْفَى -

گویا وہ بت پرستی بھی تقرب الی اللہ ہی کی نیت سے کرتے تھے، جس سے زیادہ پاک مقصد اور جس سے اچھی نیت یقیناً کوئی اور نہیں ہو سکتی لیکن، کیا ان کی یہ ”نیک نیتی“ اور صرف مقصد کی پاکی شرک کی سزا (خلود فی النار) سے ان کو بچالے گی؟ — میرا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ شرک اور سینما بنی ایک درجہ کی چیزیں ہیں بلکہ مقصد صرف اس اصول کا واضح کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص ”خدا طلبی اور ”تقرب الہی“ کی نیت سے بھی معصیت کا ارتکاب کرے (بالخصوص اس

کو معصیت اور حرام و فسق جانتے ہوئے) تو ”حسن نیت“ کی وجہ سے وہ مواخذہ سے چھوٹ نہ جائے گا۔ خصوصاً معاصی میں جو چیزیں (اصول فقہ کی اصطلاح میں) ”فحش لعینہ“ ہیں، اُن میں تو ”حسن نیت“ کا عذر نہ ہونا عقلاً بھی ظاہر بلکہ بدیہی ہے، اور معلوم ہے کہ فواحش تمام تر فحش بالذات ایسی ہیں اور سینما کے تماشوں میں جیسا کہ ”خود ان محترم“ ہی کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے، بجز فواحش کے اور کیا ہوتا ہے؟۔ بہر حال ”سینما جیسے مجموعہ فواحش و منکرات کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ”شیطان شناسی“ یا ”شیطانی ترقیوں سے واقفیت“ حاصل کرنے کے لئے، یا ”خدمت دین“ کے کسی شعبہ میں اس کے معلومات و تجربات سے کام لینے کے واسطے اس ”حرام و فسق“ کا ارتکاب اگر کبھی کبھی کر لیا جائے تو امید یہی ہے کہ اللہ مواخذہ نہ فرمائے گا۔“۔ میرے لئے اب بھی سخت موجب حیرت ہے، اور اس قسم کے محرمات و موجبات فسق کو ”خدمت دین“ کے کسی شعبہ میں کار آمد سمجھنا بھی بجائے خود عجیب تر، اور محض سطحیت نظر! ان اللہ لم يجعل شئكم فيما حرم عليكم، (اللہ نے تمہاری شفاء حرام چیزوں میں نہیں رکھی ہے) (۱)۔

واضح رہے کہ یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں وہ صرف ”کنز“ و ”ہدایہ“ جیسی کسی فقہی کتاب کے کسی ”جزئیہ“ ہی کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ یہ اصول شریعت کا کھلا تقاضا ہے۔ اس کو ”فقیہانہ“ یا ”مدرسانہ“ طرز فکر کا نتیجہ کہنا اور اس اختلاف رائے کو ”بے خبر فقیہ“ اور ”باخبر حکیم“ کے نقطہ نظر کا اختلاف قرار دینا، ”متحد دیں“ یا ”شریعت سے آزاد متصوفین“ کو تو زیبا ہو سکتا ہے لیکن اگر ”متشرعین“ بھی کسی وقت اسی قسم کی باتیں کرنے لگیں تو ”اپنی بد قسمتی“ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات اور آپ کا اسوہ حسنہ (جس کا مجموعی نام شریعت اسلامی ہے) اگر ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے قانونِ رضا و غضب کی مکمل اور غیر مشتبہ تشریح ہے اور جن چیزوں کو اُس نے ”معروف“ و ”موجب رضا قرار دیا ہے انہی پر اچھے اجر کی توقع کی جاسکتی ہے، اور جن چیزوں کو اُس میں منکر اور موجب سُخط و غضب الہی بتلایا گیا ہے تو اُن کا نتیجہ برائی نکلنے والا ہے، غرض اگر ہم شریعت محمدی کو اللہ تعالیٰ کی رضا و عدم رضا کی صحیح اور مکمل ترجمانی یقین کرتے ہیں، تو پھر کسی چیز کے متعلق یہ جانتے ہوئے کہ شرعیہ ”حرام و فسق“ ہے محض اپنے خیالات اور اپنی آرزوؤں کی بنیاد پر یہ اُمید قائم کر لینا کہ اگر اس ”نیک مقصد“ سے

(۱) علماء متفقین نے اس حدیث میں لفظ ”شفا“ کو وسیع معنی میں سمجھا ہے ۱۲۷۔

اس کا ارتکاب کر لیا جائے تو ہم سے مواخذہ نہ ہوگا، میرے خیال میں تو ایک قسم کا ”اتباع ہوئی“ ہے۔ اور اسی کا دوسرا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں ”امانی“ ہے۔

مثلاً آپ بلا وضو ”نماز“ پڑھتے ہیں، پھر اللہ کیلئے بھی نہیں بلکہ اللہ کی مخلوق کو دکھلانے کیلئے، اور دوسروں کو بھی تبلیغ کرتے ہیں کہ بھئی! نماز پڑھو، بے وضو ہی پڑھ لو، تاکہ ذرا ”یہ کافر لوگ“ دیکھیں تو اور ”شوکت اسلام“ سے متاثر تو ہوں (۱)۔

اب بیچاری کنز و ہدایہ ہی نہیں بلکہ (جہاں تک مجھے علم ہے) قرآن بھی اس ”نماز“ کو نماز نہیں تسلیم کرتا، اس پر کسی اجر کا وعدہ نہیں کرتا، بلکہ ”الدین ہم یراؤں“ کے صریح لفظوں میں ایسی ”نماز“ کی مذمت کرتا ہے، اور جا بجا صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ جو عبادت بھی خالص اللہ کی رضا کیلئے نہیں کی گئی وہ قبول نہیں کی جائے گی، بلکہ منہ پر مار دی جائے گی لیکن آپ کا ”دل“ چاہتا ہے ہماری ”یہ نماز“ ضرور قبول ہو بلکہ بہت سے اعمال مقبول رہے اور پھر آپ اپنی اس دلی خواہش کی بنیاد پر ایسا ہی عقیدہ

”ہدیٰ“ کا اتباع ہو گیا ”ہوئی“ کا اور آپ کی اس خوش فہمی اور

محکم وعدہ پر ہو گی یا محض ”امانی“ پر؟

قرآن مجید نے تو اس طریق کار اور اس طرح من مانی

قوت اور شدت سے تردید کی ہے، جن آیات میں ”عبر علم“ ”عبر ہدیٰ“ ”عبر سلطان“ ”عبر اذن رب“ دینی معاملات میں خیالات قائم کرنے کی مذمت فرمائی گئی ہے کیا ان میں غورو تدبر کے بعد اس باب میں کچھ شبہ رہتا ہے؟

اس سلسلہ میں عام محکمات شریعت کے مقابلہ میں عارف رومی کی چرواہے والی حکایت سے استناد اور بھی حیرت انگیز ہے، اگر مثنوی کی حکایات کی روایتی حیثیت کچھ قابل اعتنا (۲) ہوتی تو قواعد شریعہ کے مطابق اس حکایت ہی کی ”توجیہ“ کی جاتی، نہ کہ اُن کے مقابلہ میں اُسی کو مسائل کے استنباط کیلئے اساس بنایا جاتا۔

ہمارے ”اُن محترم“ پر یہ حقیقت تو مخفی نہ ہوگی کہ اگر بالفرض (کفرض الحال) اس قسم

(۱) یہ کوئی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک فرضی مثال ہے، ہاں اس سے کچھ ملنے جلتے ایک واقعہ کا ذکر غالباً اسی سینما بنی کے قضیہ پر روشنی ڈالنے کیلئے بعض حضرات نے فرمایا ہے، تو اس مثال سے اگرچہ اُس واقعہ پر بھی کچھ روشنی پڑ سکتی ہو (اور یہ مقصود بھی ہے) لیکن بہر حال اس کی حیدہ وہی واقعہ نہ سمجھا جائے۔ اُس میں اور فرضی مثال میں کچھ فرق ہے ۱۲۔

(۲) اہل علم کو معلوم ہو گا کہ ”مثنوی رومی“ میں بہت سی حکایات ”مکملہ ددمنہ“ کے قبیل کی ہیں۔ ۱۲۔

کا کوئی واقعہ قرآن مجید میں بھی بیان ہوتا تو اس کا شمار ”مشاہدات“ میں ہوتا اور اُس کا اتباع اور اس سے استناد کرنے والے اللہ کے فیصلہ کے بموجب ”الذین فی قلوبہم ریح“ کے مصداق ہوتے، چہ جائیکہ وہ نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں نہ ”روایات و آثار“ کی کسی کتاب میں!

اس سلسلہ میں میرے ایک مخدوم اور نہایت محترم بزرگ کے ”حکیمانہ طریق اصلاح و ارشاد کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، اگرچہ اس قسم کے مسائل میں میں اس طرز عمل کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا، اور میرا عقیدہ ہے کہ جس فعل کا غلط اور ”حرام و فسق ہونا ہمکو شریعت سے معلوم ہو، اگر اپنی کسی ”خوش فہمی“ کی وجہ سے ہم اس کے مرتکب ہو جائیں تو آخرت میں اپنے کسی بزرگ کے طرز عمل کا حوالہ دے کر اللہ کی گرفت سے ہم چھوٹ نہیں سکیں گے، (بلکہ ان بزرگوں ہی کی تعلیم و صحبت کی برکت سے بفضلہ تعالیٰ یہ ناچیز اتنی جرأت بھی اپنے اندر پاتا ہے کہ اگر خود اُن بزرگوں سے بھی کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جس سے دوسروں کے بھی گمراہ ہونیکا اندیشہ ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ انکے واجبی ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے انکو اسی طرح ٹوک دوں گا۔ بہر حال اگرچہ یہ طریقہ خود میرے نزدیک صحیح نہیں ہے لیکن اگر ہمارے وہ ”محترم“ اس پر مطمئن ہیں تو میں عرض کرتا ہوں کہ پھر دور از کار اور موضوع سے غیر متعلق اشارات سے کام لینے کی کیا ضرورت، بحمد اللہ وہ بزرگ (حضرت تھانوی مدظلہ) اس دنیا میں موجود ہیں، پوری چیز اور اصل معاملہ بخشنہ اُن کی خدمت میں پیش کر کے استصواب کیا جاسکتا ہے، اور اگر اس میں کچھ زحمت ہو تو پھر حضرت مولانا مدظلہ ہی کی ایک تحریر جو مسئلہ زیر بحث پر ہو بہو منطبق ہے یہ عاجز پیش کرتا ہے۔

آج سے پانچ سال پہلے ۱۳۵ھ میں خود راقم سطور نے حضرت مولانا مدظلہ سے چند سوالات کئے تھے، حضرت مولانا نے ان کا جواب کسی قدر تفصیل سے ارقام فرمایا تھا، جو اسی زمانہ میں رسالہ ”النور“ تھانہ بھون میں غالباً ”شق العین“ کے عنوان سے شائع بھی ہو گیا تھا۔ اسکی چند سطریں یہ ہیں جو میں اصل مکتوب گرامی سے نقل کر رہا ہوں۔

”معصیت ہر حال میں معصیت ہے، تحسین نیت سے مباح یا طاعت نہیں ہو جاتی، آیات و روایات مرقومہ بالا کا اطلاق اس کی کافی دلیل ہے۔ مگر اس کی توجہ کیلئے حضرت مولانا گنگوہی کی ایک ارشاد فرمودہ مثال یاد آگئی کہ اگر کوئی شخص ناچ رنگ کی محفل اس نیت سے منعقد کرے کہ نمازی اذان سن کر تو آتے نہیں ناچ دیکھنے کیلئے جمع ہو جائینگے، پھر سب کو مجبور

کر کے نماز پڑھو اور نگاہ، تو کیا کوئی شخص اس نیت سے ناج کرانے کو جائز کہہ سکتا ہے، بلکہ معصیت میں طاعت کی نیت قواعد شرعیہ کی رو سے زیادہ خطرناک ہے جیسے حرام چیز پر بسم اللہ کہنے کو فقہاء نے قریب بکفر کہا ہے۔ ”انتہی بلفظہ“

پس اگر حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کی تصریح ہی ”ان محترم کو مطمئن کر سکتی ہے تو لیجئے وہ بھی حاضر ہے ورنہ خود میرا اس باب میں جو مسلک ہے وہ میں عرض کر چکا ہوں وہ ادب اللہ یوم يقوم الناس لرب العلمین۔

آخر میں پھر گزارش ہے کہ چونکہ ”وہ محترم اپنی ایک افسوسناک اور خطرناک غلط فہمی کو اب ایک مستقل اصول کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور اپنے اخبار کے ذریعہ دوسروں کو بھی اسکی صحت باور کرانے کی مسلسل اور طرح طرح سے کوشش فرما رہے ہیں اور انکی بزرگی کی وجہ سے لوگ اس سے متاثر بھی ہو رہے ہیں اور میں دیانت داری کے

ہوں اس لئے خاموشی کو جرم سمجھ کر بادل ناخواستہ آج بھی یہ چند ہے کہ کس احساس کے ساتھ لکھی ہیں۔ میں نے ان سطور میں ص ہے جو میرے نزدیک کسی کیلئے غلط فہمی کا موجب ہو سکتی تھیں، باقی اور لطیفوں سے تعرض کر تیلی میں نے ضرورت نہیں سمجھی کہ شرعی مباحثہ ی چیزیں لایعنا نہ ہیں۔

With Best Compliments From

Ph. 227393

**Burma Biscuit Co.**Astabal Charbagh, Moulviqanj,  
Lucknow**NEEDO**Aminabad, Lucknow  
Ph. : 224381**OLYMPIA**HAZRATGANJ, Lucknow  
Ph. : 228549



## حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دعوت

[ ۱۳۶۳ھ میں الفرقان کا ایک خاص نمبر ”حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت“ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے شائع ہوا تھا۔ اس کے پیش لفظ مرتومہ حضرت بائی الفرقان کا ایک حصہ ————— مرتب ]

مولانا کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ارشادات تفصیل سے سننے کا موقع ملا، تو قلب و دماغ پر دواثر ہوئے۔

ایک تو یہ کہ مولانا کی دعوت بڑی عمیق اور اصولی دعوت ہے جو محض غلبہٴ حال کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص اعانت و توفیق کے ساتھ، اصول دین میں بہت گہرے غور و تدبر، قرآن و حدیث کے عمیق مطالعہ و تفکر، دین کے مزاج و طبیعت سے واقفیت اور صحابہ کرام اور قرن اول کے طرز زندگی کے وسیع اور گہرے علم پر مبنی ہے، اور وہ چند منتشر اور غیر مربوط اجزا کا نام نہیں ہے، بلکہ مولانا کے ذہن میں اس کا ایک مرتب خاکہ ہے۔ البتہ اس کے لئے ان کے نزدیک ترتیب و تدریج بہت ضروری ہے، اس حقیقت کے اعتراف کے بعد قلب میں شدت کے ساتھ اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ یہ چیزیں کاغذ پر بھی مرتب شکل میں آجائیں، اور اس دعوت کے اصول و مبادی اور طریق کار اور اس دعوت کی ذہنی اساس اور اس کی دینی بنیاد اہل علم کے لئے اس زمانہ کی زبان اور علمی پیرایہ بیان میں سامنے آجائے۔

رجب ۱۲۳۷ھ میں مولانا لکھنؤ تشریف لے گئے اور خاکسار راقم کو بھی آپ کی معیت میں کئی روز رہنے کی سعادت اور کبھی کبھی ترجمانی کی عزت بھی حاصل ہوئی، ہمارے دوست مؤلف کتاب نے ایک مجلس میں مولانا کی ترجمانی کا فرض ادا کیا، اس تقریر کے بعد خاکسار نے بہ اصرار ان سے کہا کہ آپ تمام کام چھوڑ کر اس تقریر کو قلمبند کر لیں، یا اس کو تحریری شکل میں اس مرتب کریں، یہ آپ پر سب سے بڑا حق اور بڑی ذمہ داری ہے، اور آپ سے اس۔

متعلق باز پرس ہوگی، مولانا نے بھی میری فرمائش کی تائید کی، اور غالباً اسی سے متاثر ہو کر مولف کتاب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب نے وہ رسالہ مرتب کیا جو ”ایک اہم دینی دعوت یا مسلمانوں کی عمومی تعلیم و تربیت کا نظام“ کے نام سے ادارہ الفرقان سے شائع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد راقم الحروف نے مولانا کی علالت کے زمانہ میں ”نصرت دین و اصلاح مسلمین کی ایک کوشش“ کے عنوان سے ایک مقالہ مرتب کیا اور اس میں اس دعوت کی ترجمانی و نمائندگی کی کوشش کی، اس طرح جہاں تک دعوت کے اصول و اساس کا تعلق ہے، اگرچہ کوئی تحریر کسی انسان کی قائم مقام نہیں ہو سکتی، مگر اس سلسلہ میں دل پر اب اتنا بوجھ نہیں رہا، اور کسی حد تک اس کا اطمینان ہو گیا ہے، کہ دل و دماغ کی امانت کاغذ کے سپرد کر دی گئی ہے اور اگرچہ کاغذ بہت ضعیف ہے مگر اس کے امین ہونے میں شک نہیں۔

قلب پر دوسرا اثر مولانا کی شخصیت کا تھا۔ ہماری آمد و رفت، ذاتی واقفیت جتنی بڑھتی گئی، مولانا کی شخصیت کا اثر بھی ہمارے

دوسرے صاحب بصیرت احباب اس بارے میں ہم خیال و یک شخصیت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی اور رسول اللہ ﷺ

مؤثر اور زندہ جاوید ہونے کے ثبوت کے طور پر اور صحابہ کرام جنوں و بے قراری اور اس دور کی خصوصیات کا ایک اندازہ کرنے کے لئے اس زمانہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ غیر معمولی اور نادر چیزیں دیکھتا ہے، تو چاہتا ہے کہ اس کے دوست احباب بھی دیکھیں، اس سے سن کر تصدیق کریں، دوسرے ملکوں کے سفر نامے اسی جذبے کے ماتحت لکھے گئے، طبعی طور پر ہمارا بھی جی چاہتا تھا کہ ہمارے احباب اور معاصر اس ہستی کو دیکھیں، جو قرون اولیٰ کے خزانہ عامرہ کا ایک بچا کھچا موتی ہے، لیکن کسی کو کسی پر اختیار نہیں، بہت سے احباب جو بہ آسانی پہنچ سکتے تھے اور جن کی نظر دور رس اور حقیقت شناس تھی اور جو اپنی مناسبت اور صلاحیتوں کی بنا پر مولانا کے موردِ لطف ہو سکتے تھے، وہ اپنے مشاغل کی بنا پر یا کسی دوسری وجہ سے انکی زندگی میں نہ آ سکے، یا ان کو انکی شخصیت کے مطالعہ اور انکی زبان سے انکی دعوت کے سننے کا کافی موقع نہ مل سکا۔

ہم آپس میں اکثر تذکرہ کرتے تھے کہ اگر ہم مولانا کے حالات کسی کے سامنے بیان کریں تو وہ مبالغہ پر محمول کرے گا، اور دیکھنے والا ہمارے بیان کی تقصیر اور کوتاہی سمجھے گا، الفاظ کی

کوئی بڑی سے بڑی مقدار ذاتی مطالعہ اور عینی مشاہدہ کے قائم مقام نہیں ہو سکتی، الفاظ یا تو آگے بڑھ جاتے ہیں یا پیچھے رہ جاتے ہیں، کاغذی لباس جو بھی تیار کیا جائے گا وہ جسم پر پورے طور پر راست نہیں آئے گا، یا ڈھیلا رہے گا یا تنگ۔ اگر کوئی چیز کسی کا کچھ صحیح تصور قائم کر سکتی ہے اور اس کو کسی حد تک اس کی صحیح شکل میں پیش کر سکتی ہے تو وہ صرف واقعات یا اس کی اپنی تحریریں (خصوصاً خطوط) اور اس کی روزمرہ کی بے تکلف گفتگو ہے۔

مولانا کے ساتھ رہنے اور ان کو قریب سے دیکھنے سے ہم پر ایک اہم علمی نکتہ منکشف ہوا کہ بزرگانِ دین اور اکابرِ سلف کے جو حالات کتابوں میں جمع کئے گئے ہیں ان میں خواہ کتنے ہی استقصا سے کام لیا گیا ہو وہ ان کی شخصیت اور ان کے اصلی کمالات سے کوئی نسبت نہیں رکھے، اور واقعات کا بھی وہ بہت تھوڑا سا حصہ ہوتے ہیں جن میں مؤلف و سوانح نگار کی نظر انتخاب اور اس کے ذوق کو بڑا دخل ہوتا ہے اور بعض مرتبہ تو جس شخص کی وہ سیرت ہوتی ہے اس سے زائد خود سوانح نگار کی اپنی سوانح اور اس کا ذہنی مرتبہ ہوتی ہے، پھر کیفیات و جذبات اور بیسیوں ادائیں ہیں قلم سے جنکی تصویر کشی محال ہے۔ شاعر نے سچ کہا ہے۔

اگر مصور صورتے آں دلستاں خواہد کشید

حیرتے دارم کہ نازش را چناں خواہد کشید

اور غریب سوانح نگار کرے بھی کیا، بہت سی کیفیات و حقائق کے لئے۔ شاعری کی لطیف اور وسیع زبان میں بھی لفظ نہیں

بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

☆☆☆

## احیاء دین کی دعوت اور سیاست

[ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ کے الفرقان میں پاکستان کے ایک نو عمر عالم دین کے ایک ایسے خط کا جواب شائع کیا گیا تھا جس میں تبلیغی جماعت کے کام کے بارے میں اپنے کچھ خیالات پیش کر کے بعض باتوں کی وضاحت چاہی گئی تھی۔ اس جواب کا ایک نکتہ (۷) یہاں پیش ہے مرتب]

(۷)

حکومت میں اصلاحی انقلاب یعنی دینی تقاضوں کے مطابق تبلیغی جماعت کے جدوجہد نہ کرنے کا بھی آپ نے ذکر فرمایا ہے۔ کام میں یہ بڑا خلا ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ایک حکومت کی اصلاح ہی کا معاملہ کیا اس سے علاوہ بہت سے بہت اچھے اور بعض پہلوؤں سے بہت اہم اور بہت ضروری کام ایسے ہیں جن کے لئے تبلیغی جماعت بظاہر کچھ نہیں کر رہی ہے۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کی اہمیت میں کون شک کر سکتا ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ تبلیغی جماعت اس کے لئے بھی بظاہر کچھ نہیں کر رہی ہے۔ نہ تعلیم کے نظام و نصاب کی اصلاح کے لئے کوئی کوشش ہے نہ مکاتب و مدارس قائم کرنے کی کوئی جدوجہد ہے۔ نہ مساجد میں درس قرآن جاری کرنے کی دعوت ہے۔ نہ وقت کے تقاضے کے مطابق دینی لٹریچر تیار کرنے کا کام کیا جا رہا ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اگر آپ سوچیں تو ان کے علاوہ بھی بہت سے کام آپ کو نظر آئیں گے جو بڑے اچھے ہیں اور بعض پہلوؤں سے بہت ضروری ہیں لیکن تبلیغی جماعت ان کے لئے کچھ نہیں کر رہی ہے۔ اب آپ خود ہی ذرا غور فرمائیں کہ آپ نے سیاست و حکومت والی خلا ہی کو کیوں زیادہ محسوس کیا؟

اصل بات یہ کہ مادیات کے غلبہ اور بعض خاص عصری حالات نے بھی سیاست و حکومت کے مسئلہ کو اتنا اہم بنا دیا ہے اور اس کی اہمیت و اقدامیت کا اتنا مبالغہ آمیز پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ عام طور سے یہی سمجھا جانے لگا کہ دین و دنیا کا اصلی اور بنیادی مسئلہ بس حکومت ہی

کا ہے، اور اگر کوئی آدمی حکومت کے اول بدل کے لئے کچھ نہیں کر رہا ہے، اور اس مقصد کے لئے شور بھی نہیں مچا رہا ہے تو گویا وہ کچھ کر ہی نہیں رہا ہے — میرا خیال ہے کہ غیر شعوری طور پر آپ بھی اس وقتی مشاغبہ سے متاثر ہیں۔

لیکن جن بندگان خدا کو اس حقیقت کا یقین نصیب ہو کہ جب تک قلوب میں وسیع پیمانہ پر ایمان و یقین اور فکرِ آخرت پیدا نہ ہو، اور جب تک مسلمانوں کی زندگی میں اسلام غالب نہ ہو، خاص کر عوامیت اور جمہوریت کے اس دور میں حکومت میں کسی صالح انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ان کا طرزِ عمل اس معاملہ میں قدرتی طور پر وہی ہونا چاہئے جو آپ تبلیغی جماعت والوں کا دیکھ رہے ہیں۔

ایک زمانے میں اس مسئلہ میں میرا حال بھی قریب قریب وہی تھا جو اس وقت غالباً آپ کا ہے۔ لیکن اب تو گویا کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی زندگی میں اور ان کے ظاہر و باطن میں بڑی تبدیلی کے بغیر صالح حکومت اور خلافتِ علیٰ مسہاح السبوة کے لئے براہِ راست کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی سوکھے بے جان درخت سے پھل نکالنے کی براہِ راست لا حاصل سعی کرنا، مجھے تو قرآن و احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اور غور و فکر کا فیصلہ بھی یہی ہے، اور یہی تاریخ کی شہادت ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی سمجھنی ضروری ہے کہ متذکرہ بالا احوال و اسباب کی وجہ سے سیاست کے اکھاڑوں اور حکومت سے متعلق آویزشوں سے کسی فرد یا جماعت کے یکسو رہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کو صالح حکومت کے قیام سے دلچسپی نہیں ہے، اور اس کے نزدیک حکومتِ کافرہ حکومتِ فاسقہ اور حکومتِ صالحہ عادلہ سب یکساں ہیں — یہ خیال اور حال کسی کافر کا ہی ہو سکتا ہے، بلکہ جیسا کہ عرض کیا ایک صاحب بصیرت مؤمن کسی وقت یہ فیصلہ اس لئے بھی کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اس وقت کے حالات کا دینی اقتضا یہی ہوتا ہے اور انجام کے لحاظ سے وہ اسی کو اولیٰ و اصل سمجھتا ہے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے چھوٹے بھائی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو جو چند اصولی وصیتیں کی تھیں شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو کہ ان میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ ہم کو اب دین کی خدمت سیاست و حکومت کے راستے کے بجائے دعوت کے راستے سے کرنا چاہئے۔ (۱)

(۱) مجھے وصیت کا یہ حاصل اور غلامِ یاد رہ گیا ہے۔ اصل الفاظ وصیت کے یاد نہیں ہیں، اور نہ اس وقت کتاب کا نام ہی یاد ہے۔

میرے نزدیک تو یہ بات از روئے دین بالکل بدیہی سی ہے کہ اصل چیز ایمان اور عبدیت والی زندگی اور اس کے لئے جدوجہد ہے — اور دین میں کسی حکومت کے خلاف ”جہاد“ کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ایمان اور عبدیت کے لئے کام کاراستہ آسان ہو جائے، اور دشمن دین یا بے دین حکمرانوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات اور رکاوٹیں دور ہو جائیں۔

پس اگر کسی فرد یا جماعت کی ایمانی بصیرت کا فیصلہ کسی وقت یہ ہو کہ سیاست کے راستہ سے اس وقت ہمارے مقصد کے لئے کامیابی کے امکانات نہیں ہیں، اور اگر ہم سیاست و حکومت کے اکھاڑے میں اتر کر زور آزمائی کریں گے تو بس اسی میں کھوکھو کے رہ جائیں گے، اور ایمان اور عبدیت والی زندگی کے لئے جو کچھ اس وقت دعوتی جدوجہد کی راہ سے کر سکتے ہیں وہ بھی نہ کر سکیں گے۔ تو اس عاجز کے نزدیک گویا یہ دین کے بدیہات میں سے ہے کہ اس صورت میں اس کا فیصلہ سیاست سے الگ رہ کر ہی اپنا کام کرتے رہنے کا ہونا چاہئے۔

اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی سمجھنے اور ملحوظ رکھنا

متعلق یہ فیصلہ کریں کہ ہمیں تو انشاء اللہ مرتے دم تک

دعوتی جدوجہد ہی کے کام میں لگا رہنا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ

ایمان اور عبدیت والی زندگی امت میں وسیع پیمانے پر پیدا

سنت اور اپنے وعدے کے مطابق اس امت کے صالح طبقہ کی طرف صوری اقتدار س بسی نہ تب بھی ہم حکومت میں حصہ نہ لیں گے بلکہ ایمان اور عبدیت کے لئے دعوتی جدوجہد جو اس وقت کر رہے ہیں بس یہی انشاء اللہ کرتے رہیں گے اور خدا نے توفیق دی تو اسی کو کرتے کرتے مریں گے — تو میں نہیں سمجھتا کہ دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی بندہ ان کے اس فیصلہ کو غلط اور ناپسندیدہ کہہ سکے۔

آپ نے اپنے خط میں تبلیغی کام کرنے والے بعض حضرات کا ایک فقرہ جو نقل کیا: اس کا مطلب یہی ہے لیکن چونکہ اس زمانہ میں یہ تحریک اور یہ نقطہ نظر نایاب ہے اس لئے بہت سے لوگوں کو اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، اور کبھی کہنے والے کی تعبیر کا قصور بھی غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔

## مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی بعض اہم تصانیف

تذکرہ

مجدد الف ثانی

ملفوظات

حضرت مولانا محمد الیاسؒ

جن لوگوں نے حضرتؒ کو نہیں دیکھا وہ ان ملفوظات کے مطالعہ سے آپ کو پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ملفوظات دین کے حقائق و معارف کا عجیب و غریب سمجھینہ ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا۔

قیمت اردو ایڈیشن - 25/- ہندی - 25/-

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی مکمل سوانح حیات، آپ کے عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم کارنامہ کی تفصیل جس کے نتیجہ میں اکبر اور اسکے حواریوں کا چلایا ہوا "دین الہی" تاریخی قصہ ہو کر رہ گیا۔

قیمت - 70/-

منتخب تقریریں

آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ قرآن و حدیث کی سودائیں

مولانا نعمانیؒ کی ایمان افروز اور آپ کی منزل کیا ہے؟ مولانا نعمانیؒ کی مرتب کردہ اصلاحی و تبلیغی تقریروں کا مجموعہ جو اپنے اندر افادیت کے ہزاروں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

قیمت - 36/-

قیمت - 6/-

قیمت - 5/-

میری طالب علمی

شیخ محمد ابو عبد الوہاب

تصوف کیا ہے؟

مولانا موصوف نے اس کتاب میں اپنی تعلیمی زندگی کے مختصر حالات بیان کئے ہیں۔

قیمت - 3/-

قیمت - 20/-

قیمت - 20/-

الفرقان بکاپو 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ - 18

## یہ شوق جنت اور خوف دوزخ سے محرومی!

[تبلیغی دعوت کے سلسلہ کی ایک تقریر سے اقتباس]

اس موقع پر بے اختیار اپنے دل کا ایک احساس ظاہر کر دینے کو مجبورا  
یقینی اور اصلی ایمان سے ہمارے دلوں کی محرومی اب اس حد  
اور جنت کے وعدہ میں اب ہمارے لئے کوئی کشش نہیں رہی  
چھوٹے سے چھوٹا کام ہونا بھی مشکل ہے حالانکہ اگر دلوں  
مست و بے خود ہو جانا چاہئے، جنت وہ چیز ہے جس کے شوق  
لاکھوں ایمان والے بندوں نے جانیں قربان کی ہیں اور اپنا سب کچھ منادیا ہے اور بے شک جنت  
ایسی ہی چیز ہے، قرآن و حدیث میں جنت کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس پر سچا ایمان اور  
یقین ہو تو پھر اسکے مقابلہ میں ہمارے سارے شوق سرد پڑ جائیں، صحابہ کرامؓ کو دوزخ اور جنت کا  
ایسا یقین ہو گیا تھا کہ دوزخ کی تکلیفوں اور ذلتوں کے مقابلہ میں دنیا کی کسی تکلیف اور ذلت کی ان  
کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رہی تھی، اور جنت کے شوق اور عشق میں زندگی کے سارے شوق  
کو فنا کر دیا تھا اور ہمارا حال یہ ہے کہ دوزخ اور جنت کے ذکر سے اب ہمارے قلوب میں نہ کوئی  
خوف پیدا ہوتا ہے نہ شوق۔

بزرگوں اور دوستوں! ہمارے دلوں کا یہ تغیر کوئی معمولی تغیر نہیں ہے، دوزخ کا خوف  
اور جنت کا شوق ہی دین کی وہ قوت محرکہ تھی جس نے مٹھی بھر مسلمانوں کے ذریعے دنیا کو زیر و زبر  
کر ڈالا تھا، آج اسی چیز سے خاکی ہو کر ہم خس و خاشاک سے زیادہ بے وزن اور بے وقعت ہیں۔  
جنت اور دوزخ سے بے فکری کی یہ سزا تو ہم و دنیا میں ملی ہے اور آخرت میں جو کچھ سامنے  
آیو والا ہے بس اللہ ہی اسکو جانتا ہے۔ اَلْهَمَّ اَحْفَظْنا و نعوذ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا و مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا



جنت اور دوزخ سے ہماری ب فماری اور ب تعلقی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارے خالص مذہبی جلسوں میں اور دینی و عطلوں میں بھی اب جنت اور دوزخ کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگ شاید اس کے کر سے شرماتے ہیں اور اس کے ذکر کو قیانوسیت اور ملانیت سمجھتے ہیں، حالانکہ قرآن پاک میں جنت اور دوزخ کا جتنا ذکر ہے اتنا کسی چیز کا بھی نہیں ہے حتیٰ کہ میں پورے، شوق سے کہتا ہوں کہ توحید، رسالت کا بھی نہیں ہے۔

آج کل کچھ فیشن ماہو کیا ہے کہ دین کی دعوت بھی صرف دنیوی نتائج اور مصالح کی بنیاد پر دی جاتی ہے، اور اس طر ز پر دی جاتی ہے جس طر ح دنیا کے دوسرے فلسفوں اور نظاموں کی، عوتیں دی جاتی ہیں یہ طر یقہ مفکر، مل اور فلسفیوں اور خدا اور آخرت سے غافل دنیا پرستوں کا ہوتا ہے، انبیاء علیہ السلام کا طر یقہ یہ ہے کہ آخرت کی فکر اور اس کا یقین پیدا کر کے اسی کی بنیاد پر دین کی دعوت دیتے ہیں۔

(القرقان ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ)

ﷺ

# A.H. Traders

No. : 121, Aminabad, Lucknow

VIP Suitcase, Briefcases, Safari Suit Case,  
Brief Case Canvas Holdalls, Super Quality  
School Bags & Air Bags

## A.M. Traders

Straw Board, Mill Board, School bags  
& Sport Goods

No 9, Dr B N Verma Road, Karim Market, Lucknow

# ختم نبوت کی حقیقت

اور

## حفاظت دین کے سلسلہ میں ہمارے بزرگوں کا موقف

[۲۹۷/۳۱۳۰ راکتوبر کو دارالعلوم دیوبند میں منعقد ہونے والے اجلاس تحفظ ختم نبوت کی پہلی نشست کی صدارت فرماتے ہوئے گفتگو فرمائی، جس کا کچھ حصہ تحریر کی شکل میں تھا اور کچھ ربانی خطاب کی شکل میں الفرقان بابت ماہ نومبر ۱۹۸۶ء میں یہ شائع ہوئی تھی۔ مرتب ]

حضرات کرام آپ میرا حال دیکھ رہے ہیں، بیماری آپ کے سامنے ہے۔ اس حال میں اپنی حاضری اور آپ حصہ تعالیٰ کی توفیق خاص کا کرشمہ اور اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے ”ختم نبوت“ کی نسبت کی قوت کشش کا ایک ثمرہ۔

زندگی بھر کتاب و قلم سے واسطہ رہنے کے باوجود نہ علم آیا اور نہ سم، اور اب نو آئے ہوئے علم کے بھی جانے کا زمانہ ہے۔ رات ہی مجھے معلوم ہوا کہ اسی حال میں اتنے اہل علم حضرات کے سامنے اس اجلاس کی اس پہلی نشست میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے تو کوشش کی کہ چند مختصر اشارات قلمبند کرا دوں۔

محترم حضرات! نبوت و رسالت، انسان کی سب سے اہم بنیادی اور فطری ضرورت اور راہ سعادت کی طرف اس کی رہنمائی کی تکمیل کا خدائی انتظام ہے۔ جو ابتدائے آفرینش سے چھٹی صدی عیسوی تک تو اس طرح جاری رہا کہ قوموں، علاقوں اور مختلف بنیادوں پر قائم ہونے والے انسانی مجموعوں معاشروں کیلئے الگ الگ انبیاء و رسل کی بعثت مختلف زمانوں میں ہوتی رہی، پھر چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ انسانیت بلوغ کو پہنچ گئی، اور حکمت الہی کے نظر نہ آنے والے مسلسل عمل کے نتیجے میں دنیا کے جغرافیائی، تمدنی، مواصلاتی اور ذہنی احوال اس طرح کے ہو گئے کہ پوری دنیا کو ایک رہنمائی کا مخاطب بنانا، اسے ایک ہی مرکز ہدایت سے وابستہ کرنا ممکن ہو گیا اور قیامت تک کیلئے دین اور دین کے سرچشموں کتاب و سنت کی حفاظت کے اسباب پیدا ہو گئے

تب سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو اس مبارک سلسلہ کا خاتمہ اور عالمین کیلئے رحمت بنا کر مبعوث فرمادیا گیا، اور گویا یہ طے کر دیا گیا کہ قیامت تک کے آنے والے زمانہ اور پورے کرۂ ارض میں بسنے والے انسانوں میں سے کسی ایک فرد پر اب ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آئیگا جو نبوت اور اسکے فیضانِ ہدایت سے خالی ہو اس پہلو پر غور فرمایا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ختم نبوت اس نعمتِ عظمیٰ کے انقطاع اور اسکے فیض سے محرومی نہیں بلکہ اسکے دوام و تسلسل کا نام ہے۔

ختم نبوت کا ایک اور پہلو اس لائقِ ہیکہ اسے اچھی طرح سمجھ کر عام کیا جائے، وہ یہ ہے کہ گزشتہ امتوں کیلئے نئے نبی کی آمد ایک شدید آزمائش ہو ا کرتی تھی۔ آنے والے نبی سے پہلے نبیوں کے ماننے والوں میں سے بہت کم لوگ اس کو قبول کرتے اور اس پر ایمان لاتے تھے بڑی تعداد انکار و تکذیب کا اور کفر کا راستہ اختیار کر کے لعنتی اور جہنمی ہو جاتی تھی۔ سب سے آخری دو عظیم الشان رسولوں ہی کی مثال سامنے رکھ لیجئے۔ اسرائیلی سلسلہ کے آخری رسول حضرت عیسیٰ جب تشریف لائے اور احیاء موتی جیسے معجزے لے کر تشریف لائے تو یہودیوں میں سے کتنے ان پر ایمان لائے اور کتنوں نے انکو جھوٹا مدعی نبوت قرار دے کر لعنتی اور واجب القتل قرار دیا اور انکی شرعی عدالت نے انکو سولی کے ذریعہ سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا۔ اور اس طرح حضرت عیسیٰ کی نبوت کو نہ مان کر اس وقت کی قریب قریب پوری یہودی امت لعنتی اور جہنمی ہو گئی۔

اسی طرح جب انکے بعد سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اگرچہ آپ کے بارے میں واضح پیشین گوئیاں تورات و انجیل وغیرہ اگلی کتابوں میں موجود تھیں اسکے باوجود اگلے پیغمبروں اور ان اگلی کتابوں کے ماننے والے یہود نصاریٰ میں سے بس چند ہی نے آپ کو قبول کیا اور آپ پر ایمان لائے باقی سب انکار و تکذیب اور کفر کا راستہ اختیار کر کے دنیا میں اللہ کی لعنت اور آخرت میں جہنم کے ابدی عذاب کے مستحق ہوئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم فرما کر اس امت محمدیہ پر عظیم رحمت فرمائی کہ اسکو اس سخت ترین امتحان اور آزمائش سے محفوظ فرمادیا۔ اگر بالفرض نبوت کا سلسلہ جاری رہتا تو یقیناً وہی صورت ہوتی جو پہلے ہمیشہ ہوتی رہی تھی، یعنی حضور ﷺ کی امت کے بہت تھوڑے لوگ آنے والے نبی کو قبول کرتے اور زیادہ تر آپ کے امتی اس کا انکار کر کے (معاذ اللہ) کافر اور لعنتی ہو جاتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ حضور ﷺ پر ختم فرما کر اس امت کو ہمیشہ کیلئے کفر اور لعنت کے اس خطرہ سے محفوظ فرمادیا اس لئے یہ ختم نبوت امت محمدیہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین رحمت ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذمہ پیغام الہی کی تبلیغ، اور اسکو قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کے کام کے علاوہ ایک کام یہ بھی تھا کہ ایک ایسی امت تیار کر دیں جو ان تینوں کاموں کو سنبھال لے، حضرت شاہ ولی اللہ نے اس حقیقت کی تعبیر یہ کہہ کر فرمائی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت ”بعثت مزدوجہ“ تھی یعنی آپ کی بعثت کے ساتھ آپ کی امت کی بھی بعثت ہوئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں اس طرف اشارے بھی آئے ہیں کہ آپ کے بعد اللہ تعالیٰ آپ کی امت میں وقتاً فوقتاً ایسے بندے پیدا فرماتا رہیگا جو آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت و اشاعت اور اسکی صفائی و آبیاری کی خدمت انجام دیتے رہیں گے، آپ کے ایک ارشاد کے الفاظ ہیں

إِنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں ”يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ عَنِ كُلِّ

الْعَالِيں وَاتِّحَالِ الْمُسْطَلِبِ وَتَاوِيلِ الْجَاهِلِيں

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں ”لِكُلِّ قَرْنٍ سَابِقٌ“

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں : نَدَا لَا سَلَامَ عَرَبِيًّا وَسَيَعُودُ عَرَبِيًّا سِرِّ

يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، قَالَ الدِّينُ يَصْلَحُونَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ أَمْتِي“

رسول اللہ ﷺ کے ان سب ارشادات کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں آپ کی امت میں ایسے افراد پیدا فرماتا رہیگا جو آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت و اشاعت اور تجدید و صفائی کا کام کرتے رہیں گے۔

گزشتہ چودہ سو سال میں دین کی جو خدمات ہوئی ہیں وہ دراصل انہی ارشادات نبوی کی عملی تطبیق ہیں محققین کا خیال ہے کہ ہزارہ دوم کے آغاز سے اس عظیم کام کا خصوصی مرکز حکمت الہی نے سر زمین ہند کو بنادیا۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سے یہاں اس زریں سلسلہ کا آغاز ہوا، ان سے اللہ تعالیٰ نے جو بہت بڑے بڑے کام لئے ان میں اکبر کے دین الہی کا خاتمہ سر فہرست ہے، جو ایسا فنا ہوا کہ اب تلاش کرنے سے اس کا ذکر صرف تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اسکے علاوہ توحید و سنت کی اشاعت، شرکانہ رسوم و بدعات کے خلاف جہاد تزکیہ و احسان کے صاف ستھرے نظام کی ترویج ————— مجڑے ہوئے تصوف کی بیخ کنی اور شیعیت کے فتنہ سے اس دور کے مسلمانوں کو بچانے کی جدوجہد، انکے چند اہم تجدید کارنامے ہیں۔

ان کے بعد یہ امانت بارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ کے سپرد ہوئی ان کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں پر سخت حالات تھے۔ باہمی تفرقہ و انتشار بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اصرار کی وجہ سے مسلمانوں کے مختلف حلقوں اور مکاتب فکر کی صلاحیتیں باہم ایک دوسرے کی ترویید و تصلیل ہی پر صرف ہو رہی تھیں حضرت شاہ ولی اللہ نے وہ تمام کام کئے جن سے ملت اسلامیہ ہند کی تعمیر نو ہو سکے، اور اسکی صفوں میں اتحاد اور قدموں میں ثبات پیدا ہو، اور ذوق و مزاج عملی اور مثبت ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے وقت کے فتنوں اور اسلام کو درپیش داخلی و خارجی خطروں پر کڑی نظر رکھی، اس سلسلہ میں خاص طور پر رد شیعیت کے سلسلہ میں انکے کام کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، انھوں نے نہ صرف یہ کہ خود دو کتابیں تصنیف کیں (۱) ازالۃ الحماص حلاۃ الحلواء (۲) قرۃ العین فی تفصیل الشیخین، بلکہ حضرت مجدد الف ثانی کے اس رسالہ کا عربی میں ترجمہ بھی کیا جو انھوں نے شیعوں کی تکفیر کے سلسلہ میں علماء خراسان کے فتوے کی تائید میں لکھا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے متصلاً بعد انکے صاحبزادہ گرامی حضرت شاہ عبدالعزیز کا زمانہ آیا اس زمانے کے حالات کا اندازہ آپ جیسے اہل علم و نظر حضرات صرف اس سے لگا سکتے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے زمانے میں ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا تھا، لیکن اپنے تمام دوسرے کاموں کے ساتھ جن میں رجال کار کی تیاری کا کام سب سے زیادہ اہم تھا، انھوں نے بھی شیعیت کے فتنہ سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کیلئے ”تھنہ اثنا عشریہ“ جیسی کتاب تصنیف فرمائی جو انشاء اللہ اس راہ میں قیامت تک مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

پھر حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید نے اپنے تمام کاموں کے ساتھ جن میں اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے میدان کارزار کا سجانا سر فہرست ہے شرک و بدعات کی بچ کئی کا کام پورے اہتمام کے ساتھ جاری رکھا،

پھر وہ وقت آیا کہ مغلیہ حکومت کا اگرچہ کچھ نام باقی تھا لیکن فی الحقیقت وہ ختم ہو چکی تھی، اسکی جگہ ”سرکار ایٹ انڈیا کمپنی“ کا اقتدار قائم ہو چکا تھا، اس وقت مسلمانوں کی سیاسی مفلوکیت اور کمزوری کے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر عیسائی مبلغین کی ایک فوج میدان میں آگئی، انھوں نے سمجھا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو عیسائی بنالینا آسان ہوگا، انھوں نے تحریر و تقریر سے تبلیغی مہم وسیع پیمانے پر شروع کر دی، تو ہمارے سلسلہ کے اکابر میں سے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دیگر علمائے کرام نے ایسا مقابلہ

جس نے عیسائی مبلغین کو ہمیشہ کیلئے پسپا اور خاص کر مسلمانوں کی طرف سے مایوس کر دیا۔ اسکے کچھ ہی بعد سوامی دیانند کی آریہ سماجی تحریک وجود میں آئی انھوں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ حضرت نانوتویؒ نے تحریر و تقریر سے اسکا بھی مقابلہ کیا۔ اسی دور میں یورپ کے سیاسی غلبہ اور اقتدار کے نتیجہ میں عقلیت اور روشن خیالی کے خوبصورت ناموں سے دہریت اور نیچریت کا فتنہ اٹھا، اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے حضرت نانوتویؒ نے اس طرف بھی خاص توجہ فرمائی اور اپنی تصانیف اور تقریروں سے ثابت کیا کہ اسلام کے تمام بنیادی عقائد و مسائل عقل و فطرت کے عین مطابق ہیں اور جو اس کے خلاف ہے وہی خلاف عقل و فطرت ہے۔ پھر ان خارجی حملوں اور فتنوں کے دفاع اور مقابلہ کے ساتھ شیعیت کی ضلالت کے خلاف بھی پ نے لسانی و قلمی جہاد کیا۔ اس سلسلے میں آپ کی مستقل ”تصنیف“ ”ہدایہ الشیعہ“ اور اس موضوع سے متعلق آپ کے مکتوبات حضرات اہل علم سے ملتا ہے۔

ہیں اس کے علاوہ تعلیمات نبوی اور دین کی حفاظت و اشاعت کا۔

مدارس کے قیام کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی۔ علیٰ ہذا۔ آپ۔

نے بھی عمر بھر شیعیت اور دوسرے داخلی فتنوں اور گمراہیوں، مشر

اور مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جدوجہد فرمائی اور اس کو تقرب ان سے۔

زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کا فتنہ شروع ہوا۔ ابتدا میں جب تک حضرت کے علم میں اس کی باتیں اور دعوے نہیں آئے جن کی وجہ سے اس کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا فرض و واجب ہو گیا۔ آپ نے احتیاط فرمائی لیکن جب اس کے ایسے دعوے سامنے آ گئے جن کے بعد کف لسان کی بھی گنجائش نہ رہی تو حضرت نے اس کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔

حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے بعد ان کے تلامذہ و مسترشدین، حضرت شیخ

الہند، حضرت سہارنپوری، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، پھر ان کے تلامذہ و مرشدین، حضرت

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ، حضرت مولانا سید

حسین احمد مدنی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی، (رحمہم اللہ

تعالیٰ) یہ سب حضرات بھی اپنے اکابر و اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، خارجی حملوں اور

داخلی فتنوں سے دین کی حفاظت، علوم نبوی کی اشاعت امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور امت کی

اصلاح و ارشاد کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس وقت بھی ہم میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے

جنہوں نے ان اکابر دینی غیرت و حمیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہم شہادت دیتے ہیں کہ کو

نی بڑی سے بڑی مصلحت ان حضرات کو کسی فتنے سے سمجھوتہ اور کسی زلیغ و ضلال کو نظر انداز کرنے اور اس سے چشم پوشی پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ بارہا ہم نے دیکھا اور تجربہ کیا کہ ہمارے یہ اکابر کسی مسئلہ کی طرف بڑی شدت سے متوجہ ہوئے جو ہم جیسے کوتاہ نظروں کی نگاہ میں اس شدت کا مستحق نہیں تھا، لیکن تھوڑے ہی دن بعد سامنے آگیا کہ ہم جس فتنہ کو بہت معمولی سمجھ رہے تھے یا اس کو دین میں رخنہ اور فتنہ ہی نہیں سمجھ رہے تھے وہ دین کے لئے ایسے زہریلے برگ و بار لایا کہ الاماں، الحفیظ!

یہ اجلاس تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے بلایا گیا ہے اور یہی اس کا اصل موضوع اور مقصد ہے اس سلسلہ میں ہمارے استاد امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ قدس سرہ سے (خاص طور سے اس دارالعلوم کی صدارت تدریس کے دور میں) اللہ تعالیٰ نے جو کام لیا اور اس بارے میں ان کا جو حال تھا (جس کی طرف کچھ اشارہ اجلاس کے دعوت نامہ میں بھی کیا گیا ہے) میں مناسب بلکہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر آپ حضرات کے سامنے اس کا کچھ ذکر کروں، میں اس کا عینی شاہد ہوں۔

اس وقت میں اس سلسلہ کی حضرت کی تصانیف اور انکی علمی عظمت و اہمیت کا ذکر نہیں کروں گا، اسی طرح حضرت کی توجہ اور فکر مندی سے آپ کے تلامذہ کی جو ایک بڑی تعداد قادیانی فتنہ کے خلاف تحریر و تقریر کے ذریعہ علمی جہاد کے لئے تیار ہو کر میدان میں آگئی تھی، اس کا بھی ذکر نہیں کروں گا، بس چند واقعات ذکر کروں گا جن سے اس فتنہ کے بارے میں حضرت کی شدت احساس اور قلبی اضطراب کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے گا۔

میں ۱۳۳۵ھ میں یہاں دورہ حدیث کا طالب علم تھا، یہ اس دارالعلوم میں حضرت کی صدارت تدریس اور درس حدیث کا آخری سال تھا، جس دن دورہ حدیث کے طلبہ کا سالانہ امتحان ختم ہوا اس دن حضرت نے بعد نماز عصر مسجد میں دورہ سے فارغ ہونے والے ہم طلبہ کو خصوصی خطاب فرمایا، وہ گویا ہم لوگوں کو حضرت کی آخری وصیت تھی، اس میں دوسری اہم باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ ہم نے اپنی عمر کے پورے تیس سال اس میں صرف کئے کہ باطمینان ہو جائے کہ فقہ حنفی حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ الحمد للہ فیما بیننا و بین اللہ اس پر پورا اطمینان ہو گیا کہ فقہ حنفی حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ اگر کسی مسئلہ کے خلاف کو حدیث ہے تو کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس کی تائید اور موافقت میں موجود ہے

لیکن اب ہمارا احساس ہے کہ ہم نے اپنا یہ وقت ایسے کام پر صرف کیا جو زیادہ ضرور

نہیں تھا، جو کام زیادہ ضروری تھے ہم اس کی طرف توجہ نہیں کر سکے اس وقت سب سے زیادہ ضروری کام وین کی اور امت کی فتنوں سے حفاظت ہے۔ اس وقت سب سے بڑا فتنہ مغرب (یعنی یورپ) سے آنے والا الحاد اور دہریت کا فتنہ ہے اور ہمارے اس ملک میں اٹھنے والا قادیانیت کا فتنہ ہے۔ جو بلاشبہ فتنہ ارتداد ہے میں آپ لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ ان فتنوں سے امت کی اور دین کی حفاظت کے لئے اپنے کو تیار کریں، یہ اس وقت کا جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ آپ اس کے لئے اردو تقریر و تحریر میں مہارت پیدا کریں اور جن کے لئے انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کا امکان ہو وہ انگریزی میں مہارت پیدا کریں، ملک کے اندر ان فتنوں کا مقابلہ اردو کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے، اور ملک سے باہر انگریزی کے ذریعہ ————— حضرت الاستاذ قدس سرہ سے یہ ارشاد سنے ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں، الفاظ میں تو یقیناً فرق ہو گا لیکن اطمینان ہے کہ حضرت کا پیغام اور ہم لوگوں کو آپ کی وصیت یہی تھی

حضرت اپنے خطابات اور تقریروں میں قادیانی فتنہ پر گتہ

اکبر رضی اللہ عنہ کے اس غیر معمولی حال اور اضطراب کا ذکر فرما۔

وفات کے بعد ارتداد کے فتنوں خاص کر نبوت کے مدعی مسیلمہ کز

آپ پر طاری تھا، ہم لوگ محسوس کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے قادیانی منہ۔

طرح کا حال ہمارے حضرت استاذ پر طاری فرمادیا ہے۔

یہاں میں فتنہ قادیانیت کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب سے متعلق ریاست بھاو پور کے تاریخی مقدمہ کا واقعہ ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں یہ مقدمہ بھاو پور کی ججی کی عدالت میں تھا، ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ کیا تھا کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا، اس نے اپنے کو مسلمان ظاہر کیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قادیانی ہے، اس لئے وہ کافر ہے۔ عدالت میرے اس نکاح کو نسخ اور کالعدم قرار دے۔ بھاو پور کے علمائے کرام نے اہتمام سے اس مقدمہ کی پیروی کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ تشریف لائیں اور عدالت میں بیان دیں اس وقت حضرت مریض اور مرض کی وجہ سے بہت ضعیف و نحیف تھے بالکل اس لائق نہ تھے کہ بھاو پور تک کا طویل سفر فرمائیں، لیکن آپ نے اسی حال میں تشریف لے جانیکا فیصلہ فرمایا، (میں نے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ میرے پاس کوئی عمل نہیں ہے جس سے نجات کی امید ہو، شاید اس حال میں یہ سفر ہی میری نجات و مغفرت کا وسیلہ بن جائے) بہر حال تشریف لے گئے اور جا کر عدالت میں بڑا معرکہ آراء بیان دیا، دوسرے چند حضرات علمائے کرام



کے بھی بیانات ہوئے، خاص کر حضرت شاہ صاحب کے بیان نے فاضل جج کو مطمئن کر دیا کہ قادیانی ختم نبوت کے انکار اور مرزا غلام احمد کو نبی ماننے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج کا فرد مرتد ہیں انھوں نے بہت مفصل فیصلہ لکھا، دعویٰ کرنے والی مسلم خاتون کے حق میں ڈگری دی اور نکاح فسخ اور کالعدم قرار دیا فاضل جج کا یہ فیصلہ قریباً ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب کی شکل میں اسی زمانہ میں ”فیصلہ مقدمہ بھادلوپور کے نام سے شائع ہو گیا تھا، اسکے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بڑی بنیاد حضرت شاہ صاحب کا بیان تھا ————— برطانوی حکومت کے دور میں یہ پہلا عدالتی فیصلہ تھا جس میں قادیانیوں کو کافر اور غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔

فتنہ قادیانیت کے ہی سلسلہ میں ایک واقعہ حضرت شاہ صاحب کے جلال کا بھی سن لیجئے۔ دورہ حدیث کے ہمارے ہم سبق طلبہ میں ضلع اعظم گڑھ کے بھی چند حضرات تھے، اسی زمانے میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک صاحب جو قادیانی تھے سہارنپور میں حکومت کے کسی بڑے عہدے پر آگئے، وہ ایک دن اپنے ہم ضلع اعظم گڑھ میں طلبہ سے ملنے کیلئے (لیکن فی الحقیقت انکو جال میں پھانسنے کیلئے) دارالعلوم آئے، ان طلبہ نے انکی اچھی خاطر مدارات کی، وہ شکار کے بہانے ان میں سے بعض کو اپنے ساتھ بھی لے گئے جو رات کو دارالعلوم واپس آئے، حضرت شاہ صاحب کو کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی حضرت کو ان طلبہ کی اس دینی بے حمیتی سے سخت قلبی اذیت ہوئی، ان طلبہ کو اس کا علم ہوا تو ان میں سے ایک سعادت مند طالب علم غالباً معافی مانگنے کیلئے حضرت کی خدمت میں پہنچ گئے، حضرت پر جلال کی کیفیت طاری تھی قریب میں چھڑی رکھی تھی اس سے انکی خوب پٹائی کی (یہ فاروقی شدت فی امر اللہ کا ظہور تھا) ہمارے وہ ہم سبق طالب علم بڑے خوش اور مسرور تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ ایک غلطی پر حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ سے پٹنے کی سعادت انکو نصیب ہوئی۔ جو حضرت کے ہزاروں شاگردوں میں سے غالباً کسی کو نصیب نہ ہوئی ہوگی کیونکہ حضرت فطری طور پر بہت ہی نرم مزاج تھے، ہم نے کبھی انکو غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا۔

آخر میں اپنا ایک ذاتی واقعہ ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ میرے اصل آبائی وطن سنہیل سے قریباً ۱۵ میل کے فاصلہ پر ایک موضع ہے اس موضع میں چند دو لتند گھرانے تھے، والد ماجد سے ان لوگوں کے تجارتی اور کاروباری تعلقات تھے جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ میں جب شعبان ۱۳۳۵ھ کے اواخر میں دارالعلوم کی تعلیم سے فارغ ہو کر مکان پہنچا تو میرے بڑے بھائی صاحب نے بتلایا کہ اس موضع والوں کے کوئی رشتہ دار امر وہہ میں

ہیں جو قادیانی ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ برابر وہاں آتے ہیں اور قادیانیت کی تبلیغ کرتے ہیں اور دعوت دیتے ہیں اور لوگ متاثر ہو رہے ہیں اور سنا ہے کہ اسکا خطرہ ہے کہ بعض لوگ قادیانی ہو جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ وہاں چلنا چاہئے آپ پروگرام بنائیے!۔ (میرے یہ بھائی صاحب مرحوم عالم تو نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے دین کی بڑی فکر عطا فرمائی تھی) — چند روز کے بعد انھوں نے بتلایا کہ معلوم ہوا ہے کہ امروہہ کا وہ قادیانی (جس کا نام عبد السمیع تھا) فلاں دن وہاں آنے والا ہے بھائی صاحب نے اس سے ایک دن پہلے پہونچنے کا پروگرام بنایا رمضان مبارک کا مہینہ تھا ہم اپنے پروگرام کے مطابق پہونچ گئے لوگوں سے ہم نے باتیں کیں تو اندازہ ہوا کہ بعض لوگ بہت متاثر ہو چکے ہیں، بس اتنی ہی کسر ہے کہ باقاعدہ ابھی قادیانی نہیں ہوئے ہیں جب ہم نے قادیانیت کے بارے میں ان لوگوں سے گفتگو کی تو انھوں نے کہا کہ امروہہ سے عبد السمیع صاحب آنے والے ہیں آپ انکے سامنے یہ باتیں کریں۔ ہم نے کہا کہ یہ تو بہر بھی بات کریں گے اور انکو بھی بتلائیں گے کہ مرزا غلام احمد گمراہی کے علاوہ کتنی بڑی حماقت ہے — اس گفتگو صاحب نے (جو کچھ پڑھے لکھے اور عبد السمیع کی باتوں سے زیا عبد الشکور صاحب لکھنؤی سے مناظرہ کر چکا ہے اور امروہہ — بحث کر چکا ہے اور سب کو لا جواب کر چکا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات سن کر میں بڑی فکر میں پڑ گیا اور دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی تجربہ کاری اور چرب زبانی سے لوگوں کو متاثر کر لے۔ میں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ میری مدد اور انجام بخیر فرمائے۔ میں اسی حال میں سو گیا خواب میں حضرت استاذ قدس سرہ کو دیکھا، آپ نے کچھ فرمایا جس سے دل میں یہ اعتماد اور یقین پیدا ہو گیا کہ بڑے سے بڑا کوئی قادیانی مناظرہ آجائے تب بھی میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ حق کو غالب اور اس کو مغلوب فرمائے گا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھلی تو الحمد للہ میرے دل میں وہی یقین و اعتماد تھا — لیکن امروہہ سے وہ قادیانی عبد السمیع نہیں آیا — ہم نے کہا کہ اب جب کبھی وہ آئے تو ہم کو اطلاع دیجو ہم انشاء اللہ آئیں گے — اسکے بعد ہم نے لوگوں کو بتلایا اور سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا کسی دعویٰ کرنے والے کو نبی ماننا صریح کفر و ارتداد ہے اور مرزا قادیانی کے بارے میں بتلایا کہ وہ کیسا آدمی تھا ہم بفضلہ تعالیٰ وہاں سے اس اطمینان کے ساتھ واپس ہوئے کہ انشاء اللہ اب یہاں کے لوگ اس قادیانی کے جال میں نہیں آئیں گے۔ خواب

میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مجھے دکھایا اسکو میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت اور حضرت شاہ صاحبؒ کی کرامت سمجھا۔

محترم حضرات! حضرت شاہ صاحب کے چند واقعات تو میں نے صرف اس لئے بیان کئے کہ اس دارالعلوم کے اکابر میں اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کے تحفظ کا اور قادیانی فتنہ کے خلاف جہاد کا (جو اس اجلاس کا خاص موضوع ہے) سب سے زیادہ کام انہی سے لیا — ورنہ — میں تاریخی تسلسل کی روشنی میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے اس سلسلہ مجددی و ولی اللہی اور سلسلہ قاسمی و گنگوہی کی ایک خصوصیت بتوفیق خداوندی قسم کے فتنوں اور ہر قسم کی تحریف سے دین اور امت کی حفاظت، اور اس سلسلہ میں پوری بیداری، ہوشیاری اور صلابت و صراحت رہی ہے — ہمیں اسکی فکر ہونی چاہئے کہ یہ مزاج اپنی تواتر خصوصیات کے ساتھ زندہ اور قائم رہے اور ہماری ان نسلوں کو منتقل ہو جو ہمارے مدارس میں تیار ہو رہی ہیں۔

میں اس موقع پر آپ حضرات سے اپنا یہ احساس عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وقت کا بہت اہم مسئلہ یہ ہے کہ امت کے عوام ہی میں نہیں بلکہ ان میں بھی جن کو خواص سمجھا جاتا ہے ایک بڑی تعداد ہے جو دین کے بنیادی عقائد و حقائق کے بارے میں بھی، تسامح، تساہل اور چشم پوشی کے رویہ کو اچھے اچھے نام دے کر اختیار کرتی جا رہی ہے خطرہ یہ ہے کہ وہ ایمانی غیرت و حمیت اور وہ دینی جس جو اکثر بڑے بڑے فتنوں کے مقابلہ میں محافظین دین کی مددگار رہی ہے کہیں وہ اتنی مضحکہ خیز نہ ہو جائے کہ پھر اس کے بعد آپ کو دو طرفہ کام کرنا پڑے ایک طرف تو آپ کو ان فتنوں کا مقابلہ کرنا پڑے اور دوسری طرف امت کو بلکہ ان کے خواص کو اس بات پر مطمئن کرنے پر اپنی توانائی صرف کرنی پڑے کہ عقیدہ اور دین پر کسی اور شے کو مقدم کرنا ہمارے دین کے خلاف ہے۔

اگر یہ اجلاس ختم نبوت کے خلاف ہونے والی صریح اور پوشیدہ بغاوتوں اور اسی طرح دوسرے فتنوں کے مقابلہ کیلئے اپنے اکابر و اسلاف کی روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کا نقطہ آغاز بن جائے اور مدارس کے فضلاء کی ایسی جامع تربیت کا ایک پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کر دے جس کے ذریعہ انھیں دین کی حفاظت اور فتنوں کے مقابلہ کیلئے تیار کیا جائے تو میرے خیال میں یہ اجلاس کی افادیت کا ایک عملی ثبوت ہوگا۔

آخری کلمہ اللہ کی حمد و ثناء اور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ پر درود و سلام ہے۔

اللہم أنصر من نصر محمد صلی اللہ علیہ وسلم واجعلنا منهم واحداً من حدل دیں  
محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منهم -

## حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے

”۱۹۹ اسمائے پاک“

(نگاہ اولیں الفرقان رجب ۱۳۹۳ھ)

بزرگان دین اور خاصر ان میں سے جو اکابر و اعظم ہیں مثلاً چشتی اجمیریؒ اور حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیریؒ ان کے میلے لگتے ہیں ان میں غلیظ سے غلیظ اور خبیث سے خبیث قسم کا جو چھپی چیز نہیں ہے شہروں شہروں سے پیشہ و رطوائیں پہنچتی ہیں جو فسق و فجور کے مخصوص بدنام بازاروں میں ہوتا ہے۔

ع ”آسمانِ راقب بود گر خوں ببارد بر زمیں“

لیکن جو کھلا شرک ان درگاہوں میں ہوتا ہے اور دین کی حقیقت سے جاہل لوگ ان بزرگان دین سے جس طرح حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور جس طرح نذرین مانتے اور چڑھا تے ہیں، جس شخص کو قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و ہدایت کا کچھ بھی علم ہو وہ اس سے یقیناً واقف ہو گا کہ اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کے نزدیک یہ شرک ہر قسم کے خبیث سے خبیث فسق و فجور سے بڑی مجرمانہ معصیت ہے۔ قرآن مجید میں اعلان فرمادیا گیا ہے۔

ان الله لا يعفر ان بشرک نه و يعمر ما اللہ تعالیٰ مشرک کو ہر گز نہ بخشے گا اور اس

دون دالك لمن يشاء کے سوا دوسرے گناہ جس بندہ کے چاہے

کا بخش دے گا۔

گزشتہ مہینے رجب میں اس عاجز کا گجرات میں سورت، راندیر وغیرہ جانا ہوا تھا، وہاں ایک صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے عرس کا ایک اشتہار دکھایا جو ان کے پاس ڈاک سے پہنچا تھا۔ اس پر شائع کرنے والے کا نام پتہ چھپا ہوا ہے

”پیر زادہ مولوی سید عبدالرحمن گدی نشین خادم خواجہ صاحب درگاہ شریف اجیر“

اس اشتہار میں ایک صفحہ پر عرس کا دعوت نامہ اور نذر و نیاز کے لئے رقم جمع کر کے بھیجنے کی اپیل ہے۔ (اور اس کے لئے منی آرڈر کا ایک فارم بھی منسلک ہے جس پر مندرجہ بالا پتہ انگریزی میں چھپا ہوا ہے۔) اور دوسرے صفحہ پر حضرت خواجہ کے ۱۹۹ ”اسمائے پاک“ کا وظیفہ لکھا گیا ہے۔ اس وظیفہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اشتہار ہی کے الفاظ میں پڑھ لیجئے

”حضرت خواجہ خواجہاں خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند قدس سرہ کے ۱۹۹ اسمائے پاک کا وظیفہ جو تمام مشکلات کے حل کے لئے نہایت کامیاب اور آزمودہ ہے، جو عقیدت مند اس وظیفہ کو خلوص دل سے ہڑھیں گے وہ حضرت خواجہ کی ریارت بابرکت سے شرف اندوز ہوں گے اور دینی و دنیاوی مقاصد میں کامیاب ہوں گے، مگر اس وظیفہ کو شروع کرنے سے پہلے حضرت خواجہ کی روح پر فوج کی خوشنودی اور دعا کی مقبولیت کے لئے حسب توفیق ہدیہ توشہ پیش کیا جائے، وہ ہدیہ توشہ بذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر یا بذریعہ رجسٹری دعا گو کے پتہ پر ارسال فرما کر سعادت مندی سے بہرہ اندوز ہوں۔ دعا گو کی اجازت کے بغیر یہ وظیفہ ہر گز نہ پڑھیں“

اس کے آگے خواجہ صاحب کے وہ ”۱۹۹ اسمائے پاک“ بھی لکھے ہیں، افسوس ہے کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہ سب یہاں درج نہیں کئے جاسکتے۔ ان میں سے بعض معنوی لحاظ سے نہایت مہمل اور بے نکتے ہیں۔ مثلاً عنقاء اللہ معین الدین، علماء اللہ معین الدین، خلفاء اللہ معین الدین، شرفاء اللہ معین الدین، مقتداء اللہ معین الدین، ان میں یہ اسماء بھی ہیں۔ اول معین الدین، آخر معین الدین، ظاہر معین الدین، باطن معین الدین، غفار معین الدین، ستار معین الدین، اس طرح کے ناموں سے ۱۹۹ کی گنتی پوری کی گئی ہے اور ایک لمبا وظیفہ بنایا گیا ہے۔

حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی کی تعداد ۹۹ بتلائی گئی ہے اور وہ بطور وظیفہ کے بھی پڑھے جاتے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کے ناموں کا وظیفہ پڑھنے والوں نے ان کے لئے

۹۹ نام بھی کافی نہیں سمجھے بلکہ پورے ۱۹۹ نام بتائے اس مشرکانہ ذہنیت کی مثال اگلی امتوں میں شاید ہی مل سکے۔

اور یہ سب کچھ توحید کے اس داعی اور منادی کے ساتھ اور اس کے نام پر ہو رہا ہے جس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے ہندوہند میں توحید کی اذان دی اور ہزاروں لاکھوں ایسے بندوں کو جو شرک میں گرفتار تھے اور اپنی حاجتیں اور مرادیں غیر اللہ سے مانگتے اور ان کے ناموں کا وظیفہ چپتے تھے سب طرف سے بنا کر اس خدائے واحد سے وابستہ کر دیا اور اس کے نام کا وظیفہ خواں بنا دیا جس کے وہ خود پرستار اور نام لیوا تھے۔

اللہ نے جن کو عقل و دانش اور نور ہدایت کا کوئی ذرہ دیا ہو وہ سوچیں کہ حضرت خواجہ قدس سرہ کی روح پاک کے ساتھ اس سے زیادہ تکلیف دہ کوئی مذاق ہو سکتا ہے؟ اور یہ سب کاہے کے لئے، بس منی آرڈر اور پوسٹل آرڈر وصول کرنے کے لئے۔ فرمایا گیا ہے۔

” ان کثیراً من الاحرار والرحمان لیاکلون اموال الناس ۔



Manzar re. Salafi  
Mazhar Imam



Shop 308 21 83  
Off 309 30 21  
Fax 301 00 81

# FARUQUE BROTHERS

Dealers in :

**P.V.C. Leather Cloths, Nylon, Soft Luggage  
& School Bag Materials Etc.**

Koeta Estate, Shop No. 2,210, Maulana Azad Road,  
Opp Deen -E- Mohammadi Restaurant, Moadanpura,  
Bombay-400 008

ڈاکٹر غوث احمد قریشی، ڈاکٹر عرفان احمد قریشی اور ڈاکٹر انجم قریشی کی جانب سے  
نیک خواہشات

## سحر نر سنگ ہوم

ایک انتہائی قابل اعتماد نر سنگ ہوم

جہاں آپ

شہر کے چوٹی کے ڈاکٹروں سے مناسب اخراجات پر علاج کرا سکتے ہیں

دستیاب سہولیات :

- ۱- ماہر ڈاکٹروں کی ہمہ وقت نگرانی
- ۲- مستعد اور خدمت گزار اسٹاف
- ۳- ۲۴ گھنٹے ایمر جنسی سروس
- ۴- ڈی لکس ایر کنڈیشنڈ کمرے اور جنرل وارڈ
- ۵- ایسویٹس
- ۶- ہر قسم کی جانچ
- سسٹو اسکوپ، اینڈواسکوپ، ٹی یو آر، ای سی جی، ایکس رے اور الٹراساؤنڈ وغیرہ
- ۷- ہر طرح کی سرجری۔ خاص طور پر دور بین کے ذریعہ بغیر چیرے پھاڑے آپریشن
- ۸- آؤٹ ڈور میٹرینی اینڈ چائلڈ کیئر

سحر نر سنگ ہوم - ۶ - نبی اللہ روڈ، لکھنؤ - ۱۸

تلفون نمبر : 223662

تلفون نمبر : 231578

## حافظے کے نقوش

آیہ ایک ایسی یادداشت، ایک خاص تقریب سے جنوری ۱۹۷۹ء کے الفرقان (نگاہ اولیں) میں قلمبند ہو گئی ہے جو آں مرحوم کی اس قوت حافظہ پر روشنی ڈالتی ہے، جس کا ذکر ان کے قلم پر بطور تحریک نعت آتا رہا ہے۔ [

اپنی طالب علمی کے زمانہ میں بلکہ اس کے بعد بھی :  
خرید و فروخت سے خود را قم سطور کا کوئی واسطہ نہیں تھا، تا  
نرخ یاد ہیں۔

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے دور میں خا۔

جنگ سے پہلے ہمارے وطن میں ایک روپے میں ۱۷-۱۸ سیر مل جاتا تھا، اس بوے اس ۵  
نرخ ۴- سیر تک پہنچ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس گرانی کا ذکر غریب لوگ اس طرح  
کرتے تھے جیسے قیامت آگئی۔

پھر جنگ ختم ہو جانے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بہت تیزی سے چیزوں کے نرخ  
گرنا شروع ہوئے اور بعض چیزیں قبل از جنگ سے بھی زیادہ ارزاں ہو گئیں۔ گیہوں بیس سیر تک  
فروخت ہونے لگا، اسی طرح دوسرے اناج بہت ارزاں ہو گئے تھے، میرے والد ماجد نے اسی  
زمانہ میں اپنے گھرانے کی بعض شادیوں کیلئے سونا خریدا جو غالباً ۲۳- روپے تولہ کے حساب سے  
خرید اگیا تھا۔

۱۹۲۱ء ۲۲ء ۲۳ء میں اس عاجز کا قیام اپنے خاص استاذ اور مربی حضرت مولانا کریم  
بخش صاحب مصلیٰ کے ساتھ (جن سے قرابت بھی تھی) ایک طالب علم کی حیثیت سے مؤ  
ضلع اعظم گڑھ رہا) حضرت مولانا مرحوم وہاں کے دینی مدرسہ دارالعلوم میں صدر مدرس  
تھے) مؤ میں اس زمانہ میں بھی — جبکہ ملک میں عام طور سے گائے کا ذبیحہ ہوتا تھا، نہ  
معلوم کیوں بھینس ہی کا گوشت کھایا جاتا تھا، جو اس وقت گھنیا قسم کا وہاں دو پیسے سیر، اس سے اچھا



تین پیسے سیر اور بہت اچھا چار پیسے سیر ملتا تھا (جو آجکل لکھنؤ میں ۴-۵ روپے سیر ہے) وطن میں ہمارے یہاں گائے کا گوشت کھایا جاتا تھا اور وہ اچھے قسم کا دوڑھائی آنے سیر ملتا تھا۔

استاذی حضرت مولانا کریم بخشؒ مٹو کا بڑا گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے، انکے لئے خاص اہتمام سے بکری کا گوشت پکاتا تھا، میرا کھانا پینا بھی حضرت مولانا کے ساتھ ہی تھا، جو کچھ صرف ہوتا اس کا نصف میں ادا کرتا تھا جہاں تک یاد ہے قریباً چھ روپے مہینے کا حساب ہوتا تھا۔

مٹو کی طالب علمی کے اس زمانہ ہی میں ایک دفعہ مٹو سے اپنے وطن سنبھل جاتے ہوئے ایک ساتھی طالب علم کے ساتھ (بلکہ انہی کی ترغیب پر) جو پہلے لکھنؤ میں طالب علمی ہی کے سلسلہ میں رہ چکے تھے، صرف سیر و تفریح کیلئے دو تین دن لکھنؤ میں قیام کیا، خوب یاد ہے کہ اچھا خاصا کھانا چوک بازار میں صرف چار پانچ پیسے میں کھاتے تھے جس میں گرم گرم دو تنوری روٹیاں ہوتی تھیں اور ایک پیالہ میں اچھی لذیذ نہاری، اگر کھانے میں کباب وغیرہ کسی چیز کا اضافہ کرنا چاہا تو بس ایک پیسہ مزید۔

۱۳۴۲ھ (۱۹۲۶ء) میں یہ عاجز بسلسلہ طالب علمی دارالعلوم دیوبند میں رہا۔ میں ان چند طلبہ میں سے تھا جو قیمت ادا کر کے دارالعلوم کے مطبخ سے کھانا کھاتے تھے، ایسے طلبہ سے مہینے میں حساب کر کے کھانے کی اصل لاگت لے لی جاتی تھی، مولانا گل محمد خاں صاحب مرحوم مطبخ کے ذمہ دار اور منتظم تھے، بڑے حسابی آدمی تھے، میرا قیام وہاں دو سال رہا، کھانے کی قیمت قریباً ساڑھے تین روپے، کسی مہینے کچھ کم کسی مہینے کچھ پیسے زیادہ مجھ سے وصول کئے جاتے تھے، جہاں تک یاد ہے ایک دفعہ بھی پورے چار روپے دینے کی نوبت نہیں آئی حالانکہ معلوم ہوا تھا کہ سوختہ لکڑی اور باورچیوں کی منخواہ کا بھی حساب لگایا جاتا تھا۔

۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) سے الفرقان بریلی سے جاری ہوا۔ اور اسکی وجہ سے اہل و عیال کے ساتھ وہیں قیام ہوا، بس یہیں سے خانگی ضروریات خود خریدنے یا خریدوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت مولانا کریم بخش صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالحق صاحب مرحوم بریلی کے مدرسہ مصباح العلوم کے مہتمم اور صدر مدرس تھے وہ بازار کا سودا خریدنے میں بڑے ماہر تھے، ان سے قربت داری بھی تھی میری خانگی ضروریات زیادہ تر وہی خریدتے تھے وہ ہر مہینے آنے کی ایک پوری پوری خرید لیتے تھے جس میں دو من کے قریب آتا ہوتا تھا۔ اس میں سے دو تہائی اپنے ہاں رکھ لیتے تھے اور ایک تہائی میرے ہاں بھیج دیتے تھے جو ایک مہینے کیلئے کافی ہوتا تھا اس پوری کی قیمت لگ بھگ چھ روپے ہوتی تھی، کبھی کبھی پیسے کم کبھی کبھی زیادہ گویا صرف دو

روپے کا آٹا پورے مہینے کیلئے کافی ہوتا تھا۔ گائے کا گوشت بہت عمدہ قسم کا تین چار آنے کا بکری کا چھ آنے اور بہت اعلیٰ قسم کا حصّی کا آٹھ آنے (اور بریلی میں سیر اس زمانہ میں سو تولہ والا مروج تھا)۔ مچھلی اچھی قسم کی چار پانچ آنے سیر ملتی قربانی کے لئے گائے ۲۵-۳۰ روپے کی اچھی مل جاتی تھی اور بکری ۵-۶ روپے کی۔ ایک دفعہ دودھ دینے والی ایک اچھی بکری غالباً سات روپے میں خریدی تھی جو کئی سال ربی پھر مع ایک بچہ کے آٹھ روپے میں فروخت ہوئی۔ مرغی ایک روپے میں اچھی مل جاتی تھی انڈا پہلے ایک پیسے میں ایک ملتا تھا بعد میں دو پیسے میں ملنے لگا عمدہ قسم کا گڑ ایک روپے میں دس بارہ سیر تک مل جاتا تھا۔ چاول بہت اعلیٰ قسم کا ہسراج (جو باکستی سے بڑھیا مانا جاتا ہے) ایک روپے کا ساڑھے یا گھسیر ہلدوانی سے خریدنا یاد ہے۔

الفرقان اگرچہ بریلی سے نکلتا تھا، لیکن اس زمانہ میں بریلی شروع میں تین سال تک وہ دہلی میں چھپتا رہا، کتابت بریلی ہی لیکر ہر مہینے خود دہلی جاتا اور چھپوا کے لاتا تھا، اس سلسلہ سے ۲- تھا کھانا اکثر کسی ہوٹل میں ہوتا، بہت اچھے کھانے (روٹی تورم

زیادہ دینا یاد نہیں، شام کو اکثر ایسا ہوتا کہ مغرب کی نماز کیلئے جامع مسجد جانا، وہاں سرن دروازہ پر کھانے پینے کی طرح طرح کی چیزیں بیچنے والے پچاسوں آدمی چھوٹی چھوٹی دکانیں لگائے بیٹھے ہوتے، مختلف قسم کی پھلکیاں، دہی بڑے، حلیم پشوری کباب، مچھلی کے کباب، یہ سب چیزیں بڑی لذیذ ہوتی تھیں، ان میں سے ہر چیز دو پیسے کی لی جاتی تھی۔ ایک صاحب روہو مچھلی کے سر مسالے میں تلے ہوئے بیچتے تھے۔ چھوٹا سرد پیسے میں اور اس سے بڑا چار پیسے میں دیتے تھے، ایک عدد وہ بھی لیکر کھانے کا معمول تھا۔ بس یہی شام کا کھانا ہو جاتا تھا۔ کبھی ناشتہ میں حلوہ پراٹھا بھی لے لیا جاتا جو ایک ڈیڑھ آنے میں آدھ پاؤ ملتا تھا۔

۱۹۳۴ء میں جب بریلی میں مع اہل و عیال کے قیام ہوا تو غالباً پہلے ہی دن ایک معمولی قسم کا نیا پلنگ (بغیر بنا) بازار سے ایک روپیہ دو آنے میں خرید لیا تھا، جو ۲۵-۳۰ سال تک رہا۔ اسی کے ساتھ نماز پڑھنے کی ایک نئی چوکی صرف چودہ آنے میں خریدی تھی جو کسی نہ کسی شکل میں اب تک موجود ہے۔ پلنگ کیلئے بہت اعلیٰ قسم کے پائے دو روپے میں خریدے تھے جو آج بھی بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ (اور اس وقت انکی قیمت پچاس سے کم نہ ہوگی) چولہے میں جلانے

والی بہت اچھی بالکل سوکھی لکڑی بریلی میں پہلی دفعہ ایک روپیہ میں تین من خریدنا اچھی طرح یاد ہے (اور ملحوظ رہے کہ اس وقت بریلی کا سیر سوا سیر کا اور من سوا من کا ہوتا تھا)

یورپ کی دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی اس وقت تک ان میں سے اکثر چیزوں کے نرخ قریب قریب یہی رہے — چونکہ پہلی جنگ عظیم کا یہ تجربہ تھا کہ بعض چیزیں بہت زیادہ گراں ہو گئی تھیں ان میں سے کپڑا بھی تھا اس لئے راقم سطور نے چاہا کہ اپنی ضرورت کا کپڑا اپنی استطاعت کے مطابق کچھ زیادہ خرید کر رکھ لیا جائے تو لٹھا ملل جیسے خاص کپڑوں کے ایک ایک دو دو تھان بازار جا کر خرید لئے، اچھے قسم کے لٹھے کا تھان غالباً چار آنے گز کے حساب سے خرید اتھا، دوسرے کپڑے بھی قریب قریب ایسے ہی نرخوں سے۔

بریلی میں ہمارے پڑوس میں ایک نیک صالح شخصیت عبد الماجد صاحب کی تھی، یہ بریلی کی عدالت سشن میں منصرم تھے، مثالی دیندار تھے، راقم سطور سے بہت محبت فرماتے تھے، ذالذال ایجاد ہو چکا تھا، لیکن کھانے پکانے میں ہمارے گھرانوں میں اس کے استعمال کا رواج بالکل نہیں تھا، ہمارے منصرم صاحب کو کسی دکاندار نے خوشامد اور اصرار کر کے ایک پورا کنسٹر ویدیا، وہ لے آئے، انھوں نے چاہا کہ آس پڑوس کے گھروں کو بھی شریک کر لیں، مجھ سے بھی فرمایا کہ ایک روپے کا اس میں سے آپ بھی لے لیجئے! میں نے صرف انکی فرمائش کی تعمیل اور انکا بوجھ ہلکا کرنے کی نیت سے کہہ دیا کہ اچھا بھیج دئے، انھوں نے ایک سیر گیارہ چھٹانک (بریلی کے سیر سے) بھیج دیا (جو آج کے دو کلو سے کچھ ہی کم تھا) یہ صرف ایک روپے کا تھا آخر میں بس ایک بات اور پڑھ لی جائے دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا جس محلہ (گھیر مولوی عبد القیوم صاحب مرحوم) میں میری رہائش تھی اس کی پرانی مسجد کی از سر نو تعمیر کا فیصلہ ہوا، جس دن معماروں اور مزدوروں نے اسکی چھت کا سلیپ ڈالا، جس میں انکے ساتھ اور لوگ بھی لہ لہ فی اللہ لگے ہوئے تھے، میں نے ان سب کیلئے ایک روپیہ کی جلیبیاں منگوائیں، خوب یاد ہے کہ سوا تین سیر یا پونے تین سیر آئی تھیں (یعنی سوا تین کلو یا قریباً چار کلو)۔

# ایک ایشیائی اسلامی کانفرنس کا تجربہ

[۱۹۷۸ء میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے ایک ایشیائی اسلامی کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں شرکت سے واپسی پر جو مشاہدات و تاثرات النفر قان اگست ۷۸ء کے شمارے میں لکھے گئے ان کا ایک اقتباس۔]

جہاں تک شان و شوکت اور ایشیا کے مختلف ممالک کی نمائندگی کا تعلق ہے بلاشبہ یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ لیکن یہ بات مستقبل بتائے گا کہ اسامہ الشان کانفرنس نے کیا دیا، — اس طرح کی کانفرنس کے لحاظ سے راقم سطور کا پچاس سال سے زیادہ کا تجربہ بہت پہلے سے مختلف خوش کن اور مسرت بخش ہو۔

کانفرنس میں دو چیزیں شدت سے محسوس ہوئیں، ان ۵ خیانت ہوگی۔

ایک انتہائی اسراف، جس کی کم از کم راقم سطور کوئی وجہ جواز نہیں سمجھ سکا، جس ہوٹل میں تمام مدعوین کا قیام تھا — جن کی تعداد دو سو کے قریب تھی — انہی میں سے بعض واقف حضرات نے بتلایا کہ اس ہوٹل میں ہم میں سے ہر ایک کے قیام و طعام کے مصارف کا اوسط ایک ہزار روپہ پویمہ کے قریب ہے۔ انہی صاحب نے بتلایا کہ ایک پیالی چائے جو ہم پیتے ہیں یا کسی مہمان کیلئے منگواتے ہیں اس کی قیمت سات روپے ہوتی ہے — بعد میں پاکستان ہی کے ایک صاحب نے یہ بھی بتلایا کہ اس ہوٹل کے مالک پاکستانی مسلمان نہیں ہیں بلکہ یہ امریکہ کی کسی کمپنی کا ہے — اگر یہ بات صحیح ہے تو اور بھی زیادہ رنج و افسوس کی بات ہے۔ آج کل پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ — معاشرہ کی اصلاح اور مسلمانوں میں اسلامی زندگی عام کرنے کا مسئلہ سب مخلص اور دین پسند اہل فکر کے سامنے ہے اور اسکو دوسرے سب مسئلوں سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے اور بیشک یہ اسکا مستحق ہے، لیکن سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہمارا یہ طرز عمل اور امریکہ وغیرہ کی تقلید میں ہماری یہ مسرفانہ زندگی ہماری ان نیک اور

مبارک آرزوؤں سے کچھ مطابقت رکھتی ہے، کیا اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایت، آپ کے اسوۂ حسنہ اور امت کی تاریخ میں ہمارے لئے کوئی رہنمائی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بصارت اور بصیرت عطا فرمائے۔

دوسری چیز جو شدت سے محسوس ہوئی وہ بعض مقررین کا وہ جوش خطابت تھا جس سے محسوس ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حقیقت پسندی کا کوئی حصہ عطا نہیں فرمایا ہے اور وہ صرف خیالی دنیا میں رہتے ہیں اور شاید اپنے کو اور اپنے دور کے مسلمانوں کو وہ قرون اولیٰ کے فاتح مجاہدین سمجھتے ہیں اور دنیا کی بساط پر اس وقت مسلمانوں کی جو واقعی حالت ہے اس کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے (حالانکہ صرف اسرائیل کا وجود اور اس کی تاریخ ہی ہم کو سب کچھ بتلانے اور سبق دینے کے لئے کافی ہے) — الغرض ان پر جوش مقررین کی ہنگامہ خیز تقریریں سن کر شدت سے یہ احساس ہوا کہ یہ تقریریں عام مسلمانوں کو حقیقت پسندی اور فکر مندی کے ساتھ عملی آدمی بننے کے راستہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنتی رہیں گی — کانفرنس کے آخری دن کے اجلاس میں ایک مرحلہ پر رفیق محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بڑی دلسوزی کے ساتھ تقریر فرمائی جس میں ان مقررین کو اس طرف توجہ بھی دلائی اور بتلایا کہ اس رویہ سے ہم نے کھویا بہت اور پایا کچھ نہیں ہے — لیکن بعد کی تقریروں سے اندازہ ہوا کہ مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ ”صدّاصحرا“ کے سوا کچھ نہ تھا۔ والی اللہ المشتکیٰ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب وہ خلیفہ منتخب کئے گئے اور انھوں نے پہلا خطبہ دیا جو بہت مختصر تھا تو اس کے آخر میں یہ بھی فرمایا کہ

آج تمہیں زیادہ بولنے والے امام درہنما سے

انتم الیوم الی امام

زیادہ ضرورت فعال (بہت کرنے والے)

فعال احواح مکم

امام درہنما کی ہے۔

الی امام قوال۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ بات ہمارے اس زمانہ سے جیسی مطابقت رکھتی ہے شاید ایسی مطابقت کسی دور میں نہ رہی ہوگی — واقعہ یہ ہے کہ ”قوالیت“ اور قوالیت پسندی اس وقت ہم مسلمانوں کی بیماریوں میں بڑی قابل فکر بیماری ہے۔

## خطابِ عید

[ تقریباً چالیس سال سے معمول تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں عیدین کی نماز کے بعد تقریر فرماتے۔ اور پھر دعا ہوتی۔ اس تقریر اور دعا کی نوعیت نے لکھنؤ کے تقریباً تمام فہمیدہ طبقے کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ یہ اس مبارک سلسلہ کا آخری تقریر اور دعا ہے جو عید الفطر ۱۴۱۰ھ - ۱۹۹۰ء کے موقع پر کی گئی۔ ]

حمد و صلوة کے بعد!

میرے عزیزو، میرے دوستو! اور میرے بھائیو! آ

موجودہ حال معلوم ہوگا، اور جن کو نہیں معلوم ہوگا وہ دیکھ کر سمجھ جائیں گے، میرے ت س و حرکت بھی مشکل ہو گئی ہے۔ آنکھ اور کان کی اور جسم و دماغ کی قوتیں رخصت ہو رہی ہیں، مجھے خود بھی امید نہ تھی کہ میں آپ کے ساتھ نماز عید میں شریک ہو سکوں گا۔ حسرت کے ساتھ دعائیں کر رہا تھا کہ اس مبارک موقع پر حاضری اور شرکت کا ایک موقع اور مل جائے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کے پروانے تقسیم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مجمع اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور ان میں شریک ہونا بہت برکتوں اور سعادتوں کا سبب ہوتا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے حاضری کی توفیق عطا فرمادی میرا برسوں کا معمول اس موقع پر آپ حضرات سے کچھ باتیں کرنے کا ہے مجھے اسکی تو بالکل ہی امید نہ تھی کہ اس بار میں کچھ کہہ بھی سکوں گا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ، صحیح لفظ بھی میری زبان سے ادا نہیں ہو پارہے ہیں، لیکن حضور ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی سیدنا ابوذر غفاریؓ کی ایک بات یاد آگئی، بس اس بات کی برکت سے ارادہ کر لیا کہ جو کچھ بھی بن پڑے گا کہوں گا۔ کوئی سمجھے گا یا نہیں، میرا اللہ تو دیکھے گا، اور کیا عجب کہ یہی عمل میری مغفرت کا سبب بن جائے۔

دوستو! جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں، اور کوئی لمبی چوڑی بھی نہیں، لیکن

اس سے پہلے سیدنا ابوذر غفاریؓ وہ ارشاد آپ کو بھی سنا دوں جسکا میں نے ابھی حوالہ دیا۔ آپ میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہونگے جن کے دل میں اس ارشاد کو سننے کا شوق پیدا ہو گیا ہوگا۔ تو سنئے انھوں نے ایک دفعہ فرمایا تھا۔

لو و صعثم الصمصامہ علی ہدہ۔ وأشار الیٰ قفاه وابی طست أ بی مُسمعکم کلمۃ سمعتها من رسول اللہ ﷺ لا سمعتکمoha قل أ ن تحیروا علی۔

انھوں نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اگر تم میری گردن پر تلواریں رکھ دو مگر مجھے امید ہو کہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی ایک بات ابھی سنا سکتا ہوں تو اس پہلے کہ تم میرا کام تمام کر دو وہ بات میں تمہیں ضرور سناؤں گا۔

اور یہ سیدنا ابوذرؓ تھے کون؟ کس مرتبہ کے تھے؟ اسکا اندازہ ان کے بارے میں خود رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے کیا جاسکتا ہے

ما أقلت العراء ولا أطلت الحصراء علی أصدق دی لہجۃ من أبی درا أو کما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔

(یعنی یہ کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر بسنے والوں میں ابوذرؓ سے زیادہ سچی اور کھری بات کہنے والا کوئی نہیں) تو ان ابوذرؓ نے روہ بات فرمائی تھی، بس اس بات کو یاد کر کے میں نے نیت کر لی کہ کچھ بھی ہو میں کچھ نہ کچھ ضرور کہوں گا۔

میرے بھائیو! مسلمان کہلانے والی قوم پر نگاہ ڈالو تو موٹے حساب سے تین قسم کے لوگ ملیں گے۔

۱۔ بہت بڑی تعداد میں تو وہ لوگ ہیں جو صرف نام کے مسلمان ہیں۔ ان کے مسلمان ہونے میں ان کا اپنا کچھ حصہ نہیں، مسلمان گھر میں پیدا ہو گئے، اس لئے مسلمان ہیں۔ عملی طور پر ایک دن کیلئے بھی انھوں نے اسلام کو نہیں اپنایا۔ ایسے لوگوں کے مسلمان ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھیں مسلمان ہونے سے صراحتاً انکار نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ وہ اسلام کو ایک برادری یا ایک قومی نسبت سمجھتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت آپ جیسوں کو نہیں ہوگی کہ یہ طبقہ بڑے خطرے میں ہے اور ہم سب کو اس کے بارے میں فکر مند ہونا چاہئے۔

۲۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اتنا بے تعلق تو نہیں ہے، لیکن اس نے بھی تو اسلام کو سیکھنے کی،

اپنی زندگی کو، اپنی کمائیوں کو، اپنے اخلاق اور معاملات کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ بس وہ جس حال پر ہے قانع ہے، اگر وہ جمعہ جمعہ کی نماز پڑھتا ہے تو اسی پر قانع ہے، اگر وہ صرف رمضان میں نمازوں کا اہتمام کرتا ہے تو بس اسی پر قانع ہے اگر اسکے اخلاق میں یا معاملات میں کوئی خرابی ہے، یا اسکے دل میں حسد کی، کینہ کی، یا بغض یا عداوت کی، یا لالچ کی، یا کبر و ریا کی بیماریاں ہیں، تو برسوں سے وہ اسی حال میں چل رہا ہے لیکن کبھی اس نے سنجیدہ فکر نہ کی کہ مجھے ان خرابیوں کو دور کرنا چاہئے ان بیماریوں سے نجات ملنی چاہئے اور مجھے دین کے اعتبار سے ترقی کرنا چاہئے مسلمان کہلانے والی قوم کے مردوں اور عورتوں کی خاصی تعداد اسی قسم کی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی اچھا اثر دنیا کی دوسری قوموں پر ہمارا نہیں پڑ رہا۔ اور دن رات کا ساتھ ہونے کے باوجود دنیا میں بسنے والے عام انسانوں کے دل میں ہمیں دیکھ کر کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے، وہ کچھ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتے۔

مسلمان کہلانے والی قوم کی جو غالب اکثریت ہے وہ درجہ

۱۔ مل کر بنتی ہے۔ اور اجتماعی طور پر جو حالات ہم پر آرہے ہیں وہ اسی و ۔

۳۔ ایک تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے سچے دل

اطاعت کا عہد کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں طے کیا ہے کہ اللہ ۔

ہے۔ اور ظاہر و باطن پر ہر طرف سے ہو نیوالے نفس و شیطان اور ماحول کے حملوں سے چوکنے رہنا ہے۔

یہ قسم جو بہت تھوڑی تعداد میں ہے۔ اکاؤ گا اور خال خال افراد کی شکل میں ہے یہ بھی معصوم اور بے گناہ نہیں ہے۔ غلطیاں چھوٹی بڑی اس سے بھی ہوتی ہیں، لیکن ان لوگوں کو اس کا احساس ہو جاتا ہے، توجہ ہو جاتی ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگتے ہیں استغفار کرتے ہیں، توبہ کرتے ہیں، اور اپنا معاملہ ٹھیک کر لیتے ہیں اور پھر سے طاعت اور بندگی میں لگ جاتے ہیں یہ اللہ کے ولی ہیں، ان کو اپنے اپنے تعلق کی بقدر دین کا مزا آتا ہے، اطاعت کا ذائقہ آتا ہے، ان کے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے تکلیفیں ان کو بھی ہوتی ہیں، بیماریاں انہیں بھی گھیرتی ہیں لیکن وہ نہ تو مایوس رہتے ہیں، اور نہ قہمگین، ”لا خوف علیہم ولا ہم یحزبون“ کا لطف انہیں اس دنیا میں بھی جو خوف اور حزن ہی کا گہوارہ ہے آنے لگتا ہے، یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ نہیں ہیں جو ہواؤں میں اڑتے ہیں، اور پھونک مار دیں تو یہ ہو جائے وہ ہو جائے، انکی پہچان اللہ نے یہ نہیں بتائی ہے۔ اللہ نے اپنے ان دوستوں کی اور ان انہوں کی پہچان بتائی ہے۔ اللہ دیں آموا



و کاوا یشقون۔ ایک تو ان لوگوں نے ایمان کی دولت حاصل کر لی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور اسکی بندگی کا احساس مسلسل انھیں رہتا ہے۔ غفلت اور بھول انکا مستقل حال نہیں ہے، بلکہ انکا مستقل حال تویاد اور احتیاط ہی ہے کبھی کبھی بھول جانا الگ بات ہے، مسئلہ اصل مستقل حال کا ہے سو وہ ان لوگوں کا درست ہو جاتا ہے۔

دوستو! بس دو باتیں ہیں اللہ کا ولی بننے کیلئے، ایک ایمان دوسری تقویٰ، ایمان کا مطلب یہ کہ دل میں یہ یقین اتر جائے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ بالکل برحق ہے، اور اسی میں کامیابی ہے، اور تقویٰ یہ کہ اس یقین کے مطابق زندگی میں احتیاط اور پابندی کی عادت پڑ جائے، بے لگام زندگی سے چچھا چھوٹ جائے عام طور پر لوگوں نے اللہ کا ولی ہونے کے جو مطلب سمجھ رکھے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں بر رگان دین اولیاء اللہ تھے اور بس اکیا حضور اکرم ﷺ صرف اس لئے آئے تھے کہ آپ کی پوری امت میں ۳-۶- اولیاء اللہ پیدا ہو جائیں، نہیں یہ خیال تو آپ کے فیض کی بڑی توہین ہوگی، آپ تو اس دولت کو عمومی طور پر تقسیم کرنے آئے تھے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شروع کے دور میں عام مسلمانوں کو یہ دولت ملی تھی، اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کے انسانوں کے دل اس پوری قوم کی طرف، اور اس کے طریقہ زندگی کی طرف اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ کھینچنے لگے تھے جتنے آج ان کا ذکر اللہ والوں کی طرف کھینچے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔

لہذا میرے بھائیوں! آج ایک بات کا فیصلہ کرو، پہلی اور دوسری قسم سے نکل کر تیسری قسم میں آنا ہے، واقعی اب تک کی جو غفلت ہوئی اس کی تو معافی مانگو، اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والے ہیں، لیکن آگے کیلئے نئے سرے سے اللہ کی طرف سفر شروع کرو سورہ زمر کی یہ آیت ہم سے یہی کہتی ہے

قُلْ يٰعِبَادِىَ الدِّينَ اَسْرِفُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ لَا تَقْسُطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ حَمِيْنًا ، اِنَّهٗ هُوَ الْعَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۔

وآیثیوآلِی رَّحْمٰتِہٖمْ وَاَسْلِمُوْا لَہٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُوْنَ ۔  
اے محمد! آپ (میری طرف سے میرے بندوں سے) کہئے اے میرے وہ بندوں جنہوں نے (اب تک) اپنے ساتھ بہت (غفلت برتی اور) زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخش دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا اور بہت مہربان ہے، اور رجوع ہو جاؤ اپنے رب کی طرف اور اسکی فرمانبرداری اختیار کر لو قبل اسکے کہ تم پر عذاب آجائے اور پھر کسی طرف سے تم کو کوئی مدد نہ مل سکے۔

ایک بات اور سن لو ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں جانے کیلئے بھی انسان کو حرکت کرنی پڑتی ہے نیچے سے اوپر کی طرف جانے میں انسان کو زیادہ مشقت کرنی پڑتی ہے پہلے اور دوسرے طبقہ سے نکل کر تیسرے طبقہ میں داخل ہونے کیلئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑیگا، راستہ میں مزاحمت ہونے والے نفس و شیطان کو شکست دینے کیلئے مضبوط ارادہ اور مسلسل کوشش کی ضرورت یہاں بھی ہوگی۔ یہ جو لفظ اس آیت میں آیا ہے ”وايسوا الي ربكم“۔ بس یہی ہے پہلی سیڑھی ترقی کا پہلا زینہ، اور وہ دروازہ جس میں سے نکل کر ایمان اور تقویٰ والوں میں شامل ہوا جاتا ہے یہ اثابت علماء سے پوچھو ہاتھ پیر کا عمل نہیں دل کا فعل ہے یعنی دل سے ارادہ کرو کہ اے اللہ کو راضی کرنا ہے صحیح مسلمان بننا ہے ایمان اور تقویٰ حاصل کرنا ہے جتنا سچا پکا فیصلہ دل کا ہو گا اتنی ہی طلب دل میں ہوگی اور جسے طلب ہوتی ہے وہ ڈھونڈھ ہی لیا کرتا ہے جسے دل میں طلب ہوتی ہے وہ اپنے لئے مناسب راستہ ڈھونڈھ لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسکی رہبری فرمائی

اسی چیز کی تلاش کیلئے جاتا ہے وہ اسی طلب میں اہل دل کی صحبتیں

علمائے ربانین کی کتابیں پڑھتا ہے غرض کہ جہاں سے اسے اس

وہاں طالب اور ساکل بن کر جاتا ہے پھر جہاں سے اسے اپنی مایا ملتی

بس اللہ کے بندو! اس بوڑھے معذور اور قریب المرگ کی یہ سیڑھی

اپنے موجودہ حال پر قانع نہ رہو، آگے بڑھنے کا ارادہ کرو، فیصلہ کرو، اللہ سے لو لگاؤ اس سے قرب بڑھاؤ، اور نئے سرے سے، نئے حوصلہ سے اسکی طرف سفر شروع کر دو، جہاں معلوم ہو کہ یہاں کچھ لوگ اسی مقصد سے جمع ہوتے ہیں پہنچ جاؤ، بات کو سنو ۱ جو راستہ بتایا جائے اس پر چل کر دیکھو، جن لوگوں کو اپنے گرد و پیش میں دین کے اعتبار سے اپنے سے بہتر پاؤ ان سے پوچھو مشورے کرو، غرض کہ دل میں ایسی فکر و طلب پیدا کرو کہ اللہ تعالیٰ کو ترس آجائے، اور طلب پر اعتبار آجائے کیونکہ وہ اپنے قرب کی دولت قدر دانوں ہی کو دیتے ہیں۔ آؤ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کھائے اور ہمیں اپنے قرب کی طلب اور قرب کی دولت دونوں عطا فرمادے۔

”الا ان اولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون ، الذين آمنوا وكانوا يتقون ،

سبحانك اللهم وبحمدك تشهد ان لا اله الا انت ستعمرک وتوب اليك ، اللهم صل على

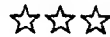
سیدنا محمد وعلی آل سیدنا محمد کما صلیت علی سیدنا ابراہیم وعلی آل سیدنا

ابراہیم انک حمید مجید ،ربنا طلمنا انفسا وان لم تعفنا و ترحمنا لمکوس من

الغفاسین ،اللهم اجعلنا من عبادک المسلمین ، اللهم اجعلنا من عبادک المؤمنین ، اللهم

احعلنا من عبادك المحسنيين اللهم احعلنا من عبادك الصالحين ، اللهم اجعلنا من عبادك المصلحين ، اللهم احعلنا من عبادك المحصلين -

اے اللہ! ہم آپ کے بندے آپ کے حضور میں حاضر ہیں، ہم ایمان لائے کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور ایمان لائے کہ سیدنا محمد ﷺ آپ کے رسول برحق ہیں، اے اللہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اس ایمان کے بعد زندگی جیسی گزرنی چاہئے تھی ویسی نہیں گزری، بہت سے کام جن کا آپ نے حکم دیا تھا، ہم سے ان کے کرنے میں بہت غفلت ہوئی، بہت سے کام جن سے آپ نے سختی سے منع فرمایا تھا ہم سے برابر سرزد ہوئے، اے اللہ ہمیں معاف فرمادے، اور آئندہ کیلئے ارادہ کرتے ہیں کہ ایمان اور تقویٰ والی زندگی گزاریں گے، اے اللہ ہمیں اس ارادہ پر جسنے والا بنادے، اے اللہ ہمیں ہمت و استقامت اور سچی طلب عطا فرمادے، اے اللہ ہم سب کو معاف فرمادے، اے اللہ ہم سب کو قبول فرمائے! آمین! برحمتك يا ارحم الراحمين -



**With Best Compliments from :**

*S. H. Abidi*

**advertisers** | **india**

Computer Graphics &  
Printing Consultants

195/43, Jagat Narayan Road, Golaganj, Lucknow-18

Phone 0522-216284 Fax 0522-229810

# اپنے خطوط کے آئینہ

مختلف حضرات کو، مختلف اوقات میں  
لکھے گئے، مختلف خطوط کا انتخاب



## علمی افکار و افادات

بنام

- ۱- حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی،
- ۲- نام نہیں معلوم ہو سکا
- ۳- حضرت مولانا فضل عثمانی، مکہ مکرمہ
- ۴- بھائی مراد علی صاحب، سعودی عرب
- ۵- مولانا سعید احمد پالنپوری
- ۶- " " " "
- ۷- نام معلوم نہیں ہو سکا
- ۸- حکیم ظل الرحمن صاحب، دہلی
- ۹- مولانا ابوالحسن زید فاروقی، دہلی
- ۱۰- مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی
- ۱۱- " " " " " "
- ۱۲- جناب عبدالرحمن کوندو، سری نگر، کشمیر
- ۱۳- مولانا سید فرید الوحیدی، جدہ
- ۱۴- جناب قطب الدین ملا، بیلگام۔



محمد منظور نعمانی

۲۳ دسمبر ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

حضرت مخدومنا (۱)! دامت فیو صکم و برکاتکم  
السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

خدا کرے حضرت والا کا مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

گذشتہ دو ہفتوں میں میری طبیعت بہت زیادہ خراب رہی، خیال تھا کہ شاید یہ آخری مرض ہے اور یہ دن زندگی کے آخری دن ہیں، ان دنوں میں جو خطوط آئے، ان کا مجھے علم بھی نہیں ہوا، اب تین چار دن سے بفضلہ تعالیٰ مرض میں تخفیف اور آفاقہ تعالیٰ نے کچھ اور مہلت عطا فرمائی ہے۔ وہی توفیق دے کہ توبہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکوں۔

آج سے دو تین دن پہلے گرامی نامہ کے بارے میں معذرت

وقت صرف اتنا ہی عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ”مصنف ابن ابی العالیہ“ کے سلسلہ میں جو کام لیا ہے، معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ حضرت کے ذریعہ ان کاموں کو تکمیل تک پہنچائے اور قبول فرمائے۔

”شارح حقیقی“ کا نسخہ ہمارے یہاں محفوظ نہیں تھا، میں چاہتا تھا کہ وہ پھر طبع ہو۔ اب والا نامہ سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ اس کا نسخہ حضرت کے یہاں نکل آیا ہے، اسکو رجسٹرڈ روانہ کرانے کا انتظام فرمادیا جائے، انشاء اللہ اشاعت کا انتظام ہو جائے گا (۲)۔

حضرت کے ضعف اور معذوری کا حال تو معلوم تھا، تازہ والا نامہ سے مزید تفصیل معلوم ہوئی، اللہ تعالیٰ عافیت عطا فرمائے۔ مولانا اسعد میاں کا حال آنے جانے والوں کے ذریعہ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ یہ مریض اور دور افتادہ ان کے لئے برابر دعا کرتا ہے اور خود حضرت والا کی دعاؤں کا محتاج و طالب اور امیدوار ہے۔

والسلام  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود

(۱) حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، مؤ۔ (۲) غالباً یہ کتاب نہیں آئی۔ ورنہ ناظم کتب خانہ کو اشاعت کیلئے سپرد کی گئی ہوتی۔ ان کا بیان ہے کہ انھیں نہیں ملی۔ (مرتب)



(۲)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

حضرت معظمیٰ (رحمۃ اللہ علیہ) (۱) ! دامت فیہ صکم و برکاتکم

و علیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوں۔۔۔۔۔ گرامی نامہ مورخہ ۶ اکتوبر ۱۹۹۸ء، اب سے کئی دن پہلے موصول ہو گیا تھا، اس سے پہلے مولانا احمد علی صاحب کے ذریعے بھی والا نامہ مجھے مل گیا تھا۔۔۔۔۔ میری بری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں نے اپنے بزرگوں کے عنایت ناموں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا، مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے اُس والا نامہ میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے اکتوبر میں پاکستان تشریف لے جانے کا ذکر فرمایا گیا تھا اور اس سلسلے میں دعا کے لئے بھی ارشاد فرمایا گیا تھا۔۔۔۔۔ اپنی ذاتی رائے کے اظہار کی فرمائش مجھے بالکل یاد نہیں، اگر بالفرض فرمائش کی گئی ہوتی تب بھی یہ عاجز اس بارے میں رائے عرض کرنا مناسب نہ سمجھتا۔۔۔۔۔ اب صفائی کے ساتھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، میں اس بارے میں سخت مایوس ہوں، جس قوم کی نوے (۹۰) فیصد یا اس سے بھی زیادہ کی حالت وہ ہو جو پاکستان کے موجودہ عام مسلمانوں کی ہے اس میں قانون شریعت کا نفاذ اور اس پر عمل بلاشبہ ایک اچھی اور مبارک آرزو تو ہے لیکن سنت اللہ یہ نہیں ہے۔ اس عاجز کے نزدیک اس مقصد کے لئے صحیح طریقہ کار یہی ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے عوام میں حقیقی ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، جب بھی قابل لحاظ اکثریت میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ چیز پیدا ہو جائیگی تو یہ مبارک آرزو بھی انشاء اللہ پوری ہو جائیگی۔

حضرت! میں ایسے حال میں ہوں کہ ٹھہر ٹھہر کر بمشکل یہ سطر لکھا رہا ہوں، اگر میرے لئے آسان ہو تو زیادہ تفصیل اور وضاحت سے اپنی بات عرض کرتا، دعاؤں کا سخت محتاج و طالب ہوں اللہ تعالیٰ اس عاجز کو آپ کے حق کے مطابق ہر طرح کے دنیوی و اخروی خیر و فلاح کے لئے دعا کا اہتمام نصیب فرمائے۔

والسلام  
بقلم محمد ضیاء الرحمن

(۳)

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

محرمی و معظمی حضرت مولانا محمد فاضل عثمانی صاحب (۱)

دامت فیو صکم و برکاتکم

و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ بہت ہی نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ پہلا عنایت نامہ بھی مل گیا تھا، میں ان دنوں آشوب چشم میں مبتلا تھا جو یہاں وبا کے طور پر پھیلا ہوا تھا، ایک مہینہ سے کچھ زیادہ اسکا اثر رہا، اس عرصہ کے وہ تمام خطوط جمع ہوتے رہے جن کا جواب بہت مختصر نہیں لکھایا جاسکتا تھا، ان میں گرامی نامہ بھی تھا، اب تک بھی یہی ۱۰ ۱۱ ۱۲ خطوط محفوظ ہیں۔ کل ہی کی ڈاک سے دوسرا گرامی نامہ موصول ہو

اس وقت صرف اتنا ہی عرض کر سکوں گا کہ سب —

ذہن سے بالکل نکل گیا تھا کہ تعلقات و معاملات کیسے رکھے جائیں گئی تھی کہ شیعہ اثنا عشریہ میں جو لوگ ان عقائد سے انکار کرتے ہیں۔

مذہب کے ان عقائد سے ناواقف ہیں، یا جن کا طرز عمل یہ بتلاتا ہے کہ یہ ایسے عقیدے ہمیں رکھتے ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہوگا؟ — الغرض میرے ذہن میں یہی سوال محفوظ تھا، میں نے اسی کے جواب دینے کی کوشش کی تھی جو خصوصی اشاعت الفرقان، حصہ دوم کے صفحہ ۳۰ پر ”ایک ضروری وضاحت“ کے زیر عنوان لکھا گیا ہے۔

دوسرا مسئلہ جو میرے ذہن سے اتر گیا تھا، میں نے اسکے بارے میں کچھ نہیں لکھا، نہ میں نے پوری طرح اس پر غور کیا ہے۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ جس طرح ہم قادیانیوں کو ان کے موجب کفر عقائد کی وجہ سے دائرۃ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں یہی حال شیعہ اثنا عشریہ کا ہے، ان کے ساتھ ہمارا رویہ وہی ہونا چاہئے جو مثلاً قادیانیوں کے ساتھ ہے۔

اس وقت اس سلسلہ میں صرف اتنا اور عرض کر سکتا ہوں کہ قادیانیوں یا شیعہ اثنا عشریہ کے ساتھ ہمارے روابط و معاملات ایسے نہ ہونے چاہئیں جن سے عام مسلمانوں کو یہ شبہ ہو کہ ہم ان کو مومنین میں سے سمجھتے ہیں — عام کافروں یہود و نصاریٰ اور مثلاً ہنود کے ساتھ تعلقات و معاملات میں کسی مسلمان کو بھی اسکا شبہ نہیں ہو سکتا، لیکن قادیانیوں اور اثنا عشریہ اور

اسی طرح اُن فرقوں کے لوگوں کے ساتھ جو مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کے عقائد قطعی طور پر موجب کفر ہیں جن کو خاص شرعی اصطلاح میں زندیق کہا جاتا ہے ان کے ساتھ ایسے تعلقات رکھنے سے منع کیا جائیگا جن سے عام مسلمانوں کو یہ شبہ ہو کہ ہم ان کو اہل ایمان و اسلام میں سمجھتے ہیں۔

کھلے غیر مسلم، کفار اور زنادقہ کے بارے میں شرعی احکام مختلف ہیں، اسلامی حکومت میں کسی کافر کو اسکے کفر کی بنیاد پر قتل نہیں کیا جائیگا لیکن جیسا حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ”مہسوی“ میں تحریر فرمایا ہے کہ زنادقہ کے واجب القتل ہونے پر متاخرین حنفیہ اور شافعیہ کا اتفاق ہے۔ یہ مختصر عریضہ بھی طبیعت کی ناسازی کی حالت میں بمشکل لکھا سکا ہوں، علاوہ اُن دعاؤں کے جو جناب ازراہ عنایت اس عاجز کے لئے فرماتے ہیں، صحت و عافیت اور کُسن خاتمہ کی دعا کی بھی درخواست ہے۔

والسلام  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود

(۴)

۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء  
کیم ربیع الاول ۱۴۱۰ھ  
باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

میرے مخلص بھائی مراد علی صاحب! سلام مسنون  
آپ کا خط ملا۔ آپ سعودیہ عربیہ کی جس بستی میں ہیں کیا وہاں کوئی عالم دین نہیں ہیں کہ آپ کو مجھے خط لکھنا پڑا۔

معارف الحدیث کی ساتویں جلد کے صفحہ ۳۹ پر اصل حدیث شریف عربی نقل کی گئی ہے۔ نیچے اسکا اردو میں ترجمہ ہے، اُس میں باندی کا ذکر ہے، آپ نے اُس کا مطلب نوکرانی سمجھ لیا، نوکرانی کا تو ہاتھ پکڑنا بھی حرام ہے، باندی کا مطلب اگر آپ نہیں سمجھتے تو کسی عالم یا زیادہ پڑھے لکھے آدمی سے دریافت کر لیتے، شریعت میں اُسکو باندی کہتے ہیں جس سے بیوی ہی کی طرح صحبت جائز ہے، یہ حدیث شریف جس میں کسی صحابی کے اپنی باندی سے صحبت کرنے کا ذکر ہے، مسلم شریف ہی کے حوالہ سے مشکوٰۃ شریف (ص ۷۵۲) کتاب المعاشرہ میں بھی نقل

کی گئی ہے، مشکوٰۃ شریف کا اردو ترجمہ مظاہر حق کہیں مل جائے تو اس میں دیکھ لیا جائے یا کسی عالم سے سمجھ لیا جائے۔۔۔۔۔ دوسری حدیث جس میں کسی سانپ یا بچھو کے کاٹے ہوئے آدمی پر ایک صحابی کے سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے اور اسکی اجرت پر بکریاں لینے کا ذکر ہے جو بخاری شریف کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے وہ بھی مشکوٰۃ شریف میں بخاری شریف کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے۔ (باب الاجارۃ ص ۲۸۵) اس کا ترجمہ اور تشریح بھی مظاہر حق میں دیکھ لی جائے یا کسی عالم دین سے دریافت کر لیا جائے۔

الغرض جو کچھ معارف الحدیث میں لکھا گیا ہے وہ حدیث شریف کا اردو میں ترجمہ اور اسکی تشریح ہے اور خدا کے فضل سے بالکل صحیح ہے، جو لوگ اس پر اعتراض کرتے اور اس کو غلط سمجھتے ہیں وہ بیچارے جاہل ہیں، ان کو کسی عالم دین سے پوچھنا چاہئے۔  
آئندہ کوئی خط لکھنا ہو تو آپ خود نہ لکھیں، کسی عالم سے زیادہ پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی سے لکھوائیں۔

میں خود ضعیف اور مریض ہوں، آنے والا خط بھی دے جواب بھی خود نہیں لکھ سکتا، دوسروں سے لکھواتا ہوں۔

آپ کا خط بھی پڑھوا کر سنا ہے، اور یہ جواب بھی دوسرے ہی۔۔۔۔۔ کے لئے دعا کرتا ہوں اور دعاؤں کا محتاج ہوں۔

والسلام  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۵)

۸ فروری ۱۹۷۷ء

برادر مکرم مخلص محترم (۱) رید محمد کم

سلام مسنون !

گرامی نامہ مورخہ یکم فروری موصول ہوا۔ مرسلہ کتاب بھی پہنچ گئی۔ بے تکلف عرض کروں اب مطالعہ کے ذریعہ علمی اضافہ کا سلسلہ بالکل منقطع سا ہو گیا ہے۔ جو علم حاصل ہو چکا ہے اس کا بھی کچھ حق ادا نہیں ہو سکا۔ اس لئے آپ مجھے کتابی ہدیہ کے لائق نہ سمجھیں۔

ہاں فتاویٰ کے سلسلہ کا محتاج ہوں، جب تک زندگی ہے اسکی ضرورت ہے۔  
 آپ نے اپنی اس تازہ تصنیف میں حضرت نانوتویؒ کی سوانح میں اور تصانیف کی  
 خصوصیات پر جو لکھا ہے وہ حرفاً حرفاً پڑھا اور آپ کے علم کے بارے میں جو حسن ظن تھا اس میں  
 بہت اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ یہ علم مبارک فرمائے۔  
 آپ نے آب حیات کی شرح لکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے، بہت بڑا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس  
 میں آپ کی مدد فرمائے۔

اب سے قریباً بیس سال پہلے جب پاکستان میں علماء دیوبند کے دو گروہوں میں مسئلہ  
 حیات النبی پر شدید اختلاف تھا اور اس نے نزاع اور جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی تو میں نے  
 اس موضوع پر کچھ تفصیل سے الفرقان میں لکھا تھا۔ اس میں ”آب حیات“ کے بارے میں بھی  
 لکھا تھا۔ شاید کبھی نظر سے گزرا ہو۔ میری ملاقات یا عیادت کیلئے ہر گز سفر نہ فرمایا جائے۔ انشاء  
 اللہ کچھ عرصہ کے بعد میں سفر کے لائق ہو جاؤں گا۔

ابھی تو خطوط کا جواب لکھنا بھی میرے لئے مشکل ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ خطوط کم  
 سے کم آئیں۔ الحمد للہ اب چند روز سے بیٹھ کر نماز ادا کرنے لگا ہوں۔ دعاؤں کا محتاج اور  
 دعاگو ہوں۔

والسلام  
 (بقلم عبید الرحمن سنہلی)

(۶)

۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر مکرّم محترم (۱) ! احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیسا۔

سلام مسنون

اخلاص نامہ موجب مسرت ہوا۔ مرحوم مودودی صاحب کے ساتھ تعلق کی یہ  
 سرگزشت میں (۲۲) سال پہلے الفرقان میں لکھ چکا ہوں صرف فرق اتنا ہے کہ دو چار باتیں

صراحت کے ساتھ اس وقت ذکر نامناسب نہیں سمجھا تھا لیکن اس طرح لکھا تھا کہ واقعات سے واقف حضرات کے لئے کافی تھا تو اب یہ ضروری سمجھا کہ ان چیزوں کو صراحت سے لکھ دیا جائے تاکہ یہ تاریخ محفوظ ہو جائے۔ ابھی ان سب چیزوں کے مشاہد زندہ ہیں کل کو وہ نہ رہیں گے الفرقان میں اس سلسلہ کے باقی خطوط کی اشاعت کا بھی فیصلہ کر لیا گیا ہے۔

موسم کی شدت کی وجہ سے مجلس شوریٰ میں شرکت کا ارادہ نہیں کر سکا معذرت لکھ دی ہے۔

آپ کے ساتھ حسن ظن اور قلبی تعلق ہے۔ دعاؤں کا محتاج اور دعا گو ہوں۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی

(۷)

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء  
محمد منظور نعمانی

مکرمی (۱) ۱

سلام مسنون

میں اس حال میں ہوں کہ آنے والے خطوط دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں اور جواب بھی دوسروں ہی سے لکھواتا ہوں، خود لکھنے اور پڑھنے سے معذور ہوں۔

آپ کا خط مورخہ ۲۸ صفر المظفر ابھی پڑھوا کر سنا۔ اسکے مضمون سے اندازہ ہوا کہ آپ غالباً عالم اور عربی داں ہیں۔

”نشر الطیب“ میں اکیسویں فصل صفحہ ۱۱۵ سے شروع ہوئی ہے اس میں مصنف حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے حضرت مفتی الہی بخش کاندھلویؒ کا پورا رسالہ ”شیم الجیب“ ترجمہ کے ساتھ نقل فرمادیا ہے جو صفحہ ۱۶۵ پر ختم ہوا ہے۔

آپ ”نشر الطیب“ میں اس پورے رسالہ ”شیم الجیب“ کو پڑھیں اسکے آخر میں لمولمہ کے زیر عنوان جو اشعار ہیں وہ حضرت مفتی الہی بخش صاحب ہی کے ہیں اور رسالہ کا آخری جزء

(۱) نام کا علم نہیں ہو سکا۔ (مرتب)

اور گویا اس کا خاتمہ ہیں۔

حضرت مفتی صاحب شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے تلامذہ اور سید احمد شہیدؒ کے مسترشدین میں ہیں اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے پیر بھائی اور ان کے ہم مسلک و ہم مشرب ہیں۔  
حضرت مفتی الہی بخش صاحبؒ یا حکیم الامت حضرت تھانویؒ جیسے سلیم العقیدہ ربانی علماء و مشائخ جب رسول اللہ ﷺ سے خطاب کر کے اس طرح کی بات کہیں جیسی ان اشعار میں کہی گئی ہے تو اس کا مطلب وہی ہو گا جو ان کے عقیدہ توحید سے پوری مطابقت رکھتا ہو۔ یہ ایسی کھلی اور بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی سلیم العقل کو شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ عربی داں اور عالم ہیں اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے میری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں تو آپ کے لئے انشاء اللہ وہ کافی ہو گا جو لکھایا ہے۔

آپ نے زمانہ طالب علمی میں پڑھا ہو گا کہ اگر ایک ملحد اور دہریہ کہے است الربیع النقل تو اس کا مطلب اس کے عقیدہ کے مطابق ہو گا اور اللہ تعالیٰ کا مومن و موحد بندہ یہی جملہ بولے است الربیع النقل تو اس کا مطلب اس کے عقیدہ کے مطابق سمجھا جائے گا۔

آپ کیلئے دین و دنیا کے خیر و فلاح کی دعا کرتا ہوں اور خود دعاؤں کا محتاج و طالب

ہوں۔

والسلام  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۸)

۱۸ جولائی ۱۹۹۱ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

عزیز مکرم (۱) سلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم

سلام و رحمت — آپ کا ملفوف خط کل ملا، بفضلہ تعالیٰ خود ہی پڑھا۔ مولوی سجاد سلمہ نے یا جوج و ما موج کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں پہلے سن چکا تھا، چون کہ جو کچھ انھوں نے لکھا وہ نئے لوگوں کیلئے نئی سی بات تھی اسلئے اس سے اتفاق نہ کرنا قدرتی بات ہے۔

(۱) حکیم عل الرحمن صاحب، دہلی

میں نے اس مسئلہ پر نہ کبھی خود غور کیا اور نہ اسکی ضرورت محسوس کی لیکن اپنے استاذ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ سے چونکہ خود اس بارے میں سن چکا ہوں اور انکی چار جلدوں میں مطبوعہ صحیح بخاری کے درس کی تقریر ”فیض الباری“ طبع مصر، میں بھی اس موضوع پر اسی خیال کا اظہار فرمایا گیا ہے جسکا حوالہ بھی مولوی سجاد نے دیا ہے۔ اسلئے مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں۔ میں حضرت استاد کا مقلد نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس دور میں نہ صرف بر صغیر میں بلکہ پورے عالم اسلام میں میری نظر میں قرآن وحدیث کا کوئی عالم اس درجہ کا نہیں ہے اور نہیں تھا اگر کبھی آپ سے ملاقات ہوئی اور آپ نے یاد دلایا تو حضرت الاستاذ کی وسعت علم کے بارے میں زبانی کچھ بتلا سکوں گا۔

آفاقہا گردیدہ ام مہرتباں ورزیدہ ام

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگر ی

دعاؤں کا طالب اور دعاگو ہوں۔

والسلام

(۹)

۴ ستمبر ۱۹۸۹ء  
محمد منظور نعمانی

محترمی گرامی مرتبت جناب مولانا ابوالحسن زید صاحب (۱) دام مجدکم السامی  
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

جناب کے علم میں ہے کہ مولانا نسیم احمد فریدی علیہ الرحمۃ نے اب سے بہت پہلے آپکی کتاب ”مولانا اسماعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان“ پر تبصرہ لکھا تھا اور الفرقان میں اشاعت کیلئے میرے پاس بھیج دیا تھا لیکن وہ مولانا مرحوم کی حیات میں شائع نہ ہو سکا تھا، گزشتہ مہینے اگست میں الفرقان کے ”فریدی نمبر“ میں شائع ہوا — اس تاخیر کے باعث کی کچھ تفصیل ”فریدی نمبر“ کے ملاحظہ سے جناب کو معلوم ہو جائیگی — مولانا مرحوم کے تبصرہ کے تکرار کے طور پر

(۱) کوہلی۔



کو اپنا یہ خیال پہونچا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے علم میں ہے حضرت شہیدؒ کی کوئی سوانح حیات سوائے مرزا حیرت مرحوم کی ”حیات طیبہ“ کے نہیں لکھی گئی اور وہ جیسی کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اس کی کوپوراکر دینے پر غور کریں، اس میں حضرت شہیدؒ اور ان کی تصانیف ”تقویۃ الایمان“ وغیرہ اور ان کے مخالفین خاص کر مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم سے مولانا زید تک کی ”مخالفانہ تحریریں“ اور ان کے جواب میں حضرت شہیدؒ کی طرف سے مدافعانہ طور پر جو چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئیں ان کا ذکر بھی آجائے گا۔

کام یقیناً بہت طویل ہے لیکن امید ہے کہ آپ کے لئے زیادہ مشکل نہ ہو گا اور ایک بہت بڑا قرض جماعت سے اتر جائیگا اور یقین کے ساتھ امید ہے کہ ایک فی سبیل اللہ شہید مظلوم اور حق کی حمایت کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق آپ کو عطا فرمائیں گے۔ جیسا کہ پہلے بھی غالباً لکھا چکا ہوں، میری نظر میں آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس سے اس ضروری کام کے انجام دے سکنے کی امید ہو۔

یقین ہے کہ اگر یہ کام ہو گیا تو انشاء اللہ کتاب آپ کی بیحد مقبول ہوگی، اگر زندہ رہا تو انشاء اللہ اسکی طباعت کے انتظام میں حسبِ توفیق حصہ لے سکوں گا۔

یہ جو کچھ لکھایا یہ بس ”الاحاحۃ فی نفس یعقوب قصہا“ ہے، اسکے سوا کچھ نہیں۔ ہو گا وہی جو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی، وہی رب کریم اس ضعیف اور عاجز بندہ کو دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔

جیسا کہ لکھایا جا چکا ہے، شاہد صاحب کی طرف سے کوئی چیز اب تک دفتر الفرقان میں نہیں پہونچی، خدا کرے کہ انھوں نے آپکو بھیج دی ہو اور آپ اس پر نظر ڈال کر روانہ فرمادیں والد ماجد کی خدمت میں سلام مسنون، ان سے اور آپ سے بھی دعا کی درخواست۔

والسلام  
بقلم ضیاء الرحمن محمود

(۱۲)

۱۳ جنوری ۱۹۷۸ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مکرمی (۱) رید لطفکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تازہ ”الفرقان“ بابت جنوری میں خط و کتابت سے متعلق میری گزارش نظر سے گذری ہوگی۔ تاہم چند باتیں مختصر عرض کرتا ہوں۔

(۱) حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام ۱۶ سے ۳۳ تک مدینہ منورہ رہا۔ ان پر وہاں کے علمی حلقہ کے خیالات کے بعض خاص اثرات تھے۔ اس زمانے کے علماء حرمین کی غالب اکثریت شیخ محمد بن عبد الوہابؒ بلکہ شیخین ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ سخت رائے رکھتی تھی۔ اس کا آئینہ شیخ احمد زینی دحلان مکی کی ”ز بہت پہلے ابن حجر مکی ہیثمیؒ شیخین کے بارے میں سخت رائے نہ ہے۔ ہم اس رائے کو دلائل اور واقعات کی روشنی میں غلط ہمارے سب اکابر ان دونوں کو اکابر علمائے امت میں سمجھتے ہیں۔

(۲) شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی اس رائے کا مجھے علم ہے کہ وہ ان کے علم کے قائل نہیں تھے۔ ”فیض الباری“ میں شاہ صاحب کے سخت الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے اس رائے کا اظہار فرمایا ہو۔ آپ کے علم میں ہے کہ انہوں نے قاضی شوکانی کے بارے میں بھی اسی طرح کی کوئی بات فرمائی تھی۔ مجھے اس سلسلہ مضمون میں جو الفرقان میں لکھا جا رہا ہے انشاء اللہ وہ لکھتا ہے جسکو میں صحیح سمجھتا ہوں۔

(۳) سماع موتی کا مسئلہ صحابہؓ کے زمانے سے مختلف فیہ رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا اس بارے میں جو نقطہ نظر ”فیض الباری“ میں نقل کیا گیا ہے وہ اس عاجز کے نزدیک صحیح اور قابل قبول ہے۔

(۴) ما اهلہ لہ لعیر اللہ کی تفسیر میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے میرے علم میں ہماری جماعت کے اکابر کا یہی مسلک ہے۔ یعنی یہ کہ وہ جانور حرام ہو جاتا ہے۔ علماء بریلی کو شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی اس تحقیق سے اختلاف ہے۔ ”تفسیر عزیزی“ کا

مطالعہ فرمایا جائے۔

(۵) مولانا بنوریؒ پر میں نے جو لکھا اس میں دو چیزیں قابل اصلاح ہیں۔ ایک یہ کہ میں نے ”بنور“ کو پشاور کا ایک قریہ لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ بنور ریاست پٹیالہ (مشرقی پنجاب) میں ایک قصبہ تھا۔ شیخ آدم بنوری وہاں آکر مقیم ہوئے تھے۔ اسی کی طرف نسبت ہے۔ دوسرے یہ کہ میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ مولانا مرحوم ڈابھیل سے فارغ ہونے کے بعد کئی برس اپنے وطن صوبہ سرحد میں رہے۔ وہاں مدرسہ بھی قائم کیا۔ بعد میں (غالباً ۱۳۵۲ھ میں) ڈابھیل جامعہ اسلامیہ میں بلائے گئے۔

(۶) شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے شاہ صاحب سے پڑھنے کی بات یقیناً غلط ہے۔ اس بارے میں تفصیل سے لکھنے کی وقت میں گنجائش نہیں ہے۔

(۷) دیوبند کے جلسہ دستار بندی میں فارغین کی تعداد کے بارے میں اگر ”نقش حیات“ میں ایک ہزار والی بات لکھی ہے تو پھر میری اطلاع قابل اعتماد نہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند سید محبوب رضوی (مؤرخ) کو خط لکھ کر دریافت کر لیں۔ وہ بالکل صحیح بتا سکیں گے۔ معذرت: میں خط لکھانے کے بعد پڑھ نہیں سکا ہوں۔ خط و کتابت سے بالکل معذور تصور فرمایا جائے۔ ”الانور“ سے متعلق مفتی صاحب اور مولانا اکبر آبادی اچھے مشورے دے سکیں گے، آپ کو دہلی جانا ہی ہے۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی  
بقلم (عبید الرحمن سنبھلی)

(۱۳)

لکھنؤ

ناسمہ سحانہ تعالیٰ

۲۶ نومبر ۱۹۹۱ء

برادر عزیز و مکرم مولانا فرید الوحیدی صاحب! رید لطفکم

سلام و رحمت — امید ہے کہ آپ بخیرت دہلی پہنچ گئے ہوں گے۔ اور بعافیت ہوں گے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ (۱) پر جو کتاب آپ نے لکھی ہے آپ نے خود ہی بتلایا تھا کہ اسکی کتابت بھی ہو چکی ہے اور یہ کہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے حضرت کے سیاسی مخالفین (مسلم لیگ کے زعماء اور ڈاکٹر اقبال وغیرہ) کے بارے میں الفاظ کو نرم کرنے کا مشورہ دیا ہے جس کو ایک حد تک آپ نے قبول بھی کر لیا ہے۔

درمیان کے ان چند دنوں میں میں نے کئی دفعہ ا

پہنچا کہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک عقیدتمند اور بنا  
بھائی ہونے کی حیثیت سے اس بارے میں اصرار کے ساتھ آ

کتاب کی تصنیف سے آپ کا خاص مقصد یہ ہو گا اور یہی ہو ماچے۔  
کے مقام و مزاج اور زندگی کے احوال سے واقف نہیں ہیں، واقف ہوں اور پہچانیں اور سبق لیں  
اور اگر اب تک حضرت کے بارے میں ناواقفی کی وجہ سے اُن کے جو غلط خیالات رہے ہیں ان کی  
اصلاح ہو۔

غالباً آپ کو بھی اس میں شبہ نہ ہو گا کہ اس مقصد کا تقاضا یہی ہے کہ وہ لوگ کتاب کو  
ٹھنڈے دل سے پڑھ سکیں۔

اس بارے میں میں نے گاندھی جی کی ایک بات سے سبق لیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے  
کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی اختلافی معاملہ کے بارے میں میں ایک آرٹیکل لکھتا ہوں پھر میں اس  
نقطہ نظر سے اُس پر نظر ثانی کرتا ہوں کہ اُس میں کوئی فقرہ ایسا تو نہیں لکھا گیا جس سے میرے  
مخالفین کا دل دکھے اور وہ میرے ہم خیال اور قریب ہونے کے بجائے اور دور ہو جائیں، اس نظر  
ثانی میں مجھے کبھی کبھی ایک فقرہ ایسا نظر آتا ہے جو میرے مخالفین کے لئے ناگواری کا باعث بن  
سکتا ہے لیکن مجھے یہ مشکل پیش آتی ہے کہ وہی فقرہ ادبی حیثیت سے پورے آرٹیکل کی جان ہوتا

ہے اور میرا دل اس کے نکالنے یا بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا لیکن میں اصل مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے دل پر جبر کر کے اُس فقرہ کو نکال دیتا ہوں۔  
گاندھی جی کی یہ بات اب سے کم از کم پچاس ساٹھ سال پہلے کہیں پڑھی تھی، یاد ہے کہ اُس میں یہ بات بہت مختصر الفاظ میں لکھی گئی تھی جس کو میں اس طول طویل عبارت میں ادا کر سکا ہوں۔

بعد میں ایک وقت خیال آیا کہ یہ سبق تو قرآن مجید کا دیا ہوا ہے، ولا تستوی الحسنة ولا السيئة، ادفع النألى همى احسن، فادأ الذى بىك وبىه عداوة كانه ولى حمىم، وما يلقاها الا الذى صبروا، وما يلقاها الا ذو حظ عظمى۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اُسی کی توفیق سے ممکن حد تک اس کے مطابق عمل کی کوشش کرتا ہوں۔ مودودی صاحب مرحوم کے بارے میں جو لکھا ہے آپ نے اُس کو تو پڑھا ہے اُس کے بعد ثمنی اور شیعیت کے بارے میں جو کچھ اللہ کی توفیق سے لکھا وہ بھی شاید آپ نے پڑھا ہو، ان دونوں کتابوں کے بارے میں مودودی صاحب اور ثمنی صاحب کے بہت سے معتقدین اور بعض شیعہ حضرات نے بھی جو اعتراف کیا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

بیماری کی اس حالت میں جو آپ دیکھ چکے ہیں جس میں میرے لئے مختصر خطوط لکھانا بھی آسان نہیں رہا ہے یہ طول طویل خط آپ کو لکھا رہا ہوں، صرف اس لئے کہ آپ کی کتاب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی مخالفین (مسلم لیگ کے زعماء وڈاکٹر اقبال کے معتقدین اور ہمارے تھانوی حلقہ کے حضرات بھی) ٹھنڈے دل سے پڑھ سکیں اور حضرت کے مقام کو پہچانیں اس طرح آپ کی محنت با مقصد اور بار آور ہو۔

اگر آپ میری طرح ”سفید ریش بزرگ“ نہ ہو گئے ہوتے تو میں خط کے خاتمہ میں لکھتا۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانان سعادأ مند پند پیر دانا را

والسلام  
محمد منظور نعمانی  
بقلم ضياء الرحمن محمود

(۱۴)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ  
لکھنؤ

۱۹ جون ۱۹۹۰ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر عزیز مکرم (۱) ا ریدت حساساتکم

سلام و رحمت — خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔ گذشتہ مہینے مئی کے شمارے میں آپ کا مضمون شائع ہوا تھا، اس کو پڑھوا کر سنا تو آپ کو میں نے خط لکھایا تھا، آپ کی طرف سے میرے اس خط کی وصولیابی کی اطلاع نہ ملنے سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ غالباً میرا خط آپ کو نہیں ملا، اس لئے مختصر اپنی رائے پھر لکھا رہا ہوں۔

آپ نے جس محنت اور تحقیق سے مضمون لکھا۔ بفضلہ تعالیٰ آپ کا تعلق دین کی دعوت اور امت میں دین کی کہ آپ نے محنت و تحقیق کے لئے ایسا موضوع منتخب کیا جس اور اس کی اصلاح کی فکر سے کوئی تعلق نہیں۔

میرے عزیز بھائی آپ نے اپنے اس مطالعہ میں محسوس کیا ہوگا کہ صحابہ کرام اور ان کے تابعین نے اس کام کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ کہ اب قیامت تک بھی یہ قطعی اور یقینی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ ولادت باسعادت کی تاریخ کیا تھی۔

میرے بھائی! امت جس میں ہم اور آپ بھی داخل ہیں، مریض ہے اور مرض بھی شدید سے شدید تر — اللہ تعالیٰ ہمیں آپکو توفیق دیں کہ علاج اور اصلاح حال کی فکر کریں اور جو محنت اس کے لئے کی جاسکے اس سے دریغ نہ کریں۔ یہ اس وقت کا جہاد ہے اللہ تعالیٰ توفیق دیں اور قبول فرمائیں تو اسکی رضا اور جنت کی امید ہے، رب کریم توفیق عطا فرمائے۔ دعاؤں کا محتاج اور دعا گو ہوں اس وقت حال یہ ہے کہ بمشکل یہ سطریں لکھا سکا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود

احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب

## معارف الحدیث

آسان اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ

مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ کی بے نظیر تالیف

جسے اللہ تعالیٰ نے بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے۔

اس میں

مولانا موصوف نے خاص طور پر ان احادیث کا انتخاب کیا ہے جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت محمدیہ کی ہدایت کا خاص

سامان ہے

پھر احادیث کی ترتیب و تشریح میں زمانہ کی نفسیات اور آج کے فکری ماحول کو

خاص طور پر سامنے رکھا ہے

اور مطمح نظر صرف یہ رکھا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اور دل متاثر ہو اور اس میں

وہ ذوق عمل پیدا ہو جو صحابہ کرام میں آپ کے ارشادات سے پیدا ہوتا تھا۔

سات جلدیں الحمد للہ شائع ہو چکی ہیں۔ قیمت کل ۱۷ جلدیں - 600/- روپے

آٹھویں اور آخری جلد انشاء اللہ آئندہ ماہ شائع ہو رہی ہے۔

یہ جلد کتاب العلم اور کتاب القصص اکل والنقاب پر مشتمل ہے۔

ناشر : الفرقان بکڈپو 141/31 نظیر آباد، لکھنؤ-226018

# توازن واعتدال

بنا

- ۱- جناب عتیق احمد طارق صاحب
- ۲- جناب بشیر احمد شاکر صاحب کشمیر
- ۳- مولانا محمد شعیب اللہ صاحب بنگلور
- ۴- مولانا یاسین علی صاحب ممباسہ، کینیا، مشرقی افریقہ





از: محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۳ جون ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

عزیز مکرم عتیق احمد طارق صاحب (۱) سلام و رحمت

آپ کا پورے پانچ صفحے کا خط ملا۔

آپ کو میرا حال معلوم نہیں، اس لئے معذور سمجھتا ہوں۔

کبر سنی کے شدید ضعف کے علاوہ مختلف امراض و عوارض اور ہائی بلڈ پریشر کے نتیجہ میں مستقل صاحب فراش ہوں، قریباً بارہ سال سے مسجد کی حاضری سے بھی محرومی ہے، میرا بستر ہی میری مسجد ہے۔ آنے والے خطوط اکثر دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں اور جواب لکھنا ضروری ہو تو دوسروں ہی سے جواب لکھاتا ہوں۔

جس مقصد کے لئے آپ نے اتنا طویل طویل خط لکھا۔

ضرورت نہ ہوتی، آپ یہ سمجھ کر اپنے آپ کو مطمئن کر سکتے۔ متعلق جو کچھ لکھا (جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے) وہ اپنے علم کے

اسکے خلاف جو ایک کتاب کے حوالوں سے لکھا ہے کتاب کے مصنف۔

مطابق لکھا ہے۔ ان صاحب کا جو حقیقی حال ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اللہ تعالیٰ اپنے علم ہی کے مطابق ان کے بارے میں فیصلہ فرمائے گا۔

اگرچہ بعض ایسے ثقہ لوگوں کے ذریعہ جو ان صاحب کے ساتھ آخری زمانہ میں بھی قریبی تعلق رکھتے تھے مجھے اسکے خلاف معلوم ہے جو آپ نے ایک کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے، لیکن مجھے بالکل اصرار نہیں ہے کہ میری معلومات صحیح ہوں، بلکہ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے میری معلومات غلط ہوں اور آپ نے ایک کتاب کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہو۔ آئندہ اس سلسلہ میں خط و کتابت سے بالکل معذور سمجھا جائے۔

لفرقان میں اپنے حال کا بار بار اعلان کیا گیا ہے اور مخلصوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ شدید ضرورت ہی سے اس عاجز کو خط لکھیں اور تاہم کان مختصر لکھیں۔ آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء

(۲)

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مخلص مکرم جناب بشیر احمد بیگ صاحب (۱) احسن اللہ تعالیٰ البکم والیہا  
سلام و رحمت! عنایت نامہ مورخہ ۱۲ اکتوبر موصول ہوا، معلوم ہوا کہ الفرقان آپ  
کے پاس جاتا ہے، آپ نے بار بار اس میں پڑھا ہو گا کہ میں بہت ضروری اور مختصر ہی خط و کتابت  
کر سکتا ہوں، اسکے باوجود آپ نے یہ عنایت نامہ تحریر فرمایا، میرا حال یہ ہے کہ آئیو الے خطوط  
دوسرے صاحب سے پڑھوا کر سنتا ہوں، اور جو خط لکھوانا ہوتا ہے وہ بھی دوسرے ہی سے لکھواتا  
ہوں، آپ کا یہ عنایت نامہ طویل جواب کو چاہتا ہے، مختصر عرض کرتا ہوں۔

حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ جس خدا ترس عالم دین نے جس زمانے میں مولانا مودودی  
مرحوم کے بارے میں یا کسی کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس وقت کے اپنے معلومات  
کی بنیاد پر کی ہے، مجھے کم از کم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ، مولانا سید مناظر احسن  
گیلانی علیہ الرحمۃ کے بارے میں معلوم ہے کہ ایک وقت ان حضرات نے مودودی صاحب  
مرحوم کے بارے میں بہت اچھی رائے کا اظہار فرمایا، اور دوسرے وقت اس سے بالکل مختلف۔  
میرے نزدیک یہ دیانتداری اور خدا ترسی کی بات ہے۔

خود میرا حال اور میری سرگذشت یہ ہے کہ میں نے ۳۳ء میں موصوف کا رسالہ  
ترجمان القرآن دیکھا اور اس کے مطالعہ سے برابر ان کی قدر بڑھتی رہی، پھر ایک وقت آیا کہ ان  
کے مضامین الفرقان کے صفحات میں برابر شائع ہوتے رہے، اور میرے قلبی تعلق میں اضافہ  
ہی ہوتا رہا، اسکا آخری درجہ یہ تھا کہ ۱۹۳۱ء میں میرے اور ان کے مشورہ سے طے ہوا کہ جماعت  
کی تشکیل کی جائے، چنانچہ ہم خیال حضرات کو دعوت دی گئی، لاہور میں مولانا موصوف کی قیام گاہ  
پر اجتماع ہوا، اس میں جماعت کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا، میں نے ہی مولانا موصوف کی امارت کی  
تحریک کی اور حاضرین سے کہا کہ اس جماعت کے امیر میں جو صلاحیتیں اور صفات ہونی چاہیں وہ  
ہمارے اس مجمع میں مجموعی حیثیت سے مولانا موصوف ہی میں ہم سب سے زیادہ ہیں۔ (یہ میرا  
اس وقت کا خیال تھا اور گویا میری اس مجمع کے سامنے مولانا موصوف کے بارے میں یہ شہادت  
تھی) چنانچہ حاضرین نے .... . میری تحریک اور تجویز کو قبول کر لیا اور

مولانا موصوف کو ہم سب نے امیر تسلیم کر لیا، مولانا نے خود ہی مجھے نائب امیر بنایا۔  
کچھ عرصے کے بعد مولانا موصوف کے بارے میں میرے معلومات اور خیالات میں  
فرق آنا شروع ہوا اور خیالات میں تبدیلی کا یہ عمل حالات کے ساتھ جاری رہا، اسکا آخری درجہ  
یہ تھا کہ میں نے اپنی سرگذشت کو تفصیل سے لکھا اور شائع کر دینا ضروری سمجھا۔

اب جب یہ بات علانیہ طور پر سامنے آئی کہ جن لوگوں کی ذہنی تربیت خود مولانا  
موصوف کی صحبت و رفاقت، اور ان کے لٹریچر کے مطالعے ہی سے ہوئی تھی، انھوں نے یہ  
معلوم ہو جانے کے باوجود کہ ٹمینی نے پوری صراحت اور صفائی کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت  
ابو بکر صدیق، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم دل سے ایک دن  
بھی ایمان نہیں لائے، وغیرہ وغیرہ، ٹمینی کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قاتل  
ملا دیئے اور اس کے برپائے ہوئے انقلاب کو خالص ”اسلامی انقلاب“

اپنے پروپیگنڈے کے تمام ذرائع صرف کر کے تمام مسلمانوں سے  
— تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس شر  
سے بچالیا، میرا یہ بھی خیال ہے اور میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ خود مولانا  
حالات میں تبدیلی کے ساتھ فرق آتا رہا، اپنے آخری دور میں انھوں نے وہ رویہ اپنایا۔ وہ  
پہلے شدت سے مخالفت اور تردید کرتے رہے تھے۔

اب وہ اس دنیا سے جا چکے، ان کا حق ہے کہ ہم ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں، یہ عاجز  
ان کے لئے حسب توفیق دعاء مغفرت کرتا ہے اور خود اپنے کو مغفرت کا سب سے زیادہ محتاج  
سمجھتا ہے۔

دعاؤں کا محتاج و طالب اور آپ کے لئے دعا گو ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

.....

۲۰ اگست ۱۹۸۷ء یکشنبہ

(۳)

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

محترمی و کرمی جناب مولانا محمد شعیب اللہ صاحب (۱) احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیا  
و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! عنایت نامہ مورخہ ۱۵ محرم الحرام موصول  
ہوا، غالباً الفرقان نظر سے نہیں گذرتا، اس میں بار بار اعلان کیا گیا ہے کہ میں ہائی بلڈ پریشر کا  
مریض اور اس کے علاوہ مختلف امراض و عوارض میں مبتلا ہوں، اس لئے بہت ضروری اور مختصر خط  
و کتابت ہی کر سکتا ہوں۔

بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خطوط پڑھوا کر سنتا ہوں اور جوابات دوسرے حضرات سے  
لکھواتا ہوں، آپ کا عنایت نامہ خود ہی پڑھا، اگر معذوری نہ ہوتی تو جواب کچھ تفصیل سے لکھاتا،  
اب مختصر ہی لکھا سکتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس کو نافع بنائے۔

میرا حال یہ ہے کہ بفضلہ تعالیٰ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی حیات کے آخر  
دور میں اور اسکے بعد طویل مدت تک دینی دعوت کے اس کام سے جو تبلیغ کے نام سے معروف  
ہو گیا ہے، قلبی اور عملی تعلق نصیب رہا، لیکن اب قریباً دس بارہ سال سے ایک ایکسڈنٹ کی وجہ  
سے اس حال میں ہوں کہ میرا بستر ہی میری مسجد ہے اسلئے اس دینی کام سے عملی تعلق سے گویا  
محرومی ہے، لیکن قلبی تعلق بفضلہ تعالیٰ نصیب ہے، اور کام کرنے والے حضرات سے رابطہ رہتا  
ہے۔

ہر دور میں کام سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں میں اس طرح کی غلطیاں رہی ہیں،  
جس طرح کی ایک غلطی کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے، جس زمانے میں کام کرنے والوں کی  
تعداد محدود، چند سو بھی نہیں تھی تو اس طرح کی غلطیوں میں مبتلا بہت کم لوگ نظر آتے تھے، اور  
اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کی اصلاح بھی جلدی ہو جاتی تھی، لیکن اب جب کام کرنے والے  
صرف ایک ملک ہندوستان میں لاکھوں ہیں، تو ایسی غلطیوں میں مبتلا لوگوں کی تعداد بہت زیادہ  
ہو نا قدرنی بات ہے۔ لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس طرح کی غلطیاں ان میں دعوت کے اس کام

نے پیدا کی ہیں؟ یا ان کی طبیعت اور مزاج میں ان کا مادہ پہلے سے موجود تھا؟  
میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر مطمئن ہوں کہ ہمارے زمانے کے عام مسلمانوں میں اس  
طرح کے فساد کا مادہ بہت عام ہے۔ میرے علم میں ہے کہ کام کے مرکز نظام الدین میں ہر  
علاقے کے خواص کو چند روز کیلئے بلایا جاتا ہے، ان دنوں میں کام کے اصول اور اس طرح کی  
غلطیوں کی اصلاح کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی جاتی ہے، بالخصوص دینی مدارس، علماء،  
و مشائخ، اور خانقاہوں کی عظمت دلوں میں بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مرکز سے اور اجتماعات سے جماعتوں کی روانگی کے وقت جو ہدایات دی جاتی ہیں ان میں بھی اس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور دعائیں اہتمام سے یہ جز شامل رہتا ہے، اسکے باوجود جیسا کہ آپ کا مشاہدہ ہے کام سے تعلق رکھنے والے عوام میں بہت سوں کے اندر اس طرح کی غلطیاں رہتی ہیں، اور اس عاجز کا خیال ہے کہ جب بھی ایسے عام وسیع پیمانے پر اجتماعات

ناگزیر ہے۔۔۔۔۔ اس صورت حال میں اس بات کو بہت دخل

بہت کم نصیب ہیں، اگر ہر شہر میں ایک دو عالم کام کی ذمہ داری

غلطیوں پر انشاء اللہ بہت کچھ قابو پایا جاسکتا ہے، لیکن یہ فطری بات

والے عوام اسی عالم دین سے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں، جن کو وہ دیکھیں کہ وہ اس سے کیا سیکھ رہے ہیں۔ (۱)

والسلام

محمد منظور نعمانی

بقلم محمد ضياء الرحمن محمود القاسمی

(۱) خط میں اسی مسئلے پر اور کچھ مشورے بھی تھے۔ مگر جگہ کی قلت کے پیش نظر بس اتنا ہی حصہ دیا جا سکا جس کا

اس مجموعہ خطوط کے عنوان سے تعلق تھا۔ (مرتب)

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(۴)

لکھنؤ (الہند)

۱۲ فروری ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مخلص مکرم محبت محترم جناب مولانا یاسین علی صاحب (۱)

احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیسا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خدا کرے آپ ہمہ وجہ بخیریت ہوں۔

انتہائی ندامت کے ساتھ آپ کو یہ خط لکھا رہا ہوں، جیسا کہ آپ کو الفرقان سے معلوم ہو تا رہا ہو گا کہ قریباً چار مہینے سے میں مریض ہوں، درمیان میں مرض شدید رہا اور کچھ دن ایسے گزرے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی زندگی کے آخری دن ہیں، پھر بفضلہ تعالیٰ افاقہ نصیب ہو گیا، اب اس حال میں ہوں کہ خطوط کے جوابات لکھا دیتا ہوں۔ آپ کا ایک عنایت نامہ بہت مدت پہلے (غالباً اکتوبر ۸۸ء) کا آیا ہوا اس زمانہ علالت کے جمع شدہ ڈاک میں رکھا رہا، اب تک اس کا جواب لکھانے کی نوبت نہیں آئی حالانکہ (آپ کے) اس (خط) کے جواب میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے تھی، لیکن تاخیر ہوئی اور کئی مہینے کی تاخیر ہوئی جس کو اپنی تفسیر سمجھتا ہوں اور معذرت خواہ ہوں۔

معارف الحدیث کی تمام جلدوں کی سوا حلی زبان میں ترجمے کی میری طرف سے اجازت ہے بلکہ میں اس کو اپنے ساتھ احسان سمجھوں گا اور شکر گزار ہوں گا۔

میں نے اپنے نزدیک ان احادیث کی تشریح میں مسلکی تعصب کی بنا پر بے انصافی نہیں کی ہے جن کا تعلق فقہی اختلافی مسائل سے ہے، ہاں یہ بات میرے پیش نظر ضرور رہی ہے کہ برصغیر ہند میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی غالب اکثریت جو حنفی المسلمک ہے اس کو اپنے مسلک کے بارے میں بے اطمینانی نہ ہو، میں نے اس کو دینی مصلحت سمجھا — آپ کے علم میں ہو گا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً فیوض الحرمین میں تحریر فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تین وصیتیں میرے ذاتی رجحان کے خلاف فرمائیں — ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اپنے ملک میں جا کر وہاں کے عامہ مسلمین کے رویہ کے خلاف رویہ (مسلک) اختیار کرنا — ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہی تھا کہ ان کے خلاف عمل کرنے سے امت میں انتشار پیدا

ہو — غالباً آپ کے علم میں ہو گا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں کہیں اپنے اسم گرامی کے ساتھ ”الحصی عملاً والشافعی درساً“ لکھا ہے۔

بہر حال اس صورت حال کا لحاظ کرتے ہوئے کہ سوا حلی زبان بولنے والوں کی اکثریت شافعی المسلک ہے، کتاب الصلوٰۃ میں یا جہاں بھی معارف الحدیث میں فٹ نوٹ لکھنے کی ضرورت سمجھی جائے وہ ضرور لکھا جائے، میرے نزدیک یہ بھی دینی مصلحت ہے — اگر مناسب سمجھا جائے تو کتاب کے شروع میں محترم مترجم صاحب کی طرف سے پیش لفظ یا مقدمہ کے طور پر جو کچھ لکھا جائے، اس میں اس عمل کا اور اسکے لئے خوش دلی سے میری اجازت کا ذکر کر دیا جائے۔

خود میرا حال یہ ہے کہ میں رفع یدین اور ترک رفع اور آمین بالجہر اور آمین بالسر دونوں کو ثابت بالنسۃ یقین کرتا ہوں، لیکن بیچارے ناواقف غیر عالم عوام کو انتشار اور بچانے کے لئے عمل خفی مسلک ہی کے مطابق کرتا ہوں لیکن والے کے عمل کو بھی ثابت بالنسۃ سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ جو آپ سے آپ کو اپنے سوال کا پورا جواب مل گیا ہو گا۔ آپ سے بھر کے لئے فلاح دارین کی دعا کرتا ہوں۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

## فیضی انٹرپرائزز

301 تھرڈ فلور، پرنس کامپلکس، حصرت گنج، لکھنؤ

نن 210702, 210702, 281650, 213392 فکس 228346 (0522)

ہجر 9610-206236

ملك اور بیرون ملك هوائی جہاز کے ٹکٹوں کے لئے رابطہ قائم کریں



## مسلمان بچوں کا کامیاب نصاب

آسان زبان اور دل نشین انداز

5/50	حضرت عمرؓ	3/-	اچھا قاعدہ
5/50	حضرت عثمانؓ	5/50	اللہ کے رسول
5/50	حضرت علیؓ	3/-	اچھی باتیں (حصہ اول)
6/-	حضرت خدیجہؓ	7/-	اچھی باتیں (حصہ دوم)
11/-	حضرت عائشہؓ	5/50	اچھی باتیں (حصہ سوم)
3/-	حضرت سودہؓ	7/-	اچھی باتیں (حصہ چہارم)
8/-	اچھے قصے	7/-	اچھی باتیں (حصہ پنجم)
5/50	آسان فقہ	8/-	اچھی باتیں (حصہ ششم)
6/-	ہمارا ایمان	5/50	حضرت ابو بکرؓ

مکتبہ دین و دانش، مکارم نگر، لکھنؤ

## تحقیق حدیث دجال پر ایک نظر

خليفة عبد الہیان اعظمی

ناشر عبد اللہ مکتبہ تحقیق، سلطان پور، گھوسی مٹو

یہ اکابر دیوبند و ندوۃ العلماء کی پسندیدہ و مقبول ترین کتاب ہے جس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے تحقیق کی خامیوں کو اجاگر کیا گیا ہے اور مولانا موصوف کی غلطی کو خود انہیں کی تحریر سے ثابت کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو بحث و تحقیق کے اعلیٰ معیار پر قائم ہے اور خروج دجال کے سلسلے میں مفصل و دل لعل بحث کر کے اس کو ہر اعتبار سے مسقح کر دیا ہے۔ اور ان طلبہ کے لئے معاون و مددگار ہے جو بحث و تحقیق و مناظرہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ نیز عقائد کو پختہ بنانے اور مضمرات سے بچنے کے لئے یہ کتاب نہایت ہی مفید و معاون و مددگار ہے۔

سائز 22x18/8 صفحات 268 قیمت 60/-

ناشر : عبد اللہ مکتبہ تحقیق سلطان پور، گھوسی مٹو

# حمیتِ حق

بنام

- ۱- جناب مولانا یعقوب کاوی، ڈیوڑری، یارک شائر، انگلینڈ
- ۲- ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی، ڈر بن یونیورسٹی، ڈر بن
- ۳- جناب عبدالرحمن کوندو، سری نگر۔ کشمیر
- ۴- جناب سید طاہر محمود، نئی دہلی
- ۵- جناب سید اصغر علی، بمبئی



(۱)

۱۹ مارچ ۱۹۸۰ء

ناسمہ سبحانہ

برادر مکرم محترم جناب مولانا یعقوب کاوی صاحب (۱) احسن اللہ الیکم والیبا

سلام و رحمت

گرامی نامہ مورخہ ۲۱-۲-۱۹۸۵ء کئی ہفتہ پہلے موصول ہو گیا تھا، طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے جواب اتنی تاخیر سے دے رہا ہوں، معذرت خواہ ہوں۔

(۱) میں 'المجمع الفقہی' کا رکن نہیں ہوں، رابطہ عالم اسلام، کراچی، مجلہ ۳ سیر ۳۰ رکن ہوں۔ اپنی معذوری کی وجہ سے دس سال سے اس کے کتبہ تھا، اس حال میں بالکل نہیں ہوں کہ ایسے سفر کر سکوں۔ ہمارے برصغیر پر اور پورے عالم اسلام میں پڑ رہے تھے جسطر نیم مردہ سے یہ کتاب لکھوائی اسی طرح انہی اثرات نے اس پر آمادہ کر دیا۔ فروری مارچ ۸۵ء کا الفرقان آج یا کل انشاء اللہ ڈاک سے روانہ ہو، ۱۵، ۱۷ سے اس اجمال کی تفصیل معلوم ہو جائے گی۔

(۲) دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے کتاب کو غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو کر دوسرا چھپ گیا ہے۔ پاکستان میں میری اجازت سے بلکہ میری خواہش پر ایک ادارہ نے اسکو چھاپا تھا، لکھا ہے کہ ڈھائی ہزار چھاپی تھی، تین ہفتہ میں ختم ہو گئی، وہاں بھی دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی اسکو میرے لئے وسیلہ مغفرت بنائے۔

(۳) شیعہ اثنا عشریہ کے کفر و ارتداد پر اب سے قریب ساٹھ سال پہلے ایک فتویٰ (۲) کی شکل میں شائع ہوا تھا اس پر اس وقت کے ہمارے تمام اکابر کی تصدیق و توثیق ہے۔ ارادہ ہے کہ ایک مقدمہ اور کچھ اضافہ کے ساتھ اسکو پھر شائع کیا جائے۔ اس دور کے ہمارے علماء کو بھی اسکا علم نہیں ہے۔ دعاؤں کا محتاج اور دعا گو ہوں۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی

(۲)

محمد منظور نعمانی

۲۷ جون ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر م مکرم و محترم ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی صاحب (۱)

احسن اللہ تعالیٰ الیکم و البیاء

و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عنایت نامہ مورخہ ۲۹ رمضان المبارک (۱۶ مئی) قریباً ایک مہینے پہلے موصول ہو گیا تھا اس سے بہت کچھ وہ معلوم ہوا جو معلوم نہ تھا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

آپ نے میری کتاب ”ایرانی انقلاب“ کے بارے میں جو اظہار خیال فرمایا ہے اس سے فطری طور پر مسرت ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس میں انکسار کو ذرہ برابر دخل نہیں کہ میں فطری طور پر مصنف اور صاحب قلم نہیں ہوں، ادیب بھی نہیں ہوں، میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت ہی محدود ہے، روزمرہ کی بول چال میں جو الفاظ استعمال کرتا ہوں وہی تحریر میں استعمال کرتا ہوں، جب کسی چیز کا داعیہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور اسکو ضروری سمجھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اسکی مدد سے کچھ ہو جاتا ہے۔ خاصکر اس کتاب کا معاملہ یہ ہے کہ میں نے یہ ایسی حالت میں لکھی کہ ہائی بلڈ پریشر اور بعض دوسرے امراض میں مبتلا کیوجہ سے لکھنے کے قابل نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا شدید داعیہ دل میں پیدا فرمادیا تھا اور اسی حال میں یہ کتاب لکھی ہے مقصد صرف یہی تھا کہ سنیوں کی نادانقہ دنیا خاصکر ہمارے علماء شیعیت کی حقیقت سے واقف ہو جائیں کیونکہ یہ بات آنکھوں کے سامنے آگئی تھی کہ ایرانی انقلاب کے بعد سے شیعیت ایک زندہ دعوت و تحریک بن گئی ہے اور پورا عالم اسلام اور خاصکر حرمین شریفین ان کا اویں نشانہ ہیں۔ ہاں دعا کا اہتمام بھی نصیب رہا، میں تمنا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کتاب کو یہ مقبولیت ہوگی، معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اشاعت کے بعد دو سال سے کم عرصہ میں پاکستان میں مختلف اداروں اور مکتبوں کی

(۱) ڈر بن یونیورسٹی، ڈر بن، ساؤتھ افریقہ۔ افسوس کہ مکتوب الیہ حال ہی میں انتقال فرما گئے۔ یہ ابتداء میں بہت پُر جوش حامی ”انقلاب ایران“ تھے۔ تبدیلی کس طرح آئی اس کا علم نہیں ہو سکا۔ شاید اسی کتاب کا اثر ہو، جیسا کہ اور بہت لوگوں پر ہوا۔

طرف سے اور اہل خیر حضرات کی طرف سے دولاکھ سے زیادہ اسکے نسخے شائع ہوئے۔ اس سے اپنے بارے میں بفضلہ تعالیٰ کوئی خوش فہمی نہیں ہوئی۔ میں اپنا حال جانتا ہوں اسلئے اسکو منجانب اللہ سمجھا (وما بکم من نعمۃ من اللہ)

(۳)

۱۹ مارچ ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مخلص محترم جناب عبدالرحمن کوندو صاحبہ  
سلام ور

خدا کرے آپ ہر طرح بعافیت ہوں۔  
قریباً ایک مہینہ ہو یا اس سے بھی کچھ زیادہ مدد  
مولانا رحمت اللہ میر صاحب نے اطلاع دی تھی کہ یہاں کسیریں  
پر چھاپہ مار کر میری کتاب ”ایرانی انقلاب خمینی اور شیعیت“ اور مولانا علی میاں کی کتاب ”دو  
متفاد تصویریں“ کے نسخے پولیس نے اٹھائے اور ضبط کر لئے۔  
مولوی رحمت اللہ میر صاحب نے اس اطلاع کے ساتھ علماء کے ایک اجتماع کی کاروائی  
اور اس سلسلہ میں ایک تجویز یا میمورنڈم بھیجا تھا۔  
یہاں جب اطلاع پہونچی تو مولانا علی میاں نے اس سلسلہ میں میر واعظ فاروق صاحب  
کو خط لکھا، جسکے جواب کا انتظار رہا۔ آج سے دو تین دن ہی پہلے مجلس مشاورت کا ایک جلسہ تھا،  
مولانا علی میاں تشریف لے گئے تھے آج ہی واپس آئے ہیں انھوں نے مجھے فون پر بتلایا کہ میر  
واعظ مولانا فاروق صاحب بھی جلسہ میں شرکت کیلئے تشریف لائے تھے میں نے ان سے اپنے  
خط کا ذکر کیا انھوں نے بتلایا کہ آپ کا خط مجھے نہیں ملا اصل معاملہ کے بارے میں انھوں نے بتلایا  
کہ پولیس میں جماعت اسلامی کے حلقہ کا جو عنصر ہے یا جو شیعہ افسر ہیں انھوں نے یہ کاروائی بطور  
خود کی ہے۔ حکومت کی سطح پر اس طرح کی کوئی کاروائی نہیں ہوئی، یہ بھی کہا کہ اب میں جا کر اس  
سلسلہ میں کوشش کروں گا۔

مولانا رحمت اللہ میر صاحب وغیرہ بعض حضرات کے خطوط سے قریباً ایک مہینہ پہلے جب میرے علم میں یہ بات آئی تھی تو خیال تھا کہ آپ بھی مجھے تحریر فرمائیں گے اور اس سلسلہ میں آپ حضرات نے کوئی کوشش فرمائی ہوگی، میں اس وقت سے برابر آپ کے عنایت نامہ کا منتظر رہا مگر یہ ہے کہ آپ نے تحریر فرمایا ہوگا جو ڈاک کی بد نظمی کے نتیجہ میں مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔

بہر حال یہ عریضہ اس لئے لکھا رہا ہوں کہ اس سلسلہ میں جو کارروائی کی گئی ہو اس سے مطلع فرمایا جائے یہ یقین ہے کہ آپ نے اور آپ جیسے حضرات نے کوئی کوشش ضرور فرمائی ہوگی۔

امید ہے کہ الفرقان برابر نظر سے گذرتا ہوگا اور مارچ کے شمارے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے الفرقان کی خصوصی اشاعت ”ضمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ“ کو، ویسی ہی مقبولیت عطا فرمائی جیسی میری کتاب ”ضمینی اور شیعیت“ کو عطا فرمائی گئی تھی، خود مجھ کو اسکی توقع نہیں تھی کیوں کہ تکفیر کے فتوے بہت بدنام ہو چکے ہیں، میں نے تو اپنا دینی اور ایمانی فرض سمجھ کر کیا تھا اور خیال تھا کہ بہت سے اپنے بھی شاید اسکو پسند نہ کریں لیکن اللہ کی شان میری پہلی کتاب ”ایرانی انقلاب ضمینی اور شیعیت“ کی اشاعت پر تو ملامت اور گالیوں کے سینکڑوں خطوط آئے تھے، جو زیادہ تر جماعت اسلامی کے حلقہ کے لوگوں کے تھے اور چند شیعہ صاحبان کے بھی، لیکن اس خاص نمبر کی اشاعت پر آج تک ایک خط بھی کسی صاحب کا نہیں آیا، جنہوں نے ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا ہو، یہ سب من جانب اللہ ہے، میں تو سمجھتا تھا کہ اس کی اشاعت پر ملامت کے تیروں کی مجھ پر بو چھا ہوگی، لیکن جیسا کہ عرض کیا اس طرح کا ایک خط بھی کسی کی طرف سے آج تک بھی نہیں آیا، فَلَلهُ الْحَمْدُ وَلَهُ الشُّكْرُ۔

بشرط ملاقات و یاد و سہولت مولانا مسعودی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، اُن سے اور آپ سے بھی دعا کی درخواست۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
محمد منظور نعمانی  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود قاسمی

(۴)

عزیز مکرم ڈاکٹر طاہر محمود (۱) احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیبا  
سلام ورحمت

خدا کرے آپ ہر طرح بعافیت ہوں۔  
میں آپ سے واقف ہوں اور آپ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ کے والد صاحب  
مرحوم و مغفور کے ذریعہ آپ کے جو حالات معلوم ہوتے رہتے تھے وہ بھی حافظہ میں ہیں۔  
امید ہے کہ آپ مجھ سے واقف ہوں گے اور میں آپ کو  
میں مریض ہوں۔ شروع دسمبر سے علالت شدید ہو گئی تھی،  
لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور کچھ اور مہلت دیدی۔ وہی ر  
واستغفار کے خاص اہتمام کے ذریعہ اپنی زندگی کی تقصیرات  
کی توفیق عطا فرمائے جو میرے لئے آخرت میں مغفرت و رحمت ہے  
میں اس وقت یہ خط ایک خاص مسئلہ سے متعلق لکھا رہا ہوں۔ خود لکھنے کے قابل نہیں  
ہوں، پچھلے دنوں شدید علالت کے دور میں ایک عزیز ایرانی حکومت کی طرف سے تہران سے  
نکلنے والا رسالہ 'راہ اسلام' لائے اور بتایا کہ اس میں انجم قدر صاحب کے نام آپ کا ایک خط شائع ہوا  
ہے وہ ان عزیز نے مجھ کو پڑھ کر بھی سنایا۔ اس وقت ارادہ کر لیا تھا کہ اگر زندہ رہا تو آپ کو اس  
سلسلہ میں کچھ لکھوں گا۔

غالباً آپ کے علم میں نہ ہو گا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں اثنا عشری مذہب کی حقیقت  
اور اسکے بارے میں متقدمین و متاخرین علماء کرام کے موقف سے عام مسلمانوں اور خاص کر عصر  
حاضر کے علماء کرام کو واقف کرانے کی کوشش ایک دینی فریضہ سمجھ کر اس عاجز نے کی ہے۔  
خود میرے لئے اسکا محرک کیا ہوا اور میں نے اسکو کیوں اپنا دینی فریضہ سمجھا یہ آپ کو  
القرآن کے ان دو خصوصی شماروں سے معلوم ہو جائے گا جو میں آپ کو انشاء اللہ بھجواؤں گا، میں  
آپ کو یہ زحمت دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان دونوں شماروں میں جو کچھ میرے قلم سے لکھا گیا



ہے آپ اسکو بغور ملاحظہ کریں اور بغیر اس لحاظ کے کہ میری عمر زیادہ ہے اور بغیر اس تعلق کے لحاظ کے جو آپ کے والد مرحوم و مغفور کا مجھ سے تھا، آپ کو جو غلطی نظر آئے بے تکلف اس کی نشاندہی کریں۔ ان دونوں شماروں میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بنیادی باتیں یہ ہیں۔

۱۔ کفر و اسلام کی حقیقت اور ان کے درمیان حد فاصل۔ اس بارے میں میں نے جو لکھا ہے اس میں اگر آپ غلطی محسوس کریں تو ضرور نشاندہی کریں۔

۲۔ میں نے اثنا عشریہ کی بنیادی کتابوں اور اسکے مستند ترجمانوں کی عبارتیں نقل کر کے ان کے صرف تین عقیدوں پر گفتگو کی ہے۔ (۱) یحییٰ (حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ) کے مومن ہونے سے انکار اور کفار و مشرکین کی طرح ان کے ”مخلد فی النار“ ہونے کا عقیدہ۔ (۲) قرآن مجید کے تحریف ہونے کا عقیدہ۔ (۳) یہ عقیدہ کہ امامت نبوت سے بالاتر ہے اور ہمارے بارہ اماموں کا درجہ تمام انبیاء سابقین سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

یہ تین عقیدے تمام علماء امت کے نزدیک موجب کفر ہیں۔ ان میں سے پہلے اور آخری عقیدے کا زمانہ حاضر کے اثنا عشریہ کو بھی انکار نہیں ہے۔ ان کے علماء مجتہدین ان دونوں عقیدوں کے بارے میں متفق ہیں۔ ہاں تحریف قرآن کے عقیدہ کا ہمارے دور کے اکثر علماء شیعہ انکار کرتے ہیں۔ لیکن ان کے علمائے متقدمین میں صرف چار وہ ہیں جنہوں نے عقیدہ تحریف سے انکار کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ کو الفرقان کے شماروں کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ خود ان کے اکابر علماء و مصنفین نے اسکا اقرار کیا ہے کہ ان حضرات کا انکار مصلحت کی بنا پر تقیہ کے طور پر تھا۔

الفرقان کے ان شماروں میں آپ یہ بھی ملاحظہ کریں گے کہ اثنا عشریہ، حضرات خلفاء ثلاثہ اور ان کے رفقاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کافر و منافق یا کم سے کم فاسق اور ظالم و غاصب اور دنیا پرست سونے کا جو عقیدہ رکھتے ہیں اس عقیدہ کیساتھ از روئے عقل بھی یہ بات ناممکن ہے کہ وہ قرآن کو تحریف سے محفوظ مان سکیں اور ہماری آپ کی طرح قرآن پر ان کا ایمان ہو۔ کیوں کہ یہ انکو بھی مسلم ہے کہ موجودہ قرآن کو انہی نے مرتب اور شائع کر لیا ہے۔

یہاں جو کچھ مختصر طور پر میں نے لکھ لیا ہے آپ اسکو انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ الفرقان کے شماروں میں پڑھیں گے۔ میری ان باتوں میں جہاں آپ کو غلطی نظر آئے اسکی ضرور نشاندہی کریں۔ میں بہر حال ایک بشر ہوں، مجھ سے غلطی ممکن ہے، اگر میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے اس بارے میں غلطی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یقین کیساتھ امید ہے کہ

میں آپ کی نشاندہی کے شکریہ کے ساتھ الفرقان میں اپنی غلطی کا اقرار و اعتراف اور اس سے رجوع شائع کر دوں گا۔ الفرقان کی طویل زندگی میں کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔

میں اس حال میں اس وقت نہیں ہوں کی کسی سے بھی اس مسئلہ پر کوئی بحث کر سکوں اور اس تحریر کا مقصد ہرگز بحث و مباحثہ نہیں ہے، بلکہ صرف یہی چاہتا ہوں کہ آپ اگر غلطی محسوس کریں تو اسکی نشاندہی کر دیں، امید ہے کہ آپ کی مختصر تحریر بھی انشاء اللہ میرے لئے کافی ہوگی۔

الفرقان کے جو خصوصی شمارے آپ کو بھیجے جا رہے ہیں جنکا براہ راست تعلق تکفیر کے مسئلہ سے ہے ان کے مطالعہ سے یہ بھی آپ کو معلوم ہو گا کہ اسلسلہ میں سب سے پہلے میں نے اس موضوع سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں صرف اثنا عشریہ کی بنیادی اور مستند کتابوں سے مذہب شیعہ کو پیش کیا گیا تھا۔ جنمینی صاحب کے :

ان کی کتاب ہی سے لکھا گیا تھا۔ اس میں نے شیعہ مذہب کی تردید بھی نہیں کی تھی بس صرف خاص کر تعلیم یافتہ اہل کیلئے ان چیزوں کو پیش کر دیا گیا تھا۔ آپ اگر اس کا مطالعہ کر۔

مل جائے گی ورنہ لکھ دیا جائے میں انشاء اللہ یہاں سے بھجوادوں گا۔ ۔ ۔ ۔ پ ۔

بھی مطالعہ فرمائیں لیکن الفرقان کے ان دو شماروں کے مطالعہ کے بعد۔

اگر ایرانی حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل آپ کی نظر سے گزرتے ہوئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اس عاجز اور محترم مولانا علی میاں کے بارے میں مسلسل پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں سعودی حکومت کے ایجنٹ ہیں جیسا کہ مختلف لوگوں نے مجھ سے بیان کیا ہے

امید نہیں ہے کہ آپ اس طرح کی بدگمانی کریں گے لیکن احتیاطاً آپ کو لکھتا ہوں آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ سعودی عربیہ ہی میں نہیں بلکہ تمام خلیجی حکومتوں میں شیعیت کے خلاف تقریر و تحریر کی سخت ممانعت ہے۔ میری کتاب جسکا میں نے اوپر ذکر کیا اسکا داخلہ سعودی مملکت میں گزشتہ سال تک ممنوع تھا اور خلیجی ممالک میں اب بھی ممنوع ہے۔

گلو جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے

کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

شیعہ حضرات کی جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے میرا اندازہ ہے کہ وہ آپکو دہلی

لا بُریریوں میں آسانی سے مل جائیگی۔ میرے پاس وہ سب موجود ہیں ہر حوالہ دیکھا جاسکتا ہے۔  
 والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
 دعا گو اور دعاؤں کا محتاج  
 محمد منظور نعمانی  
 (بقلم عبید الرحمن سنہ صلی)

(۵)

محمد منظور نعمانی  
 ۲۴ رذی الحجہ ۱۴۱۷ھ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ  
 عنایت فرمائے بندہ جناب سید اصغر علی صاحب (۱)  
 سلام و رحمت

اب سے قریباً پچاس سال پہلے پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوخ عمری کا اردو ایڈیشن شائع ہوا تھا، میں نے اسی زمانے میں اسکو دیکھا تھا، شاید آپکو معلوم ہو جواہر لال نہرو لاندھب تھے، انھوں نے اپنی اس سوخ حیات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندو مذہب... عجیب مذہب ہے، اس سے کسی طرح پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، میں کہتا ہوں کہ میں کسی مذہب کو نہیں مانتا، ہندو دھرم کو بھی نہیں مانتا، لیکن میں پھر بھی ہندو ہوں۔

واقعہ ایسا ہی ہے، سناتن دھرمی جنکا دین و مذہب مورتی پوجا (بت پرستی) ہے وہ بھی ہندو، اور آریہ سماج جو مورتی پوجا کا کھنڈن کرتے ہیں اور اسکو مہاپاپ سمجھتے ہیں، وہ بھی ہندو۔ چار ویدوں کو خدا کی الہامی کتاب ماننے والے آریہ سماجی بھی ہندو اور ان ویدوں کو خرافات کا مجموعہ کہنے والے جینی بھی ہندو، الغرض ہندو ہونے کیلئے کوئی عقیدہ ضروری نہیں، آپ مذہب اسلام کو بھی ہندو دھرم ہی کی طرح سمجھتے ہیں کہ بارہ اماموں کو سب نبیوں سے افضل ماننے والے شیعہ اور خاص طور سے خمینی بھی مسلمان ہیں اور اس عقیدے کی بنیاد پر انکو کافر اور دائرۃ اسلام سے خارج سمجھنے والے علماء بھی مسلمان ہیں، قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کی محفوظ کتاب مجید ماننے والے ہم لوگ بھی مسلمان ہیں اور اسکو محرف اور مبطل ماننے والے شیعہ بھی مسلمان ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمانؓ اور دیگر اکابر صحابہ جنکے

مومن صادق اور جنتی ہونے کی شہادت قرآن مجید نے دی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں ان کے فضائل و مناقب بیان فرمائے اور ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی ان کو ایسا ہی سمجھنے والے ہم لوگ بھی مسلمان ہیں اور ان کو کافر و منافق بتلانے والے خمینی اور ان کے ہم مذہب شیعہ بھی مسلمان ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کو (معاذ اللہ) کافرہ اور منافقہ کہنے والے اور لکھنے والے شیعہ بھی مسلمان ہیں اور قرآن پاک کے الفاظ میں ان کو امہات المومنین اور رسول اللہؐ کی پاک اور مقدس اور واجب الاحترام بیویاں ماننے والے سنی بھی مسلمان ہیں۔ خمینی کو اتحاد اور وحدت اسلامی کا داعی وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جسکو اللہ نے دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والی عقل نہ دی ہو، سات آٹھ سال سے مسلسل عراق سے جنگ ہو رہی ہے، جس میں دونوں طرف سے لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتر چکا۔

ہی کہتے تھے اور جنگ بندی کی ساری کوششیں صرف خمینی کی ہے پھر ہر سال حج کے موقعہ پر خمینی کے بھیجے ہوئے ایرانی فساد برپا کرتے ہیں اور اس سال جو فساد برپا کیا اس سب کا ذمہ اسلامی کا علمبردار ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اس نے ہم کو دیکھنے والی آنکھیں، حقائق کو سمجھنے والی عقل بھی، آپ نے سکھوں کی مثال دی ہے کہ ہم مسلمانوں کو سکھوں سے سبق حاصل کرنا چاہئے، کیا کوئی ہوش و عقل رکھنے والا ایسی بات کہہ سکتا ہے؟ سکھ کیا کر رہے ہیں؟ وہ اپنے پڑوسی بے قصور ہندوؤں کو قتل کر رہے ہیں، لوٹ مار کر رہے ہیں، بسوں کو روک روک کر ہندو مسافروں کو اتار کر ان کو گولیوں سے موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جو سکھ ان کے اس قتل و غارتگری میں ان کے ساتھ نہیں ہے، ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔

آپ کا مشورہ یہ کہ ہم مسلمان بھی یہی راستہ اختیار کریں، جو شخص دین اسلام کی حقیقت اور اسکے حدود سے اتنا واقف ہو اور عقل و خرد سے اتنا محروم ہو وہ اسکا مستحق ہے کہ اسکو مشورہ دیا جائے کہ وہ دین اسلام کی حقیقت اسکی حدود، اور احکام کا علم حاصل کر لے، اور اسکے لئے عقل سلیم کی دعا کی جائے۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی



محمد منظور نعمانی، لکھنؤ

۱۵ مارچ ۱۹۸۸ء

(۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

برادر مکرم (۱) ! احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیا ووفقا لما یحبه ویر صاہ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا ملفوف مکتوب مورخہ ۱۸ فروری وقت پر مل گیا تھا، اور میں نے کسے سے پڑھوا کر سن بھی لیا تھا لیکن جو میرے عزیز خطوط کے جوابات تھے وطن ہفتہ عشرہ کی نیت سے گئے تھے اللہ کی مشیت کہ وہاں جا بعد پر سوں واپسی ہوئی ہے، اس زمانہ کی ڈاک جمع ہوتی رہی، میں رکھا رہا، کل سے جمع شدہ ڈاک کے جوابات ان سے لکھا رہا ہوگی، امید ہے کہ معذور تصور کریں گے

آپ نے میری لکھی ہوئی بعض تحریروں کا حوالہ دیکر میرے بارے میں جس حسن ظن کا اظہار فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس طرح کی تحسیات سے اس عاجز کو اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی، میں فطری طور پر صاحب قلم اور مصنف نہیں ہوں جو کچھ لکھا گیا وہ اللہ تعالیٰ نے لکھوا دیا۔ فله الحمد ولہ الشکر۔

کرم نامہ میں دارالعلوم دیوبند سے متعلق میرے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا اور دریافت کیا ہے اس سے اندازہ ہوا کہ بہت سے دوسرے حضرات کی طرح آپ بھی واقعات سے بہت ہی ناواقف ہیں، اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے۔

میں یہ سطوریں لپٹے لپٹے اس حال میں لکھا رہا ہوں کہ گذشتہ رات نیند بہت کم آئی صبح اس کمی کو پورا کرنے کیلئے خواب آور دو اکھائی، کوئی اثر نہیں کیا، صفائی سے کہنا ضروری سمجھتا ہوں اگر آپ کے بارے میں حسن ظن نہ ہوتا تو دارالعلوم کے بارے میں ایک لفظ بھی لکھنا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن چونکہ خاص طور سے آپ کے اس مضمون کی وجہ جو آپ نے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات پر لکھا ہے، آپ کے بارے میں ایک اچھا تصور

وقت اب تک نہ آسکا۔ پچھلے دنوں جناب کی شدید علالت اور علاج کیلئے دہلی ہسپتال میں داخلہ کی خبر اخبار میں پڑھی تھی تو ارادہ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپکو صحت عطا فرمائے تو اب کسی وقت کا انتظار کئے بغیر ہی عریضہ لکھوں گا۔ کل ایک صاحب ملے جو حال ہی میں دیوبند گئے تھے اور جناب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے انھوں نے جناب کے ضعف و نقاہت کا حال بتایا تو اب وہ سب کچھ لکھنے کا ارادہ ترک کر کے جو لکھنا چاہتا تھا اسوقت صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دارالعلوم کے سلسلہ میں بد قسمتی سے جو اختلاف ہمارے درمیان پیدا ہوا جسکا کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مجلس شوریٰ کے ایک رکن کی حیثیت سے میرا بھی اس میں حصہ رہا، اس سلسلہ میں میں نے جو لکھا، باعماً کیا اگرچہ یہ سمجھ کر لکھا، باکیا کہ یہ دارالعلوم اور جماعت کا مجھ پر حق ہے اور اگر میں نے اس میں کوتاہی کی تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اسکی جواب دہی کرنی پڑیگی۔

تاہم میں بشر ہوں، خطا اور نفس و شیطان کے شر سے محفوظ نہیں ہوں (وما ابری نفسی ان النفس لامارة بالسوء) بالکل ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں جناب کے حق میں مجھ سے تعدی (زیادتی) ہوئی ہو۔ اس کے لئے عاجزانہ طور پر معافی کا طالب و سائل ہوں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”ولیعصوا ولیصمحو الاً تحبون ان یعمر الله لکم“ کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاف اور آخرت کے مواخذہ سے بری فرما کر اس عاجز پر احسان فرمائیں گے۔

اس اختلاف کے زمانے میں بھی اپنے لئے باعث خیر و سعادت سمجھ کر جناب کے لئے بھی دعا کرتا رہا ہوں اور خود دعا کا محتاج و طالب ہوں۔ مکرر عرض ہے کہ جناب کے ضعف و نقاہت کا جو حال معلوم ہوا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس وقت صرف اتنا ہی عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ جناب کو اپنے فضل و کرم سے صحت و توانائی عطا فرمائے تو انشاء اللہ اصلاح ذات البین ہی کی غرض سے وہ چند باتیں عرض کروں گا جو عرض کرنا چاہتا تھا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اس کا موقع عطا فرمائے۔ اور اس کو میرے لئے جناب والا کے لئے اور دارالعلوم اور پوری جماعت کے لئے نافع بنائے۔ وما هو علی اللہ معیر۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی

(۳)

۱۴ جون ۱۹۸۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر مکرم و محترم جناب مولانا مرغوب الرحمن صاحب (۱)

احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیبا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے مزاج بعافیت ہو اور دارالعلوم ط۔ ط۔ ط۔  
خیریت ہو، اسوقت تو دارالعلوم میں داخلہ کا سلسلہ جاری ہوگا، اللہ  
فرمائے۔

ماہ مبارک میں آپ کا عنایت نامہ مل گیا تھا جس سے ر۔  
کی حاضری کی سعادت کا حال معلوم ہو گیا تھا، میں نے اس کے  
جس میں عرض کیا تھا کہ لکھنؤ تشریف آوری کا ارادہ جلدی نہ فرمایا جائے، میں دور دورہ میں  
تک زیادہ مصروف رہوں گا، اب تو شوال ختم ہو رہا ہے اور میری مصروفیت اب تک ختم نہیں  
ہو سکی، جس کام میں مشغول ہوں، اللہ تعالیٰ اسکو آسان فرمائے، انجام تک پہنچائے اور قبول  
فرمائے۔

پرسوں ہی جناب حاجی علاؤ الدین صاحب کے حادثہ انتقال کی اطلاع ہوئی، اللہ تعالیٰ  
کامل مغفرت و رحمت سے نوازے، بہت ہی باتوفیق بندے تھے، ہر کار خیر میں پورے اخلاص و  
لنہیت کے ساتھ حصہ لیتے تھے، برسوں سے قلب کے مریض تھے، لیکن اسی حال میں دینی  
تقاضوں پر برابر سفر کرتے تھے، اُن کی رحلت کا حادثہ دارالعلوم کے لئے بھی بڑا حادثہ ہے، میرا  
ان سے تعلق قریباً چالیس سال سے تھا، میں نے ان کو بہت ہی مخلص اور بے مثال آدمی پایا، عالم  
فاضل کچھ نہ تھے، عامی تھے، لیکن دین کا فہم اور عام معاملہ فہمی بھی اللہ تعالیٰ نے خاص درجہ کی  
عطا فرمائی تھی، ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ بھئی اور سبکدات کے اپنی جماعت کے تمام اہل خیر و  
مخلصین کا اعتماد ان کو حاصل تھا۔



جب تک میں سفر سے معذور نہیں تھا بعض سالوں میں کئی کئی دفعہ بمبئی جانا ہوتا تھا، اب قریباً بارہ تیرہ سال سے بمبئی جانا نہیں ہو سکا اسلئے میں نہیں جانتا کہ ان کے حلقہ کے کون صاحب انکا بدل ہو سکتے ہیں، دارالعلوم کے لئے یہ مسئلہ بہت اہم ہے، میرا خیال ہے کہ اس بارے میں سب سے زیادہ رہنمائی مولانا محمد عمر پالنہری صاحب سے حاصل ہو سکے گی، اللہ تعالیٰ دارالعلوم کو ان کا بہتر بدل عطا فرمائے۔

آپ سے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ پر کاموں کا بوجھ بہت زیادہ ہے، فطری طور پر کام اور فکر کا اثر صحت پر پڑتا ہے، کسی بھی مناسب آدمی کو منتخب کیجئے جو کاموں میں آپ کا معاون بن کر بوجھ ہلکا کر دے۔

میرا خیال ہے کہ شوال میں دارالعلوم میں آپ کی موجودگی خاص طور سے ضرور رہتی ہے۔ انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں اُس کام سے فارغ ہو جاؤنگا، جس میں مشغولیت رہتی ہے اسکے بعد اگر آپ کے لئے لکھنؤ تشریف لانا آسان ہو تو ضرور تشریف لائیں۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ میری معذوری اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ سفر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، والحمد للہ علی کل حال۔

دارالعلوم کے حالات تو انشاء اللہ آپ کی تشریف آوری پر ہی معلوم ہو سکیں گے، حسبِ توفیق دعا کا اہتمام نصیب ہو جاتا ہے، خود دعاؤں کا سخت محتاج و طالب ہوں۔

والسلام  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۴)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۵ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

محترمی و معظمی جناب مولانا مرغوب الرحمن صاحب رید مجد کم السامی

السلام علیکم ورحمۃ الہ وبرکاتہ

دو تین دن پہلے مولانا اسعد میاں تشریف لائے تھے، ان سے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ شوریٰ کا اجلاس غالباً صفر کے پہلے ہفتہ میں ہوگا، کل دعوت نامہ۔ اطلاع نامہ بھی پہنچ گیا۔

مستقل ضعف اور امراض و عوارض کے علاوہ ادھر کئی دن سے طبیعت خراب چل رہی ہے، اسلئے اس وقت صرف اتنا ہی لکھاتا ہوں کہ ایجنڈے میں ایک دفعہ یہ بھی لکھ دی جائے کہ محمد منظور نعمانی کا خط اور قابل غور تجویز۔

میں جلدی ہی وہ خط لکھا سکوں گا — میرے سامنے کوئی نئی بات بھی نہیں ہے، لیکن دارالعلوم کے حق میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے وہ ارکان حضرات جو سفر کر کے اجلاس شوریٰ میں شرکت سے معذور ہو چکے ہیں وہ مستغنی ہو کر جگہ خالی کر دیں اور باہم مشورہ اور غور و فکر سے ان کی جگہ دوسرے ارکان منتخب کر لئے جائیں اور دارالعلوم کی مصلحت کا اگر یہ تقاضا ہو (اور غالباً ہوگا) کہ ان کا تعلق دارالعلوم سے بانی رہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ایسے حضرات ارکان کو مشیر خصوصی یا مشیر اعزازی یا سرپرست اعزازی بنادیا جائے۔ یہ عذر صحیح نہیں ہے کہ دستور میں اس عہدہ کا کہیں ذکر نہیں۔

عرض کر چکا ہوں، مجلس شوریٰ کے اختیارات کے آخری دفعہ — پورا اختیار دیا گیا ہے — اس سے پہلے مجلس نے آپ کو مد بعد مولانا عبد المالک کاندھلوی اور مولانا عبد القادر آزاد کے نے کی تھی اس میں مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کو مد دستور میں نہ مددگار مہتمم کا کوئی عہدہ ہے اور نہ صدر مہتمم کا — یہ دونوں ٹیلے سی اختیار بنی پر کئے گئے تھے جو دستور میں مجلس کے اختیارات کے کے آخری دفعہ میں دیا گیا ہے۔ میں نے مولانا اسعد میاں سے اس بات کا تفصیل سے ذکر کیا تھا اور اصرار کیا تھا۔ اس سلسلہ گفتگو میں مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ حکیم عبد الجلیل صاحب سے بھی استعفا لیا جاسکتا ہے۔

مجلس شوریٰ کے ہونے والے اجلاس میں مرحوم و مغفور حاجی علاؤ الدین صاحب کی جگہ رکن کے انتخاب کا مسئلہ بھی سامنے آئیگا، میں پہلے بھی غالباً آپ کو لکھ چکا ہوں کہ اس سلسلہ میں مولانا محمد عمر پالنپوری صاحب سے ضرور رہنمائی حاصل کی جائے، میرا ارادہ بھی خط کے ذریعہ مولانا موصوف کی رائے دریافت کرنے کا ہے۔

آپ نے اپنے گرامی نامہ میں لکھنؤ تشریف آوری کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا، اگر تشریف آوری ہوئی تو تفصیلی باتیں ہو سکیں گی۔

دارالعلوم کی برابر فکر رہتی ہے، اب اس وقت اس عاجز کی سب سے بڑی فکر یہی ہے

لیکن یہ معذور، دور افتادہ بس آپ حضرات کو مشورہ ہی دے سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہی کر سکتا ہے۔۔۔ دارالعلوم کے لئے اور آپ کے لئے دعا کی توفیق برابر ملتی رہتی ہے لیکن اللہ پاک کی ذات بڑی بے نیاز ہے، پھر بھی اسکی رحمت اور اسکی صفت، بندوں کی دعاؤں کی استجابت پر نظر رکھتے ہوئے، ہمکو امید کے ساتھ دعا کرنی چاہئے، انہ سميع مجيب الدعوات خود دعاؤں کا تخت محتاج و طالب ہوں۔

والسلام  
بقلم محمد ضياء الرحمن محمود القاسمی

(۵)

۱۶ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

۲۹ ستمبر ۱۹۸۸ء

بسم الله الرحمن الرحيم

محترمی و معظمی مولانا مر غوب الرحمن صاحب! احسن الله تعالى اليكم واليا  
و عليكم السلام ورحمة الله وبركاته!  
گرامی نامہ مورخہ ۱۷ ستمبر ۸۳ صفر المظفر موصول ہوا، اس میں جو کچھ تحریر فرمایا گیا ہے علم میں آیا۔

میں کئی سال سے آپ حضرات سے اصرار کر رہا ہوں کہ جو ارکان اپنی معذوریوں کی وجہ سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں شرکت نہیں کر سکتے اُن سے استعفا حاصل کر کے ان جگہوں پر ارکان کا انتخاب کر لیا جائے، میں نے اب سے دو تین سال پہلے جب استعفا پیش کیا تھا تو غالباً یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ استعفا منظور ہو جانے کے بعد میں خود ان حضرات سے اس کے لئے درخواست کر سکوں گا، اور میں ایسا ہی کرتا لیکن جب تک میں خود معذوری کے باوجود رکن ہوں مجھے کسی دوسرے سے درخواست کرنے کا کوئی جواز نہیں، اس لئے بھی میں مناسب سمجھتا ہوں کہ میرا استعفا قبول فرمایا جائے۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ مولانا مفتی منظور احمد صاحب کانپور واپس ہونے کے بجائے رائے پور تشریف لے گئے، اس طرح ان کو بذریعہ کار رائے پور سے لایا جاسکا ورنہ مجلس تو مالتوی ہو چکی تھی۔

صورت حال یہ ہے کہ میں اور میری طرح کم سے کم تین حضرات اور ہیں جو معذوری کیوجہ سے دیوبند تک سفر نہیں کر سکتے اور دو تین حضرات ایسے ہیں جن کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ وہ شرکت کا ارادہ ہی نہیں فرمائیں گے، ایسی صورت میں ممکن ہے کہ بار بار کورم پورانہ ہونے کیوجہ سے التواء کا فیصلہ کرنا پڑے اور ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بہت نامناسب اور موجودہ نظام کے لئے بہت مضر ہے۔ اب میری اصرار کے ساتھ رائے ہے کہ شوریٰ کے آئندہ جلسہ سے پہلے کم از کم دو حضرات کا استعفا حاصل کرنے کی کوشش کر لی جائے جو امید ہے کہ بخوشی اس کے لئے راضی ہو جائیں گے، اور آئندہ شوریٰ کے ایجنڈے میں ان کے استعفا اور بصورت منظور کی ان کی جگہ انتخاب کا مسئلہ بھی درج ہو، اگر ایسا نہیں ہوا تو میں دارالعلوم کی خیر خواہی کا حق اور اپنا فرض سمجھوں گا کہ اپنی طرف سے قطعی طور پر استعفا پیش کر دوں اور اس کے ساتھ اپنے جیسے دو تین معذور حضرات سے درخواست کروں اور ان کو اسے استعفیٰ کا فونو کالی بھی بھیج دوں۔

مولانا غلام رسول خاموش صاحب کے انتخاب کی:-

غالباً لکھ چکا ہوں کہ میں خود ان صاحب سے واقف نہیں

علاؤ الدین صاحب کے صاحبزادوں کے علاوہ بمبئی اور گجرات۔

میں مشورہ حاصل کیا تھا، سب نے انھیں کا نام بتایا، اللہ تعالیٰ ان کے انتخاب و دارالعلوم میں خیر کا باعث بنائے۔

گرامی نامہ سے مقدمہ کی صورت حال معلوم ہوئی، کل ۲۸ کو فریق ثانی کا جواب داخل ہو چکا ہو گا اور ۴ اکتوبر کو انشاء اللہ بحث بھی ہو جائیگی، خدا کرے التواء نہ ہو، دارالعلوم کے لئے اور آپ کے لئے دعا کے اہتمام کی توفیق نصیب رہتی ہے، لیکن ہم عاجز بندے بس مانگ ہی سکتے ہیں، اور رب کریم کے کرم پر اعتماد کر کے پوری امید کے ساتھ مانگتے رہنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی فکر اور محنت و کادش اور دعاؤں کو قبول فرمائے، فطری طور پر ظاہری اور باطنی قوتوں میں ضعف تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے، اب بس ایمان پر خاتمہ اور آخرت میں رحمت و مغفرت کی فکر ہے، اپنے کو بالکل خالی ہاتھ پاتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے امید ہے۔ آپ سے اسکے لئے خاص طور سے دعا کی درخواست ہے۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۶)

۲۵ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر معظم و محترم جناب مولانا مرغوب الرحمن صاحب !

احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیہا

سلام و رحمت \_\_\_\_\_ خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

عنایت نامہ کل شام موصول ہوا، پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی، سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، محض اسکا فضل و کرم ہے وہی ادائے شکر کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ نے سفر بیکار دارالعلوم کیا اور مصارف سفر کی خطیر رقم کا بوجھ اپنے ہی اوپر ڈالا اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ میں اگر مجلس شوریٰ میں شریک ہوتا تو میں بھی اصرار کے ساتھ یہی مشورہ دیتا کہ کم از کم ہوائی جہاز کا کرایہ ضرور دارالعلوم سے لیا جائے، لیکن آپ نے جو کچھ کیا اور لوجہ اللہ ہی کیا وہ بہت ہی اچھا کیا، اللہ تعالیٰ اس قربانی کو قبول فرمائے۔

میری رائے یہ ہے کہ آپ کے ذریعہ سے نہیں مولانا اسعد میاں کے ذریعہ یہ بات سب کے علم میں آئے یہ ان نیکیوں میں سے ہے جن کا اظہار اس زمانے میں افضل بلکہ ضروری ہے تاکہ دوسروں کو بھی اس رویہ کے اپنانے کی اور اس راستہ پر چلنے کی کسی درجہ میں رغبت اور ہمت ہو۔

دارالعلوم کے غالباً تیسرے مہتمم مولانا محمد منیر علیہ الرحمۃ کا واقعہ آپ کے علم میں ہوگا، اس کے بعد قریباً ایک صدی پوری ہونے والی ہے، میرا خیال ہے کہ پوری اس صدی میں اس طرح کا واقعہ نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق آپ کو دنیا و آخرت میں اس کا صلہ عطا فرمائے۔

اس وقت خط لکھنے کا خاص محرک یہ بھی ہوا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں نے سفر سے پہلے آپ دونوں حضرات کی لکھنؤ تشریف آوری کیلئے لکھا تھا، آپ نے اس کا حوالہ دے کر تحریر فرمایا ہے کہ انشاء اللہ عید کے بعد جلدی ہی آپ دونوں حضرات تشریف لائیں گے۔

مجھے عرض کرنا ہے کہ اُس بات کے بارے میں اب جلدی نہیں ہے، اطمینان سے تشریف آوری کا پروگرام بنایا جائے، میں بھی بظاہر وسط شوال تک زیادہ مصروف رہوں گا۔ دعاؤں کا سخت محتاج ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کے لئے آپ کے حق کے مطابق دعا کا اہتمام اس بندہ مسکین کو عطا فرمائے۔

غالب گمان ہے کہ برادر مکرم و محترم مولانا اسعد میاں مدنی اپنے معمول کے مطابق معکف ہو گئے، ان کی خدمت میں بھی بشرط یاد و سہولت سلام مسنون اور دعا کی درخواست، بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ بھی یہ عریضہ ملاحظہ فرمائیں۔

والسلام  
استکتہ محمد منظور نعمانی  
بقلم محمد ضیاء الرحمن۔ محمد۔

(۷)

محمد منظور نعمانی  
۱۰ مارچ ۱۹۸۹ء / یکم شعبان ۱۴۰۹ھ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر عزیز و مکرم مولانا رشید احمد الاعظمی صاحب (۱)۱

احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیبا

سلام و رحمت — خدا کرے حضرت مولانا مدظلہ العالی کا مزاج گرامی اب بالکل بعافیت ہو، اور آپ سب حضرات بھی بخیر ہوں۔

عنایت نامہ مورخہ ۲۶/۲۶ رجب ۱۴۰۹ھ کل موصول ہوا۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ حضرت مدظلہ کا مزاج گرامی اب بخیر ہے۔ (اس عریضہ کے کاتب عزیزم مولوی ضیاء الرحمن قاسمی سلمہ نے ابھی بتلایا کہ ان کو آج ہی باوثوق ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مدظلہ گورکھپور تشریف لے گئے ہیں، یہ معلوم کر کے مزید مسرت ہوئی کہ بفضلہ تعالیٰ اب اس حال میں ہیں کہ سفر فرما سکتے ہیں۔)

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا دعوت نامہ جو سہتم صاحب نے ۲۱ فروری کو روانہ

(۱) ابن حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی، منو، یوپی۔

فرمایا تھا یہاں مجھے ۷ مارچ کو ملا ہے، نہایت افسوس اور قلق ہے کہ میری معذوری اب اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ چند قدم چل کر بیت الخلاء پہنچنا بھی مشکل ہو گیا ہے، اپنی اس حالت کی وجہ سے گزشتہ دو سالوں کی کسی شوریٰ میں بھی شرکت نہیں ہو سکی، میری طرف سے حضرت مدظلہ سے عرض کیا جائے کہ ممکن ہو تو زحمت برداشت فرما کر شوریٰ میں شرکت کیلئے دیوبند کا سفر فرمالیا جائے۔ میں نے کل ہی مہتمم صاحب کو خط لکھایا ہے کہ وہ کسی مناسب آدمی کو خط لیکر حضرت کی خدمت میں مو بھیج دیں جو حضرت کی مرضی کے مطابق سفر کا انتظام ریزرویشن وغیرہ کا نظم بھی کر سکے۔

معلوم ہوا ہے کہ مولانا عبدالحلیم صاحب زید مجدہم کی صحت کی خرابی اور ضعف کی وجہ سے شوریٰ میں شرکت کی بہت کم توقع ہے، ان کے بارے میں بھی میں نے مہتمم صاحب کو لکھا ہے۔

مولانا مرغوب الرحمن صاحب حضرات اکابر کی سرپرستی اور تعاون کے بڑے حاجت مند اور مستحق ہیں۔

دعوت نامہ حضرت کی خدمت میں پہنچ چکا ہوگا، شوریٰ کی تاریخ ۱۹/۲۰/۲۱ شعبان مطابق ۲۸/۲۹/۳۰ مارچ لکھی ہے۔

حضرت مدظلہ العالی کی خدمت میں سلام اخلاص و نیاز اور دعا کی درخواست — آپ سے بھی دعاؤں کا طالب ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مدظلہ کے اور آپ حضرات کے حق کے مطابق دعا کا اہتمام کما حقہ اس عاجز کو نصیب فرمائے اور قبول فرمائے۔

والسلام علیکم  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

# نفی ذات اور فکرِ آخرت



- ۱- حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاچپوری، راندیر
- ۲- حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی، پشاور
- ۳- حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی، پشاور
- ۴- مولانا جمیل احمد صاحب، حیدر آباد، دکن
- ۵- مولانا محمد یوسف لدھیانوی، کراچی۔ پاکستان
- ۶- جناب عبدالرشید صاحب، راولپنڈی۔ پاکستان
- ۷- حافظ محمد قطب الدین صاحب، بیلگام، کرناٹک
- ۸- " " " "
- ۹- " " " "





(۱)

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۰ مارچ ۱۹۸۹ء

مخدومی و معظمی حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاچپوری

رادت فیو صکم و برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قریباً دو ہفتے پہلے گرامی نامہ موصول ہو کر باعث شرف ہوا

حضرت! میں اس حال میں ہوں کہ آنے والے خطوں

لکھانا ہو تو دوسروں ہی سے لکھاتا ہوں، خود چند سطریں لکھنا بھی

کے کاتب صاحب (جو یہ عریضہ لکھ رہے ہیں) ان دنوں اپنے وطن

پر جو کچھ الفرقان کے لیے لکھانا تھا اس میں مصروف ہو گئے تھے اس

خطوط کے جواب میں تاخیر ہوتی رہی۔

آج جمع شدہ ڈاک کا جواب لکھانا شروع کیا ہے، پہلا عریضہ حضرت کی خدمت ہی میں

لکھا رہا ہوں۔

گرامی نامہ سے جناب والا کا حال معلوم ہوا، الحمد للہ بڑا مبارک حال ہے۔ جسمانی ضعف

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے مطابق اس کے حکم ہی سے ہے ”آنچہ ازد و دست می

رسد نیکو است۔“

حضرت! میرا حال یہ ہے جیسا کہ غالباً پہلے بھی عرض کیا ہوگا، قریباً بارہ تیرہ سال سے

بستر ہی میری مسجد ہے، اب سے چند مہینے پہلے تک جمعہ کے دن کسی طرح قریب کی مسجد تک چلا

جاتا تھا اب اس سے بھی محرومی ہے۔

ادھر چند مہینے سے کھانسی بخار وغیرہ کی شکایت ہو گئی تھی، الحمد للہ اب نہیں ہے، البتہ

ضعف خاصا باقی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خاصی عمر عطا فرمائی، جو کرنا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا، بڑی تقصیر رہی، بس

ارحم الرحیمین کی رحمت ہی سے امید ہے، اللھم ان معصرتک اوسع من دونی، ورحمتک

ارجی' عدی میں عملی، ہی سہا رہے۔

اب سب سے بڑی حاجت بس یہی ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں ایمان، اعمال مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت، نعمتوں پر شکر، گناہوں سے استغفار کے اہتمام اور عافیت سے پورے ہو جائیں، وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے اور ارحم الراحمین محض اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادیں۔

آپ سے بھی اسی دعا کا طالب اور سائل ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حق کے مطابق آپ کے لئے دعا کا اہتمام اس عاجز کو نصیب فرمائے۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۲)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

معلمی دمعنری مولانا محمد اشرف سلیمانی صاحب دامت فیو صکم و برکاتکم  
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے عریضہ کے جواب میں آخری گرامی نامہ غالباً اوائل رمضان المبارک میں مل گیا تھا جس میں جناب نے مطلع فرمایا تھا کہ اس عاجز نے جو عریضہ حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب کے ذریعہ ارسال کیا تھا وہ بھی موصول ہو گیا تھا اس میں حضرت مولانا فقیر محمد صاحب دامت برکاتہم کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا تھا اس سے دل بے حد متاثر ہوا۔ بے تکلف عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ عام عادت کے خلاف اپنی اس کم نصیبی پر دیر تک روتا رہا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خود حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ اور ان کے اکثر اجلہ خلفاء سے عقیدت و محبت اور نیاز مندانہ تعلق نصیب رہا اور انکی عنایتیں اور شفقتیں بھی بفضلہ تعالیٰ نصیب رہیں لیکن حضرت مولانا فقیر محمد صاحب دامت برکاتہم سے قریبی زمانے تک بالکل ناواقف رہا۔ اور اب سفر سے معذور ہو جانے کی وجہ سے امید بھی نہیں کہ حضرت

ممدوح کی خدمت میں حاضری اور زیارت نصیب ہو سکے۔

اسی کے ساتھ شدت سے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ ان سے غائبانہ بیعت (بیعت عثمانی) کی درخواست کروں عزیزم مولوی خلیل الرحمن سجاد سلمہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے تعلیمی قیام کے دوران حضرت کے بارے میں کچھ جانتے رہے اور صرف زیارت اور طلب دعا کیلئے انکی خدمت میں کبھی کبھی حاضر بھی ہوتے رہے۔ انہوں نے یہ بتلایا کہ حضرت کے مزاج پر انفاء کا غلبہ ہے۔ بہت ہی کم لوگ ہیں جو انکو جانتے ہیں۔

میں نے ان سے مشورہ کیا کہ میں اس مقصد سے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھنا چاہتا ہوں وہ خود بھی آپ کا گرامی نامہ پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے انہوں نے بتلایا کہ جدہ کے نور دلی خاندان کے بھائی حاجی محمد نور عبدالقادر نور دلی اور حاجی محمد نور علی نور دلی حضرت ممدوح سے عقیدہ تمندانہ اور نیاز مندانہ تعلق رکھتے ہیں۔

منورہ میں انہی حضرات کے ”بستان“ میں ہوتا ہے انکے ذریعہ حسن اتفاق سے میرے ایک بہت ہی مخلص اور مخلص

۹ رمضان مبارک کو عمرہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے میں نے ”

لفافہ پر حضرت ممدوح کا اسم گرامی لکھ کر جدہ کے اپنے دوستوں کے پاس اسے درجہ تن دیا۔ اور ان کو مکلف کیا کہ وہ میرا عریضہ حتی الوسع جلد ہی مدینہ منورہ حضرت مکتوب الیہ دامت برکاتہم کی خدمت میں پہنچادیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ عریضہ جلد ہی حضرت ممدوح کی خدمت میں پہنچ جائیگا میں نے اس عریضہ میں اپنا حال لکھ کر غائبانہ بیعت کی درخواست کی ہے اور اسکا اظہار کر دیا ہے کہ اسوقت اسکا محرک آپ کا گرامی نامہ ہوا ہے۔

میں اب ضعف کے جس حال میں ہوں کچھ کر نیکی لائق تو نہیں ہوں۔ امید یہ ہے کہ اس طرح مجھے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے سلسلہ کی برکات سے بھی حصہ مل جائیگا۔ بفضلہ تعالیٰ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کی ارشادی تعلیمات سے مجھے مناسبت نصیب رہی ہے اور میں نے ان کو اپنے لئے شمع راہ سمجھا ہے۔

آپکا ممنون اور شکر گزار ہوں کہ آپ کے گرامی نامہ ہی نے یہ داعیہ پیدا کیا اور وہی اس

کا محرک ہو۔ جراکم اللہ تعالیٰ کما یلیق بشاہہ الکریم۔

امید ہے کہ یہ عریضہ ماہ مبارک کے عشرہ اخیرہ میں وصولیابی سے مشرف ہو جائیگا۔

کراچی کے ایک دوست آئے ہوئے ہیں کل واپسی ہے۔ انکے حوالہ کر دینے کا ارادہ ہے۔ وہ انشاء

اللہ لاہوریا کراچی پہنچ کر حوالہ ڈاک کر دیئے۔ دعاؤں کا بہت ہی محتاج و طالب ہوں۔  
والسلام

(۳)

معظمیٰ و معزز می حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی صاحب!

دامت فیو صکم و برکاتکم

وعلیکم السلام ورحمت اللہ وبرکاتہ و مغفرتہ و مراضاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۵/رجب المرجب ۱۴۰۹ھ موصول ہو کر باعث شرف ہوا۔ حضرت  
والاجب لکھنؤ تشریف لے گئے تھے تو دہلی پہونچکر غالباً دفتر جمعیت علماء ہند سے گرامی نامہ تحریر  
فرمایا تھا، جس میں روانگی سے پہلے دوبارہ میرے پاس تشریف نہ لاسکنے کے وجوہ و اسباب  
تفصیل سے تحریر فرمائے تھے اور میرے بارے میں اپنے ایسے حسن ظن کا اظہار فرمایا تھا جس  
کا میں قطعاً مستحق نہیں۔ کیا عرض کروں میرا کیا حال ہے؟.....

حضرت! صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ میری عمر کچھ زیادہ ہے اور اپنے سلسلہ کے اکابر و  
مشائخ کی زیارت اور ان کی خدمت میں مجھے حاضری کا اللہ تعالیٰ نے بہت موقع غنایت فرمایا، لیکن  
جو کچھ خود کرنا چاہئے تھا وہ چونکہ نہیں کیا اور اس میں بڑا قصور رہا اس لئے حال یہ ہے کہ اگرچہ ٹوٹا  
پھوٹا نماز روزہ نصیب ہے، لیکن باطن کی اصلاح نہ ہو سکی۔

حضرت کی عمر اگرچہ مجھ سے کم ہے لیکن مجھے بفضلہ تعالیٰ آپ کے ساتھ وہی عقیدت  
ہے جو اپنے سلسلہ کے مشائخ کے ساتھ ہے۔

مجھے جو کچھ امید ہے بس اللہ تعالیٰ کی رحمت، حضور کی شفاعت، اللہ کے مقبول بندوں کی  
دعاؤں سے ہے، لجاجت کے ساتھ درخواست ہے کہ خصوصیت کے ساتھ دعا فرمائیں کہ اللہ  
تعالیٰ اپنے خاص کرم سے رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود قاسمی

(۳)

از طرف محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ  
نظیر آباد لکھنؤ  
۲۲ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر محترم محبت مکرم مولانا جمیل احمد صاحب - احسن اللہ تعالیٰ الیکم والیسا۔  
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حضرت! الفرقان میں میں نے اپنا مختصر حال اسی لئے لکھ دیا تھا کہ آپ جیسے حضرات دعا فرمائیں۔  
قمری حساب سے میری عمر ماہ شوال میں ۸۵ ہو کر ۸۶ واں سال شوال ۱۴۰۹ھ ۱۲ مئی ۱۹۸۸ء  
عنایت نامہ کا حق تھا کہ اپنا حال تفصیل سے لکھتا لیکن پہلے قر  
کے بعد سے آشوب چشم کی تکلیف شروع ہوئی جس سے ابھی پ  
اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے صحت و شفاء عطا فرمائے اور جو تکلی  
سیئات بنائے۔

محترم بھائی جمیل صاحب! بظاہر تو دین کی خدمت کے کاموں میں خداداد عمر کا بڑا حصہ  
گذرا۔ بغیر ادنیٰ انکسار کے عرض کرتا ہوں کہ آخرت میں کام آنے والا وہی عمل ہے جو خاصاً لوجہ  
اللہ ہو لیکن اپنے کسی عمل کے بارے میں اس اعتبار سے اطمینان نہیں ہے، اس لئے بس اللہ تعالیٰ  
کی صفت رحمت و مغفرت کا اور اسکے مقبول بندوں کی دعاؤں ہی کا آسرا ہے، خاص کر حضور کا  
تعلیم فرمایا ہوا یہ کلمہ استغفار اپنے حسب حال ہے۔ اللہم ان معصرتک اوسع من دہوی  
ورحمتک ارجی من عمدی — یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اپنی بد حالی کا احساس  
ہے آخرت کی فکر نصیب ہے۔

بظاہر ہم آپ دونوں ہی زندگی کی آخری منزل میں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ہی کی تعلیم  
فرمائی ہوئی یہ دعا حسب توفیق نصیب ہے۔ ”اللہم اجعل حیر عمری آخرہ وحیرہ عملی  
خواتیمہ وحیرہ ایامی یوم القاک فیہ“ اللہ تعالیٰ آپ کے حق کے مطابق آپ کے لئے دعا کا  
اہتمام اس عاجز کو نصیب فرمائے، آپ دعاؤں میں یاد فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے

مطابق اس کا صلہ عطا فرمائے گا۔ عزیزم اشفاق احمد سلمہ کو سلام و دعا۔  
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(۵)

باسمہ تعالیٰ

صفر المظفر ۱۴۰۳ھ، مطابق ۱۹۸۳ء

صدیقی المحترم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ مورخہ ۲۲ / محرم موصول ہو کر موجب منت و مسرت ہوا، عریضہ کا جواب یا اطلاع رسید نہ ملنے کی وجہ سے خیال ہو گیا تھا کہ شاید وہ ڈاک سے ضائع ہو گیا۔ آپ تک نہیں پہنچ سکا۔ اب گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا یہ انعام ہوا تھا کہ ان دنوں آپ سفر حج میں تھے اب واپسی پر میرا عریضہ ملاحظہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس حج اور اس سفر کے عمرات اور ان کے سلسلہ کے تمام مناسک و افعال اور دعوات صالحہ کو اپنی شان عالی کے مطابق قبول فرمائے اور آپ کے لئے اور آپ کے اہل تعلق کے لئے مغفرت کا وسیلہ بنائے اور اس کے انوار و برکات آپ کی روح میں اس طرح پیوست فرمادے کہ قبر میں بھی ساتھ جائیں۔

دارالعلوم دیوبند کے المیہ کے سلسلہ میں حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی حیات میں اور ان کے حادثہ وفات کے بعد الفرقان میں جو کچھ لکھا گیا اس کے بارے میں گرامی نامہ سے جناب کی رائے اور تاثر معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا، اور دل کی فکر و تشویش میں کمی ہوئی اور اسی کی وجہ سے دل میں کچھ عرض کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ ورنہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہونے کی وجہ سے اب خطوط بہت مختصر ہی لکھتایا لکھاتا ہوں۔ یہ عریضہ بھی ایک عزیز سے لکھا رہا ہوں۔ مولانا! واقعہ یہ ہے کہ جو مقدر تھا وہ ہو چکا، لیکن خاص کر ان کی وفات کے بعد سے دل بہت متاثر ہے اور جب خیال آجاتا ہے تو رنج اور افسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ

مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔ درجات بلند فرمائے اور اس سلسلہ میں جو غلطیاں ہم سے یا ان سے ہوئیں اپنی شان کرم سے ان کو معاف کر دے۔ اہ عمو کریم۔

مولانا! ”لِلْإِنْسَانِ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ“۔ مجھے اپنے ظاہری و باطنی عیوب و معاصی کا علم ہے جو ایسے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ رحم و کرم کا معاملہ نہ فرمائے تو خیریت نہیں ہے۔ اور قاری صاحب مرحوم مغفور کے تو صرف ان ہی اقدامات کو میں غلط سمجھتا ہوں جو دارالعلوم کے بارے میں عمر کے آخری دور میں ان کی طرف سے ہوئے، بالخصوص دارالعلوم کے ”دستور اساسی“ اور اس کی ”مجلس شوریٰ“ کو کالعدم قرار دینے کا اقدام، جو دارالعلوم کے حق میں یقیناً انتہائی درجہ کی خطرناک بات تھی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی فطرت اور ان کے عمر بھر کے طرز عمل کے خلاف تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کی فطری انتہائی درجہ کی نرم مزاجی اور کبر سنی کی پیدا کی ہوئی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اس غلط اور ناممکن بات کے لئے ان کو تباہ بھی نہیں سکتے تھے، یہی چیز اس اختلاف اور خلفشار کی بنیاد ہوئے۔ فی مابیننا و بین اللہ دل اس پر مطمئن ہے کہ دارالعلوم ہم ارکان شوریٰ نے جو رویہ اختیار کیا وہ صحیح بلکہ ہمارا فرض تھا غلطی سے ہم میں سے کوئی محفوظ نہیں ہے۔

بہر حال میں تو ان کے صرف اس عمل اور اس سلسلہ کے اقدامات کو غلط سمجھتا ہوں جو رائے اور فکر کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ان کی جن حسنات اور جن کمالات سے واقف ہوں ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں ان کو حفظ قرآن کی دولت عطا فرمائی۔ وہ زندگی بھر ان کا وظیفہ رہا، پھر وہ علم دین کی نعمت عظمیٰ سے بھی نوازے گئے۔ ہم نے آپ نے ان کو دیکھا وہ شرافت نفس اور خلق حسن کا مجسمہ تھے، ان کے مواعظ حسنہ سے ہزاروں بندگان خدا کو ہدایت ملی ہوگی، نماز روزے کی اور ذکر و تلاوت پھر دوسرے اعمال خیر کی توفیق ہوئی ہوگی، اس سب کے علاوہ خود اپنی قریباً ۸۰ سال کی مختلف النوع عبادات اور دینی خدمات و حسنات کا بھی ذخیرہ اپنے ساتھ لے کر اس دنیا سے گئے ہیں، اور آخرت میں فیصلہ کسی ایک عمل پر نہیں بندہ کے مجموعہ اعمال پر ہوگا۔ ”فمن ثقلت موازینہ فاولئك هم المفلحون“ اور ”فاما من ثقلت موازینہ فهو فی عیشة راصیة“۔

ظاہر ہے کہ ان کی ان بیشمار حسنات و خدمات کے مقابلہ میں دارالعلوم کے سلسلہ کی اس غلطی کی کیا حیثیت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا منشور رحمت ہے۔ ”ان الحسبات یدھس السیئات“



اس سب کو سامنے رکھ کر قریب بہ یقین امید ہوتی ہے کہ وہ انشاء اللہ ”اولئك هم المملحون“ اور ”فہو فی عیشۃ راضیۃ“ والے زمرے میں ہوں گے۔

اور اس کے برعکس یہ عاجز اپنے کو زائل اور معاصی کا مجسمہ ہی دیکھتا اور سمجھتا ہے ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ہے کہ اپنی اس حالت کا احساس اور فکر نصیب ہے۔ اور اسی کی طرف سے توبہ و استغفار کی توفیق بھی ملتی رہتی ہے۔ دعائے ماثور ”اللہم ان معفرتک اوسع من دیوبی ورحمتک ارحی عیدی من عملی“ کو خاص طور سے اپنے حسب حال پاتا ہوں اس لئے غرق معاصی ہونے کے باوجود رحم الرحیمین کی رحمت کا امیدوار ہوں اور جیسا کہ جناب نے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے اس کی بھی امید رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ رب کریم ہم کو ان بندوں میں شامل فرمادے جنکے بارے میں ارشاد ہوا ہے و برعنا ما فی صدورہم من عل احوانا علی سرر متقابلیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
بقلم محمد حسان نعمانی

(۶)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الاول ۱۴۱۶ھ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

میرے عزیز و کرم بھائی (۱) احسن اللہ الیکم و البوا علیکم السلام ورحمۃ اللہ اپنی بات آپ تک پہنچانے کا ذریعہ صرف الفاظ (بشکل تحریر) ہی ہو سکتے ہیں پھر ایسا کوئی آلہ معلوم نہیں جس سے آپ یہ جان سکیں کہ یہ الفاظ بالکل حقیقت کے مطابق ہیں ان میں انکسار اور تواضع بھی نہیں ہے۔

آپ نے میرے پہلے خط کو غالباً تواضع پر محمول کیا ہے اللہ تعالیٰ آپ جیسے محبین کے حق ظن کی برکت سے اس عاجز پر اپنا فضل فرمائے۔

آپ ہی بتائیے کہ جس بندہ کو حق الیقین کے طور پر یہ معلوم ہو کہ وہ اس دولت نسبت سے خالی ہے اور ”او کہ خود گم است“ کا مصداق ہے اس کے لیے کیسے درست ہے کہ وہ یہ ذمہ داری قبول کرے۔ برسوں سے میرا معمول ہے کہ حضرت قدس سرہ کے ارشاد کی تعمیل

(۱) جناب عبدالرشید صاحب لدھیانوی۔ مدینہ پاپ استور۔ راولپنڈی

میں صرف بیچارے ان عوام کو جن میں بظاہر کوئی خاص استعداد نہیں ہوتی ان کے کہنے پر بس توبہ کر دیتا ہوں اور ان کے ساتھ الحمد للہ خود بھی توبہ کر لیتا ہوں۔ پھر اگر ان میں سے کسی میں آگے چلنے کی استعداد محسوس ہوتی ہے تو کہہ دیتا ہوں کہ اب تم حضرت شیخ مدظلہ کی خدمت میں یا اللہ کے جس بندہ سے مناسبت دیکھو چلے جاؤ، میں تمہارے لیے خط بھی لکھ دوں گا۔ یہ میں ازراہ امانت ضروری سمجھتا ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے پیشے نے اللہ کے ان بندوں کی نگاہوں میں بڑا بنادیا ہے جو بس میری کتابیں پڑھتے ہیں اور ان کو حسن ظن بھی نصیب ہے۔ لیکن میں خود دھوکہ میں نہیں ہوں۔ بہر حال آپ مجھ سے جو خدمت لینا چاہتے ہیں اس کا میں اہل نہیں ہوں۔

دعا کے لیے کوئی اہلیت شرط نہیں ہے اس لیے اس کا پکا وعدہ کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ایفا نصیب فرمائے، ایک مشورہ بھی دے سکتا ہوں اگر کسی ط

رکعت صلوٰۃ توبہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس

اقدس قدس سرہ کے ہاتھ پر آپ نے کی تھی اور ا۔

حضرت اقدس کی تعلیم و تلقین کی رہنمائی میں معمول و

حضرت شیخ سے اور اگر اس ناکارہ ہی سے جی چاہے تو مجھ سے متورہ رہا ہے۔ اگر بیعت اس پر

مطمئن ہو جائے تو پھر کسی نئی بیعت کی مطلق ضرورت نہیں۔ اصل ہادی اور مرشد تو اللہ تعالیٰ

ہیں اور حضرت اقدس اور مشائخ سلسلہ کی روحانیت کے فیوض و برکات کا تسلسل باذن اللہ تعالیٰ

جاری ہے۔ میں دعا کا محتاج اور طالب و سائل ہوں اور آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(۷)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۳/ جمادی الاول ۱۴۱۶ھ

باسمہ تعالیٰ

برادرِ مہر و عزیزِ مہر حافظ محمد قطب الدین (۱) ریدت حسانتکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے عزیز بھائی ایہ تو صحیح ہے کہ اہل اللہ سے تعلق خاص کر اس زمانے میں ضروری

(۱) مدرسہ تعلیم القرآن۔ داکٹر محمد

نافع اور فتنوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے لیکن جن صاحب نے اس سلسلہ میں آپ کو میراث نام اور پتہ بتلایا ان کو غلط فہمی ہے، میں ایک گنہگار بندہ ہوں لیکن بفضلہ تعالیٰ اپنے گنہ گاری کا شعور اور فکر رنج و افسوس ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ استغفار کی توفیق نصیب ہے، اور اس بنا پر اپنی بد اعمالیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید ہے، وہ غفور رحیم ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ دعائیں گنہ گاروں کی بھی قبول فرماتا ہے، دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کی تکلیف کو دور فرمادے۔

اپنی بیماری کی شفا کے لئے اور دوسری دنیوی ضرورتوں کے لئے بھی دعا کرتا عبادت ہے بلکہ حدیث شریف میں ہے دعا عبادت کا جوہر اور مغز ہے، تو بعض بندوں کی دعائیں اللہ تعالیٰ اس لئے دیر سے قبول فرماتا ہے کہ وہ برابر دعا کرتے رہیں۔ اور اس طرح ان کی دینی ترقی ہوتی رہے لیکن ہم ضعیف بندے ہیں، اس لئے ہمیں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرنی چاہئے کہ جلدی شفا دیکر تکلیف سے نجات عطا فرمائے۔

اپنے لئے دعا کریں اور میرے واسطے بھی۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۸)

عزیز مکرم محترم! احسن اللہ تعالیٰ الیہا والیکم

ابھی ابھی آپ کا اخلاص نامہ مورخہ ۲۲/ رمضان المبارک ملا، پڑھ کر بہت دل خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر ابر توفیق دیتا رہے اور ان اعمال میں ترقی اور استقامت عطا فرمائے۔ آپ میرے لیے ضرور اہتمام سے دعا کرتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ کے حق کے مطابق آپ کے لیے دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ انشاء اللہ یہ ملاقات سے زیادہ نفع مند ہوگا۔ میں تو اپنے حالات کی وجہ سے مسجد کی حاضری تک سے معذور ہوں۔ آپ جیسے مخلص دوستوں اور ان کے اعمال اور ان کی دعاؤں کو اپنے لیے وسیلہ نجات سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری اس امید اور گمان کو غلط نہ فرمائے۔

ایک بات اگر آپ سے زبانی نہیں کہی ہے تو پورے اخلاص کے ساتھ اب لکھتا ہوں۔ مجھ سے اس طرح کا تعلق رکھنے والے دوستوں میں جس طرح کا تعلق آپ سے رہا ہے جن کو

تبلیغ کے کام سے اللہ تعالیٰ نے مناسبت عطا فرمائی ہے میں یہ مشورہ دینا ان کے اخلاص کا حق سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب! سے بیعت کا تعلق قائم کر لیں۔ اس سے ان کو انشاء اللہ زیادہ نفع ہوگا اور میرے تعلق میں ذرہ برابر فرق نہیں آئے گا۔ لیکن حضرت مولانا دامت برکاتہم کے سامنے اس کا اظہار بالکل نہ کیا جائے کہ پہلے کسی شخص سے تعلق ہو چکا تھا اگر اس کا اظہار ہوا تو غالباً مولانا قبول نہیں فرمائیں گے۔ میں متعدد مخلص دوستوں کو جن کا تبلیغ سے اچھا تعلق ہے یہ مشورہ دے کر اصرار کے ساتھ اس پر عمل بھی کرا چکا ہوں۔ آپ کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ میری یہ رائے اور میرا یہ مشورہ ہے۔ دعاؤں کا محتاج و طالب اور دعا گو ہوں۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی  
بقلم خلیا

(۹)

باسمہ تعالیٰ

عزیز و مکرم (۱)! وفقنا اللہ و ایاکم لما یحب و یرصی  
و علیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

اخلاص نامہ ابھی ملا۔ مجھے افسوس ہے اور دکھ ہے کہ کسی وہم کی وجہ سے آپ کا دل دکھا حقیقت اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھے اپنا حال حق الیقین کے درجہ میں معلوم ہے اور میں اس سے ڈرتا ہوں کہ قیامت میں اس پر مواخذہ ہو کہ اللہ کے مخلص بندوں نے اپنے حسن ظن کی بنا پر تجھ سے وہ تعلق قائم کر لیا تھا جو اصحاب ارشاد سے قائم کیا جاتا ہے اور تو نہ اس کا اہل تھا اور نہ اس سلسلہ میں انکی خدمت کر سکا۔

بس اسی احساس کی بنا پر آپ جیسے دوستوں کو اس طرح کا مشورہ دینا اور اپنا حال بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلئے رائے اور مشورہ تو اخلاص و محبت کے ساتھ اب بھی وہی ہے لیکن اسکے بعد بھی اگر آپ موجودہ صورت کو ہی اپنے لیے انسب اور نفع سمجھیں تو مجھے کوئی عذر

نہیں۔ ہدایت و ارشاد کا اصلی سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے وہ میری بھی دستگیری فرمائے اور آپ کی بھی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر آپ میرے مخلصانہ مشورہ پر عمل کریں تو آپ کے ساتھ جو قلبی اور روحی تعلق ہے انشاء اللہ اس میں کوئی فرق نہ آئے گا آپ کے لیے دل سے دعا گو اور خود دعاؤں کا بیحد محتاج ہوں۔

بیلگام اور لکھنؤ کے درمیان بہت مسافت ہے صرف میری وجہ سے بس سے اتنا طویل سفر ہر گز نہ کیا جائے ”بعد منزل نشو و در سفر روحانی“ اگر کسی سلسلہ سے ادھر کا کوئی سفر ہو تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے اعتکاف اور دوسرے اعمال و مجاہدات کو قبول فرمائے اور اپنے خاص فضل سے اخلاص و استقامت عطا فرمائے۔ شاید اس کا ذکر بھی آپ سے نہیں آیا کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی سوانح پر نظر ثانی کر کے اسکو انگریزی میں منتقل کرایا گیا ہے ”ملفوظات“ سے ۴۰ ملفوظ منتخب کر کے ”ملفوظات“ کے ایک باب کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ عنقریب طباعت شروع ہونے والی ہے اس پر مقدمہ بھی از سر نو لکھا گیا ہے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے نفعیت اور مقبولیت مقدر فرمائے۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

## اصلاح وارشاد

بنام

- (۱) جناب اعجاز الدین انصاری صاحب، بھوپال
- (۲) جناب اعجاز الدین انصاری صاحب، بھوپال
- (۳) جناب قطب الدین ملا، بلگام
- (۴) جناب قطب الدین ملا، بلگام
- (۵) جناب قاری عبدالحق صاحب، ارس سعودی عربیہ
- (۶) جناب انیس صاحب
- (۷) جناب عبدالسلام صاحب پیرپاڑی۔ جے پور
- (۸) جناب اوپنڈر ناتھ اشک صاحب



(۱)

لکھنؤ

۸ مارچ ۱۹۷۰ء

باسمہ سبحانہ

برادر عزیز و مکرم! (۱) ریدت حسنا تکم — سلام مسنون

ملفوف اخلاص نامہ ہفتہ عشرہ پہلے پہنچ گیا تھا

(۱) پابندی کے ساتھ ذکر کی توفیق بڑی دولت ہے اللہ تعالیٰ استقامت اور ترقی نصیب

فرمائے۔ اور چلتے پھرتے دھیان و ذکر کی توفیق تو بہت ہی بڑی نعمت ہے۔

(۲) گوشش کیجئے کہ تلاوت اور مناجات کا ناغہ نہ ہو چاہے ایک ہی رکۃ ۱۶، ۱۷، ۱۸

دعائیں ہو جائیں۔ اہتمام کیجئے۔ ناغہ بڑا خسارہ ہے۔

(۳) آپ نے حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کی خدمت

برکات کا ذکر کیا ہے، بلاشبہ حضرت کی ذات گرامی اللہ تعالیٰ کی؛

ایسوں کی محبت بہت بڑی سعادت ہے۔ حدیث پاک میں ہے العزۃ

(۴) حضرت شیخ الحدیث کے ہاں ڈاک کا اہتمام ہے اگرچہ روز آنے والے خطوط لی

تعداد پچاس سے بڑھ جاتی ہے، کچھ خطوط رہ بھی جاتے ہونگے۔

(۵) اللہ تعالیٰ آپ کیلئے دعا کا اہتمام نصیب فرمائے، خود دعاؤں کا بہت محتاج ہوں اور

مخلصوں کی دعاؤں سے بہت امید رکھتا ہوں اسوقت لفافہ نہیں ملا اسلئے کارڈ ہی لکھ دیا کہ زیادہ

تاخیر نہ ہو۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی

(۲)

لکھنؤ

۳ ربیع الثانی دو شنبہ

محبی مخلصی (۲)! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

(۱) الحمد للہ حالت بحیثیت مجموعی قابل شکر ہے اللہ تعالیٰ ترقی عطا فرمائیں۔



(۲) بس ان ہی معمولات کو جاری رکھئے۔

(۳) استغفار سے دل کا لگاؤ اللہ کی نعمت ہے حدیث میں ہے وہ بندہ بہت ہی کامیاب ہے جسکے صحیفہ اعمال میں استغفار زیادہ ہو۔

(۴) عشا کے بعد تہجد کی نیت سے جو ۴ رکعت نفل آپ پڑھتے ہیں انکو اس وقت تک جاری رکھئے جب تک آخر شب میں تہجد کی مستقل عادت نہ ہو جائے آخر شب میں نہ اٹھ سکنے والوں کیلئے عشا کے ساتھ تہجد پڑھنے میں بھی انشاء اللہ پورا ثواب ہے۔ بجائے چار رکعت کے آٹھ رکعت زیادہ بہتر ہے اگرچہ تہجد کی سنت چار سے بھی ادا ہو جاتی ہے وتر ان کے بعد پڑھنا افضل ہے۔

(۵) ابھی کسی اضافہ کی ضرورت نہیں موجودہ معمولات ہی میں کیفیت بڑھانے کی کوشش کرتے رہئے۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ درود شریف بھی میں نے بتلایا تھا یا نہیں اگر نہ بتلایا ہو تو اسکا طریقہ اور تعداد مجھ سے عند الملاقات زبانی دریافت کر لیجئے گا۔  
دوستوں کیلئے دعا کرتا ہوں اور انکی دعاؤں کا محتاج ہوں۔  
انشاء اللہ پرسوں چہار شنبہ روانہ ہو کر جمعرات کو بھوپال پہنچوں گا۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی عفا اللہ

(۳)

۱۵ مارچ ۱۹۹۶ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر عزیز مکرم (۱) !

و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپکا خط مورخہ ۲ مارچ ملا حالات معلوم ہوئے۔

تسبیحات میں تو بہت ہی کم وقت ہوتا ہے اگر اسکی بھی پابندی نہ ہو سکے تو اپنے ہی ساتھ بے انصافی ہے۔ غالباً میں نے بتایا ہو گا کہ اگر کسی دن مقرر وقت پر تسبیحات پوری نہ کی جاسکیں تو

دوسرے وقت انکو پورا کر لینا چاہئے۔ اگر دل میں انکی اہمیت ہوگی تو انشاء اللہ توفیق ملتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق غمخوار ہیں بندہ کی بے فکری کبھی کبھی محرومی کا سبب بن جاتی ہے لیکن انکی رحمت کی صفت غالب ہے آئندہ کیلئے اہتمام اور پابندی کا عزم کر لیجئے انشاء اللہ توفیق ملتی رہے گی۔ تسبیحات تو راستہ سے آشنائی پیدا کرنے کا ابتدائی ذریعہ ہیں اگلی منزلوں کی طلب ہونی چاہئے۔

خوابوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے ایک غیر اختیاری چیز ہے تاہم آپکا خواب اچھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپکی روح میں بلند پروازی کی استعداد رکھی ہے۔ آپ اگر اس راستہ پر چلیں گے تو اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا۔ نہ چلنے کی صورت میں یہ استعداد بھی ضائع ہو جائیگی۔

امتحان کیلئے بھی دعا کرتا ہوں۔ نمازوں اور تسبیحات کے بعد :  
وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر لیجئے۔ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي  
سید محمد اقبال صاحب اور رحمت صاحب کو جواب سلام  
وا

محمد مسعود

(۴)

۲۸ جون ۱۹۷۶ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

عزیز مکرم محترم (۱) احسن اللہ تعالیٰ الیکم و البیاء  
اخلاص نامہ مورخہ ۱۵ جون وقت پر مل گیا تھا، حسب عادت جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ آپ نے اپنا جو حال لکھا ہے بہت سے اللہ کے بندوں کا یہ تجربہ ہے کہ حج کے سفر میں ایسا ہو جاتا ہے۔ کہ آدمی سمجھتا ہے کہ میں جو پونجی لیکر آیا تھا وہ بھی کھودی اور کچھ بھی نصیب نہیں ہے عارفین کو کہتے سنا ہے کہ یہ بہت اچھی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے ہم سب امراض کا شکار ہیں۔ اگر اس طرح کی واردات کبھی نہ ہو تو اعجاب نفس میں مبتلا ہو کر برباد

(۱) قلب الدین ملا صاحب، ہیلگام (کرناتک)

ہو جائیں۔ حق یہ ہے کہ کسی کے پاس کچھ نہیں کبھی کبھی اسکا تجربہ کرا کے علاج فرما دیا جاتا ہے۔  
 سر اسر کرم ہے، اللہ تعالیٰ شکر کی توفیق دے۔ اور عاجزانہ دعا کو آپکا اور میرا بھی حال بنادے۔  
 الحمد للہ میں اپنے حال سے کچھ آگاہ ہوں آپ جیسے دوستوں کی محبت کو اچھی علامت سمجھتا ہوں اپنے پاس ہے کچھ نہیں۔

مخلص عزیز مکرم سید محمد اقبال صاحب کو جواب سلام، انکے لئے بھی دعا کرتا ہوں اور  
 خود دعاؤں کا بے حد محتاج ہوں۔ غائبانہ دعا سب سے قیمتی ہدیہ اور تحفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور  
 میں روحانی ملاقات ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دولت بھرپور نصیب فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ  
 محمد منظور نعمانی

(۵)

۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء  
 محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر مکرم جناب حافظ قاری عبدالحق صاحب (۱)!

و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر عافیت ہوں۔ ۱۹ اگست کا لکھا ہوا اخلاص نامہ غالباً ستمبر  
 کے پہلے یا دوسرے عشرہ میں مل گیا تھا، اس سے چند ہی روز پہلے آپکو ایک خط لکھایا جا چکا تھا جس  
 میں آپکے اس عنایت نامہ کے وصولیابی کی اطلاع تھی جسکے ساتھ آپکا چار سو کا ڈرافٹ بھی  
 موصول ہوا تھا، امید ہے کہ میرا لکھایا ہوا وہ خط بھی آپکو ملا ہو گا اسکے بعد سے طبیعت ناساز رہی  
 اور ایسے خطوط کے جوابات ملتوی ہوتے رہے جو مختصر نہیں لکھائے جاسکتے تھے اسلئے آپکے آخری  
 عنایت نامہ مورخہ ۱۹ اگست کا جواب اب تک نہیں لکھا جاسکا، میں نے ابھی پڑھوا کر سنا ہے، مختصر  
 چند باتیں لکھا رہا ہوں۔

(۱) آپ میرے بارے میں بہت مبالغہ کرتے ہیں میں بالکل اس حال میں نہیں ہوں جو  
 آپ گمان کر رہے ہیں، بے تکلف لکھانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئندہ اس بارے میں احتیاط

فرمائیں۔ میں اپنا حال خوب جانتا ہوں، اسلئے میرے بارے میں مجھے کچھ لکھنا غیر ضروری ہی نہیں نامناسب ہے، مجھے اس سے گرائی ہوتی ہے۔

(۲) آپ نے بیعت کی بات لکھی ہے، یاد آتا ہے پہلے بھی میں بھی لکھا چکا ہوں، آپکو کسی سے بیعت کی ضرورت نہیں، ہمارے مرحوم و مغفور معظم محترم بھائی مولانا حافظ فتح محمد صاحب سے جو بیعت آپ نے کی تھی وہی کافی ہے۔

(۳) معلوم ہوا کہ آپ کے اہل و عیال دہلی میں ہیں ان کی وجہ سے آپ جب چاہیں اور مناسب سمجھیں دہلی کا سفر کریں، اگر اس وقت ملاقات کی نیت سے لکھنؤ کا بھی سفر کیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی

(۶)

۲۳ رمضان ۱۴۱۰ھ بروز جمعہ  
محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ  
میرے عزیز بھائی انیس صاحب! (۱) حفظکم اللہ تعالیٰ و عافکم  
سلام و رحمت

آپکا خط ملا پڑھا کر سنا، آپکے علم میں نہیں ہے میں زیادہ دن سے بیمار اور صاحب فراش ہوں، خود لکھنے پڑھنے سے بالکل معذور ہوں۔ لیکن میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کے خط کا جواب لکھواؤں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بعض صحابہ کو بڑے سخت شیطانی وسوسے آتے تھے انھوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت! ایسے وسوسے آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جاتا ان سے بہتر ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ حالت اسکی دلیل ہے کہ تمہیں پورا ایمان نصیب ہے اور ایمان کی دولت عزیز ہے۔

(۱) پتہ دستیاب نہیں ہے۔

یہ عاجز آپکو یقین دلاتا ہے کہ بفضلہ تعالیٰ آپ پورے صاحب ایمان ہیں، ان خیالات کو دوسرے سمجھنا اور ان سے تکلیف اور پریشانی محسوس کرنا اور پریشان اور رنجیدہ ہونا اسکی دلیل ہے کہ بفضلہ تعالیٰ آپکا قلب مومن ہے۔

نماز یا قرآن پاک کی تلاوت میں لذت اور حلاوت نہ ہونے سے کوئی نقصان نہیں بلکہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکو بس پر زیادہ اجر و ثواب عطا فرمایگا کہ لذت اور حلاوت نہ ہونے کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نماز پڑھتے ہیں اور اجر و ثواب کیلئے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ اللہ کے بعض بندوں پر کبھی ایسے حالات آجایا کرتے ہیں لیکن چند روز میں وہ کافور ہو جاتے ہیں اور ان سے پریشانی اور تکلیف کا احساس ان کی دینی اور ایمانی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

### ایک مختصر عمل لکھاتا ہوں

صبح نماز فجر سے پہلے یا نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسی طرح رات کو عشاء کی نماز کے بعد گیارہ دفعہ درود شریف، اسکے بعد ایک سو ایک دفعہ یہ مختصر دعا "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ قَلْبِيْ عَلٰی دِيْنِكَ" پھر گیارہ دفعہ درود شریف پڑھنے کا تین ہفتے کیلئے معمول بنالیتے اور ہر نماز کے بعد دعا بھی کیجئے کہ اے اللہ تو شیطانی دوسو سے میری حفاظت فرما اور تین بار کلمہ شریف پڑھ لیا کیجئے۔ یہ عاجز بھی آپکے لئے دعا کرتا ہے امید ہے کہ انشاء اللہ آپ جلد اس حالت سے نجات پا جائیں گے، خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
بقلم محمد ضیاء الرحمن قاسمی

(۷)

۲۶ مارچ ۱۹۸۸ء  
محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر م عبد السلام صاحب (۱) ! عافا کم اللہ تعالیٰ  
آپکا خط ملا، حال معلوم ہوا، عاکر تا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپکو کامل صحت و عافیت عطا فرمائے

(۱) پی پاز۔ ضلع جے پور۔

آئندہ بھی اللہ تعالیٰ آپ کے لئے اس دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرماتا رہے۔  
 عزیم عبد القلیم سلمہ کی بچی کی ولادت کا حال معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ اسکے لئے خیر  
 وبرکت مقدر فرمائے، حدیث شریف میں ان لوگوں کو جنت کی بشارت سنائی گئی ہے جن کو اللہ  
 تعالیٰ نے بچیاں عطا فرمائی ہیں اور انکو بوجھ نہ سمجھیں خوش دلی سے انکی کفالت اور تربیت کریں  
 رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے تو چھوٹی عمروں میں ہی وفات پا گئے تھے چار صاحبزادیوں نے عمر  
 پائی انکی شادیاں بھی ہوئیں ان میں سے بھی تین کی وفات حضور ﷺ کی حیات ہی میں ہو گئی  
 صرف حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا باقی رہیں وہ بھی حضور ﷺ کی وصال کے چھ مہینے  
 بعد وفات پا گئیں۔ بہر حال بیٹیاں بچیاں بھی بڑی نعمت ہیں اللہ تعالیٰ عبد القلیم سلمہ کو ولد صالح  
 بھی عطا فرمائے۔ بچوں کا نام رکھنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسکے لئے دوسروں سے مشورہ نہ لیا جائے،  
 معمولی بات ہے تاہم لکھتا ہوں ”صدیقہ خاتون“ صادق  
 خاتون ”سعیدہ خاتون“ میں سے کوئی نام رکھ لیا جائے۔  
 خود دعاؤں کا طالب ہوں۔

محمد - حضور  
 بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۸)

۲۹/۳/۱۹۸۹ء  
 محمد منظور نعمانی  
 لکھنؤ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مہربانم اوپندر ناتھ اشک صاحب!

اللہ تعالیٰ ہمارے آپ کے ساتھ فضل و کرم کا معاملہ فرمائے۔

میری عمر چھیالیس ۸۶ سال ہے مختلف امراض و عوارض کے علاوہ ہائی بلڈ پریشر کا بھی مریض  
 ہوں، ایک ایکسڈنٹ کی وجہ سے چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا ہوں، آنے والے خطوط  
 دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں کچھ لکھانا ہو تو دوسروں ہی سے لکھاتا ہوں۔

آپ کا عنایت نامہ ایسے وقت آیا تھا کہ میرے خطوط کے کاتب صاحب اپنے وطن گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو دوسرے ضروری کاموں میں مصروف رہے اسلئے خط کا جواب بہت تاخیر سے لکھا جا رہا ہے معذرت خواہ ہوں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ کو مرنے کے بعد کی فکر ہے لیکن آجکل زیادہ تر لوگ اس سے غافل ہیں، حالانکہ یہ مسئلہ ہماری زندگی کے دوسرے تمام مسائل سے زیادہ لائق فکر ہے

آپ نے جو دریافت فرمایا ہے اس کا جواب لکھنا میرے لئے مشکل ہے اور آپ کیلئے اس کا سمجھنا بھی مشکل ہو گا۔ اگر کبھی لکھنؤ تشریف لانا ہو اور خدا نے چاہا تو زبانی عرض کر سکتا ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے میں بات بھی زیادہ دیر تک نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ مجھ کو اور آپ کو ہدایت عطا فرمائے۔

فقط

والسلام علی من اتبع الهدی  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

## Alamgeer Trading Corporation

(Importers & Exporters)

----- Exporters of -----

✽ The Holy Quran ✽ Standard Islamic Books ✽ Wooden Rehals

----- Please Contact -----

**(1) Kutub Khana Azizia (Publishers)**

4142, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi

**(2) Alamgeer Trading Corporation (Exporters)**

41474, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi Tel 3266422, 3266439, Fax 3266067

# اصلاح رسوم

(بنا)

- ۱- جناب عبدالرحمن کوندو صاحب، سری نگر، کشمیر
- ۲- جناب انوار حسین صاحب سنبھل، ضلع مراد آباد
- ۳- مولانا حکیم محمد احسن صاحب سنبھل، ضلع مراد آباد
- ۴- عزیزہ عائشہ سلمہا بنت جناب حافظ محمد اقبال صاحب مہتمم مدرسہ فرقانیہ گونڈہ
- ۵- معجز حسین صاحب و شاہدہ بیگم، سنبھل (مراد آباد)





از طرف محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ  
لکھنؤ، ۳ جون ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ  
مخلص مکرم جناب عبدالرحمن کوندو صاحب (۱) رید لطفکم  
سلام و رحمت

گرامی نامہ مورخہ ۷ ار مئی موصول ہوا۔ آج کل ضعف بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔  
گذشتہ ڈیڑھ دو مہینے سے بصارت میں بہت کمی آگئی ہے۔ خطوط دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں۔  
کسی کتاب سے کوئی مضمون نکلوانا ہو تو دوسروں ہی سے اس کو نکلوا کر سنتا ہوں۔ اگر یہ  
معذوری نہ ہوتی تو جہیز سے متعلق آپ کی کتاب ”فتنہ جہیز“ کتہ :  
یاد آتا ہے کہ اب سے چند سال پہلے الفرقان میں جہیز  
علم کے مضامین پاکستان کے کسی مقرر سالے سے نقل ہو کر شائع  
کیا گیا تھا کہ جہیز جو نکاح و شادی کے لوازم میں سے ہو گیا ہے قضا  
ہی سمجھتا ہے۔

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۲)

۷ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ  
عزیزم انوار حسین اور عزیزہ مسلمہ (۲) سلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم  
سلام و رحمت

خدا کرے تم سب بخیر و عافیت ہو۔  
فون کے ذریعہ عزیز می مولوی عبدالمومن سلمہ (۳) کا پیام ملا تھا کہ تم لوگوں نے عام  
رواج کے مطابق بچی کے ساتھ جہیز دینے کے لئے تیاری کر لی ہے جسکے لئے مومن ہرگز

(۱) امری مگر کشمیر۔ (۲) برادر زادی بنت حاجی محمود حسین مرحوم سنہیل، ضلع مراد آباد، یوپی۔ (۳) برادر رادہ

(۱) ابن مولانا حکیم محمد احسن قاسمی مرحوم

رضامند نہیں ہیں، ان کی طرف سے گویا نکاح کی شرط یہ ہے کہ ایک پیسے کا سامان بھی نہیں آئے گا۔

مجھے یہ کہنا ہے کہ جس طرح عبدالمومن کہیں وہی ہونا چاہئے، حضور کی تمام ازواج مطہرات کا نکاح اسی طرح ہوا، آپ کی سب صاحبزادیوں کا نکاح بھی اسی طرح ہوا، حضرت فاطمہؓ کو جہیز میں کچھ دینے کی بات غلط مشہور ہو گئی ہے۔ حدیث شریف میں ہے امت میں بگاڑ پیدا ہو جانے کے وقت میرے طریقہ کو زندہ کرنے والے کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ شکر ادا کرو کہ خود عبدالمومن سلمہؓ کو اس پر اصرار ہے اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہی اپنے بھائی یحییٰ کو اس کے لئے تیار کیا تھا اور یحییٰ کی شادی اسی طرح ہوئی۔ بہر حال مجھے یہ لکھنا ہے کہ میری بھی شدت سے یہی رائے ہے، یوں سمجھو کہ تم دونوں کو میرا حکم ہے کہ مولوی عبدالمومن سلمہؓ جس طرح چاہتے ہیں اسی طرح شادی ہو آخرت میں جب اس کا اجر و ثواب سامنے آئے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ کتنا عظیم نیک کام ہوا ہے۔

اگر کچھ سامان تیار کر لیا گیا ہے تو وہ دوسری بہن کے کام آسکتا ہے۔ میں نے یہ خط ضروری سمجھ کر طبیعت کی سخت خرابی کی حالت میں لکھ لیا ہے، تم دونوں کو اور سب کو سلام و دعا۔ خود دعاؤں کا محتاج ہوں۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی  
بقلم ضیاء الرحمن

(۳)

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۴ جنوری ۱۹۹۲ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر عزیز گرامی قدر مولوی حکیم محمد احسن (۱) ! حفظکم اللہ تعالیٰ و عافاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تمہارا حال آنے والوں کے ذریعے معلوم ہوتا رہتا ہے۔ حسب توفیق صحت کے لحاظ سے حالت کی بہتری پر شکر اور مزید کے لئے دعا بھی کرتا ہوں۔ اس وقت خود اس حال میں ہوں کہ چند سطریں لکھنا بھی مشکل ہیں۔ لیکن دل کے

(۱) سب سے چھوٹے حقیقی بھائی، جنھوں نے ۱۴ مئی ۱۹۹۳ء کو انتقال فرمایا۔

شدید تقاضے سے لکھانے کا ارادہ کیا ہے۔ اس کے مخاطب تمہارے سارے فرزند ان عزیز بھی ہیں بلکہ میرے لئے زیادہ ضرورت انہیں کو لکھانے کی ہے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے رضی میاں سلمہ کا رشتہ طے ہو گیا ہے اور مقررہ تاریخ بھی قریب ہی ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس رشتہ کے سلسلے میں بات چیت میں میرا بھی نام آیا ہے اگر میں کسی طرح بھی عزیزم مولوی عتیق الرحمن سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جانے کے لائق ہوتا تو خود ہی چاند پور جاتا لیکن میرا حال یہ ہے کہ غالباً کئی مہینے سے اپنے کمرہ کے اندر سے مکان کے صحن تک جانا نہیں ہوا ہے۔ والحمد للہ علی کل حال۔

میری انتہائی خواہش ہے کہ شادی کی یہ تقریب ایک مثالی نمونہ ہو۔ میرا خیال ہے اور مجھے بتایا بھی گیا ہے کہ نور چشمی شمیمہ (۱) کے بھائی جن پر اللہ تعالیٰ کا اس وقت خاص فضل ہے ان کی خواہش یہی ہوگی کہ یہ تقریب ”شاندار“ طریقے پر انجام دیا جائے۔ خواہش یہ ہے اور معلوم ہے مولوی عتیق الرحمن سلمہ اللہ شریک حال ہیں کہ یہ تقریب اُس طرح انجام پائے جیسی ا۔ دیندار گھرانہ سمجھا جاتا ہے اور جس کے دروازہ پر جلی حروف کے لئے میرے سامنے ایک مثال ہے۔ سہارنپور کے مشہور اور سہارنپور

صاحب مرحوم شاید تم کو یاد ہوں، یہ دارالعلوم کے ہماری طالب علمی کے زمانہ میں بھی سہارنپور کے سب سے بڑے ڈاکٹر کی حیثیت سے معروف اور مرجع تھے اور پھر حضرت رائے پوری، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہما کے آخری مرض میں معالج رہے، ان کے اکلوتے بیٹے محسن تھے۔ ان کے نکاح کا واقعہ ہے، ان کے والد ڈاکٹر برکت علی صاحب مرحوم نے ان کو بٹھا کر شادی کے سلسلے کے مصارف پر بات چیت کی، اندازہ ہوا قریب۔ ۲۰,۰۰۰ (اس زمانے کے بیس ہزار) خرچ ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا محسن ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ بیس ہزار اسی طرح خرچ ہوں جس طرح شادیوں میں عام طور پر خرچ ہوا کرتے ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ پوری رقم مصارف خیر میں صرف کی جائے اور شادی سادہ طریقہ سنت پر ہو جائے محسن نے بڑی خوش دلی سے دوسرے طریقہ کو پسند کیا۔ چنانچہ اس رقم کا ایک بڑا حصہ مظاہر علوم دارالعلوم دیوبند اور اسلامیہ کالج سہارنپور کو اور کچھ غریب و غم ضرورت مندوں کو دیدیا گیا۔

پھر معلوم ہوا کہ اس کے نتیجہ میں سہارن پور میں بہت سے گھرانوں میں اسی طرح

شادیاں کی گئیں۔ یقیناً ان سب کا اجر و ثواب ڈاکٹر برکت علی صاحب مرحوم اور ان کے بیٹے محسن کے حصے میں بھی آئیگا۔ مَسَّنَ فِی الْاِسْلَامِ سِتَّةَ حَسَنَةٍ فَلَهُ اَحْرَہَا وَ اَحْرَہَا مِنْ عَمَلٍ بَہَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَوْ کَمَا قَالَ ﷺ۔

میری دلی خواہش ہے کہ رضی سلمہ کی یہ شادی بہت سادہ طریقہ سے انجام پائے۔ عام رواجی طریقوں پر کم سے کم خرچ کیا جائے۔ جو کچھ خرچ کرنا ہو تو اپنا مدرسہ اور اپنی مسجد (۱) بہترین مصرف ہیں۔ فریق ثانی سے بھی یہی کہہ دیا جائے۔ چاند پور جانے والوں کی تعداد دس بیس سے زیادہ نہ ہو۔ شادی کی مد میں خرچ کم سے کم ہو۔ اور یہ وہ نیکی ہے جس کا اعلان اور اس کی تشہیر مناسب اور باعث اجر و ثواب ہے۔ اگر ایسا ہی ہوا تو مناسب سمجھوں گا کہ ”الفرقان“ میں بھی اس کا ذکر کیا جائے۔ حضور کا ارشاد ہے۔ ”اعظم الکاح بركة ایسبرہ مؤنة“۔ ہم جیسوں کے لئے یہی مواقع ہیں جہاں یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ ہم اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کریں یا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک کے احکام کی پیروی اور عقل کے تقاضے کے مطابق چلیں آج کل کے ویسے قطعاً سنت نہیں ہیں بلکہ اکثر معصیت کے حکم میں آتے ہیں، سنن ابن ماجہ کے حاشیے میں ولیمہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کانت سة والآ صارت مدعة (غالباً یہی الفاظ ہیں) یہاں تک لکھا کر چور ہو گیا ہوں۔ عزیزہ شمیمہ سلمہا بھی اس کی مخاطب ہیں، امید ہے کہ رضی سلمہ بھی بخوشی اس کے لئے راضی ہوں گے۔

حسان سلمہ کے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے کہ وہ نہ جائیں امید ہے کہ مولوی سجاد اس وقت تک آجائیں گے ان کا جانا میرے نزدیک مناسب ہوگا۔

فقط والسلام

(۴)

۴ جون ۱۹۸۹ء

از طرف محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ  
لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

عزیزہ من بیٹی عائشہ (۲) سلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم  
و علیکم السلام ورحمة اللہ و برکاتہ

(۱) جامعہ مدینۃ العلوم اور مدینہ مسجد، انجمن معاون الاسلام۔ سنبھل (۲) بشت حافظ محمد اقبال صاحب مہتمم مدرسہ

فرقادیہ گوٹھہ۔ یوپی

بٹی تمہارا خط ملا، میں ایسے حال میں ہوں کہ خود تو خط پڑھ بھی نہیں سکتا لیکن طویل خط پڑھوا کر سننا بھی مشکل ہوتا ہے۔ تمہارا خط پڑھوا کر سنا، مجھے یقین ہے کہ تم نے جو کچھ لکھا ہے صحیح اور سچ لکھا ہے، لیکن جو کچھ ہوا بہت غلط ہوا، شادی بیاہ کے سلسلہ میں جو طریقے عام طور سے ہندوستان میں رائج ہیں وہ قریباً سب ہی خلاف سنت و شریعت ہیں لیکن قریباً سب ہی ان میں مبتلا ہیں، ان میں اور نئی رسموں کا اضافہ کرنا بہت ہی غلط کام ہے، اگر پہلے سے یہ رواج نہیں تھا کہ رشتہ طے ہونے کے بعد انگوٹھی اور جوڑا پہنایا جائے تو تم نے یہ کر کے ایک غلط قسم کے رسم کی بنیاد ڈالی جو اللہ کے بہت سے بندوں کے لئے مصیبت کا باعث بنے گی۔ اسی طرح لڑکی والوں کی طرف سے مٹھائی وغیرہ کا آنا اور تمہارا قبول کر لینا بہت غلط کام ہوا ہے۔ رسمیں اسی طرح شروع ہوتی ہیں پھر وہ سب کے لئے لازمی سی ہو جاتی ہیں بہت سے غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو کچھ ہو چکا (ہو کیا) اب خاندان والوں غلطی ہوئی لیکن نہ جاننے کی وجہ سے ہوئی۔

ان بری رسموں اور رواجوں کی اصلاح کے لئے جہا

لڑکی والوں سے کہلوادو کہ ہم نکاح اور شادی سنت و شریعت کے مطابق ... پڑھیں۔ پ۔ لوگ بھی ایسا ہی کریں ایک حدیث شریف ہے۔ ”اعظم الکاح بركة ایسرہ مؤنة“ زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جس میں بار کم ہو۔

## (۵)

عزیزانِ من معجز حسین و شاہدہ سلمہما! سلام و رحمت

[۱] میری رائے تو یہ تھی کہ (بارات) میں صرف تینوں بھائی اور مولوی زکریا چلے

جائیں ان کے سوا اور کوئی نہ جائے لیکن معلوم ہوا کہ حسان میاں کے چند دوست پہلے سے جانا طے کئے ہوئے ہیں اور راشدؒ ان کو دعوت دے گئے ہیں۔ بہر حال ۱۲ سے ۱۵ ہو جائیں گے۔

لے یہ خط برادرِ عزیز میاں محمد حسان نعمانی کے رشتے کے سلسلے میں لکھا گیا۔ (مرتب) لے برادرِ عزا و مرحوم ابن مولانا حکیم محمد احس صاحب مرحوم۔

[۲] یہ لوگ ۲۰ ستمبر کی صبح انشاء اللہ پہلی بس سے مراد آباد سے سنبھل پہنچیں گے صرف دن بھر رہیں گے۔ اسی دن رات کی ٹرین سے لکھنؤ کے لئے واپسی ہو جائے گی۔

[۳] میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے اوپر زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور شادی کو مصیبت نہ بناؤ۔

[۴] میرے لئے یا ہمارے ہاں کسی آدمی کے لئے کپڑے ہر گز نہ بنائے جائیں۔ کوثر اور حمیرا کے لئے بھی نہ بنائے جائیں۔ اگر آئیں گے تو واپس کر دیئے جائیں گے۔ ہاں اپنی بچی کے لئے کپڑے بناؤ۔ اس میں بھی میرا مشورہ ہے کہ ہمارے جوڑے بہت کافی ہیں۔ انشاء اللہ ساری عمر اچھے کپڑے اللہ کی طرف سے ملتے رہیں گے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ حسان میاں کی والدہ مرحومہ کے نکاح کے موقع پر میں نے صرف ایک یادو جوڑے کپڑے بنوائے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساری عمر اچھے سے اچھے کپڑے ملتے رہے۔

[۵] میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ خدا کے فضل سے گھریلو زندگی کی ساری چیزیں موجود ہیں تمہیں اپنی بچی کے لئے کسی چیز کی فکر کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ غلط طریقوں کو چھوڑ کے صحیح طریقوں کو اپنائیں۔

محمد منظور نعمانی

۹ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

.....

Hafiz Samuallah Siddiqui

Ph (Resi) 285305

## DEENI BOOK CENTRE

Opp Tableeghi Markaz, Kutchery Road, Aminabad, Lucknow

Resi 23, Shuturkhana, Maqboolganj, Lucknow

# دلِ دردمند

تعزیت - عیادت - تسلی



- (۱) مولانا مفید الدین صاحب
- (۲) مولانا محفوظ الحسن صاحب سنبھلی مقیم دہلی
- (۳) مولانا عطاء اللہ قاسمی - چروآلوں - ضلع موئگیر
- (۴) جناب ریاض اللہ صدیقی اٹا دہ
- (۵) عزیزہ فاضلہ صاحبہ - سنبھلی ضلع مراد آباد
- (۶) جناب اسماعیل منصوری صاحب - بمبئی
- (۷) مولانا نظر شاہ صاحب - دیوبند
- (۸) حاجی احمد صالح جی و حاجی عبدالرزاق صالح جی - سواتھ افریقہ
- (۹) عزیزہ کنیزہ فاطمہ گاندھی نگر بستی
- (۱۰) جناب محمد خلیل اللہ صاحب - لیٹر - برطانیہ





(۱)

محمد منظور نعمانی

۱۶ جنوری ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

محترم می و معظی جناب مولانا مفید الدین صاحب دمت - کاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شاید کسی ذریعہ سے جناب کے علم میں آ گیا ہو کہ یہ عاجز قریباً ۱۰ سالہ اور صاحب فراش ہے، انھیں دنوں میں مولانا ضیاء الحسن صاحب میں شدت آئی میرے دو تین عزیز دار العلوم ندوۃ العلماء میں حال معلوم ہوتا رہا انتہائی رنج و قلق ہے کہ بیماری اور معذہ و عیادت نہ کر سکا حسب توفیق دعا کا اہتمام نصیب رہا پھر وہ وقت دنیا سے اٹھالینے کا فیصلہ فرمایا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ یقیناً ہمارے آپ سے وہ وقت آتا ہے۔

مولانا مرحوم و مغفور جب ہسپتال پہنچا دیے گئے۔ میرے عزیز برابر جاتے اور مجھے بتلاتے کہ مولانا مرحوم پر بظاہر اللہ تعالیٰ کا غیر معمولی فضل ہے وہ اس دنیا اور اہل دنیا کو خیر آباد کہکے سفر آخرت اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری کی تیاری میں مشغول ہیں مجھے انکے حالات سنکر بڑا ہی رشک آتا، حق یہ ہے کہ ایسی موت پر ہزار زندگیاں قربان۔ انکے متعلقین جس میں انکی زوجہ مکرمہ اور خود آپ بھی شامل ہیں، تعزیت سے زیادہ مبارک باد کے مستحق ہیں اگر یہ عاجز معذور نہ ہوتا تو مولانا مرحوم مغفور سے تعلق کا حق تھا کہ میں اپنے احساسات انکے اہل تعلق کو پہچانے کیلئے سو کا سفر کرتا، اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا فرمائے کہ مولانا مرحوم کیلئے مغفرت و رحمت اور درجات عالیہ کی اور انکے پسماندگان خاص کر آپکی صاحبزادی ان کی اہلیہ مکرمہ اور بچوں کیلئے صبر کی توفیق اور اپنے خاص الخاص کرم سے ان کی سرپرستی کیلئے دعا کا اہتمام نصیب فرمائے۔

(۱) مولانا مرحوم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد حدیث تھے۔ ان کی تحریرت کے سلسلے میں یہ خط مرحوم کے خسر صاحب کو لکھا گیا تھا۔

اپنی صاحبزادی صاحبہ کو میرا سلام پہونچائیں اور یہ کہ میں رنج و غم میں ان کا شریک ہوں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتا ہوں کہ وہ آپ کے حق کے مطابق دعا کا اہتمام نصیب فرمائے۔ یہ عریضہ جواب طلب نہیں ہے۔ وصولیابی کی اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی دعاؤں کا محتاج اور طالب ہوں، اور آپ کے لئے دعا گو۔  
والسلام

(۲)

محمد منظور نعمانی

۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مکرم محترم مولانا محفوظ الحسن صاحب (۱) ا ریدت حسانتکم  
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے اپنی بیٹی حمیرا نسیم سلمہا کے خط سے آپ کی اہلیہ مکرمہ کے انتقال کی اطلاع ہوئی یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ سنبھل ہی میں ہیں اسلئے یہ سطر لکھا رہا ہوں خدا کرے آپ تک پہونچ جائیں۔

میں دو دفعہ اس مرحلہ سے گزرا ہوں، تجربہ ہے کہ دل پر کیا گزرتی ہے اور زندگی کے نظام پر کیا اثر پڑتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کیلئے اس سلسلہ کی مشکلات کو آسان فرمائے اور نعم البدل عطا فرمائے معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی سب سے پہلی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ جو اولیٰ مومنات تھیں اور حقیقی اور وسیع معنی میں رفیقہ حیات، انکی مفارقت کا شدید صدمہ حضور ﷺ کو پہونچا، اولاد بھی چھوڑی، آپکو یہ سنت بھی نصیب ہوئی جو غیر اختیاری ہے، اللہ تعالیٰ اس صدمہ کا اجر اپنی شانِ عالی کے مطابق آپکو آخرت میں عطا فرمائے۔

آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَحَدُوْہِ لَہِ مَا عَطٰی و کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہُ

ماحل مسمیٰ فلتنصر و لتحتسب۔

(۱) مولانا محفوظ الحسن سنبھلی، مقیم دہلی۔ ان کے والد مولانا نجم الحسن صاحب مرحوم والد ماجد کے شاگردوں میں اور راقم الحروف (متیق) کے استادوں میں تھے۔

یہ خط جواب طلب نہیں ہے اطلاع رسید کی بھی ضرورت نہیں۔ اسکے باوجود کچھ تحریر فرمانا چاہیں تو تحریر فرمائیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۳)

محمد منظور نعمانی

۲۷ اگست ۱۹۸۸ء۔ ہفتہ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر عزیز مکرم مولوی عطاء اللہ قاسمی صاحب (۱)

سلام و رحمت

مونگیر وغیرہ بہار کے اضلاع میں زلزلہ کی خبریں اخبارات میں آرہی ہیں، قدرتی طور پر بڑی فکر ہے، اس وقت یہ خط اسی مقصد سے لکھا رہا ہوں کہ اپنی خیریت سے مطلع کریں۔ گزشتہ سال کے سیلاب سے آپ کے گھر کا بڑا حصہ منہدم ہو گیا تھا آپ نے لکھا تھا کہ ایک کوٹھری رہ گئی ہے، جس میں ہم باپ بیٹی رہتے ہیں خدا کرے حالیہ زلزلہ سے وہ متاثر نہ ہوئی ہو۔ محمد عارف سلمہ نے آپ کا خط پہنچا دیا تھا یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس کا خاصہ حصہ آپ نے خود اپنے قلم سے لکھا، اس سے یہ اندازہ کر کے اطمینان ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک آنکھ میں اتنی روشنی باقی ہے کہ کچھ لکھ پڑھ بھی سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو باقی اور محفوظ رکھے۔ محمد عارف سلمہ نے یہ بتلایا تھا کہ آپ کا ارادہ خود لکھنؤ آنے کا ہے اور صرف میری وجہ سے۔ میری رائے یہ ہے کہ آج کل سفر میں تکلیف بھی بہت ہوتی ہے اور مصارف بھی بہت ہوتے ہیں، اسلئے میرا مشورہ یہ ہے کہ میری وجہ سے آنے کا ارادہ مت کیا جائے۔ حسب توفیق براہِ ردعا کرتا ہوں۔

(۱) چروا آٹوال۔ ضلع مونگیر، بہار مولانا عطاء اللہ صاحب قاسمی الفرقان کے قریب ابتدائی زمانے سے ۱۹۳۸ء تک والد ماجد کے رفیق اور تاعلم و تفر رہے۔ اب وطن میں قیام فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپکو ہر طرح عافیت سے رکھے اور عزیزہ فاطمہ کی طرف سے بھی آپکو اطمینان  
عطا فرمادے، اِدہ رؤف بالعباد وانہ علی کل شئی قَدیر۔  
خود دعاؤں کے سبب و طالب ہوں۔  
اپنا پتہ لکھوا کر لفافہ سادہ رکھوارہا ہوں، مختصر لفظوں میں اپنی خیریت سے مطلع کر دیا  
جائے، عزیزہ انیس فاطمہ کو بھی سلام مسنون۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
محمد منظور نعمانی  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۴)

محمد منظور نعمانی  
۲۳ اگست ۱۹۹۱ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

عزیزم (۱) سلمکم اللہ تعالیٰ وعافاکم  
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا ملفوف خط بھی ملا جیسا کہ تم نے لکھا ہے حسان میاں نے مجھکو اسی وقت آپ کے  
والد ماجد مرحوم کے حادیثہ رحلت کی اطلاع دی تھی جب انکو یہ اطلاع ملی تھی۔ میرا مستقل  
معمول ہے کہ جب کسی بھی ایسے صاحب کے اس دنیا سے جانے کی اطلاع ہوتی ہے جن سے کچھ  
بھی تعلق یا تعارف ہو حسب توفیق انکے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔ اسکے بعد بھی جب خیال  
آجائے تو حسب توفیق دعا کرتا ہوں اور بصدقہ عموم تو تمام ہی اہل تعلق اور عام مومنین و  
مومنات کیلئے دعاء مغفرت و رحمت کا اہتمام ہر نماز میں نصیب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے جیسا تعلق تھا اللہ تعالیٰ انکے حق کے مطابق دعاء کا اہتمام اس  
عاجز کو نصیب فرمائے۔ آپ سب بھائیوں، بہنوں اور والدہ محترمہ کیلئے صبر جمیل اور آخرت

میں اس صدمہ کے اجر کی دعا کا اہتمام اللہ تعالیٰ اس عاجز کو نصیب فرماتا رہے۔  
خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

اب سب سے بڑی سخت حاجت بس یہ ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں ایمان، اعمال  
مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت اور عافیت کے ساتھ یورے ہوں، مقرر وقت آنے پر  
ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے اور ارحم الرحیمیں صرف اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادیں۔  
والدہ صاحبہ کو سلام مسنون اور ان سے بالخصوص دعا کی درخواست۔  
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
بقلم ضیاء الرحمن قاسمی

(۵)

محمد منظور نعمانی

۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

میری عزیزہ فاضلہ (۱) سلعمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم

سلام و رحمت

عزیزم مولوی محمد عمران سلمہ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ حمیرا سلمہا کا خط ملا اس سے تمہاری  
بڑی بیٹی کے حادثہ انتقال کی اطلاع ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔  
جوان صاحب اولاد بیٹی کے انتقال کا صدمہ ایک فطری بات ہے اللہ تعالیٰ تمکو اسکا پورا  
پورا اجر آخرت میں عطا فرمائے اور مرحومہ کے بچوں کی وہی پوری سہولت پرستی فرمائے۔  
تمہیں معلوم ہو گا کہ حضور ﷺ کی تین صاحبزادیاں جوانی کی عمر میں جن میں سے دو  
صاحب اولاد بھی تھیں حضور ﷺ کی حیات میں ہی انکا انتقال ہوا، فطری طور پر حضور ﷺ کو بڑا  
صدمہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مصیبت اور صدمے کے موقع پر انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کہنے کی  
تعلیم فرمائی ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ جب کسی بندے یا بندی کو کوئی صدمہ پہنچے تو وہ یقیناً تازہ

(۱) حقیقی بھانجی، مقیم سنبھل ضلع مراد آباد۔

کر لے اور اپنے دل کو یاد دلائے کہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں وہی مالک ہے اسکو اختیار ہے کہ جس بندے یا بندی کو جس حال میں چاہے رکھے اور ہم سب اسکے حضور میں پہونچیں گے، پھر وہ اپنی خاص رحمت سے ہمکو ان صدموں کا بھی اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

میری عزیزہ! جب تمہارے دل پر صدے کا اثر ہو اور خیال آئے تو دل اور زبان سے ادا للہ و ادا الیہ راجعون۔ پڑھ کر اپنے دل کو سمجھاؤ، انشاء اللہ اس سے سکون حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم اور سب سے زیادہ مہربان ہے آخرت میں جب وہ اپنے بندوں اور بندیوں کو دنیا میں پہونچنے والی تکلیفوں اور صدموں کا اجر و ثواب عطا فرمائے گا تو وہ بندے اور بندیاں کہیں گے کہ کاش! ایسے صدے ہمکو دنیا میں ہر روز پہونچا کرتے۔

تم مرحومہ بیٹی کیلئے مغفرت کی دعا کرو انکے بچوں کیلئے بھی دعا کرو اور اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے صبر کی توفیق اور اجر مانگو اس سے انشاء اللہ تمہارے دل کو سکون ہوگا۔

میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ میری اور تمہاری دعاؤں کو قبول فرمائے عزیزم فطین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ کو سلام مسنون، ان کیلئے بھی دعا کرتا ہوں اور تمہاری اور انکی دعاؤں کا طالب ہوں

والسلام  
استکتہ محمد منظور نعمانی  
بقلم ضیاء الرحمن القاسمی

(۶)

محمد منظور نعمانی

۹/ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مخلص مکرم بھائی اسماعیل منصوری صاحب (۱)! رید لطفکم

سلام و رحمت

۱۴/۱۳ دن ہوئے مولوی حسان سلمہ نے بتلایا کہ آپکا خط آیا ہے جس میں والدہ ماجدہ

مرحومہ کے انتقال کی اطلاع ہے، ادا للہ و ادا الیہ راجعون۔

(۱) خود مکتوب الیہ کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ الفرقان میں ذکر آچکا ہے۔ بیٹی کے ان اہل تعلق میں تھے جن سے والد ماجد کو بہت ہی انس تھا اور انکے فہم و تقویٰ کی بڑی قدر فرماتے تھے۔

مشہور حدیث ہے یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ جنت تمہاری والدہ کے قدموں کے نیچے ہے۔ آپ کے بارے میں جو اندازہ ہے اسکی بنا پر قریباً یقین ہے کہ مرحومہ و محترمہ کی خدمت کر کے جنت کا یہ استحقاق حاصل کر لیا ہوگا، اب بظاہر وہ راستہ بند ہو گیا ہے لیکن ایک دوسرا راستہ کھلا ہوا ہے وہ مرحومہ کیلئے برابر دعا کرنا۔

حدیث شریف میں ہے کہ یہاں سے جانے کے والوں کیلئے جب کوئی دعاء خیر کرتا ہے تو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص کرم اور عافیت ہوتی ہے تو وہ بندہ (یا بندی) دریافت کرتے ہیں کہ یہ تازہ عنایت کیسی ہے تو بتلایا جاتا ہے کہ تمہارے فلاں عزیز نے تمہارے لئے یہ دعا کی ہے یا کوئی عمل خیر کر کے ایصال ثواب کیا ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انکو اس عزیز کے بارے میں کسی قدر خوشی ہوتی ہوگی اور کس قدر محبت تازہ ہوتی ہوگی یہ دروازہ ہمارے آپ کیلئے برابر کھلا ہوا ہے۔

قرآن مجید میں والدین کیلئے مغفرت و رحمت کی اس عالم میں پہونچنے کے بعد برابر اپنے عزیزوں خاصکر یہاں اشتیاق رہتا ہوگا، اللہ تعالیٰ ہمکو آپکو توفیق دے کہ اپنے۔

سے والدین کیلئے بھی مانگا کریں، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ سے یہ دعا ہے۔  
اعمر لی ولوالدی وللعموم یوم یقوم الحساب۔

بندہ کا کچھ حال تازہ شمارے (جنوری فروری) سے معلوم ہو گیا ہوگا خود اس خط کی عبارت کی بے ربطی سے بھی آپ کچھ اندازہ کر سکیں گے، علاوہ دوسری تکلیفوں کے بولنا مشکل ہے، سننا بہت زیادہ مشکل ہے، آگے کے ذریعہ بھی مشکل سے سن پاتا ہوں، والحمد للہ علی کل حال۔

پچھلے دنوں بمبئی کے مسلم کش فسادات کی خبریں سنتا تھا آپ جیسے دوستوں کے بارے میں بڑی فکر ہوتی تھی لیکن مولانا علی میاں اور محمد بھائی کے درمیان جو فون سے باتیں ہوتی رہیں ان سے اتنا تو اطمینان ہوا کہ اپنے خاص احباب بفظلہ محفوظ ہیں اللہ کے جو بندے اس فسادات میں شہید ہوئے انکے لئے اور جسکو کوئی بھی نقصان پہونچا انکے لئے بھی بس دعا ہی کرے گا۔

اب بس اپنے بارے میں یہ فکر ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں، ایمان اعمال صالحہ کی توفیق، نعمتوں پر شکر، گناہوں سے استغفار کے اہتمام اور عافیت کے ساتھ پورے ہوں، مقرر وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے اور ارحم الراحمین محض اپنے رحم و کرم سے



مغفرت فرمادیں۔  
آپ سے بھی اسی دعا کا طالب ہوں اور آپ جیسے دوستوں کیلئے اللہ تعالیٰ سے اسی دعا کی  
توفیق مانگتا ہوں۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی  
بقلم ضیاء الرحمن محمود

(۷)

محمد منظور نعمانی  
۲۹ ذیقعدہ ۱۴۱۹ھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

برادر مکرم مولانا محمد انظر شاہ کشمیری صاحب (۱) احسن اللہ تعالیٰ البکم والیہا

سلام و رحمت

خدا کرے آپ معہ متعلقین بخیر و عافیت ہوں۔

میں اس وقت یہ سطر میں ایک خاص ضرورت سے لکھا رہا ہوں۔

مولانا مسعودی علیہ الرحمہ کے بارے میں الفرقان میں کچھ لکھانے کا ارادہ ہے اس  
سلسلہ میں مجھے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا حضرت الاستاد امام العصر نور اللہ مرقدہ  
سے مولانا مسعودی مرحوم کا قربت کا بھی کوئی تعلق تھا؟ میرا خیال ہے کہ یہ بات آپ سے  
معلوم ہو سکتی ہے۔

خدا کرے یہ میرا خط آپکو جلدی مل جائے اور آپکا جواب جلدی آجائے، آئندہ ماہ  
جولائی کا شمارہ زیر ترتیب ہے اسی کیلئے لکھانے کا ارادہ ہے۔

گزشتہ سال رمضان المبارک میں میں نے ایک خط آپ کو لکھایا تھا جسکا تعلق میری  
ایک ذاتی ضرورت سے تھا، اسی مضمون کا ایک خط برادر مکرم مولانا محمد سالم صاحب کو لکھایا تھا انکا  
جواب بھی مل گیا تھا، اللہ تعالیٰ انکو اپنی شانِ عالی کے مطابق جزائے خیر عطا فرمائے۔ لیکن آپکی

طرف سے جواب نہیں آیا کچھ دن تک یہ خیال رہا کہ آپ شاید سفر میں ہوں، زیادہ دن گزرنے کے بعد خیال کر لیا کہ ممکن ہے میرا خط آپ کو نہ ملا ہو یا آپ نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا ہو، اگر پہلی والی بات ہو یعنی میرا وہ خط آپ کو نہ ملا ہو تو برادر م مولانا محمد سالم صاحب سے دریافت کر لیں، میرا اندازہ ہے کہ میرا وہ خط انھیں یاد ہو گا۔ اگر ان سے معلوم ہو جائے تو اس بارے میں بھی چند سطریں لکھ دی جائیں۔ وأحرکم علی اللہ۔

یہ عاجز بندہ دعا کرتا ہے اور دعاؤں کا محتاج و طالب ہے اب سب سے بڑی حاجت بس یہ ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں، ایمان اعمال مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت، نعمتوں پر شکر، گناہوں سے استغفار کے اہتمام اور عافیت سے پورے ہو جائیں، مقرر وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے، اور ار رحمہم الراحمین محض اپنے رحم و کرم

بشرط یاد و سہولت برادران مکرم مولانا محمد سالم

سلام پہونچا دیا جائے اور ان حضرات سے بھی دعا کی درخواست

والسلام

محمد منظور

نوٹ قریباً دو ڈھائی سال سے خود کچھ لکھنے سے معذور ہو چکا ہوں جو کچھ لکھنا لکھانا ہوتا ہے دوسرے ہی کے قلم سے لکھاتا ہوں۔ والسلام آخراً

(۸)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۹ مارچ ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادران مکرم و محترم جناب حاجی احمد صالح جی و حاجی عبدالرزاق صالح جی (۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ حضرات کی طرف سے لکھے ہوئے خط کی فونو کاپی بمبئی سے ایک لفافہ میں پرسوں

۷ مارچ کو موصول ہوئی، حادثہ کے تفصیلات کا علم ہوا، دل دکھا اور متاثر ہوا، ہم عاجز بندے اللہ تعالیٰ رحیم و کریم سے دعا ہی کر سکتے ہیں وہی اپنے رحم و کرم سے قبول فرمائے اور جو عزیز حادثہ میں زخمی یا مجروح ہوئے ان سب کو کامل صحت عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہم کو اور آپ کو ایمان نصیب فرمایا اور اسکی بنیاد پر یقین ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کی مشیت اور حکم سے ہوتا ہے، اہل ایمان کو جو تکلیف پہنچتی ہیں اور جو صدمے ان پر آتے ہیں وہ انکے حق میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کی ایک شکل ہے، ایک طرف یہ تکلیفیں کفارہ سینات بنتی ہیں دوسری طرف ان صاحب ایمان مجروح و صحت کو اور ان کے بڑے چھوٹے عزیزوں قریبوں کو دعاؤں کی وہ کیفیت نصیب ہوتی ہے جو اسکے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور وہ دعائیں انکے حق میں رفع درجات کا وسیلہ بنتی ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اشد الناس بلاء الا سباء ثم الامثل فالامثل یعنی اس دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف انبیاء پر آتی ہیں انکے بعد ان لوگوں پر جو دینی لحاظ سے دوسرے سب لوگوں سے افضل ہوں اسکے بعد درجہ بدرجہ افضل لوگوں پر۔

اس سب کے باوجود ہم ضعیف اور کمزور بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت کی اور تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنے ہی کی دعا کرنی چاہئے، یہ بھی حضور ﷺ کی تعلیم ہے۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۹)

محمد منظور نعمانی

۲۰ مارچ ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

عزیزہ بہن کنیزہ فاطمہ (۱) ! سلام و رحمت

آپ کا خط پہونچا تھا میری طبیعت ناساز تھی اب بفضلہ تعالیٰ کچھ بہتر ہے اس وجہ سے جواب تاخیر سے لکھا رہا ہوں۔

آپ نے اپنے بیٹے محمد طاہر کا جو حال لکھا ہے اسکو سنکر دکھ اور افسوس ہوا یہ بندہ اللہ تعالیٰ سے صرف دعا ہی کر سکتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکی ذہنی اور دماغی اصلاح فرمائے

جو حال آپ نے لکھا ہے وہ میرے نزدیک ایک طرح کا مرض ہے میرا مشورہ ہے کہ کسی اچھے ماہر ہو میو پیٹھ ڈاکٹر سے علاج کرایا جائے۔ دعا کا بھی اہتمام کیا جائے۔  
تعوید لکھنا میرا معمول نہیں بس دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے آپ کیلئے اور آپ کے صاحبزادہ کیلئے بھی دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ دعا کا خاص اہتمام نصیب فرمائے اور اپنے کرم سے قبول فرمائے۔

حود و عاؤں کا محتاج اور طالب ہوں۔ خاص کر اس دعا کا کہ، جب تک زندگی ہے ایمان اور ایمان والے اعمال اور عافیت کے ساتھ پوری ہو، وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے، اور ارحم الراحمین محض اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادیں۔

بقلم

(۱۰)

محمد منظور نعمانی

۱۳ دسمبر ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

عزیزم محمود میاں (۱) سلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم

سلام و رحمت

خدا کرے آپ معہ متعلقین بخیر و عافیت ہوں۔

کئی ہفتہ گزر گئے آپ کا خط ملا تھا، میں نے پڑھوا کر سنا، اس سے کاروباری صورت حال معلوم کر کے دلی صدمہ اور دکھ ہوا، یہ عاجز بندہ دعا ہی کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بار بار دعا کا اہتمام نصیب ہوا، اور انشاء اللہ برابر دعا کرتا رہوں گا۔

میرے عزیز! یہ تو تم کو معلوم ہو گا کہ اس دنیا میں تکلیفیں حضرات انبیاء اور اولیاء کرام کو بھی ہوتی ہیں وہ ان حضرات کیلئے آخرت میں درجانی ترقیات کا وسیلہ بنیں گی، ایک حدیث شریف کا مضمون ہے کہ اس دنیا میں جس ایمان والے بندہ یا بندی کو جو تکلیف پہونچے اس کا بدلہ

(۱) مقیم لیٹر، (انگلینڈ) کتب الیہ بریلی کے اس خاندان کی یادگار ہیں جس سے بہت ہی عزیز گھریلو تعلق کا رشتہ استوار رہا۔ ان کے والد پروفیسر خلیق احمد مرحوم بریلی کالج میں استاذ تھے۔ یہ پورا خاندان تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہو گیا تھا۔

آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نہ کسی شکل میں دیا جائے گا لیکن ہم آپ ضعیف بندے ہیں ہمیں تکلیف اور تنگی دفع کرنے کیلئے اور عافیت اور خوشی حاصل کرنے کیلئے دنیوی تدبیریں اور محنتیں بھی کرنا چاہئیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرتے رہنا چاہئے۔

ایک مختصر سی دعا وضو کے درمیان حضور ﷺ سے ثابت ہے اس میں رزق کی وسعت کیلئے بھی دعا ہے بہت سے بندوں کا تجربہ ہے کہ اس دعا کا اہتمام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں رزق کی وسعت بھی عطا فرماتا ہے دعا یہ ہے: وضو کرتے وقت ایک یا زائد دفعہ پڑھی جائے۔

اَلْهُمَّ اَعْفِرْ لِي ذَنْبِي اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما دے

وَوَسِّعْ لِي فِي دَارِي اور میرے گھر میں وسعت عطا فرما

وَبَارِكْ لِي فِي رِزْقِي اور میرے رزق میں برکت عطا فرما

ایک خاص عمل رزق میں وسعت و برکت کیلئے ہمارے بزرگوں کے تجربے میں یہ رہا ہے، عشاء کہ نماز کے بعد با وضو (آپ اپنے گھر میں یا مسجد میں) رو بہ قبلہ بیٹھ کر پہلے گیارہ بار درود شریف پڑھیں پھر چودہ سو چودہ (۱۴۱۴) مرتبہ ”یا وَهَّابُ“ پھر ایک سو ایک بار ”یا وَهَّابُ اَهْبِ لِي مِنْ نِعْمَةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ“ پھر گیارہ بار درود شریف۔

وَهَّاب - اللہ تعالیٰ کے بابرکت ناموں میں سے ایک نام ہے جس کا مطلب ہے۔ عطا

فرمانے والا داتا۔

یا وَهَّابُ، کہتے وقت دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔ ”یا وَهَّابُ اَهْبِ لِي مِنْ نِعْمَةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ“ کا مطلب ہے اے عطا فرمانے والے داتا مجھے دنیا اور آخرت کی نعمتیں عطا فرما تو عطا فرمانے والا داتا ہے۔

ہر نماز کے بعد تسبیح فاطمہ اور کم سے کم تین دفعہ استغفار اور درود شریف کا بھی حتی الوسع اہتمام کیا جائے۔

یہ عاجز دعا کرتا ہے اور خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہے اپنی اہلیہ مکرمہ کو بھی سلام فرمادیں اگر ہمارے بھائی پروفیسر لئیق احمد صاحب (اپنے والد ماجد) کی خدمت میں خط لکھیں تو ان کو اور آپ کی والدہ محترمہ ہماری قمری بہن کو میری طرف سے سلام لکھ دیں، دعا بھی کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد منظور نعمانی

بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

# دور معذوری اور فکرِ ملت

”لیکن ترے خیال سے غافل نہ ہوں“



- ۱- حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ
- ۲- جناب منظور احمد صاحب، مالیگاؤں



100

1

2

100

100

100

100

100

محمد منظور نعمانی

۵ نومبر ۱۹۸۸ء

(۱)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

صدق محترم و معظّم (۱) احسن الله تعالى اليكم واليسا  
سلام و رحمت اكل عزيزم مكرم مولوی محمد غیاث الدین صاحب آئے تھے، انھوں نے  
آپ کا عنایت فرمایا ہوا المر تفضی کا نسخہ پہنچایا، مجھے بھی اشتیاق تھا، انشاء اللہ ضرور پڑھوا کر  
سنوں گا۔

معلوم ہوا تھا کہ 'المر تفضی' کے رسم اجراء کی جو تقریب ہو  
لئے مولانا رحمانی زید مجد ہم اور پروفیسر خلیق نظامی صاحب اور غاء  
تشریف لارہے ہیں۔ غالب گمان یہی ہے کہ ان حضرات کا قیام ۱۰  
ہوگا۔ افسوس ہے کہ میں بالکل اس حال میں نہیں ہوں کہ اس موقع پر  
اگر حاضر ہوتا تو خود ہی ان حضرات سے عرض کرتا، اب آپ سے اور مولانا رحمانی زید مجد ہم  
سے گزارش ہے کہ بابرہ مسجد کے قضیہ نے جو خطرناک شکل اختیار کر لی ہے اس موقع پر جمع  
ہونے والے حضرات کی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی بیان دیدیا جائے۔ اور اگر اس مقصد  
کے لئے وسیع پیمانے پر خواص اہل الرائے واصحاب دانش کا اجتماع بلانے کی رائے ہو جائے تو اس  
کے بارے میں فیصلہ فرمالیا جائے۔ ۲۶ نومبر کو دہلی میں بابرہ مسجد کے سلسلہ میں جو  
کانفرنس بلائی جارہی ہے اندیشہ ہے کہ اس کے بعد مسئلہ اور زیادہ خطرناک ہو جائے۔  
مجھے احساس ہے کہ میں علیل ہوں اور اس وقت کی میری رائے بھی علیل ہے لیکن اس  
مسئلہ کی خطرناکی کے احساس سے آپ حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنے کا شدید داعیہ  
ہے۔ جس میں اسلام اور امت مسلمہ کی خیر ہو، اللہ تعالیٰ اس کی طرف رہنمائی فرمائے اور مقدرو  
میسر فرمادے۔

والسلام  
بقلم ضیاء الرحمن محمود



لکھنؤ

۱۶ جون ۱۹۷۵ء

(۲)

ناسمہ سحانہ

برادر مکرم بھائی منظور احمد صاحب (۱) ریدت حسانتکم

سلام مسنون !

خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔ اور سب احباب و مخلصین بخیر ہوں۔

پچھلے مہینے مئی میں بڑودہ سے ایک صاحب ملا صالح بھائی کا ایک خط ملا تھا اس کی لفظ بلفظ نقل میں اس خط کے ساتھ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس میں مایگاڈوں کا بھی ذکر ہے۔ میں نے بہت سوچا کہ اس معاملہ سے متعلق مایگاڈوں میں کس کو خط لکھوں، غور و فکر کے بعد میں نے یہ مناسب سمجھا کہ میں خط بھیج تو آپ کو دوں۔ آپ وہاں کے علماء اور دوسرے خواص میں سے وہاں کے حالات کے لحاظ سے جن کے بارے میں یہ سمجھیں کہ وہ اس طرف خصوصی توجہ کریں گے آپ ان کو میرا یہ خط پہنچا دیں۔

غالباً مناسب یہ ہو گا کہ صرف دو چار مخلص اور صاحب فہم حضرات شروع میں اس بارے میں غور اور مشورہ کریں، پھر جن دوسرے حضرات کو مناسب سمجھیں شریک کریں۔

ملا صالح بھائی نے خط میں داؤدی بوہرہ جماعت کے اندر جس انتشار اور خلفشار کا ذکر کیا ہے اس کا ذکر اخبارات میں بھی آچکا ہے۔ بلاشبہ اس وقت اس کا بڑا امکان اور بڑی امید ہے کہ اگر صحیح طور پر ان لوگوں میں کام کیا جائے تو اللہ کے ہزاروں بندے ہدایت یاب ہو جائیں۔ یہ واقعہ ہے کہ داؤدی بوہرہ جماعت کے عقائد اسلامی عقائد سے بالکل مختلف ہیں۔ اور ان میں سے اگر کچھ لوگ اس مسلک کو چھوڑ کر صحیح اسلامی عقائد قبول کر لیتے ہیں تو عند اللہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی غیر مسلم کا اسلام قبول کر لینا۔ اس وقت ہم لوگوں پر یہ خاص فرض عائد ہوتا ہے کہ پہلے پورے غور و فکر سے طریقہ کار سوچیں اور ان لوگوں میں کام کریں، یہ کام بہت خاموشی سے ہونا چاہئے۔ غالباً انفرادی ملاقاتیں زیادہ مفید ہوں گی۔ اور مقامی حضرات ہی یہ کام اچھی طرح کر سکیں گے۔ مایگاڈوں میں اہل علم اور اہل فہم بھی ہیں اور الحمد للہ دوسرے مخلصین بھی

ہیں، میں یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اس خاص کام کی طرف توجہ دلاؤں۔ اس کام پر آخرت میں بڑے اجر و ثواب کی امید ہے، شاید یہی مغفرت کا وسیلہ بن جائے۔

گزشتہ سال دیوبند میں جو حادثہ مجھے پیش آیا تھا اس کے بعد سے میں سفر بہت کم کرتا ہوں، غیر معمولی شدید ضرورت ہو تو سفر کرتا ہوں، بظاہر اس کام کے سلسلہ میں میرے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر طریقہ کار سے متعلق مشورہ کے سلسلہ میں میرا کہیں جانا مفید ہو سکتا ہو تو میں اس کام کے لئے سفر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

میں نے اسی طرح کے خطوط سورت، راندیر اور بمبئی کے بعض مخلصین کو بھی لکھے ہیں۔

میرے قلب پر اس کام کا بہت سخت تقاضا ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ اگر خلاصہ دانشمندی اور خاموشی کیساتھ یہ کام کیا گیا تو اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو ہدایت یاب کر دے گا۔ اور عجب نہیں کہ یہی کام ہماری آپ کی کہ اوپر لکھ چکا ہوں، حضرات علماء کرام اور دوسرے مخلص حضرات کو میرا یہ خط دکھایا جائے۔ یہ گویا میری طرف سے درخواست ہے۔ آپ صرف وسیلہ اور قاصد ہیں وہ اس مسئلہ پر باہم بورہ ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دلوں میں صحیح تدبیر ڈالے اور اس کار خیر میں ہماری آپ کی رہنمائی فرمائے۔

والسلام  
محمد منظور نعمانی  
بقلم محمد حسان نعمانی

"بانی الفرقان نمبر" کے لئے اپنی نیک خواہشات پیش کرتے ہیں



**GULSHAN MEDICARE**

Word of Trust

Approved by Gulf Corporation Council

دہلی یا بمبئی کی دوڑ دھوپ کا خاتمہ

عرب ممالک کو جاے والوں کے لئے میڈیکل کرایے کی سہولیات لب لکھنؤ میں

گلف کارپوریشن کو سبل کی طرف سے تصدیق یافتہ

**گلشن میڈیکل**

۶-نبی اللہ روڈ، نزد سٹی اسٹیشن، لکھنؤ - ۱۸ فون نمبر : 223662

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی

**خطبات ماجد یا ہدیۂ زوجین**

اسلامی تعلیمات برائے زوجین کی ایک جامع و مکمل کتاب جو ہر مومن مرد و عورت کے لئے بے حد کار آمد ہے۔

اس پر عمل کر کے اپنی زندگی آسان بنائیں۔

**تحفۂ تبلیغ**

اہل تبلیغ کے لئے ایک نادر و نایاب تحفہ جو تبلیغ و موعظت کی راہ میں بیحد مفید ہے۔

اسٹاکسٹ وڈ سٹری پیوٹرس

مکتبہ الحرمین مرکز والی مسجد، کچھری روڈ، لکھنؤ

فون : 217956

## متفرقات

بنام

- ۱- مہتمم مدرسہ فلاح دارین، ترکیسر
- ۲- جناب بھائی اسرار احمد صاحب، لکھنؤ
- ۳- جناب رئیس علی صاحب، رحیم آباد، ضلع لکھنؤ
- ۴- مولانا نیاز احمد رحمانی صاحب، (جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ، مونگیر، بہار)



محمد منظور نعمانی

۲۶ مارچ ۱۹۸۸ء

محترمی و کرمی (۱) احسن الله تعالى اليكم واليا  
و عليكم السلام ورحمة الله وبركاته الحمد لله اس حال میں ہوں کہ کوئی خاص اذیت  
اور تکلیف نہیں ہے، کبر سنی کے ضعف کے علاوہ امراض و عوارض بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو  
کفارہ سینات اور آخرت میں نجات کا وسیلہ بنائے۔

یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ اس سال دارالعلوم فلاح دارین سے ۲۲ طلبہ دورہ  
حدیث سے فارغ ہوئے، اللہ تعالیٰ ان حضرات کے علم میں برکت عطا فرمائے، اخلاص نصیب  
فرمائے، اور علم دین و نیابت نبوت کی ذمہ داریوں کا صحیح احسا  
فرمائے، علم دین کے ہم طلبہ اور مشغولین کے لئے حضرت  
لرزادینے والی ہے، جو مشکوٰۃ المصابیح میں بھی صحیح مسلم کی  
ہے (۲)۔

افسوس ہے کہ ہمارے طبقہ میں علمی انحطاط کے ساتھ بدلہ اس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔  
کی کمی ہے، حالانکہ ہمارے مدارس کے نصاب میں حدیث کی پہلی کتاب مشکوٰۃ اور آخری کتاب  
صحیح بخاری دونوں کا آغاز مشہور حدیث پاک ”امما الاعمال بالیات الح“ سے کیا گیا ہے، اللہ  
تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کا احساس اور اہتمام نصیب فرمائے۔  
یہ عاجز دعاؤں کا سخت محتاج طالب ہے، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کے لئے اور دارالعلوم  
کے لئے دعا کا کما حقہ اہتمام نصیب فرمائے اور قبول فرمائے۔

محترمی مولانا عبد اللہ صاحب زید مجد ہم کی خدمت میں سلام مسنون، اُن سے بھی دعا کا  
طالب ہوں۔  
والسلام علیکم ورحمة اللہ  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود

(۱) مہتمم صاحب دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر۔ سورت (۲) حدیث میں دین کا علم تام و نمود کے لئے حاصل کرنے  
طلوں کا یہ انجام بتایا گیا ہے کہ وہ سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ ان لوگوں کے ساتھ ایسے ہی شہیدوں اور  
نیک کاموں میں خرچ کرنے والے مالداروں کا بھی یہی انجام بتایا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے اس کے راوی بیان  
کرتے ہیں کہ آپ نے اس حدیث ————— (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲)

محمد منظور نعمانی

۷ اپریل ۱۹۸۸ء

مخلص مکر مہائی اسرار احمد صاحب! ریت حسنا تم

سلام و رحمت!

اس وقت آپ کے مدرسہ جیلانیہ میں دستار بندی کا جلسہ جاری ہوگا، کل شام مجھے اس کا دعوت نامہ اطلاع نامہ آپ کی طرف سے کسی صاحب نے پہنچایا تھا، افسوس ہے کہ اپنی معذوری کی وجہ سے میں اس میں شرکت کی سعادت سے محروم ہوں۔

خاص کر ہمارے اس زمانہ میں حفظ قرآن کی توفیق اللہ تعالیٰ کا بڑا خاص انعام ہے، اللہ کا جو بندہ اپنے کم سن بچے کو حافظ قرآن بنانا چاہتا ہے وہ اپنے پیارے بچے پر کم عمری میں بڑا بوجھ ڈالتا ہے۔ پھر یہ ایسا بوجھ ہے کہ زندگی میں کبھی بھی بچہ اس سے فارغ اور بے فکر نہ ہوگا، زندگی بھر یاد رکھنے کی محنت کرنی پڑے گی، اور دنیا میں زندگی بھر کی اس محنت سے کوئی دنیوی نفع حاصل نہ ہو سکے گا، اسلئے اللہ کے جو بندے اپنے بچوں کو قرآن پاک حفظ کراتے ہیں، ان کے سامنے اللہ کی رضا اور آخرت کے ثواب کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا، میرے نزدیک اس وقت یہ خصوصیت صرف حفظ قرآن کو حاصل ہے، اس کا اجر و صلہ اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق آخرت میں بچوں کے والدین کو اور خود اس حافظ کو عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت کے سمجھنے کی توفیق ہم سب مسلمانوں کو عطا فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود قاسمی

---

کو بیان کرنا چاہتا تو تیس دفعہ ایسا ہوا کہ شروع کرتے اور مارے دہشت کے بیہوش ہو جاتے۔ اس حدیث کی ترمذی شریف (ابواب الزہد) کی روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ حدیث معاویہؓ کے سامنے بیان ہوئی تو ان کا روتے روتے یہ حال ہوا کہ گویا ہلاک ہو جائیں گے۔ (مرتب)

(۳)

محمد منظور نعمانی

۲ جولائی ۱۹۸۸ء

عزیزم میاں رئیس علی صاحب (۱) سلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم  
سلام و رحمت، خدا کرے آپ اور سب متعلقین بخیر و عافیت ہوں۔

ہمارے مخلص ترین دینی بھائی اور دوست آپ کے والد ماجد مرحوم شیخ فیاض علی صاحب کے حادثہ انتقال کے بعد آپ نے جب پہلی دفعہ آم کی فصل آنے پر ان کے معمول کے مطابق آم بھیجے تھے تو اس کے ساتھ مجھے خط بھی لکھا تھا، اس میں آپ نے لکھا تھا کہ میں والد صاحب مرحوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کو یہ آم بھیج رہا ہوں جو صاحب آم اور آپ کا یہ خط لائے تھے وہ دیکر حطّ

گزشتہ سال بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے آپ کو خط لکھا تھا غائباً

رحیم آباد ہاؤس لکھنؤ کے پتے پر لکھا تھا یا بانی نگر کے پتے پر (آ

کوئی صاحب آپ کی طرف سے آم پہنچا گئے، مجھے بعد میں

ہوں، یہ ایک صاحب کے ذریعہ رحیم آباد ہاؤس بھیجوں گا، اگر وہاں سے نہیں باقی نگر رہتا ہے تو پھر ڈاک سے باقی نگر روانہ کر دیا جائیگا، خدا کرے پہنچ جائے۔

مجھے آپ کو صرف یہ لکھنا ہے کہ مرحوم و مغفور بھائی شیخ فیاض علی صاحب کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ آم کی فصل آنے پر وہ آموں کا تحفہ بھیجتے (اللہ تعالیٰ ان کے ہر بار کے تحفے کو قبول فرمائے اور اس کے حساب میں جنت کے بہتر سے بہتر پھل ان کو عطا فرمائے۔) بلکہ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر دو تین مہینے کے بعد تشریف لاتے، ان کی نوٹ بک میں کچھ سوالات لکھے ہوئے ہوتے وہ دریافت فرماتے، میں اگر جواب دے سکتا تو جواب دیدیتا، بہر حال وہ سال میں کم سے کم چار پانچ مرتبہ ملاقات بھی فرماتے اور کچھ دینی خدمت بھی لیتے۔

میرے عزیز! شاید آپ کو معلوم ہو کہ میں ایکسڈنٹ کے نتیجے میں قریباً تیرہ سال سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہوں، میرا بستر ہی میری مسجد ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں خود کبھی کبھی رحیم آباد ہاؤس آیا کرتا۔ بہر حال آپ سے کہنا یہ ہے کہ آپ کا تحفہ بسر و چشم قبول۔ آپ کے لئے اور آپ کے گھرانے کے لئے دعا بھی کرتا ہوں لیکن اپنے والد صاحب مرحوم و



مغفور کے نقش قدم پر چلنے والی بات جب صحیح ہوگی جب کبھی آپ اُن کی طرح میرے پاس آنے کی زحمت بھی برداشت کریں اور مجھے کچھ دینی خدمت کرنے کا موقع ملے۔  
 دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دینی و دنیوی سارے معاملات میں آپ کو اپنے مرحوم و مغفور والد صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی پوری توفیق عطا فرمائے، اور اس کا فضل و کرم ہر طرح آپ کے شامل حال رہے۔

والسلام  
 محمد منظور نعمانی  
 بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۴)

محمد منظور نعمانی  
 ۲۷ فروری ۱۹۸۹ء

برادر مکرم جناب مولانا نیازا احمد رحمانی صاحب (۱) ! رید مجدکم  
 وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
 فیس رکنیت کی یاد دہانی کے سلسلہ میں عنایت نامہ کل موصول ہوا۔ میرا یہ مستقل معمول ہے کہ رکنیت کی فیس کے بارے میں جب بھی یاد دہانی کی جاتی ہے میں روانہ کر دیتا ہوں۔  
 مجھے اتنی بات یاد ہے کہ ۱۹۸۷ء کے اواخر میں آپ کی طرف سے اسی طرح یاد دہانی فرمائی گئی تھی، میرے ذمہ اس وقت تک کی فیس جو واجب الادا تھی وہ میں نے روانہ کر دی تھی، مجھے مقدار صحیح یاد نہیں، آپ نے ایک سو پینتیس (۱۳۵) تحریر فرمائے ہیں، یہی رقم بھیجی گئی ہوگی۔

مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں جو عریضہ لکھا تھا، اس میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ آئندہ سال ختم ہونے سے پہلے یاد دہانی فرمادی جائے، میرے لئے یہ آسان ہے کہ ہر سال کی فیس اسی سال میں روانہ کر دی جائے۔ بہر حال میرے خیال اور میری یاد کے مطابق

۱۹۸۸ء کی فیس میرے ذمہ واجب الادا ہے، ۸۹ء شروع ہوا ہے، اسکے نصف آخر میں کسی وقت بھی یاد دہانی فرمادی جائے، بشرط حیات انشاء اللہ حسب معمول روانہ کرادونگا۔  
اس وقت ۸۸ء کی فیس مبلغ پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کرائی جا رہی ہے۔  
دعاؤں کا محتاج و طالب اور دعا گو ہوں۔

بشرط یاد و سہولت حضرت مولانا منت اللہ صاحب زید مجدہم کی خدمت میں سلام  
مسنون اور دعا کی درخواست۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ  
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود

Feroz Alam  
Prop

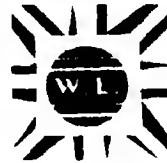
☎ : 230280  
(R) 261680

# Work Line

## Photo Offset Process System

Specialist in

- ⊕ Negative,
- ⊕ Positive,
- ⊕ 4 Colour Job,
- ⊕ Colour Cutting,
- ⊕ Plate Making



155/313, Behind Wahab Mansion, Moulviganj, Lucknow

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی خصوصی اشاعت

بہ یوگار حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی بے نظیر مقبولیت کے لئے ہم دست بدعا ہیں۔

## آزاد فائر ورکس اینڈ امبریلاس

یحی گنج، لکھنؤ



ٹیلیفون :

آفس : 266601

رہائش : 251038, 264910

ٹیلیگرام :

جل ساتھی

جناب فضل حق عارف خیر آبادی

## ”گلشنِ علم و عمل کی پڑ گئی مدھم بہار“

بیکرِ صدق و صفا تو خادمِ دینِ متین  
آسمانِ علم کا عزت نشانِ ماہِ مبین

اہلِ دل اہلِ نظر کی صف میں تھا تو باکمال  
عصرِ حاضر میں نہیں ملتی کوئی تیری مثال

سوئی سونی علم کی محفل ہے اب تیرے بغیر  
مطمئن ہو زندگی مشکل ہے اب تیرے بغیر

تو حدیثِ مصطفیٰ ﷺ کا نکتہِ دال و ترجمان  
ملتِ بیضاء کا تو بیشک تھا میرا کاروان

پاک ظاہر، پاک باطن، پاک طینت، پاکباز  
اپنے ہم معروں میں حاصل تھا تجھے اک امتیاز

قوم اک انگشتری اس کا نگینہ تیری ذات  
محفل علمائے دیں میں آگینہ تیری ذات

تیری ذات خاص خوش اخلاق و خوش اطوار تھی  
شاہراہ دین و ملت تجھ سے پر انوار تھی

تو بلاشبہ خدائے پاک کا منظور تھا  
تیرا ”نعمانی“ لقب ہر چار سو مشہور تھا

مسلک دیوبند کا تو ترجمان و حق نگار  
یعنی پوری زندگی تیری رہی سنت شعار

تیری حق گوئی سے بدعت کا ہوا سینہ فگار  
اہل بدعت تیری ضربوں سے ہوئے زار و نزار

رحلتِ منظور نعمانیؒ سے عارف سو گوار  
گلشنِ علم و عمل کی پڑ گئی مدھم بہار



# کارزارِ حیات میں!

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ  
آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ  
لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا  
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي  
سَبِيلِ اللَّهِ - أُولَٰئِكَ هُمُ  
الصَّادِقُونَ

”مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اسکے رسول پر، پھر شک میں نہیں پڑے، اور جہاد کیا  
اپنے مال اور اپنی جانوں سے، اللہ کی راہ میں، یہی ہیں سچے۔“ [القرآن ۱۵/۴۹]

[اس مضمون میں اقتباسات کی کثرت اور طوالت کی وجہ سے  
اقتباس کی کتابت کا طرز عام طرز سے کچھ مختلف کر دینا پڑا ہے۔]

# بانوے / چورانوے سالہ زندگی

## منزل بہ منزل

بسم الله الرحمن الرحيم

### پیدائش

آپ کے آبائی وطن سنبھل کے میونسپل بورڈ والے سرکاری اندراجات لو اریٹج تسلیم کر لیا جائے تو آپ نے ۱۸ جنوری ۱۹۰۶ء (مطابق ۲۲/ ذی قعدہ ۱۳۲۳ھ) کو اس خاکدانِ عالم میں قدم رکھا، لیکن خود آپ کی اپنی ایک تحریر کی رو سے آپ کی پیدائش کا مہینہ شوال ۱۳۲۳ھ ہے۔ (جسکی مطابقت جنوری ۱۹۰۶ء کے بجائے دسمبر ۱۹۰۵ء سے ہوتی ہے) آپ کی یہ تحریر الفرقان بابت ماہ ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ میں شائع ہونے والے آپ کے ایک مضمون ”میری زندگی کے تجربات اور خاص خاص واقعات“ کی تمہید میں پائی گئی ہے۔ اس میں فرمایا ہے کہ ”اس نامہ سیاہ“ محمد منظور (عفا عنہ ربہ الغفور) کی عمر بھی اس گزرے ہوئے شوال میں چالیس سال پوری ہو گئی۔“ اس بیان کی رو سے یہ سمجھا جانا چاہئے کہ میونسپل بورڈ کے کاغذات میں اندراج کچھ دیر سے ہوا۔ یہ اندراج اگر صحیح وقت پر ہوتا تو جنوری ۱۹۰۶ء کے بجائے دسمبر ۱۹۰۵ء کی کوئی تاریخ آپ کی تاریخ پیدائش کے خانے میں درج ہوتی (۲)۔

- شمس سال کے حساب سے عمر تقریباً بانوے سال ہوئی۔ اور قمری حساب سے پورے چورانوے سال۔

(۲) مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا بیان ہے کہ ایک صحبت میں انکی موجودگی میں یہ فرمایا تھا کہ ”میری تاریخ پیدائش ۱۸ شوال ۱۳۲۳ھ ہے“ اور اس کو انھوں نے نوٹ کر لیا تھا۔ اس بیان سے جہاں قمری مہینے کی تاریخ معلوم ہو جاتی ہے وہاں دسمبر ۱۹۰۵ء کے بارے میں بھی متین ہو جاتا ہے کہ اسکی تاریخ تھی۔



## خاندانی ماحول

سنجھل کے بارے میں تو تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ہندوستان میں ٹرکانِ احرار کی ابتدائی آمد ہوئی تو ان کی ایک بڑی تعداد نے سنجھل اور اس کے قرب و جوار کو وطن بنالیا۔ آپ کا گھرانہ، بلکہ سنجھل کا وہ پورا محلہ (دیہ پاسرائے) جس میں یہ گھرانہ آباد ہے انہی ٹرکانِ احرار کی یادگار ہے۔ آپ کے والد ماجد (اور راقم الحروف کے دادا صاحبؒ م ۱۹۳۸ء) کے بارے میں الفرقان میں بھی آچکا ہے۔ اور گزشتہ سال شائع ہونے والی کتاب ”تحدیثِ نعمت“ میں بھی ذکر ہوا ہے کہ وہ دین اور دنیا پر لحاظ سے نہایت خوش قسمت لوگوں میں سے تھے۔ صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ کی دولت سے مالا مال ہونے کی بنا پر ”صوفی“ نام کا جزء بن گیا تھا۔ یعنی صوفی احمد حسین یا صوفی جی کہلاتے تھے۔ اور اللہ نے دنیاوی رفاہیت کے ساتھ عزت و وجاہت بھی باوجود بالکل سادہ صوفیانہ و درویشانہ رہن سہن کے، اتنی عطا فرمائی تھی کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی جو ان کے محلے میں قدم رکھتا لازم تھا کہ ان کے دروازے پر تھوڑی دیر ضرور بیٹھے۔ اولاد کے معاملے میں بھی اللہ نے انھیں بہت خوش قسمت کیا تھا۔ مجموعی طور پر انکے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ اور اللہ کے کرم سے سب کے سب دین کے معاملے میں اپنے والد کے نقش قدم ہی پر رہے۔

والد ماجد (یعنی حضرت بانی الفرقان) ان میں چوتھے نمبر پر تھے، آپ کے اوپر دو بھائی شیخ غلام امام صاحب اور مولوی محمد حسن صاحب اور ایک بہن تھیں۔ ان کی والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد دادا صاحب (صوفی احمد حسین صاحب) نے عقد ثانی فرمایا تو ان دوسری اہلیہ کے بطن سے سب سے پہلے آپ (والد ماجد) کو وجود ملا، آپ کے بعد تین بھائی اور دو بہنیں علی الترتیب یوں تھے۔ حاجی محمود حسین صاحب، حلیمہ بی بی، مولوی حکیم محمد احسن صاحب، ساجدہ خاتون اور محمد عارف صاحب۔ (۱) راقم الحروف کو الحمد للہ ان سب کو (سوائے محمد عارف صاحب) کم

(۱) ان میں سے محمد عارف صاحب تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے باقی سب نے اپنی عمر اللہ کے فضل سے بہر حال پائی کہ اپنے بعد بولا چھوڑی۔ اور دوا جان مرحوم کی ننکی دیک ننکی کے طفیل ان سب کی اولاد میں بھی دین و شریعت کا عالمی لحاظ قائم رہا اور ہے کہ اب بھی یہ گھرانہ صالحین ہی کا گھرانہ شمار ہوتا ہے۔ محمد عارف صاحب مرحوم کے سوا چار بیٹے صاحب اولاد ہوئے ان میں سے ایک کے یہاں تو زینہ اولاد تھی بیٹیاں ہی تھیں۔ ایک بیٹا ہوا جو بچپن ہی میں انتقال کر گیا باقی چار میں سے ہر ایک کی اولاد میں کم از کم ایک عالم دین ضرور ہے۔ مولود رکرا صاحب استاذ حدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ ہمارے بڑے تایا شیخ غلام امام مرحوم کے فرزند ہیں جو کہ خود عالم نہ تھے، ان کے سب سے بڑے بیٹے (محمد فضیل صاحب) بھی عالم تھے جن کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے استاذ ندوہ مولانا محمد عارف سنجھل ہمارے مرحوم چچا محمود حسین صاحب کے بیٹے ہیں۔ یہ چچا بھی خود عالم نہ تھے، سب سے چھوٹے چچا مولوی محمد احسن صاحب کے چھ بیٹوں میں سے بھی دو عالم ہیں، اور چھاندیہ العلوم سنجھل کے ذمہ دار ہیں، تایا مولوی محمد حسن صاحب کے یہاں بیٹا نہ تھا، مگر سب بیٹیوں کو باقاعدہ ترجمہ قرآن پڑھایا، اور ان میں سے ایک اپنے زیادہ تعلیمی ذوق کی وجہ سے مولوی بن گئی ہیں۔

و بیش اچھی طرح دیکھنے کی سعادت ملی۔ سب میں اپنے والد کی نیکیوں اور طور طریق کا عکس تھا۔ غالباً سبھی تہجد گزار تھے، اور بیٹوں میں سے تین تو باقاعدہ فارغ التحصیل عالم دین بھی، جن میں ایک حضرت والد ماجد (بانی الفرقان) ہیں۔

تعلیم

تعلیم کی سرگذشت بھی الفرقان کے صفحات میں بعض موقعوں پر آچکی ہے اور ”تحدیثِ نعمت“ میں بھی مجملًا ذکر آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سال کی عمر تک تعلیمی حال بالکل ہی ناقابلِ رشک تھا۔ اس کی کچھ تفصیل ”میری زندگی کے تجربات“ والے مضمون میں ملتی ہے۔

### ابتدائی تعلیم

”قرآن شریف ناظرہ اور معمولی سی اردو پڑھانے کے بعد ہی فارسی

کے بعد بہت چھوٹی عمر ہی میں (یعنی عمر کے غالباً آٹھویں یا نویں سال میں) عربی

شروع کرادی گئی۔ میرا اندازہ ہے کہ اگرچہ میں اس ہی عمر میں عربی کی ابتدائی تعلیم

ہے کہ ”میزان الصرف“ اور ”صرف میر“ و ”نحو میر“ وغیرہ کے ذریعے ہمارے۔

و نحو کی ابتدائی تعلیم کا جو مشکل طریقہ عموماً رائج ہے، میری سمجھ ابھی اس سے استفادہ کرنے کے قابل نہیں ہوتی تھی، اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ اگرچہ استاد کی مار کے ڈر سے میں گردائیں اور قاعدے بھی زبانی یاد کر لیتا تھا لیکن کچھ نہ سمجھتا تھا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ ظاہر

ہے کہ ایسی حالت میں ہر پڑھا ہوا سبق درحقیقت میرے لئے بے پڑھائی رہتا تھا اور جب میری تعلیمی خامی دیکھ کر یا کسی دوسری

وجہ سے میرے گھر والے مجھے ایک کتب یا ایک مدرسے سے دوسرے کسی کتب یا مدرسے میں بھیجتے تھے تو وہاں کے استاد مجھے پھر

پچھے ہٹا دیتے تھے اور مجھے وہی پڑھی ہوئی کتاب پھر پڑھانی شروع کی جاتی تھی، اور غضب یہ ہے کہ پھر اسی طریقہ سے پڑھائی جاتی

تھی جس سے میں اس عمر میں استفادہ کے قابل نہیں تھا۔ مجھے اب یاد بھی نہیں رہا کہ ان دنوں میں کتنی دفعہ میں نے کون کون

کتاب کہاں کہاں پڑھی ہاں اتنا یاد ہے کہ ”میزان“ سے لے کر ”علم الصیغہ“ اور ”ہدایت الخو“ تک قریباً ہر کتاب ہی میں نے دو تین

بار ضرور مختلف مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھی ہے اور مجھے یاد نہیں کہ ان پڑھانے والے برادروں میں سے کسی نے مجھے اس طریقہ

سے پڑھانے کی کوشش کی ہو جو طریقہ میری اس وقت کی عمر اور فہم کے مناسب ہو سکتا تھا اور جس کا میں متحمل ہو سکتا تھا۔

ایک تو وہ عمری کمیل کو اور پڑھنے لکھنے کے کام سے جان چڑانے کی تھی پھر تعلیم کے اس غلط طریقہ نے پڑھنے کی طرف

سے دل اور بھی اچاٹ کر رکھا تھا اور مجھے خوب یاد ہے کہ گھر پر اور مدرسے میں پڑھنے کے خوف کے سوا کوئی اور محرک اور دافعہ مدرسے

جانے اور سبق پڑھنے کے لئے گویا تھا ہی نہیں۔ افسوس ہے کہ اس غیر شعوری تعلیم میں اس طرح میرے پانچ، چھ برس ضائع ہوئے۔

اس کے بعد میں ایک نئے استاد کی خدمت میں پہنچا گیا (۱)۔ انھوں نے میری حالت جانچنے کے بعد مجھ سے فرمایا

(۱) تحدیثِ نعمت میں ان استاد محترم کا نام مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی بتایا گیا ہے۔

کہ اگر خود تھمار ارادہ پڑھنے کا ہو تو ہم تم کو اس سر نو پڑھائیں گے، لیکن تھمار اوقت زیادہ خراب نہیں ہوگا، چنانچہ انھوں نے پڑھ شروع کیا اور چونکہ ان کا طریقہ تعلیم صحیح تھا نیز عمر کے ساتھ میری سمجھ کا درجہ بھی بڑھ گیا تھا اسلئے اب جو کچھ وہ پڑھا اور بتاتے وہ مجھ لگا اچھی طرح ذہن کی گرفت میں آ جاتا تھا جس کی وجہ سے سبق کی بہت زیادہ مقدار بھی طبیعت پر بار نہیں ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حو کا م پچھلے پانچ چھ برس میں نہیں ہوا تھا وہ مجھ اللہ یہاں پانچ چھ مہینے سے بھی کچھ کم ہی میں ہو گیا اور اب خود اپنی طبیعت بھی پڑھنے کے لئے کھل گئی ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت میں صرف میں فضول اکبری اور غم میں کافیہ اور منطق میں مرقات تک کی کتابیں میں نے پڑھ لیں اس کے بعد سنہیل کے مشہور درسی عالم حضرت مولانا کریم بخش صاحب (م ۱۳۱۰ھ) قی مگرانی اور خدمت میں دیکر میں مولانا (م ۱۳۱۰ھ) بھیج دیا گیا (۱)۔ جہاں کے ایک مدرسہ میں مولانا موصوف صدر مدرس تھے میں پورے تین سال اس مدرسہ کا طالب علم رہا اور ان تین سالوں میں درسی متوسطات قریب قریب پوری ہو گئیں، جہاں تک یاد ہے غالباً میں نے میز زائد رسالہ مع حواشی علام بخٹی، شرح ہدایہ، الحکمتہ للسمیعہ، حسامی، شرر عقائد نسفی، دیوان حنفی، تک کی درسی کتابیں ان تین سالوں میں اسی مدرسہ میں پڑھیں۔ جس اتفاق سے یہاں مجھے دو تین سالہ ایسے مل گئے جو بڑی محنت سے پڑھتے تھے انھیں دیکھ کر مجھے بھی محنت کا شوق ہوا اور اس جذبہ مسابقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسا اوقات رات کے دو تین بجے تک میں اپنی ریر درس کتابوں کے مذاکرہ یا مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔

اس کے بعد استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب مرحوم وطن عزیز سنہیل ہی کے ایک مدرسہ میں صدر مدرس ہو کر وہیں رہ گئے، میں بھی اس سال وہیں رہا اور اس تمام سال میں صرف معقول کی لقیہ درسی (اور بعض غیر درسی بھی) کتابیں پڑھیں یعنی حمد اللہ، قاضی مبارک، بحر العلوم، شرح سلم، میرزا ہدایہ جلال، اسکا حاشیہ بحر العلوم، صدرہ، شمس بازغہ، خیالی، میز راہد امور عامہ، موقع تلوغ، اسکے علاوہ دیبانت میں اس سال جلالیس کے صرف ابتدائی چند پارے بھی پڑھے، چونکہ حضرت استاد مرحوم کی مجھ پر خاص عنایات تھیں اور ان معقولی کتابوں کے درس میں انھیں خاص امتیاز حاصل تھا اور میں بھی اس زمانہ میں واقعی ”طالب علم“ بنا ہوا تھا، یعنی مطالعہ وغیرہ میں بہت محنت صرف کرتا تھا، اسلئے ان ”معقولات“ میں مجھے امتیاز حاصل تھا یہاں تک کہ شمس بازغہ اور میرزا ہدایہ امور عامہ کے تو غالباً وہی چار سبق پڑھ کر حضرت استاذ کو رخصت دینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اور خود ہی ان دونوں کتابوں کو اس طرح دیکھ ڈالا کہ چند مہینوں کے بعد جب دارالعلوم دیوبند جانا ہوا تو داخلہ کے امتحان میں بھی ان دونوں کتابوں کو غالباً میں نے لکھا یا تھا۔“

## طالب علمی کے آخری دو سال

### دارالعلوم دیوبند میں

”اپنی تعلیم کی جس منزل کا میں نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے، یہاں تک پہنچتے پہنچتے ”معقولات“ میں تو اگرچہ میں نے مروجہ درسی کتابوں سے گذر کر بعض غیر درسی کتابیں بھی پڑھ ڈالی تھیں، لیکن دینیات کا حال یہ تھا کہ ”ہدایہ اولین“ بھی نہیں پڑھی تھی ہاں جیسا کہ ابھی عرض کیا صرف جلالین کے ابتدائی تین چار پارے ضرور پڑھے تھے اور اس کے بعد یہ اندازہ کر کے کہ کتاب بہت آسان ہے سبق میں حاضر ہوتا ہی چھوڑ دیا تھا (اگرچہ دوسرے رفقاء درسی نے کتاب قریب قریب ختم ہی

(۱) یہاں مولانا سے پہلے کے ایک سال کا ذکر رہ گیا ہے۔ ”محمدیہ نعمت“ کے مطابق حضرت مولانا کریم بخش صاحب کے ساتھ پہلا سال دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں گزرا تھا، جو شوال ۱۳۰۹ھ تا شعبان ۱۳۱۰ھ تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا کریم بخش صاحب دارالعلوم مولانا قسریہ لے گئے اور تین سال وہاں رہے۔

کر کے چھوڑی) بہر حال مجھے یہ عرض کرتا ہے کہ تعلیم کی اس منزل تک میں ”دینیات“ میں گویا کورا تھا، رمضان مبارک ۱۳۳۳ھ میں آگے کی تعلیم کیلئے جب دارالعلوم دیوبند جانے کا میں نے ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ جو کتابیں وہاں جا کر میں پڑھنا چاہتا ہوں، وہاں کے قانون کے مطابق، فقہ میں کم از کم ہدایہ اولین اس سے پہلے پڑھی ہوئی ہونا چاہئے، چنانچہ میں نے رمضان ہی میں ہدایہ اولین کا مطالعہ کر لیا اور شوال ۱۳۳۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہو گیا اور دو سال میں اپنی باقی نصابی تعلیم کی میں نے یہاں تکمیل کی، پہلے سال میں مشکوٰۃ شریف، شرح نخبۃ الفکر، ہدایہ اخیرین اور دیوان حماسہ وسبغہ معلقہ، یہ کتابیں باقاعدہ ”دوسرے کے اسباق“ کے طور پر پڑھیں اور ان کے علاوہ ہیئت میں تصریح و شرح چھنی اور فلسفہ میں شرح اشارات طوسی، یہ تینوں کتابیں بھی اسی سال دارالعلوم ہی کے اساتذہ سے خارجی طور پر پڑھیں۔ دوسرا پورا سال دورہ حدیث مع تفسیر بیضاوی سورہ بقرہ میں لگا۔

دورہ حدیث والے سال کے بارے میں یہاں بس اتنے ہی الفاظ ہیں۔ لیکن ”تحدیثِ نعمت“ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سال آپ کی تعلیمی زندگی کا اہم ترین سال تھا۔ لیکن ان میں سال بھی تھا۔ وہاں اسکی کچھ تفصیل اسی اہمیت کے ساتھ آئی۔

”دوسرے سال یہ عاجز دورہ حدیث میں شریک ہوا، یوں تو اس وقت فن کے امام اور صلاح و تقویٰ اور تعلق مع اللہ میں صاحب مقام تھے۔ لیکن ان میں العلماء حضرت مولانا محمد انور شاہ قدس سرہ کا خاص الخاص مقام تھا۔ جنہوں نے،

کہ چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں اس شان کا بھی کوئی تجربہ عالم ہو صاحب

اساتذہ کے اعتبار سے اس خوش نصیبی کے علاوہ خود اپنے طالب علمانہ حال کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

”میں طالب علمی کے زمانہ میں، خاص کر دارالعلوم کی طالب علمی کے دو سالوں میں صرف طالب علم تھا۔ اور اول و آخر دلچسپی بس درس و مطالعہ سے تھی“ (ص ۳۴) خاص کر آخری سال کے بارے میں لکھا ہے کہ -

”یہ پورا سال اس طرح گزرا تھا کہ دن رات کے اکثر اوقات میں حدیث شریف کی کتابوں ہی سے اشتغال رہتا تھا“ (ص ۳۰)

اور پھر اس محنت و دلچسپی کا پھل آپ نے اس شکل میں پایا کہ امتحان کے گیارہ پرچوں میں سے پانچ میں آپ کے نمبر اعلیٰ ترین مفروضہ نمبروں (۵۰) سے بھی زیادہ تھے۔ (جو وہاں کی ایک روایت ہے کہ امتحان اگر جوابات سے بہت خوش ہوتا ہے تو کچھ نمبر اپنی طرف سے بڑھا سکتا

(۱) حضرت شاہ صاحب کے علاوہ آپ کے باقی اساتذہ دارالعلوم کے اسامہ گرامی آپ کی تحریر کے مطابق یہ ہیں۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید امیر حسین میاں، حضرت مولانا سراج احمد رشیدی، حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی، حضرت مولانا اعجاز علی امرودی، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیدی۔ (الفرقان اپریل ۸۰ ص ۳۳)

ہے۔) تین پرچوں میں پورے پچاس تھے اور صرف تین پرچوں میں ۵۰ سے ایک یا دو تین نمبر کم۔ نتیجہ امتحان کی یہ تفصیل ہمارے سامنے مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند (مولانا مرغوب الرحمن صاحب) کے اس مضمون کے ذریعے آئی ہے جو اسی نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ جس میں نتیجہ امتحان کا پورا چارٹ نقل ہوا ہے۔

یہ شعبان ۱۳۴۵ھ کی بات ہے جس میں دارالعلوم میں آپ کا دوسرا اور آخری سال تمام ہوا۔ اور اسکے ساتھ ہی رسمی طالب علمی کا دور بھی ختم ہو گیا۔

### فراغت کے بعد

دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد آپ نے آئندہ ہی سال سے اپنے بزرگوں کا پسندیدہ شغل تدریس اختیار فرمایا۔ سنبھل کا مدرسہ محمدیہ جو آپ کے محلے ہی میں واقع تھا اور اسی میں آپ کی اپنی تعلیم کی ابتداء بھی ہوئی، شوال ۱۳۴۵ھ، ۱۹۲۷ء میں وہیں سے آپ کی تدریسی خدمات کا آغاز ہوا۔ ”تحدیثِ نعمت“ میں ”تعلیم سے فراغت“ کے بعد کے زیر عنوان تحریر فرمایا ہے کہ -

”شعبان ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت ہوئی۔ اسکے اگلے سال اپنے وطن کے مدرسہ محمدیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد بھی سلسلہ تین سال تک اس طرح (۱) کے ایک مدرسے میں قائم رہا جو اپنے جائے وقوع محلہ چلہ کی مناسبت سے مدرسہ (اسلامیہ) چلہ کے نام سے معروف تھا۔“

### تدریس کے ساتھ ساتھ دین کی مناظرانہ خدمات بھی:

”زندگی کے تجربات و خاص خاص واقعات“ کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے کہ بعض خاص اتفاقی وجوہات سے زمانہ طالب علمی ہی میں مناظرہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اُس وقت مناظرہ کے تین بازار خاص طور سے گرم تھے، [۱] آریہ سماج سے مناظرہ کا بازار جس میں شردھانند جی کی خدمتی سنگھن کی تحریک نے اُس وقت خاص گرمی پیدا کر دی تھی، [۲] قادیانی مناظروں کا بازار جس کو مرزا صاحب آنجنائی ہی خود قائم کر گئے تھے اور ”بہر کوچہ و بازار مرزائیت کے چمچے“ کے لئے جوان کی ایک اچھی تدبیر تھی، [۳] تیسرا بازار ”اہل بدعت“ سے مناظرہ تھا، یہ اگرچہ تحریکِ خلافت کے اثر سے کئی برس تک خنڈا ہوا رہا یہاں تک کہ گمان ہو سکتا تھا کہ شاید یہ اپنی موت مر گیا۔ لیکن ۱۳۴۳ھ میں مجاز پر سلطان ابن سعود والی نجد کے تسلط نے اس مردہ میں بھر اچانک جان ڈال دی اور پھر اس میں خوب گرمی آ گئی۔

بہر حال راقم سطور جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کا ”طالب علم“ تھا مناظرہ کے ان تینوں میدانوں سے اسے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ ”طالب علمی“ کا سفر ختم کر کے تدریسی شغل کے ساتھ اس سفر کے آرائی میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

(۱) یہ سنبھل ہی کی طرح ضلع سرو آباد (ترپردیش) کا ایک قدیم مشہور قصبہ ہے، سنبھل سے بہ جانب شمال، اب شاید ضلع کا نام کچھ اور ہو گیا ہے۔ یعنی ایک نیا ضلع بن گیا ہے۔

اس کے بعد ان تین میں سے اپنے خاص مناظرانہ میدان کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

”قادیانیوں اور آریوں سے مناظرہ کرنے والوں کی چونکہ کوئی خاص کمی نہ تھی اس لئے ان دونوں فریقوں سے تو مناظروں کا اتفاق دو چار دفعہ سے زیادہ نہیں ہوا، لیکن ”اہل بدعت“ یعنی مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے وہ مقلدیں یا پسماندگان جن کو اپنے مثبت اور ایجابی عقیدوں سے زیادہ حضرت شاہ سلطیل شہید اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا اشرف علی صاحب وغیرہ بزرگان دیوبند کے (معاذ اللہ) کافر اور خارج اسلام ثابت کرنے پر اصرار رہتا ہے چونکہ اس پارٹی کے زماں دراز مقررہ اور مناظرہ کے مدعیوں کے تعاقب سے متوسلین دیوبند میں سے کسی اور کو اس زمانہ میں دلچسپی نہ تھی اور میری دلچسپی اس بارہ میں حد افراط کو پہنچی ہوئی تھی، اس لئے اس فریق سے مناظروں کی نوبت بہت زیادہ آئی۔

### یہ خدمت دلچسپی سے بڑھ کر شوق بن گئی:

”آگے فرماتے ہیں۔ ”بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس پارٹی میں بھی کوئی مناظرہ کا ایسا اشتیاق نہ تھا۔“

میرا حال تھا۔ بلکہ اگر ان میں سے کسی کو مجھ سے آدمی چوتھا بھی مناظرہ کی دعت ہوتی۔ ہفتہ بھی مناظرہ سے خالی نہ جایا کرتا، یہ واقعہ ہے کہ بعض دفعہ مجھے کسی ذریعہ سے اٹھناظر فلاں جگہ پہونچا ہوا ہے تو میں اپنے ہی کرایہ سے وہاں پہونچ گیا۔ اور ”مان نہ مال“ کسی طرح مناظرہ کی صورت پیدا کر لی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض دفعہ فریق مخالف تک کا سفر خرچ دینا بھی اپنے ذمہ کر لیا اور دیا اور ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سب کچھ ملے۔

ہو جانے کے باوجود جب فریق ثانی کے مناظر تاریخ مقررہ پر نہ پہونچے تو ان کو بذریعہ تارنوس دیکر کہ اگر آپ ہمیں آئیں گے تو آپ کو سارا ہرجہ خرچہ ادا کرتا ہوں گا۔ آنے پر مجبور کر دیا اور مناظرہ کر کے چھوڑا۔ غرض مناظرہ کا شوق کیا تھا اچھا خاصہ طوفان تھا، جو روز افزوں طغیانی ہی پر تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ کی عنایت سے اور ظاہر اسباب اپنی تیاری اور اس راہ کے داؤ گمات سے واقف ہو جانے کی وجہ سے بھی ہر میدان میں پالی اپنے ہی ہاتھ رہتی تھی غرض یہ چیز بھی اس شوق کی ہمت افزائی کا ایک بوابا عث ہوئی۔“

### الفرقان کا اجراء

اس مناظرانہ ذوق کے زمانے میں اور اسی کے زیر اثر الفرقان کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ اور وہ بھی عین مولانا احمد رضا خاں صاحب کے مرکز بریلی سے، یہ فیصلہ شوال ۱۳۵۲ھ۔ فروری ۱۳۳۲ء کے ایک مناظرانہ قضیے ہی کا نتیجہ تھا۔ تحدیث نعمت میں اسکی پوری تفصیل آئی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس مہینے کے لئے ایک بہت اہم بلکہ تاریخی نوعیت کا مناظرہ لاہور میں ہونا طے ہوا تھا۔ اہمیت یہ تھی کہ مناظرہ کی بابت فیصلے کے لئے تین نہایت مؤثر اشخاص کو حکم بنانا طے ہوا تھا۔ اور ان حضرات نے منظور بھی کر لیا تھا۔ ان تین میں سے ایک علامہ اقبال تھے۔ مقصد یہ تھا کہ فریقین کی بحث سن کر حکم حضرات جس فریق کے حق میں بھی فیصلہ دیدیں کہ متنازع مسائل میں اس کا

موقف صحیح ہے۔ یا اس حد تک صحیح اور اس حد تک غلط ہے۔ اس کو دونوں فریق تسلیم کر لیں اور پھر روز و روز کی معرکہ آرائی اور اسی کے ساتھ افتراق بین المسلمین کی نامبارک صورت ختم ہو جائے۔ لیکن فریق ثانی نے ہر گفتنی اور ناگفتنی طریقہ اختیار کر کے اس فیصلہ کن مناظرہ کا انعقاد ناممکن بنا دیا۔ بس یہی چیز اس فیصلہ کا باعث ہوئی کہ ایک ماہنامہ جس کا خیال کافی دنوں سے ذہن میں چل رہا تھا اب بلا تاخیر الفرقان کے نام سے جاری کر دیا جائے اور فوری کام اسکے ذریعہ یہ کیا جائے کہ لاہور کے محترم مناظرے کیلئے جو مباحث طے ہوئے تھے ان پر اپنی بحث اس کے صفحات میں پیش کرتے ہوئے فریق ثانی سے کہا جائے کہ وہ اسکے جواب میں جو کچھ کہنا چاہے تحریری شکل میں پیش کرے اسے بھی شائع کیا جائے گا اور پھر دونوں طرف کی مکمل بحث ان ہی ججوں کے سامنے پیش کر دی جائیگی جو مناظرہ لاہور کیلئے طے ہوئے تھے۔ چنانچہ الفرقان نامی یہ ماہنامہ محرم ۱۳۵۳ھ مطابق مئی ۱۹۳۳ء سے جاری ہوا اور معرکہ القلم کے عنوان سے وہ بحث اسکی پہلی ہی اشاعت سے قسط وار نکلتا شروع ہو گئی۔

الفرقان کے اجراء کی یہ مہینہ تقریب ایسا ظاہر کرتی ہے کہ یہ گویا دین کی بس مناظرانہ خدمت ہی کیلئے جاری ہوا تھا۔ مگر اس کے جو مقاصد اس کی پہلی ہی اشاعت میں بیان کئے گئے وہ اس سے بالکل مختلف اور اسلام کی خدمت کا ایک وسیع تر تصور دیتے ہیں اور اس میں شائع ہونے والے مضامین کی جو نوعیت شروع ہی سے رہی وہ اس بیان مقاصد کی تصدیق کرنے والی ہے مقاصد کا یہ بیان حسب ذیل تھا

### ”الفرقان“ کا مقصد اور مسلک

”الفرقان“ کا اصل مقصد صرف دین الہی کی اشاعت اور توحید و سنت کی حمایت و حفاظت ہے۔ اور اسی مقصد کو لیکر وہ عالم و دعو میں آیا ہے۔ اور اس مبارک مقصد کی تکمیل کے لئے جو لائحہ عمل اس وقت اس کے سامنے ہے وہ اختصار کے ساتھ دلیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اسی سے ہمارے ناظرین کو ”الفرقان“ کی حکمت عملی بھی معلوم ہو جائیگی ”الفرقان“ انشاء اللہ اقوام عالم کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ محاسن پیش کرے گا جنکی نظیر سے دنیا کے مذہب اور بانیاں مذہب کی تاریخ عاجز اور یقیناً عاجز ہے۔

”الفرقان“ حتی الامکان معارف قرآنیہ کی نشر و اشاعت کا خاص اہتمام کرے گا کیونکہ قرآن اسلام کا ایک زندہ اور ہمیشہ مافی رہنے والا معجزہ ہے اور وہی خدا کا وہ آخری پیغام ہے جو قیامت تک کے لئے انسانوں کی ہدایت کا کفیل بن کر آیا۔

”الفرقان“ ”بھون اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتباع سنت کی روح پھونکے گا کیونکہ اس کا نہایت راسخ عقیدہ ہے کہ ہماری صلاح و صلاح اسی سے وابستہ ہے اور ہمارے اسلاف کا عروج جس نے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اسی اتباع اور اقتداء کا مرجع و مست تھا ہمارا ایمان ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل بھی صرف جناب رسالت مآب ﷺ کے نقش قدم کی پیروی ہی سے خوش گوار ہو سکتا ہے، حضرت امام مالک کا کیسا حقیقت افروز ارشاد ہے ”لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها“ اس امت کے

آخری دور کی اصلاح بھی صرف اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے اس کے دور اولین کی اصلاح ہوئی۔  
 ”الفرقان“ ان بدعات اور مشرکانہ رسوم کے خلاف زبردست جہاد کرے گا حصوں نے فرزندانی توحید کے دین  
 دنیا کو برباد کر دیا ہے۔ اور جن کے ہر لیے اثرات سے مسلمانوں کا ایمان تک محفوظ نہیں۔

”الفرقان“ خدا پرستی کا حامی اور مخلوق پرستی کا سخت دشمن ہے وہ چاہتا ہے کہ انسان کی جبین یار صرف واحد قہار کے  
 حلال و جبروت کے سامنے جھکے اسی لئے صلیب پرستی، بُست پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی، نفس پرستی، وغیرہ کو بھی وہ خلاق  
 فطرت کی شدید بغاوت اور انسانیت کی سخت ترین اہانت سمجھتا ہے، لہذا اسکے خلاف بھی وہ زبردست جہاد کرے گا، اور قوم سے  
 اس لعنت کے دور کرنے کے لئے اپنی ساری طاقت صرف کر دے گا۔

”الفرقان“ کا مقصد بلا وجہ کسی جماعت یا کسی شخص سے الجھنا اور اس کو بچاد کھانا یا اس پر عصہ اُتارنا اور اس کی  
 پکڑیاں اچھاننا ہرگز نہیں وہ صرف اعلائے کلمۃ الحق کے لئے میدان میں آیا ہے، واللہ اگر کوئی خدا کا باغی اس کے اصل مقصد میں  
 حائل ہو گا تو وہ اس کا بھی مقابلہ کرے گا لیکن اس میں بھی اس کی روش قرآن حکیم کی تعلیم کردہ اصول ”و جادلہم بالیٰ ہی  
 احسن“ سے متاثر نہ ہو گی۔“ (شمارہ اہلدار الحرام ۵۳-۱۳۵ھ)

اسی پہلی اشاعت میں جہاں تردید بریلویت والے مضامین ہیں وہیں ہم ”قرآن اور زمانہ  
 حال کے مسلمان“ جیسا ادارتی مضمون بھی پاتے ہیں جو اس بات کی مکمل تائید کرتا ہے۔  
 مقاصد میں اسلام کی خدمت کا جو وسیع تر تصور سامنے آیا تھا وہ محض  
 اور بامعنی بات تھی، اور ایسے مضامین کم و بیش ہر شمارے ہی میں  
 پورا مضمون تو یہاں نقل نہیں کیا جاسکتا مگر ایک دو اقتباسات دیے۔  
 ارشاد ہوتا ہے

”میری قوم کے نوجوان شاید مجھے دیوانہ تائیں گے مگر میں تو یہی کہوں گا کہ ہماری حیات کا راز صرف اتباع قرآن ہی  
 میں مضمر ہے۔ قرآن ہی ہر دور کی آزمودہ دوا اور ہمارے ہر مرض کا مجرب علاج ہے۔ آج اگر مسلمان اس کتاب الہی کو اپنی  
 زندگی کا دستور العمل بنالیں تو انکی ساری کمزوریاں ابھی دور ہو جاتی ہیں۔ وہ دنیا میں ایک باعزت قوم ہوں گے، ان کی غلامی کی  
 زنجیریں دیکھتے دیکھتے کٹ جائیں گی۔ مگر ہائے اس بد نصیبی کا کیا علاج کہ آج ہم ہی میں کے بہت سے گم کردہ راہ اپنی ترقی کی راہیں  
 اغیار کے بنائے ہوئے قوانین اور مغضوبین و ضالین کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔“ (ص ۱۷)

مزید:

”میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے مرض کا علاج صرف قرآن پاک کے شیریں الفاظ کی تلاوت یا  
 اسکے پاکیزہ معانی کی سیر سے نہیں ہو سکتا بلکہ ضرورت اسکی ہے کہ امت اس صحیفہ آسمانی کو اپنی زندگی کا دستور العمل بھی  
 بنائے، ہمارے اسلاف قرآن مجید سے صرف تلاوت ہی کا کام نہ لیتے تھے۔ اور نہ صرف علمی ذوق پورا کر کے کیلئے اسکے معانی کی  
 سیر کے عادی تھے بلکہ وہ اسکو کلام اللہ ہونے کے ساتھ انسانی زندگی کا مکمل نصاب بھی سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ اسکے فیوض  
 سے بہرہ مند ہوئے۔“ (ص ۱۸)

لیکن یہ بالکل قدرتی تھا کہ جو چیز الفرقان کے اجراء کے فوری فیصلے کی تقریب بنی تھی  
 اس کا اثر کچھ دن تو ضرور ہی غالب رہے۔ چنانچہ دو تین سال تک اس میں بریلوی مذہب اور اسکی



پھیلائی ہوئی مشرکانہ بدعات و خرافات کی تردید اور اس سلسلے کی مناظرانہ سرگرمیوں ہی کا رنگ غالب رہا۔ اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میدان میں چونکہ یہ ایک غیر معمولی گرج چمک والے انداز کی یا حضرت مرحوم کے اپنے الفاظ میں ایک ”طوفانی“ انداز کی سرگرمی تھی اس لئے ایک جوش و خروش والے استقبال کی روح بھی اس نے لوگوں میں پھونک دی تھی۔ آئیے اس استقبال کا ایک نمونہ بھی دیکھتے چلیں... یہ جناب رہبر اعظمی مرحوم کی خیر مقدمی نظم ہے جو ۱۳۵۵ھ کے سالنامے میں شائع ہوئی

## الفرقان کا خیر مقدم

از جناب رہبر اعظمی مبارکپوری

شبستان ضلالت میں وہ چمکی برقی نورانی  
بڑھایا دست قدرت نے وہ جام نور عرفانی  
نہ ہو کیوں صفحہ عالم پر الفرقان لاٹانی  
ہے دیئے صحافت میں مثال نیر اعظم  
تری ہر ہر گجاں میں ہے پنہاں جذبہ صادق  
ترا ہر نغمہ جان آفریں نسکین وہ خاطر  
الٹ کر رکھ دیا واللہ تو نے تختہ باطل  
وہ شمشیر ہدایت ہے کہ جسکے خوف و دہشت سے  
تلاطم خیز موجیں مستتر ہیں جس کے دامن ہیں  
پلائے جا پلائے جا وہی پھر بادہ دوشیں

برستا ہے سماء فیض سے اک نور ایقانی  
ہوئی مخمور صہبائے حقیقت چشم انسانی  
زبان ہے اسکی سحابی، مضامین اسکے حسانی  
جہاں بھر میں اسی کی ہے درخشان و تابانی  
تیرے ہر قطرہ خون جگر میں جوش ایمانی  
تری ہر بات وجہ اندمال زخم پنہانی  
فضا میں اڑ گیا ہے دامن تدبیر شیطانی  
کلیجہ شرک و بدعت کا وہ دیکھو ہو گیا پانی  
وہ الفرقان علم دین کا ہے بحر عرفانی  
ہو جس کی جرمہ کشی باعث تنویر ایمانی

یہی وہ رہبر کامل ہے جو منزل دکھائے گا  
کوئی ہو رافضی یا قادیانی یا رضا خانی

لیکن جیسے ایک طرف خیر مقدم کیلئے جوش و خروش تھا دوسری طرف ایسے ہی ناراضگی کا غیظ و غضب بھی، چنانچہ اشاعت کے دوسرے ہی سال (۱۹۵۴ء) کے چوتھے شمارے میں ہم قتل کی اس دھمکی کی خبر بھی پڑھتے ہیں کہ

”مگر تو بار نہیں آیا اور تیرا یہی حال رہا تو بہت جلدی تجھے مزہ چکھا دیا جائے گا بہت سے سی تیرے حوں کے پیاسے ہیں۔“

قتل کی یہ دھمکی بظاہر اس مناظرے کا نتیجہ تھی جو الفرقان کی اشاعت کے دوسرے ہی سال محرم ۱۳۵۴ء میں عین بریلوی حضرات کے مدرسے جامعہ رضویہ میں ہوا۔ اور — جیسا کہ اس سال کے شمارہ (۲) میں لکھا گیا — اس مناظرہ کی ابھی پہلی بحث بھی تمام نہ ہوئی تھی کہ مناظرے کے بریلوی اسٹیج سے ایک شرانگیز انداز میں ”واجب القتل واجب القتل“ کے نعرے کے ساتھ ہڑبونگ کا آغاز ہوا۔ اور مناظرے کا جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ اس دھمکی کے جواب میں جو ایک دو صفحے الفرقان میں لکھے گئے تھے اُن کی چند سطریں بھی نقل کر دی جائیں تو زندگی کی اس منزل کے احوال میں کا ایک ضروری جزو فی الجملہ سائے۔

”اب سے پہلے ۱۵ھ میں بھی حکم میں ایک مناظرے ہی کے سلسلے میں دوران میں اس قسم کے گناہ خلوں کے دریغے دو دفعہ ایسی ہی بدولادہ دھمکیاں دی گئی۔ آگے اپنا یہ عقیدہ ظاہر کرنے کے بعد کہ موت و حیات

ہے کہ۔“

”اسی کے ساتھ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو موت راہ حق میں آئے در حقیقت وہ موت نہیں بلکہ ایک دائمی اور لاروال زندگی کا پیش خیمہ ہے۔“

اور اس کے آگے یہ دعا آتی ہے اور یہی قصے کی جان ہے

”اے موت و حیات کے مالک اے شہیدوں کو دائمی زندگی عطا کرنے والے مجھے بھی اپنی راہ میں موت دے کر اپنی رحمت کے آغوش میں لے لے۔ ساتھ ہی میری یہ بھی دعا ہے کہ خداوند اگر میری موت تیرے کسی بندے ہی کے ہاتھ سے مقدر ہے تو میرا قاتل اسکو بنا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان نہ ہو، میں نہیں چاہتا کہ کوئی بد قسمت مسلمان میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگے اور میری وجہ سے جہنم میں جائے۔“

بریلویت سے ماسوا مناظرے

صاحب الفرقان کی مناظرانہ سرگرمیوں کے رخ کا اصل میدان اگرچہ بریلویت ہی رہی لیکن اس سلسلے میں اُن کے اوپر نقل کئے گئے بیان سے یہ خیال کرنا صحیح نہوگا کہ آریہ سماج اور قادیانیت سے مناظروں کا جو میدان اس زمانے میں گرم تھا اس میدان میں وہ بالکل نہیں اترے۔

آریہ سماج سے انکے کئی مناظروں کی روداد جو الفرقان کے دور اشاعت میں پیش آئے، ہمیں الفرقان ہی کے صفحات میں ملتی ہے اور اس ضمن میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض مناظرے الفرقان کے دور اشاعت سے پہلے ہو چکے تھے۔ اس سلسلے کے پہلے مناظرے کی روداد الفرقان کی پہلی جلد کے شمارہ نمبر (۱۰-۹ اور ۱۲) میں ملتی ہے۔ یہ مناظرہ اسی سال یعنی ۱۹۵۳ء مطابق ۱۹۳۴ء پنڈت گوپی چند دہلوی سے بریلی ہی میں ہوا۔ اس کے بعد اگلے سال انھیں دونوں نومبر ۱۹۳۵ء میں ایک دوسرے آریہ سماجی مناظرہ پنڈت رام چندر دہلوی سے آپ کا مناظرہ بریلی ہی میں اور سابق مناظرے کی طرح کئی دن تک ہوا۔ اس کی روداد الفرقان کے متعدد شماروں میں قسط وار نکلی ہے۔ پہلی قسط شمارہ (۹-۸ جلد ۲) میں شائع ہوئی تھی۔

قادیانیوں سے کسی مناظرے کی روداد ہمیں الفرقان میں نہیں ملتی، اگرچہ قادیانیت کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ بظاہر اس گروہ سے آپ کا کوئی مناظرہ الفرقان کے دور میں نہیں ہوا۔ البتہ الفرقان ہی کی فائل سے معلوم ہوتا ہے کہ الفرقان کے اجراء سے قبل ۱۹۲۸ء میں جو کہ امر وہہ میں آپ کی مدرسی کا یہ پہلا سال تھا ایک ایسے مناظرے کا اتفاق حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنؤی اور حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کی معیت میں پیش آیا تھا۔ اس کا تذکرہ ہمیں اپریل ۱۹۸۰ء کے الفرقان میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کی وفات پر لکھے گئے آپ کے تعزیتی مضمون میں ملتا ہے، تحریر فرمایا گیا ہے کہ

"عالم ۱۹۲۸ء کا کوئی مہینہ تھا کہ حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنؤی اچانک بغیر کسی اطلاع کے امر وہہ تشریف لائے، کسی نے مجھے اطلاع دی اور بتلایا کہ تم سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔ میں خود فوراً ہی حاضر خدمت ہو گیا، فرمایا کہ اس وقت صرف تم کو ساتھ لینے کے لئے راستے میں ٹرین سے اترا ہوں۔ ضلع میرٹھ میں کوئی قصبہ انچولی ہے۔ وہاں قادیانیوں سے مناظرہ طے ہو گیا ہے۔ اس مناظرے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ لوگوں کے قادیانی ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ایک صاحب جو مولانا کے ساتھ تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کل ہی مجھے لینے کے لئے انچولی سے لکھنؤ پہنچے تھے، میری طبیعت کئی دن سے خراب چل رہی تھی لیکن میں نے پیونچنا ضروری سمجھا اور یہ طے کر لیا کہ امر وہہ سے تم کو ساتھ لے لوں گا۔ اب پہلی ٹرین سے تم کو میرے ساتھ میرٹھ چلنا ہے۔ ممکن ہے مناظرہ تمہیں کو کرنا ہو۔ الغرض ہم لوگ میرٹھ کے لئے روانہ ہو گئے وہاں سے رات کے وقت انچولی پہنچے، معلوم ہوا کہ دیوبند سے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب اور مولانا محمد شفیع صاحب اور کچھ اور حضرات بھی ہم سے پہلے تشریف لائے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مناظرہ تین دن ہو گا۔ پہلے دن مسئلہ ختم نبوت پر اور دوسرے تیسرے دن صدق و کذب مرزا پر جس میں پہلے دن قادیانی مناظرہ مدعی ہو گا اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت و وصیت کی صداقت ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور دوسرے دن مسلمانوں کا ناسندہ مناظرہ مدعی ہو گا اور مرزا کا کذاب ہونا ثابت کرے گا۔ معلوم ہوا کہ مناظرے کے یہ موضوعات اور یہ ترتیب فریقین کے مقامی لوگوں نے پہلے سے طے کر رکھی ہے۔

مشورے سے طے ہوا کہ پہلے دن مسئلہ ختم نبوت پر مناظرہ مجھے کرنا ہو گا، دوسرے دن حضرت مولانا لکھنؤی اور

آخری دن حضرت مولانا چاند پوری مناظرہ فرمائیں گے — چنانچہ ایسا ہی ہوا — مناظرے میں ایک ایسے معادل کا وجود بہت مفید ہوتا ہے جس کی زیر بحث مسئلہ کے مالہ و ماعلیٰ پر خود بھی پوری نظر ہو اور حسب ضرورت و موقع کتابوں کے حوالے نکال کر مناظر کو دیتا رہے اور خود مناظر کو کتابوں سے حوالے نکالنے کا کام نہ کرنا پڑے۔ اس مناظرے میں یہ مدد مجھے جیسی مولانا محمد شفیع صاحب سے ملی، کبھی کسی مناظرے میں کسی سے ایسی مدد نہیں مل سکی، معلوم ہوتا تھا کہ ختم نبوت کے موضوع کے متعلق مجھے جن حوالوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی وہ مفتی صاحب کو گویا حفظ تھے۔

مفتی صاحب کی اس مدد کی کچھ تفصیل کرنے کے بعد فرماتے ہیں

”اس مناظرے میں مناظر تو میں ہی تھا لیکن مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے گویا ”روح القدس“ بنا دیا تھا۔“

اس حوالے کی بدولت قادیانیوں سے آپ کے ایک مناظرے کا علم ہمیں ہو جاتا ہے، لیکن اس کی کوئی مفصل روداد دستیاب نہیں اسلئے کہ یہ الفرقان کے اجراء کے بہت پہلے کا ہے۔ اس کے برعکس مناظرے کے میدان کے تیسرے گروہ آریہ سماج کے ساتھ آپ کے دو مناظروں کی بہت تفصیلی رودادیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، الفرقان کے صفحات میں موجود ہیں۔ آریہ سماج کے ساتھ آپ کے ان مناظروں کا ایک پہلو یہاں قابل ذکر آتا ہے۔

### آریہ سماج سے مناظروں کا ایک قابل ذکر پہلو

قادیانیوں سے مناظرہ ہوا یا بریلوی حضرات سے دونوں عالم سے بھی جس نے محنت سے تحصیل علم کی ہو اور ذہین موضوعات پر بآسانی حاوی ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اسلئے کہ ان سب ریلوی اسی علم دین سے ہے جس کی وہ بنیادی تحصیل کر چکا — اور جیسا کہ ذکر آئے گا، بریلوی حضرات سے مناظرے کے موضوعات پر تو صاحب الفرقان نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں تیاری کر لی تھی — لیکن آریہ سماج سے سنجیدہ مناظرے کے موضوعات ایک مختلف چیز ہوتے تھے۔ ان موضوعات پر جب ہم آریہ سماج سے مناظروں میں آپ کی بحثیں پڑھتے ہیں تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ جیسے آپ پیدا کنٹی طور ہی پر مناظرانہ صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔

پنڈت رام چندر دہلوی سے ان کا مناظرہ (کیم نمبر ۳۵ء) وید کی الہامیت اور اس کے ساتھ تنازع (آواگمن) کے مسئلوں پر تھا اس کا صرف ایک اقتباس آپ کی اس صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔

وید کو الہامی کتاب مانا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے حضرت بانی الفرقان نے فرمایا تھا کہ ایک الہامی کتاب کیلئے لازمی طور پر یہ ذریعہ ہے کہ وہ مخلوق کے پاس ایسے ذریعے سے پہنچے جو قابل اعتبار

ہو۔ ورنہ خدائے پاک کی طرف سے یہ (معاذ اللہ) بڑی بے انصافی ہوگی کہ لوگوں کو اس کے ماننے کا پابند بنایا جائے۔ اور یہ انتہائی لازمی اور بنیادی شرط بھی دید کے حق میں نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ خود از روئے دید یہ بات ابھی تک طے نہیں ہے کہ ویدوں کا الہام جن پر ہوا وہ انسان تھے یا کچھ اور ان ملہمین کے بارے میں ویدوں کے اندر خود بانی آریہ سماج سوامی دیانند جی کے بقول چار لفظ ملتے ہیں۔ ”اگنی، وایو، آوتھ، انگرا“ اور از روئے لغت یہ چاروں لفظ غیر ذی شعور اور بے حس عناصر کے نام ہیں، علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ انسان تھے تو انکی شخصیتیں متعین نہیں ہیں، سماجی حضرات چار ریشیوں کو مانتے ہیں۔ اور پورا تک لوگ چار منہ والے برہما کو۔ اس کے جواب میں پنڈت رام چندر جی نے جو تقریر کی وہ تقریر اور اس کا جواب پڑھ کر وہ بات اچھی طرح محسوس کی جاسکتی ہے جس کے احساس نے یہاں اسکو ہمارے لئے قابل تذکرہ بنایا

### پنڈت رام چندر جی دہلوی

”مولوی صاحب کا اعتراض میں نے سمجھا، اصل بات یہ ہے کہ مولوی صاحب سنسکرت زبان سے واقف نہیں ہیں۔ ورنہ آپ کو یہ شبہات پیدا ہی نہیں ہوتے، مولوی صاحب جس طرح عربی فارسی وغیرہ اور زبانوں میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں اسی طرح سنسکرت میں بھی بعض لفظوں کے متعدد معانی آتے ہیں پس اسی اصول پر ”اگنی وایو، آوتھ، انگرا“ عناصر کو بھی کہتے ہیں اور یہی ریشیوں کے بھی نام ہیں، آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنکا نام اگنی ہے اور یہ بات کلام کے موقع سے معلوم ہو جاتی ہے کہ یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔ اور اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ حق خدا کا بھی نام ہے اور حق ایک اخبار بھی لکھا ہے، تو اگر کوئی شخص کہے کہ حق چھپ گیا یا حق پھٹ گیا تو کیا کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ خدا چھپ گیا یا خدا پھٹ گیا۔ بس جیسے کہ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق اخبار چھپ گیا یا پھٹ گیا دیسے ہی جب ویدوں میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگنی، وایو، آوتھ، انگرا، پر ویدوں کا الہام ہوا تو خود بخود یہ سمجھ لیا جائے گا کہ یہ ریشیوں کے نام ہیں۔ کیوں کہ بے جان عناصر پر الہام نہیں ہوتا اور برہما کسی شخص خاص کا نام نہیں لکھ۔ وہ صفت ہے اور جو کچھ کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع اس کے چار منہ تھے۔ کیوں کہ یہ تو بالکل خلاف عقل ہے۔ آج تک ایسا کوئی بھی آدمی نہیں دیکھا گیا جس کے چار منہ ہوں بلکہ جس طرح سات زبانوں کے جاننے والے کو ہفت زبان کہہ دیتے ہیں اسی طرح جس شخص نے چار ویدوں کا علم ریشیوں سے حاصل کیا تھا اس کو جو کچھ برہما لکھ دیا گیا ہے۔

منو سمرتی جس کو پورا تک لوگ بھی مانتے ہیں اس میں بھی ویدوں کا ظہور ”اگنی، وایو وغیرہ ریشیوں سے لکھا ہے، نہ کہ خود رہا جی سے، تو یہ غلط ہے کہ برہما جی یا دیاس جی پر ویدوں کا الہام ہوا ہو، بلکہ انھوں نے ویدوں کو ریشیوں سے حاصل کیا تھا، لہذا آپ کا اعتراض صحیح نہیں۔

(پنڈت جی نے اپنی اس تقریر میں اپنی تائید کیلئے جو وید منتر پڑھے تھے، انفسوس ہے کہ ہم اپنی ناواقفگی کی بنا پر یہاں انکو درج نہیں کر سکے لیکن ساری تقریر کا خلاصہ صرف اسی قدر تھا۔“)

(مرتبہ روداد)

### مولانا صاحب

پنڈت جی! مجھے تو آپ کے ساتھ بہت زیادہ حسن عن تھا مگر انفسوس کہ وہ غلط ثابت ہو رہا ہے۔ میرے اعتراض کی

بنیاد یہ تھی کہ اردوئے وید ”گئی، والیو وغیرہ کا انسان ہونا ثابت نہیں بلکہ یہ صرف سوامی جی کی ایک انکل ہے، آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ گئی وغیرہ کے معانی عناصر کے بھی آتے ہیں اور وہ ریشیوں کے نام بھی ہیں اور سمجھانے کیلئے آپ نے ”حق“ کی مثال بھی دی ہے کہ وہ خدا کا نام بھی ہے اور اسی نام سے ایک اخبار بھی نکلتا ہے، حالانکہ یہ آپ کا مغالطہ ہے کیوں کہ لفظ ”حق“ کے متعلق تو یہ معلوم ہے کہ وہ اخبار کا نام بھی ہے لیکن گئی والیو وغیرہ کے متعلق اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ انسانوں کے بھی نام ہیں، بلکہ یہ صرف آپ کی اور سوامی جی کی انکل ہے اور وہ بھی صرف اس بنیاد پر کہ خدا کے کلام کا ظہور غیر دی شعور پر نہیں ہو سکتا، گویا صرف اسی مجبور سے آپ ان کا انسان ہونا مان رہے ہیں کہ عناصر پر خدا کے کلام کا ظہور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا ورنہ ویدوں میں اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں ہے اور وہ عقلی وجہ بھی بالکل کمزور ہے۔ اسلئے کہ جب ایک انسان گراموفون کے بے جان ریکارڈ کے ذریعے سے دوسروں کو اپنا کلام سنا سکتا ہے، سنیں ان میں تصویروں کو گویا (نولٹا) دکھلا سکتا ہے تو اگر پر میثور غیر ذی شعور عناصر کے ذریعے سے دنیا کو اپنا کلام سنائے تو عقلاً اس میں کوئی استحالہ نہیں۔

بہر حال میرا یہ اعتراض مستور باقی رہا کہ اردوئے وید گئی، والیو، او تھ، انگریز کا انسان ہونا بھی تک معلوم نہیں بلکہ وہ سوامی جی کا محض عقلی خیال ہے اور وہ بھی نہایت کمزور۔

دوسری بحث یہ تھی کہ ملہمین وید کو اگر اساتذہ فرض کر لیا جائے تب بھی خود حاملان وید میں ان کی شخصیتوں کے متعلق اختلاف ہے، آپ حضرات چار ریشیوں کو وید کا ملہم ماننے ہیں اور قدیم ہندو (پورائٹ) کے متعلق ہے۔

اس کے جواب میں آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برہما انہوں نے وید کا علم انھیں ریشیوں سے حاصل کیا تھا ”یہ جواب بھی غیر متعلق ہے“ بحث نہیں کہ برہما جی کون تھے؟ بلکہ میرا اعتراض صرف یہ ہے کہ حاملان وید میں

اختلاف ہے۔ اور آپ خود بھی اس اختلاف کا انکار نہیں کر سکتے، خود سوامی جی مہاراج نے اس ”بھومکا (ص ۳۶) پر کیا ہے۔ پس آپ نے جو جواب دیا ہے وہ درحقیقت پورا انکو کو دیے کا ہے۔ میں تو صرف اختلاف کا ناقول ہوں اور آپ حضرات کا یہ اختلاف ہی میرے اس دعویٰ کو ثابت کرے کے لئے کافی ہے کہ وید کی تاریخ تاریکی میں ہے۔ اگر ملہمین وید کے متعلق خود وید میں کوئی صاف اور مکمل ہوئی تصریح ہوتی یا تو اتر سے معلوم ہوتا کہ فلاں پر وید کا رول ہوا، آج حاملین وید میں یہ اختلاف نہ ہوتا جس طرح کہ قرآن مجید کے متعلق آج کوئی ایسا اختلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی اس کا پورا پورا یقین رکھتے ہیں کہ اس کتاب (قرآن مجید) کو الہام کے دعویٰ کے ساتھ دیا کے سامنے داعی اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے پیش فرمایا اور درحقیقت جو چیز تو اتر کے ساتھ منقول ہوا سمیں کبھی کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا پس الہام وید کے متعلق آپ لوگوں کا یہ اختلاف اسکی زبردست دلیل ہے کہ یہ مسئلہ پہلے ہی سے تاریکی میں رہا ہے۔

تیسرا اعتراض میرا یہ تھا کہ بحث سابق سے قطع نظر کر کے ویدوں کا ملہم خواہ بقول ساج، گئی، والیو، او تھ، انگریز، کومانا جائے یا عام ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق برہما جی کو یا دیاس جی کو۔ بہر حال ان سب کی زندگی کے حالات نامعلوم ہیں اور ہمیں کہا جاسکتا کہ وہ کس کیریکٹر اور کیسے چال چلن کے انسان تھے، اگر ویدوں میں اس کے متعلق کچھ ذکر ہو تو آپ فرمائیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ وید اس بارے میں بالکل خاموش ہیں بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ویدوں سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ انسان بھی تھے یا نہیں، کیرکٹر تو بعد کی چیز ہے۔ (۱)

## بوارق الغیب کی تالیف

زندگی کے اس مناظرانہ دور کی ایک خاص قابل ذکر بات ”بوارق الغیب“ نامی کتاب کی تالیف بھی ہے۔ بریلی اور دیوبندی مکتب فکر کا ایک خاص اختلافی نقطہ مسئلہ ”علم غیب“ کے نام سے مشہور ہے۔ بریلویت رسول اللہ ﷺ کے لئے اسی کامل علم غیب کا دعویٰ کرتی ہے، جو اللہ جل جلالہ کی صفت ہے۔ اور یہ اہل دیوبند کی نظر میں قطعی شرک ہے۔ وہ کئی علم غیب کو صرف اللہ کے لئے مخصوص مانتے ہیں۔ اس کتاب کا موضوع قرآن و حدیث کی روشنی میں اسی مسئلہ کا فیصلہ ہے۔ اور اپنے موضوع پر یہ فیصلہ کن اور حرف آخر مانی گئی ہے۔ اس کی اہمیت صرف ”حرف آخر“ ہونے میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ اس درجے کے کام کا آغاز مصنف نے اپنی طالب علمی ہی کے زمانے میں کر دیا تھا۔ اور اس وقت میں اس میدان کی سب سے نامور شخصیت مولانا سید مرتضیٰ صاحب چاند پوریؒ نے جب یہ ارادہ سنا تو ان کی نوعمری کے باوجود یہ توقع کی وہ اس کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ الفرقان کا اجراء ہونے تک یہ کتاب چھپ نہیں سکی تھی۔ اس لئے الفرقان میں اس کی قسط وار اشاعت کا اعلان کرتے ہوئے اس کے تعارف میں جو صفحے لکھے گئے ہیں ان سے ہمیں اس کی تالیف کی یہ اہم تاریخی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا ہے۔

”قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ ۱۳۴۲ھ میں حکومت حجاز کے انقلاب نے ہندوستان کے اندر ملت و بدعت کی قدیمی جنگ کو از سر نو تارہ کر دیا تھا اور بناء علی القیور، نذر غیر اللہ، عرس، فاتحہ، میلاد، علم غیب کے فرسودہ مباحث پھر معرکہ الآراہن گئے تھے یہاں تک کہ حجاز میں تو چند ہی روز کے بعد کامل امن و امان ہو گیا۔ مگر ہندوستان میں جو مذہبی جنگ چھڑی اس کے شرارے برابر بلند ہی ہوتے رہے یہاں تک کہ علماء کرام کے علاوہ مدبران اخبارات و جرائد نے بھی ان مباحث کی تحقیق میں حصہ لیتا شروع کر دیا۔ اسی وقت بعض اخباری مضامین و کچھ مسئلہ ”علم غیب“ کے متعلق ایک مختصر رسالہ لکھنے کا ارادہ ہوا، یہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا، اور میں مرکز علوم اسلامیہ دارالعلوم دیوبند میں اپنی تعلیم کے آخری درجات پورے کر رہا تھا، حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب مدظلہ سے میں نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا، مولانا نے فرمایا کہ ہمارے حضرات نے اس مسئلے پر اب تک جو رسائل لکھے ہیں ان سب میں قدر ضرورت پر استغناء کیا گیا ہے، اور مخالفین نے غلط بحث کرنے کے لئے بڑے بڑے رسالے لکھ ڈالے ہیں لہذا اگر اس موضوع پر کچھ لکھنا ہے تو ہمت کر اور ایک مبسوط رسالہ لکھ دے۔ جس میں اپنے دلائل بھی کافی شافی ہوں، اور مخالفین کے دلائل کا جواب بھی بالاحتیاج ہو، کام یقیناً بڑھتا اور حکم بھی بہت بڑے کا اللہ کا نام لے کر قلم اٹھایا اور اسی طالب علمی کے زمانے میں لکھنا شروع کر دیا۔ مگر اس سال دورہ حدیث کی مشغولیت کی وجہ سے بہت تھوڑا وقت ملا تاہم اتنا ہوا کہ جو خالی وقت ملتا میں اس میں دارالعلوم کے کتب خانے میں جا بیٹھتا اور کتابوں کے حوالے نقل کر لیتا، اسی سال تعلیم کے ختم ہونے کے ساتھ دارالعلوم کے قیام کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور میں اپنے وطن سنبھل چلا آیا، یہاں آکر تعلیم کا کام شروع کر دیا، اسکی مصروفیت اور کسی وسیع کتب خانے کے نہ ہونے کی وجہ سے اس عرصے میں رسالے کا کام بالکل بند رہا، اس کے بعد تقریباً تین سال میرا قیام امر وہہ میں رہا، وہاں کے مدارس کے کتب خانوں میں دینی کتابوں کا ذخیرہ اگرچہ کچھ کم نہ تھا، لیکن

تعلیم کی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے تالیف کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنا ایک سال صرف اس رسالے کی تکمیل کے لئے خالی کر لیا۔ اور پھر دوسرے کتابیں جمع کر کے ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گیا، چار پانچ مہینے کی مسلسل محنت اور جاں کا ہی نے کام کو قریب ختم پہنچا دیا، اور میں کتاب کے اکثر حصہ کی ترتیب و تکمیل سے بھی فارغ ہو گیا۔ ۱۹۹۳ء مطابق ۱۳۵۰ھ ستمبر کا مہینہ تھا کہ ایک مناظرہ کے سلسلے میں مجھے ضلع کجرات، پنجاب جانا پڑا۔ اور میری پس غیبت میں میرے مکان سے کتاب کا پورا مسودہ غائب ہو گیا، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے اس کا کس قدر صدمہ ہوا اور میرے دل پر کیا گزری اس کا تحریر میں آنا دشوار ہے۔ ہمت نے اس قدر شکست کھائی کہ اس کے بعد میں نے بار بار اس کو اور سر نو لکھنا چاہا لیکن دل و دماغ نے صاف جواب دے دیا۔ اور میں ایک عرصے تک قلم نہ اٹھا سکا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اعادہ تعینف سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب مدظلہ العالی کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کو پھر از سر نو لکھنے کا حکم فرمایا، میں نے اسی ہمت شکنی اور حوصلہ شکنی کا عذر کیا، لیکن ممدوح نے ایک نہ سنی اور فرمایا کہ اللہ کے بھروسے پر لکھنا شروع کر، اتنا لا لمار۔ ۱۳۵۱ھ میں، میں نے پھر اسکو لکھنا شروع کیا اور الحمد للہ تعالیٰ کہ اس کے فضل و کرم سے ۱۳۵۲ھ میں دوبارہ مکمل ہو گئی۔“ (۱)

بوارق الغیب کی تصنیف کے اس قصے میں ہماری ملت کے  
ہے جو کسی دارالعلوم یا کسی یونیورسٹی میں تحصیل علم کر رہے ہیں  
باندھ لے اور کسی موضوع کا حق ادا کرنے کی ٹھان لے تو وہ اپنی  
سکتا ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو چاہے کتنی ہی سندیں اور ڈگریاں حاصل  
نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر  
نغمہ ہے سودائے خام، خون جگر کے بغیر

### بوارق سے بھی پہلی کتاب

بوارق تو خالص علمی اور تحقیقی انداز کی کتاب ہے، جو طالب علمی سے فراغت کے پانچ سال بعد مکمل ہوئی، اس سے پہلے کی ایک مناظرہ نہ رنگ کی کتاب ان کے قلم سے ۱۳۴۸ھ میں، جبکہ ان کی عمر ۲۴-۲۵ سال کی تھی، بعض بریلوی اعتراضات کے جواب میں سیف یحیٰی کے نام سے لکھی، اس میں بھی ان کی محنت، بھرپور توجہ اور دلچسپی نے وہ رنگ پیدا کر دیا تھا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جیسی عظیم اور محتاط شخصیت نے ایسے الفاظ میں اس پر تقریظ ثبت فرمائی جن میں ذرا سا بھی کوئی تحفظ اور ریزرویشن نہیں تھا۔ اور اس بات کا جو درجہ ہے اسے جاننے والے جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بعد الحمد والصلوٰۃ حقراشرف علی عفی عنہ نے رسالہ ”سیف یحیٰی“ بالاعتیاد دیکھا جو بعض



اہل اہواء کے اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا ہے، تحقیقی جواب بھی ہے اور انرازی بھی۔ بلا مبالغہ اس کو جادِ لہم بالئی ہی احسن کا مصداق پایا۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس نصرت حق پر جزائے خیر عطا فرمائے اور رسالہ کو سرمایہ رشد و ہدایت بنائے، (۱)

والسلام

اور وقت کے بہت بڑے فاضل اور مناظر، صاحبِ علم و عمل، ناظم تعلیمات مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب نے تو پورے ایک صفحے کی تقریظ کا خاتمہ ان الفاظ پر فرمایا تھا:

”میں اخیر میں اس حقیقت کا اظہار بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ علامہ محترم کو میں ایک سال قبل مولوی منظور صاحب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل میں اپنی ذہنیت بدلنے پر محور ہوا اور مولانا مولوی محمد منظور صاحب کہنے لگا۔ لیکن اس تعریف لطیف کے غیر فانی نقوش نے میرے قلب کو علامہ محترم حضرت مولانا مولوی عم مجبور کر دیا۔“ (۲)

## ایک اور سبق

ہر کام میں محنت اور خونِ جگر شامل کرنے کے سبق کے ساتھ ایک دوسرا سبق بھی اس جانے والی ہستی سے لینے کا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ غیر معمولی درجے کی تقریظوں کے تمنغے کتاب میں ایک مرتبہ چھاپ دینے کے بعد مستقل طور سے سینے پہ سجا کے اس نے نہیں رکھے کہ یہی خودی کے پاسبانوں کا طریق ہے۔ اس کتاب کی عمر قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی راقم الحروف (عقیق) کی۔ مگر اس کے ہوش سنبھالنے کے بعد اس سال (۱۹۹۸ء) سے پہلے جب کہ اتفاق سے اس کا مذکورہ پاکستانی ایڈیشن دستیاب ہو گیا، یہ کتاب سامنے نہ پڑی تو ان تقریظوں کا علم بھی اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ پوری عمر میں یہ پہلا موقع ہے کہ یہ ستر (۷۰) سالہ تاریخی مرتبہ رکھنے والی تقریظات علم میں آئی ہیں۔

## مناظرانہ دور کا اختتام

مناظرانہ سرگرمیوں کا یہ دور قریب قریب دس سال رہا۔ ”میری زندگی کے تجربے۔۔۔“ والے مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ ”آخر ۵۵ھ میں راقم کا آخری مناظرہ پنجاب (سلانوالی) میں ہوا جس کے بعد یہ مشغلہ بالکل چھوٹ ہی گیا“

(۱) سیفِ یمانی (ص ۵) پاکستانی ایڈیشن، شائع کردہ مکتبہ دارالعلوم فیض محمدی، خالد آباد، لاہور۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۴۸ھ میں ہندوستان سے نکلا تھا۔ بعض تقریظوں پر ڈی قعدہ ۱۳۷۵ھ کی تاریخ بھی درج ہے۔

(۲) ایضاً

راقم السطور نے ہوش سنبھالنے کے بعد والد ماجد کا جو مزاج دیکھا اسکی بنا پر بریلوی حضرات سے ان کے مناظروں کی روداد پڑھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کی ان رودادوں کے مطابق بریلوی مناظر جیسا لایعنی بلکہ ایک حد تک غیر شریفانہ اور پھکڑ بازانہ رویہ اختیار کرتے تھے تو وہ کیسے چار چار دن تک اس روپے کو بھگتے رہا کرتے تھے؟ (۱) یہ حیرت اُن کا یہ بیان تجربوں والے مضمون میں پڑھ کر فی الجملہ دور ہوئی جس میں مناظرہ سے متعلق اپنی ایک دھن اور لگن والی کیفیت کا بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

”مختلف بازیوں کے شوقیوں کو شاید اپنی بازیوں کی اتنی دھن نہ ہوگی جتنی مجھے ان دنوں اس مناظرہ بازی کی دھن لگی ہوئی تھی، اب کبھی اپنی اس کیفیت کو یاد بھی کرتا ہوں تو بعض اوقات تنہائی میں بھی ہنسی آجاتی ہے مگر خیریت ہوئی کہ یہ بحرانی کیفیت غالباً چار پانچ سال سے زیادہ نہیں رہی اور بعد میں جیسا کہ چاہئے قاطعتاً سیر ہو کر حالت اعتدال پہ آگئی اور پھر مزید تین چار سال گزرنے کے بعد تو طبیعت میں آہستہ آہستہ اس سے امان اور انکار کی کیفیت بھی پیدا ہونے لگی۔“ (۲)

جو لوگ والد مرحوم کے مزاج سے قریبی واقفیت نہیں رکھتے یا اُن کے ساتھ کسی خاص حسن ظن کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ ایسا لگام بھی کر سکتے ہیں کہ اگر کے روپے کو خواہ مخواہ ایک مخاصمانہ جذبے سے خراب دکھانے کی رودادیں آریہ ساجیوں کے ساتھ ہونے والے مناظروں کی کسی منصف مزاج غیر کیلئے اس بدگمانی کی گنجائش نہیں چھوڑتیں ایک اقتباس اوپر گذرا ہے۔ اُسکی روداد کے آغاز میں ہم انفرقان ہی سے کی تعریف پاتے ہیں کہ:

”ہمیں کھلے دل سے اعتراف ہے کہ پنڈت جی کی گفتگو بھی نہایت مہذب اور سنجیدہ تھی۔“

(الفرقان ج ۲، ش ۸-۹، ص ۸۹)

## ایک نئی منزل کا رخ اور اُس کا محرک

مناظرانہ سرگرمیوں سے طبیعت کا رخ ہٹ کر جس نئی منزل کی طرف مڑا اس کے سب سے اہم محرک (۳) کے بیان میں ”زندگی کے تجربات و خاص واقعات“ میں تحریر فرمایا ہے کہ

”مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا رسالہ ”ترجمان القرآن“ اُس زمانہ میں حیدر آباد کن سے نکلا تھا۔ اُس میں موصوف

(۱) یہ تمام رودادیں حال ہی میں لاہور کے ایک ادارے نے ”فتوحات نعمانیہ“ کے نام سے چھاپ دی ہیں۔  
(۲) اور اس بیان کے ساتھ اگر اُن کے ان مناظروں کا اصل محرک بھی ذہن میں رکھا جائے جس نے انھیں اس میدان میں اُتارا یعنی توحید و تسبیح کے دفاع اور شرک و بدعت سے جنگ کا جذبہ تو پھر یہ بجائے خود بھی آدمی میں ہر طرح کی لغویات کو برداشت کا حوصلہ پیدا کر سکنے والی چیز ہے۔ (۳) یعنی دوسرے محرکات بھی تھے مثلاً تجربے سے یہ یقین کہ بریلوی علماء جان بوجھ کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا، اس سلسلہ مضامین نے دل و دماغ کو ایک دم چو نکا دیا لہذا بالکل یوں نظر آنے لگا کہ جن مباحث اور مسائل پر مناظرے کرنے اور مسائل لکھنے میں ہم لگے ہوئے ہیں، ان میں ہماری اس مصروفیت کی مثال اُس مالی کی سی ہے جو اپنی ساری جدوجہد اس کام میں صرف کر رہا ہے کہ لے پنے بانگ کے پھلوں کو ختم جیسے پرندوں کے نقصان سے بچائے یا چلتے پھرتے چرندے، درختوں کے پتوں پر جو منہ مار جاتے ہیں اُن سے درختوں کی حفاظت کرے اور اسی کی حفاظتی تدبیروں میں اپنا دن رات ایک کر رہا ہو۔ لیکن سارے بانگ کے درختوں کی جڑوں میں نہایت خطرناک قسم کی اور سب درختوں کو برباد کر دینے والی دیک جو لگ رہی ہو اور جس کی وجہ سے سارا بانگ ہی معرض فانی ہو، اُس سے وہ کم نظر مالی غافل ہو۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی ہی کے ان مضامین نے ابتداءً چو نکا پھر جوں جوں خود غور کیا یہ احساس، یقین کا درجہ اختیار کرتا گیا تا آگے ایک منکشف حقیقت بن کر وہ دل و دماغ پر اس طرح چھا گیا کہ جذبات کا رخ یکسر پلٹ گیا۔ اب دل و دماغ نے پچھلے مشاغل میں دلچسپی لینے سے انکار کر دیا۔ اور چند ہی روز کے بعد یہ کیفیت ہو گئی کہ مناظرہ میں زیر بحث آنے والے جن مسائل کے متعلق مجھے خواب میں بھی دلائل سوچتے تھے اور صحیح سوچتے تھے اور جن کی تائید یا تردید میں پچاسوں کتابوں کی سیکڑوں مہارتیں بیدار تھیں صاف نوک زبان رہتی تھیں ان مسائل پر بھی بولنے یا لکھنے کے لئے دقت لگانا طبیعت پر بار ہونے لگا۔ (۱)

یہ الفرقان کی اشاعت کے چوتھے سال (۱۳۵۶ھ) کی بات ہے۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”اس منزل پر پہنچ کر اللہ پاک کی طرف سے ایک عجیب و غریب دیکھیری ہوئی۔ ”الفرقان“ کا ”مجدد الف مانی نمبر“ نکالنا طے ہوا اور یہ واقعہ ہے کہ جس وقت ”مجدد نمبر“ نکالنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت اس کا تصور بھی نہ تھا کہ اس ذریعہ سے

(۱) مہارتوں کے نوک زبان رہنے کے سلسلے میں ایک خاص واقعہ بھی اس موقع پر درج فرمایا ہے۔ اور وہ قابل ذکر ہی ہے۔ ”راقم کا جو آخری مناظرہ حجاب میں ہوا اُس میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میرے مخاطب مناظر نے یعنی شرح بخاری سے ایک عبارت اپنے مدعا کی تائید میں پیش کی، میں نے اسی کتاب سے اُس کا جواب دینے کے لئے یعنی کی وہی جلد اُن مناظر صاحب سے مانگی کیونکہ میرے ساتھ اُس وقت وہاں یعنی نہیں تھی، اُن حضرت نے یعنی دینے سے صاف انکار کر دیا، میں نے کہا اچھا میں عبارت پڑھتا ہوں آپ یعنی کافلاں صفحہ دیکھئے ایہ مناظر صاحب، اتنے ”معقول“ اور ”معقولیت پسند“ آدمی تھے کہ فوراً بولے ”مولوی صاحب مناظرہ میں جس کتاب کی عبارت جس کو پیش کرنا ہو وہ کتاب ہی سے پڑھ کر سنائے تو سنی جائے گی۔ اپنی یادداشت سے کوئی فریق کوئی عبارت پیش نہ کر سکتا“ اُن سے ہر چند کہا گیا کہ آپ کی یہ شرط اصول مناظرہ کے خلاف ہے۔ ”اصول مناظرہ کی درسی کتاب ”رشیدیہ“ بھی دکھائی گئی، لیکن وہ ایسے ہی ”بھلے آدمی“ تھے کہ یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ اس شرط کے عائد ہونے سے ”محمد منظور“ کے لئے میدان استدلال تنگ ہو جائیگا اور ہر حوالہ کو کتاب سے نکال کر پیش کرنے میں اس کا کافی وقت لگا کرے گا۔ وہ اس نفعو لایعنی بلکہ جاہلانہ شرط پڑا رکھے، بالآخر میں نے اُن کی اس شرط کو قبول کر لیا، لیکن (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے) کیا یہ کہ جس کتاب کی جو عبارت پیش کرنی ہوئی اگر وہ کتاب ساتھ نہیں تھی یا نکالنے میں زحمت سمجھی تو اُس کی ہم تقطیع دوسری کوئی کتاب ہاتھ میں لیکر مگر کتاب کے نام اور صفحہ کا بھی حوالہ صحیح دے کے اصل عبارت حافضہ سے پڑھ دی اور آخر مناظرہ تک شاید دسوں دفعہ یہی کارروائی کرنی پڑی لیکن بچا رہے اُن مناظر صاحب کو شاید آج تک بھی اس کی خبر نہ ہو (عود اللہ من شرور اعداسا ومن سیئات اعمالنا ولا حول ولا قوة الا باللہ)۔

انکار و جذبات کی اصلاح و تربیت کا اتنا عظیم فائدہ خود اپنی رات کو بھی حاصل ہو گا (۱) بہر حال ”مجددِ نسر کی تیاری کے سلسلہ میں حضرت امام ربانی کی زندگی اور ال کے مکتوبات کا مطالعہ ناچیز لے شروع کیا، اس راہ میں جو سب سے بڑی چیز اس عاجز کو حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ مولانا مودودی کے چونکائے سے طبیعت میں جو ایک وقتی انقلاب پیدا ہو گیا تھا ”مکتوباتِ امام ربانی“ کے مطالعہ سے اس کی صحیح تربیت اور تہذیب کا سامان مل گیا۔“

اور پھر فرماتے ہیں کہ

”اپنے انکار و جذبات کے جس انقلاب کا اوپر میں نے ذکر کیا اور حس کی تہذیب و تربیت الحمد للہ مکتوباتِ امام ربانی سے ہوئی اس کے بعد ممیر کا تقاضہ ہوا کہ جس مقصد کے اور اک اور حسِ ضرورت کے احساس لے یہ اضطراب پیدا کیا ہے (یعنی ”احیاءِ دین“ کے لئے جدوجہد اور اصل دین کی جڑوں کو جملے، مصبوط کرے اور جہالت و جاہلیت کے سخت رہریلے اثرات سے اسے صاف کرنے اور محفوظ رکھنے کی ہمہ گیر کوشش) غرض طبیعت میں یہاں کے ساتھ ایک تقاضا تھا کہ اس مقصد کے لئے جو کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور جو حالات موجودہ کیا جاسکتا ہے اپنے کو اس میں معرود کر دیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام بیٹھے بیٹھے مقالے یا رسالے لکھ دیے یا جلسوں میں تقریریں کرنے اور وعظ کھدینے کی طرح کا کوئی آسان انفرادی کام نہ تھا، بلکہ اس کے لئے ضرورت تھی ایک ہمہ گیر دعوت لیکر اٹھنے اور جدوجہد کا ایک مختلف المہات نظام قائم کر دیے کی۔ اپنی ہستی کو بھی میں نے بار بار اس لحاظ سے جانچا اور تو لا کہ کیا اس عظیم کام کا بیڑا میں خود اٹھا سکتا ہوں؟

ہوں؟ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہر دفعہ میرا اندازہ اپنے متعلق یہی قائم ہوا کہ اس کام کی عا  
لوجہ اٹھانے کے لئے بعض حن خاص صلاحیتوں کی ناگزیر درجہ میں ضرورت ہوتی ہے  
میں مجھ میں بہت زیادہ کمزوری ہے۔ اپنے متعلق اس اندازہ پر مطمئن ہونے کے بعد  
عظیم کا بیڑا اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اور نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن اگر کوئی اور اللہ کا  
جائے تو پھر اپنے کو اس کے ساتھ لگا دینا چاہئے۔

اس وقت اس جستجو میں میرے ہی جیسے مضطرب جذبات کے حامل چند بدگمان حد اکاپتہ بھی لگا اور میں مستقل سر  
کر۔ کر کے ان کی خدمتوں میں حاضر بھی ہوا، لیکن اس وقت کی میری یہ تنگ دود نتیجہ کے لحاظ سے لا حاصل ہی رہی اور قریباً دو  
تیس سال تک حیرانی اور سرگردانی سی رہی۔ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ خاص اسی مقصد کے لئے اپنی آرزوؤں کے مطابق ہی،  
مولانا مودودی کی دعوت پر انہی کی امارت و قیادت میں ”جماعتِ اسلامی“ کا نظام بنا، اس عاجز نے بھی اس کی دعوت پر بڑھ کر  
لیک کہہ، مگر افسوس ہے کہ خلاف توقع بعض مایوسیوں اور بے اطمینانیوں کے درمیان میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کے  
مقصد سے للہی محبت اور اس کے اساسی اصول سے دیا متدارانہ موافقت کے باوجود ایک ہی سال کے بعد میں اپنے آپ کو اس نظام  
سے علیحدہ کر لینے پر مجبور ہو گیا۔“ (تجربات و خاص واقعات)

مایوسی اور اس کی دردناکی

یہ شکست آرزو اور نامرادی امید کی بڑی دردناک کہانی ہے۔ اور اس پر ایک پوری

(۱) اس دور میں مجددِ مانی نمبر شاہ ولی اللہ نمبر الفرقان کے بڑے معر کے اور اعلیٰ علمی معیار کے دو ایسے نمبر شائع ہوئے  
تھا جو علمی اور دینی حلقوں میں آج تک یاد کئے جاتے بلکہ لائقِ استفادہ سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک خاص نمبر اس وقت کی  
ہنگامہ خیز تحریک ”خاکسار تحریک“ پر بھی خاصے کی چیز تھی۔ ان نمبروں پر ان شاء اللہ اس مضمون کے آخر میں کچھ لکھا جائے گا۔

کتاب ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت“ لکھی جا چکی ہے۔ مگر اختصار کے ساتھ کچھ بیان یہاں بھی ضروری ہے۔

آپ کی دینی و ملی سرگرمیوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایک بات بہت واضح طور پر نظر آئے گی کہ جس بات کو اس سلسلے میں حق اور فرض جانا اس کے لئے سب کچھ کر گزرتا اور کسی سے نہ ڈرتا، یہی ان کی مناظرانہ زندگی کے ہر ورق سے عیاں ہے۔ اور یہی پھر اس دوسری منزل کی طرف چل پڑنے میں ہوا جس کا رجحان مودودی صاحب کی تحریروں نے پیدا کیا۔ وہ دیوبند کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ انھیں دیوبند اور بزرگان دیوبند سے بے حد تعلق بھی تھا۔ اور انکی غایت درجہ خوش قسمتی کہ تمام اکابر دیوبند ان کی کم عمری کے باوجود انھیں وہ درجہ دیتے تھے جو شاید اُس وقت ان کے کسی اور ہم عمر کا نہ تھا۔ بالفاظ دیگر وہ ان کے منظور نظر تھے۔ یہ چیز الفرقان کے ابتدائی فائلوں میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اور یکجا طور سے ایک حد تک ”تحدیثِ نعمت“ نامی انکی کتاب میں ملتی ہے۔ یہ انکی ان دینی سرگرمیوں کی وجہ سے تھا جو وہ مناظروں کے میدان میں اور الفرقان کے صفحات پر ایک دھن اور لگن کے ساتھ اور بھرپور عالمانہ انداز پر انجام دے رہے تھے۔ اسی کے ساتھ عملاً اگرچہ وہ سیاسی نہ تھے لیکن ذہن و فکر کی حد تک ملی سیاست میں جمعیت العلماء ہند کی راہ کو، جو بالفاظ دیگر جماعت دیوبند ہی کی سیاسی راہ تھی، نہ صرف صحیح سمجھتے تھے۔ بلکہ باضابطہ اس کے ممبر بھی تھے۔ ”تحدیثِ نعمت“ کے دوسرے باب میں ۳۸-۳۷ء کے ایک موقع پر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی اس خواہش کا ذکر کرتے ہوئے کہ ان کے نمائندے کی حیثیت سے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت قبول کر لی جائے، اس سے معذرت کے سلسلہ میں اپنا عذر یہی بیان کیا گیا ہے کہ ”میں اس وقت جمعیت علماء سے باضابطہ وابستہ تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اُسی کے سیاسی مسلک کو اصولی اور بنیادی طور پر صحیح سمجھتا تھا۔ اگرچہ بعض معاملات میں میری مستقل رائے تھی۔“

مودودی صاحب کے مضامین جن سے تاثر شروع ہوا، ابتداء میں اگرچہ کسی ایسی نوعیت کے نہ تھے کہ ان اکابر کے مذہبی یا سیاسی فکر سے ٹکراتے ہوں۔ مگر ۳۸-۳۷ء آتے آتے وہ سیاسی طور سے تو کلکتہ اور کسی حد تک مذہبی طور سے بھی ان اکابر دیوبند کے اور خاص طور سے جمعیت علماء کے فکر سے ٹکرانے لگے تھے۔ لیکن آپ نے اس مرحلے میں بھی جب مودودی صاحب ہی کے فکر کو بنیادی طور پر صحیح سمجھا تو پھر اُس کا یہ ٹکراؤ بھی مودودی صاحب کی طرف بڑھتے جانے سے نہیں روک سکا۔ کہ کسی چیز کو حق جان لینے کے بعد یہی افتادِ طبع تھی۔

جمعیت سے رسمی ممبری کا تعلق قائم رہا اور وہ بظاہر اس لئے کہ اپنے نئے سیاسی فکر کی طرف، جسے وہ مودودی صاحب کے نظریے کے مطابق عین تقاضائے دین و اسلام جان رہے تھے، اپنے ان بزرگوں اور دوستوں کو بھی متوجہ کرنے کی کوشش دوستانہ اور عقیدت مندانہ ماحول میں کرتے رہ سکیں۔ اور اُن کے وہ تعلقات بحال رہ سکیں جو انہیں عزیز اور محترم رہے۔ چنانچہ وہ یہ کوشش کرتے ہوئے، جس کے بھرپور نشانات ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک کے الفرقان میں پائے جاتے ہیں، شعبان ۱۹۶۰ء / اگست ۱۹۴۱ء میں مودودی صاحب کی امارت میں ”جماعت اسلامی“ قائم کرنے کی منزل تک پہنچ گئے، اور یہ اُس کے بعد تھا جب کہ جمعیت علماء کے اخبار الجمعیت میں مودودی صاحب پر وہ سخت تنقیدی حملے شروع ہو چکے تھے جن میں ان کو ”خطبہ فروش، چالاک تاجر“ جیسے الفاظ سے یاد کیا گیا تھا۔ اور الفرقان نے اس کا نوٹس لیا تھا۔ (شمارہ ۵، جلد ۵، ص ۱۳۵ھ)

انہوں نے جماعت میں صرف شرکت ہی نہیں کی تھی، وہ جماعت کو قائم کرنے میں مودودی صاحب کے شانہ بشانہ تھے، اور اسکو قائم رکھنے اور بڑھانے بہت آگے۔ مولانا علی میاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) راغب کیا، مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم جو سترہ سال تک جماعت کی طرف لانے میں اُن کا کسی نہ کسی حد تک حصہ ضرور مولانا مرحوم کی رکنیت اور ان سے ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھے گئے مولانا اصلاحی سے اس فقرے کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے۔

”میں مودودی صاحب کو نہیں جانتا، تمہیں جانتا ہوں، اگر مودودی صاحب کل کو کسی غلط راستے پر چل پڑے تو میں خدا کے سامنے تمہیں پکڑ کر پیش کروں گا کہ ان سے پوچھئے، میرے ذمہ دار بھی یہی ہیں۔“ (۱) [ص ۷۳]

”جماعت کی تاسیس و تشکیل کے بعد جماعت کے سلسلے میں میرا کام“ کے عنوان سے

(۱) اتفاق سے ٹھیک انہی دنوں میں کہ یہ مضمون تیار ہو رہا تھا، مولانا اصلاحی مرحوم کے جاری کردہ ماہنامہ ”تذکرہ لاہور کا اصلاحی نمبر آیا۔ جس کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مولانا اصلاحی کارکنیت میں نام بھی بانی الفرقان (مولانا نعمانیؒ) نے از خود ہی لکھا دیا تھا۔ جسے مولانا اصلاحی نے مرثیہ قبول کر لیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مولانا کو سرائے میر سے دارالاسلام پٹھان کوٹ (مرکز جماعت اسلامی) منتقل ہو جانے پر مجبور کرنے والے بھی مولانا مودودی کے ساتھ مولانا منظور نعمانی تھے۔ ان میں سے پہلی بات کیلئے تو، باوجود بالکل خلاف قیاس ہونے کے، مولانا اصلاحی کے حوالے کے احترام میں کچھ گنجائش نکالی جاسکتی تھی، مگر دوسری بات اس قدر قطعی طور سے خلاف واقعہ ہے کہ وہ پہلی بات کو بھی قابل اعتبار نہیں سمجھوڑتی۔ مولانا اصلاحی سرائے میر سے دارالاسلام پٹھان کوٹ اُس وقت منتقل ہوئے ہیں جب مولانا نعمانی اس سے بہت پہلے جماعت کو چھوڑ چکے تھے۔ اور یہ بات سرگزشت کے اُس اوتلیں بیان میں آگئی تھی جو مارچ اپریل ۱۹۵۸ء کے الفرقان میں شائع ہوا۔

سرگزشت میں تحریر فرماتے ہیں۔

”اجتماع سے واپس آکر الفرقان کے شوال کے شمارہ میں، میں نے۔۔۔ ایک دینی تحریک کا تعارف“ کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا جس میں پوری تفصیل سے اس اجتماع اور جماعت اسلامی کی تاسیس و تشکیل کا تذکرہ کیا۔ اور اس کے مقصد و نصب العین اور دعوت و طریق کار کی وضاحت کی

اپنے ردیک اس عاجز نے اس مضمون میں انتہائی دلسوری و دردمندی اور پوری قوت و اعتماد کے ساتھ عام مسلمانوں، بالخصوص خواص امت کو جماعت میں شرکت یا کم از کم تعاون کی دعوت دی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ”جماعت اسلامی“ کی ایسی مکمل، اتنی مدلل دعوت کی وضاحت اُس وقت تک خود مولانا مودودی صاحب کے قلم سے ”ترجمان القرآن“ میں بھی نہیں آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس زمانہ میں جماعت کی دعوت و کالمت کے جذبہ سے سرشار تھا، جہاں جانا ہوتا اور جس مجلس میں بات کرنے کا اتفاق ہوتا، اکثر یہی میری گفتگو کا موضوع ہوتا، حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میرے بعض دینی اکابر کو میرا یہ اقدام نا پسند ہے لیکن میں اپنے اقدام کو بالکل صحیح اور اپنے ان اکابر کو یہ خیال کر کے معذور سمجھتا تھا کہ اُن کے سامنے وہ صورت حال اور وہ پوری بات نہیں ہے جو میرے سامنے آگئی ہے۔“ [ص ۳۳-۳۴]

اور اس سب پر مزید، مودودی صاحب کے فکر و نظر سے لگا نکت کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ بقول خود

”اس زمانے میں، میں مولانا مودودی سے اتنا متاثر تھا کہ اُن کی اصطلاحوں اور انہی کی زبان میں بولتا تھا، مثلاً اسلام کو ایک ”انتخابی تحریک“ کہتا تھا۔“

اسکی مثال میں اُس زمانے کی بہمنی میں کی گئی اپنی تقریروں کے ایک مربوط سلسلے کا حوالہ اس موقع پر خاص طور سے دیا ہے، جو خطبات بہمنی کے نام سے پہلے الفرقان میں اور پھر الگ کتابی شکل میں شائع ہوئی تھیں، اور جن کی حیثیت آپ کی طرف سے جماعت اسلامی کی تمہید کی تھی۔ اور واقعہً یہ تقریریں مودودی صاحب کی زبان اور اصطلاحات میں ایسی ڈوبی ہوئی تھیں کہ جس کسی نے حضرت بانی الفرقان کا وہ دور نہیں دیکھا سنا ہے، البتہ بعد کے دور سے آشنا ہے، اور اچھی طرح آشنا ہے، اس کیلئے یقین کرنا مشکل ہو گا کہ یہ واقعہً مولانا نعمانی ہی کی تقریریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے، اس مشکل کو حل کرنے کا بھی انتظام فرما گئے ہیں۔ الفرقان کی جلد [۴۷] (۱۹۷۹ء) کے آخری شمارے میں نگاہ اولیں کے زیر عنوان تحریر فرمایا کہ:

”الحمد للہ اس شمارے پر الفرقان کے ۳۷ سال پورے ہو گئے ہیں۔ قریب نصف صدی کی اس مدت میں راقم سطور نے الفرقان کے ہزار ہا صفحات میں یا اسکے علاوہ جو کچھ لکھا، اس میں عیناً بہت سی غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں ایک اصولی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ اگر کسی وقت میں نے کسی مسئلے اور کسی معاملے میں ایک رائے ظاہر کی اور اُس کے بعد کسی زمانے میں اس سے مختلف رائے ظاہر کی تو بعد والی تحریر کو پہلی تحریر کا ناخ سمجھا جائے۔“

اور یہ وضاحتی تحریر آئی بھی ہے ایسے موقع پر کہ اُسکے متصلاً بعد ”مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت“ والا مضمون شروع ہوا ہے۔ پس بزبان حال اس میں

صاف اشارہ مل جاتا ہے کہ اس وضاحت کا خصوصی تعلق مودودی صاحب کی رفاقت والے زمانہ کی تحریروں سے ہی ہے۔

بہر کیف مودودی صاحب کی امارت میں جماعت بنی، یہ کام لاہور میں ہوا تھا جہاں مودودی صاحب مقیم تھے۔ آئندہ کیلئے فیصلہ ہوا کہ جماعت کا مرکز شہری ماحول سے دور بنایا جائے۔ جس کے نتیجے میں پٹھانکوٹ کے قریب ایک صاحب خیر مسلمان کی دارالاسلام کے نام سے بنائی ہوئی عمارتوں میں یہ مرکز قائم ہوا۔ اولاً مودودی صاحب وہاں پہنچ گئے، اور اُن کے دون تین ہفتے بعد (شعبان ۱۳۶۷ھ جولائی ۱۹۴۷ء میں) آپ بھی (مع رالم السطور عتیق کے)۔

اپنی سرگزشت میں اس مرحلے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

”میرے قیام کو ابھی ایک ہی ہفتہ گزر رہا تھا کہ میرے سامنے بعض چیزیں ایسی آئیں جس سے معلوم ہوا کہ احکام شریعت کی جس درجے کی پابندی، یا کہنا چاہئے کہ جس درجے کا عملی تقویٰ جماعت کے ہر رکن کیلئے شرط لازم قرار دیا گیا تھا خود مولانا مودودی نے اپنے کو ابھی تک اُس کا پابند نہیں بنایا ہے۔ اور یہ کہ جماعت کی تاسیس سے چند روز پہلے والی تہائی کی گفتگو سے تقویٰ اور شریعت کی پابندی کے بارے میں مولانا کا حوالہ میں نے سمجھا تھا واقعہ میں اس کا راز ان میں اس قدر تہاون اور اتنی سہل انگاری ہے جو مقام تقویٰ کے مالک منافی ہے۔“

اس صورت حال کے نتیجے میں فرماتے ہیں کہ

”اب میرے سامنے ایک سخت مشکل والحصہ آگئی، اور وہ یہ کہ حواء

امارت کی تحریک خود میں نے پیش کی تھی اور سب کے سامنے میں نے اپنے اس اطمینان

دعمل اور اپنی فکری صلاحیتوں کے لحاظ سے جماعت کی امارت کیلئے موروں تریں آدمی ہیں اور اس سر..... میں امیر کیلئے ضروری قراردادیں مکی ہیں یہ گویا میری طرف سے مولانا کے بارے میں ایک شہادت تھی جو میں نے اس وقت کی اپنی معلومات کی بنا پر ادا کی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ال کا حال وہ نہیں ہے جو ان کے تئیں سے میں نے سمجھا تھا۔ اور جس کام میں نے مار بار اپنے رہاں و قلم سے اظہار کیا۔ اب میں محسوس کرتا تھا کہ اس نے علم و انکشاف کے بعد بھی اسی طرح میرا رکن جماعت بنا رہا تھا ایک ایسی عملی شہادت ہے جس کا عطا اور حلاف واقعہ ہوتا مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اور یہ ایک طرح کا نفاق ہے۔“ (ص ۵۳-۵۴)

اوپر پیش کی گئی تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے جن سے گذر کر والد مرحوم دارالاسلام میں بس جانے کی نیت سے پہنچے تھے، جماعت سے رشتہ توڑنے اور اُلٹے پاؤں دارالاسلام سے واپس چلے آنے کا خیال جس قدر بھاری ہو سکتا ہو گا اس کا تصور مشکل نہیں ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ جماعت کے نظریے، مقاصد اور طریق کار سے دل و دماغ کے تعلق میں کوئی ادنیٰ فرق نہیں پڑا ہے۔ وہ اسی طرح عزیز و محبوب ہیں جس طرح روزِ اوّل سے تھیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ امیر جماعت کے بارے میں دی ہوئی شہادت غلط ثابت ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس فیصلے میں



مہینوں لگ گئے۔ اگرچہ دارالاسلام سے واپسی کو التوا میں نہیں رکھا گیا۔ یہ ایک دو ہفتے کے بعد ہی عمل میں آگئی۔ اور پھر جماعت کی رکنیت ترک کرنے کا وہ فیصلہ بھی بالآخر تین چار مہینے کے غور و فکر کے بعد ہو گیا۔ جس میں قدرتی طور سے ان تمام نو خیز امیدوں اور آرزوؤں کا خون تھا جو جماعت کی تاسیس سے وابستہ کی گئی تھیں۔ اور گویا وہ منزل کھوٹی ہو گئی جس کے لئے مودودی صاحب کی امارت میں رختِ سفر باندھا گیا تھا۔

## منزل بچ گئی

مگر نہیں یہ درحقیقت منزل کو کھوٹی ہونے سے بچانے کا ایک ربانی انتظام ثابت ہوا۔ منزل درحقیقت اُس وقت کھوٹی ہوتی جب وہ اپنی شہادت کے مسئلے کا کوئی اور حل تلاش کر کے اپنے آپ کو جماعت سے وابستہ رکھتے۔ حتیٰ کہ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبدالغفار حسن اور جناب عبدالجبار غازی کی طرح ۱۶-۱۷ سال گزار کر اس نتیجے پر پہنچتے کہ بڑے دھوکے میں رہے اور اس وقت جا کے آنکھ کھلی جب جسم و جان اور دل و دماغ کی قوتوں کا بڑا حصہ محض اضاعتِ نذر ہو چکا۔

معاملے کی نوعیت کسی طرح بھی ایسی نہیں نظر آتی کہ وہ اس کے حل کے لئے جماعت سے اپنی وابستگی ترک کرنے کو سوچیں۔ شوریٰ کے بااثر حضرات کے ذریعے یا پوری شوریٰ کے ذریعے مودودی صاحب کو یقیناً آمادہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں۔ اور جو کمی کوتاہی ہے، اس کا ازالہ کر دیں۔ سرگزشت میں اس معاملے پر مودودی صاحب سے گفتگو کا جو تذکرہ ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کو اصلاح حال پر آمادہ کیا جاسکتا تھا۔ اور اس طرح ”جھوٹی شہادت“ کا مسئلہ ختم ہو جاتا۔ مگر اسکے بجائے ذہن میں ہدایت کے ساتھ استغفے کی بات آتا۔ اور اُسی کو مسئلے کا واحد حل سمجھنا۔ جبکہ جماعت، اسکی پالیسی، اسکے مقاصد و نظریات سب ہی انھیں حسب سابق عزیز اور علیحدگی کا تصور نہایت شاق تھا۔ جبکہ مودودی صاحب کے بارے میں اس علم و انکشاف سے یہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے لائق امارت ہونے میں کلام ہو گیا ہو۔ یہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے تحت رکنیت ناجائز معلوم ہونے لگی ہو۔ جیسا کہ یہ سب کچھ سرگزشت میں صراحتاً آیا ہے معاملے کے یہ سب پہلو صاف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ ترک رکنیت کا خیال اور فیصلہ اپنے ذہن کی پیداوار نہیں تھا۔ یہ ایک من جانب اللہ بات تھی۔ کہ اُن کو اس سفر کے اس حسرتناک انجام سے بچایا جائے جس سے قافلے کے دوسرے لوگ آگے چل کر دوچار ہوئے۔

## اصل فیصلہ کہاں سے اور کیسے آیا؟

”تحدیثِ نعت“ (باب دوم) میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے ایک نو مسلم میواتی رفیق حضرت حاجی عبدالرحمن صاحبؒ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس تذکرے میں ان کی خصوصیات میں سے مستحباب الدعوات ہونے کے بیان میں آتا ہے کہ حضرت مولانا الیاس صاحب کی وفات (رجب ۱۳۶۳ھ) کے اگلے ہی دن میوات کے ایک تبلیغی اجتماع میں جانا ہوا۔ نظام الدین کے دوسرے اکابر کے ساتھ میانجی عبدالرحمن بھی شریک سفر تھے، واپسی میں میانجی نے اصرار کر کے مجھے اپنی بیل گاڑی میں، جو ان کے کسی معتقد کی تھی، بٹھالیا، اور پھر راستے کی اس تنہائی میں فرمایا کہ میں نے تنہائی میں ایک بات پوچھنے کے لئے آپ کو ساتھ بٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ

”کوئی دو ڈھائی برس پہلے کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا، ٹھیک دو پہر کا وقت تھا، میں کھائے وغیرہ سے فارغ ہو کے اپنی عادت کے مطابق حجرے کے کواڑ بند کر کے سوئے کے ارادے سے لیٹ گیا تھا کہ صبح تھی۔ دروازہ پر آکر دستک دی اور آہستہ سے فرمایا کہ ”حاجی عبدالرحمن اگر تم جاگ رہے ہو؟“ مات کرنی ہے۔“ میں اگرچہ جگ رہا تھا بھی سویا نہیں تھا، لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس وقت آرام کر لیں، بات تو پھر بھی ہو جائے گی۔ میں نے سوچا اگر میں دروازہ کھولوں تو پھر ان کے آرام کا وقت نہیں رہے گا، تو میں نے ان کے آرام کے خیال سے نہ

کھولا۔“ میں نے اس کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا اور کوئی جواب نہیں دیا تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنے حجرہ میں آرام کر لیں۔ لیکن وہ اس کے بعد بھی واپس نہیں گئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی فرمایا۔ میں نے مجبور ہو کر دروازہ کھول دیا اور ان سے کہا کہ میں جگ تو رہا تھا لیکن میں اس لئے نہیں بولتا تھا کہ آپ اس وقت ماتیں شروع کریں گے تو آرام نہیں کر سکیں گے، بات تو آرام کرنے کے اور ظہر کے بعد بھی ہو سکتی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ تقاضہ تھا کہ تمہیں اٹھا کے ابھی بات کروں۔ اس کے بعد حضرت جی نے تمہارا (راقم السطور محمد منظور نعمانی) کا نام لیکر فرمایا کہ ان کو جانتے ہو؟ میں نے کہا مجھے تو یاد نہیں، فرمایا وہ جن کا بریلی سے رسالہ نکلتا ہے اور وہ مدعات کا اور اہل مدعات کا رد کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں ان کو تو جانتا ہوں۔ فرمایا وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں، اسی وقت اسکے لئے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ انکو وہاں سے نکال لے۔ پھر حضرت مجھے ساتھ لیکر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ مجھے ساتھ کھڑا کر کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی، پھر مجھ سے فرمایا کہ ان کے لئے اللہ سے دعا کرو اور اللہ سے مانگو، خود بھی دعا فرمائی۔“

یہ پورا واقعہ بیان کر کے حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تمہارا قصہ کیا تھا اور تم کہاں گئے تھے، میں نے حضرت جی سے پوچھا بھی نہیں۔ اگر تم تاسکو اور بتانا مناسب سمجھو تو بتاؤ کہ تم کہاں گئے تھے جس کی حضرت جی کو اتنی فکر تھی؟ (۱)

حاجی عبدالرحمن صاحب کی یہ بات نقل کر کے فرماتے ہیں

”میں نے ان کی بتلائی ہوئی مدت اور موسم کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں ”جماعت اسلامی“ کے ایک اساسی رکن کی حیثیت سے اسکے اُس وقت کے مرکز اور مستقر (دارالاسلام جمال پور ضلع گورداسپور) میں جا کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ و میرہ چندر فقہاء جماعت کے ساتھ مقیم ہو گیا تھا۔“ (ص ۲۲۷)

اس واقعے کو سننے کے بعد اس بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ملتی کہ جماعت کو چھوڑ دینے کا فیصلہ جو عام منطق کے اعتبار سے ناقابل فہم تھا۔ وہ دراصل اپنے ذہن کا فیصلہ تھا ہی نہیں وہ اوپر سے، ایک اللہ والے کی قوت قلب کے ذریعہ، اس بندے کے ذہن پر اس کی بھلائی کی خاطر اتارا گیا تھا۔ اور وہ نافذ ہو کر رہا۔ یہی بات، اس واقعہ دعا کو سن کر، اس بندے کے ذہن نے بھی اپنے الفاظ میں اس طرح تسلیم کی — چنانچہ آگے اس قصے کی تکمیل ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

”وہاں (دارالاسلام) پہنچ کر چند ہی روز کے بعد میرے قلب کی جو ایک خاص کیفیت ہو گئی تھی۔ اور جس شدید اندرونی کشش میں، میں مبتلا ہو گیا تھا (جس کے نتیجے میں بالآخر چند ہی مہینے بعد میں جماعت سے مستعفی بھی ہو گیا) جس کے کچھ ظاہری اسباب وجود ہو چکے تھے، لیکن حجتی عبدالرحمن صاحب سے مذکورہ بالا واقعہ سن کر دل میں یقین سا پیدا ہو گیا کہ میری اُس قلبی کیفیت اور اندرونی کشش میں اصل عامل ان دونوں بررگوں کی دعا ہی تھی۔“ (ص ۲۲۷-۲۲۸)

مذکورہ بالا ”کشش“ اور جن ”ظاہری اسباب“ سے وہ پیش آئی اس کے تذکرے میں لکھا گیا ہے کہ اس واقعے سے مجھے اتنا سخت رنج اور صدمہ ہوا کہ شاید ہی عمر میں اس سے پہلے کوئی اتنا بڑا صدمہ ہوا ہو

عالم اسباب میں بظاہر اسی صدمہ کا اثر تھا کہ (دارالاسلام سے واپس ہونے کے) دو ہی چار دن بعد میں بیمار پڑ گیا — اور دو دن تو ایسے گزرے کہ بیمار داروں کو زیست کی امید بھی کم تھی۔“ (۱)

حضرت خضر علیہ السلام نے جب بے قصور بلکہ اپنے محسن ملاحوں کی کشتی کو نقصان پہونچایا تو ان کو کیا کچھ صدمہ نہ ہوا ہوگا۔ جبکہ رفیق سفر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی ضبط نہ کر سکے تھے۔ مگر بعد میں اس کا راز کھلا کہ ان غریب ملاحوں کی بھلائی اسی میں تھی — بالکل یہی قصہ یہاں نظر آتا ہے کہ ایک نیک دل مسافر کو، وقت کے ایک ”خضر“ کے ہاتھوں، اسکی منزل کھولی ہونے سے بچانے کا انتظام فرمایا گیا تھا۔ اگرچہ اس انتظام میں اس کے لئے فوری طور پر بڑی ہی شدید تکلیف کا سامان تھا اور وقت کے ایسے ”خضر“ ہر زمانے میں ہوتے ہی رہے ہیں۔

بقول حضرت اقبال -

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ انکو  
یہ بیضا لئے بیٹھے ہیں، اپنی آستینوں میں  
جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو (۱) موج نفس ان کی  
الہی کیا چھپا ہوتا ہے، اہل دل کے سینوں میں؟

اور اس خضر کی تو مسافر پر بہت پہلے سے نگاہ تھی -

الفرقان کی فائلیں بھی بتاتی ہیں اور اسکے بعد اب آخر میں آکر ”تحدیثِ نعمت“ کے صفحات نے دکھا دیا ہے کہ آپ نے وقت کے بزرگوں، خاص کر بزرگانِ دیوبند، سے ہمیشہ نیاز مندانہ اور مؤدبانہ تعلق رکھا اور اسکے لئے اس کی بھی شرط نہ تھی کہ کوئی خاص مناسبت ہو۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب وقت کے اُن بزرگوں میں تھے جن سے آپ کو بقول خود دلی احترام اور عظمت کے باوجود کوئی خاص مناسبت نہ تھی۔ تحدیثِ نعمت کے پہلے ہی صفحے پر یہ بات آئی ہے لیکن دوسری طرف اس دعا والے واقعے کے بعد والا سال (ستمبر ۲۰۰۲ء) ہونے والے صد مات کے باعث آپ (والد ماجد) کے لئے،

اور اسکے زیر اثر آپ نے ذہنی و قلبی سکون کے لئے اپنا ایک -

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پور کی خانقاہ میں اسکی بعض خصوصیات لی وجہ سے گزارا۔ جہاں آپ کو مطلوبہ وقتی سکون کے ساتھ وہ ایک دراشت بھی دوبارہ ملی جو کسی وقت ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی، اس کی تفصیل ”تحدیثِ نعمت“ میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے تذکرہ میں پڑھی جاسکتی ہے۔ رخصت کے وقت حضرت شاہ صاحب نے وصیت فرمائی کہ حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب) کے یہاں زیادہ جایا کریں، اور اس پر عدم مناسبت کا عذر سن کر حضرت کی بلند مقامی کے بارے میں بڑے بلند الفاظ فرمائے۔ واپس ہوتے ہوئے سہارنپور پہنچے تھے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کے یہاں حضرت مولانا الیاس صاحب کی نازک علالت کی اطلاع ملی تو وہیں سے دہلی کا قصد کر لیا۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ پیش

(۱) بھی ہوئی شمع - (۲) ذی قعدہ ۱۴۲۲ء میں آپ کے چھوٹے بھائی حاجی محمود حسین صاحب نے ۳۶ سال کی عمر میں پانچ بیٹے چھوڑ کر نہایت مختصر بیماری میں انتقال فرمایا اور رمضان ۱۴۲۳ء میں رفیقہ حیات (راقم السطور کی والدہ ماجدہ) بھی اسی طرح آغا نامہ اسی آخرت ہوئیں۔

آیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے الفرقان بابت ماہ جمادی الاولیٰ والاخریٰ ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء میں تحریر فرماتے ہیں

”اب سے کوئی تین برس پہلے کی بات ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں دو ایک دفعہ حاضری کا اتفاق ہوا تو مدوح نے بڑے درد اور قلق کے ساتھ یہ شکوہ فرمایا کہ ”تم میرا ساتھ نہیں دیتے“ — اس زمانے میں مولانا کے اس شکوے کو میں سنتا تھا اور بس ٹال جاتا تھا۔ کیوں کہ مولانا کی تبلیغی جدوجہد کے متعلق میری جو معلومات تھیں اور جو کچھ میں امداد کرتا تھا اس کی بنیاد پر اگرچہ اس کو ایک اچھی دینی خدمت اور ماعثِ احرا کو شش یقیں کرتا تھا لیکن میری سمجھ میں اسکی کوئی ایسی غیر معمولی اہمیت نہیں آتی تھی جس کی وجہ سے میں اسکو اسی ماہ کے اپنے دوسرے مشاغل پر ترجیح دینا ضروری سمجھتا اور اپنے اوقات کا کوئی بڑا حصہ اس میں لگا دے کا فیصلہ کر لیتا۔

پھر مذکورہ بالا وجہ کی کچھ تفصیل کرنے کے بعد فرماتے ہیں

”سہر حال یہی وجہ تھی کہ میں نے مولانا کے شکوہ کو کئی بار سنا اور خاموشی سے ٹال دیا، ہاں کبھی کسی بڑے اور عام اجتماع کے موقع پر مدح و تقریر کے لئے یاد فرمایا تو چلا بھی گیا اور تبلیغ کی اہمیت و ضرورت پر تقریر بھی کر دی

الغرض عرصہ تک مولانا کے کام اور ان کی جدوجہد کے بارے میں میرا خیال یہی رہا۔ اس مدت میں کئی بار مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا اور غالباً ہر دفعہ ہی مولانا نے ساتھ نہ دینے اور دور دور رہنے کی شکایت فرمائی اور کام میں حصہ لینے کے لئے کہا، لیکن میں نے نہ کبھی وعدہ کیا اور نہ کبھی ارادہ ہی قائم ہوا۔“

اسکے آگے اس حاضری کا قصہ بیان کرتے ہوئے جو ۱۳۴۳ء کے آخر میں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کی بنا پر ہوئی تھی، لکھتے ہیں

”کافی رات گئے“ ”بستی نظام الدین“ پہنچا (جہاں ایک مسجد کا حجرہ مولانا کی قیام گاہ ہے) جن دوستوں سے ملاقات ہوئی ان سے معلوم ہو گیا کہ کئی دن سے سہار میں بے حد شدت ہے۔ میں نے تاکید ال سے کہہ دیا کہ آپ میں سے کوئی صاحب مولانا کی خدمت میں جائیں تو صبح سے پہلے میری اطلاع نہ کریں، اگر اسی وقت خبر ہو گئی اور بلو کر مہنگو کرنے لگے تو خواہ مخواہ تکلیف ہو گی — لیکن اطلاع ہو گئی اور اسی وقت مجھے حجرہ میں طلب فرمایا، بخار بے حد تیز تھا، کھانسی کی شدید تکلیف تھی، صغف بھی بے حد تھا، مایں ہمہ میرے پہنچتے ہی بستر سے اٹھنے لگے، میں نے باصرار گزارش کی کہ اسی طرح آرام فرماتے رہیں لیکن ایک — سی گئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے، میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی طبیعت ناسار ہے اور کمزوری بہت زیادہ ہے آرام ہی فرمائیں۔

ارشاد فرمایا — اہی کیسی بیماری اور کہاں کی کمزوری، بس تم لوگوں کا بیمار ڈالا ہوا ہوں، تمہارا ہی ستایا ہوا ہوں، آج کا کام کر لے لگو، انشاء اللہ اچھا ہو جاؤں گا — میں نے پھر عرض کیا حضرت تشریف رکھیں! میں تو حاضری ہوں — فرمایا نا وعدہ کرو! — میں نے اپنے دل میں یہ سوچ کر کہ ایسی حالت میں تجھے مولانا کی بات نانی نہ چاہئے، عرض کیا ”انشاء اللہ وقت دو ٹکا اور کچھ کام کرو ٹکا“۔

میرے اس عرض کرنے پر بھی لینے تو نہیں، ہاں! نیچے نیچے ہوئے مصلے پر دیوار سے سہارا لگا کر بیٹھ گئے اور ایک خاص انداز میں فرمایا۔“

اسکے بعد جو کچھ ارشاد الفرقان میں نقل ہوا ہے اس کی یہاں ضرورت نہیں۔ بس

صرف یہی دکھانا تھا کہ اس ”خضر وقت“ کی نگاہ اس ”مسافر“ پر پہلے سے تھی۔ وہ اسے اپنے کام کی چیز جانتا تھا اور اس دن کا آرزو مند تھا جب کہہ سکے کہ ”آمد آں یارے کہ مای خواستیم“ اور بظاہر یہی وجہ ہوگی کہ اس مسافر کے حالات معلوم یا منکشف ہو کر اس دل کے لئے خصوصی بے چینی کا باعث بنے اور پھر اس بے چینی نے اس دعا کی شکل اختیار کی جو تیر بہ ہدف بن کے نکلی۔

اللهم احسن احمره و قدّس سرّہ۔

### جملہ معترضہ

واقعہ یہ ہیکہ والد ماجد مرحوم کے مودودی صاحب سے اس طرح متاثر ہونے کو جس کا اوپر کچھ بیان آیا — ایک تقدیری امر کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ فی الواقع کوئی جوڑ کی بات تھی ہی نہیں۔ سب سے پہلی بات جو مودودی صاحب کی اُس زمانے کی تحریریں پڑھنے سے سامنے آتی ہے اور ماہ الفرق ہے وہ انکا اندازِ تکلم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی آدمی آسمان ہفتہ [۷] سے بول رہا ہے۔ اور باقی ساری دنیا بونوں اور احمقوں پر مشتتا۔ اس طرزِ تکلم سے کوئی مناسبت اس زمانے میں بھی نہ تھی۔ پھر تنقیدی تحریروں میں پایا جاتا تھا جس سے والد کا قلم اپنے مناظرِ مشکل ہی سے آشنابا (۱) اور تیسری بات طرزِ تحریر اور طرزِ خطاطہ مغزِ خطاب کی ہے، اس پر نظر کر کے بھی حیرت ہوتی ہے کہ کیسے یہ تحریریں — یہ باب — ہوئے۔ ۱۹۴۰ء کی ان کی ایک مایہ ناز اور شہرہ آفاق تحریر علیگڑھ یونیورسٹی میں دیا گیا خطبہ (لیکچر) ”اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے“ کے عنوان پر ہے۔ بلا ادنیٰ مبالغے کے سچ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی ”اسلامی حکومت“ کا تصور ہے جو زمین پر نہیں بلکہ خلا میں قائم ہونے جارہی تھی۔ اسکو عالمی اور ازلی زمینی حقائق سے ذرہ برابر سروکار نہ تھا — چنانچہ جیسے چند سال بعد زمینی حقائق کا تجربہ ہوا وہ خطبہ ”قصہ ماضی“ بن گیا۔ اور جس شدت سے کل جن چیزوں کو ناقابلِ قبول بتایا

(۱) اور اگر کبھی کسی کو اس قسم کی شکایت کا موقع مل گیا تو پھر تلافی کے لئے اس حد تک ان کا جانا کہ مناظروں میں ان کے خاص دریدہ دہن اور فحاش بریلوی مقابل مولوی حشمت علی خاں نے بھی اگر شکایت کی تو، اس بات پر حد اکا شکر ادا کرتے ہوئے کہ حشمت علی خاں صاحب کو بھی احساس ہوا کہ کوئی لفظ غیر مہذب اور دل آزار بھی ہوتا ہے، لکھا کہ ”ہم مولوی حشمت علی صاحب کے اس احساس کی قدر کرتے ہیں اور بلا کسی اعتدال کے اعتراف کرتے ہیں کہ بے شک یہ العاطفہ دل آزار ہیں، اور اس حیثیت سے کہ وہ الفرقاں میں شائع ہوئے ان کو مجھ سے مواخذہ کا حق ہے اور میں نادم ہوں“

(الفرقان ربع الثانی ۱۳۵ھ ص ۳)۔

گیا تھا اسی شدت سے انھیں ناگزیر بتایا جانے لگا۔ اس ہوائیت کے علاوہ اس خطبے کی دوسری قابل توجہ یہ چیز تھی کہ اسلامی حکومت کے موضوع کا خطبہ اور کتاب و سنت کے کسی بھی حوالے سے خالی! گویا تمام تر ایک طبع زاد تصور (اور آئیڈیا) تھا۔ مگر تخلیق کافن اور قلم کا آرٹ تھا کہ یہ خطبہ ایک خاصے کی چیز بنا رہا۔

الغرض اسے ایک تقدیری امر ہی کہا جاسکتا ہے کہ ان باتوں کے باوجود مودودی صاحب کی طرف ایسا رجحان ہوا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ملاقاتوں اور قریب سے دیکھنے کے بعد طبیعت کو سخت دھکا بھی لگا کہ تحریری دعوت اور عملی حالت میں بڑا فرق ہے۔ اور اسلئے ایک بار ان کی طرف سے قطعی مایوسی کا فیصلہ بھی کر لیا (سرگزشت ص ۲۹) مگر دو ڈھائی سال کسی اور موزوں تر آدمی کی تلاش کرنے اور اس میں ناکامی کے بعد طبیعت پھر ایک بار موصوف ہی کے لئے نرم ہوئی اور کتابت تقدیر اپنا کام کر گئی۔

تقدیری عمل کے پیچھے بھی اسباب کا سلسلہ تو ہوتا ہی ہے، ان اسباب کی نشاندہی بڑی حد تک سرگزشت ہی سے ہو جاتی ہے۔ نو عمری میں تحریک خلافت کا وہ دور دیکھا تھا جس میں ملک کے بعض علاقوں میں (خصوصاً مو [سابق ضلع اعظم گڑھ] جہاں وہ اس وقت تعلیم پا رہے تھے) کچھ وقت کے لئے اسلامی نظام حکومت، جس کے لئے خلافت کی تحریک نے جوش بھر دیا تھا، عملاً قائم بھی ہو گیا تھا۔ پھر دیوبند پہنچے تو وہاں ان جذبات کو اور غذائی کہ وہاں شیخ الہند کی تحریک اور قربانیوں کے تذکرے تازہ تھے۔ فراغت کے بعد جمعیتہ علمائے ہند سے باقاعدہ تعلق قائم کر لیا جو ان جذبات اور ان یادوں کی وارث تھی۔ غرض ہندوستان میں اسلامی حکومت کا احیاء یا کم از کم مسلمانوں کے ایک خود مختار نہ شرعی نظام کے لئے جذبے کے وہ وارث تھے۔ انڈیا ایکٹ ۱۹۴۷ء کے بعد جو صوبائی حکومتوں کے لئے الیکشن ہوئے اور پھر بیشتر صوبوں میں کانگریسی حکومتیں بنیں، اس کے تجربے نے ذہن کو اس بارے میں مشکوک کر دیا کہ جمعیتہ کی جو پالیسی کانگریس کے ساتھ اس مفروضہ پر اشتراک و تعاون کی چل رہی ہے کہ آزاد ہندوستان میں وہ مسلمانوں کو ایک آزاد و خود مختار شرعی نظام قائم کرنے کا موقع دے گی۔ یا نہیں تو اس کے علی الرغم ایسا کیا جاسکے گا، یہ فی الواقع ایک صحیح پالیسی ہے؟ اسی حالت میں مودودی صاحب نے، جن سے وہ کئی سال پہلے سے متاثر ہوتے آرہے تھے اپنے رسالے ترجمان القرآن میں ملک کے آئندہ سیاسی نقشے پر اظہار خیال شروع کیا، مودودی صاحب کے اس سلسلہ مضامین نے ان کے شک کو یقین سے بدل دیا جس کے بعد انھوں نے کوشش کی کہ جمعیتہ کی قیادت میں بھی اس کا احساس کیا جائے، اس

سلسلے کے مضامین بھی اس زمانے میں الفرقان میں نکلے ہیں (۱)۔ لیکن اس کی کچھ زیادہ توقع کرنے کی گنجائش بظاہر نہیں پائی جاتی تھی۔ اسلئے جیسے ہی خود مودودی صاحب نے اسلام اور اسلامی نظام زندگی کے لئے ایک نقشہ کار پیش کیا ان کے دل و دماغ نے اسے قبول کر لیا اور حرکت پسند طبیعت فوراً عمل کے لئے مستعد بھی ہو گئی۔

یہ ہے مختصر اُن اسباب کا قصہ جو اس تقدیر امر کو ظہور میں لے آئے والعلم عند اللہ۔ لیکن واقعے میں یہ مودودی صاحب کا پیش کردہ نقشہ عمل تھا بالکل ایک غیر عملی نقشہ کار، اور بس یہ اللہ کی غیر معمولی مہربانی بانی الفرقان علیہ الرحمہ یہ ہوئی کہ ان کا زیادہ وقت اس خیالی نقشہ عمل پر — جس کا بنیادی فکر ”اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے“ میں پایا جاتا ہے — ضائع نہیں ہونے دیا گیا۔ **فالحمد للہ**۔

حفاظت جس سفینے کی انھیں منظور ہوتی ہے  
کنارے تک اُسے خود لا کے طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

والہی بخد مت حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ

آئیے، اب حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت کر بیچ میں یہ جملہ معترضہ درپیش ہو گیا تھا۔

حضرت مولانا سے ان کے اصرار پر ان کے احترام میں جو وعدہ دیا گیا تھا۔ مجلس میں ایک شرح صدر والے وعدے میں اُس وقت بدل گیا جب مولانا نے اپنے کام کی کچھ وضاحت چند جملوں میں فرمائی — اور پھر ایسی وضاحتوں کا سلسلہ قائم رہا — مثال کے طور پر الفرقان کے اُسی شمارے میں حضرت مولانا کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے

”ہماری اس (دعوتی) تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو ”حَمِيعٌ مَّاحِجٌ، هِ السَّيِّئَاتِ“ سکھانا (یعنی اسلام کے پورے علمی و عملی نظام سے امت کو وابستہ کر دینا) یہ تو ہے ہمارا اصل مقصد — ہر ہی قافلوں کی یہ چلت بھرت اور تبلیغی گشت سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ و نثار کی تلقین و تعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی ”الف، ب، ت“ ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہمارے قافلے پورا کام نہیں کر سکتے، ان سے تو بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ ہر جگہ پہنچ کر اپنی حد و جہد سے ایک حرکت و بیداری پیدا کر دیں اور قافلوں کو متوجہ کر کے وہاں کے مقامی اہل دین سے واسطہ کرے کی اور اس جگہ کے دین کی فکر رکھنے والوں (علماء و صلحاء) کو پچارے عوام کی اصلاح پر لگا دیے کی کوشش کریں۔ ہر جگہ پر اصلی کام تو وہیں کے کارکن کر سکیں گے اور عوام کو زیادہ فائدہ اپنی ہی جگہ کے اہل دین سے استفادہ کرے میں ہو گا۔ البتہ اس کا طریقہ ہمارے ان آدمیوں سے سیکھا جائے جو ایک عرصہ سے افادہ و استفادہ اور تعلیم و تعلیم کے اس طریقے پر عامل ہیں اور اس پر بڑی حد تک قابو پا چکے ہیں۔“



یہ وہ راہ عمل تھی جسے پاکر بانی الفرقان نے گویا وہ چیز پالی جسکی ان کی روح کو جستجو تھی۔ اس پر ان کے شرح صدر میں پھر بھی فرق نہیں پڑا۔ اس چیز (راہ عمل) کی پوری تشریح ان کے اس سلسلے کے اولین مقالے ”نصرت دین اور اصلاح مسلمین کی ایک کوشش“ میں ملتی ہے۔ جس کا خاتمہ اسکی ان سطروں پر ہوتا ہے۔ (یہ مقالہ جمادی الاولیٰ والاخریٰ ۱۳۶۳ھ کے الفرقان میں شائع ہوا تھا)۔

### اس تحریک اور اس کے طریقہ کار کی ہمہ گیری

”امید ہے کہ ناظرین کرام نے یہاں تک کی گزارشات سے اس تحریک کے مقاصد، اس کی ہمہ گیری اور اس کی دور رس کو سمجھ لیا ہوگا، اور اندازہ فرمایا ہوگا کہ -

یہ تحریک دین کی ”عمومی تعلیم و تربیت“ کے اُس سببی طریق کو رہ کرے اور رواج دے کی براہ راست کوشش ہے جس نے قربِ اول کے سارے مسلمانوں کو علم عمل اور سعی و جہد کا کامل نمونہ بنادیا تھا اور اب بھی اگر اُس کا عام رواج ہو جائے تو یقیناً موجودہ ”مسلمان قوم“ قرآن والی ”امت مسلمہ“ اور ”خیر امت“ بن سکتی ہے۔

یہ تحریک مسلمانوں میں دین کی خدمت و نصرت کا جذبہ عام کرے اور ان کو نصرت کے اس صحیح راستہ پر لگانے کی فی رما سہترین صورت ہے جس راستہ سے خود رسول اللہ ﷺ نے اور آپ کے صحابہ نے دین کی نصرت کی تھی۔

علیٰ ہد مسلمانوں کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے سے قریب کرنے، ملی جلی رہدگی مگر اے، اسلامی مساوات و مساوات کا عادی بنادینے اور اخوة اسلامیہ کو پھر سے زندہ کر کے بھی یہ حکیمانہ اسکیم ہے۔

اسی طرح ایمان و یقین کی تجدید و تکمیل، تزکیہ اخلاق اور تعمیر سیرت کو مسلمانوں میں عام کرے، نیز ذکر و فکر اخلاص و احسان، مراقبہ آخرت، اور اللہ کی حیثیت جو مسلمانوں کے عمومی اوصاف ہونے چاہئے تھے مگر ہماری بد قسمتی سے اب چند حلقہ نشین برہگوں کی خصوصیت بن کے رہ گئے ہیں (اور اب تو وہاں بھی عام طور سے اُس اللہ کا نام ہی ہے۔ الا مس شاء اللہ) تو ان خصائص و احوال کو پھر سے مسلمانوں میں بطریق عموم پھیلانے کی بھی یہ بہترین عملی تدبیر ہے۔

اس سب کے ساتھ یہ تحریک، مقصد رسالت کی نیلۂ حفاظت، تبلیغ و دعوت کے فریضہ کی ادائیگی، اور ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر“ کے اجراء کی بھی براہ راست کوشش ہے“ (الفرقان جمادیٰ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۳ء)

اور یہاں سے بانی الفرقان کی زندگی کے ساتھ الفرقان کا بھی ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ جس میں اُس کی اصل دعوت یہی تھی جسے قرآن پاک کے مختصر الفاظ میں یا اٰیہا الدّٰیْنِ اٰمِنُوْا اٰمِنُوْا۔ اے مسلمانو! سچے ایمان والے بن جاؤ۔ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ دور پوری یکسوئی کے ساتھ تقریباً ۶۱-۱۹۶۰ء / ۱۳۸۰ھ تک رہا لیکن اس کی خصوصی اہمیت آخر دم تک دل میں رہی۔ ”تحدیثِ نعمت“ میں اپنے اس دور حیات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

”میرا احساس ہے کہ اپنی ذات اور الفرقان دونوں سے جس قدر کام اس راہ میں لیتا اس عاجز کے لئے ممکن ہوا وہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات و العامات میں سے غیر معمولی درجے کا بڑا انعام و احسان ہے۔“ [ص ۱۸، طبع اول ۱۹۹۹ء]

## یکسوئی میں فرق

تبلیغی دعوت میں عملی یکسوئی کے ساتھ بھی ذہن حالات حاضرہ سے کبھی بے نیاز نہیں رہا تھا۔ پابندی سے اور غور سے اخبار دیکھنے کی عادت تھی اور ملکی و ملتی حالات کے بارے میں اپنی سوچی سمجھی رائے رہتی تھی۔ اسی کا قدرتی اثر تھا کہ ۱۹۶۰ء کے قریب انھیں یوپی کے ایک ضلع میں انجام دی جانے والی ایک نہایت اہم ملتی خدمت کا علم ہوا جس کی نوعیت تقاضہ کرتی تھی کہ وہ پورے صوبے میں ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیلے۔ یہ خدمت تھی 'مسلمان بچوں کے دین و ایمان کو ان خطرات سے محفوظ کرنے کا انتظام کرنا جو صوبے کے سرکاری نظام تعلیم کے زیر اثر صاف طور سے سامنے آگئے تھے۔ انھوں نے اس خدمت کو بھی تبلیغی جدوجہد کے پہلو بہ پہلو اپنے وقت میں شریک کرنا لازم سمجھا۔ یہ کام دینی تعلیمی کونسل کے قیام کے ذریعے صوبے کے پیمانے پر شروع ہوا اور الحمد للہ ہو رہا ہے۔ اسکے بعد ۱۹۷۰ء ختم ہونے جا رہا تھا کہ - الفاظ "تحدیثِ نعمت" "ملک میں مسلم کشی کا ایک بھیانک سلسلہ آنا فانا"

رہے تھے کہ یہ ۱۹۷۰ء کی طرح کا وقتی اہال نہیں تھا۔ چنانچہ ا میں مزید فرق ڈالا اور ایسے مسائل کے سلسلے میں اب تک ذہن عارضی اور وقتی صورت حال ہے اور مسلمانوں میں دینی اور ایمان اس صورت حال کی تبدیلی کیلئے بجائے خود کافی ہوگی۔ "اس ذہن نے مظاہر - پیر ۱۷ مارچ اب اپنے ایک دینی و ملی فرض سے روگردانی کے ہم معنی نظر آنے لگا۔

## ندائے ملت کا اجراء

اس ضمن میں پہلا قدم اپنی ملت کی ذہنی و فکری رہنمائی کے لئے ندائے ملت اخبار کے اجراء کی شکل میں اٹھا، یہ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ایک بڑا بھاری بوجھ تھا جو انھوں نے اٹھانے کی ہمت کی۔ اس کے لئے ایک ٹرسٹ بنایا گیا۔ یہ زمانہ مولانا علی میاں صاحب کی رفاقت کا تھا، ان کو اس ٹرسٹ کا صدر بنایا گیا۔ بوجھ اٹھانے میں پوری شرکت کرنے والے نوجوان ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی تھے اور ادارت کی ذمہ داری راقم السطور کی۔ ہندوستان کی مسلم صحافت کی تاریخ میں اس کے ابتدائی چھ سالہ دور (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء) نے جو نقش قدم چھوڑا ہے وہ شاید بلا اختلاف مسلم ہے۔

## مسلم مجلس مشاورت

ندائے ملت جاری ہوئے دو ہی سال ہوئے تھے کہ ۱۹۶۴ء میں بہار، بنگال اور اڑیسہ قحط

صوبوں میں پھیلی ہوئی ساڑھے چار سو میل کی پٹی میں وہ بھیانک مسلم کش فسادات ہوئے کہ تمام پچھلے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ اس کی دلدوز خبریں معلوم کر کے آپ نے اس علاقے (جمشید پور، راوڑ کیلا اور رانچی) کا سفر کیا اور دل پر پتھر رکھ کر وہ تمام دردناک مناظر دیکھے جو یہ فسادات اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اسی طرح سے متاثر ہونے والوں میں دوسرے بہت سے حضرات بھی تھے۔ پرانے کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود نے اس موقع پر ایک خاص طریقے کے متحدہ مسلم پلیٹ فارم کا تصور پیش کیا جسے حضرت بانی الفرقان نے، ان کے رفیق خاص مولانا علی میاں صاحب نے اور جماعت اسلامی کے محمد مسلم صاحب مرحوم نے خاص طور سے آگے بڑھانے میں مدد کی۔ جس کے نتیجے میں مسلم مجلس مشاورت کے نام سے ایک متحدہ مسلم پلیٹ فارم کی تشکیل ۱۹ اگست ۱۹۶۴ء کو ہوئی مگر — اس کو جیسے نظر لگ گئی اور ”خوش درخشید و لے شعلہ“ مستعجل بود“ کا مصداق بن گیا۔ اس کی زیادہ تفصیل کے لئے دیکھئے ”تحدیثِ نعمت“۔

### مسلم مجلس مشاورت کے تجربے کا اثر

امت میں ایمانی زندگی کی تبلیغی دعوت و محنت کی اولین اہمیت کے ساتھ ساتھ ملت کے دوسرے مسائل کے سلسلے میں اسکی رہنمائی اور ذہن سازی سے ان کا ذہن کبھی اس لئے بے نیاز نہ رہ سکا کہ وہ حالاتِ حاضرہ سے واقفیت کی بھی فکر رکھتے تھے۔ مگر مشاورت کے تجربے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے جس کا وہ پہلے سے بھی احساس رکھتے تھے۔ کہ امت میں فی الحال اجتماعی کاموں کی صلاحیت دور دور تک نہیں ہے۔ اس سے دنیا تو کیا سنورتی، الٹے آخرت خطرے میں پڑتی ہے۔ اس لئے مجبوراً انفرادی کام پر ہی قناعت کرنا پڑے گی۔ یعنی جو کچھ ایک آدمی کے اپنے بس میں ہے اُسے اپنے طور پر انجام دے۔ حتیٰ کہ ایسی مخلصانہ اور بے غرضانہ انفرادی کوششیں اپنے دائرہ اثر کو پھیلاتی ہوئی امت میں ایک عمومی شعور اور بے غرضانہ خدمت کا مزاج پیدا کر دیں — اس فیصلے پر پہونچنے میں زیادہ دخل ان کے اس تجربے کا تھا کہ دنیاوی لحاظ سے لا حاصل ثابت ہونے والا یہ ”کھیل“ آخرت کے پہلو سے بہت خطرناک ہے۔ باہمی چپقلش ہوتی ہے، بدگمانیاں ہوتی ہیں اور بدگوئیاں — راقم السطور کا اپنا خیال یہ ہے کہ اس فیصلے میں والد مرحوم کی حساسیت کو بھی دخل تھا۔ انھیں غلط قسم کی باتیں بالکل ہی برداشت نہ ہوتی تھیں، اور اجتماعی کاموں میں ایسی باتوں سے مفر نہیں، البتہ یہ بات اپنی جگہ درست ہی مانتی پڑے گی کہ امت سے بی بحیثیت مجموعی اجتماعی تقاضوں کا وہ شعور ہی جیسے سلب ہو گیا ہے جس پر قرآنی ہدایت۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ  
(الشوریٰ-۳۸)  
اور اُن کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہے۔

کی بنیاد ہے۔

اس تجربے کے بعد

مجلس مشاورت کا یہ تجربہ ۶۸ء میں تمام ہوا۔ اسکے بعد ۱۹۷۲ء میں ہم ان کو مسلم پرسنل لا کے مسئلے پر ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل و تاسیس میں سرگرم عمل دیکھتے ہیں۔ لیکن اسکی نوعیت مجلس مشاورت قسم کے اجتماعی کاموں سے ذرا مختلف تھی اور ایسی ہی ثابت ہو رہی ہے۔ مزید برآں اس کی تحریک ملک میں مسلم پرسنل لا کے خلاف اٹھتی ہوئی فتنہ آرائی کے تدارک کیلئے دارالعلوم دیوبند کی ایک دینی ذمہ داری کے طور پر وجود میں آئی تھی اور وہ دارالعلوم کے نہایت اہم ذمہ داروں میں (یعنی سینئر ترین رکن شوریٰ) تھے۔ یہ بورڈ جو بلا تفریق ہر مسلک اور مکتب فکر کے نمائندوں پر مشتمل تھا، اس وقت کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب کی سرکردگی میں سرگرم عمل ہو صاحب ہی اسکے سربراہ رہے۔ رحمۃ اللہ علیہ

دورِ معذوری کی داغ بیل

مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس کو دیر بڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ دیوبندے سر (۱۹۷۲ء) میں دیوبند پہنچ کر رکشہ الٹ جانے کا حادثہ پیش آیا اور اسمیں کو لھے کی ہڈی کا جوڑ (Hip joint) کھل گیا۔ غیر معمولی درجہ کا تکلیف دہ حادثہ تھا۔ مگر اللہ نے کرم فرمایا، چند مہینے علاج معالجے کے بعد اُس کے اثرات نوے پچانوے فی صدی جاتے رہے اور معمول کے مطابق نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ لیکن اندرونی طور پر معالجے میں کوئی کسر بظاہر رہ گئی تھی۔ جس کے اثرات دو سال کے بعد ایسی شکل میں ظاہر ہوئے کہ چند دن موت و حیات کی کشمکش کی صورت رونما رہی اور پھر یہاں سے اُس مستقل معذوری کا آغاز ہو گیا جس معذوری کے عالم میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ دو سال بعد یعنی (۱۹۷۴ء) کا قصہ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ یہ ملک کے ایک بڑے اہم تاریخی موقع پر، اپنی ملت کے سلسلے میں اپنے اُس احساس ذمہ داری کا ایک تقاضہ پورا کرنے میں پیش آیا تھا جس احساس ذمہ داری نے انھیں تبلیغی محنت و دعوت کے سلسلے میں اپنے کامل شرح صدر کے باوجود ندائے ملت کے اجراء اور مسلم مجلس مشاورت کو وجود میں لانے کی

جدوجہد پر مجبور کیا تھا۔ اور اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں بے ریا و بے غرض خدمت کا وہ ایک یادگار نمونہ سامنے آتا ہے جو ان کے فرزند ان ملت کے لئے گویا خاموش عملی نصیحت ہے کہ اپنی ملت کی خدمت اس طرح کرو کہ اگر ہو سکے تو بس تم جانو اور تمہارا اللہ۔ یہ واقعہ انھیں کے قلم کا لکھا ہوا — یا لکھایا ہوا — الفرقان اکتوبر نومبر ۱۹۷۷ء میں بایں الفاظ شائع ہوا ہے

”عرفت رمی بمصح العرائم و مصال مبارک (مطابق ستمبر ۱۹۷۷ء) کے شمارہ کی ترتیب و تیاری اور اس طرح کے دوسرے کاموں سے میں شعبان میں بالکل فارغ ہو گیا تھا اور نیت یہ تھی کہ رمضان مبارک بالکل یکسوئی سے گزرے۔ اسی نیت اور ارادہ کے تحت میں نے رمضان مبارک کے دنوں اور راتوں کے لئے اپنا نظام الاوقات بھی مرتب کر لیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کچھ اور تھی — ۳۰ شعبان کو جمعہ کا دن تھا۔ عصر کے قریب ٹیلیوین سے اطلاع ملی کہ ہمارے محترم مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرانی (شیخ التفسیر دارالعلوم مدوۃ العلماء لکھنؤ) کا بھی اپنے مکان پر انتقال ہو گیا۔ (انا لله وانا الیہ راجعون) مہار عصر سے فارغ ہو کر وہاں پہنچا۔ مولانا مرحوم سے خاص تعلق رکھنے والے چند حضرات اور بھی پہنچ چکے تھے۔ پہلے اس کے امکانات پر غور کیا گیا کہ رات ہی میں تم میں ہو جائے لیکن اس میں ناقابل غور مشکلات نظر آئیں تو یہ طے ہوا کہ تین صبح ہو چنانچہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر مولانا مرحوم کے مکان پر پہنچا اسی وقت مولانا کو غسل دیا گیا۔ قریباً گیارہ بجے تدمین سے فراغت ہوئی رفتی محترم مولانا علی میاں اسی وقت دہلی اور سہارن پور کے سر سے واپس ہوئے تھے مولانا کو بعض اہم معاملات کے بارے میں اس عاجز سے گفتگو فرمائی تھی طہر تک ہم دونوں اس میں مشغول رہے، طہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایسا ہی کوئی اور کام سامنے آگیا اور شام تک اس میں مصروفیت رہی، مشکل تھوڑا سا قرآن شریف پڑھا جا سکا — رمضان المبارک کا پہلا دن اس طرح پورا ہوا — مولانا علی میاں رائے بریلی تشریف لے گئے اور اس سے جس اہم معاملے میں گفتگو ہوئی تھی اسی سلسلے میں یہ طے ہوا کہ کل صبح مجھے بھی رائے بریلی پہنچنا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد رائے بریلی کے لئے روانہ ہو گیا، وہاں ظہر تک مسلسل اسی معاملے میں گفتگو ہوتی رہی اسکے بعد فوراً ہی ٹرین سے لکھنؤ واپس ہوئی اور عصر کے قریب مکان پر پہنچ گیا۔ یہ رمضان مبارک کی دوسری تاریخ اور اتوار کا دن تھا — یہ بھی اسی طرح ختم ہو گیا — اس دو دنوں میں مجھے آرام کرنے کا بھی موقع بالکل نہیں ملا اس لئے تھک کر چور ہو گیا تھا۔ لیکن کسی تکلیف یا بیماری کا احساس بالکل نہیں تھا۔ رات کو تراویح بھی معمول کے مطابق مرکز کی مسجد میں ادا کی اس کے بعد عادت کے مطابق سویا اور اپنے وقت پر بیدار ہو گیا۔ سحر وغیرہ سے فارغ ہو کر فجر کی نماز مسجد میں پڑھی، نماز کے بعد قریباً آدھ گھنٹہ کچھ بیان بھی کیا اور اس سے فارغ ہو کر حسب معمول کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ اس وقت تک بھی کسی قسم کی تکلیف یا بیماری کا احساس نہیں تھا اسی حال میں نید آگئی۔ قریباً ایک گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ ڈھائی سال پہلے ایک ایکسڈینٹ کے نتیجے میں بائیں ٹانگ جو رجمی ہو گئی تھی (اور خدا کے فضل سے جسکا کوئی اثر بعد میں باقی نہیں رہا تھا) اس میں سخت تکلیف ہے۔ اور کولے پر بلکہ ٹانگ کے پورے بالائی حصہ پر درم آگیا ہے، اور میرے لئے زمین پر قدم رکھنا بھی مشکل ہے۔ بخار بھی ہو گیا تھا لیکن ٹانگ کی شدید تکلیف کی وجہ سے مجھے اس کا بالکل احساس نہیں تھا — مرض کا حملہ آچانک بالکل اس طرح ہوا جیسے فالج اور لقو وغیرہ مفاصلاتی امراض کا حملہ ہوا کرتا ہے — علاج شروع ہوا، دوا کے استعمال کے لئے روزہ بھی قصاکر دینا پڑا لیکن ٹانگ کی تکلیف تیز رفتاری سے بڑھتی رہی اور اسی طرح بخار بھی — رات اسی بے چینی اور تکلیف میں گزری دوسرے دن اس کیفیت میں یہ اضافہ ہوا کہ ہچکچاہٹیں آنا شروع ہو گئیں اور مسلسل فاقوں کے باوجود مستقل ایک ہی حالت میں رہنے سے پیٹ میں نفخ کی کیفیت پیدا ہو گئی — اگلے دن تک بھی اس کیفیت میں کوئی فرق نہیں واقع نہیں ہوا بلکہ ٹانگ کی تکلیف اور نفخ میں اضافہ ہوتا

رہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تیسرے دن سے بخار یکساں رہنے کے بجائے تیزی سے گھٹنے پڑنے لگا۔ دن میں دو تین بار شدید لرزہ کے ساتھ بخار بڑھتا تھا اور سارے جسم پر کچھٹی طاری ہو جاتی تھی۔ یہ صورت حال میرے بیمار داروں کے لئے قدرتی طور پر پریشان کن تھی۔ ایک ڈاکٹر جو بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں ان کو میری بیماری کی اطلاع دی گئی، وہ آئے اور میری یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ مجھے بلڈ یوریا کا شبہ ہے اس لئے خون اور پیشاب کا ٹسٹ فوراً کرایا جائے۔ بیمار داروں نے اس کا انتظام کیا اور اگلے ہی دن ٹسٹ کی رپورٹوں سے ڈاکٹر صاحب کے شبہ کی تصدیق ہو گئی، معلوم ہوا کہ بلڈ یوریا ہے، اور آنا فانا خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے۔ میں اس مرض سے اور اس کی سنگینی سے واقف نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے بیمار دار اور معالج خاصے فکر مند ہیں۔ اس نے اور غیر متوقع مرض کے انکشاف کے بعد میرے بیمار داروں نے ایک دوسرے کرم فرما ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا اور انکے مشورہ سے اس مرض کے خصوصی ماہر ایک ڈاکٹر کا علاج شروع ہوا۔

میرا اپنا حال یہ تھا کہ مجھے علامات کے پہلے ہی مرحلہ سے اصل احساس ٹانگ کی تکلیف کا تھا، جو رفتہ رفتہ میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ دوسرے بخار کے اضطراب اور لٹخ کی ادیت اور مسلسل بے خوابی نے ان تین چار دنوں میں مجھے اس درجہ بے حال اور بے حال کر دیا تھا کہ میرے لئے آنکھیں کھولنا اور اپنے گھر والوں کو پہچاننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اور بعد میں بیمار داروں نے بتلایا کسی کسی وقت بالکل ہڈیانی کیفیت ہو جاتی تھی۔ اسی حالت میں بلڈ یوریا کے ماہر معالج ان ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جلدی ہی افادہ ہونے لگا۔ اس درمیان میں ڈاکٹر صاحب

خون اور پیشاب ٹسٹ کر لیا جاتا رہا اور ہر مرتبہ کی رپورٹ سے مرض میں تخفیف ہی طار

ہو گیا۔ البتہ ٹانگ کی تکلیف ابھی تک جوں کی توں برقرار تھی اور بخار بھی برابر

ہسپتال میں داخلے کا فیصلہ کیا گیا اور ایسولنس کے درجہ مجھے ہسپتال پہنچا دیا گیا، وہاں

ڈاکٹروں نے بتلایا کہ کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہے بلکہ جو ہڈی ایکٹیوٹ سے بھرجو ہو

ہے اور اس کا علاج بس آرام اور ورزش ہے۔ چنانچہ ورزش شروع ہو گئی اور بخار وغیرہ لے۔

گتے رہے الغرض اس طرح علاج چلتا رہا۔ دس بارہ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ علاج گھر پر بھی اسی طرح جاری رہ سکتا ہے، اس لئے ڈاکٹروں کی اجازت سے گھر آنے کا فیصلہ کر لیا گیا، چنانچہ ۲۸ ویں روزے کو ہسپتال سے گھر واپسی ہوئی اور وہی علاج گھر پر ہوتا رہا۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے سامنے بندے کی عاجزی اور بے بسی کی رمضان مبارک کے صرف دو روزے نصیب

ہو سکے اور سارا مہینہ اس طرح گذرا کہ صرف فرض نمازیں کسی طرح لینے لینے اشاروں سے ادا ہو جاتی تھیں۔ اور ان کے بارہ میں بھی اس قدر بے اطمینانی تھی کہ میں ان سب کو صحت کے بعد واجب الاعداء سمجھتا تھا بمعزل اللہ ماہشاء و بحکم ماہرہ۔

## خدمت؟

س خاصہ لمبی تحریر میں ہم کو کہیں بھی کسی ملتی خدمت کا ذکر نظر نہیں آتا۔ ایک مولانا محمد اولیس صاحب مرحوم کی تجبیز و تکفین کا بس ذکر ہے وہ خدمت کہاں ہے؟ وہ خدمت ہے حضرت مولانا علی میاں صاحب سے گفتگو کے حوالے میں لپٹی ہوئی اور پھر مزید گفتگو کے لئے رائے بریلی کے سفر کے حوالے میں لپٹی ہوئی۔ اب اسکی تفصیل میں آئیے۔

ستمبر ۱۹۷۶ء کا یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب راقم السطور (عتیق) اس سے ایک ہی ماہ قبل لندن جا پہنچا تھا۔ اس لئے کچھ تفصیل معلوم نہ تھی۔ اور بعد میں خطوط سے معلوم ہوئی تو اپنے حافظے کی خرابی سے وہ زیادہ دیر پوری طرح ذہن میں محفوظ نہ رہی تھی۔ اس مضمون کے لئے الفرقان کے فائلوں کی ورق گردانی کی تو اس موقع پر پہنچ کر تفصیل کا تجسس ہوا۔ برادر عزیز میاں خلیل الرحمن سجاد نے بتایا کہ وہ لکھنؤ سے رائے بریلی کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہمراہ تھے۔ اور واقعہ یہ تھا کہ اندرا گاندھی کے دور کی ایمر جنسی کا زمانہ تھا۔ جس میں جبری نسبندی کی مہم جیسی المناک زیادتیاں ہوئی تھیں اور ہو رہی تھیں۔ مولانا علی میاں نے کچھ لوگوں کے توجہ دلانے پر اپنی اس حیثیت سے، اندراجی کو ان معاملات پر توجہ دلانے کیلئے خط لکھا کہ وہ رائے بریلی ہی سے (جو مولانا کا آبائی شہر ہے) پارلیمنٹ کیلئے منتخب ہوئی تھیں۔ اور مولانا ایک معروف ہستی تھے۔ اس پر تو وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ البتہ ایک دن یکایک وزیراعظم کی طرف سے قصر صدر جمہوریہ (راشتر پتی بھون) میں لانچ میں شرکت کی دعوت پہنچی۔ مولانا نے خیال فرمایا کہ یہ شاید انھیں خطوط کا غیر معمولی اکرام و اعزاز کے انداز میں جواب ہے (۱)۔ اس لئے ان دنوں کے معمول کے مطابق حضرت والد ماجد سے مشورہ کیا۔ اور پھر جب جانے کی رائے ہو گئی تو پرائم منسٹر سے جو کچھ کہنا تھا اس کو ایک خط کی صورت میں قلمبند کر کے اور اسکی انگریزی کرا کے لے گئے۔ یہ دہلی کے اس سفر سے واپسی تھی جس کا حوالہ الفرقان کی مذکورہ بالا تحریر میں دیا گیا ہے کہ واپسی پر ”مولانا کو بعض اہم معاملات کے بارے میں اس عاجز سے گفتگو فرمائی تھی“۔ اور اسکے بعد دوسرے دن جو رائے بریلی کا سفر ہوا جس سے واپس آکر ٹانگ میں تکلیف ہوئی۔ اُس کا قصہ یہ تھا کہ محترمہ اندرا گاندھی کے معتمد خاص محمد یونس خاں صاحب کے بارے میں مولانا کے یہاں اطلاع آئی ہوئی تھی کہ وہ ملنے کے لئے رائے بریلی آنا چاہتے ہیں اور قدرتی طور پر یہ سمجھا گیا کہ وہ اسی سلسلے میں آرہے ہونگے۔ مولانا ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ حضرت والد ماجد بھی اس موقع پر شریک گفتگو ہوں، اسلئے کہ بظاہر اسکا موضوع وہی ہو گا جس کے لئے اندراجی کو خطوط لکھے گئے تھے۔ پس یہ وجہ تھی کہ دوسرے دن (دوسرے روزے کو) رائے بریلی کا سفر ہوا اور بڑی طویل گفتگویونس خاں سے رہی۔

راقم السطور نے جب ارادہ کیا کہ اس واقعہ کو اس خاص نمبر میں لانا ہے تو ازراہ احتیاط مناسب سمجھا کہ خود حضرت مولانا (علی میاں) سے اس کی تصدیق ہو جائے اور یہ سوچتے ہی ذہن

(۱) حالانکہ بات کچھ اور ٹکلی اگرچہ وہ مقصد بھی پورا ہو گیا جس کے خیال سے مولانا نے سفر فرمایا تھا اور مسئلے پر گفتگو ہوئی۔

مولانا کی کتاب ”کاروان زندگی“ کی طرف گیا کہ اس میں یہ واقعہ یقیناً آیا ہوگا اسلئے اسے دیکھ لینا کافی ہے۔ واقعہ پوری تفصیل سے کتاب کی جلد دوم میں نکلا مگر شروع سے آخر تک والد ماجد کا ذکر اس میں کہیں اشارہ کنایہ بھی نہیں تھا۔ اس چیز نے تو بڑے شش و پنج میں ڈال دیا کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس معاملے میں مولانا نے والد ماجد کی شرکت اتنی ضروری سمجھی ہو، اور پھر جس کے نتیجے میں ایسی تکلیف انھوں نے مول لے لی ہو۔ اس کے تذکرے میں کہیں انکا نام ہی سرے سے نہ آئے! اور دوسری طرف یہ کہ سجاد میاں ایسی خواہ مخواہ کی کہانی تو نہیں گڑھ سکتے۔ پس اب ناگزیر ہو گیا کہ حضرت مولانا کی خدمت میں جایا جائے۔ حاضر ہوا، استفسار کیا کہ مولانا محمد اولیس صاحب کے انتقال کے دن وہ کیا مسئلہ تھا جس کے بارے میں والد ماجد نے لکھا ہے کہ آپ سے لمبی گفتگو کی ضرورت رہی اور پھر اسی سلسلے میں اگلے دن رائے بریلی جانا پڑا؟ مولانا نے ”کچھ بھی یاد نہ ہونے“ کا اظہار فرمایا، پر خدا بھلا کرے مولانا محمد رابع صاحب کا کہ اُن کی وہاں موجودگی کام آگئی، انھوں نے حضرت مولانا کو پورا قصہ اختصار سے یاد دلایا اور اس طرح واقعہ کا تفصلاً

مصدقہ (Confirmed) ہو گئی۔ جو اوپر برادر م سجاد میاں کے

حضرت مولانا کے حافظے کی بابت ادھر برابر سننے میں آرہا تھا کہ

نے یادداشت بہت متاثر کر دی ہے، معلوم ہوا کہ واقعی بہت

برقرار رکھے۔

تو یہ ہے ۱۷؎ کا وہ ایک تاریخی واقعہ جس کے سلسلے میں راحت و آرام سراسوں رے وہ تکلیف انھوں نے مول لی جس نے رفتہ رفتہ آخر دم تک کے لئے بالکل ہی صاحب فراش کر دیا مگر اس تکلیف کے اس طویل بیان نے جو الفرقان کے حوالے سے اوپر نقل ہوا اصل معاملے پر ایسا خفا کا پردہ ڈالا گیا ہے کہ کسی کو اس کی اہمیت کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔

### دورِ معذوری کی ایک المناک آزمائش

مارچ ۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس ہوتا طے ہوا۔ اس اجلاس میں دارالعلوم کی تاریخی عظمت اور نیک شہرت کو گویا نظر لگ گئی اور اسکے درمیان ہی میں ایک خانہ جنگی کی بنیاد پڑ گئی۔ پھر جہاں تک بات پہنچی اب وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ لوگ اس سے عام طور پر واقف ہیں اور اپنے اپنے رجحان، طرز فکر، یا پسند ناپسند کے مطابق رائے رکھتے ہیں۔ یہ ان تمام لوگوں کے لئے بڑی آزمائش کا وقت تھا جو دارالعلوم سے کوئی ذمہ دارانہ تعلق رکھتے تھے۔ بانی الفرقان علیہ الرحمہ بھی انھیں میں سے تھے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے صرف کہنے کو سینئر ترین رکن



نہ تھے بلکہ روز اول سے اس رکنیت کی ذمہ داری کو عملاً ایک بڑی بھاری ذمہ داری کے طور پر نبھاتے آرہے تھے۔ اس بالکل نئی قسم کی اور بظاہر نہایت دور رس آزمائش میں انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ اس بارے میں غور و فکر کرنے کے بعد انھوں نے جس طرز عمل کو اپنی ذمہ داری سمجھا اسکو اختیار کر لیا۔ اور پھر آخر تک وہ اس پر قائم رہے حتیٰ کی قضیہ فیصل ہوا۔

”تحدیثِ نعمت“ میں اس المناک قضیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا گیا ہے کہ:

”واقعہ یہ ہے کہ اس عاجز نے تودائع سے آٹھ دس سال پہلے ارادہ کیا تھا کہ شوریٰ کی رکنیت سے استغفہ دیدوں۔ اس لئے کہ جن معاملات کی بدولت یہ واقعہ رونما ہوا وہ اس وقت اس درجے پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے جواز کی میرے نزدیک کوئی شکل نہ تھے اور اصلاح کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے ایک ہی راستہ نظر آتا تھا کہ بحیثیت رکن شوریٰ اس سلسلے میں جو ذمہ داری مجھ کو اپنے اوپر نظر آتی ہے، اُس سے اپنے آپ کو سبکدوش کر لوں۔“ (ص ۹۹)

اس کے آگے اس سلسلے میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے مشورہ کا ذکر فرمایا کہ، جن سے وہ اپنے اس قسم کے اہم معاملات میں مشورے کے عادی تھے، لکھتے ہیں کہ حضرت والا نے میری رائے سے اتفاق نہ فرمایا، اور فرمایا کہ ان حالات میں بھی میں تمھارا دارالعلوم میں رہنا مفید سمجھتا ہوں۔ عند اللہ بری الذمہ ہونے کیلئے اتنا کافی ہے کہ روک ٹوک کرتے رہو۔ ”چنانچہ میں نے اس مشورے کو قبول کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اور اپنے بس بھر روک ٹوک کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسکے بعد فرماتے ہیں:

”حتیٰ کہ جشنِ صد سالہ کے موقع پر مولانا اسعد میاں کی صدارت میں ”مؤتمرِ اہلئے قدیم دارالعلوم دیوبند“ کا قیام اور حضرت مولانا قاری محمد مہیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی صدارت میں ”تنظیمِ فضائلِ دارالعلوم دیوبند“ کے قیام نے اس لاوے کے پھوٹ پڑنے کا اعلان کر دیا جو ایک مدت سے پک رہا تھا۔ اور اُس کے نتیجے میں حضرت مہتمم صاحب مرحوم کی طرف سے اسعد میاں کے ”خطرے“ کی روک تھام کے لئے جو اقدامات دارالعلوم کے اندرونی معاملات میں شروع ہوئے انھوں نے معاملات کے اس بگاڑ کو جو اس عاجز کے استغفہ کے ارادے کا باعث ہوا تھا تیز رفتاری بھی کر دیا اور پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک رخ پر بھی ڈال دیا۔

کاش حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے مولانا اسعد میاں کے کسی اقدام کے مقابلے میں خود سے کوئی فیصلہ اور اقدام کر کے بجائے معاملہ شوریٰ کے سامنے رکھا ہوتا بلکہ اس پر چھوڑا ہوتا۔ اس لئے کہ یہ اسی کے دائرہ اختیار کی چیز تھی، تو یہ نزاع جس شکل میں اپنے انجام کو پہنچا اُس سے کوئی بہتر شکل نکل آتی“ [ص ۱۰۰-۹۹]

”تحدیثِ نعمت“ میں اُس قضیہ کا تذکرہ محض منمنایا تھا اور اسی لئے بہت مختصر۔ اس لئے کہ یہ تو اول سے آخر تک محض ایک آزمائش تھی نہ کہ کوئی فضل و نعمت۔ اصل تذکرہ دارالعلوم سے اپنے تعلق اور اُسکی حتی الامکان خدمت کی طویل توفیق کا تھا۔ پھر بھی اس میں قضیہ کی وہ بنیادی صورت پوری طرح منقح (Elucidated) ہو گئی ہے جس پر اس قضیہ میں

انکار وہ اور اُن کا موقف بنی رہا۔ اور وہ یہ کہ مولانا اسعد میاں کے ایک ایسے اقدام پر جو حضرت قاری صاحب کیلئے یقیناً پریشان کن ہو سکتا تھا، حضرت موصوف نے جو تدارک کی اقدامات دارالعلوم کے اندرونی معاملات میں بالکل اپنے طور پر شروع کر دئے، حالانکہ وہ شورئی کے دائرہ اختیار کے تھے، یہ غیر آئینی اقدامات ہی — جن کا سلسلہ برابر آگے ہی بڑھتا گیا — اُن کے (ہائی الفرقان کے) اس رویے اور موقف کا باعث بنے جو انھیں عند اللہ اپنی ذمہ داری نظر آیا۔

حضرت مہتمم صاحب مرحوم کے اُن ”غیر آئینی“ اقدامات کے برابر آگے ہی بڑھتے جانے کی تفصیلات اس زمانے کے الفرقان میں آتی رہی ہیں (۱)۔ یہاں اُن تمام تفصیلات میں جانے کا تو موقع نہیں۔ البتہ صرف ایک اقدام کی طرف اشارہ سے معاملات کی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ اقدام تھا ۲۴ اکتوبر ۸۱ء کو دہلی میں ”ہمدردان دارالعلوم“ کا اجتماع بلایا جانا، جس میں شورئی کی کوئی شرکت نہیں تھی۔ اور اس اجلاس میں شورئی کے متبادل کے طور پر (یعنی اسکو برخواست کر کے) ۱۱- اشخاص کی ایک ایڈھاک کمیٹی بنائی گئی۔ اور ۷۔

دستوردارالعلوم میں تبدیلیوں کیلئے۔

یہ وہ صورت حال تھی جس میں حضرت ہائی الفرقان

طاقت سے، اپنی معذوریوں کے باوجود، مزاحم ہونے کا فیصلہ

اراکین ہمارے تھے۔ مگر اُن میں متعدد ایسے حضرت تھے جن کی رائے

کا دارالعلوم کے معاملات میں دخیل ہونا کچھ ایسا ہی حکم رکھتا تھا جیسا اُسے حضرت مہتمم صاحب (قاری طیب صاحب) اپنے لئے سمجھتے تھے۔ جبکہ اُن کا دخیل ہونا اس وقت گویا ایک ہو کر رہنے والی بات بن گیا جب حضرت مہتمم صاحب نے نے شورئی سے لڑائی مول لے لی۔ اور پھر دارالعلوم کے اندر کا ماحول بھی اپنے خلاف دیکھ کر اُسے غیر معینہ مدت کیلئے بند کر دیا۔ طلباء کو باہر نکلوا دیا۔ مجلس شورئی بھی اپنا جلسہ دارالعلوم کے اندر نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے میں مولانا اسعد میاں طلبہ کی طرف اپنی اعانت اور سرپرستی کا ہاتھ بڑھاتے تو کون سے طلبہ اسے رد کرنے کو سوچ سکتے تھے؟ اور شورئی کی طرف دست تعاون دراز کرتے تو کس جواز کے ماتحت شورئی اُن کا ہاتھ جھٹک سکتی تھی؟ اور جب ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو پھر کون انھیں اُس وقت دارالعلوم میں دخیل ہونے سے روک سکتا تھا جبکہ لڑائی کا فیصلہ شورئی اور طلباء کے حق میں نکلتا؟ جیسا کہ نکلا۔ اور

(۱) واضح رہے کہ حضرت والد صاحب ان اقدامات کو دراصل حضرت مہتمم صاحب کے ارادہ کے کچھ مفاد پرست لوگوں کا کام سمجھتے تھے۔ جو حضرت مہتمم صاحب کی کبر سنی اور نرمی سے فائدہ اٹھا کر وہ لوگ کر رہے تھے۔ یہ بات الفرقان کی تحریروں میں راز نہ کور ہوتی رہی ہے۔

نکلتا ہی تھا۔

الغرض شوریٰ کے یہ ارکان جو اسعد میاں کی شرکت کا تصور پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے تو اپنا موقف بدل دیا۔ اور اب معاملے کو مہتمم صاحب بمقابلہ شوریٰ کے بجائے بمقابلہ اسعد میاں قرار دے کر مہتمم صاحب کی حمایت میں آجانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر حضرت بانی الفرقان نہ صرف اپنے لئے بلکہ واقعہ میں ان حضرات کیلئے بھی اس موقف کا کوئی جواز نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا اور اُسے یقیناً چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اسعد میاں کیلئے ”اس کا موقع (تو) حضرت مہتمم صاحب کے ناعاقبت اندیش حلقے ہی سے فراہم کیا ہے۔“ (۱) یعنی اب کس کے بس کی بات تھی کہ وہ اگر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو اُن کو روک دیتا؟ اس لئے اُن کے نزدیک اب واحد صورت یہی رہ گئی تھی کہ اسعد میاں کے دخیل ہونے کے امکان کو قبول کیا جائے۔ اور ان سے اگر واقعی دارالعلوم کے کسی مفاد کو خطرہ ہے تو شوریٰ اُن کی روک تھام کیلئے بھی اپنا فرض ادا کرے جیسا کہ مہتمم صاحب اور ان کے حلقے کے مقابلے میں ابتداء وہ ایک متفقہ موقف کے ذریعے کر رہی تھی۔

مگر صحیح یا غلط، ان حضرات کا موقف یہی رہا۔ اور اس طرح حضرت والد ماجد کا موقف کئی نہایت باوزن ارکان شوریٰ کی رفاقت و ہم آہنگی سے محروم ہو گیا۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ واقعی معنی میں جو ان کے ہم پلہ حضرات تھے وہ تقریباً سب ہی اُن کا ساتھ چھوڑ گئے۔ مگر اُن کیلئے بات اصول کی تھی۔ انھوں نے ذرہ برابر بھی اپنے تنہا رہ جانے کی فکر نہیں کی، آخر تک شوریٰ کے حق کی لڑائی اپنی معذوریوں کے باوجود پورے اعتماد کے ساتھ لڑی اور شوریٰ کی حاکمیت بحال ہوئی۔

اُن کی رائے کسی کے نزدیک غلط تھی تو وہ غلط بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بشر تھے۔ اُن کے طریق کار اور طرز عمل میں غلطی تھی؟ تو وہ بھی ہو سکتی ہے، مگر ایک بات ان کی رائے کے مخالفین کی بڑی ہی ناانصافی پر مبنی ہے۔ یہ کہ انھوں نے دارالعلوم اسعد میاں کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس لئے کہ یہ اگر واقعہ ہے۔ تو اس کا موقع حضرت مہتمم صاحب اور اُن کے حاشیہ نے اسعد میاں کیلئے فراہم کیا۔ اور اُسکی روک تھام کیلئے اُن معزز ارکان شوریٰ نے ہمت دکھانے سے انکار کیا جو شوریٰ کے ابتدائی متفقہ موقف کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ نہ رکھ سکے۔ اب ان میں سے سوائے ایک ہستی کے سب مرحوم ہو چکے۔ اللہ تعالیٰ سب کے ساتھ بہتر معاملہ فرمائے۔ کسی

والد ماجد کو اس کا تو آخر دم تک اطمینان تھا کہ انھوں نے جو کچھ کیا، اپنی عند اللہ ذمہ داری کے ماتحت انھیں یہی کرنا تھا۔ مگر اس کا رنج بھی برابر رہا کہ حضرت قاری صاحب جیسی محترم ہستی سے انھیں معرکہ آرا ہونا پڑا۔ اور اپنے دل و ضمیر کی صفائی کی بنا پر یہ امید رہی کہ اگر اللہ نے خاتمہ ایمان پر کیا تو اسکی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ ہم دونوں کو اُس زمرے میں شامل کرے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اور ہم دور کریں گے اُن کے دلوں میں سے کدورت کہ  
سب بھائی بھائی کی طرح ہیں جنھوں پر بیٹھے آئے سامنے۔

الغرض یہ اُن کی زندگی کا نہایت کر بناک ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اہم درجے کا تاریخی بلکہ تاریخ ساز باب ہے۔ زیادہ تفصیلات کے خواہشمندوں کو الف تا ی کے صفحات ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵

معذوریوں میں اضافہ

اور ایک نئے معرکے کی بساط

دارالعلوم کے قصبے نے انھیں جسمانی و روحانی اور ذہنی و قلبی طور پر بس مدر بھی نہ تھکا دیا ہوتا کم تھا۔ بڑا طویل اور بڑا کر بناک قصبہ تھا۔ مگر اس قصبے سے باہر نکل کر جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک نئے معرکے کی بساط اُن کیلئے بچھی ہوئی ہے۔ یہ تھی قائد انقلاب ایران (۱۹۷۹ء) آیۃ اللہ خمینی صاحب کی ”امامت“۔ جسے بے پناہ پروپیگنڈے کے ذریعے جمیع عالم اسلام کیلئے واجب الاطاعت بنایا جا رہا تھا۔ اور یہ پروپیگنڈہ جس کیلئے گویا ایرانی دولت کے خزانے کھول دئے گئے تھے اس کے اثرات نے اہل سنت کی آبادیوں میں اس حد تک رونما ہونا شروع کر دیا تھا کہ وہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان جو اپنے دینی رجحان کی وجہ سے ”اسلام پسند“ کہلاتے ہیں اور دین کے ایک خاص تصور کے پیرو ہونے کی وجہ سے ”اسلامی حکومت“ کا نعرہ اُن کیلئے غیر معمولی محسوس رکھتا ہے وہ اہل سنت میں اس ”امامت“ کے پر جوش داعی بن گئے۔ حالانکہ یہ خالص شیعہ عقیدے اور تصور والی امامت تھی۔ اور سنتیت کیلئے زہر قاتل۔ جسے شیعہ سنی اتحاد دیگانگت کے خلاف میں لپیٹ کر محض ایک دھوکے کا سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

الفرقان کا مانی، جسے حق و باطل کے تفرقے کی روز ازل سے اہمیت رہی تھی، اُس کیلئے

یہ صورت حال قدرتی طور پر ناقابل برداشت تھی۔ عمر کو اسی (۸۰) ہو چکی تھی۔ بیماریاں اور معذومیاں بھی ساتھ تھیں۔ مگر اُس نے کمر ہمت باندھی اور اپنے خیال میں اپنے دین حق کے ساتھ وفاداری کا آخری حق ادا کرنے کی نیت سے اس سیلاب بلا خیز کی مزاحمت کا تنہا ہی منصوبہ بنایا۔ جو یہ تھا کہ شیعیت، خمینیت اور ایرانی انقلاب کی واقعی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیا جائے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر صاف صاف سامنے آئے۔ یہ منصوبہ آپ کی آخری کتاب ”ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت“ کی شکل میں تکمیل پذیر ہوا، (جولائی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی)۔ اور ”از دل خیزد دل ریزد“ کی وہ مثال ثابت ہوا کہ بلاشبہ اور قطعاً بلاشبہ، معاصر تاریخ تصنیف اسلامی میں اسکی کوئی دوسری مثال نہیں پائی جاتی۔ ایک ایسا شخص جس نے اپنا خاص کوئی حلقہ نہیں بنایا، کوئی جماعت نہیں بنائی، کہیں اسکے خاص ماننے والوں کے ادارے اور مرکز نہیں وجود میں آئے۔ مگر سنی آبادی کا شاید کوئی ملک بچا ہو جس میں یہ کتاب وہاں کی مقامی زبان میں آپ سے آپ نہ ترجمہ کر لی گئی ہو۔ اور یوں وہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا میں پھیل گئی۔

اس تذکر کی منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے اس اسی (۸۰) سالہ معذور انسان کو کیا کچھ اور کیسے ذاتی حالات میں کرنا پڑا اس کے لئے کتاب کے پیش لفظ کی یہ سطر میں کچھ اندازہ دیتی ہیں:

جب ایرانی انقلاب کے سلسلے کے اس پروپیگنڈے اور اُس کے اثرات کو دیکھ کر اس موضوع پر لکھنے کا دایمہ پیدا ہوا اور میں نے اسکو دینی فریضہ سمجھا تو شیعیت سے ذاتی اور برہم اور است واقفیت کیلئے (۱) میں نے مذہب شیعہ کی بنیادی اور مستند کتابوں کا اور خود امام خمینی کی تصانیف کا مطالعہ ضروری سمجھا۔ چنانچہ گزشتہ تقریباً ایک سال میں کہ عمر اسی (۸۰) سے متجاوز ہو چکی ہے۔ اور اس عمر میں ظاہری و باطنی قوتوں میں جو ضعف و اضطلال فطری طور پر پیدا ہونا چاہئے۔ وہ پیدا ہو گیا ہے۔ اُسکے علاوہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بھی ہوں اور اسکی وجہ سے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت بہت متاثر ہو گئی ہے۔ بہر حال اسی حالت میں ان کتابوں کے کئی ہزار صفحات پڑھے ” [ص ۲۲-۲۱]

اور اس بیان میں جو بات وہ اپنے مزاج اخفاء اور انکسار کے مطابق صاف نہیں کہہ سکتے تھے وہ حضرت مولانا علی میاں نے کتاب کے مقدمے میں فرمادی۔ ارشاد فرماتے ہیں:

” انھوں نے اس محنت اور انہماک کے ساتھ کام شروع کیا کہ ہر اہل کی صحت خطرے میں پڑ گئی اور اہل تعلق کو اس بارے میں غمزدہ و تشویش لاحق ہو گئی۔ مگر مولانا اپنی افتاد طبع اور زندگی بھر کے معمول کے مطابق اپنے کو اس سے باز نہیں رکھ سکے۔ انھوں نے شروع سے شیعیت کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ [ص ۱۶]

اور یہ نامساعد و ناموافق ذاتی حالات کا بیان اپنا کوئی احسان قوم پر جتانے کیلئے نہیں تھا۔

یہ مزاج ہی نہ پایا تھا۔ بلکہ صرف اس مقصد سے کہ لوگ توجہ کریں اور غور سے کتاب کو پڑھیں۔ تاکہ دین حق میں باطل کی ملاوٹ کیلئے اٹھی ہوئی یہ تحریک پروان نہ چڑھنے پائے۔ اور خلافت راشدہ سے عداوت رکھنے والوں حکومت کو اسلامی حکومت نہ مان لیا جائے۔ اور الحمد للہ یہ مقصد مصنف علیہ الرحمۃ کی توقعات سے کہیں زیادہ — ہزاروں گنا زیادہ — بڑھ کر پورا ہوا۔

اس مقصد کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں صاحب نے کتاب کے مقدمے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ مقصد کی غیر معمولی اہمیت کے ساتھ کتاب کی اہمیت پر بھی بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ فرماتے ہیں

”عقیدہ کی اہمیت ہماری بنی تعلیم یافتہ نسل میں خطرناک حد تک کم ہوتی جا رہی ہے، اور یہ بڑی تشویش انگیز اور قابل فکرات ہے، انبیاء اور غیر انبیاء کی دعوتوں میں اور ان کی جدوجہد کے مقاصد اور محرکات میں سب سے بڑی حد فاصل یہی عقیدہ ہے جس پر وہ کسی سمجھوتہ اور اوپے پونے سودا کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس کے یہاں رد و قبول، پسندیدگی، ناپسندیدگی کا معیار اور وصل و فصل کی شرط ہی عقیدہ ہوتا ہے، یہ دین (جو مسلمانوں کی ساری کمزوریوں کے باوجود) اپنی اصلی شکل میں اس وقت تک موجود ہے، اسی ”عقیدہ“ کے معاملہ میں صلابت و استقامت اور حمیت و غیرت کا رہنما ہے۔“

اس سلسلہ میں کسی باجبروت طاقت اور کسی وسیع سے وسیع تر بادشاہی کے سامنے ہر

پر سکوت جائز نہیں سمجھا، چہ جائیکہ مسلمانوں کے دیاوی مصالح اور اختلاف و تقریق

کرتے، امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) کا حلق قرآن کے عقیدہ میں۔ صرف مسلمانوں

کے سب سے بڑے فرماں رواؤں خلیفہ مامون الرشید (فرزند خلیفہ ہارون الرشید) اور

ہو جاتا اور تاریخوں اور رندوں کی تکلیف برداشت کرتا۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد دہلویؒ

ہزارہ دوم، دعوائے امامت و اجتہاد اور وحدت ادیان کی مخالفت کرتا پھر جہانگیر کے عہد تک اس کو اس وقت تک جاری رکھا تک

مغلیہ حکومت کا رخ بدل نہیں گیا، اس کی دو مثالیں ہیں، ورنہ تاریخ اسلام اپنے اندر ”کلمہ حق عند سلطان حاکم“ اور ”لا طاعۃ لمخلوق

من معصۃ الحال“ کی میسوں تابناک مثالیں رکھتی ہے، یہ سلاطین جائز کبھی محض بادشاہ ہوتا ہے کبھی رائے عامہ، کبھی شہرت عام، کبھی

دل فریب کامیابیاں اور بلند و بانگ دعاوی۔ اور تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ آخرالذکر صورتیں زیادہ آزمائش کی چیزیں ہیں۔

حقیقت میں اسلام کی حقیقی تعلیم اور صحیح عقیدہ وہ دریا ہے جو کبھی اپنا رخ نہیں بدلتا اور کبھی پیلا نہیں ہو سکتا، سیاسی

طاقتیں، وقتی انقلابات، حکومتوں کا قیام و زوال اور دعوتیں اور تحریکیں موہیں ہیں حو آتی اور گر جاتی ہیں، دریا اگر صحیح رخ پر

بہہ رہا ہے اور آب جاری ہے تو کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر عقیدہ میں صداد آگیا تو گویا دریائے اپنا رخ بدل دیا اور اس میں آب صافی

کے بجائے گند اور نا صاف پانی بہنے لگا، اسلئے فساد عقیدہ اور رنج و ضلال کے ساتھ کوئی دعوت و تحریک کسی ملک کا عروج و اقبال،

کسی معاشرہ کی جڑی اصلاح یا کسی فساد خرابی کو دور کرنے کا دعویٰ یا وعدہ قبول نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں اس ملت کی

نقا اور بین کی حفاظت کا راز مضمر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جو اپنے اپنے دور کے علماء، خاد میں دین اور محافظین شریعت و سنت کو اس

دشوار اور بعض اوقات ناخوشگوار فرض کو ادا کرنے پر مجبور کرتی رہی ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی یہ فاضلہ اور محققانہ کتاب ’ایرانی انقلاب،

امام خمینی اور شیعیت‘ ہے۔“

## جناب خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں استفتاء

اس کتاب (ایرانی انقلاب) کے مضامین کا آخری عنوان تھا ”حضرات علمائے کرام کی خدمت میں“ اس کے تحت لکھا گیا تھا کہ

”اس کتاب میں آپ ے اثنا عشریہ کی مستند ترین کتابوں اور ان کے مسلم علماء و مجتہدین کی واضح تصریحات کی روشنی میں ملاحظہ فرمایا کہ ان کے اساسی عقیدہ امامت کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ کہ اس کا درجہ بیوت سے برتر اور ائمہ کا مقام و مرتبہ انبیاء و مرسلین سے بالاتر ہے۔ اور وہ خدا و مدی صفات و اختیارات کے بھی حامل ہیں، اور یہ کہ حضرات خلفاء ثلاثہ اور ان کے رفقاء تمام اکابر صحابہ، منافق، اللہ و رسول کے عدا، جنہی اور لعنی ہیں۔ اور ائمہ المؤمنین عائشہ اور حصہ منافقہ تھیں۔ انہوں نے ہر دے کر حضور ﷺ کو حتم کیا۔ اور قرآن مجید محرف ہے۔ ان کے علاوہ بھی اثنا عشریہ کے جو معتقدات آپ کے سامنے آئے امید ہے کہ اس کے بعد آپ اس مذہب اور اس کے پیروؤں کے اسلام سے تعلق کے بارے میں کتاب و دست کی روشنی میں قطعیت کے ساتھ فیصلے فرمائیں گے۔ آپ امت امین ہیں اور ربیع و ضلال سے امت کی حفاظت آپ کا فریضہ ہے۔ واللہ یقول الحق و هو یہدی السبیل۔“

علماء امت کی خدمت میں اس گزارش کی اشاعت کے بعد آپ کو اپنا یہ بھی فرض معلوم ہوا کہ ایسے اہم معاملے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ ایک استفتاء بھی مرتب کر دیں۔ تاکہ علماء کرام کو غور و فکر میں آسانی بھی ہو۔ اور بات مل نہ جائے۔ چنانچہ ایک مفصل استفتاء ۱۹۸۶ء میں تیار فرمادیا گیا۔ اور پھر اس کے جوابات کی پہلی قسط الفرقان کے ایک خاص نمبر کی شکل میں دسمبر ۱۹۸۷ء میں اور دوسری قسط مئی ۱۹۸۸ء کی خاص اشاعت کی شکل میں شائع ہوئی۔ اور اتنی بڑی تعداد میں ان جوابات کے حاصل کرنے کے لئے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی ادارہ علماء مشکل سے چھوٹا ہوگا، اس بیمار و زار بوڑھے انسان کو ایسی حالت میں کہ اسکے پاس ایک معمولی سے کاتب خطوط کے سوانہ کوئی سکریٹریٹ تھا نہ پروفیشنل اسٹینو جقدر تعب اٹھانے اور بوڑھی ہڈیوں کو گھلانے کی ضرورت پڑی ہوگی، اسے کسی بیان کی ضرورت نہیں، مگر یہ کام بھی اللہ نے ان کی خواہش کے مطابق ان سے لے ہی لیا۔ حصہ دوم (۸۸ء) کے مقدمے میں فرماتے ہیں

”یہاں یہ عاجز اپنے رب کریم کے شکر کے ساتھ اس کا اظہار بھی مناسب سمجھتا ہے کہ جب میں نے شیعہ اثنا عشریہ اور ٹیہی کے بارے میں استفتاء مرتب کر کے حضرات علماء کرام کا فتویٰ حاصل کرے اور اس کے شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو میرا خیال ملکہ غالب گمان تھا کہ ماضی قریب بعض لوگوں کے کمر کے غلط فتوؤں کی وجہ سے تکفیر کا فتویٰ بہت مدام ہو گیا ہے اس لئے مختلف حلقوں کی طرف سے مجھ پر ملامت کے تیردوں کی بوچھاڑ ہوگی اور ممکن ہے کہ بہت سے حضرات جو اصل مسئلہ میں پورا اتفاق رکھتے ہیں وہ بھی اسکو مناسب نہ سمجھیں۔ لیکن یہ عاجز اس صورت حال میں جس کا ذکر استفتاء کی تمہید اور مقدمہ میں بھی کیا جا چکا ہے ہمسایہ ویس اللہ اس کو اپنا دینی فریضہ سمجھتا تھا اس لئے ارشاد بانی بحاہدوں فی سبیل اللہ ولا بحاہدوں لومۃ

لادم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے کو ملامت کے تیروں کا نشانہ بننے کے لئے تیار کیا اور اسی عہدہ کے نتیجہ میں الفرقان کا وہ خاص نمبر گذشتہ دسمبر میں شائع ہوا، جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

یہ عاجز اس کو اپنے کریم پروردگار کا خاص کرم ہی سمجھتا ہے کہ آج تک ایک خط بھی ایسا نہیں آیا جس میں اس متوائے کفیر اور اس کی اشاعت کے اقدام کو غلط یا نامناسب ہی قرار دیا گیا ہو۔ اس کے برعکس لاتعداد خطوط ایسے موصول ہوتے رہے جن میں لکھا گیا کہ یہ اس وقت کا اہم دینی فریضہ تھا جس کے ادا کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی۔“

### سفرِ حرمین شریفین

فتنہ خمینیہ کے خلاف اس مہم کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مطالعہ شیعیت کے نتیجے میں اس فتنے کا عملاً سب سے زیادہ خوفناک پہلو آپ کے سامنے یہ تھا کہ حرمین شریفین پر اقتدار اس کا خاص نشانہ ہے۔ آپ رابطہ عالم اسلامی کے رکن اساسی تھے۔ مگر ۶۷ء سے ٹانگ کی معذوری کے سبب اس کے جلسوں میں شرکت نہیں کر پارہے تھے۔ ۸۵ء کے اجلاس کا دعوت نامہ آیا تو مطالعہ شیعیت کے اسی خوفناک تاثر کے ماتحت اس

سفر کر لیں۔ تاکہ وہاں کے خواص کو اس خطرے کی طرف کما حقہ

بظاہر وہاں توجہ کے بالکل آثار نہیں تھے۔ چنانچہ معذوری کی بنا پر وہ

خود اٹھا کر اس ارادے کی تکمیل کی۔ اگرچہ واپسی بہت مایوسانہ ہوئی

خطرے کا احساس نہیں کیا گیا جب تک کہ دو سال بعد ۸۷ء میں ایرانیوں نے

موقع پر وہ خوررین ہنگامہ نہوا جس میں کئی سو آدمی مارے گئے۔ حد یہ ہے کہ ”ایرانی انقلاب“ والی کتاب کا وہاں داخلہ بھی بند رہا۔ الفرقان بابت فروری مارچ ۸۵ء میں اس سفر جاز کا ذکر آیا ہے۔

### حُسن ختام

شیعیت اور خمینیہ کے بارے میں اپنے اس کام کو جو اُن کی عملی زندگی کا آخری کام ثابت ہوا، وہ اپنے علم اور فہم دین کی روشنی میں ان کاموں میں سے ایک — بلکہ شاید سب سے برتر — سمجھتے تھے جن پر اپنے اللہ سے وہ امید لگائے تھے کہ ذریعہ مغفرت کے طور پر قبول فرمائے جائیں گے۔ اور دنیا میں اُن کے اس کام کی عزت و مقبولیت ان شاء اللہ آخرت کے لئے ایک امید افزا علامت ہی ہے۔

یہ بانوے رچورانوے سالہ زندگی کے اُس وقت تک کی اجمالی سرگزشت ہے جس وقت تک آپ کچھ بھی کارکردگی کے قابل رہے۔ اسکے بعد زندگی کے تقریباً آٹھ سال آپ



کوٹے، مگر ضعف پیری اور عوارض و معذوری کی حالت میں مذکورہ بالا شدید محنت طلب اور فکر و توجہ طلب مہمات کی انجام دہی نے جسمانی اور دماغی قوتوں کو بالکل نچوڑ ڈالا تھا۔ صرف معارف الحدیث کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ۱۹۹۲ء تک قائم رکھ سکے۔ اور اسکے بعد کے ۴-۵ سال میں تو گویا وقت آخر کے انتظار میں گزرے۔ اور اس ”انتظار“ کے زمانے میں بھی بظاہر انکی زندگی کچھ ”منزلیں“ طے کرتی رہی، مگر ان منزلوں کا تام ہم جیسے عامی نہیں جانتے۔ ہاں ان کے صبر و ثبات، رضا و استقامت اور روز بروز بڑھتی ہوئی توجہ الی اللہ کی کیفیت سے محسوس کھلے طور پر ہوتا تھا کہ زندگی اب بھی ٹھیری ہوئی نہیں ہے۔ منزلوں کا سفر جاری ہے۔ حتیٰ کہ ۲۷ ذی الحجہ بروز یکشنبہ ۱۴۱۷ھ / ۴ مئی ۱۹۹۶ء کو یہ مسافر حیات ابدی کی منزل سے ہم کنار ہو گیا۔ عمر اللہ لہ و قدس سرہ

## الفرقان کے تین خاص نمبر

### اور تدریس حدیث

بیان منازل (یا سنبھائے میل) اختتام تک پہنچ گیا۔ لیکن دواہم عنوان جن کی جگہ درمیان میں تھی، ان کے بیان کی کوئی موزوں صورت ان کی واقعی جگہ پر نہ بن سکی۔ مجبوراً انھیں آخر میں رکھنا طے کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک ہے، الفرقان کے تین خاص نمبر۔ اور دوسرا تدریس حدیث۔

### الفرقان کے خاص نمبر

الفرقان کی خاص اشاعتیں یوں تو بہت سی ہیں جن کا سلسلہ شاہ اسماعیل شہید نمبر ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے لیکن زیادہ اہمیت والے نمبر تین ہیں جن میں سے دو کی اہمیت تو دوسروں کی نظر میں بھی غیر معمولی قرار پائی اور وہ الفرقان اور اسکے بانی مدیر کا ایک نہ صرف دینی بلکہ علمی کارنامہ بھی آج تک مانے جاتے ہیں۔ اور ان کا اس حیثیت سے حوالہ آتا ہے۔ یہ ہیں حضرت مجدد الف ثانی نمبر (۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۸ء) اور حضرت شاہ ولی اللہ نمبر (۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء)۔ تیسرا خاص نمبر جو صرف حضرت مرحوم کے ایک مقالے پر مشتمل تھا، یعنی ”خاکسار تحریک علم و عقل کی روشنی میں“۔ یہ اوروں سے قطع نظر خود آپ کی اپنی نظر میں ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اسلئے مناسب معلوم ہوا ہے کہ اس کو بھی یہاں کے قابل ذکر نمبروں میں شامل کیا جائے۔

ان تینوں خاص نمبروں کی مشترک اہمیت یہ تھی کہ یہ ملت کو ایک پیغام دیتے تھے جس کی اُس وقت کے حالات میں خاص ضرورت تھی۔ اور یہ ضرورت مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر کے حق میں تو بلاشبہ آج بھی اُسی طرح قائم ہے۔ یہ دونوں بزرگ اس برصغیر میں اپنے اپنے وقت کے ایسے مجدد اور حکیم پیدا ہوئے تھے کہ آج بھی انکے کام اور انکے پیغام کی روشنی کی ہمارے لئے وہی قدر وقعت ہے جو انکے زمانے میں تھی۔ بلکہ آج کے ہندوستان میں جبکہ اسلام کو فنا کر دینے کے منصوبے بالکل برہنہ ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ ان کی قیمت کا درجہ اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ اور مجدد الف ثانی نمبر تو خاص طور پر نکالا ہی اس وقت گیا تھا جب ۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ کی رو سے ہندوستانیوں کی صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان میں اسلام کے لئے مستقبل کے ہندوستان کا وہ خطرہ چہرہ دکھائی دیا جو اس وقت ہمارے سامنے بالکل برہنہ شکل میں ہے (۱)۔ اس لحاظ سے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہئے کہ یہ ایک بڑی خاص توفیق ایزدی تھی کہ الفرقان کو اسکے بالکل ابتدائی دور میں ————— اور اس دور میں جبکہ اسکا ہر شمارہ عالمی شان و کرامت کا مسئلہ لئے ہوئے تھا ————— تین تین چار چار سو صفحات کے بلند ملا اور بلاشبہ یہ حضرت بانی الفرقانؒ کے سفر حیات میں بڑی اہمیت میں سے ہیں۔

### خاکسار تحریک پر ۱۹۵۸ء میں نکلنے والا خاص

رکھتا تھا کہ وہ اسلامی شان و شوکت کی بحالی کے نام پر علامہ عنایت اللہ مہتریؒ کی وادہ سے ————— خلاف ایک ایسی گمراہ کن تحریک کے توڑ کے طور پر نکلا تھا جس تحریک کی طاقت کا ان دنوں یہ عالم تھا کہ وہ صوبائی حکومتوں سے مسلح فکرموں کے حوصلے دکھا رہی تھی۔ اور بالآخر اس فکرموں میں وہ سر سکندر حیات وزیراعظم پنجاب کی حکومت کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ اس نمبر کی کتابی اشاعت کے مقدمے میں مولانا علی میاں صاحب نے اس تحریک میں پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی، حسن بن صباح والی باطنی تحریک سے کھلی مشابہتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی زیادہ خطرناک اور زیادہ قابل فکر خصوصیت ان الفاظ میں بتائی تھی کہ

”لیکن ہم کو اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان دنوں تحریکوں میں ایک عظیم الشان فرق بھی ہے، فرق یہ ہے کہ باطنی تحریک آخر وقت تک مسلمانوں کی ہمدردی و اعانت سے محروم رہی اور مسلمانوں کے ہر طبقہ سے اس کو اسلام سے قطعاً خارج اور مذہب کے خلاف اعلان جنگ سمجھا اور اسکو یہودیت اور عیسائیت سے بڑھ کر اسلام کے لئے خطرہ تصور کیا لیکن خاکسار تحریک کے ساتھ مسلمانوں کا طرز عمل کچھ مختلف ہے۔“

اس ”مختلف طرز عمل“ کی قدرے مختصر تشریح اسی خاص نمبر میں شائع ہونے والے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے مکتوب کی ان سطروں میں ملتی ہے۔

”مسلمانوں سے میری مایوسی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ میں حیران ہوں کہ جس قوم میں ایسے ذلیل طریقے فروغ پا سکتے ہیں اور جو اتنے پست اخلاق اور گھٹیا درجے کے آدمیوں کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اس کا اخلاقی وقار دنیا میں کیسے باقی رہ سکتا ہے۔ دو چار یا ہزار دو ہزار آدمی ایسے ہوتے تب بھی کوئی بات نہ تھی۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ لاکھوں مسلمان اس کے پیچھے ہیں، لاکھوں اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے بکثرت اخبارات اسکی حمایت کر رہے ہیں۔ اور بعض بڑی ذمہ دار مسلمان انجمنیں اسکی تائید پر ہیں“

یہ تھی اس نمبر کی وہ خاص اہمیت جس کی بنا پر یہ ضخامت میں کمتر اور صرف ایک مقالے پر مشتمل ہونے کے باوجود اسکا مستحق ٹھہرتا ہے کہ اسے حضرت بانی الفرقان کے سفر حیات کا ایک سنگ میل قرار دیا جائے۔ یہ ایک تنہا اور نہتے شخص کے ہاتھوں ایک ایسی فوجی تحریک کا بھرپور پوسٹ مارٹم تھا جس نے حسن بن صباح والی تحریک کو بھی اس لحاظ سے پیچھے چھوڑ دیا تھا کہ اس کی پشت پر لاکھوں جذباتی مسلمان تھے اور دیوانہ وار تھے! پھر نہ صرف یہ تحریر کا کام کیا گیا بلکہ عملاً ایک تحریک بھی اسکے خلاف اٹھانے کی بھرپور شروعات کی مگر پھر اس مشرقی تحریک کی حماقتیں خود ہی اس کے خاتمے کیلئے کافی ہو گئیں۔

### تدریس حدیث

شروع میں گذر چکا ہے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد چار سال تدریس علم دین کی خدمت بھی اپنے اساتذہ اور اکابر کے طریقے پر انجام دی لیکن اسکے بعد یہ سلسلہ آزادانہ خدمت دین کے لئے ترک کر دیا۔ یہ ۱۹۳۱ء / ۱۳۵۰ھ کی بات ہے اس کے بعد لکھنؤ کے زمانہ قیام میں جو (۱۹۳۶ء سے آخر دم، یعنی ۱۹۹۷ء تک قائم رہا) یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حلیم عطا صاحب کے بیمار ہو جانے سے صحیح بخاری اور مسلم شریف کا درس بند ہو جاتا ہے۔ یہ شوال ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ تب اس کے لئے آپ (حضرت والد ماجد سے) خواہش کی جاتی ہے کہ شاہ صاحب کی صحت بحال ہونے تک یہ سبق پڑھا دیئے جائیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ پانچ سال تک قائم رہا اور تحدیث نعمت میں اس کا تذکرہ ایک خاص ضمن میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے مجھ سے کہا گیا کہ جب تک شاہ صاحب صحت یاب ہوں اور درس کے لائق ہو کیس میں دیکھنے کے لئے دارالعلوم آکر یہ سبق پڑھا دیا کروں اس کے لئے مشاہرہ کی بھی پیش کش کی گئی اتفاق سے اس سال ان دونوں کتابوں کی پڑھنے والی جماعت میں بعض ایسے طلبہ بھی تھے جو اس عاجز سے گہرا غمناک تعلق رکھتے تھے،

اور میرے دل میں ان کی قدر تھی، انھوں نے بھی اس کے لئے اصرار کیا اور خود مجھے سمجھے اس کے تعلیمی نقصان کا احساس تھا۔ میں نے اپنے مستقل ضروری مشاغل اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دارالعلوم کے دمہ دار حضرات سے عرض کیا کہ میں رورانہ دو گھنٹے تو نہیں دے سکتا، اتنا کر سکتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے لئے آخر صرف صحیح مسلم کا سبق پڑھایا کروں، شاہ صاحب حب صحت یاب ہو جائیں گے تو وہ بخاری شریف پڑھادیں گے، اس طرح اس جماعت کا تعلیمی نصاب بھی پورا ہو جائے گا۔ میں اس ایک گھنٹہ کا کوئی مشاہرہ اور معاوضہ نہیں لوں گا، اللہ میری آمد و رفت و رکشہ سے ہوگی، اس کا کرایہ دارالعلوم کی طرف سے ادا کر دیا جائے گا۔ یہی طے ہو گیا اور میں ایک گھنٹہ کے لئے دارالعلوم آکر صحیح مسلم کا درس دینے لگا۔ شاہ صاحب کا علاج جاری تھا، امید تھی کہ انشاء اللہ کچھ عرصہ میں شفایاب ہو کر وہ درس کا سلسلہ جاری کر سکیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ چند مہینے کے بعد مرض کا اختتام اُن کے سفر آخرت پر ہوا۔ (رحمہ اللہ ورحمہ الامراء الصالحین)۔

میں جو مسلم شریف پڑھا رہا تھا الفضلہ تعالیٰ تعلیمی سال کے اختتام تک وہ حتم ہو گئی۔ اس کے بعد جب دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا تو دارالعلوم کے دمہ دار حضرات کی طرف سے پھر مجھ سے کہہ لیا کہ اب میں مستقل دو گھنٹے دے دیا کروں اور حدیث کے دو سبق پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر لوں۔ میں اپنے دوسرے مستقل مشاغل کی وجہ سے اس وقت بھی اپنے کو اس کے لئے آمادہ نہیں کر سکا، میں نے عرض کیا کہ جب تک شاہ صاحب مرحوم کی جگہ کسی استاد حدیث کا انتظام ہو میں ایک گھنٹہ جس طرح اب تک دیتا رہا ہوں انشاء اللہ دیتا رہوں گا۔ چنانچہ اس کے بعد بھی روزانہ ایک گھنٹہ کے لئے لایا۔

سبق پڑھا تا رہا — دو تیس سال اسی طرح گزر گئے اور شاہ سلیم عطا صاحب مرحوم نہیں ہو سکا تو پھر دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے اصرار کے ساتھ فرمایا۔ پیش نظر رکھنے ہوئے اس ذمہ داری کو سہر حال قبول کر لوں اور وراثہ صرف دو گھنٹے کے۔ سبق پڑھا دیا کروں اور اس کے لئے معقول مشاہرہ کی پیش کش بھی کی گئی۔

میں نے اگرچہ طالب علمی سے رسمی فراغت کے بعد ۳-۴ سال تک ،

خدمت بھی انجام دی تھی لیکن اس کے بعد کسی مدرسہ سے ملازمت کا تعلق نہیں رکھا۔ طبیعت آزادہ لڑہی حسب لوہیں کام کرنے کی عادی ہو گئی اور اسی کو اپنے لئے بہتر سمجھا (بعض تلخ تجربے بھی اس کا سہ سے تھے)۔ اس وجہ سے دارالعلوم مدۃ العلماء کی اس پیش کش کو قبول کرنے پر بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوئی۔ دوسری طرف یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ حدیث تریف اور صرف حدیث شریف کی مستقل تدریسی خدمت کا موقع مل رہا ہے، اس سے انشاء اللہ خود مجھے بھی علمی اور دینی نفع ہو گا اور مشاہرہ کی شکل میں دنیوی منفعت بھی ہے، وہ بھی اللہ کی نعمت ہے اور طبیعت کا انکار شاید نص کے استکار اور استکاف کی وجہ سے ہے جو باحتیاج ملازمت کو اپنے لئے گنہگار کہہ کر مات سمجھنے لگا ہے، اور اگر ایسا ہے تو یہ شیطان کا وسوسہ ہے۔

اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر کافی غور فکر کے بعد مکی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تو مشورہ کے لئے سہارنپور حضرت

شیخ الحدیث کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوری بات عرض کی (۱)۔

آگے حضرت شیخ الحدیث کے اس مشورے کا ذکر ہے کہ پیش کش قبول کرنا مناسب

ہے۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا اور درس حدیث کا یہ سلسلہ پھر کئی سال چلا۔ غالباً ۱۹۶۳ء تک۔

اس سلسلہ درس کے بارے میں حضرت مولانا علی میاں صاحب جو ان دنوں ندوے

(۱) تحدیثِ نعمت باب دوم۔ تذکرہ حضرت مولانا محمد رکیا صاحب "ص ۳۰۵۳۰۲۔

کے معتمد تعلیمات تھے، اور بظاہر انھیں کے اصرار سے یہ خدمت قبول کی گئی ہوگی، مولانا محمد عمران خان صاحب کے نام، ۱۹۶۰ء میں، لکھے گئے ایک خط میں اپنا جو تاثر بیان فرماتے ہیں اس پر یہ بیان تدریس حدیث ختم کیا جاتا ہے

”دارالعلوم کی بڑی خوش قسمتی اور اقبال مندی ہے کہ اس نے مولانا محمد منظور صاحب جیسے نامور عالم اور راسخ العلم مکلم و محدث تدریس کے لئے حاصل کر لیا۔ ان کا وجود ہندوستان و پاکستان کے بڑے سے بڑے ادارہ اور جامعہ کے لئے موجب فخر و وقعت تھا۔ واقعہ یہ ہے میں ان کو دیوبند کی مسند حدیث کے لئے ہر دوسرے عالم سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی بہت سی صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے ہیں جس کی وجہ سے ماحصوں تدریس حدیث کے لئے ان سے بہتر آدمی ملنا مشکل ہے، پھر ان کا اخلاص، اصابت رائے، معاملہ فہمی، قوت فیصلہ، اشتراک عمل کا جذبہ اور وسیع ذہن ایسی حاداد صلاحیتیں ہیں کہ ان کا وجود دارالعلوم کے اس مجموعہ میں کسی نوع سے بھی مفید اور بیش قیمت ہے (۱)“

بہت کچھ ان صفحات میں آگیا۔ پھر بھی سب کچھ کہاں؟ کہ ایک نمبر کے مقالے کی ضخامت میں، کم از کم اپنے جیسی اہلیت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ نوے سالہ بھرپور زندگی کے کل عنوانات کو اس میں سمیٹ لے۔ ع ”سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے۔“

☆☆☆

ماہنامہ الفرقان کی خاص اشاعت کے لئے نیک خواہشات

## گلو ریس پینٹس Glorious Paints

ہمارے یہاں ہندوستان کی مشہور کمپنیز برجر پینٹ اور شالیہار پینٹ کے مختلف اقسام کے پینٹ اور پالش کے سبھی سامان تھوک اور پھکر ریٹ میں دستیاب ہیں۔  
معراج محمد

**Glorious Paints**

21, Latouche Road, Lucknow  
Phone : (Shop) 214698, (Res.) 224310

# حضرت بانی الفرقان کی تصنیفی و تالیفی یادگاریں

[۱]

وہ ضخیم، متوسط اور مختصر کتابیں اور کتابچے جن کا سلسلہ اشاعت برابر قائم ہے۔ اور دستیاب رہتی ہیں۔

- ۱- اسلام کیا ہے؟ \_\_\_\_\_ اردو، ہندی
- ۲- دین و شریعت \_\_\_\_\_ اردو، انگریز
- ۳- قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اردو ————— (ہندی ایڈیٹر
- ۴- معارف الحدیث مکمل ۷ جلدیں ————— (آٹھویں اور آٹھویں جلدیں بہت حلد منظر عام پر آرہی ہے)
- ۵- تذکرہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی
- ۶- ملفوظات مولانا محمد الیاس
- ۷- بوارق الغیب حصہ اول۔ یا مسئلہ علم غیب کا قرآنی فیصلہ
- ۸- بوارق الغیب حصہ دوم \_\_\_\_\_ نیا ایڈیشن نئی کتابت کے ساتھ زیر طبع
- ۹- حضرت شاہ اسماعیل شہید اور معاندین اہل بدعت کے الزامات
- ۱۰- شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات
- ۱۱- تصوف کیا ہے؟
- ۱۲- کلمہ طیبہ کی حقیقت
- ۱۳- نماز کی حقیقت
- ۱۴- برکات رمضان

- ۱۶- آپ حج کیسے کریں؟ اردو ————— (ہندی ایڈیشن زیر طبع)
- ۱۷- آسان حج ————— اردو و ہندی ایڈیشن (انگریزی زیر طبع)
- ۱۸- عقیدہ علم غیب
- ۱۹- مسئلہ حیات النبی کی حقیقت
- ۲۰- قرب الہی کے دور استے
- ۲۱- منتخب تقریریں
- ۲۲- دینی مدارس کے طلباء سے ایک خطاب
- ۲۳- آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور آپ کی منزل کیا ہے؟
- ۲۴- میری طالب علمی
- ۲۵- انسانیت زندہ ہے ————— اردو، ہندی ایڈیشن
- ۲۶- مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف
- ۲۷- تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات
- ۲۸- قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟
- ۲۹- قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ
- ۳۰- کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت
- ۳۱- تذکرہ حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ
- ۳۲- قرآن و حدیث کی سودعائیں
- ۳۳- الفیۃ المحدثہ
- ۳۴- ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت
- ۳۵- خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ (۲ حصے)
- ۳۶- تحدیثِ نعمت

[۲]

وہ کتابیں اور رسالے جن کے نام معلوم ہیں مگر کتب خانہ الفرقان کے شروع دور کے بعد ان کی اشاعت کا سلسلہ قائم نہیں رہا۔ البتہ ان میں کی بعض کتابیں اب کچھ دن سے پاکستان میں شائع ہو رہی ہیں۔

۱- سیفِ یمانی۔

غالباً سب سے پہلی تصنیف ہے۔ جس میں اکابر دیوبند اور مسلک دیوبند پر اعتراضات کے نہایت مؤثر جوابات دئے گئے ہیں۔

۲- مومن کی پہچان از روئے قرآن۔

اسلامی توحید کے عنوان پر اس مختصر رسالہ میں قبر پرستی، وغیرہ کی نہایت دلکش انداز میں تردید کی گئی ہے۔

۳- ستہ ضروریہ:

(۱) علم غیب، (۲) توسل، (۳) استغاثت بغیر اللہ، (۴) عرس، (۵) سماع مزامیر اور (۶) نذر بغیر اللہ۔ ان چھ مسائل کی شرعی تحقیق۔

۴- ہدایات قادریہ یا ہماری گیارہویں شریف:

مروجہ گیارہویں شریف۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی

روشنی میں۔

۵- حاضر و ناظر:

آنحضرت ﷺ کے بارے میں ”حاضر و“

۶- نتیجہ:

نتیجہ، دسویں وغیرہ رسوم مردجہ بعد الموت کے بارے میں ایک جامع رسالہ۔

۷- خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں:

علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک پر ایک نہایت مدلل اور مکمل مقالہ

مذہب و سیاست کی روشنی میں۔

۸- ایک ہفتہ چند دینی مراکز میں:

کچھ دینی مراکز میں حاضری کی ایک تاریخی داستان۔

۹- خاکسار تحریک کیوں قابل قبول نہیں:

خاکسار تحریک سے متعلق ایک بصیرت افروز تقریر۔

۱۰- خطبات بمبئی:

اسلام بحیثیت نظام کامل پر آٹھ مسلسل تقریروں کا مجموعہ



۱۱- نصرت دین — اصلاح مسلمین کی ایک کوشش:

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تبلیغی و اصلاحی تحریک کے مقاصد اور طریقہ کار کی توضیح میں ایک جامع و مفصل رسالہ۔

۱۲- میری زندگی کے چند تجربے:

چالیس سال کی عمر تک کے اپنے قابل ذکر تجربات اور زندگی کے

اہم واقعات۔

۱۳- اسلام اور موجودہ مسلمان قوم:

ایک دعوتی مقالہ۔

۱۴- دعوت احیاء دین یا دینی انقلاب کی ایک جدوجہد:

مضمون عنوان سے ظاہر ہے۔

۱۵- دعوت اصلاح و تبلیغ:

اصلاح و تبلیغ کے موضوع پر تین اہم مقالوں کا مجموعہ۔

۱۶- اسلام اور نظام سرمایہ داری:

[۳]

اور کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو لکھی گئیں، حتیٰ کہ بعض کی کتابت بھی ہو گئی۔ مگر چھپنے کا مرحلہ رہ گیا۔ اور پھر وہ عدم توجہ سے ضائع ہو گئیں۔ اس لئے کہ حضرت مصنف کی ذہنی و فکری توجہات کسی دوسری سمت مرکوز ہو گئیں۔ آپ کی معروف تصنیف ”فیصلہ کن مناظرہ“ (یا معرکہ القلم) کے مقدمے میں بغیر نام کے ایسی کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ اور اسکے ساتھ افسوس بھی کہ ان کتابوں کی حق تلفی ہوئی۔ بہت کام کی تھیں۔ اور بڑی محنت سے لکھی گئی تھیں۔ ان کا تعلق سنت و بدعت (یا دیوبندیت و بریلویت) کے مسائل سے تھا۔

قاری محمد مسلم غازی

بیاد

## حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

اے کہ تیری ذات تھی صد افتخار علم و فضل علم سے تجھ کو شرف، تو تھا نثارِ علم و فضل

تیری رحلت پر ہیں گریاں سب مراکز علم کے الفراق اے شیخِ دیں، اے تاجدارِ علم و فضل

منفرد انداز سے کی تو نے شرحِ دینِ حق !! تو رہا تازہ

مسلک قرآن و سنت کا تواک روشن دماغ فخرِ زہد و اتقا

خانقاہوں، مدرسوں میں غم کی چھائی ہے گھٹا آج سونی ہو گئی ہے رہگذارِ علم و فضل

وہ ریاضت روز و شب کی دینِ قیم کے لئے اب کہاں دنیا میں وہ روشن منارِ علم و فضل

اب کہاں ہنگامہ تعلیم قرآن و حدیث روٹھ گئی دنیا سے گویا اب بہارِ علم و فضل

یہ تدبیر، یہ تعقل، اور یہ فکرِ عمیق اے فدائے شاہِ دین، اے شہسوارِ علم و فضل

تھا زمانے بھر میں یکتا تیرا اسلوبِ بیاں اب نہ دیکھے گا کوئی ایسا نکھارِ علم و فضل

جس سے پاک و ہند کے روشن رہے دیوار و در بجھ گیا ہے آہ اک ایسا شرارِ علم و فضل  
 نطق وہ کہ جیسے ہو جبریل خود محوِ کلام بہہ رہا ہو جیسے کوئی آبشارِ علم و فضل  
 لمحہ لمحہ زندگی کا، عزم و ہمت کی مثال اُس کی ساری زندگی آئینہ دارِ علم و فضل  
 علم اُس کا علمِ نافع، اور عمل مقبول حق اُس کی ہستی ایک بحرِ بے کنارِ علم و فضل  
 مارگاہِ زیست میں اُس کے مراتب ہیں بلند ذات سے اُس کی تھا قائم اعتبارِ علم و فضل  
 س کے علم و فکر کی پھیلی ہے ہر سو روشنی مستفید اُس سے ہوئے مردانِ کارِ علم و فضل  
 ٹھ گیا دنیا سے اک طاعت گزار شاہِ آدیں ہو گیا او جھل نظر سے کو ہزار علم و فضل  
 غ نعمانی کا مدفن مرجع اہل کمال قبر یہ اُس کی نہیں، یہ ہے مزارِ علم و فضل

اِس جہاں سے آج وہ انسان رخصت ہو گیا  
 جس سے قائم تھا زمانے میں وقارِ علم و فضل





## MA FOUNDATION

PROUDLY ANNOUNCES THE OPENING OF  
EDUCATIONAL CENTRE  
IN NAME OF



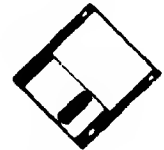
### **MA ACADEMY OF APPLIED EDUCATION ( MAAAE )**



ALL TYPES OF  
COMPUTER EDUCATION,  
ENGLISH SPEAKING

&

PERSONALITY DEVELOPMENT  
COURSES



#### ----- FACILITIES -----

- ◆ Air conditioned Hi Tech Computer Lab.
- ◆ Internet and Multimedia
- ◆ Separate Batches for Girls.
- ◆ Maximum Practical Time on Computers

#### **SPECIAL CONCESSIONS AND SCHOLARSHIP SCHEMES**

With Best Compliments From :

### **MA ACADEMY OF APPLIED EDUCATION**

50 Mohd. Ali Lane, Gwynne Road, Aminabad.  
Lucknow - 18. PH : 211751, Mobile : 98390-10008.

## F. I. Builders offers

Beautiful Flats on Cantt. Road  
at very reasonable rates

Project is approved by L.D.A.

24 Hrs. Water, Stand by Generator, Health Club :  
Two/Three Bedroom, Drawing/Dining and Duplex unit.



## F. I. TOWERS

37, Cantt. Road, Lucknow-1

**For More Details Contact**

*Mr. Mehmood*

*F I Builders Pvt Ltd*

*37, Cantt. Road, Lucknow*

*Ph 285044, 211703, 220683*

*Mobile 9839013025 Mr Shoeb Iqbal (M D)*

فون آفس : 228602 بانی الفرقان نمبر کی کامیابی کے لئے  
فون گھر : 210367 دست بدعا

ہندوستان بھر میں تھلکے چاٹینے والے

۱۲ بور ہندو کے کارٹوس

الہ اشہ

اور

تانترک

شادی بیاہ اور حفاظت  
(بھارت سرکار کے لائسنس دار)

تشریف لائیں

ایکو انڈسٹریز

(ایر کنڈیشن شوروم)

پہلی منزل ، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

مالک : چودھری شرف الدین

ہماری دعا ہے کہ  
 حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ کی یاد میں  
 شائع ہونے والی ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی خاص اشاعت  
 عند اللہ وعند الناس مقبول ہو  
 اس زبردست تاریخی اشاعت پر ہم  
 ادارہ الفرقان کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں



کاکوری آفسیٹ پریس

کاکوری کوٹھی، بی این ورماروڈ، لکھنؤ-18

فون : 229616

## رحمان فاؤنڈیشن چیریٹیبل ٹرسٹ

(انکم ٹیکس کی دفعہ G-80 کے تحت مستثنیٰ)

مشہور و معروف عالم ربانی حضرت شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادی کے نام سے مسوب یہ ادارہ پچھلے تین سال سے مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی صاحب کی سرپرستی میں عوام کی خدمت بعیر کسی مذہب و ملت کی تعریف کے عوام کے ہی وسائل و صلاحیتوں کو منظم کر کے نہایت دیانت داری سے انجام دے رہا ہے۔

آپ کے صرف ایک روپیہ یومیہ کی امداد آپ کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالے گی مگر یہ کسی دوسرے کی زندگی کے رح یا معیار کو بدلنے میں اہم کردار کر سکتی ہے۔

### اغراض و مقاصد

- ۱- مذہب و ملت، نسلی اور قومی تفرقات سے مالا تر ہو کر انسانی اخوت اور علم کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا۔
  - ۲- جہالت، توہم پرستی اور تعصب و تنگ نظری سے پورے سامان کو پاک کرنا۔
  - ۳- علم اور خدمت کے جذبہ کو عام کرنا۔
  - ۴- حفظان صحت کے اصولوں سے عوام کو باخبر کرنا اور ضرورت مندوں کو طبی خدمات مہیا کرنا۔
  - ۵- غربت اور افلاس کے مارے ہوئے لوگوں کی اس طرح مدد کرنا کہ ان کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچے اور وہ حلقہ جلد اس سطح سے نکل آئیں۔
  - ۶- ایسے معاشرہ کی تعمیر کرنا جس میں خواتین کی مخصوص حیثیت اور ان کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور ساتھ ہی معاشرے کی خدمت اور ترقی میں وہ اپنا بھرپور کردار بھی ادا کر سکیں۔
  - ۷- معاشرے کے کمزور طبقے کے افراد کو "اپنی مدد آپ" کی بنیاد پر خود کفیل بنانے کے لئے معاشی مدد کرنا۔
  - ۸- ان سب مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر مقام پر وہیں کے وسائل اور صلاحیتوں کو منظم کرنا۔
- نوٹ: صرف تین سال کے عرصے میں ان سب شعبوں میں جتنا کام اب تک ہو چکا ہے اس کی تفصیل جانے کے لئے دفتر تشریف لائیں یا خط و کتابت کریں۔

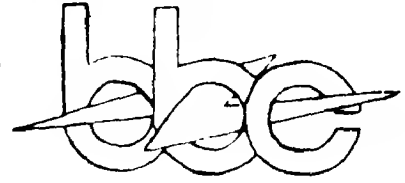
مہربانی فرما کر منی آرڈر، چیک یا ڈرافٹ درج ذیل پتہ پر بھیجیں اور چیک یا ڈرافٹ پر صرف

RAHMAN FOUNDATION ہی لکھیں۔

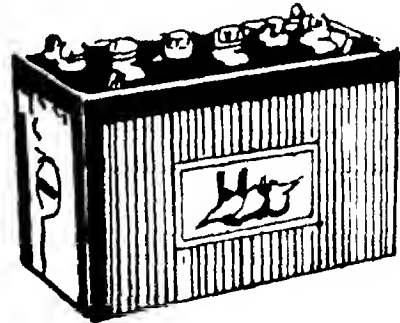
پتہ: رحمان فاؤنڈیشن بشن 118/133 کینٹ روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ فون: 210678



برائڈ ایک نئی بیٹری ہے جس نے شمالی ہندوستان میں  
پروکار مقام حاصل کر لیا ہے۔



یہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کانپور سے پاس شدہ ہے اور حکومت اتر پردیش  
کے منظور شدہ ریٹ کنٹریکٹ پر دستیاب ہے۔  
ماڈرن ٹکنالوجی اور اعلیٰ خام مال سے بنائی جانے والی یہ پائیداری بی بی سی بیٹریاں ماروقی  
کار، وین و جیسی کے لئے طرہ امتیاز اور روایتی گاڑیوں  
کے لئے شان و بھروسہ کی ضامن ہیں۔  
رابطہ قائم کریں



**B. B. C. (INDIA)**

**BOMBAY BATTERIES**

Lal Bagh, Lucknow

Ph. : 229901, 212620 (Resi.) 328380

## قرآن کا پیغام انسانیت کے نام

مولانا سجاد نعمانی کے درس قرآن کے خلق محتاج تعارف نہیں، اس کے درس اور یاں میں گہری فکر ملتی ہے اور اہم نکتے پر بحث آتے ہیں، دعوت کی بصیرت حاصل ہوتی ہے اور زندگی کو پاکیزہ اطوار سے مرین کرے کا حد۔ میدار ہوتا ہے۔ ان کے درس قرآن اور ملک کے مختلف علاقوں میں ہوئے والی اس کی دعوتی و اصلاحی تقاریر کے تقریباً ۳۰۰ سیڈ تیار میں۔ چند اہم کیسٹوں کی تفصیل درج دیل ہے۔ مکمل مہرست ۲/۱ روپیہ کا نکتہ لگا ہوا الفاؤ بھیج کر ڈاک سے طلب کی جاسکتی ہے۔

کوڈ نمبر	عنوان	قیمت	کوڈ نمبر	عنوان	قیمت
0794	آج دین یتیم ہو گیا	50/-	2394	گھمنڈی عبادت گزار سے بھر	30/-
5895	اس یتیم کو کون گود لے	30/-	6495	شرمندہ گنہگار	30/-
6895	ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ شخصیت	25/-	1896	رمدگی دیبے والا ایک تو سمدگی	30/-
4296	تحفہ حواتین	30/-	5796	ایبل کی کیوں	30/-
	میراث کی تقسیم	30/-		کلمہ سواہ - مسترک حقائق	30/-
				آتو الرکوة مہم	30/-

1897-3297 سورہ یسین مکمل سیٹ

بیٹگی رقم آئے پر ستر ڈپارسل سے ہی کیسٹ بھیج جاتے ہیں، بارسل ہ ہے، رقم درج دیل پتے پر بھیجے۔ ڈرائٹ پر صرف IMAN FOUNDATION پتہ رحمان فاؤنڈیشن 118/133 کیسٹ روڈ، قیصر با۔

## وشوا ایکتا سندیش (ہندی ماہنامہ)

مولانا طیل الرحمن سجاد نعمانی کی سرپرستی میں نکلنے والا یہ ہندی رسالہ گزشتہ ۳ سال سے اہل ہند کو وحدت الہیہ، وحدت بنی آدم اور وحدت دین کی غوس علی بنیادوں پر مدہب کی اصل روح سے آسا کرانے کا اور حق کی راہ دکھانے کا کام کر رہا ہے، جو ملک میں ہر مکت فکر کے عوام و خواص کی توحہ کامرکز بنا ہوا ہے۔

گذشتہ سال ہندوستان کی آراوی کے پچاسویں سالگرہ کے موقع پر 264 صفحات پر مشتمل ایک صحیح مسرتابع کیا گیا تھا جسکو ملک کے گوشہ گوشہ میں اہل نظر و فکر حضرات بے بہت سراہا، جس میں حضرت مولانا محمد مطہر نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (علی میاں) کے فکر انگیز مصامیں بے مشہور و معروف قیصوں کے سربراہوں کے اسٹریو اور ہندو علماء و دانشوروں کے علمی و تحقیقی مصامیں بھی شامل ہیں، اس خاص شمارہ کی قیمت ہندوستان 35/- (تھر جشری ڈاک خرچ) اور بیرون ممالک کے لئے 20/- ڈالر ہے۔

سالانہ خریداری ممبر شپ ہندوستان میں ایک سو روپیہ اور بیرون ممالک 20/- ڈالر، ڈرائٹ پر صرف "Vish-

wa Ekta Sandesh" لکھیں۔

پتہ: "Vishwa Ekta Sandesh" 118/133 کیسٹ روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ

"سانی الفرقان مہر" کے لئے ایسی بیک حوابسات ییتس کرتے ہیں



## GULSHAN MEDICARE

Word of Trust

Approved by Gulf Corporation Council

دہلی یا بمبئی کی دوڑ دھوپ کا خاتمہ  
عرب ممالک کو جانے والوں کے لئے میڈیکل  
کرانے کی سہولیات اب لکھنؤ میں  
گلف کارپوریشن کونسل کی طرف سے  
تصدیق یافتہ

گلشن میڈیکل

۶- نبی اللہ روڈ، نزد سٹی اسٹیشن، لکھنؤ - ۱۸ فون نمبر . 223662

हमारी ओर से शुभकामनायें

# अग्रवाल ट्रेडिंग कम्पनी

365, गुईन रोड,  
मीनाबाद लखनऊ-18

सभी प्रकार के कागज़  
के थोक विक्रेता

डिस्ट्रीब्यूटर :

सन्चुरी पल्प एण्ड पेपर

फोन दुकान : 215581, 218628

निवास : 322091

ماہنامہ الفرقان کی اشاعت خاص بائی الفرقان نمبر کے لئے

— نیک خواہشات —

ہمارے یہاں ہندی، انگریزی اور عربی کی کمپوزنگ اور ڈیزائننگ کے ساتھ ساتھ  
اردو کی کمپوزنگ اور ڈیزائننگ کے لئے دنیا کے سب سے عمدہ وارڈ سافٹ ویئر  
ان پیج (InPage) کی سہولت دستیاب ہے۔

— رابطہ قائم کریں —

**Print Line Computers**

23, Shutur Khana, Maqboolganj,  
(Hewett Road, Near Bhanmati Chauraha)  
Lucknow Ph. : (0522) 285305

۱۹۱۶ء سے ٹیلرنگ کی دنیا میں  
ایک معتبر نام

فٹ اینڈ کمپنی ٹیلرس

**Fit & Co. Tailors**

اسپیشلسٹ : رولر مشین کے ذریعہ  
فیوز لان سوٹ اور شیر وانی کی سلائی کے ماہر

ریمنڈس، ویسل اور گوالیار جیسی مشہور ملوں کے  
شانداز سوئٹس، کرتے اور پٹھانی سوٹ کے  
کپڑوں کے لئے لکھنؤ کی  
ایک قابل اعتماد دکان

**سردار سنس**

کلا تھ مرچنٹ، نظیر آباد، لکھنؤ

**Sardar Sons**

Cloth Merchant  
Nazirabad, Lucknow-18  
Ph. : 213866 - 226657

محله العرقان مسر کی حملہ کامیابی کے لئے بیک حوابشات کے ساتھ

### کاکوری برائیلرز - 210748

ہمارے یہاں زندہ برائیلرز، برائیلرز کا گوشت، "جاپانی شیر"، برائیلرز کی ڈرم اسٹک،  
بون لس اور برائیلرز کا دانا مناسب قیمت پر مہیا رہتا ہے۔

ایک مار صلاحیت کا موقع [یس]

کاکوری برائیلرز تازہ سیناروڈ، امین آباد، لکھنؤ - 210748 (فون)

بیک حوابشات کا اظہار کرتے ۔

Corner

ریگل کافی کارنر

ہمارے یہاں چائے، ناشتے کا معیار ہی اور

بھان متی چوراہا، ہیوٹ روڈ، لکھنؤ

پروپرائٹر محمد ایوب

دست مدعا ہیں

### حاجی عنایت ہوٹل

ہمارے یہاں ناشتے میں لکھنؤ کے مشہور نہاری کچے لٹے ہیں اور دوپہر سے رات گیارہ بجے تک کھانے کا معقول  
انتظام رہتا ہے۔ قورمہ، بند گوشت، مونگ گوشت، بریانی وغیرہ اور تمام رمضان المبارک کے موقع پر افطار سے سحر تک  
نہاری کچے کا معقول انتظام ہوتا ہے۔

بلالی مسجد نظیر آباد، لکھنؤ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی یاد میں شائع ہونے والی

الفرقان کی تاریخ ساز اشاعت کے لئے

ہم نیک خواہشات اور مبارکباد پیش کرتے ہیں

## اجمل لیمنیشن

اعلیٰ و معیاری لیمنیشن کے لئے ایک مستند نام

فون ۲۶۳۱۱۶

۱۶- بلوچ پورہ، لکھنؤ-۲۲۶۰۰۳

raymond

دلہن کے لئے اور آپ سب کے لئے

بنارس سوٹ، بنارس سی ساڑی، کامدار سوٹ اور ساڑیاں، لہنگا،  
چیزی، لاپے اور ریمینڈس و ویمل کی سوئنگ شرٹنگ کے لئے

— آپ کی اپنی دوکان —

ناولٹی کلا قہ سنٹر

نظیر آباد، لکھنؤ فون: 215298

ایک دینی و علمی مرتفع اور تاریخی یادگار  
سہ ماہی "احوال و آثار" کا نند ہلہ کی اشاعت خاص

بیاد

## حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ

امیر جماعت تبلیغ

جس میں حضرت مولانا کے خاندان، آباء و اجداد کے مستند تذکرہ کے ساتھ حضرت مولانا کے  
احوال و اسفار کی تفصیل، مولانا کے اہم ملفوظات کا انتخاب، کا:  
آخر میں مولانا اظہار الحسن صاحب کاندھلویؒ کے حالات۔  
بھی شامل کیا گیا ہے۔

جامع و مرتب

نور الحسن راشد کاندھلوی

عمدہ کتابت، اعلیٰ کاغذ، معیاری طباعت اور نہایت عمدہ جلد و خوبصورت  
گرد و پوش سے آراستہ۔

ضخامت ساڑھے سات سو صفحات

قیمت ایک سو پچاس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

بیرونی ممالک کے لئے تیس امریکی ڈالر

ناشر : مفتی الہی بخش اکیڈمی

محلہ مولویان کاندھلہ، ضلع مظفرنگر۔ (یوپی) پن کوڈ . 247775



ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی خصوصی اشاعت

بہ یادگار حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی بے نظیر مقبولیت کے لئے ہم دست بدعا ہیں۔

ESTD 1936

ہجری ۱۴۵۵ھ

قائم شدہ ۱۹۳۶



بفضلہ



بہترین مٹھائیوں اور بیکری مصنوعات  
وابستہ نام۔ سلیمان عثمان

ہماری مصنوعات کے پس پشت ہے۔ خصوصی لذت، انفاست،  
اعلیٰ معیار، خوشنویسی اور ساٹھ سالہ تجربہ

ساتھ ہی خدا کے فضل اور عزت کا ہر گونہ کی کرم فرمائی کے سبب ہیں  
ماں ہوئے ہیں دو دو گولڈ میڈل اور شیلڈ۔

جدید صحت مصنوعات، اطباء، ڈرائیوٹ، رتی، ڈرائیوٹ رتی  
ایچ پاک، آخوٹ پاک، اندام کا عطفانی معود، مادائی مسلوہ  
سوان طوہ، مادائی سوان طوہ، کا خوشنویسی کا نورول، ایک کتب  
رکے علاوہ کا نورلکٹ اور دیگر نئی شہرت مسکت سستہ ماں خطا بنیں۔

نعمہ یاسو غاٹ کیلئے جدید و کتب پختہ

شیریں مروج، شیریں مزاج

سلیمان عثمان مٹھائی والے

۱۶۷ اسیمپٹ روڈ، سس ۵، ۵۹، ۴۵۰۰۵۹، ۴۵۰۰۵۹

میں مٹھائی بیکری ۲۳ محلہ روڈ، روڈ، سس ۵، ۴۵۰۰۵۹

Fax 009122 6341635 Telex 011 75941 BARI IN